

# ستاروں کا آئینہ

نسیم سحر قریشی

WWW.PAKSOCIETY.COM



WWW.PAKSOCIETY.COM

کہاں آ کے رکنے تھے راستے کہاں سبڑ تھا اسے بھول جا  
وہ جو مل گیا اسے یاد رکھو جو نہیں ملا اسے بھول جا  
وہ تیرے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پر برس گئیں  
دل بے خبر میری بات سن اسے بھول جا اسے بھول جا  
کسی آنکھ میں نہیں اشک غم تیرے بعد کچھ بھی نہیں ہے کم  
تھے زندگی نے بھلا دیا تو بھی مسکرا اسے بھول جا  
تو یہ کس لیے شب بھر کے اسے ہر ستارے میں دیکھنا  
وہ فلک کہ جس پہ طے تھے ہم کوئی اور تھا اسے بھول جا  
(امجد اسلام امجد)

**فضول** غم بھٹی یا کھڑی کے تیر ہارن نے غم صحت بھی گوہر کو چھوٹا دیا کہ اس نے کھڑکی سے بھاگ کر دیکھا  
پیش پر نیل بھائی کی سنی کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ جواب میں گوہر نے انہیں  
انداز آئے کا اشارہ کیا۔ گردہ بند رہے۔ ڈرامیٹک سیت پر جسے رہے۔

”کیا بات ہے نیل بھائی؟ خیر تو ہے۔“ گوہر مسکرائی۔  
جو ہر آ پالان دونوں ایک طویل عرصے بعد اپنے خوابوں کی آجیر بانے وان تھیں اور پورا گھران کی طرف سے کسی  
بیر یا تھنر تھا۔

”ہاں صاحب خیریت ہی خیریت ہے۔ بس ہماری جان ناتواں پر آپ کو یہاں سے اپنے گھر لے جانے کی  
بھاری ذمہ داری کا یو جہ ہے۔ بیگ صاحب فرماتی ہیں کہ چند منٹ میں آپ کو کبھی محترمہ گوہر صاحبہ کو ان کی خدمت  
قدس میں حاضر ہونا چاہئے۔“

”کیا آپ کو ہسپتال جانا ہے۔“  
”جی حد ہوئی گوہر بی بی! کیا تم نے رات کو کوئی خواب دیکھا ہے؟ تمہاری آپا کے ہسپتال جانے میں ابھی  
پہرا آیا۔“ لہوڑا ہے۔ یہی فضول باتوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ تم جلدی سے آؤ تاکہ تمہیں گھر چھوڑ کر اپنی  
غریب پاپا گھس سے دو دو ہاتھ کر لیں۔ تمہیں خیر سے ناشام چار بجے کے بعد ایک پل بھی ہمیں باہر رہنے کی  
اجازت نہیں۔“ نیل بھائی نے اپنا اندر پیش کیا۔ گوہر مسکرائی۔

”نیل بھائی میں ایسا سے تو کہہ دوں۔ میں ابھی آئی۔“ وہ اندر چلی گئی اور تھوڑی دیر میں لوٹ آئی پل میں  
گاڑی گیٹ کی راہ باہر نکل گئی۔  
گاڑی سے اترتے ہی وہ گوہر کو اندر کمرے میں لے گئے۔ جوہر کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ جوہر نے۔

”بیٹے حضور..... آپ کا طوم حاضر ہے۔ اور یہ بندہ باہر جانے کی اجازت کا طلب گار۔“ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر  
پر نام کیا۔  
گوہر نیل بھائی کی معصومیت پر مسکرائی۔ جوہر نے شکایتی انداز میں نیل کو دیکھا۔ وہ خدا حافظ کہتے ہوئے  
باہر چلے گئے۔

”کیا بات ہے آپا۔ ابھی دو دن ہوئے پورے چوبیس گھنٹے تمہارے پاس رہ کر گئی ہوں۔ پھر کیا ضرورت آن  
ہی۔ ایک تو تم اور تمہارے مجملہ کام میرے گلے کا بار بن گئے ہیں۔ اور پھر یہ ہر وقت کے بلا دے۔ کچھ وقت

جمہ حقوق محفوظ

2005ء  
خواتین ڈائجسٹ  
ابن حسن پریس کراچی

پاراوان  
ناشرین  
پریس

سول ایجنٹ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی



"ان کے دوست۔ ہونہ بزنس کے دھندوں میں الجھے وہ تنگ اور یور لوگ۔ اور میری بھلا کون سی ایسی سہیلی  
 جو مجھ سے چھٹی ہو یا اس کا گھر میں نے نہ دیکھا ہو آخر کس نے مجھے یہاں لایا..... کون کر سکا ہے ایسی حرکت؟"

گوہر ایک بار پھر تصویریں دیکھ رہی تھی۔ بے انتہا حسین۔ یہ خوب صورت گھر کس کا تھا؟ اس کا ذہن یہ سوچنے  
 سے تاصر تھا۔

وہ کچھ کہنے لگی۔ لاطینی کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔

"دندفل..... ایک خیال آ رہا ہے میرے ذہن میں۔" جوہر نے ایک دم کہا۔

"اچھا۔ آ رہا ہے تو لگے ہاتھوں نہیں بھی سنا بیٹھے۔ کیا خیر آپ کے خیال سے ہم بھی اتفاق کر لیں۔"

"اس دن پارٹی میں جس سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی۔ کیا نام تھا بھی نہیں۔ ارے جو بار بار  
 تمہاری سادگی کا معترف ہوا جا رہا تھا۔ ہاں وہ میجر میلام حسن۔ کیا خبر اس نے اپنا پروپوزل بھیجے سے قبل اپنا  
 تعلق کرنا ضروری سمجھا ہو۔ میرا مطلب ہے اپنا مکمل پتو۔ حدود دار بند۔ یعنی اپنا مکمل جغرافیہ بتانے کی کوشش  
 کی ہو۔" گوہر یہ سن کر غصے سے بھرنی۔

"جوہر آ پاپا۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ وہ بیٹے بیٹے چپ ہو گئیں۔

"میں اتنی لے آپ کے گھر آنے سے گریز کرتی ہوں۔ نہیں بھاتیں۔ مجھے یہ محسوس پارٹیاں اہران میں شرکت  
 کرنے والے لوگ..... میں تو ان دن بھی آپ کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ ٹیلی بھائی اس میجر میلام  
 حسن کو لیے اندر ہی آ گئے۔ ان کے سامنے میں کیا ہتی بھلا۔ ناچار بیٹھی رہی۔ گھر میں اور کوئی جائے امن بھی نہیں  
 نہیں۔ چپے چپے پر تو مہمان گھر سے تھے۔ پارٹی نہیں شادی تھی وہ تو۔ خیر..... لیکن میں نے تو اس سے کوئی  
 ایسی بات نہیں کی تھی جو بقول آپ کے وہ پروپوزل بھیجے کی سوچے اور اگر بھیجے بھی تو آپ کے ہاں اس مسئلے کا  
 تعلق تو خالص آپ کی ذات سے ہے۔ ویسے جوہر آ پاپا۔ یہ بندہ جو کوئی بھی ہے حسن انتخاب کی داد نہ دینا زیادتی  
 ہوتی۔ پندرہم کی یہ تصویر دیکھی آپ نے کیا خواب آئیں ماحول ہے۔ تم سے دیکھ کر ہی مجھ پر تو خند کا غلبہ  
 ہونے لگا ہے۔" گوہر شریرانہ انداز میں کہیں کوہ پینتے گی۔

"ہاں واقعی بہت زیادہ خوب صورت ہے اور ہم دونوں کو بھیجے جانے کی شخصیت کو ماننا ہوگا۔ یہ اتنی ذوق کسی اعلیٰ  
 بندے کا ہی ہو سکتا ہے۔ عام بندے کا نہیں۔" جوہر مسکرائیں۔

"ہوگا۔ آپ کیا خیال درست ہی ہوگا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بس کسی نام سے بندے کو تعمیر کی تو فیشن ہوگی اور  
 اس نے تاج محل بنا ڈالا۔ کچھ نہ کر سکتا تو اچھے سے اچھا بندہ بھی بنا کر رہ جاتا ہے۔"

"دیکھو فتنہ نہیں چلے گا اور نہ ہی مذاق۔ میں نے تمہیں بلایا ہے تو اس لیے کہ تم اس مسئلے کا حل تلاش کرو۔"

"آپ! یہ آپ کا بالکل ذاتی معاملہ ہے اور کوئی اتنا اہم بھی نہیں کہ جس کے لیے پریشان ہونا چاہئے۔ اللہ بھیجے  
 والے پر رحمت نازل کرے۔ بیچ دیں اس نے۔ تم نے دیکھ لیں۔ دل خوش ہوا۔ اللہ اللہ خیر صاف۔"

"نہیں گوہر! ان میں کوئی راز ہے۔"

"تو کرنی رہے فکر۔ مجھے اجازت دیجیے۔ بہت سے کام اور پورے رہیں گے۔ میرے یہاں رہ جانے سے۔"  
 "ارے بیٹھو۔ اب نہیں کی رہی ہے۔ پہلے تو تم نہیں چا سکتیں۔"

"اچھی سزا ہے۔"

مجھے اپنی ذات کے لیے بھی چاہیے ہوتا ہے۔ آج میں نے سوچا تھا کہ پورا دن اپنا مرضی سے گزاروں گی لیکن وہ  
 جوہر آ پاپا کیا جو دوسروں کو جین سے رہتے ہیں۔"

"دم تو لو..... رک تو کسی۔ اصل میں گوہر بات ہی ایسی تھی جو تمہیں جانا پڑا۔ میں تو رات سے سوچ سوچ کر  
 پریشان ہوئی جا رہی ہوں۔ آخر یہ کون ہوگا.....؟ کون؟"

"کون.....؟ کون ہے کون.....؟" گوہر حیران رہ گئی۔

"خاہر ہے کوئی انسان ہی ہوگا۔ لیکن بڑی عجیب بات ہے۔"

"کون سی بات؟" وہ ہلکی سی سن رہی تھی۔

"بہن دیکھو نا۔ حسین نظاروں کی پھیلوں اور کلیوں کی تصویریں بنانے کی حد تک تو بات جائز ہے۔ لیکن یہ خالی  
 مکانوں کی میزوں کرسیوں کی خواہگا ہوں اور ڈرائنگ روموں کی۔ بلکہ گاڑیوں کی تصویریں ہونا تو ایک دم نا جائز  
 ہے۔ یوں لگتا ہے کسی نے ہم پر اپنی امارت کا رعب جھاڑا ہے۔"

"کیا مطلب جوہر آ پاپا؟ میں پورے ہونے لگی ہوں۔ آپ کی نہ سمجھ آنے والی باتوں سے بھی تصویریں کا کیا ہے  
 جس چیز کی بنا میں بن جاتی ہیں۔ اسے ذرا دیکھو پچھنی نہ تھی۔ ایسی باتوں سے۔"

"ہنی تو ہیں..... لیکن کچھ اچھی نہیں لگتی۔ کوئی تنگ ہے بھلا..... ایک دم بچے جگے ڈرائنگ روم کی  
 تصویر بنا دو۔ جس میں بندہ دیکھنے کو نہ ملے۔" گوہر ہلکی سی سن رہی تھی۔

"جوہر آ پاپا یہ سب کیا ہے۔ کسی ڈرامے کا مستر تو نہیں۔"

"یہ سب بھی کچھ ہے اٹھا اور جا کے میرے بیڈ کی سائڈ ٹیبل کی دراز کھولو اور اوپر پڑا سفید بھاری لفافہ اٹھا لو۔"  
 "جوہر آ پاپا! آپ کو خبر ہے نا میں سسپنس سے کتنا گھبراتی ہوں۔ اس لفافے میں کیا ہے؟" وہ جاتے جاتے  
 رک گئی۔

"کوئی اسرار نہیں میری جان۔ پر صرف تصویریں ہیں جتنیں عدد تصویریں۔"

"تصویریں ہیں۔ تو میں کیا کروں۔"

"ارے بھئی وہی تصویریں۔ کسی خالی مکان کی۔ دیکھو اور معطل نہ رہنے میں میری مدد کرو۔"

تھوڑی دیر بعد گوہر تصویریں دیکھ رہی تھی۔ واقعی میزوں کی کرسیوں کی تصویروں کی بیڈز کی کسی گھر کے لان کی  
 ٹی وی لائونج کی۔ ایک خوب صورت ترین گھر تھا وہ۔ جس کی چاٹ انجائی فاسٹ سے کی گئی تھی۔ خوب صورت  
 گل سیکر۔ انتخاب ماربل کے چکنے فرش آئل پینٹ کی دیواریں۔ ایک تصویر میں گھر کا آؤٹ لکٹ۔ سنگ مرمر  
 کے انتخابی حسین رنگوں سے سجا گھر۔ گوہر ایک ایک تصویر تیراتی سے دیکھتی جا رہی تھی اور اب ساری تصویریں  
 دیکھی جا چکی تھیں۔

"آپا کچھ سمجھتے ہیں؟"

گوہر نے ہلکی سی سر ہلا دیا۔ احتیوں کی طرح۔

"یہی سمجھتے تو کل سے مجھے الجھائے جا رہی ہے۔ دیکھو نا لفافے پر ایڈریس نام پ کیا ہوا ہے۔ ڈاک کی کوئی  
 ٹکٹ لگی ہے نہ کوئی مہر ہے۔ یہ لفافہ کل کی ڈاک کے ساتھ لیزر لکس سے نکلا ہے۔"

"نہیں بیٹا! کو خبر ہے؟"

"وہ جوہر حیران ہیں کہ یہ سب کیا ہے؟"



”تصویریں؟“ گوہر جو اندر داخل ہو کر چپ کھڑی شہری بھائی کی بات سننے لگی تھی ایک دم بول پڑی۔

”وہی خالی گھر والی تصویریں نا۔ شہری بھائی اکہا آپ کے پاس بھی آئیں؟“  
”ارے نہیں۔ لاہور سے رضا کا فون آیا تھا۔ اس کے پاس کسی نے بھجوائی ہیں۔ اسے مجھ پر شک تھا۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو۔“

”وہ۔۔۔۔۔ وہ ایسی تصویریں جو ہر آپا کے ہاں بھی آئی ہیں اور اب بھی بتا رہی تھی ایسی تصویروں کا۔ کون ہے یہ بھینچے والا جس نے پورے خاندان کے لیے زحمت کی۔“ وہ مسکرائی۔

”خبر نہیں کون ہے۔ وہ رضا تو روایتی دیکھوں کی طرح کئی سوکتے نکال رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ بھائی کسی من چلے نے دوپہل کی تفریح کا سامان پیدا کر دیا۔ تمہارا کوئی نقصان تو نہیں کیا۔ غصہ کس بات کا۔ تصویریں تخریب پیدا نہیں کر سکتیں۔“

ابھی یہ ذکر ہوا تھا کہ عامر حسین صنیہ بیگم کے کمرے میں داخل ہوئے۔

سب نے حیرت انہیں سلام کیا۔ انہوں نے ہاتھ میں کچرا لٹا دیا۔

”لو بھئی صنیہ آج یہ نئی بات ہوئی۔ دکان پر کوئی لڑکا آ کے وٹے گیا۔ میں تو نہیں تھا۔ ملازم تھے وہاں پتا ہی نہیں چلا کہ کون ہے دینے والا۔ بھلا کسی کو ہم جیسے بوڑھے آرنی سے مذاق کرنے کی کیا سوجھی۔“

”بابا جان! اگر اس لٹا نے میں کسی خالی گھر کی تصویریں ہیں نا۔ تو اس مذاق کا شکار آپ کا پورا خاندان ہی ہے۔ کاظم چچا، شاہجہاں، مومن جو ہر آپا۔ ان سب کے پاس بھی ایسی تصویریں بھج چکی ہیں۔“ شہریار نے جلدی سے اطلاع بہم پہنچائی۔

”ارے۔۔۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی۔“

”جی ابا جان! ابھی انھی آئی ہوں میں جو ہر آپا کے کمرے سے۔ بالکل ایسی تصویریں تھیں وہ بھی۔“

”عجیب بات ہے۔ بھئی میری عکس تو کوئی اندازہ لگانے سے قاصر ہے۔“ عامر حسین کچھ سوچ رہے تھے۔

شہری بھائی حنا بھائی تصویریں دیکھنے میں لگے تھے۔ صنیہ بیگم منتظر بیٹھی تھیں۔

”لاؤ بھئی کچھ عکس بھی تو خبر ہو۔“

”اماں یہ تصویریں محفوظ رکھیے آرائش و زیبائش مکان کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ بخت کے کام آئیں گی۔ اسے بھی تو بہت شوق ہے۔ ایک اچھا گھر بنانے کا۔ ان سے کچھ نہ کچھ فیض حاصل کر لے گا۔“ شہریار نے مشورہ دیا۔ گوہر جنس وئی۔

”ارے نے ایسی تصویروں کو نہیں بھائی کے لیے محفوظ کر دیا۔ اور شہری بھائی آپ نے بخت بھائی کے لیے۔۔۔۔۔ اللہ بھنا کرے بھینچنے والے نے کئی ایک کی مشکل ایک ساتھ آسان کر دی۔“

”اچھا چلو بھئی یہ بچوں کی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔ فی الحال تو کھانے کی فکر کرو۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ عامر حسین اہاں سے اٹھ گئے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

گھر کے دروازے پر روشن دن کے اجمالے میں چلتے بہت بھینچے لگ رہے تھے۔ بڑا سا سفید گیٹ بند تھا۔ صرف آہٹ کی تھی۔ اس نے مختصر انداز میں بھائی اور کھڑکی کے راستے اندر چلی گئی۔ سرخ بگری کی روش سے تیزو اسما بہت توجہ سے مٹا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے ذرا سی گردن اٹھائی۔ آنکھیں کھلیں اسے

حصار پھر ہو گیا۔ رات کی ہلکی سی بوند باندی نے سبزے کے رنگ کو نکھار بخش دیا تھا۔ پھول زیادہ خوب صورت لگتے تھے۔ پورچ میں نئی بوند باندی لگائی تھی۔ ہلکی سی آواز پیدا ہوئی اور دروازہ کھل گیا۔ کوریڈور میں ہلکی مارتے فرش صاف کرنے میں لگی تھی۔  
”آئیے بی بی! وہ مسکرائی۔“

دارا نے سامنے بڑی بالوں کی چوٹیوں کو جھک کر پیچھے کیا۔ اور چیزی سے سامنے کے دوسرے دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ سخت غصے میں لگ رہی تھی۔

”دراز بھلا کھانا! شہری بھائی! شہری بھائی!“

بی بی صاحبہ کچن میں ہیں۔“ صفری نے اطلاع دی۔

”تو میں۔۔۔۔۔ کیا کر رہے ہیں وہاں؟“ اس نے فوراً لیکن کا رخ کیا۔ انتظار کی کونٹ کے ساتھ ایک اور شخص کی تلاش ہو گیا۔

”اے شہری بھائی! گڈ مارنگ۔۔۔۔۔ بھی آپ کچن میں مجھے کیا کر رہے ہیں۔“ اس نے گڈ مارنگ کسی ہتھوڑے کی طرف سے مارا۔

”اڈا اڈا کر لیا ڈاڈا آریومائی سوٹ بے بی۔“ وہ مسکرائے اور ٹوسٹر میں سے سلاخ نکالتے ہوئے بولے۔

”تو اس بول رہی میں آپ سے۔“ اس نے منہ پھلایا۔

”یوں جناب کس جرم کی پاداش میں؟“

”آپ ناشتے پر کیوں نہیں آئے۔ مہا پاپا آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنی دیر ہو گئی۔“

”ارے نہیں بے بی! تم لہگوں کو میرا انتظار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مہمان تو ایک دن دو دن ہی اچھا لگتا ہے۔ یہ بھی بی بی مہمان ہے۔ جم ہی جائے۔“

”آپ مہمان تھوڑے ہی ہیں۔ آپ تو شہری بھائی ہیں۔ مہما کے بھائی پاپا کے بھائی۔“

”اور تمہارے بھی بھائی ہیں نا۔۔۔۔۔ نانی گرل مجھے تمہارے آنے کی خبر تھی۔ یہ دیکھو میں نے تمہارے لیے بھی تیار کیا ہے۔“ جلولو ڈشبل پڑھ کر بیٹھی۔

”میں نہیں کر رہی نا شہ۔ آپ ہمارے گھر نہیں آ سکتے تو میں کیسے رک سکتی ہوں یہاں۔“ اس نے چھوٹی سی منہ پھلایا۔ منہ بنایا۔ شہری کو اس آگئی۔

”شہری بھائی! وہ ایک ہم خوش مزاج سی نظر آنے لگی۔“

”آپ کی باتیں کچھ عجیب و غریب نہیں۔“

”شہری بھائی! آپ بہت جلد انسانوں سے اکتا جاتے ہیں۔ اپنائیت سے بے لگائی پراتر آتے ہیں۔ خوش رنگ نالوں میں چبکتے چبکتے ایک دم خاموش ہو جاتے ہیں اور۔۔۔۔۔ اور یہ کہ محبت کرنے والوں کی پہچان ہی نہیں کرتے۔“

”ارے۔۔۔۔۔ یہ کیا الزامات کی اتنی بھرمار بھی ہم تو اپنی صفائی دیتے دیتے پورے ہو جائیں گے۔“  
”نہیں ایسا تو نہیں کاس کا سبب آپ یہ خوبصورت بلکہ عالی شان گھر ہو۔ آپ کا لہجا جو ذرا بڑا نہیں ہو۔ آپ کی زبان انشیت ہو۔ آپ کو ان سب سے دل کراس قدر بے نیاز بنا دیا ہے۔“



شیر کے چہرے پر تار یک سائے لہرائے گئے۔

”تمہیں ماورا۔ میں ایسا نہیں ہوں۔ ہرگز نہیں۔ یہ چیزیں فخر کے لائق کب ہوتی ہیں۔ یہ تو سب عارضی سہارے ہیں۔ فخر کے لائق تو محبتیں ہوتی ہیں۔ سدرہ آ پاندہ ہوتیں۔ افتخار بھائی نہ ہوتے۔ تم جیسی پیاری پیاری گزریات ہوتی تو میں کب ہوتا یہاں۔ کب لوٹا پاکستان۔ تم سب کے پیار نے مجھے سمجھنا سیکھا ہے۔ فخر کے لائق تو تم سب کی ذات ہے۔ شاید میں اتنی ساری محبتیں پا کر مغرور ہو گیا ہوں۔“

”یونہی اچھی تو خاندان کے چنے جانے پر خود ناشتا ہمارے ہیں۔ آپ کو ہمارا کوئی خیال نہیں۔ چاہیے ہم نہیں بولتے آپ سے۔“

”ماورا۔“

وہ انہیں گلہ بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی کچن سے نکل گئی۔ یہ پیچھے لپکے۔

”ماورا۔ بے بی۔۔۔۔۔ رکو تو سنبھالو۔“ لیکن وہ کب رکنے والی تھی۔ بڑھتی ہی چلی گئی۔

”ماورا۔ دک جاؤ۔“

انہوں نے زور سے پکارا۔ لیکن وہ گیٹ پار کر گئی۔

شیر اس کے تعاقب میں پہلے اور میزنگ پار کر کے سامنے کے گھر کے گیٹ میں داخل ہو گئے۔ ان سے چند قدم آگے وہ کھٹ کھٹ کرتی پٹا جا رہی تھی۔ سیدھی ڈرائیونگ روم میں داخل ہو گئی۔ شیر بھی اس کے پیچھے پیچھے داخل ہوئے۔

منہ بچلائے ہوئے اس نے قبر بھری نظران پر ڈالی۔ چودہ سالہ ذرا انہیں بہت عزیز تھی۔

”افتخار بھائی! اپنی بیٹی کو دیکھیے۔ اس کو مات کرنے لگی ہے۔ قد بہت میں۔ لیکن مزاج بھی کچھ کا سا ہے۔ روٹھ کر چلی آئی۔“ مسپینٹ گاڈن پر اچھرنے والے سیدھے۔ چھری ہاتھ میں لیے شیر ڈرائیونگ روم کے دروازے میں کھڑے تھے۔

سدرہ آ پانڈھی آگئی۔ افتخار نے بھی ون کا غبار نکالا۔

”اور خود کو دیکھا ہے تم کیا لگ رہے ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں۔ اس گھر کو گھر نہیں سمجھتے۔ چارے کونسا وقت تھا۔ جب تمہیں الگ گھر لینے کا مشورہ دیا۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ تم ہم سے بے گانہ ہو جاؤ۔ ماورا کا قصہ بجا ہے۔ ناشتا تمہارے افتخار میں ٹھنڈا ہو گیا۔ تم وہاں ناشتا نہ رہتے تھے۔ ناشتا وہاں کب سے۔ سدرہ نے تمہاری پسند کے قیمہ بھرے پرائیوٹ بنائے ہیں صبح۔ آئندہ سے صبح کروں گا۔ کیا ضرورت ہے رزق منانے کرنے کی۔ تمہارے پاس تو بہت کچھ ہے۔ بہت بڑے برنس مین ہو کیا ضرورت ہے تمہیں کسی چیز کی۔ لے لینا کہیں سے کھیتیں بھی گر کیتی بل جائیں۔ ہم بھی رہ لیں گے۔ تمہارے بغیر۔۔۔۔۔“

”چھوڑو یہ افتخار کسی نہ کسی طرح آ تو گیا ہے نا۔ چلو اب بیٹھو شی۔۔۔۔۔ آج صبح ہم سب کو تمہاری عادت سی ہو گئی ہے۔ آخر اتنے سالوں کا ساتھ ہے۔ صرف پانچ سال ہی کیوں۔ عباس گھر میں آئے تھے جب تم تیرہ چودہ سالہ لڑکے ہی تھے۔ اس وقت میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ جب عدی کی اور تمہاری دوستی ہوئی۔ افی۔۔۔۔۔ یہ تو میرا بہت اچھا بھائی تھا شی۔ چنانچہ لینڈ روڈ تو سدا اس کے قینے میں رہتی۔۔۔۔۔ کہیں جان بوشی اور لینڈ روڈ تیار عدی کا بچو شروع سے کام چور تھا۔ تم لندن چنے گئے۔ ماورا پیدا ہوئی۔ وہاں ہوتی وہی اور شی کے ہاتھ لگ گئی۔ ہاسٹل سے بھاگ آتا۔ ماورا کو گھما تار جتا۔ اس سے کھیتا رہتا۔ شی نے تو ایک اچھی آبا کا کام دیا۔ ماورا اس کی عادی ہو

تھی۔ ایک رات بارہ ایک بجے بچہ لحد ہو گئی۔ چاہے چارے شی کو ہاسٹل سے خود چلے لائے۔ اور تب کہیں چلے گئے۔

”دھت تیری کی اور اب روٹھی ہوئی ہے۔ دیکھو گا۔ کتنی دیر روٹھی رہتی ہے۔ کر لو تا صلح۔“ شیر قدرے جھکے۔

”پہلے آپ وعدہ کریں۔ آپ بھی اپنے گھر پر کھانا نہیں کھائیں گے۔“ ذہرمان سے کہہ رہی تھی۔

”بیٹے! وہ خانسا ماں مفت کی خواہ لیتا رہے گا کیا۔“

”یہ بتا رہے۔ میرے پیارے ہو دیں گے۔“ وہ ناز سے بولی۔

”بیٹی! کب تک کا وعدہ لوگی۔ تھوڑے عرصے میں تمہاری ماں آ جائیں گی۔ تب تو وہ ہی پکا کے کھلایا کریں گی۔“ سدرہ نے کہا۔

”ماں کے لیے بھی اس گھر میں کھانا پک جایا کرے گا۔ بس آپ وعدہ کرنا آئندہ آپ نے وعدہ توڑا تو نہیں ہتی نہیں بولوں گی آپ سے۔“

”لیجئے افتخار بھائی سارے بوجھ آپ پر ہی ہیں۔ جتنی بات سچ ہے کہ بچے دو دھیال کی نسبت تمہیال سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ ماموں کا کتنا خیال ہے بچی کو۔ سن لیجئے آج سے کھانا بھی آپ کے ڈسہ اور خانسا ماں کی خواہ بھی۔ ورنہ بیٹی کی بول چال ہم سے بند ہو جائے گی۔“

”نیرودہ مائینڈ۔ یہ یاں حاسی عزیز شے ہوتی ہیں۔ اور سارے۔۔۔۔۔ ان کی تو بات ہی کیا پھر بیٹی کا بچھم تو ان سب سے بڑا کہ۔“ افتخار شوخی سے بولے۔ سدرہ سرخ ہو گئیں۔ ماورا نے فخر سے اپنے باپ کو دیکھا۔ اور شیر کرسی پر ٹپ گئے۔

”لائیے کہاں ہیں وہ مشہور زمانہ قیمہ بھرے پرائیوٹ۔ منہ میں پانی بھرا آیا ہے۔“

سدرہ نے ڈش آگے بڑھا دی۔ ماورا نے ایک پرائیوٹ پٹی پلیٹ میں رکھا۔ افتخار کے ہاتھ بھی آگے بڑھے۔

☆☆☆☆☆☆

ناشتا کرتے ہی وہ گھر کو بھاگے۔ ملازمہ پورے گھر کی صفائی کر چکی تھی۔ شاید ڈرائیونگ روم کی جھاڑ پونچھ کر دی تھی۔ آج وہ جلدی میں تھی۔ بچے کو ہاسٹل لے جانا تھا۔ ورنہ صفائی سدرہ اپنی مگرانی میں کر داتی تھیں۔ شیر وہ اب گاہ میں آئے تمام چیزیں اپنے اپنے ٹھکانے پر تھیں۔ وہ ڈرائیونگ روم میں داخل ہوئے۔ وارڈ روپ ڈالی۔ آج کے لیے لباس نکالا۔ میچنگ ہائی لڈ مال اور جوڑے منتخب کرنے میں تھوڑا سا وقت لگا۔ تیار ہوئے۔ باہر آئے گاڑی کے قریب فسطیہ کھڑی تھی۔

”بابے مسٹر شیر بھائی۔“

”ادہ فسطیہ! باؤ آ رہو؟ آج صبح صبح قدم رنج فرمایا ہے۔ خیریت؟“

”خیریت بھی اور ضرورت بھی۔“ وہ مسکرائی۔

”آج گاڑی نے سب سے زبردستی پر جواب دے دیا۔ کالج سے لیٹ ہو رہی ہوں۔ سدرہ ماں نے بتایا کہ آپ ابھی تک لبر ہیں۔ اس سے سوچا صبح کسی ذرا نیوٹری نسبت آپ کی رفاقت خاصی دل خوش کن رہے گی۔“

ہوا۔ ورنہ آپ کو کسی ڈرامہ کی رفاقت کا پورا پورا پھانسا پڑتا۔ چلیے تشریف لے آئیے گاڑی میں۔ میں ایک منٹ میں آیا۔ انہوں نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ فسطیہ کھڑی رہی۔

”گاڑی میں بیٹھ جانے سے پہلے بہتر نہیں کہ آپ کے اس خوب صورت لان کا نظارہ کیا جائے۔ اتنی دیر.....“ اس نے لان کو تھمید کی نگاہوں سے دیکھا۔

”جیسی آپ کی مرضی۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔“

وہ پھر اندر چلے گئے۔ کچھ ضروری کاغذات بھول گئے تھے۔ لے کر واپس آ گئے۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے باہر کھڑی فسطیہ سے بولے۔

”اگر آپ کو کچھ دیر ہو تو ایک دو ضروری کام پٹیا کر آپ کو پک کر لوں گا۔“ وہ ہنسی بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ فسطیہ ہنستی ہوئی دوسری طرف سے گاڑی میں آئی۔ اس نے اپنی جینپ مٹائی۔

”لان بے شک خوب صورت ہے لیکن اتنا بھی نہیں کہ بندہ گم ہو کر رہ جائے۔“

”نوازش ہے آپ کی۔“ شہیر نے سر کو قدر سے خم کیا۔

فسطیہ کو پھر جیسی آگئی۔

”یہ نوازشات کس سلسلے میں۔ اتنے احترام سے شکر گزار ہورے ہیں۔ گویا.....“

”بھئی آپ نے لان کو خوب صورت کہا اور صرف اسی میں چند لمحوں کے طور ہیں۔ یہ اعزاز کافی ہے شکر یہ ڈیو ہو گیا تھا۔“

”ویسے شہیر صاحب ایہ شوق باغبانی آپ کا ہے یا آپ کے کسی ملازم کا؟“

”آپ کس کا لگا؟“

”..... پھولوں کے رنگوں کا حسین امتزاج کسی خاص بندے کی نشاندہی کرتا ہے۔ شاید وہ آپ ہی ہوں۔“

”حقیقت تو یہ ہے کہ مصروف زندگی سے بہت ساری گھڑیاں جھین کر ہم نے یہ لان آباد کیا۔ مشورے سدرہ آپا کے بھی ہیں بلکہ بہت زیادہ ہیں۔ پھولوں کی اقسام کی فہرست وہ پکڑائی تھیں۔ ہم لاتے گئے۔ رنگ انہیں معلوم تھے۔ ترتیب ہم نے دیے اور یہ بیرونی دیوار کے ساتھ لگی ساری پھلیں انہوں نے باہر سے گھر کو دلکش بنا رکھا ہے۔ یہ تو کھینٹا ہمارا ہی انتخاب ہیں۔“

”گاڑی“ فطیہ گیٹ سے باہر نکلی۔ اس کا رخ دیکھ کر پٹیا کی طرف تھا۔

”رات آپ ہماری طرف آنے ہی نہیں۔ مراد بھائی آپ کو یاد کر رہے تھے۔“

”رات کافی دیر سے گھر لوٹا۔ بارہویں ایجنٹ کی میٹنگ تھی۔ ڈنکا اہتمام کہانہ میں تھا۔ بس سب شپ کرتے رہے ہوگی۔ بدلتا تو ضرور۔ صبح آگے بھی دیر سے نکلی۔ مارے شرم سے آپا کی طرف بھی نہیں گیا۔ ناشنا خود بنانے لگا تھا۔ ماہر آگئی۔ کپڑے ساتھ لے گئی۔ بس ابھی تیار ہوا ہوں۔“

”ابھی جو ایک پری رو حید کو پہلو میں بٹھانے شہر کی سڑکوں پر مزہشت کر رہے تھے۔ کیا تاثیر کا سبب اس کی انت نہ تھی۔“

”ابھی جو ایک پری رو حید کو پہلو میں بٹھانے شہر کی سڑکوں پر مزہشت کر رہے تھے۔ کیا تاثیر کا سبب اس کی انت نہ تھی۔“

”ابھی جو ایک پری رو حید کو پہلو میں بٹھانے شہر کی سڑکوں پر مزہشت کر رہے تھے۔ کیا تاثیر کا سبب اس کی انت نہ تھی۔“

”ابھی جو ایک پری رو حید کو پہلو میں بٹھانے شہر کی سڑکوں پر مزہشت کر رہے تھے۔ کیا تاثیر کا سبب اس کی انت نہ تھی۔“

”ابھی جو ایک پری رو حید کو پہلو میں بٹھانے شہر کی سڑکوں پر مزہشت کر رہے تھے۔ کیا تاثیر کا سبب اس کی انت نہ تھی۔“

”ابھی جو ایک پری رو حید کو پہلو میں بٹھانے شہر کی سڑکوں پر مزہشت کر رہے تھے۔ کیا تاثیر کا سبب اس کی انت نہ تھی۔“

”ابھی جو ایک پری رو حید کو پہلو میں بٹھانے شہر کی سڑکوں پر مزہشت کر رہے تھے۔ کیا تاثیر کا سبب اس کی انت نہ تھی۔“

”ابھی جو ایک پری رو حید کو پہلو میں بٹھانے شہر کی سڑکوں پر مزہشت کر رہے تھے۔ کیا تاثیر کا سبب اس کی انت نہ تھی۔“

”میں کالج کی نہیں آپ کے گھر کی بات کر رہی ہوں۔“

شہیر مسکرائے۔

”گھر میں کس بات کی دیر؟“

”گھر میں ایک اہم ہستی کی آمد میں دیر کی بات کر رہی تھی۔“

”یہ تو خدایا بہتر جانتا ہے لیکن بندہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ کہہ سکتا ہے۔“

”کیا کہے کیا کرے۔“

”بندے کو چاہیے کہ وہ سدرہ نازی سے دست بردار ہو کر اسے ایک حد و حیثیت کی ضرورت ہے اور سب جناب میں سدرہ نازی کچھ تصویریں جہاں جسم حسینا میں اس کے سامنے لائیں تو وہ ان میں سے ایک کو منتخب کرے۔ مہرا اللہ لگا دے گا۔ منظور کی۔ اور اس بات کی کینل پیدا ہو جائے گی کہ آپ قضا نمازیں پڑھنے سے بچ جائیں۔ کوئی ہو جو آپ کو کسی مائٹ بھیل پر چلا سکے۔“

شہیر اس اعجاز بیان پر ہنسے بغیر نہ رو سکے۔

”فسطیہ! آپ واقعی اردو کی شہکار ہیں۔ مجھے یہ سب باتیں کابلقین آیا ہے۔“

”شکر یہ۔ ورنہ آپ تو مجھے ایک بونٹی کی طالبہ کے سوا کچھ مانتے ہی نہیں۔“

کالج آ گیا۔ شہیر نے گاڑی روکی۔

”ضرورت محسوس کریں تو لینے آ جاؤں۔“

”نہیں نہیں۔ واقعی میں وہ ساری شہر کو ٹیکڑا ساتھ ہوں گی اور خواہ مخواہ میں پورڈ لگا دیں گی آپ کے نام کا۔“ وہ تراسی بولتی تھی۔ منہ پر بات کہنے والی۔ شہیر جینپ سے گئے۔ آگے کچھ نہ کہہ سکے۔ وہ خدا حافظ کہتی ہوئی اندر کو جانے لگی۔

☆☆☆☆☆☆

بارہویں ایجنٹ کے آفس میں سارے عہدیدار جمع تھے۔ جب وہ اندر داخل ہوئے۔

”آؤیار..... بڑی دیر کر دی..... کئی دیر سے انتظار ہو رہا ہے تمہارا۔“

”چارے کب تک یوں ڈانٹاؤں اور زعمی گزارتے رہو گے۔ مجال ہے جو کبھی وقت پر پہنچے ہو۔“

”دعاؤ صفت ایک دن کی تاخیر سارے دنوں کے نام تو نہ لگاؤ۔ رات تیز بھی بہت دیر میں آئی۔ صبح تاخیر سے جاؤ اور یہاں دیر سے پہنچا۔“

”ارے..... اتنا سفید جھوٹ اور وہ بھی ڈھٹائی ہے۔“ دروازے کا پردہ ہٹا کر فخر و ہیں کھڑے کھڑے ان نے مخاطب تھے۔

”نیا مطلب؟“

”ابھی جو ایک پری رو حید کو پہلو میں بٹھانے شہر کی سڑکوں پر مزہشت کر رہے تھے۔ کیا تاثیر کا سبب اس کی انت نہ تھی۔“

”ابھی جو ایک پری رو حید کو پہلو میں بٹھانے شہر کی سڑکوں پر مزہشت کر رہے تھے۔ کیا تاثیر کا سبب اس کی انت نہ تھی۔“

”ابھی جو ایک پری رو حید کو پہلو میں بٹھانے شہر کی سڑکوں پر مزہشت کر رہے تھے۔ کیا تاثیر کا سبب اس کی انت نہ تھی۔“

کچھ زیادہ ہی شوخ بہتر رہتے۔  
 "یادے پر بیڑگا نڈر آتے تھے۔ اب راز کھلا..... لڑکیوں کو گاڑیوں میں بٹھا کر گھماتے ہو۔ چور کہیں کے۔"  
 ہم خواہ مخواہ ہی تمہاری تجازی زندگی پر ترس کھاتے رہے۔"  
 پرویز فاروقی نے آنکھیں دکھائیں۔  
 "یار چھو اس بندہ بے کسی کی بھی تو سٹو اپنی کہہ جاؤ گے۔"  
 "کیو..... کیو..... جھوٹ کیو..... اپنی صفائی دو۔"  
 "یار! وہ افکار بھائی کی بھانجی تھی۔ فسطیح بخاری 'مراہ بخاری کی بہن۔ گاڑی نواب ہو گئی تھی اس کی۔ میر۔  
 باجی آئی۔"  
 یازم لوگ تو بات کا بھنگو بنانے میں ماہر ہو۔ آخر پتوں کیل جو خمیرے۔"  
 "یار وہ بونی ہیں ہوں یار لوگ تو اسے اسی تڑا دیے۔ سے ہی ہمیں گے۔"  
 "تسین بخارا میں نے بھی کسی کو اس نظریے سے نہیں دیکھا۔"  
 "اور اتنی لیے ٹیشن بھی کر رہا ہے مائی ڈیئر شہیر شاہواز شکاری۔ فارگا ڈیک کسی کو اس نگاہ سے دیکھ لو۔ ملک و تو  
 کا بھانجیاں اس میں ہے۔"  
 "ویسے میرا خیال ہے مسز آصف مصطفیٰ ہم..... کسی اور مقصد کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔" ظفر۔  
 "موضوع کو خود ہی بدل دیا۔"  
 "ہاں یار واقعی....."  
 "آج اس ایسوسی ایشن کے اجلاس میں ایک تہہ راد پیش کی جانی تھی جس کی مدد سے بار ایسوسی ایشن ایکشن۔  
 لیے دکلاہ و رادری کی طرف سے کچھ امدادیں کے نام دینا چاہتی تھی۔"  
 "مگر کیا سوچا تم نے شہیر شکاری..... میرا خیال ہے۔ حتیٰ فیصلہ کری لو۔ سب ٹی کوشش یہی رہی۔ اسے ہے  
 تمہیں ایشن میں حصہ لینا چاہیے۔"  
 "شہیر سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔"  
 "دیکھو یار! تم ہر طرح سے ان بات کے اہل ہو۔ ملک کو عزم و ہمت اور جوانوں کو ہنگامی۔ نیا خون، سنبھلاؤ اور  
 بھائی اور لڑکے جو ان قیادت کی ضرورت ہے۔ تم اس عہدے کے لیے ڈی زورہ کرنے ہو۔ ہم سب تمہارا بھر  
 ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ اور ہمارے ساتھی شہیر کے ہر علاقے میں کچھ نہ کچھ اثر و رسوخ اور انھیں شہرت رکھتے ہر  
 سب سے بڑی بات جو تمہارے حق میں جاتی ہے۔ وہ تمہارا ماضی قریب کا کردار ہے۔ تم ایک مشہور لیڈر رہے  
 طلباء یونین کے..... اور تم نے یونیورسٹی سے فراغت پانے کے بعد جو کارکردگی دکھائی تو جوان لیڈر کے طور  
 اچھے۔ انسانی حقوق کی خاطر جنگ لڑی۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہاری ناکا  
 تھی۔ اور حقیقت وہ تمہاری شخصیت کا ایک اعلیٰ درجہ تھا۔ اس نے لوگوں کے دلوں پر تمہاری پامردی اور توجہ  
 کے اثرات چھوڑے۔ اب تمہارا احترام کرتے ہیں۔ تم اسی حوالے سے لوگوں کو یاد ہو۔ تمہاری شعلہ بیانی  
 ایک گویا رہے۔ آج بھی محسوس کرتے ہیں کہ تم ان کی آواز ملک کے قابل احترام جوانوں میں پہنچانے کے  
 بواہر ایسا انداز تھی۔ چھ سال باہر نزارنے پر ملک سے وطن کی سنی سے رشتہ نہیں ڈاٹا نا۔ تمہارا  
 خیالات تو ہمیں بدلے۔"

... یا ابھی کچھ اور بھی کہتا ہے جناب کو۔" شہیر سستے۔  
 "ات کچھ کہتا ہے مگر لوگوں کے سامنے۔ تمہارے سامنے یہ تو میں رہی رہا تھا۔" پرویز فاروقی نے  
 اتے ہوئے وضاحت کی۔  
 "یار وہ دن وہ لمحے ان دنوں کی تلخی، لہجوں کی اذیت ناک طوالت ہر چیز مجھے یاد ہے۔ آج  
 دن نہتا ہوں تو مجھے ہنسی آتی ہے۔ اپنی نادانوں پر۔ چلا تھا میں بگڑی قلندریں سنوارنے سے سجا بننے لوگوں  
 انار کی پاسداری کرنے۔ کیا ملا مجھے..... صرف سچی..... تمہاری..... بے بسی..... قید کی صعوبتیں، مفلسی کا قہر  
 اور انہوں کی نفرت..... یار مجھے اس خارزار میں نہ گھسیٹو تو یہ مجھ پر ایک احسان ہوگا۔ ایک مدت کی  
 ان کے بعد تھوڑا سا سکون مل پایا ہے مجھے..... کیا چاہتے ہو یہ سکون بھر مجھ سے چھین جائے۔ بھر کہیں بس  
 بس دکھل دیا جاؤں۔ پھر کسی جنیل کا کوئی اجس زود کرہ میرا ساتھی بن جائے۔ پھر میری پہچان کھو جائے۔  
 بہت زیادہ کسی کو یاد رکھتے ہیں بھلا۔ کون آتا ہے کسی کی مدد کو۔ جلسے جلوسوں میں نعرے لگانے والے تو بہت  
 ہوتے۔ ہاتھ مل جاتے ہیں۔ لیکن کسی عتاب زدہ سے ملنے کوئی نہیں آتا۔"  
 "شہیر..... تمہاری یہ سوچ غلط ہے۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ قدم قدم وقت دار رہیں گے اور تمہیں خبر  
 دے دوں گے۔ عوام میں بھی سوجھ بوجھ پیدا کر دی ہے۔ اچھے اور برے کی پہچان سب کو ہے۔ لوگ اپنی  
 سوچ سمجھ کر کسی کے حق میں دے رہے ہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھیں بند کیے کسی کے پیچھے چل پڑے۔ ہم بھی پر  
 قیادت چاہتے ہیں۔ اب ان تک پہنچنے والا ہر کون اپنے علاقے کے عوام کی آواز ہوتا ہے اور ہم سب یہ دیکھتے  
 ہمارے قول اور عمل میں کتنی مماثلت ہے۔ تمہاری زندگی میں سچائی کا کس حد تک دخل ہے اور اگر یہ رکینیت  
 میں کوئی خناس نہیں بھرتا۔ اور آوی آسمانوں کی طرف پرواز کرنا شروع نہیں کر دیتا تو ہمیں بھروسہ  
 کہ تم یہ حقیقت ایک لیڈر کی ذمہ داریاں بھی ضرور نباہ سکو گے۔"  
 "یار میں ایک بار پھر دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ مجھے زمین پر ہی رہنے دو بلکہ صحیح کہوں تو یہ ہے کہ زمین میں  
 رہنے دو۔ میں تو بس اتفاق باہر ہوں کہ دنیا کی رونقیں دیکھ رہا ہوں۔ میں تو اتنا مختار بھی نہیں ہوں کہ ان  
 میں حق و باطل پر حصہ لے سکوں تم مجھے آسمانوں کی راہ دکھا رہے ہو۔ میں اس قابل نہیں ہوں یار....."  
 "تم اس قابل ہو..... کس قابل نہیں ہو اس کا فیصلہ ہمیں کرنا ہے۔ شام کی میٹنگ میں یہ تجویز پاس ہوتے ہی  
 کے کاغذات مزاحمتی داخل کرادیں گے۔ اور..... بس....."  
 "اب سے ایک ساتھ ہاتھ بند کر دیے۔ کچھ کہنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی۔"  
 \* \* \* \* \*  
 "ابے ابو کی ہم۔ یہ تو نے پھر سیاست کی گنڈن پنے اور پھیلانی۔ سنا ہے انتخابات میں حصہ لینے لگا۔ باز  
 ہذا آ جا۔ لگتا ہے وہ انجام تجھے قبول کیا ہے جس سے تمہارے دم دبا کے بھاگا تھا۔ اور چاہتی تھی سرد ہوا پا  
 میں۔ اور تو کرم بھڑبھڑا کا کہ تیرے حال پر اس کی مہربانی ہوگی اور تو انسان بن گیا۔ اور نہ..... تیری  
 انی نقل بخلی ہو تم کہ وہ کہ میں نے جو سنا ہے غلط سنا ہے۔ کسی دشمن نے سنے ہو کی اڑائی ہے۔"  
 "مائی یہ سب پر پنا نہیں۔ اصلی خبر ہے۔ بالکل اسی اور اس کی ذمہ داری میرے ولیک پر ہے۔ جو بار ایسوسی  
 ایشن کے عہدہ دار ہیں۔ آج شام تجویز پاس ہوگی۔ کل فرشتوں کے ٹکھے پر ہم نا حق پکڑے جانے والے ہیں۔"





”بس دم گھٹ گیا تھا..... بعد ہوئی بولتی۔ یار یہ کوئی اتنا ٹوٹا ک موضوع تو نہیں کہ تو مارے ڈار کے کچھ بول بھی نہ سکے۔ خاصے حسین درخشاں لکھات اس ذکر سے وابستہ ہیں۔ اور تو بے کہت میں کھنگھنیاں ڈال لیتا ہے۔ اب اتنا بچہ بھی نہیں ہے۔ اکتیس برس کا ہو گیا ہے۔ یہ عمر میں شادی کی عمر ہے اور کیا تب کرے گا شادی جب منہ میں ایک دانہ نہ ہوگا۔ اب تو شہر کی کچھ نہ کچھ لالیاں تیری پر سنا لئی سے امپر لیں ہو سکتی ہیں۔ دس سال بعد ایک بھی تو نہ پوچھیں گی۔“

”عدنی! یہ میرا نہیں آپ کا مسئلہ ہے۔“ وہ گہرے لہجے میں کہنے لگے۔  
 ”اور تیرا مسئلہ صرف سیاست کے بھٹے میں ٹانگ اڑانا ہے۔“

”نہیں بابا۔ تمہیں خبر ہے میرا کس کجی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں۔ میرے ووٹ میری ذاتی قابلیت، کردار اور اخلاق کے پیش نظر میرے ہوں گے۔ اس میں عدنی! میرے دل کے زخم پکار پکار کر کہہ رہے ہیں۔ مجھے کچھ کرنے کا کچھ بننے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ دولت بہت بڑی قوت ہے عدنی! دولت نے اسے میرے پاس بے حساب طریقے سے لا ڈالا ہے۔ مجھے دولت کے سارے فوائد سے فیض یاب ہونے دو عدنی۔ وہ آنسو میری اپنی ذات پر قرض ہیں۔ جو میں نے بے سرو سامانی تنہائی اور بے لگی کے عالم میں دیتا ہے چھپ کر بہائے۔ کل میں صرف ایک پر جوش جوان تھا۔ لاہالی بھی اور زمانے کی چیز دوستیوں سے نا آشنا بھی۔ آج زمانہ شہساز ہوں۔ میں چونکا دینا چاہتا ہوں عدنی! ان سب کو۔ ہاں ہاں عدنی! ان سب کو جنہوں نے ایک دن مجھ سے سب تاتے توڑ لیے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے عدنی! جنہیں مجھ سے محبت کا بھونکا تھا۔ ایک دن وہ بھی بے گانے بن بیٹھے تھے۔ میں ان سب کو دکھانا چاہتا ہوں۔ انسانوں کے ساتھ چھوڑ جانے سے کیا ہوتا ہے۔ خدا کی رحمت ساتھ نہ چھوڑے۔ سختیاں منانے کے لیے نہیں حوصلہ جتنے کے لیے آتی ہیں۔ تم بھی دعا کرنا عدنی..... دعا کرنا۔ میں وہ سب کچھ پالوں..... جو میرا مطمح نظر نہ ہوتے ہوئے بھی ہے۔ تمہیں خبر ہے تا..... میرے حلقے میں ہمارا اپنا علاقہ بھی ہے اور..... اور..... تم دیکھنا میری کامیابی میں ان غریبوں کا ہاتھ سب سے زیادہ ہوگا جن کے ساتھ میرے ماضی کا کچھ حصہ وابستہ رہا۔“

سردرد آ پا اچھ چاب چاب کھڑی شہیر کی باتیں سن رہی تھیں۔ ان کی نم آنکھوں نے سردرد آپا کے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ انہوں نے اپنا آنکھ شہیر کی طرف بوجھا کر ان کے نیچے گرتے آنسو اس میں سولے۔  
 ”اچھا خدا حافظ عدنی۔“ وہ جذباتی ہو چلے تھے۔  
 ”شعی!“

رہسپور رکھ کے وہ سردرد آپا کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔

”شعی! اب اگر تم نے بھی وہ تکلیف دہ ڈاکر کیا تو یا اور کھانا میں اس گھر میں آنا چھوڑ دوں گی۔“

”آپا.....“ شہیر نے ان کے ہاتھ تمام کے آنکھوں سے نکال لیے۔ ”آپا..... آپ نے وہ سب پیار مجھے دے ڈالے جن کے لیے میں ایک عمر ترستا رہا۔ آپ میری ماں بھی ہیں اور بہن بھی..... میری زندگی کی عمارت آپ کی شفقت کے سہارے تو کھڑی ہے۔ آپ نہیں بدشئی۔ آپ نہیں آئیں گی۔ شعی کیسے جیے گا۔ آپ بچہ ہے جس پر سب کا ہونہار کی معنہ ہنس کا مستحضر رہا ہوں۔ کتنا مان بھجھے آپ سب کی محبتوں کا..... آپ نے جو بچہ دیا۔ اس کی توقع تو خونی رشتوں سے بھی نہیں کی جاسکتی۔ آپ نے تو عدنی کی دوستی کا بھرم بھنا یا ہے۔ صرف بھرم۔“ وہ

لے آئے۔

”ایک دم بچھے ہوئے تم سے تو ہم سب کے دل مل گئے۔ تمہیں خبر ہے نا ڈیڑی تمہیں کتنا عزیز رکھتے ہیں۔ آج مجھ سے۔ نئی انہوں نے بات کی..... چند دنوں میں آ رہے ہیں وہ۔ اپنے بڑھاپے اور ہائی ہلڈ پریشن کے باوجود ہمارے لیے ہم چلائیں گے عدنی تو تمہارا جگر ہی دوست ہے شعی اور تم دونوں میں مذاق تو چلتا ہی رہتا ہے۔“  
 ”نہیں یاد ہے۔ کھم جیل میں جب تم قانون کے کھل پہرے میں تھے۔ وہ ہر دو بار تو ذکر تم تک پہنچ جاتا تھا۔ پاپا ناتے ہیں۔ تمہاری رہائی کے لیے انہوں نے دن رات ایک کروڑے کی دن رات تمہارے لیے سزا سنی کی سائیں مانگی تھیں۔ تم ہم سب کو عزیز ہو شعی۔ عدنی کی طرح..... میں تے سدا یہ جانا ہے..... کہ عدنی! کھنکھن بھائی نہیں تم بھی میرے بھائی ہو۔“

شہیر نے ان کے ہاتھ تھامے ان کی طرف دیکھا۔

”شعی! کیا انسانوں کے لیے اتنا کافی نہیں ہوتا کہ اس دنیا میں چند ایک لوگ اسے دل سے چاہتے ہیں۔“  
 ”بھی انہیں زیادہ پیار آتا وہ انہیں شعی کہتی تھیں۔“  
 ”کیا عہد و پیمانہ ہوتا ہے ہیں عہد؟“ ماورا جانے کہاں سے دے پاؤں آگئی تھی۔

”آئیے آپ بھی شریک ہو جائیے..... ارنے۔ ساتھ میں فلسفہ بھی۔ آپا..... ایک تو میں ان دنوں شہر کی لڑکیوں سے حد سے زیادہ تنگ ہوں۔ جب بھی چیزیں بگاڑنے کو دل چاہا ادھر چلی آئیں۔ اب کرنا ہوگا کھنکھن کوئی ناکام تجربہ۔“

”اللہ شہیر بھائی آپ تو کیا ہیں بچے۔ آپ کو کیسے خبر ہوئی۔ بھی فلسفہ باتی نے خواہمیں کے ایک میگزین میں ایک زیر دست قسم کی ڈش کی ترکیب پڑھی ہے۔ میں نے سوچا..... آپ کے ہاں بنالی جائے۔ آپ کا بھی ہمارا ہو جائے گا۔“ ماورا نے رسالہ پیچھے کر کے چھپایا ہوا تھا۔  
 ”بچے سردہ آئی! اب آپ خود ہی ملاحظہ فرمائیے۔ کچن میں نہیں یہ لڑکیاں اتنی گندا کیا کرتی ہیں اور آپ مفت میں میرا اور میرے دوستوں کا نام لگا رہتی ہیں۔“

”آپ بچے چٹل خود بھی ہیں۔ نہیں بتائیں گے۔ اب یہاں کوئی چیز بنے تو نہ آپ کھا میں گے۔ اس وقت تو اسے لے لے کے کھاتے ہیں۔ بھی ماورا غضب کی بنا ہی ہے یہ ڈش۔ سردرد آپا تو قیامت تک بکاتی رہیں تو ان دن بھائیں۔“ دورانہ بنانے کے جاری تھی۔ فلسفہ ہی دبانے ایک طرف کھڑی تھی۔ شہیر منہ کھولے اسے نیسے جا رہے تھے۔

”یہ بھوت ہے آپا! ایک دم بھوت۔ میں تو صرف تعریف کرتا ہوں۔ آپ کے پکائے کھانے کی کیا بات..... اور کیو! جا کر چن کا حشر خراب کرو لیکن ہم میں بظلمت ایسا نہ کرو۔“

”وہ دن کی طرف بڑھ گئیں۔ شہیر اور سردرد آپا تنگ رہے اس آگے ہی میں خوش باش نظر آنے لگے۔ یہ شہیر کی ایک اضافی خوبی تھی۔“

”آپا! کل میں شہسے اور نہ چھائی والے کھنکھن لایا تھا۔ فرصت ہو تو وہ سلوا کر تہ حواد جیسے گا۔ نوم کے کھنکھن بھی لے لیا تھا وہ یہ دیکھیے یہ سونہ بیک ور کیسے ہیں؟ یہ بھی مل گئے ہیں۔ من سے خوب صورت ہیں۔ لے لیے اور آتے ہی لے لے دیے۔ ارے ہاں یہ کھنکھن کی باسکٹ تو آپ نے دیکھی نہیں۔ ایک دوست لایا ہے جاپان سے۔ یہ ایک بھل کے لیے مناسب رہے گی۔ ہے تا سردرد آپا ایسا ہی کی تو بہتات ہے گھر میں۔ روزانہ تازہ گلہ سدا جا



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریٹریوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

دیا کرے گا مانی اس میں..... اور..... وہ دیکھیے وہ جو سپیوں سے بنی سنتری ہے نا۔ وہ ایک مدت سے سامان میں بند پڑی تھی۔ کل میں نے الماری کھولی تو یاد آگئی۔ ڈرل سے سوراخ کر کے کیل لگا کر میں نے خود اسے ٹانگ دیا۔ سدرہ آبی! اس کے لگانے سے ڈرامنگ روم کچھ زیادہ خوب صورت نہیں ہو گیا۔"

سدرہ آبی! کوشیر کی دائمی حالت پر شہ ہونے لگا۔ لیکن وہ ان ساری باتوں کے اندر چھپی بات اور درد سے واقف تھیں۔  
"شیر....." وہ پرورد لیکن پر خیال انداز میں مسکرائیں۔  
"شیر! اس گھر کو ایک عورت کے ہاتھوں کی ضرورت شدت کے ساتھ ہے۔ تم اسے روز بروز سامان سے بھر رہے جا رہے ہو اور سنبھالنا میرے لیے مشکل بھا جا رہا ہے۔ ویسے ایک بات ہے شیر۔ بہت سی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک خرابی ہے تم میں۔"

"خرابی۔ نہیں سدرہ آبی! کوئی خرابی نہیں۔"  
"ہاں خرابی تو خرابی وہ ہے تمہاری فضول خرچی اور زبردست قسم کی فضول خرچی۔" شیر نے قہقہہ لگایا۔  
"فضول خرچی نہیں سدرہ آبی۔ بس صرف یہ ہے کہ اپنی ذات کے لاڈ خود اٹھاتا ہوں نا۔ آپ ایک دن مر تو جانا ہے۔ کیا بہت سی حسرتوں کے ساتھ یہ حسرت بھی دل میں رہے کہ آپ گھر کو اپنی مرضی سے نہ بچا سکتے۔" شیر کے تکیے کا کھوکھلا پن سدرہ آبی سے چھپا ہی رہا۔ وہ ان کے ساتھ بیڑ روم میں بیٹلی آئی۔  
دونوں بھید قسم کی باتوں میں لگ گئے۔



دوسرے دن کا خدات نامزدگی داخل کر دیے گئے۔ دن بھر..... اسی سلسلے میں وہ عدالت سے بھی غیر حاضر رہے۔ شام ڈھنسنے گھر آئے۔ ماورا ہر آدھے کی بیڑیوں پر بیٹھی کوئی انگلیش ناول پڑھ رہی تھی۔  
"اے لڑکی! اندھیرا ہو چلا ہے۔ کیا نظر آ رہا ہے تمہیں۔"  
"آپ بخوبی نظر آ رہے ہیں شیر بھائی۔"  
"یہاں کیوں بیٹھی ہو۔"  
"آپ کے لیے ہرگز نہیں۔ چانتی ہوں آج آخری دن تھا۔"  
"کیسا آخری دن؟"  
"آپ کے ہمارا ہونے کا۔ اب تو آپ خود اپنے بھی نہد ہیں گے۔"  
"خل گرل۔ تم بہت سمجھدار ہو خرابات کیا ہے۔"  
"آپ سب کی محبتوں کا فیضان اٹھ رہے۔ اس گھر میں ایک سے ایک..... کچھ تو کچھ وار ہے۔ میں بے توجہ کیسے رہ جاتی۔"

شیر نے ایک قدم پیڑھی پر رکھتے ہوئے ماورا کے سر پر ہلکی سی چپٹ لگائی۔  
"نہ بایا نہ تم ہم سب نے استاد ہو۔ سمجھداری ہم پر محض ایک اثر نام ہے۔ رہے ہاں اس ڈش کا کیا ہوا جو شام اتنی شدت سے تیار کی جا رہی تھی۔ مجھے بڑے غضب کی بیوقوفی رہی ہے۔ ان تو شامی پائے بھی کول رہی۔"  
"ڈش....." وہ انہی تھنجر ہنجرنا کام رہ گیا۔ صوبے کی جگہ وہ تو کوئی وندنا چیز بن گئی۔ فسطیہ ہوتی تو اسے

لے دیاں سے میرا مطلب ہے لیکن کے عقیقہ دو اڑے سے بھاگ گئیں۔ میں نے اس منصوبے کو وہیں چھوڑ دیا۔  
یہیے فکر نہ کریں شیر بھائی ایک دو بار کی ناکامی کے بعد کچھ نہ کچھ بن ہی جائے گا۔"

"اے تو ٹھیک لیکن جتا تو چلے۔ لیکن میں کن کن چیزوں پر توجہ پڑھی گئی۔"  
"یہ بھی نہیں بس ایک میر سوجی ایک میر شکر۔"  
"یہ میریوں کا کیا حساب ہے بھئی۔ کلوگرام کا حساب بتاؤ۔"  
"نہیں شیر بھائی! اور سال بہت پرانا تھا۔ کلوگرام سے بچنے میں گریز ہو جاتی۔ ہاں تو ایک میر سوجی۔ ایک میر..... ایک پاؤدودہ۔ ایک پاؤدودہ سے حاصل کر دو گئی..... کچھ سیوہ جات اور بارہ ماہہ۔ انڈے۔"

"یعنی یہ سب ضائع....."  
"ہاں ہاں..... جی ہاں....." اس نے تکیے سے جواب دیا۔  
"اور ابھی دو چار مرتبہ اور ضائع کرنے کا ارادہ ہے۔"  
"آز آپ مناسب سمجھیں تو....."  
"بشت شری رہی..... اچھا..... ہاں یاد آ یا..... کل کی میٹنگ میں ہم لوگوں کو کیمرے کی ضرورت تھی۔ پرویز ما..... کو تصویریں بنانے کا کریز ہے لیکن کیمرا کہیں ملا ہی نہیں۔ یہ جو تم سامان کو ادھر ادھر کرتی رہتی ہو نا۔ تو تم انہی بچتے میں ضرور کر دیا کرو۔ میں کئی دیر یوٹیلٹی کا ڈھونڈتا رہا۔"

ماورا کا چہرہ تکی ہونے لگا۔  
"کک..... کیمرا..... شیر بھائی۔ ایک کیمرا تو ابھی..... میرا مطلب ہے کیمرا تو فسطیہ ہانسی کے پاس ہے۔ اس نے جلدی سے کہہ ڈالا۔

"فسطیہ کے پاس..... وہ کسی لیے؟"  
"ہم نے وہ تصویریں بنائی تھیں نا..... ابھی کچھ فٹوز باقی تھے۔ فسطیہ ہانسی نے اپنے دوستوں کے ساتھ فوٹو ہانسنے تھے۔ وہ کالج کے گئیں۔"  
"تم نے کس کی تصویریں بنائی تھیں۔ ماورا..... دیوانی لڑکی! بھلا تمہارے پاس تصویریں کی کی ہے۔"  
"اے شیر بھائی! آپ تو خود خواہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنی کب تصویریں بنائیں۔ میں نے میں نے تو آپ کے گھر کی تصویریں بنائی تھیں۔ وہ تو کب کی آ بھی گئیں۔ دیکھاؤں آپ کو؟"  
"اے ماورا! تم واقعی بڑی سے اتر گئی ہو۔ گھر کی تصویریں کس لیے بنائیں۔"  
"نہرے کی آگجہ خوبی بھی ڈھونڈ لاتی ہے جو آ نکھ سے ابوجھل ہوتی ہے۔ اور وہ غیب جو ہماری نگاہوں سے چھپتا ہے۔ میں نے بھی دیکھنے کی کوشش کی کہ درحقیقت ہمارے شیر بھائی کا گھر کتنا خوب صورت ہے۔"  
"ماورا.....! میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

ماورا نے مسیت تکیے لگائی۔  
"اپنا لانا کہاں ہیں وہ تصویریں؟"  
"ابھی اندر ہو جاتی۔ شیر اس کے پیچھے پیچھے گئے۔ ایک سائڈ ٹیبل سے اس نے سفید لٹاف باج ٹکا اور شیر کو لایا۔ وہ لٹاف کھول کر اس میں سے ایک تصویر نکال کر دیکھنے لگے۔  
"ماں! بروہی! کی..... تصویریں اندر کرسیوں کی..... بیڈ اور ٹیبلوں کی تصویریں..... اندر رہی اور یہ وہی وہ انڈے

کی تصویر ... لان کے رنگ پھولوں کی تصویریں ... زبردست عکاسی تھی کسی ماہر کیمرا مین کے ہاتھوں کا شاہکار۔

”اچھا تو تصویریں انسانوں کے بغیر بھی ہوتی ہیں۔“  
”آف کورس۔۔۔۔۔“

”حیران ہوں یہ دیکھ اور سن کر لیکن بائی واوے یہ بتائیں کیوں نہیں؟ کس کے لیے؟ کب اور کیسے؟“

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

”میرا خیال ہے میں نے تو بھول کر بھی ایسی امتحان خواہش کا اظہار تم لوگوں کے سامنے نہیں کیا۔ ضرورت بھی کیا تھی۔ ایک بے چارے بنا جان تھے۔ زعمہ ہوتے تو اپنا یہ کارنامہ انہیں دکھانے کو دل چاہتا۔ آخر یہ حرکت کی کس نے۔“ شہیر کو کھینچ لگی تھی۔

”میں نے ہرگز نہیں کی شہیر بھائی۔ وہ جو فلسطین باجی ہیں نا۔ انہیں ہی ایسے شوق جراتے ہیں۔“  
”فلسطین کو۔ نہیں کیا ضرورت تھی۔ نوٹہ مگر افرانے کیا سب چاہوگا۔ ان لوگوں نے دنیا میں کچھ نہیں دیکھا۔“  
”مجھے پتا نہیں شہیر بھائی۔ خیر یہ سارا کچھ تو نوٹہ مگر افرانے فلسطین باجی کے بارے میں ہی سوچا ہوگا۔ پرنٹ ہو خود نکلا کے لائی ہیں۔ ویسے نا احوال تو آپ ادھر چلے۔ آپ کو بھوک لگ رہی ہے نا۔ کسی فارغ وقت میں فلسطین باجی سے پوچھ لیجئے گا۔“ وہ دانا نظر آ رہی تھی۔ مضموم سی دانا۔  
وہ اس کے ساتھ نکل دیے۔

”ایک تو یہ ڈیوٹی بھی بڑی سخت ہے۔ چوکیداروں کی طرح برآمدے میں بیٹھے رہو اور جب آپ فوایز ادا صاحب شریف لائیں آپ کو ہمارے حضور پیش کرو۔“ بڑ بڑا ہی تھی حسب عادت۔

”اتنے حرے سے میری تھمتی کتابوں کا کبازا کر رہی تھیں ارے چوکیدار کوئی اتنے ٹھاٹھے سے بیٹھتے ہیں۔ ہاتھوں میں آفسٹ پیپر کے انگٹھس ٹانوں لے کر۔“ انہوں نے مارنے کو ہاتھ بڑھایا۔

ماہرہ کو لٹھی آگئی۔ وہ دونوں ابھی سڑک پار کر ہی رہے تھے کہ جمال احمد کی گاڑی سامنے کے گیٹ میں داخل ہونے کی مڑی۔

”ارے۔ یہ تانہ جان کہاں سے آگئے۔“ جمال احمد گاڑی سے باہر آئے تو شہیر ان تک پہنچ چکے تھے۔  
”میٹھیو ڈیرن۔ کیسے ہو بھی۔“ وہ سدائی طرح خوش بخرم اور تروتازہ لگ رہے تھے۔

”اچھا ہوں ڈیوٹی۔ آپ کیسے آگئے۔“  
”لو بھئی۔ تمہاری طرف سے ایک خوشخبری مل جانے پر بھی ہم چپکے بیٹھے رہے ہمیں تو آنا ہی تھا۔ جہاز میں سیٹ بدل سکی ہم بائی روڈ آگئے۔“

”آپ کے لیے طویل سفر مع سے ڈیوٹی۔“ انہوں نے یاد دلایا۔  
”نہیں سن۔۔۔۔۔ کیا مسخ سے اور کیا نہیں اس کی ہمیں خبر ہے۔ ہم تو اس تانہ لاتی کو بھی لا رہے تھے۔ مگر وہ ٹور پر چلا گیا۔ ہم جانتے ہیں یہ بہانہ تھا لیکن ہم اس کی مزاحمت نہ کریں گے۔“

”سدرہ آ پاشہ۔ سن کر باہر آگئیں۔“  
”ارے ڈیوٹی جان آپ؟“

”ہاں جی میں آیا ہوں۔“ انہوں نے ماہرہ کو پیار کر کے ہونے سدرہ آپا کے سلام کا جواب دیا۔

”جی۔ ارے آپ بھی ہیں۔“  
ماہرہ کے سیاہ شیشوں کے سبب کوئی انہیں دیکھ نہ پایا تھا۔ شہیر بھاگ کے ان کے آگے بچکے۔  
”آداب کی؟“

”بیٹے رہو۔ بیٹے رہو۔ بھی تمہارے ڈیوٹی کو نہیں لیکن مجھے وہ تصویریں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ سچ پوچھو تو میں انٹرن کے لیے نہیں تمہارا گھر دیکھنے آئی ہوں۔ بہت پیاری تصویریں تھیں۔ مگر تو اور بھی۔“  
”یہی تصویریں می؟“ وہ حیران کھڑے تھے۔

”اے لو۔ بھئی جو تم نے بھجوائی ہیں۔“  
”میں نے۔“ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں ہاں اپنے گھر کی۔“ می نے تھج کی۔  
”نہ نے جھٹ ماورا کی طرف دیکھا۔ اس نے صفائی دی۔“

”نہ شہیر بھائی آئی سوئٹ میں نے نہیں بھجوائیں۔“  
”تو اس نے بھجوائیں۔“ وہ سوچتے لگے۔

”ماہرہ پوچھتے ہوں جا کر اس فلسطین کی بیٹی سے۔“ شہیر کو کھینچ لیا۔  
”نیا ہوا شہی؟“ سدرہ آپا نے انہیں روکا۔

”آپا۔ آپ نے دیکھی ان ٹرکیوں کی شرارت بھانڈا گھر کی تصویریں بنا کر ڈیوٹی می تو بھجوا دیں۔“  
”تو برا کیا کیا؟ می ہی کشش کے تحت روزی چلی آئیں۔ درشت تو آئی رہتیں کہیں کسی خوشگوار موسم میں۔“ سدرہ آپا الدین کی آمد سے خوش تھیں۔

شہیر بھی مسکرانے لگے۔ بلکہ ان گئے۔  
”دس ازواج کیٹ۔ بعض اوقات یہ ٹکی ٹرکیاں خاصی کام کی ثابت ہونے لگتی ہیں۔“ ماورا نے کندھے پر ہاتھ رکھے۔

”یہ فلسطینہ، فیرہ کو بھی سہانوں کی آمد کی اطلاع مل گئی تھی۔ مراد اور فلسطینہ وہیں آگئے۔ یہ دونوں جمال احمد کی شہی کے بیٹھے تھے اور افتخار احمد کے بھانجا بھانجی۔ یعنی سدرہ آپا کی منڈ کے بچے۔“

”اوہ ہونا جان۔ آپ۔ ارے گریڈ نا تھی ہیں۔“  
”نہ بیٹھا۔ ان تصویریں کا ذکر نہ کیجئے۔“ فلسطینہ نے سرگوشی کی آداب کہتے کہتے۔ لیکن سرگوشی ذرا بلند تھی جسے ان شہیر مسکرا دیے۔

”راز داری کی ضرورت نہیں۔ ہمیں سب خبر ہے۔“  
”آپ کو سب خبر ہے۔ کیسے۔ کیسے ہوئی آپ کو خبر۔ کس نے بتایا؟“ وہ بڑکلا گئی۔

”جی نے اور کس نے۔ ایسے کس فلسطینہ اس عنایت کا شکر یہ بھی کو یہاں لانے کا سارا کریڈٹ آپ کو جاتا۔“ فلسطینہ کی جان میں جان آئی۔

”ان سے آنے سے گھر ایک دم آباد ہو گیا۔ شہیر اپنی مرضی سے گھر سے جاتے اور واپس آتے۔ ان دونوں کے ہمراہ بیٹی رہتی تھی۔ دن کا بیشتر حصہ وہ ان میں گزارتے۔ خوب صورت برحقوں کے سامنے میں نے تمہاری ہی دردمند سہنتے ہوتے۔ ڈیوٹی سارا ان نایاب پتھروں کی دیکھ بھال کرتے۔ جی ٹرکیوں کو



”بت ابھی بہت پیاری لگتی ہیں جب بظاہر ہوتی ہیں ڈانٹتی ہیں۔“  
 ”کل ہٹ مت بنا مجھے۔ کوئی غصے میں بھی اچھا لگا کبھی۔“

”آپ۔۔۔ رٹلی آپ۔۔۔ غصے میں بھی پیار چھپا ہوتا ہے نا اسی لیے اور میں تو ہمیشہ چھپی ہوئی چیزوں کو پسند کرتی ہوں اسی لیے آپ کی یہ ڈا۔۔۔“

”کس کی ادا۔۔۔ کسی ادا۔۔۔ شہی یہ می سے اچھا رشتہ آختر کس سلسلے میں۔“

”سدرہ آپ ایک دم بگن میں داخل ہوئیں۔ شبیر کو اڑ پلٹ میں رکھا حریرہ جھکنے میں لگے تھے۔ دونوں ایک ساتھ چوگے۔“

”سدرہ تو واپس بھی آگئی۔ کیا ہوا دیکھی لڑکی۔ پسند آئی۔ کیسی تھی؟“  
 ”سدرہ شبیر کو دیکھ کر مسکرائے۔“

”مہی۔۔۔ سانس تو لینے دیں۔ سب کچھ بتاؤں گی۔ بڑی حد میں ہو رہی ہیں اپنے بیٹے کی۔ ہمیں بھی تو چکھنا پڑا کیا ہوتا ہے۔ زبردست خوشبوؤں سے گیٹ پرانی میرا استقبال کیا تھا۔“

”اے کیسی نمدیدی ہے تو میں حال پوچھ رہی ہوں۔ اور تو۔۔۔۔۔“

”مہی مجھے ساتھ بھیجا ہوتا آنکھوں دیکھا حال وہیں سے مواصلاتی سوارے کی معرفت آپ تک پہنچا۔۔۔“  
 ”نے شرات سے سدرہ آپ کو دیکھا اور ایک پلیٹ میں حریرہ ڈال کر ان کی طرف بڑھایا۔“

”جیسے جتنی دیر یہ ٹکڑا ہوا آپ مہی کو احوال کہہ سناں۔“

”بڑی جلدی ہے بچے کو۔ کیا خیال ہے انکیشن سے پہلے سہرے نہ باندھ دیے جائیں۔“

”یک خیال ہے کام آسان ہو جائے گا۔ ایسے نیک خیال تو یہ بھی ہے میں انکیشن کے بن سہرے ہاندھ دوں۔ جائیں اور اگر کامیابی مقدر ہو جائے تو جشن کا میاں اور ویسا ایک ساتھ کر دیا جائے۔“ سدرہ حیران ہو کر شبیر دیکھنے لگی۔

”یہ تم کہہ رہے ہو۔“

”آف کورس۔ میں ہی کہہ رہی ہوں۔ آپ اتنی حیران کیوں ہیں؟“

”میرا خیال ہے۔ بیٹا شہی کے آنے کا ہے۔ ورنہ کل تک تو تم اس ذکر سے کئی کتر اتے نظر آتے تھے۔“  
 ”خدا کا خوف کریں سدرہ آپ۔ مہی کھڑے کھڑے نکال باہر کریں گی۔ مہی کی رضا جیتنے کے لیے نظریات یہ

تبدیلی ضروری ہے اور ان دنوں مہی کو ناراض کرنا گھائے کا کام ہے۔ ارے آپاں کی دعا میں نہ ہوں گی۔ کامیابیاں دور سے چہرہ دکھا کر بھاگ جائیں گی۔ اور میں۔۔۔ کامیابی چاہتا ہوں سدرہ آپا۔ ہاں اب آپ بت۔“

”آپ نے لڑکی دیکھی۔ پسند آئی۔ کیسی تھی۔ شاہی کے چانسز کتنے فیصد ہیں؟“

”مہی لڑکی بہت پیاری ہے۔ اپنی منطیہ کی کوئیگ ہے اتھار نے تو ان سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میری بہانہ اپنے بھائی کے لیے لڑکی دیکھنے آ رہی ہیں۔ سو بھائی کے متعلق بتانا پڑا۔ عمر، تعلیم، شکل و صورت، اخلاق سیر۔ ذریعہ معاش اور مشاغل۔“

”ارے۔ اس کا مطلب ہے کہ پراسیس خاندان سا پھڑا ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے خاصے پاپڑے پڑتے پڑتے؟ بے چاری بہنوں کو تب جا کر بھائیوں کا گھر بتانا ہے۔ آپ نے بھی خوب تک مرتج لگ کر اپنے اس گئے بھائی

تقریبیں کی ہوں گی۔“

”نہیں کیوں جھوٹ بولتی۔ کیا کی ہے تم میں۔ لاکھوں میں ایک ہو۔“  
 ”نہروہ تو ہر بہن کے لیے اس کا بھائی ہوتا ہی ہے آپ آگے کہیے۔“

”نہیں لڑکی کی بہنوں کو ایک اعتراض تھا۔“

”اعتراض۔ مجھ پر۔ کیا وہ مجھے جانتی ہیں؟“

”ہاں ایک طور سے۔“

”نہں ضرور کیا اعتراض ہے انہیں۔“

”نہ تم ایک سیاستدان ہو۔“

”نہیں۔ سیاست دان ہوں۔ یہ بے پر کی کس نے اڑائی سدرہ آپا؟“

”یہ ایک حقیقت بن گئی ہے تمہارے انکیشن میں حصہ لینے سے۔ ان کا خیال ہے یہ لیڈر ٹائپ لوگ خود اپنی بات کے لیے بھی باقی نہیں رہتے بیوی تو پھر نالوی حیثیت رکھتی ہے۔“

”یعنی کیا مطلب؟“

”یعنی اپنی سوچ کی بات ہے۔ میرا خیال ہے پورے خاندان کے لیے اعتراض کی بس یہی بات تھی۔“

”اے یہ بھی کوئی اعتراض ہے۔ کیسے لوگ ہیں۔ شہرت کون نہیں چاہتا۔ عزت کے مطلوب نہیں۔ اے میرا

نہروہ سے ویل ایجو کینڈ ہے۔ انکیشن جیت گیا۔ اسمبلی میں پہنچ گیا۔ تو کسی دن وزارت تک بھی پہنچ سکتا ہے۔

انہیں بتایا ہوتا۔ شہی کی کابلیت کے انگریز استاد بھی معترف تھے۔ وہیں پھر رشپ دیتے کو تیار تھے۔ وہ تو اپنے ملک کی۔ ہماری محبت میں وطن واپس آ گیا۔ ارے یہ بھی کوئی برائی ہے۔ ارے میں نے بھی تو ایک

نات دان کے ساتھ عمر گزارا ہے۔ مجھے تو کوئی دکھ نہیں ملا جمال سے اچھا شوہر مجھے بھی نہ مل پاتا۔ تمہارے

دن نے سدا مجھے ایک قیمتی شے کی طرح سنبھال کر رکھا۔ محبت دی۔ اپنا قیمتی وقت دیا۔ عزت دی۔“

”ارے مہی آپ اپنی تواناں بھی نہ کریں۔ آپ کا گھر تو دنیا کے سارے گھروں سے مختلف لگتا ہے۔ پہلے دن

ہاں۔ میں اکثر سوچتا تھا اور آج بھی سوچتا ہوں۔ آپ اور ڈیڈی کسی اور دنیا کی مخلوق ہیں۔ میں نے بھی بھی

بہنوں کو اس بچھا ہوا باغیچے میں نہیں دیکھا۔ خوش و خرم چاق و چوبند۔ ایک دوسرے کا جان نثار۔ مہی آپ

آنگن ستاروں سے سجا نظر آتا تھا۔ جھلمل کرتے ستاروں کا مسکن لگتا تھا۔ ستارے آسمان کے لیے نہیں۔

نے لیے نہیں صرف آپ کے گھر آنگن کے لیے بنے ہیں۔ مہی آنگن جھلمل ستاروں کے آنگن کیسے بننے

پیدا ہونے سے پہلے نا۔ یہ کتنے مجھے سچا ہے نا۔“  
 ”نہرا میرا دور نہیں کھوئیں۔“

”نہیں کیا بتاؤں۔ اپنے ڈیڈی سے پوچھنا۔ انہیں خبر ہوگی۔ اے شہی۔ خدا نے چاہا تو تیرے آنگن میں چاند

نہں کا اور ستارے بھی۔“ مہی نے ایک اور بات کہہ ڈالی۔

”نہیں مہی چاند بے وفا دوست ہے۔ ستارے سنا ساتھ دیتے ہیں۔ رونق تو ان ہی کے دم سے ہے۔ چاند تو

نہاں ہے۔ چاند تو ایک آرزو ہے۔ چند دنوں کے لیے آتا ہے چھپ جاتا ہے۔“ وہ جانے کن خیالوں میں

نہں سے جا رہے تھے۔

”ہاں بت افسانوی باتیں لے بیٹھا۔ مردوں کو خاص شہوتیں حقیقتوں سے پرانتھو ہوتی ہے۔“

”تقریباً بہت کمزوری ہوتی ہے۔ ذکر سے زندگی کا مزاج بدلنے لگتا ہے۔“ شبیر شبیر دے ہو گئے۔

"کیسے ہو تم خدا کے بندے۔ میں تمہاری سیاست دانی کا ذکر کر رہی تھی۔"

"ہاں۔ ہاں سدرہ آیا۔ آپ فرمائیے لڑکی کی دانشور بہنوں نے اور کیا کیا اعتراض اٹھائے۔"

"جی سوا اعتراضوں کا ایک اعتراض۔ اور کیا۔ لڑکی مجھے پسند آئی۔ خوب صورت تھی دیکھنے میں سنجیدہ تھی۔ لیکن اصل چیز تو آپس کا افتخار ہوتی ہے۔ وہ پہلے دن سے یہ خدشہ لے کر آئے تو زندگی کے طویل شب و روز گزارنا اتنا سہل بھی نہ ہوگا۔"

"زندگی یوں بھی اہل نہیں توں بھی نہ ہوگی تو کیا ہوگا۔ مگر تو آؤ اور نہ ہی بنا۔ رشتوں کے معاملے میں کتنا خط ہے میرے آس پاس۔ کوئی تو میرا ہوگا۔ میرے جسم و جاں کا حصہ جسے میں پیار دے سکوں۔ میں۔ میں۔ تو۔"

"ارے کہاں کھو کر رہ گئے۔ سدرہ آپ اپنے ان کا کندھا ہلایا۔ شیر نے ہڑ بڑا کرنا نہیں دیکھا۔"

"تو شہر میں لڑکیوں کی کون سی کمی ہے۔ کھل کسی اور جگہ قسمت آزمائی کر لیجیے گا۔ کوئی نہ کوئی لڑکی تو آپ کے شی کو قبول کر ہی لے گی۔"

"ارے لڑکیوں کی کیا مجال ہے۔ سدرہ اتم تو گھری بیٹھی رہو۔ اس شہر میں میں نے بھی ایک عرصہ گزارا ہے۔"

"میرے بھی شناسا یہاں موجود ہیں۔ کل کی کل میں ہی لڑکی تلاش نہ کی تو نام بدل دیتا۔"

"ٹھیک ہے مگر آپ کی مرضی۔ ویسے ایک بات ہے مگر۔ ابھر ادھر لڑکیاں تلاش کر رہے ہیں ہم لوگ۔ اور"

"گھر میں جو لڑکی ہے۔ اس کی طرف بھیان بھی نہیں گیا۔"

"گھر میں کون سی لڑکی ہے۔"

"شہر بھی چوکنے۔"

"مئی اپنی فسطیہ۔ اور کون۔ حسن میں اخلاق میں تعلیم میں قابلیت میں۔ نمایاں حیثیت ہی رکھتی ہے۔"

"شہر کی نظروں میں فسطیہ کا سراپا گھوم گیا۔ چند ماہ میں انخار کی بہن کا یہ گھر زمان کے قریب ہو گیا تھا۔ مراہ"

"ایک شخص دوست کی طرح ان کے قریب تھا۔ اور فسطیہ۔ جو کہ چھ مہینے پہلے سال باوقار قریب لڑکی تھی ماہورا کے"

"ساتھ میں کر خاصی شہر بنی رہتی تھی۔ واقعی حسن صورت میں اپنی مثال آپ تھی۔ ایک کالج میں پیچھا رہی۔ کردار"

"سے گفتار تک کوئی خامی شہر کے سامنے نہ تھی۔ دو چپ رہے۔"

"مئی۔ کیوں نہ ہم انخار سے یہ بات کر کے دیکھیں۔ آخر فسطیہ کو کہیں نہ کہیں بیان تو ہے ان کی ہمیشہ نے"

"کیوں نہ شہر سے ہی۔ سدرہ آ پاپوں خوش تھیں۔ گویا ہم دریافت کی ہو انہوں نے۔"

"سچ کہا تو نے سدرہ۔ میں ابھی تمہاری طرف آ رہی ہوں انخار سے خود ہی بات کرتی ہوں۔ انخار کی کیا مجال"

"کہ وہ کوئی اعتراض کریں۔"

"مئی دو کیوں اعتراض کرنے لگے۔ بات تو باجی کی ہے۔ فسطیہ کے چاچا کی ہے۔ مراو کی ہے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جاتی ہوں اب کے بزرگ کون ہیں۔"

"نما ہر ہے ڈیڈی ہی ہیں۔"

"تو ان لوگوں کی اتنی ہمت کہاں کہ وہ مجال کی بات ٹھکرادیں۔ ان سے کیا وہ خواہست کرنی۔ مجال جو جس"

"مے اور بات سے کھٹے کھٹے۔"

"سدرہ آیا۔ مذاق ہی مذاق میں بات نہ آگے نہیں بڑھتی۔" شہر نے انھگو میں حصہ لیا۔"

"بہ مطلب؟"

"بھی ابھی کچھ دن انتظار کیجیے۔ ایک مسئلہ تو حل ہو۔"

"ہاں ہاں۔ وہ بھی ہوتا رہے گا اور یہ بھی۔"

"سدرہ باہر چلیں۔ شہر پھر سوچوں میں گم ہو گئے۔"

☆☆☆☆

رات کے کھانے کے بعد شیر حسب عادت باہر چلے گئے۔ مئی نے مجال احمد سے باتیں کرتے ہوئے بات اب دہم۔ چھیڑی۔

"آخرو میری کس بات کی ہے۔"

"مگر کس بات میں؟"

"بجٹی ایسے شہر کی شادی میں۔"

"ہو جائے گی مگر کیا ضرورت ہے۔"

"کیسے نگر نہ کروں۔ عہدی کی شادی کو سنتے سال گزار گئے اگر تقدیر میں ہوتا تو اب تک وہ دو بچوں کا باپ ضرور"

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہو۔"

"ہاں ہاں۔ وہ بھی سوچے گا نا کہ آخر میں منہ بولا بیٹا ہی تھا خون تو نہ تھا کہ میرا خیال رکھا جاتا۔"

"سیا آج ایسا ایسے فرسودہ خیالات کا دورہ کیوں کر ہوا۔ بجٹی شہر کو ابھی بہت کچھ کرتا ہے۔ اس عہدی بندے کی"

"بانی تھی۔ اور بے پروائی میں تمہارا ہی تو ہاتھ ہے۔ اس نے بڑھ لکھ کے ڈیوڈیا۔ کیا اس لیے اسے سیاسیات"

"انسان تھی ہم نے۔ قانون کا امتحان دلویا تھا کہ وہ خود کو بے کار کے دھندوں میں گم کر دے۔ شہر سے ہمیں بہت"

"د امیدیں ہیں۔ ہم اسے ترقی کے آسمانوں پر چاند کی طرح ضوئیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک فعال انسان بنانا"

"بانتے ہیں۔ وہ ہمیں بہت زیادہ عزیز ہے۔ آپ کو اس کی کیا خبر۔ اور میں تو حیران ہوں۔ ان نازک ترین"

"بات میں آپ کو اس کی شادی کا خیال کیسے آ گیا ایک عمر ی ہے۔ میری بھوئی اسی شریک حیات۔ فی الحال تو"

"ایم این اے کی نشست حاصل کرنا ہے۔ اپنے علاقے کی نمائندگی کرنا ہے۔ اپنے آپ کو نمائندگی کا اہل"

"نہ کرنا ہے۔ بلکہ فی الحال تو ہمارا سب سے اہم کام اس کی انتہائی حد تک سپورٹ ہے۔ اور تم اپنا وقت اسکی"

"ہا باتوں میں ضائع کر رہی ہو۔ ان دو تین ماہ میں میں پھر یہ ذکر سننا پسند نہیں کروں گا۔ سدرہ کو چاہا۔ تو"

"انہی جواب دیتی ہے وہ تمہیں۔ کل تمہیں بھی میرے ساتھ۔ جہاں گھر جانا ہے۔ اپنے علاقے کے لوگوں کو"

"انسانی اہمیت اور شہر کی خوبیوں سے آگاہ کرنے اور شہر آل۔ مجال احمد نے بات کو معمولی سمجھ کر نال دیا۔"



” حکومت۔ میں کسی ایرے فیرے سے ملنا پسند نہیں کرتی۔ وہ میری کوئی گلیگ ہے۔ اردو کی کچھرا ہے۔“

” چلو وہ نہ سہی۔ اس کا کوئی بھائی وائی تو ہوگا۔“

” ارم پلیز۔ سنجیدہ رہنا کرو۔ ہر وقت الٹی سیدھی باتیں رہتی ہو۔ اس کے ایک چھوڑ دی بھائی ہوتے رہیں۔ مجھے تو اپنی کوئی گلیگ سے ہی مطلب ہے۔“

” مجھے ساتھ لے چلو۔ میں ان میں سے ایک کی ہزار مت کر لوں گی کہ پلیز فار گوڈ سیک اس جھپٹی اور دیوانی لڑکی کو قبول کر لیجئے۔ اس کی زندگی کے حصارے کا رخ بدل دیجیئے۔“

” تم کام کی بات کرو۔ کیوں ڈسٹرب کیا ہے اس ناوقت۔“

” ہاں ہاں جب کہ تمہیں اپنی کوئی گلیگ کے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ آئی ایم سوری گو ہر ڈیر۔ آج ایک بڑی عجیب بات ہوئی جو تمہیں بتائے بغیر ہنسن نہیں ہو رہی ہے۔“

” عجیب بات۔ بھئی تمہاری تو پوری زندگی ہی عجیب ہے۔ عجیب باتوں پر حیرت نہیں ہوتی۔“

” نہیں بھی سچ سچ کی عجیب بات۔“

” تو پھر بتاؤ۔“

” ہوا یہ کہ کل شام۔ ڈیڈی کے ساتھ بازار گئی۔ وہاں ہی میں ڈیڈی۔ خیابان شہرازی کی طرف جانے لگی۔ ان کے کسی دوست کا گھر ہے ادھر۔ ڈیڈی نے بہت کہا کہ میں ان کے ساتھ اندر چلوں۔ لیکن میرا موڈ ہی نہ بنا۔ میں وہیں گاڑی میں بیٹھی رہی۔ ڈیڈی نے کافی دیر کر دی۔ میں گھبرا کر گاڑی سے نکلنے اور سڑک پر چھل قدمی کرنے لگی۔ بلکہ

اپنی ہی دھن میں بہت دور نکل آئی۔“

” معاف کرنا یہ کوئی عجیب بات ہرگز نہیں ہے تمہیں ایسے دور سے اکثر پڑ جاتے ہیں۔“

” تم سنو تو گوہر۔ عجیب بات تو ہوئی گئی تو نہیں چلتے چلتے میں نے نگاہ اٹھائی تو میرے دائیں طرف ایک خوب صورت گھر بڑی شان سے براہمان تھا۔“

” گھر تو چاروں طرف ہوتے ہیں۔ یہ کون سی پریشانی والی بات ہے۔“

” ہے پریشانی والی بات۔ یہ گھر خاص گھر تھا۔“

” کیا اس میں انسانوں کی جگہ تیسری مخلوق آباد تھی۔“

” اوہ یونان سنس۔ سنہ تو سہی۔“

” کیو۔“

” گوہر۔ پائل لڑکی یہ وہی گھر تھا۔ جس میں۔ جو۔ جس کی تصویریں ہم سب کے پاس ہیں۔ آئی میں ہم سب کو پراسرار انداز میں بتاتی ہیں۔“

” اوہ نو۔ امپا سہیل۔“

” گوہر پلیز میری بات کا یقین کرو۔ وہ بالکل وہی گھر تھا۔ میں میں وہی۔ تصویر میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ گوہر گھر کا آؤٹ لک تصویر سے زیادہ خوب صورت سے حقیقت میں۔ میں کتنی دیر گم سم کھڑی رہی۔“

گھر کا گیسٹ ڈاک تھا۔ ورنہ اندر چلی جانی۔ اور پوری کنفیوشس کر کے ہی گھر واپس آئی۔“

” یہ سب تمہارا ہم ہے ارم بی بی۔“

” ہاں گو یا تمہارے خیال میں ہمیں تصویروں کے یہ پنڈے سیدھے بنت انٹرویو سے ارسال کیے گئے

” تو اس مہلے میں کیا کر سکتی ہوں۔“

” سر پھوڑ لو اپنا۔ بھئی ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلو۔ تاکہ ہم وہاں جا کر اہل خانہ سے پوچھ سکیں کہ کتنے اہل انٹیلی ٹوگوں سے ایسا مذاق کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔“

” نکر ارم اس وقت تو میں ساگرہ پارٹی میں شریک ہونے چنی ہوں۔ اس وقت تو جانا مشکل ہے۔ کسی اور وقت میں گے اس بار سے میں۔“

” نہیں گوہر نہیں۔ ہمارا جانا بے حد ضروری ہے۔“

” نہیں کیا ناکان مکان کھود کر نہیں لے جاتے کا سوچ رہے ہیں یا تم لب گوہر ہو۔“

” بہر حال آئی ایم جسٹ کنگ۔ اور تمہیں چلنا ہوگا۔“ گوہر مسکرا دی۔

” لیکن ایک شرط ہے۔“

” جی ہاں تمہیں اب اپنی بے وقتی شرط۔“

” پہلے پارٹی میں شرکت پھر آپ کی یوگس اور بے کاری ہم۔“

” اے۔۔۔ میں آ رہی ہوں۔“ ارم نے تو بالکل دسے ماری۔

گوہر نے جلدی سے لباس تبدیل کیا۔ فسطیہ بخاری کے لیے کرل شفیق الرحمان کی کتابوں کے سیٹ کو ایک اب صورت دہر میں پیک کیا۔ اسے میں ارم آ گئی۔ گھر میں داخل نہیں ہوئی۔ زور زور سے ہارن بجا کر اپنی آہ

اٹھان کیا۔ گوہر نے تھوڑے اور پرس سنہالا اور باہر کو بھاگی۔ صفیہ چشم باندھاری میں مل گئیں۔

” ساگرہ میں جارہی ہوں اماں ارم بھی ساتھ ہے۔ رات سے پہلے لوٹ آئیں گے۔“ اور باندھاری عبور کر گئی۔

” اے اے دیکھتے ہی گاڑی اشارت کی اور اس کے لیے فرنٹ سیٹ والا دروازہ کھول دیا۔ گوہر نے تھوڑے کچھنی سے پرکھا اور آرام سے ٹھہر گئی۔

” اس طرف چلنا ہے گوہر فاطمہ مسکری صاحبہ؟“

” لیاقت روڈ۔“

” لیاقت علی خان روڈ۔ مکان نمبر ۴۔ اے“ ارم نے ان کی طرف دیکھا۔

” مذاق ایک طرف ایڈریس بتاؤ۔“

” بتایا تو ہے۔ اب خود لٹا لٹک کر بتاؤں۔ یا تمہیں لٹکا کر۔“

” خیر۔ چلے چلتے ہیں۔“

” لائی جیس منٹ میں فسطیہ بخاری کے گھر کے آگے کھڑی تھی۔ دونوں بیچھاتریں۔

” ہر بن جلائے شریک ہونا کتنا احتیاطیہ فعل ہے۔“

” تم میرے ساتھ جارہی ہو اور تمہیں خبر نہیں فسطیہ میری بہت پیاری دوست ہے۔“

” ہاؤ آئی اپنی ایک خواہش کے ہاتھوں بے وقوف بن کے کتنی دکھ لیتے ہیں۔“

” ہاں واوے مس ارم شاہنواز یہ ایک اچھے بھلے آدی شہزادہ محسن ہانگی نے تمہیں ان ہی بے وقتوں کی وجہ سے تو

سلیکٹ نہیں کیا کہیں۔ "شہزاد الحسن ہاشمی کے نام نے ارم کے چہرے پر گلابیاں پھیلا دیں۔  
"شاید۔"

"وہیے کب آرہے ہیں یہ ڈاکٹر شہزاد۔ اس بڑے سے ہماری جان چھوئے۔"

"چھوڑو یار..... یہاں کوئی ڈاکٹر شہزاد کے لیے باؤنڈ ہو کر نہیں بیٹھا۔ موصوف لندن سے آتے ہوئے ایک عدد بیوی ساتھ لیتے آئیں اور ہم روٹی ہو کر بستر سنبھال لیں۔ ناممکن ہے۔ چاہے آج جس جگہ ہم لوگوں کو جا رہے ہوں مکان کوئی شریف بے ضرر لو جو ان کا تو اپنا موٹ تو اسی کے حق میں ہو جائے گا اور عسکری و محترمی..... شہزاد الحسن ہاشمی کو لکھ دیں گے کہ....."

جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

اور اس شریف آدمی کا ہاتھ تمام لیں گے۔"

"مہر کر ارم! اور یہ بھی یاد رکھو..... مالک مکان کوئی شکیا یا بھاری بنا کر کسی ایسی پٹا راشی افسر بھی نکالنا نہیں..... تیرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر ہی لوگوں کی۔"

ارم ہنس دی۔ سامنے فلسطینہ کھڑی تھی۔

"اوہ گوبر عسکری..... موسٹ ویکم۔ موسٹ ویکم۔" وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔

"یہ میری کزن ارم ہاشمی ہے فلسطینہ۔" دونوں نے ہاتھ ملایا۔

"بن بلائے چلے آنے پر معذرت خواہ ہوں۔" ارم بے حد مہذب انداز میں معذرت کر رہی تھی۔ گوبر کو ہنسوانے لگی۔

"ایسی کوئی بات نہیں خوشی ہوئی آپ سے مل کر..... آپ کو یہاں پائٹر۔" فلسطینہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔  
تھ..... اچانک ایک لڑکی بھاگتی ہوئی ان کے قریب آئی۔

"طینی ہاشمی! طینی ہاشمی!..... اچیلے..... فوہ اچیلے۔"

"کہاں؟"

"بھئی ادھر..... ٹیلی فون کی طرف....."

"بہت بدحواس ہو..... بات کیا ہے؟"

"اللہ بھی آپ کا فون ہے۔ شہیر بھائی نے یا فرمایا ہے آپ کو۔"

"شہیر بھائی واپس آگئے کیا؟"

"نہیں ٹرک کال ہی لگ رہی تھی۔ لگتا ہے ابھی تک وہیں پھنسے ہوئے ہیں۔ ماسٹرل چائٹا کے پاس۔"

"اچھا تم میری دوستوں کے پاس دو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

گوبر جو ایک پل قبل خانے خوشگوار موڈ میں تھی۔ ایک دم پریشان ہی ہو گئی۔ ارم نے اس کی طرف دیکھا۔

"گوبر..... گوبر....."

گوبر کی سامنتوں پر ایک لفظ کاری ضرب بن کر لگ رہا تھا۔

"آپ..... آپ..... آپ طینی ہاشمی کے جانے پر پریشان ہو گئیں۔ دراصل ایک ضروری کال تھی ان کے لیے....."

شہیر بھائی اصل میں ہمارے ماموں ہوتے ہیں۔ ابھی چند دنوں میں ان کی متعلقہ ہماری فلسطینہ ہاشمی سے ہو جاتا ہے۔

نی۔ اصل میں وہ آج کل بے حد مسرور ہیں۔ اب بھی ہمارے بڑے ماموں کے ہاں گئے ہیں۔ انہیں ساتھ

ان کے لیے..... وعدہ کر کے گئے تھے کہ طینی ہاشمی کی سالگرہ والے دن تک لوٹ آئیں گے۔ نہیں آسکے تو فوری طور پر رہے ہوں گے۔" وہ اپنی دھن میں کہے جا رہی تھی۔ گوبر تو کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔

"ارم نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔ میں ماورا ہوں ماورا انصار بخاری..... اپنے پاپا اور ماما کی اکلوتی

نی۔ چار بھائیوں کی بہن یاور..... خاور..... اظفر..... اور احمد..... میرے بڑے عیارے بھائی ہیں۔ آج کل وہ

بے حد مسرور ہیں۔ شہیر بھائی کے لیے احتمالی مہم چلا رہے ہیں۔ ہر شام لیاقت روڈ پر بچوں کا عظیم الشان

ہاں ان چاروں کی سربراہی میں ہوتا ہے اور راشد منہاس پارک کے وسیع ٹراؤڈ میں ان کی پرجوش تقریروں پر

آہ جاتا ہے۔ پاپا کہتے ہیں شہیر بھائی کے لیے بچوں کے ووٹوں کی ضرورت ہوتی..... تو شہر کے سارے بچے

ان ہی کے حق میں رائے دیتے۔ خیر تہجیب بھی کوئی ایسا رائے نہیں ہوگا..... تمہارے ماما جان ساری عمر بھر ہی بچتے

پلٹتے ہیں۔ وہ شہیر بھائی کے لیے میدان عمل میں نکل آئے ہیں۔ تو جیت ان کا مقدر ہی ہوگی۔ ارے.....

نہیں دوستو پڑھو۔ میں خواہ مخواہ میں یہ باتیں کیے جا رہی ہوں۔ بھلا آپ کو میری ان باتوں سے کیا لگتی ہے۔

نی۔ نی..... وہ آپ کی فریڈ آگئیں۔

ارم نے مجھے اجازت..... خدا حافظ..... میں تو چلی اپنی سہیلیوں کی طرف۔"

گوبر ابھی تک ماورا کی باتوں کی بازگشت میں کھولی ہوئی تھی۔

"موری گوبر عسکری..... ایک ضروری کال تھی۔ جانا پڑا۔" گوبر نے فلسطینہ کی طرف غور سے دیکھا۔

"ایا بات ہے گوبر۔ ابھی جب تم اس کمرے میں داخل ہوئی تھیں تو موڈ اس قدر پراسرار تو نہ تھا۔ ایک لمحے

میں یہ کیا تبدیلی آئی۔"

"کوئی نہیں..... کچھ نہیں..... تم کیسی ہو؟"

"ارے بابا ابھی تو کالج سے تم سے رخصت ہو کے ہی آئی ہوں۔ اچھی تھی۔ اب بھی اچھی ہوں۔"

گوبر کو اپنے غلط سوال پر شرمندگی ہوئی۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ارم نے اسے ٹھیکو کا دیا۔

"نہا ابھی گوبر! ارم کی سرگوشی میں نہیں تھی۔"

"انہیں پڑاروں لوگوں کا نام ایک جیسا ہو سکتا ہے۔ واقعی مجھے خود پر قابو پانا چاہیے۔" گوبر نے خوب کوسمجھایا۔

"ماورا نے تمہیں بتایا ہوگا۔ شہیر بھائی نے صرف مبارک باد کہنے کے لیے فون کیا تھا۔ پشاور سے بول رہے

تے۔ بہت اچھے انسان ہیں یہ شہیر بھائی..... ایک دم سے پر غصوں..... وقار۔"

گوبر بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ فلسطینہ کے چہرے پر کوئی حسین جذبہ نہ تھا۔ وہ سیدھے سادے ماعناز میں

ات کر رہی تھی۔ جب کہ ماورا کا کہنا تھا کہ چند دنوں میں فلسطینہ کی شہیر سے متعلق ہونے والی ہے۔

بھلا اپنے ہی خیالات میں غلطیاں و پریشانیاں وہ بہت کچھ سوچتی رہی۔ ارم اپنی عادت کے مطابق فلسطینہ سے مکمل

میں تھی۔ اس اثنا میں کارٹ کے اسٹاف میں موجود فلسطینہ کی باقی ماندہ دوست بھی آگئیں۔ ارم ان سب کے ساتھ

ان کے کسی کونے میں خوشگوار موڈ میں تھی۔ ایک دم پریشان ہی ہو گئی۔ ارم نے اس کی طرف دیکھا۔

گوبر..... گوبر..... گوبر عسکری کی خاموشی دیکھ کر روزی

آج بھی الجھن کا شکار ہو گئی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

"کمال کرتی ہیں آپ بھی سدرہ مائی۔ آپ نے بھلا کہاں دیکھا ہوگا اس سے قبل اس لڑکی کو۔ یہ میری

دلہنہ گوبر عسکری ہے۔ کارٹ میں میرے ساتھ ہی بیٹھاتی ہے۔ سیاسیات کے شعبے میں ہے۔ ایک دم سے

تین..... فطین اور سمجھ دار لڑکی ہے۔ اپنے شیخے کی ایک ماہر استاد انہی مروت کے دو تین سال ہی ہوئے ہیں زیادہ نہیں۔ سیاست میں پی ایچ ڈی کا ارادہ رکھتی ہے۔ قابلیت کا یہی عالم رہا تو وہ اس چانسلر کے عہدے تک آسانی سے چاہتی تھی۔

"یقین کرو۔ فسطیہ! میں کہتی ہوں میں نے اسے ضرور دیکھا ہے۔"

"دیکھا ہوگا۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ ممکن ہے عذرا کی کلاس فیلور ہی ہو یا ایسی ہی کوئی اور وجہ ہو..... بہرحال وہ آپ کے لیے ایک اچھی لڑکی ہے۔"

فسطیہ انہیں گویا اور ارم کے پاس لے آئی۔ سلام دعا کے بعد وہ ٹوہر کے ساتھ بیٹھ گئیں۔  
"میں فسطیہ کی ماما ہوں۔"

"جی فسطیہ اکثر آپ کا ذکر کرتی رہتی ہے۔" گوہرائی وہ میں اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی۔ چہرے پر مسکراہٹ ناساتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"تجربہ دیکھ کر مجھے یوں لگا گویا پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ فسطیہ کا خیال تھا شاید تم عذرا کی کلاس فیلور ہی ہوگی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ میں خود حیران ہوں کہ یہ سب کیا ہے۔ کیونکہ میں اس شہر میں پہلی بار آئی ہوں۔ میں بارہ ماہ سے میں لندن میں تھی۔ شہر پاکستان آنے لگا تو میرا خیال ہی وہاں نہ لگا۔ انتظار سے کہ سن کے میں بھی پاکستان آگئی۔ شہر میرا بہت ہی پیارا بھائی ہے۔ فسطیہ میری نند کی بیٹی ہے۔ جب سے مٹی آئی ہیں۔ انہیں ایک ہی نظر ہے شہر کی شادی کی اس کا گھر آباد کرنے کی۔ وہ خیر سے ایکشن میں حصہ لے رہا ہے۔ مٹی تو چاہتی تھی جلد از جلد شادی ہو جائے لیکن ایڈی نے سختی سے روک دیا اور..... اور..... ان دونوں جب میں شدت سے رشتے کی تلاش میں شہر کی گلیاں ناپ رہی تھی۔ اچانک ایک خیال ہم سب کا مددگار بن گیا کہ کیوں نہ شہر کی شادی فسطیہ سے کر دی جائے۔ شہر بہت سمجھ دار اور سعادت مند لڑکا ہے۔ ہمارے فیصلے کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اور فسطیہ بھی ماشاء اللہ ہزاروں میں ایک ہے۔ شہر کو اعتراض بھی کیا ہوگا۔ ایکشن سے فراغت پاتے ہی شادی کا دن مقرر کر دیں گے۔"

سند بخوش خوشی اس کو بتائے جا رہی تھیں۔

کتنی دیر وہ اپنی اپنے گھر کی شہر کی باتیں کرتی رہیں۔ ساگر کا ایک کزنے کا وقت آ گیا پھر چائے کا دور چلا اور اس سے فراغت پا کر گھر ورنے رخصت چاہی۔ دونوں باہر آ گئیں۔ گاڑی میں بیٹھے ہی ارم نے کہا۔

"اور جناب اب ہے اس مہم کی باری جس کے نام پر میں بلیک میل کی گئی۔"

"ہاں آپ..... ورنہ تمہارے ساتھ یہاں تک کیسے آتی؟"

گاڑی دائیں طرف کے اس گیٹ سے نکل کر سڑک پر آئی۔ گوہر جواب تک جھنجھکی خاموش اور فکر میں جتا تھی۔ یونٹی اپنے بائیں طرف دیکھنے لگی۔ ارم نے گاڑی روک دی۔ ایک خوب صورت چندر سفید گیٹ کے آگے۔ گوہر ایک دم چونکی۔

"ارم..... ڈرکھو..... دیکھو..... ارم اب وہی گھر ہے۔"

"آف کورس..... اترو گاڑی سے۔" ارم نے انجمن بند کر دیا۔

"کیا مطلب؟"

"ابو..... اندر چلیں گے..... اہل خانہ سے مذاق تمہیں کریں گے اور کیا....."

"جیسے ارم ایک اجنبی گھر میں بغیر کسی جان پہچان کے بے دھڑک جانا اچھا لگتا ہے بھلا....."

"اجنبی لوگوں کے پاس تصویریں بھیجنا تو بہت اچھا لگتا ہے..... چلو چلو اب باہر نکلو..... گیٹ کھلا ہے۔"

"نہیں کہ اہل خانہ کا گریبان تمام کران سے پوچھتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ایسا مذاق کیوں....."

"بے وقوف۔"

ارم نے دروازہ کھول کر اسے باہر دھکیا اور خود بھی باہر نکل آئی۔

ارم لگتا ہے آج ہمارا دن باری ہے۔"

"بہتی باری؟"

"نہیں ہونے کی۔ بھی میں تو نہیں جا رہی اندر تم چلی جاؤ۔ مل کے آ جانا۔ میں انتظار کرتی ہوں۔ تمہارے آنے کا۔"

"ارم..... تمہیں ساتھ چلنا ہوگا۔ آؤ۔"

ان نے پھر اسے کھیٹا۔ دو قدموں میں وہ گیٹ کے اندر داخل ہو گئیں۔ شام کے خواب ٹانگ اندھیروں نے خوب صورت گھر کے گرد خیر اڑا رکھا تھا۔ گلاب کی کیاریوں کے پاس کوئی بیٹھا..... پودوں کی دیکھ بھال دیتا تھا۔ ارم دو قدموں کے بعد آگے نہ چل سکی۔ گوہر تو ویسے بھی برا نہیں نہ تھی۔

"ہوائے کی تو..... بدستور۔" گوہر نے سر گھٹی کی۔

"جیسے رہ..... ہمیں رنگ کر صاحب ممبر وقت کا انتظار کرتے ہیں۔"

"نہیں..... دیکھ رہی ہو گھر میں ان کے موا کسی کے ہونے کے آثار ہی نظر نہیں آرہے اور رات ہونے والی ہے۔"

"تو وہ کوئی بلا نہیں ایک انسان ہی ہوگا۔"

"نہیں ہزار اس سے کیا نانا۔"

ارم نے ننگے پاؤں چلنے سے اجتناب کیا۔ جھنجھاکر جو گوہر بولی تو آواز اونچی آئی۔

"اب چلتی ہو یا نہیں جاؤں۔ تم تکتی ہو کر کے لوٹ آؤ۔"

یاد رہی کہ جھنجھکے انسان نے سراٹھا کر بلکہ سڑن ان دونوں کی طرف دیکھا۔ گوہر کا دل دھڑک گیا۔ ارم ایک آنے لگی۔ مالک مکان ہاتھ صاف کرتے گھری وہیں چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آداب سر۔" ارم نے سر کو قدر سے خم کیا۔

"جیتی رہو جیتی رہو۔" وہ زور سے بولے..... اور ان دونوں کی طرف آئے۔

"یہ کمر..... آپ کا گھر ہے؟"

گوہر باوقار شخص کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ ارم نے کچھ سے بغیر سوال دے مارا تھا۔ انہوں نے غصہ سے اس طرف دیکھا۔

"ارم تم لوگ اس گھر میں داخل ہو ہی گئی ہو تو اندر تو آؤ؟۔ یہ وضاحت پھر لے لینا۔" وہ مسکرا رہے تھے۔

"نہیں میں تو کوئی نہیں ہے سر؟"

"نہیں تو ہوں اور میری بیوی میری ساری کاہلی سستی اور نااہلی کے باوجود مجھ پر بھروسہ رکھتی ہے کہ میں مہمانوں



"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

"نہیں۔ آپ اس بات سے انکاری ہیں کہ تصویریں بھیجتا اس گھر کے مکینوں کا کام نہیں تو اندر جانا انتہائی  
"توئی بات ہے۔"

کو اچھا ڈیل کرتا ہوں۔ تم دونوں بچیوں کو بھی مایوسی نہیں ہوگی۔ کم آن۔ آج چائے گول ہو چلی تھی۔ اکیلے  
میں مزہ آتا۔ چلو تم دونوں کی کھیتی تھی۔ چائے میں خود بنلاؤں گا بس تم۔۔۔۔۔"

"سرا ہم اجنبی لوگیاں ہیں۔ پہلی بار اس گھر میں قدم رکھا ہے ہم نے۔" ارم حیران تھی۔ اب پریشان بھی۔  
"لیکن اس گھر میں آجانے کے بعد اجنبی نہیں رہیں۔"

"مگر سر! ہمارا مسئلہ کچھ اور ہے۔"

"مسئلہ۔۔۔۔۔ کیا تم لوگ میرے بیٹے کے پاس آئی ہو۔ آئی میں اس کی کلاکتف ہو۔ تب تو میرا فرض بنتا ہے  
میں تم لوگوں کو اعتراض کروں۔ لیکن بچیوں۔۔۔۔۔ آئی اہم سو رہی۔ تمہارا مسئلہ حل نہ ہو سکے گا۔"

"سرا ہم آپ کے بیٹے کے کلائمش نہیں ہیں۔ ہم کن کو نہیں جانتے۔ ہمارا مسئلہ تو کچھ اور ہے۔"

"مسئلہ کوئی بھی ہو۔ مہمان نوازی کا اصول لاگو رہے گا۔ آؤ۔۔۔۔۔ آؤ بیٹی۔۔۔۔۔ میں ڈرائنگ روم کا دروازہ  
کھلتا ہوں تم بیٹھو۔ مسئلہ بعد میں بتائی رہتا۔"

گوہر تے جھٹ ارم کی طرف دیکھا۔ ارم نے گوہر کی طرف۔ جس کی نظروں میں کات تھی۔ سرزنش تھی۔

"میں اندر نہیں جاؤں گی۔ تیرا لڈو بچر مجھے بھی لے ڈوے گا۔" اس نے پھر سرگوشی کی۔

"آپ کی اس پیش کش کا شکریہ۔ معزز بزرگ! ہمیں تو ایک گھر کی تصویریں نے الجھن میں ڈال دیا تھا۔"

"گھر کی تصویریں نے۔"

"جی ہاں اور اسی گھر کے تصویریں نے۔"

"ہاں گھر کی۔۔۔۔۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔"

ارم نے پنڈ بیگ کھولا۔ ایک تصویرنگانی اور مالک۔ مکان کی طرف بڑھا دی۔

"یہیٹا آپ اپنے گھر کے ایک بیڈروم کو آسانی سے پہچان جائیں گے۔" تصویر ہاتھ میں لیے وہ حیران  
کھڑے تھے۔

"اف کورس۔۔۔۔۔ یہ اسی گھر کے ایک بیڈروم کی تصویر ہے۔ میرے بیٹے کے بیڈروم کی۔ لیکن بیٹی تمہیں کبار  
سے ڈر؟"

"یقین کریں میں ڈر نہیں لے گی۔" ارم نے تھوڑا سا جھک کر کہا۔

"دلہ بیٹی۔۔۔۔۔ یہ تو واقعی ہمارے بیڈروم کی تصویر ہے۔ مگر۔۔۔۔۔ بیٹی۔۔۔۔۔ یہ تمہارے پاس کیسے آگئی۔"

"میں بہت تو حیرت کی ہے صرف یہی نہیں پوری پچھتیں عدد تصویریں ہمارے پاس ہیں۔"

"یعنی۔۔۔۔۔"

"یعنی کسی نے پوری فلم دھلو کر ہمارے پاس بھجوا کر ہماری نسلوں پر احسان کیا ہے۔"

"حیرت ہے۔"

"معزز بزرگ! یہ خیال کرنا تو انتہائی غیرحائش مندی ہوگی کہ تصویریں آپ نے بھجوائی ہوں گی۔ اس گھر میں  
اور کون کون ہے؟" ارم نے شہیدہ لہجے میں پوچھا۔

"اس گھر میں جتنے بھی لوگ ہوں۔ ان میں سے کوئی ایسا نہیں جو ایسی حرکت کرے اور میرا بیٹا تو مجھ سے زیادہ  
خاموش طبع اور باوقار ہے۔۔۔۔۔ بیٹی۔۔۔۔۔ جس گھر کی چھتیں عدد تصویریں تمہارے پاس موجود ہیں کیا تم پشیم  
اسے۔ کچھ پتہ نہیں کرو گی۔"

”تو وہاں چلتے ہیں۔“

”خیر دار..... ایک دوں گی اگلے ہاتھ کا۔ سیدھی طرح مجھے گھر چھوڑ دو۔ مجھے تو ندامت ہو رہی ہے۔ شرم آ رہا ہے۔ کیا سوچا ہوگا اس اجنبی انسان نے ہم دونوں کے بارے میں۔“

”سوچتا رہے۔ کس نے منت کی تھی اس کے بیٹے کی اور ہم نے کون سا غیر اخلاقی کام کیا ہے۔“ ارم۔

پر جوش انداز میں کہا۔

”آئندہ ایسی بے ہودہ عہدہ ہم پر مجھے ساتھ مت لے جانا۔“ گوہر نے وارننگ دی۔

”ہاں۔ تمہیں ضرورت بھی کیا ہے۔ یادوں کے جبر سے کی سیر سے فرصت ہی نہیں ملتی تمہیں۔ کسی اور چیز کا طرف نگاہ ہو گئی تو کیسے۔ تمہارے بھٹنے کے لیے عرض ہے۔ زندگی گزارنے کو بہت کچھ حقیقت میں چاہیے ہو ہے۔ اس نئے معاملے میں تمہارا انٹرسٹ ہو تو میں دوبارہ محترم شہزاد افسان باٹھی کے واسن سے وابستہ ہوتی جاؤں ہوں۔“

”تو یہ ہے۔ وابستہ ہونا اور جدا ہونا..... دونوں سمجھتی ہیں تمہارے لیے۔“

”جی ہاں اور آپ گوہر بی بی۔ آپ ٹھہریں تو حید کی قائل۔ آپ کے لیے وہی وابستگی کافی رہی۔۔۔۔۔ ہونہ۔ محبت کے قائل تو جیسے ان جیسے غمڈے ہی ہوتے ہیں۔ گوہر بی بی آپ میری پھوپھی زاد ہیں۔ بس اس صورت میں نے آپ کا جرم معاف کر دیا..... ورنہ عمر بھر.....“

”ارم! تم بھول رہی ہو۔ ہم تم میں وعدہ ہے کہ یہ موضوع کبھی نہیں چھیڑا جائے گا۔ تم ایک نہیں ہو بارادھر جاؤ۔ شوق سے شہزاد سے بے وقالی کرو۔ مگر پلینز مجھ سے ایسی کوئی بات مت کرو۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے انتہائی ذہنی معاملہ۔ میں معذرت خواہ ہوں۔“

گوہر کے ساتھ ساتھ ارم کا موڈ بھی خراب ہو گیا۔ اسے گھر سے باہر اتار کر وہ دن سے گاڑی نکالنے لگی۔ گوہر جو فسطیہ کے گھر جاتے ہی پریشان ہو گئی تھی۔ ایک سنگین یاد کا خیال بوجھول میں لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆☆

وہ پشاور سے واپس آتے ہوئے عدی کو ساتھ ساتھ نانا بھولے۔ رات کی قلائت سے گھر پہنچے تو بوڑھے ملازم کے سوا کسی سے بھی سامنا نہ ہوا۔ عدی تو جہاز میں ہی نیند کے قناتق میں دوڑتا جھومنے لگا تھا۔ گھر آتے ہی لباس بدلے بغیر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ شبیر بھی چند سو گئے۔ صبح ٹیلی فون کی چیخ گھنٹی نے انہیں جگایا۔

”ہیلو شبیر بھائی۔“

”اوہ مائی ٹائیس بیاری بیٹی..... کیا حال ہے۔“

”ٹھیک ٹھاک۔“

”کب آئے آپ؟“

”رات ہی..... مگر تمہیں کیسے خبر ہوئی؟“

”عرض ہے نانو جان جو گلگ کے لیے گھر سے باہر آ چکے ہیں۔ ہمیں بتانے کے لیے ابھر آ گئے۔ کیا عدی ماموں بھی آئے ہیں؟“

”آ تو کیا ہے لیکن ابھی تک خراٹے ہی لے رہا ہے۔ جب کہ بیٹی کا خیال تھا کہ وہ مہم چلائے گا۔ میری

...نی۔ خاک پیلے گی۔ وہ تو پڑا سوتا رہے گا۔“

...معاذ کے سچے شہیر بھائی وہ پہلے آپ کے بھائی ہیں اور بعد میں میرے ماموں۔“

...سدرہ: آپ انہیں ہیں؟“

...ماہرہ: جی ہاں آپ کے لیے۔“

...تم نے کیا کیا ہے؟“

...میں: کیا کرتی۔ بس آپ کی آمد کا انتظار کرتی رہی۔“

...ہاں..... شہزادوں کی بھاری بند رہی ہوگی۔ تجھی تو ماموں کی یاہ آئی۔ سنو ماووا..... مہی کیا کر رہی

...میں: جن تو ابھر آپ ہی کی طرف ہیں۔ ابھر تو نہیں ہیں۔“

...مہی: ٹھیک ہے خدا حافظ..... مہی یقیناً جن میں ہوں گی۔ میں ان کی طرف جا رہا ہوں۔“

...میں: آ کر شبیر نے مہی کو سلام کیا دعا نہیں لیں۔ وہ بولیں۔

...میں: سنے جتنا مناسب نہ سمجھا۔ کیسے ہو تم اور عدی؟“

...میں: جی اچھے ہیں۔“

...میں: ہاں۔“

...میں: بھائی کو ایک دو ضروری تقریبات میں شرکت کرنا تھی۔“

...میں: کیوں آیا۔ اس کے ساتھ ہی رہ جاتا۔“ مہی کے لہجے میں تھی۔ شبیر جواب میں کیا کہتے۔

...میں:۔“

...میں:۔“

...میں: تیری شاری میں کسی سیدھی ساوی لڑکی سے کہوں گی۔ جو ساوی کی ساوی شوہر کی ذات پر انحصار

...میں: ہے بذات خود ضروری تقریبات میں شرکت کا ڈھنگ نہ آتا ہو۔“

...میں: اب اپنی مرضی کرتے ہیں۔ اسے تمہاری پسند کی ہوئی لڑکی کی ضرورت نہیں۔“ جمال احمد کی آواز ان سے

...میں: آ گئی۔

...میں: مائے۔ آپ کہاں سے آ گئے۔ اور جناب عدی نے کب اپنی مرضی کی تھی۔ بہو تو میرا انتخاب ہے۔

...میں: اپنی غلطی کا ردنا رہ رہی ہوں۔“ مہی بھولی سے اتر گئیں۔

...میں: جناب تمہیں اپنی غلطی کا ردنا نہیں رونا پڑے گا۔“

...میں:۔“

...میں: اب غلطی کرنے کی ٹوہت ہی نہیں آئے گی۔ صاحبزادے خود مختار ہیں۔ آزاد ہیں اپنی مرضی کے مالک

...میں:۔“

...میں: ڈیڈی۔ آپ.....“

...میں: ہاں۔۔۔۔۔ صرف تصویریں بھیجے پراکتفا کیوں کیا پرو پوزل بھی ساتھ بھیج دیتے۔ قبول ہو جاتا.....

...میں:۔“ کیا ضرورت تھی ہزاری۔“

...میں:۔“

"اس گھر کی تصویریں۔ سلسلہ جنابانی کا یہ نیا طریقہ عجیب ہے۔ جس کو تم نے ایجاد کیا ہے۔ لڑکی مجھے پسند آتی ہے۔ اعزاز ہرگز نہیں پاتا تا دینا۔ کل تمہاری می کو بھیج دوں گا۔"

"کیسی لڑکی.....؟ کس کا رشتہ؟" شہیرہ حیران کھڑے تھے۔

"بنتے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارا حق تھا۔ اچھا ہوا تم نے استعمال کر لیا۔ ویش آل اپنی ماں کو ایڈریس دے دینا۔"

"مگر..... ڈیڈی..... کس کا ایڈریس دے دوں۔ ہائی گاڈ میں کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔ نہ ہی میں نے کہیں کوئی تصویریں بھیجی ہیں۔ ڈیڈی! آپ لوگوں کے ہوتے ہوئے میں ایسی حرکت کر سکتا ہوں، بھلا مجھے کیا پڑتی کہ شہیرہ لڑکیوں میں اپنے گھر کی تصاویر باغیچہ پھروں۔ سارے گھروں جیسا ایک گھر ہے یہ بھی..... ایسی کون سی خوبی ہے اور اگر ہو بھی تو زیادہ لوگوں کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ آئی ایم سوری ڈیڈی! آپ نے مجھے کتنا غلط سمجھا۔ آپ باہر سے پوچھ لیجئے۔ یہ تصویریں میں نے بنائی بھی نہیں۔ مجھے ایسے فنکاروں کا ہونے کے لیے فرصت ہی کہاں ہے۔ آپ تو خواہ مخواہ بھلا ہوا ہے۔ شادی بھی مگر اور آپ کا سر راد ہے۔ ارادہ میں تو ایسی ضرورت محسوس نہیں کر رہا اور ڈیڈی ان دنوں تو مجھے بس ایک ہی فکر ہے۔ آپ خفا ہو گئے تو اسٹیشن میں میرا معاون اور مددگار کون ہوگا۔"

"آپ تو بیچے پر خواہ مخواہ گرم ہوتے جا رہے۔ میرا شہی عام لڑکوں جیسا نہیں ہے۔ سدرہ کہتی ہے۔ مغرب کی آزاد دنیا میں بھی اس نے نظر اٹھا کر کسی لڑکی کو نہیں دیکھا۔ یہاں پر....."

"چھوڑو چھوڑو اس موضوع کو..... کل شام بہر حال دو لڑکیوں ایک عدد تصویر کے ساتھ یہاں آئی تھیں اور انہیں دیکھ کر میرا اس معاملے میں پڑتا تھی امر تھا۔ خیراد دیکھا جائے گا۔ ہاں وہ غلطی اب تک نہیں جاگا۔ یعنی تم لوگ ناشتا کرو اور سٹیلا منٹ ماؤنٹ کی طرف جاؤ۔ اسے یہاں بلانے کا یہی مقصد تھا کہ وہ تمہارا ساتھ دے۔ نہ کہ پڑا سوار ہے۔"

عندی آنکھیں ملتا جگن میں داخل ہوا۔

"آداب ڈیڈی..... آداب ہی....."

"اور وہاں سن..... جاگ گئے۔ میرا خیال تھا کہ تمہیں جگانے کو باقاعدہ کسی....." جمال احمد مسکراتے ہوئے بولے۔

"نہیں نہیں ڈیڈی میں خود بخود ہی جاگ جایا کرتا ہوں۔"

"جیوں، نماز کا وقت اپنے گزرنے کے بعد۔" جمال احمد نے غمزدگی سے کہا۔

"نماز تو آج میں نے بھی نہیں پڑھی ڈیڈی۔" شہیرہ نے عندی کو سہارا دینے کی کوشش کی۔

"رات ہی میں آئے تھے۔ سوئے بھی پیرس۔"

"کوئی بات نہیں۔ جاگتو وقت پر گئے ہاں۔" عندی نے پتے کی بات کہی۔

تیبوں جس پڑے۔

"اچھا عندی تم لوگ آج پورا دن بی لصریہ رہو گے۔ ملک عطا محمد..... جو بددی احسان الحق علامہ قریظ حسین ان سب سے میں نے بات کی تھی۔ اچھے اپنے مذاق میں انہوں نے جلسے کا انتظام کر رکھا ہے۔ رات شہیرہ کی ایجنٹ کے ہمراہ کلاء جھ سے مل کر گئے ہیں۔ شہیرہ کی حیرت ان کے لیے ایک چیلنج ہے۔ وہ شہیرہ کی حیرت کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ وہ سب لوگ ساتھ جا رہے ہیں۔ جو بددی احسان الحق کہہ رہے تھے کہ

ایک کامیاب ترین جلسے کے انتظامات مکمل کر چکے ہیں اور شہیرہ کی بات سننے کے لیے علاقے کے لوگ جوق در جوق وہاں آئیں گے۔ جو بددی احسان کا بیٹا جو بددی ڈیڈی شہیرہ کا کلاس فیلو تھا۔ اس لیے وہ شہیرہ کی ذاتی طور پر طرف ہے۔ جو پوسٹرز میں نے اس علاقے میں لگے دیکھے ہیں ان میں واضح طور پر درج تھا۔ ماضی کے بے گناہ طالب علم لیڈر شہیرہ عسکری۔"

عندی کے ذکر پر شہیرہ کو جھرجھری سی آئی۔ چہرے پر شام کی مدھم تار کی جیسے سائے لہرانے لگے۔

"اسکے ڈیڈی! ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم لوگ ہاؤس میں جا جائیں گے۔"

"اور ہاں عندی..... اپنے علاقے کی طرف بھی چلے جاؤ۔ گو وہاں جا کر شہیرہ کے لیے تقریر کرنا ضروری نہیں۔ لیکن پھر بھی غریب لوگ شہیرہ کی آمد پر بار بار باغ ہو جائیں گے۔ اس طرف کے سارے ووٹ تو بندھے بندھائے لیتے کے ہی ہیں۔"

"بہتر جناب چاہے رات کو ہی واپس کیوں نہ ہو ہم وہاں کا چکر لگا کے آئیں گے۔"

"اور ہاں..... بھائی سے پوچھ لینا کہ کل شام مجھ سے ملنے والی دو لڑکیوں میں سے اس کی پسند کون سی ہے۔ جتانے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ تمہیں بتا دے گا۔"

"ڈیڈی..... لڑکیاں آپ سے منے آئیں مگر کیسے؟"

"میں کیا جاؤں ہوگی تمہارے بھائی کی پلاننگ کہ میں گھر پر نہیں ہوں تم آ کر میرے ڈیڈی کا ووٹ جیت لو۔"

"تیار کرتے ہیں آپ خواہ مخواہ میرے بیٹے پر الزام لگاتے جا رہے ہیں۔ کیا خبر کون تمہیں وہ لڑکیاں اور آپ کو یہ خبر بھی نہیں کہ ہم سب نے فسطیہ کو اپنی بیوی بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"فسٹیہ یعنی مراد کی بہن۔" عندی حیران تھے۔

"ہاں..... ہاں اس سے اچھی لڑکی اور کہاں ملے گی۔"

"بظرف..... خاصا اچھا خیال ہے مگر ڈیڈی..... شہیرہ کے باپ..... کیا شہیرہ اب تک ان سے ملا نہیں۔"

"کیا ضرورت تھی اسے ملنے کی....." عندی نے حیرت کی بات ناگوار لڑی۔

"میں آفر آل وہاں کا بیٹا ہے۔"

"کیسا بیٹا..... کس کا بیٹا؟" عندی نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہارے ڈیڈی کا بیٹا ہے۔ شادی ہو لیتے وہ۔ بھجواویں نے پکارا۔ تاکہ وہ آئیں اور شہی کو..... اس کے خیر کو..... اس کی شان و شوکت کو..... اس کی دھن کو..... اور ان کی نیکیوں کو دیکھ جائیں جو شہی کے اوپر گرد ہیں۔ میں تو ہر لمحہ دعا کرتی ہوں میرا شہی ترقی کے ساتویں آسمان تک پہنچ جائے۔ اسٹیشن حیرت سے..... وزیر بن جائے..... تاکہ اس کے ستم گر باپ کو یہ احساس ہو سکے کہ اس نے ایک تالیب میرا کھو دیا۔"

جمال احمد نے تالی بھائی۔

"ویری گنڈ..... ویری گنڈ..... شہی بیٹا..... کسی اور کی تو ضرورت ہی نہیں۔ انتہائی مہم میں صرف ہی کو اپنے ساتھ لکھو۔ تقریر بہت اچھی کر لیتا ہیں۔" وہ شاید بات ٹالنا چاہتے تھے۔

وہ مسکرا دیں۔ دھجھ کہا نہیں۔

عندی نے جگن بس ہی ہاتھ منہ نہ بنایا۔ تو می نے اسے گھور کر دیکھا۔

"بچپن کی عادت اب تک موجود ہے۔ تالان نہیں کے..... لیکن سزا دھونے کی جگہ ہے بھان۔"

”مٹی ناشتے میں بھی تو وقت گئے گا اور ایک گھنٹے بعد ہمیں یہاں سے رخصت ہو جانا ہے۔“

یہاں اس لیے کہ ظہیر اس سے بے پناہ لگاؤ رکھتے تھے۔ لیکن گوہر نے اپنے ارد گرد فیصلوں کی خاردار بازو لگا لی۔ کوئی اس تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

”میرے انتہائی کوشش کی۔ اس کا دل جیتنے کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے اور اعلیٰ التحیم کا بہانہ بنا کر غیر ملک سدھار۔ گوہر نے خدا کا شکر ادا کیا۔“

شہ سالوں کے کتنے دن اور کتنی راتیں گزر گئی تھیں۔ اسی بھاری رات کبھی اس پر نہ آئی تھی۔ اس کی پریشانی باہر شہر بھر میں لگے بیسز اور پمپرز تھے۔ بڑے بڑے بیسز پر ایک نام! اپنا پوری آب و تاب کے ساتھ جھگڑا ہوا۔ کتنے سلور ٹرے لکھا کھین گولڈن ٹرے سے تحریر کیا۔ وہ تب بھی شاید یوں پریشان نہ ہوتی۔ لیکن اس کی توجہ تو ”خار نے اپنی جانب کھینچی۔“

اور کوئی لمحے کی مہمان ہے گزر جائے گی رات  
پو پھٹے تک آپ اپنی موت مر جائے گی رات  
ہے اتق سے ایک سنگ آفتاب آسنے کی دیر  
نوٹ کر مانند آئینہ کھر جائے گی رات

یہ اشعار نے اسے کتنی دیر بھرے بازار میں رواں ہواں سڑک پر دک جانے پر مجبور کر دیا۔ اس نے ادھر ادھر اٹھا۔ ایک اور جگہ پھرتا لگا تھا۔

”ناسی قریب کے ہر دوغز بے پاک۔ ہزر۔ طالب علم لیڈر۔ حق کی آواز۔ سچائی کے پرستار..... شیخ  
... بیت کے جان نثار پروانے..... شبیر شاہنواز عسکری کو اپنا قیمتی ووٹ دے کر کامیاب کیجئے۔“

عوام کے دلوں کی آواز  
شبیر شاہنواز شبیر شاہنواز

یہاں کارپوریشن کے دفتر کی باؤ نظری والی پر اس قسم کے کھنڈے دیکھے تھے اور اس سے تھوڑا سا آگے.....  
نروڈ کے ایک موڑ پر شبیر شاہنواز کی قدر آدم تصویر دیکھ کر وہ گویا وہیں جم کر رہ گئی۔  
”یہ تو میں گوہر عسکری۔“

اس نے گڑبڑا کر اپنے دائیں جانب دیکھا۔ نل پو نیفارم میں میجر عیلام حسن اس سے مخاطب تھے۔  
”باؤ آریو۔“

اس نے تصویر سے نظر میں چڑا کر بے مشکل میجر کی طرف دیکھا۔  
”جسے بازار میں اکیلا کیا کر رہی ہیں۔ ساتھ میں کوئی نہیں آیا۔“  
”اوہ السلام علیکم۔“ وہ پوری طرح عیلام حسن کی طرف متوجہ تھی۔  
”ہاں بلکہ السلام..... حیرت ہو رہی ہے آپ کو تہجد کیجئے۔“

”کیا باں۔ کارنگ سے نقل تو یاد آبا آپ نے آنے والے بچے کے لیے کچھ خریداری کرنے کو کہا تھا۔ مگر جانے کے  
۔ ادھر آ گئی۔“

”یہاں آ کر گونا گوں بیسز اور پمپرز میں الجھ گئیں۔ ظاہر ہے پالیٹکس کی اسناد کو کیا ست سے دلچسپی تو  
ہی۔“

اور کوئی لمحے کی مہمان ہے گزر جائے گی رات  
پو پھٹے تک آپ اپنی موت مر جائے گی رات  
ہے اتق سے ایک سنگ آفتاب آسنے کی دیر  
نوٹ کر مانند آئینہ کھر جائے گی رات  
جو بھی ہیں پردہ شب جو بھی غلٹ پست  
وہ تو جائیں گے اتنی جانب جدھر جائے گی رات  
اٹل طوقان! بے بسی کا گر بنی عالم رہا  
سوج خون من کر ہر اک سر سے تزر جائے گی رات  
رات کا اجماع بھی معلوم ہے مجھ کو سرور  
لاکھ اتنی حد سے گزرے تا سحر جائے گی رات

گوہر کتنی دیر سے ان اشعار میں گم تھی۔ چند سال پرانی یہ ڈائری..... اس میں کبھی سرور بارہ ہلکوی کی یہ غزل  
جس دست کی تحریر کر رہی تھی۔ وہ گوہر کے سینے کھتا جیسی ہو چکا تھا۔ لیکن جنسی تو بھر بھی نہیں تھا۔ بعض چیزیں جو دل  
میں بس جائیں..... روح کو مکان بنالیں۔ اچھی کتب ہوں تو اور یہ تحریر تو اس ہنر کی تھی۔ جس کے لیے ایک  
دن گوہر نے اپنا سب کچھ چھوڑ کر دیا تھا۔ جس کے لیے ایک عمر اس نے کائناتوں پر سفر کیا تھا۔ جس کے لیے ان  
گنت حروف ملامت اس نے اپنے نامن میں چھپا لیے تھے۔ جس کے لیے خواہ مخواہ ہی اپنی ذات وقف کر بیٹھی  
تھی۔ رات کا ایک بج چکا تھا۔ گوہر والے کمرے میں کھینچے گئے تھے۔  
کتنی دیر وہ امجد کی غزل سنتی رہی تھی۔

وہ تیرے نصیب کی بادشیں کسی اور چھت پر رہیں گئیں

دل بے خبر میری بات سن اسے بھول جا اسے بھول گیا

لیکن امجد کی یہ نصیحت اس کے کام نہ آئی۔ وہ تو ایک ملن کا ہے نہ جنوں کی تھی۔ ایک لمحے کو اس کی یاد  
سے دور نہ ہوتی تھی۔ بس جہاں بے درویش اپنی تہائی سے تھوڑے کر کے اپنے حصے کی ذمہ داریاں نبھائے چلی جا  
رہی تھی۔ دلوں وہ نابل خانہ کے عتاب کا شکار رہی تھی۔ دونوں فرٹیں اس کا جگر جلائی رہی تھیں۔ دلوں اس کی  
جرات زندانہ خانمان بھری گنگو کا موضوع بنی رہی تھی۔ لوگ اسے سیدائی خیالی گرتے گئے تھے۔ وہ بس چپ  
رہی تھی۔ خاموش..... اپنی صفائی میں ایک حرف بھی نہ بولنے کا ہیرو کیے۔

یہاں تک کہ دنیا نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اماں نے بھی اس کے سامنے کسی رشتے کا ذکر نہیں کیا  
تھا۔ بابا نے سب کچھ اس کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ شاید اس زیادتی نے جو بابا نے دانستہ کی تھی لیکن مجبوراً..... ان  
کی زبان بند کر رکھی تھی۔ بھائی! اپنی اس گولڈ میڈلسٹ۔ بہن کی جاسٹے کس خوبی سے اتنے مرعوب تھے کہ اس  
کے شب و روز میں ہلکی ہی مداخلت کی انہیں کبھی جرأت نہ ہوئی۔ بس ایک جوہر آپا ہی ایسی ہستی تھیں جو گوہر سے  
قریب تھیں۔ اچھی بری بات کہتی سنتی تھیں۔ یا میجر ام شاہنواز تھی..... گوہر کی ماموں زاہدہ..... جو گزارتے  
سالوں میں خواہ مخواہ ہی اس کے نزدیک آ گئی تھی۔ ارم اسے بھائی بنا چاہتی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وارم کی پسند

”پھر اب کیا ارادے ہیں۔“ خیر مقدی مسکراہٹ کا رنگ بہت گہرا تھا۔  
”کچھ بھی نہیں۔“

”یعنی شاپنگ نہیں کریں گی۔“

”نہیں..... وہ تو کروں گی۔ بہت سی بیڑیاں لےنا ہیں نیکل بھائی بہت مصروف ہیں اور آپی کہتی ہیں۔ انہیں ایسے چیزوں کی سمجھ بھی نہیں۔“

”اور آپ کو ہے۔“ میجر نے مسکرا کر گوبر کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں۔ بھائیوں کے بچوں کے لیے خریداری کر کے آگئی ہے۔“

”پہلے آج ہم بھی آپ کی اس سمجھداری سے استفادہ کرتے ہیں۔ سوئے اتفاق ہمیں بھی اپنے ایک دوست کے نو زائیدہ بچے کے لیے کچھ لینا ہے تو کیوں نہ دونوں مل کر یہ کام نہ پھیلے۔“

گوہر مرہت میں انکار نہ کر سکی۔ ورنہ اس وقت وہ اپنی طور پر سب سے جدا کبھی ہوتی تھی۔ خریداری کا ارادہ بھی ملتوی کر چکی تھی۔ مگر اسے مجبوراً سامنے موجود پارکسٹل اسٹور پر جانا پڑا۔

جمال احمد..... عدلی کے ساتھ ڈپارٹمنٹ اسٹور میں داخل ہوئے۔

”مئی کو بھی آج ہی یہ ایسی اسٹ پکڑا تھی۔“ عدلی بڑبڑائے۔

”کام کرنا سیکھو..... بر خوردار کام کرنا..... تمہیں خبر ہے تمہاری مئی کو ہمارے سوا کسی کی خریدی چیز پسند نہیں آتی تھی اور ہم بھی گھر کا سودا سٹل لاکر خوش ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔“ جمال احمد نے شوخ لہجے میں کہا۔

”اس میں اہمیت کی کوئی بات ہی نہیں ڈیڈی۔“ عدلی نے اختلاف کرنے کا اظہار کیا۔ جمال احمد چلتے چلتے رک گئے۔ عدلی کی طرف دیکھا۔

”عدلی بن جمال! جالے کیوں میرے چاہنے کے باوجود تمہارا ذہن آمرانہ ہی رہا۔ بیٹے..... تمہیں خبر ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کام اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے۔ میں سنت کی دیروی کی خاطر تمہاری مئی کا ہاتھ نانا اچھا فرض خیال کرتا ہوں اور یہ سوا سٹل کی ذمہ داری تو ویسے بھی مردی ہے۔ ایسے کاموں سے عزت نہیں گھٹا کرتی! تو تمہیں میں گھنل کر جینے کا چاہتا ہوں۔“ وہ ایک کاغذ کی طرف بڑبڑائے۔

سامنے گوبر کھڑی تھی۔ بچوں کی ریڈی میڈ کپڑوں کا انبار اس کے سامنے تھا۔

جمال احمد اسے پہلی نظر میں پہچان گئے۔ پہلو میں میجر میلا م حسن تھے۔ بننے مسکرائے ایک ایک فرائڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ گوہر نے جمال احمد کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ وہ اس کے قریب پہلے گئے۔

”بھئیے انارڈی میں بھی ہوں انارڈی تو آپ بھی ہیں..... لیکن یہ پہلی خریداری لگتا ہے شل کر اچھی ہی کر ڈالیں گے۔“

”جی ہاں اور یہ سلسلہ ہی طرح چننا رہا تو.....“

”ایک دن ماہر ہو جائیں گے اس معاملے میں۔ ویسے کریڈٹ آپ کو ہی جانا ہے۔ پسند آپ کی ہے۔“ وہ مسکرائے۔

”پسندیدہ سے بچتے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔ میں نے تو آپ کے انتخاب کو ترجیح دی ہے۔“ میجر میلا م اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ جمال احمد آگے بڑھ گئے۔

”کون لوگ تھے بیڈیڈی..... میں تو انہیں نہیں جانتا۔“

”ہرے کوئی نیا تو بیڈا جوڑا تھا۔ شاید پہلے بچے کے لیے خریداری کر رہے تھے۔ میں بے اختیار رک گیا۔ ہر زمانے کی اپنی بات ہوتی ہے۔ ہمارے زمانے میں یہ کام بڑے بڑوں کے سپرد ہوا کرتا تھا۔ تم بیڈا ہوئے تو تبارکی بانی جان کو زبردست پراہم ہوئی۔ انہوں نے سامان ایک کا تیار کیا تھا۔ آگے تم دو ایک ساتھ..... تب نیت بائٹل سے بھاگ کے بازار آ پڑا۔ بس وہی خریداری میری کسی بچے کے لیے پہلی خریداری تھی۔ میں اس وقت اپنے انارڈی پن کا ان کے انارڈی پن سے مقابلہ کر رہا تھا۔“ عدلی نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دونوں ابھی تک خریداری میں ہی الجھے ہوئے تھے۔ جمال احمد گوبر کو فوراً سے دیکھنے لگے۔

”عدلی! وہ پر خیال انداز میں بولے۔“

”جی ڈیڈی۔“

”جاننے ہو یہ لڑکی کون ہے؟“

”نہیں ڈیڈی! میں نے.....“

”ارے یاد آیا۔ کچھ دن پہلے یہی لڑکی تو ہمارے گھر آئی تھی۔ ساتھ میں ایک اور لڑکی بھی تھی۔ شوخ و شریری۔ ارے عدلی! ہم نے تو اپنے بچے شہیر کے لیے اسی لڑکی کو پسند کیا تھا۔ چپ چاپ خاموش طبع..... خوب صورت۔ ہم نے سوچا تھا۔ عدلی..... شہیر کو یہی لڑکی پسند ہوگی۔ مگر..... اب ہم سوچ رہے ہیں۔ ہم نے شہیر کو ڈائن کر غلطی کی۔ اسے بے چارہ تو واقعی ان کو نہیں جانتا ہوگا۔ ارے نہیں جانتا ہوتا تو..... تو وہ اس طرح اجنبی بن کر توڑ آتیں۔“

”اب خیال سے عدلی..... ان سے پوچھ جائے۔“

”ڈیڈی! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ وقت اس جان پہچان میں گزار گیا۔ تو مئی خفا ہوں گی۔ چاہے آپ کو.....“

”خبر کیا ہوا ہے؟ آنکھ بچے سب مہمان آ جائیں گے۔“

”اوہ..... آل رائٹ چلو پھر۔“

”..... سہ سہ سہ سہ گئے۔ عدلی سب اختیار اس چیز سے کی طرف دیکھنے لگے جو بچہ کی کپڑوں میں الجھنے لگے۔“

”اب وہ ہمیں ان کے دل میں سر اٹھانے لگی۔“

”کاش وہ بھی..... وہ بھی کسی بچے کے لیے خریداری کر سکتے۔“

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

”اب سب سے رات دو بجے تک اسے ایک ہل پہن نہیں آیا تھا۔ اس کی نظروں میں وہ تہہ آدم تصویر..... چمکتے۔“

”اب میں لکھنا دو نام اور سرور بارہ بنگوی کی شاعری کی جوتی رہی پھر وہ تصویر ہی تصویر میں فسطیہ کی سانگرہ میں جا کر انہوں نے ایک نام کا بڑا چہرہ چا تھا۔ ہر زبان پر اس کا تذکرہ تھا۔ اس نے پرانی ڈائری کے ساتھ رکھی پرانی، لمبھی لکھی، بس میں ایک تصویر اپنی تمام تریادوں کے ساتھ رکھی تھی۔“

”تم زندہ ہو شہیر..... تم زندہ ہو..... گوہر کے لیے اس سے بڑی خوشی کی خبر! ہر کیا ہو سکتی ہے لیکن حیرت منت حیرت ہے۔ تم زندہ ہو گئی ہو اور اس شہیر میں بھی لیکن گوہر سے بے نیاز..... غافل ہو..... نہیں نہیں شہیر کی کہتے تم نہیں یہ کون اور شہیر ہوگا۔ تم سا..... تمہارا نام نام..... تمہارا بے جیسا مزاج رکھنے والا۔“

”جی..... جانے مئی اور وہ تو رہی۔ اچانک گھر کا سٹاٹا ملی فون کی گھنٹی نے توڑ دیا۔ گوہر نے جلدی جلدی



آواز کی لرزش اور آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کی۔ کھٹی بھی چلی گئی۔  
"ہیلو!"

"ہیلو ہیلو بول رہا ہوں۔ یہ تم ہونا گوہر....."

"جی دو لہا بھائی یہ میں ہوں۔"

"مگر تمہاری آواز کو کیا ہوا اور رات کے تم جاگ رہی تھیں کیا؟"

"جی..... جی نہیں۔ ابھی جاگی ہوں۔"

"پھر شاید خواب میں دروغی تھیں۔ تمہاری آواز صاف بتا رہی ہے۔"

"چھوڑو یہ آپ بتا رہے ہیں آپ نے اتنی رات گئے ہوں کیوں کیا۔"

"بھئی تمہاری آواز کو ابھی پتہ نہیں لگتا ہے۔ انہاں جان کو چکا وہ پلیر..... اور تم بھی ساتھ چلو تو بہتر ہے۔"

"جی اچھا..... میں ابھی چگانی ہوں انہیں آپ....."

"ہاں ہاں میں جو ہر کوہ پہنچ چھوڑ کر تمہیں لینے آنا ہوں۔"

ہاسپٹل کے کٹنگ ڈارڈ میں جو ہر کوہ لیریم میں لے جایا جا چکا تھا۔ انہاں اندر گوہر کوہ یڈور میں بے چین وہ بے قرار کھڑی تھیں۔ ماں تر آتی آیات کا دورہ کر رہی تھیں۔ کچھ دیر پہلے سورہ ہم پر پڑھ کے پانی پر دم کر کے اندر بھجوا دیا تھا۔ گوہر ماں کو ڈھ سے روم میں لے آئی۔ خود بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔

چند وقت کے فاصلے پر نرسز اسٹیشن تھا۔ چند ڈاکیاں وہاں بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھیں۔ اونچے اونچے قہقہے کوہ یڈور میں گونج رہے تھے۔ انہاں کچھ پڑھ رہی تھیں۔ ایک دو ڈاکٹر وہاں سے گزریں تو گوہر ان کی طرف لپکتی۔

"ڈاکٹر! میری بہن خیریت سے ہیں نا؟"

ڈاکٹر نے ہنسنے کوہر کوہ دیکھا۔

"اوہ..... میرا خیال ہے آپ مسز ہیل کی سسٹر ہیں..... گوہر عسکری۔"

"جی ہاں۔"

"ہم ان ہی کی طرف جا رہے ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" گوہر ان کے جانے پر بھی وہیں رہتی رہی۔

نرسک سیاست کے موضوع پر؟ کئی تھیں شاید۔ مگر ماگرم بحث ہو رہی تھی۔

"یہ بات گروہ میں ماندھ لہ۔ جیت شیر عسکری کی ہوگی۔"

"جناب مدد مخالف کوئی ایسا ایسا نہیں۔ ہر اسنے سیاست دان ہیں۔ ہمیشہ سے جیت ان ہی کا مقدر رہی ہے۔"

"تھیں حضور عوام بہت سمجھ دار ہو چکے ہیں۔ انہیں اب حسین بھٹو کی نہیں عمل کی ضرورت ہے۔"

"تو یہ کون سی کتاب میں لکھا ہے کہ شیر عسکری با عمل انسان ہوگا۔"

"اس کی ہسٹری اس بات کی گواہ ہے۔ وہ غریبوں کا دوست ہے سرمایہ داروں کا دشمن ہے۔"

"اور خود ایک سرمایہ دار کا بیٹا ہے۔" کئی ایک نے ایک ساتھ تہہ لگایا۔

"صرف نام کو..... ورنہ تمہیں پتہ ہے۔ اس میں اور اس کے سرمایہ دار باپ میں کوئی ربط یا تم نہیں۔ یہ میرا نہ

صرف اس لیے کہ سرمایہ داری کا لیبل ہٹ جائے اور غریب اسے اپنا چھٹی بھی خواہاں نہیں۔"

اگر حقیقت کا علم نہ ہو تو بھاری کھٹل میں ایک مارنا بے کار ہوتا ہے۔"

"اچھا تمہارے پاس گویا اس کی کھٹل ہسٹری شیت ہے۔"

"جی ہاں اس لیے کہ میرا بھائی اسی کالج کا طالب علم تھا جہاں شیر بھی پڑھتا تھا اور اس نے انسانوں کے حقوق کے لیے طالب علم میڈر کے پیٹ فلاہ کو بڑی خوبی کے ساتھ استعمال کیا تھا۔"

"پھر یہ کہ حکومت نے اسے شہید کیا اس کی زبان بند کر دیا۔ اسے حکم سے باہر بھجوا دیا۔"

"نظا..... حکومت نے اسے باہر نہیں بھیجا۔"

"پھر میں نے؟"

"ملا سکتی تھی کروں نے۔ بغاوت نے۔"

نصرف چند ذاتی الفاظ ہیں یہ حقیقت نہیں ہے۔ اگر قبول تمہارے اس کا ایسے سرمایہ دار باپ سے کوئی تعلق نہ ہو تو بگ لہرا خیر جو اس نے مہنگوں میں اس شہر میں تعمیر کرایا ہے۔ اس محل لہرا گھر میں کئی آرائشی چیزیں پیش آت تیرتھ اور ہمدردت لہرا زبات کہان سے آئے۔ کیا اس نے ڈاکٹر لہرا جوری کی۔ یہ سب حکومت کی عملیات ہیں۔ انہوں نے شیر عسکری کو قہریہ لیا ہے۔ اس انکیشن میں اس کا کٹرا ہوا بھی اس بات کی نشانی ہے کہ وہ۔" بحث

نہیں تھی۔ تمہیں صرف دوٹ دینا ہے۔ مرنے ہو تو وہ دینا۔ کچھ اچھا سننے کی کوشش نہ کرو۔

نہیں تھی۔ تمہیں صرف دوٹ دینا ہے۔ مرنے ہو تو وہ دینا۔ کچھ اچھا سننے کی کوشش نہ کرو۔

یہ بددیانتی ہے۔ ظلم ہے۔ بے وقافی ہے۔ بھلا کیوں نہیں استعمال کرے گی اپنا حق۔ تمہاری طرح ہر انسان یہی

نہیں تھی۔ تمہیں صرف دوٹ دینا ہے۔ مرنے ہو تو وہ دینا۔ کچھ اچھا سننے کی کوشش نہ کرو۔

نہیں تھی۔ تمہیں صرف دوٹ دینا ہے۔ مرنے ہو تو وہ دینا۔ کچھ اچھا سننے کی کوشش نہ کرو۔

نہیں تھی۔ تمہیں صرف دوٹ دینا ہے۔ مرنے ہو تو وہ دینا۔ کچھ اچھا سننے کی کوشش نہ کرو۔

نہیں تھی۔ تمہیں صرف دوٹ دینا ہے۔ مرنے ہو تو وہ دینا۔ کچھ اچھا سننے کی کوشش نہ کرو۔

نہیں تھی۔ تمہیں صرف دوٹ دینا ہے۔ مرنے ہو تو وہ دینا۔ کچھ اچھا سننے کی کوشش نہ کرو۔

بھی۔ تم بھی بک گئے۔ اپنی خواہشات کے ہاتھوں۔ مگر کون سی خواہشات۔ تمہیں تو دنیا میں اس اور صلح کا سفیر بنا کر بھیجے کی خواہش تھی تمہیں امیری اور غریبی کا فرق منانے کا ارمان تھا۔ تمہیں تو غیریت سے محبت تھی۔ تم تو ظلم و ستم کے اندھیروں میں محبت اور نرمی کی شمع لے کر روشنی پھیلانے چلے تھے۔ کاش۔ اسے کاش۔ تم اس راہ پر چلتے چلتے مٹ گئے ہوتے۔ مجھے فکر ہوتا۔ میں خوشی سنا کیلیاں دنیا میں مٹی لیتی۔ تم بھی وہی ننگے ہی۔ اپنی بے جا خواہشات کے شلام آخرب تک دور رہے۔ کب تک ایک ٹکڑہ راہ پر چلتے۔ تم بھی پروردو شب غی تھے ظلمت پرست تھے۔ تم بھی اسی سمت چلے گئے۔ اسی راست کی سمت جس کے اندھیروں میں عوام کاٹھن چوسنے والے درندوں کی پہچان ہی نہیں ہو پائی۔ آئی۔ آئی بیٹ یو شہر مسکری۔ آئی بیٹ یو۔ مجھے نفرت ہوئی ہے شہر مسکری تم سے نفرت شدید نفرت۔ اپنی ذات میں میں ایک قطرہ دن کیوں نہ سہی سہن کسی ظلمت پرست کے لیے اچھے دل میں ذرہ بھر چکر رکھنا۔ میرے آدرش کی موت ہے اس اونچے آدرش کی موت جس کے سبب ایک دن تم میرے دل میں سا گئے تھے کہ تم میرے آدرش پر پاد سے اترے تھے۔ مجھے تم میں ایک ایسے انسان کی جھلک نظر آئی تھی اس انسان کی جس کی جس جیسے ہزاروں جہانوں کی عالم اسلام کو آج بھی شدت سے ضرورت ہے۔

پر تم وہ نہیں تھے۔ تم وہ نہیں ہو۔ تم وہ نہیں ہو۔ جس کی خاطر میں نے عمر کی کئی گزیاں بولیں بے کار بے مقصد بنا دیں۔

آس دیاس کی صلیبوں پر لگی روز جیتی اور روز مرنی رہی۔ تم سے بے خبر رہ کر بھی میں برآمد ہوئی۔ سر ہانڈھی۔ مجھے تم پر باز تھا۔ میں تمہارے تم پر جینا چاہتی تھی۔ میں نے ایک زمانے سے تمہاری خاطر گزارا کیا۔ ایک ایک کا مقابلہ کیا۔ خود کو والدین کی نظروں میں کھینکنا کیا نہیں ہاں تمہارا مانی۔ مجھے تمہارے وجود کا مان تھا۔ تمہاری ذات پر بھروسہ تھا۔ میرے خیالوں میں ایک حسین دنیا آباد تھی۔ صلح و امن کی امن دنیا۔

میں سوچتی تھی۔ تم جانے کہاں ہو۔ زندہ ہو یا اپنے مقصد کی بیخست چڑھ گئے ہو۔ تم جہاں بھی ہو۔ میرے دل میں زندہ ہو۔ میرے احساس کے دیے میں ایندھن بن کر جالا کھیر رہے ہو۔ تم مجھ میں ہو۔ میں نے تمہارا مشن جاری رکھا۔ انسانوں کی مدد کا مشن۔ مظلوموں کو ان کا حق دلانے کا مشن۔ میں ایک کردار لڑتی تھی۔ دم و دراج کی قیدی۔ میں نے تمہارے دم کا لبادہ اوڑھ لیا۔ گوہر مسکری کے بجائے شہر مسکری کے نام سے سہی رہی۔

ہر اس اخبار میں ابران ہرید سے میں نئے عوام سے ان کے مسائل سے دلچسپی لیتی۔ میں نے اسی نام سے ہم چلائی چراغ سے چراغ روشن کرنے کی ہم۔ میں ہستی ہستی کو جو چاہتے انسان کا آئینہ رہی۔ میں نے ایک انجمن تشکیل دی۔ انسان دوست۔ عوام دوست۔ وطن دوست۔ انجمن۔ مجھے تمہارے ارادوں سے بھی یاد تھا نا شہیر۔ میں نے تمہارے ارادوں کو کھنی جامہ پہنانے کی کھنی لگا۔ اپنے ارادوں کو جمع کر لے۔ میرے ارادوں کو لوگ بھی میرا اصلی چہرہ نہ پہچان سکے۔ کیونکہ میرا اور ان کا تعلق صرف لکھنؤ کی حد تک تھا۔ میں جانتی تھی۔ بابا جان کی طرح تمہیں بھی تو آزادی پسند تھی۔ ہورت کو تم بھی تو چپا کر رکھنے کی چیز کہتے ہو۔ سو میں لچکی رہی۔ ہنسنے میرے وہ خیالات دنیا کے سامنے رہے جن باتم نے پابندی نہ لگائی تھی۔

شاید یہ بھی ہو شہر مسکری کہ میرے اس عمل نے تمہیں لوگوں کے دلوں میں زندہ رکھا ہو۔ کتا سے بوس جانے کہاں گزار کے تم پلٹے ہو تو کسی نے یہ محسوس ہی نہیں کیا کہ تم انجمن ہو۔ لیکن انہیں کیا خبر تم تو اپنے آپ کے لیے بھی انجمنی ہو گئے ہو۔ چند سال پہلے کا شہر شہیر تمہیں نہ پہچان سکے۔ تم سے نظر س نہ لگا۔ کیونکہ اس شہر کی

زندگی کا مقصد یہ نہ تھا جو آج تمہارا ہے۔ تمہارے دل میں حکمرانی اور ہوس دنیا جیسی خواہشات نے جنم لے لیا ہے۔ تم جو دیوانے تھے۔ تم جو مجنوں تھے۔ تم جو مختون تھے۔ غریبوں کے حقوق کے ان کی بھلائی کے۔ ان کی ترقی کے۔ تم جو جج کی راہ پر چلے تھے۔ بھلائی کی چوٹی میں تم رک گئے اور اب تم لینا اے اقتدار سے دل لگا بیٹھے ہو۔

اور میں جو تمہاری پرستار تھی۔ تمہاری دیوانی تھی۔ تمہاری مجنوں تھی۔ اب میں تم سے نفرت کرنے لگی ہوں ہاں شہر نفرت ہی نفرت ہے میرے دل میں کہ شاید مجھے تم سے نہیں تمہارے ذمہ تمہاری خوب صورت سوچوں سے چار تھا۔ اب جب کہ وہ دل وہ ذہن تمہارا نہیں میں کس سے محبت کروں گے چاہوں۔ میں واپس چار ہی ہوں شہر۔ اپنی دنیا میں۔ شاید مجھے یہ سفر تھا کاٹنا ہے۔ شاید مجھے اکیلے ہی دنیا سے چلنا ہے۔ گل تک تمہارا خیال میرا نہیں تھا۔ آج وہ بھی نہیں۔ کچھ بھی باقی نہیں رہا۔

اس نے صوفیوں کے بازو پر سر رکھا دیا اور سہا ڈال کر رو دی۔ تاکہ ساتھ بیٹھی اماں کو خبر نہ ہو سکے۔ "مبارک ہو مبارک ہو ایک حدیث بتوانا بیٹے نے اس دنیا میں کھلی سانس لی ہے۔" نیل کی بے قرار یوں کو قرار آ گیا۔ اماں بدحواس ہو کر ڈاکٹر کی طرف بھاگیں۔ نیل نے گوبر کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پر خوشی کی ایک کھلی سانس لہری تھی۔ وہ تیزی سے گوبر کے قریب آئے۔ "گوبر مجھے مبارک ہو دو۔ تمہارا بھانجا پیدا ہوا ہے۔ خدا نے یہ خوشی ایک طویل انتظار کے بعد ہمارا نصیب بنائی ہے۔"

نیل کے ہاتھ اس کے شانوں پر تک گئے۔ انہوں نے حیران ہو کر گوبر کو دیکھا جس کی آنکھوں میں آنسو بند ہو گئے تھے۔ موتی بن کر ٹھہر گئے تھے۔ اس نے جلدی سے ہتھیلیوں کی پشت سے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ بھاگ دوڑ میں کتنے لمبے گز گئے کتنی تیزی سے گزرے اسے خبر ہی نہ تھی۔

"بہت بہت مبارک نیل بھائی۔ بہت بہت مبارک۔ خدا کرے آپ کی خوشی دائمی ہو۔ سدا سلامت رہے۔" اپنی خوشی میں نیل گوبر کی پریشانی نہ بھانپ سکے۔ اور نیل کی وارڈ کی طرف بڑھ گئے۔ جہاں جوہر کو منتقل کیا جا چکا تھا۔

وہ بھی اماں کے ساتھ وہیں چلی آئی۔ بند پر دروازہ جوہر چہرے پر مسکا کا نغہ لے تھی مطمئن اور خوش نظر آ رہی تھیں۔ خدا نے یہ خوشی ایک طویل امتحان کے بعد ان کا مقدر بنائی تھی۔ وہ بیڈ کے قریب آئی اور جھک کر اپنی پیادہ آئی کی پیشانی پر ہم ٹی۔

جھولے میں خوب صورت گلاب جیسا پچ آکھیں بند کیے جین کی نیند سو رہا تھا۔ گوبر نے اسے بغور دیکھا۔ ایک نامعلوم احساس نے اس کے دل میں اس نئے وجود کے لیے جیڑی بھاری بھاری کر دیا۔ وہ اس پر جھک گئی۔ اور اس کے گلابی رخسار پیار کے ساتھ چھو لیے۔

"بیٹا تو بہت پیارا ہے آبا بکھن۔"

"نیل بھائی کی تصویب۔" فقرہ اندر آتے نیل نے عمل کر دیا۔ گوبر کو ہنسی آئی۔ جھٹ بولی۔

"حسن کن کے سوا کیا کہوں اسے۔" جوہر نے نیل کی طرف دیکھا۔

"تو تمہارا لیا خیال ہے بچہ تم پر گیا ہے۔"

"کس کا ہے؟"



"اگر تمہارا یہ خیال ہو کہ تمہاری آپنی ہم سے زیادہ حسین ہیں تو یہ بھی تمہاری خوش فہمی ہے۔" نیل نے گوبر کو مخاطب کیا۔

"جی ہاں آپ تو یکٹائے روزگار ہیں۔"

"دعا دو کہیں ہم سہا حسین خوب صورت۔ ایسے ہی نہیں مرگے جس تمہاری آپنی ہم پر۔"

"سورنی سرا! پھر تو آپنی نے لاکھوں پائے اگر پچھو تو آپ پر گیا ہے تو آپ بے مثال تو نہ رہیں گے۔ کوئی تو ہوگا آپ سے مقابلہ کرنے والا۔"

"میرا خیال ہے گوبر سے ماں کا ہم شکل ہی رہنے میں۔ آئندہ بھی کسی سے کم نہیں ہے۔"

"گوبر! بس دئی۔ جو ہر کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی۔"

"خامسے چالاک ہیں آپ۔" انہوں نے شوہر پر پونٹ کی۔

"لیکن آپ سے کم۔" نیل نے برجستہ کہا۔

"میں نے جو کہہ دیا ہے کہ بچا اپنی ماں پر گیا ہے تو چپ ہیں۔ کہ چلو ایک حسین مصوم بچوں کو ہم سے مشابہت دینی چاہی ہے خاموشی بھرتے ہو رہتے ہو ہم کچھ نہیں اور جو اب میں یہ چپ رہیں یہ کسی کتاب میں لکھا ہی نہیں۔ ویسے جو ہر اپنی داؤ سے تمہاری انگوٹھی بہن اپنے انگوٹھے سے تو بیلے بنائے گی اور پھر زیادہ خوش دکھائی نہیں دے دیتی۔"

"دیس تو نیل بھائی آئی ایم دیری ہیں۔ میں تو بہت زیادہ خوش ہوں۔ اس بچے کی آرزو آپ سے زیادہ مجھے تھی۔ میری دعاؤں میں یہ آرزو بھی شامل رہی۔ سدا میں نے آپنی کے لیے آپ کے بے دعاگی آپ کے پیار کا شکریہ ادا ہے۔" گوبر نے گئی۔

"نیل نے چونک کر اسے دیکھا۔"

"کیا بات ہے گوبر؟" وہ اس کے قریب آئے۔

"کیا بات ہے؟ یہ آج تم ہات ہات پر رونے کیوں لگ جاتی ہو۔ آج تو خوشی کا دن ہے۔ تمہاری آپ کی برسوں پرانی آرزو پوری ہوئی ہے۔ میں نے سب کوفون کر دیا ہے۔ ابھی پہنچا ہی جا رہے ہیں گے۔ ہاں وہ میجر عیلام بھی پوچھ رہے تھے کہ سنے کی انگوٹھی خالہ جانی تو آج بہت خوش ہوں گی۔ سب سے پہلے انہیں ہی مبارک یاد کیے گا۔"

"گوبر نے اپنی آنکھیں صاف کر لیں۔"

"پاگل ہیں آپ کے یہ میجر عیلام حسن۔"

"تو پکڑ لی بی۔ آہستہ بات کرو۔ آری کے ایک آفسیر کو یا گل کہہ رہی ہو۔ کسی نے سن لیا تو دھری جاؤ گی۔"

"کسی نے کیا خود میجر عیلام حسن نے ہی سن لیا ہے۔ لیکن شخص لوگ اتنے اچھے ہوتے ہیں کامریڈ! کیا ان کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کی جرات ہی نہیں ہو پائی۔ ہزار خواہش کے باوجود۔"

"گوبر ایک دم شرمندہ ہو گئی۔ میجر عیلام اس کے سامنے کھڑے تھے۔"

"تمہا مہمان مبارک ہو بھائی اور مس گوبر عسکری صاحب۔"

"آپ کو بھی میجر عیلام۔" گوبر کو میجر عیلام بہت باوقار لگتے تھے۔ بلکہ وہ تو سنجیدگی سے گوبر کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

"ہم اسے بڑی کرسی پر رکھ گئے۔"

"آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ شیر کی مڑوں پر فضا مارش تھا۔ کئی جگہوں پر ٹریک بلاک ہو کر رہ گئی۔"

"چلو کسی نہ کسی طرح پہنچ گئے یار۔ ہمارا ولی عہد بالکل ہم پر جائے گا۔ ہم بھی تو لوگوں کی خطائیں اکثر بخش دیتے ہیں۔ لیکن خیریت اتنا شرس کس سلسلے میں تھا۔ کہیں اٹل شیر ہمیں مبارک باد کہنے تو نہیں چلے آ رہے۔"

"اوہو یار اب اسے بھی اہم نہ ہو۔"

"تو پھر کیا تھا؟"

"وہ دراصل آج ایک امیدوار کا جلسہ ہو رہا ہے، اقبال پارک میں لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ یار۔"

"اتنا ہے اس دفعہ قومی اسمبلی کی میٹ یہ بندہ بیٹھتی جائے گا۔"

"کون؟ امیدوار تو چار پانچ ہیں۔"

"لیکن شیر شاہنواز عسکری کی پوزیشن بے حد اونچا ہے۔" سب نے سوائے گوبر کے چونک کے۔ میجر عیلام کی طرف دیکھا۔

"شیر شاہنواز عسکری۔" گوبر بڑبڑائیں۔

"ہاں ہاں جگہ ہنڈ ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ اب کی تو خبر نہیں سنا ہے کانٹ اور پونڈوشی لائف میں لیڈر تھا۔ وہ شہرت آج کام آ رہی ہے۔ اور ایک محبت وطن پر اس نے سیاسی لیڈر جمال احمد اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ پھر پورے ترقی سے اسے سپورٹ کر رہے ہیں۔"

"شیر شاہنواز عسکری۔" نیل نے نام دہرایا۔

"گوبر۔ یہ یہ..... تمہارے ماموں زاد شیر شاہنواز تو نہیں ہیں کہیں۔"

"ایک مدت سے اس کی تو کوئی خبر ہی نہیں۔ جیل میں تھا وہ۔ پھر لاپتہ ہو گیا۔ کیا خبر یہ کون ہے۔"

"یہ آپ کے کزن ہیں۔" میجر عیلام حیران تھے۔

"شاید۔" گوبر نے مختصر کہا۔

"تو پرائیم میرے پاس ایک پوسٹر ہے چھوٹا سا۔ اس پر ان صاحب کی تصویر بھی چھپی ہوئی ہے آپ دیکھ لیں۔" میجر عیلام نے پوسٹر جیب سے نکالا۔

"ارے میجر عیلام۔ آپ کو کبھی دیکھی ہے انہی باتوں سے۔" گوبر نے پوسٹران کے ہاتھ سے لے لیا۔

"دیس بھائی میں جیب میں بیٹھا تھا ایک پوچھ مجھے پکڑا گیا میں نے لے لیا۔"

گوبر پوسٹر دیکھ رہی تھی۔

"نیل۔ یہ تو اپنا شیر ہے۔ شی۔ ریلی یہ شیر ہی تو ہے۔ کچھ شیر ہے۔" بے اختیار گوبر کی نظر میں گوبر کی طرف آئیں۔ وہ اس طرف متوجہ ہی تھی۔ کمال بے نیازی سے وہ کمرہ چھوڑ کر چلی گئی۔

"میجر عیلام۔ یہ میرا ماموں زاد ہے۔ آپ میرے ماموں سے بھی ملے ہیں۔ اس دن پارٹی میں جو سب سے

شوٹ و شیر پر لڑی تھی ارم وہ شیر کی بہن ہے۔ اوہ میرے خدا تو کتنا مہربان ہے۔ ایک دن میں وہ خوشیاں دیکھ ساتھ مجھے دے دیں۔"

گوبر ہمارے خوشی کے رونے لگیں۔ میجر عیلام انہیں دیکھتے رہ گئے۔

نیل نے پوسٹر خور سے دیکھا۔

"اف کوری جوئی۔ یہ تو تمہارا کرن ہی ہے۔"

"مگر نیل۔" خوشی کسی دکھ میں بدل گئی۔ جو ہرنے نیل پر نظریں جمادیں۔ نیل ہلکے لگنے کے منتظر تھے۔

"اس شہر میں آ کر اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ ہم لوگوں سے نہیں ملا۔ کئی حیرت کی بات ہے۔"

"کچھ لوگ اپنے زخموں کا حساب اور جلنوں میں سدا کے لیے غصہ کرتے ہیں شاید اسی سبب۔"

جو ہرنے آنسو پونچھے لیے۔ باہر بہت سے لوگوں کی آمد کا شور اٹھا۔ پھر سب لوگ اندر آ گئے۔ بات وہیں کی

وہیں رہ گئی۔ اماں۔ بابا جان۔ شیری بھائی۔ بھائی۔ نیل کی والدہ ان کی بکنٹیں۔ ارم شاہنواز ماموں۔ سب کے

سب ایک ساتھ آ گئے تھے۔ میجر عیلام حسن کمرے سے نکل آئے۔ کپاؤٹ میں گورنر ایک کرسی پر نیم دراز تھی۔

"میں گورنر۔" اس نے ایک دم چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ اشکوں کی برسات میں ڈوبی آنکھیں میجر عیلام

کے سامنے تھیں۔

"آپ دور ہی ہیں۔ خیریت تو ہے۔"

"جی خیریت ہی ہے۔"

"کمال ہے میرا خیال ہے یہ پہلا واقعہ ہوگا کہ بندہ یوں زخموں و جھاراؤں سے صرف اس لیے بہا رہا ہو کہ خیریت ہے۔"

وہ چپ ہو گئی۔

"بوسے مائیکوں آخر کیوں؟ میں جب سے آیا ہوں آپ پریشان ہی نظر آتی ہیں۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"وہ کیسے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد مجھ پر اپنے جرم سے انکار کرتا بھی رہے تو کون سا ہے۔ بے قصور ماننا

ہے۔ آپ کو جانا ہوگا مس گورنر۔ جانا ہوگا کہ آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں۔ آپ کے دکھ اور سگڑ شہر کرنا چاہتا

ہوں۔ ہائی گاڈ مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ کیوں؟ آپ جیسی بے سعیت اور سویرائی کا یوں رونا مجھے بہت کھلا ہے۔"

"دس از مائی اون پرائیم میجر عیلام حسن اور اپنے ذاتی مسائل میں میں نے اپنے والدین اور بھائیوں کی

شرکت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ آپ۔ آپ تو پھر بھی نیل بھائی کے ایک دوست ہیں اور بس۔"

میجر عیلام کا چہرہ سرخ ہو کر رہ گیا۔ گورنر کے الفاظ سے اس کا نچوڑا ہوا تھا۔

"او۔ کئے۔ میں بھول گیا تھا۔ کسی کے ذاتی معاملات میں یوں دخل نہیں دیا جاتا۔ خدا حافظ۔"

وہ ایڑیوں کے بل گھومے اور کیا ڈنڈے کے دروازے سے باہر نکل گئے اور ان کے جانے کے بعد گورنر اور بھی زور

چور سے آنسو بہانے لگی۔

"گوری۔ گوری کی بیٹی۔ اے مس گورنر۔ ارم وراثے میں کھڑی اسے آواز دیں۔ سدا ہی تھی۔

بھری محفل میں تماشا ہنسنے سے قبل اس نے اپنے آپ کو سنبھالنا چاہا۔ آج کل رٹو کر آ سوسان کے لیے اور وہ سر پر

آنا چاہتی۔

"بھئی۔ گورنر۔ آج کل تو تمہارے لیے مبارک ہی مبارک ثابت ہوا۔"

"آئی کا جینا تمہیں بھی مبارک ہو ارم۔"

"اور شہر کی واپسی صرف تمہیں مبارک ہو۔" ارم نے جلتے بیچے انداز میں کہا۔

"جسبیں کیوں نہیں۔ بلکہ مبارک باد وصول کرنا اب تمہارا حق بن گیا ہے ارم۔ اب وہ وہی تجو ہے جو تم لوگ

پاہتے تھے۔ ایک محل نما گھر کا ٹانگ۔ ایک سر نہی دار۔ شان و شوکت اس کی کیتیز۔ دولت اس کی لوٹری۔۔۔۔۔  
خوش ہو جاؤ۔ وہ سر عبداللہ کی جگہ لے لے گا۔۔۔۔۔ انکیشن جیت کر وزیر بن جائے گا۔۔۔۔۔ غریبوں کی حمایت کے  
نعرے لگا کر حکومت تک پہنچ کر غریبوں کا خون چوسنے اور ان کے گلے کاٹنے میں وہ سر عبداللہ کے بیٹے کا بھرپور  
ساتھ دے گا۔"

"پاپا کو اس زہریلے شخص کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔۔۔۔۔ وہ آج بھی اس سے نفرت کرتے ہیں۔ پاپا کے پاس  
کس چیز کی کمی ہے جو وہ اس کا دارا بن گیا میں گے۔ ہم سب ان کے بغیر بولت سے بجا رہے ہیں۔ تمہاری دنیا میں  
گزر چوکی۔ گھر آباد کر لینا اب۔۔۔۔۔ ہم سب کو خوشی ہوگی۔۔۔۔۔ ہم سب تمہاری جدائی گوارا کر لیں گے۔"

"ارم خدا کے لیے ارم۔۔۔۔۔ چپ رہو۔ مت کہو ایسے الفاظ۔ وہ میرے لیے نہیں تھا وہ میرے لیے نہیں ہے۔  
اس کی اور میری راہیں جدا جدا ہیں۔ کاش میں نے عمر کے قیمتی سال ایک سراب کے پیچھے دوڑتے بھاگتے نہ  
گزارے ہوتے۔ کاش۔ ارم۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔۔"

یہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"سننا ہے آج وہ ایک عظیم الشان جلسے سے خطاب کرنے والا ہے۔ کیا تم اس کی خوب صورت الفاظ سے بھی  
جذباتی تھریر بھی سنے نہیں جاؤ گی۔ ہاتھ بلند کر کے اسے دانیس دو گی۔ اس کا حوصلہ نہیں بڑھاؤ گی۔ اس انتخابی  
مہم میں اس کا ساتھ نہیں دو گی۔ لوگوں کو اس کی غلطی کا قائل نہیں کرو گی۔ جاؤ نا گورنر۔۔۔۔۔ چ۔۔۔۔۔ چ۔۔۔۔۔ چاں  
نے تمہیں بلایا ہے۔ اپنی وطن واپسی کی اطلاع بھی نہیں دی۔"

"پہلے خیالات اور احساسات بدلتے ہیں۔ پھر راستے بدل جاتے ہیں۔ اس کی منزل ساتویں آسمان پر رونق  
افروز اس کی منتظر ہے ارم اور میں زمین کی ایک ادنیٰ ہی ہوں۔ اسے میری ضرورت تھی؟"

"تم ہوش میں تو ہونا گوری۔۔۔۔۔ سچ کہہ رہی ہو۔"

"ہاں ارم شاہنواز! نکل سچ۔ آج میں نے جان لیا ہے۔ وقت فاصلے پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے اور میرے  
درمیان بندھنے والا نہ ختم ہونے والا قاصد ہے جو اب عمر بھر کی پیش رفت کے بعد بھی جوں کا توں رہے گا۔"

"بھڑا۔۔۔۔۔ ایک سیٹ۔ ارم نے تالی بجائی۔

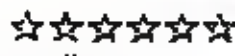
"تو یا ر ایسا کر دو۔۔۔۔۔ جلتے جلتے ہیں۔ جلسہ گاہ میں نہیں جائیں گے۔ گاڑی میں بیٹھے رہیں گے۔ ایک نظر  
میں صوف کو دیکھ لیں گے کہ گزریے دیوں نے مزاج ہی بدلا ہے یا شکل و صورت بھی۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ تم جانا چاہو تو چلی جاؤ۔۔۔۔۔ مجھے جس بیڑے سے مطلب نہ ہو میں نے اس کے پھل سٹنے  
کی کبھی کوشش نہیں کی۔"

"یہ اتنی تم کہہ رہی ہو تم۔۔۔۔۔ ارمے کس کا نر کو جانے کی پڑی ہے۔۔۔۔۔ میں تو تمہیں آزار ہی تھی۔ اچھا چلو۔  
اندرو تو آؤ۔ سب تمہارا پوچھ رہے ہیں۔"

"چلو۔۔۔۔۔"

وہ اٹھ کر اندر چل دی۔



"شہیر بھائی۔۔۔۔۔ شہیر بھائی۔۔۔۔۔ شہیر بھائی۔" کھٹ پٹ کرنی تیز تیز چلتی وہ ان کی طرف آ رہی تھی۔ سارے  
دن کی سخت ترین مصروفیت کے بعد یہ چند لمحے آرام کے ملے تھے۔ شہیر لاؤنچ میں پڑے صوفے پر ہزار تھے۔



اسے آنا دیکھ کر اٹھ بیٹھے۔

”یہ شوہر بھائی۔“

”کادورا.....“ وہ سیدھے منہ ہو گئے۔

”نیچے جا سب.. خور چا رکھا تھا آپ نے۔ ہائے میرا بھائی..... ہائے میرا بھائی..... ہو گیا ہے فارغ..... ایک فلم کی دو تین تصویریں رہ گئی تھیں..... میں نے پوز مار دیے۔ تصویریں دیکھ کر آئیں..... فسطیہ باجی کی برقعہ ڈالے پارٹی کی تصویریں ہیں۔“

”چھوڑو تصویروں کا ذکر..... چڑھو گئی ہے مجھے تصویروں سے۔“

”کیوں؟“ وہ ٹانوں میں پوچھ رہی تھی۔

”ایک تو تمہاری فسطیہ باجی نے جانے کہاں کہاں تصویریں پھینچا دی ہیں۔ ڈیڑی سے ڈانٹ کھانا پڑی تھی..... خود سوچو مادورا..... میں بھلائیوں میں تصویریں پھینچا ہوا ہوں۔“

”کیوں کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“

”پہلے غصہ رہنے دیں..... آپ یہ تصویریں تو دیکھیں۔ فسطیہ باجی کی اسکرین ہوئی بھی غضب آئی ہے۔ فونو جینٹل چہرہ ہے۔ ہر تصویر میں بیارن لگ رہی ہیں شوہر بھائی یہ فونو گرامی میرا کمال ہے۔“

”وہ مادورا کی طرف دیکھنے لگے۔ بہت بڑا تھا نہیں مادورا سے۔“

”لاؤ دکھاؤ۔ تمہاری شکل نا قابل برداشت ہے۔ ہمارے لیے ہم سر کے بل دیکھیں گے ضرور دیکھیں گے۔“

”دیکھیے جناب۔“

شوہر ایک ایک کر کے تصویریں دیکھنے لگے۔ ایک دو تین چار..... اچانک ایک تصویر پر ان کی نظر کیار کی رنگ و پے میں نظر میں اور محبتیں ایک ساتھ گردش کرنے لگیں..... انہوں نے غور سے تصویر کو دیکھا۔ وہ دیکھی تھی۔ بالکل وہی۔ ویسا انداز۔ وہی شکل۔ بصورت۔

مادورا کیا کہے چار رہی تھی۔ اس سے بے خبر وہ اپنے آپ سے نہرنا آ رہا ہوا ہے۔ تھے..... تصویر ایک برقی تھی۔ ان کے احصاب پر اپنی پوری شدت سے گرتی۔

”شوہر بھائی..... آپ تصویریں دیکھتے دیکھتے مراقبے میں طے مگے ہیں کیا؟“ اس نے کان کے قریب منہ کر کے بلند آواز میں کہا۔ شوہر بڑا کراس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سکرانے لگے۔

”بھئی مراقبے میں تو جانا تھا۔ تمہاری فسطیہ باجی نے اپنے ارد گرد کس مخلوق کو بچا رکھا ہے۔ انہوں نے تصویر آگے کر دی۔

”اللہ شوہر بھائی..... یہ جن پر یاں نہیں نہتی پسرا میں ہیں۔ باجی کی سہیلیاں ہیں۔ کان کی پتھر اڑ رہی ہیں۔ کچھ کلاس فیلوز اور بس.....“

”اچھا.....“

”مگر آپ حیران کیوں ہوئے؟“

”حیران نہیں پریشان ہو گیا ہوں۔“

”شاید آپ نظارہ نہیں رہی۔ شوہر بھائی باجی کی سہیلیاں ایک دوسرے سے بڑھ کے سن گئے۔“

شوہر پھر کسی خیال میں کھو گئے۔ فطرت کی ایک ساہر پھر خون میں غود کر آئی۔

”مگر مادورا بیٹے..... ہر حسین چہرے کی تہہ میں ایک حسین دل ہو یہ ضروری تو نہیں۔“

”جی.....“

”کچھ نہیں..... کچھ نہیں..... میں سناؤ کر رہا تھا۔ بڑی پیاری ہیں یہ تصویریں۔ کمال تو فونو گرامی کا ہے۔ تم نے بری چیزوں کو بھی اچھا کر دکھایا۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”ہماری تصویر کب بناؤ گی؟ ایک عدد تم ہمارے لیے بھی تربان کر دو یا..... قسم سے تمہاری فسطیہ باجی کی ساری سہیلیاں فونو گرامی کریں گی۔ ہم ان سب سے زیادہ خوب صورت اور پرکشش ہیں۔“

”آپ کے کلم کی ہر تھی۔ گل ہی بنا دوں گی۔“

”ہو کے۔ لیکن ان دنوں ذرا سناؤ رکھنا۔ اس ایکشن کے پھندے نے ہمیں ادھ موا کر رکھا ہے۔“

”پہلے پہلی تصویر اس وقت بنے گی جب آپ ہار پھولوں سے لدے پھندے گھر میں داخل ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“

”کیا ٹھیک ہے؟“ عدی جانے کہاں آ گئے۔

”تصویریں..... تم بھی سناؤ ساتھ بنا لینا۔ تصویر کی تصویر مٹا لے کا متا بند۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔“

”کیا مطلب؟“

”بھئی بہت ڈنکھیں مارتے ہو اپنی شکل بصورت پر بڑا نا ز ہے۔ پتا چل جائے گا نا دیکھنے والے خود انصاف کر لیں گے۔“

”جل سالا۔ بیٹھا با تمیں ہار با ہے۔ ہمیں دیکھ غور کر بے چاری لڑکیوں کو جب پتا چلتا ہے کہ ہم شادی شدہ ہیں تو صدمے کے مارے وہ ہیں گر جاتی ہیں۔“

”اوہو کسا ایسا بانکا جیلا نو جوان ان کا مقدر نہ ہوا۔“

”آف کوزس۔ ایک ڈوبے اب تک کسی لڑکی نے نگاہ بھرد دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔“

شوہر ہنسنے لگے۔

”تمنی سچی بات کس نے بتائی ہمیں۔“

”میں اندھا ہوں کیا۔ میرے آس پاس سیلوں تک کوئی چاند چہرہ کبھی نظر نہ آیا۔“

شوہر کے چہرے پر تار یکیاں پھیلنے لگیں۔

”واقعی تم نے سچ کہا یا..... ہم میں کبئی ایسی بات تھی ان نہیں۔“ ان کی سچیدگی کو عدی نے حیرت سے دیکھا۔ شوہر ہاتھ میں پکڑی تصویر کو غور سے دیکھنے لگے۔

”میں تو سناؤ کر رہا تھا تم تھے سچیدہ کس سلسلے میں ہو گئے۔ الو کی دم..... تو کسی طرف متوجہ بھی ہو تو بات ہے..... تو نے کئی کئی کو دیکھا تو نہیں..... تیرا معیار بہت اونچا ہے تجھے محبت کی ضرورت ہی نہیں۔“

”میں عدی ماموں..... ہمارے طاعنان میں رواج ہی نہیں کڑے کڑے لڑکیوں کو دیکھتے پھر میں آپ کی شادی کرینڈ مانے اپنی مرضی سے کی تھی۔ شوہر بھائی کی شادی بھی ان ہی کی مرضی سے ہوئی۔ دیکھیے..... دیکھیے یہ فسطیہ باجی کسی سے کم ہیں کیا۔ شوہر بھائی کو تو لیا پڑی کہ وہ تاک جھانک کا گناہ اپنے سر لیتے پھر میں۔“





”بچر بھی۔“

”آپ خود ہی ملاحظہ فرمائیں۔ بانی قمر ڈویژن ہے۔“  
بابا جان سینہ سے ہویٹھے..... یہ ہر کا دل دھک سے رہ گیا۔  
”نہیں نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا۔“ دو بول اٹھی۔

اماں بھی شاید کان ویٹے ہنسی تھیں۔

”نکل آیا تا تب۔ دن رات ناول رسالے پڑھے جاتے تھے۔ قمر ڈویژن تو آتا ہی نہ۔“  
وہ ایک دم رونے لگی۔ پیدزلٹ اس کے لیے ناقابل یقین تھا۔

”ایسا ہو چکا ہے محترمہ۔ یہ دیکھیے یہ ہیں آپ کے نمبر۔“

وہ گزٹ کی طرف نگاہ کیے بغیر..... اندر کو بھاگی..... اور ہسٹری گر کے زارہ قطاروں نے لگی۔ باہر اماں سلوا تھیں۔  
سارہ جی تھیں۔

”بھئی کا چھ لایا کر رکھا۔ کام نہ کرنے دیا کہ بیٹا پڑھ لکھ کر باپ کا نام روشن کریں گی۔ اچھا سلا ملا ہمیں اپنی  
قرباتیوں کا..... عام کو کیا نمبر۔ میرے بس میں ہوتو کتابوں سے بھری کتابداری پر تھل چڑھ کر کراٹھ لگا دیں۔“

”کیوں شور مچا رہی ہو..... جو ہونا تھا ہو گیا۔ ایک تو پیسے سے گری ہے۔ اس پر شور مچا رہا۔ کھانا تیار ہوتو  
دستر خوان لگوا دو۔ اسرار اور شہری کہاں ہیں۔ ارنے یہ گوہر بھی نہیں ہے۔ کہاں چٹائی؟“ بابا جان نرمی سے کہہ  
رہے تھے۔ کسی موج میں بھی گہ تھے۔ بے یقینی بھی تھی۔

”کہاں جاتیں۔ اندر کمرے میں ہیں۔ بوہنا تھا اپنی قابلیت پر۔ تیرے دور سے میں بارہویں پاس کی ہے۔  
ظاہر ہے تم تو ہو گا۔“ بخت پاس کھڑے سکھان بکت اصلی خبر پڑھانے کے لیے عام ٹیم القادہ استعمال کر رہے تھے۔

سکھان جو ہر وقت گوہر کو دعائیں دیا کرتی تھی اس سے مرعوب تھی۔  
”نہ بھیا..... بیٹا تو بہت لائق ہیں۔ سارا سارا اون کمرے میں کھسی پڑھا کرتی تھیں۔ آپ مذاق کرنے لگے

ہیں۔“

”سکھان بی بی..... آپ کو تو ساری کتابیں ہی نظر آتا ہیں۔ سا جزا دی ہے۔ آر۔ خاتون کے لکھے  
مہ لے سولے ناول پڑھتی تھیں۔ امتحان ناولوں کا نہیں وہ سری کتابوں کا ہے۔“

اماں ایک تو ناول نگار خبیہ تھیں۔ نہ طالبات کا بیزار غرق کر دیا ہے۔ گوہر کی انٹاری رضیہ فرحت کے بے کار  
ڈونٹوں سے بھری بڑی ہے۔ جو ہر آ پائیں ہونے میں کیا دے کے جائیں گی۔ یہی سید کاہل۔ زورہ نگاہ۔

سیا باغلاب۔ شگفتہ سارہ صبیحہ صاحبہ ہوا ایک اور سلسلہ..... پتھر کے صنم، لہجے کے صنم، اشقیے کے صنم، ہر فن کے صنم  
پلاسٹک کے صنم غرض جانے کس کس چیز کے صنم۔ اماں آپ کی اس صاحبزادے نے پچی ہاتھ میں پکڑ کے ان  
مختلف اصنام کے لیے مجھے بازاروں کے ہزاروں چکر لگوائے اور تیبہ بی بی لگا جس کی لازم تھی تو امید تھی۔“

بابا جان نے غصے سے آنکھوں پر لگانے۔  
”اوسر لاف..... کہاں ہے گوہر کا رول نمبر..... دیکھوں تو سہی۔ آخر کتنے نمبر ہیں۔“ بابا جان بہت خاموش سے

تھے۔

”اے کیا کرے گی دیکھ کر بچھٹا کہہ رہا ہے کیا؟“ دروازے پر لگی سی دنگ ہوئی۔ بچر بھل گئی۔  
”بخت..... دروازے پر جا۔“

وہ گزٹ بابا جان کو دے کر دروازے کی طرف چلے اور وہیں سے ان کی آواز آئی۔

”ارے..... آپ..... یعنی آپ..... اماں جان دیکھیے تو یہ آپ کے..... عزیز۔ آپ کے بھائی کے فرزند  
دلہند۔“

”کون ہے..... ظہیر میاں ہیں۔“

”نہیں اماں..... وہ جن سے بچھلے دنوں اچانک آپ کی ملاقات ہو گئی تھی۔ میرا مطلب ہے ہاموں جان کے  
ہاں پارٹی میں.....“

”ارے..... میرا بیٹا آیا ہے..... شہیر ہے۔ آؤ بیٹا..... یہ کیا جنیوں کی طرح دیکھیں دیکھیں لگے۔ اسے اپنا گھر  
تھا..... یہ دھڑک چلے آتے۔“ اماں دروازے کی طرف لپکیں۔  
آنے والا رک گیا۔

”آؤ یاد رکھ کیوں گئے؟“ بخت نے فوراً کہا۔ اماں نے اسے گلے لگایا۔ چیشانی چومی اور بابا جان کی طرف  
سنے آئیں۔

”عام..... یہ شہیر ہے۔ میرے بھائی کا بڑا بیٹا..... میرا بھتیجا۔“  
”آداب بچو بچا جان۔“ وہ ان کے آگے جھکا۔

”چیتے رہو..... چیتے رہو..... آؤ جنہو۔“ بخت چپکے۔  
”دیکھو یاد..... اگر تم گوہر کی باعث شرم کامیابی کا سن کر آئے ہو تو کچھ مت کہنا ہمارے دل پہلے ہی چلے ہوئے

ہیں۔“

”گوہر..... کون ہیں یہ محترم..... اور بخت بھائی بھلا کوئی کامیابی بھی باعث شرم ہوتی ہے۔“  
”ہاں۔ جب خط تیرے دور سے کی ہو۔“

”بخت، تم بھی نرے بے وقوف ہو۔ اب بچے کو کیا خبر گوہر کون ہے یا اس نے کیسے۔“ اماں نے بخت کو لڑکا۔  
”سوری اماں..... پہلے تو تعارف ضروری ہے۔ ہاں تو شہیر عسکری صاحب۔ گوہر آپ کی پھوپھی صاحبہ کی  
سب سے چھوٹی اور نالائقی بیٹی ہے، جس سے مل کر تمہیں نایابی ہوئی۔ جب کہ بابا جان، آپ شہیر سے مل کر خوش  
ان گئے تھیں انہوں نے چھ سال ایف۔ اے کے امتحان میں پورڈ میں باپ کیا تھا۔“

”بہت خوب میاں خوشی کی بات ہے۔ اصل میں میں گوہر کی وجہ سے پریشان ہوں اور یوں بھی تم سے صرف  
ہم کی حد تک واقف تھا۔ پہلی بار دیکھ رہا ہوں..... اب وہ بھی اس عالم میں جب خود پریشان ہیں۔“

”مگر میں نے تو آپ کو پہچان لیا۔ دراصل پھوپھی نے آپ کے متعلق اتنی باتیں کہیں کہ میں بغیر کسی دلت کے  
بان گیا کہ آپ میرے بھوپھا جان ہیں۔“ دو قدرے رکا..... بابا گزٹ دیکھنے لگے۔

”پھوپھی بی بی اندر سے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ خیر مت تو ہے۔ کیا دلتی میں کوئی رورہا ہے یا میں ہی ایسا  
تسہن کر رہا ہوں۔“

”نہے بیٹا تمہارے کان تھوڑے ہی بجا رہے ہیں۔ گوہر ہے اندر۔ قمر ڈویژن پر رونے ہی نہیں تو کیا کرے  
ن۔ بخت کے باوجود.....“ اب اماں کو گوہر پر ترس آ رہا تھا۔

”اماں۔ آپ کیسی باتیں کرنے لگیں۔ محترم اندھے نہیں۔ آنکھوں والے ہوتے ہیں۔ بختی بخت کی اتنا لکھا  
ہوئے ہیں۔“



”بختیار عسکری۔“ پایا نے پکارا۔

”جی بابا جان۔“

”ادھر آؤ بیٹے! ہوو سامن سے بولے۔“

بخت ان کے نزدیک گئے۔ بابا جان نے ہاتھ اونچا کر کے ان کا کان مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”یہ رول نمبر میرا خیال ہے تمہاری بہن گوہر کا ہے اور نمبر میری نظر کے کہنے کے مطابق سات سو اٹھائیس ہی ہیں۔“

”سات سو اٹھائیس..... اماں اور شہیر ایک ساتھ کہنا تھے۔“

”جی..... جی بابا میرا بھی یہی خیال ہے۔“ بابا جان نے بخت کا کان مروڑ دیا۔

”اوہ بابا..... میرا کان.....“

”اور جو بیماری بچی کی ازجہ روئے میں خاص کر رہی وہ..... چلو نا معقول لڑکے جاؤ..... اس کے آنسو پونچھو۔“

اسے منانہ اور باہر لاؤ۔“ شہیر نے گزرتا اٹھانیا۔ بابا جان نے نشان دہی کی۔

”ہوئے رفل پچو پچا جان۔ آپ کی بیٹی ماشاء اللہ بہت لائق فائق ہے۔“

”ہماری بیٹی جو سوئی..... صاحبزادے تم آج کل پایا کر رہے ہیں۔“

”جناب بی۔ اے کا امتحان وے کر فارغ ہوں۔“

”رہتے کہاں ہو تم جو بیٹی پچھو سے اس نمبر میں مل پائے۔“

”زیادہ دور نہیں۔ عباس نگر کے ڈگری کالج میں پڑھتا تھا۔ وہیں کے ہوٹل میں رہائش تھی میری۔“

”گو یہ تم اپنے والد کے ساتھ ڈنمارک میں نہیں تھے۔“

”جی نہیں..... بلکہ پتہ چار سال کی عمر سے ہوٹلوں میں ہی رہ رہا ہوں۔ ڈیڈی کا خیال ہے۔ یوں میری پرورش اچھے طریقے پر ہوئی۔“ شہیر کے لہجے میں طنز ابھرا آیا۔

”اچھا خیال ہے تمہارے والد کا..... ایک یہ ان کی ہمیشہ ہیں۔ بچوں کو شہر سے دو قدم متہا جانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔“

”وہ شہری اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانے کو ہمت دے۔ انہوں نے ہاتھ بند کر رکھا ہے۔ میان تعلیم بہت فائدے کی چیز ہے۔ اس پر تنگ کا دار و مدار ہے۔ بخت کرو۔ تم سب یہ بخت تمہارے بھی کام آئے گی اور تنگ ملت کے بھی۔“

”اچھا ایف۔ اے میں تو تم نے ڈپ کیا۔ اب کیا ارادے ہیں۔“

”خدا ہی بہتر جانتا ہے جی۔ امیدیں تو بہت ہی ہیں۔ اللہ اپنا کرم کرے۔“

”خوشی ہوئی تم سے ہو نہا رہے تھے۔ لڑکھیں اچھی گوہر سے بھی بڑی امیدیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ خواہش کے لیے عائد کردہ شہری حدہ میں رہتے ہوئے خوب علم حاصل کرے اور ترقی کرے مگر تمہاری پچھو جی اسے گہر داری کے کھینچے میں الجھانا چاہتی ہیں۔“

شہیر نے ہاتھ کہا جا بگماتے میں بخت بہا پھسلا کر گوہر کو باہر لا چکے تھے۔ شہیر نے گوہر کی طرف دیکھا۔

”سرخ آنکھیں سرخ چہرہ..... آنسوؤں کے واضح نشان..... جنگلی نظریں۔ شہیر کی نظریں اس کے چہرے پر تنگ سی تھیں۔ گہری نظریں۔“

”یہ میری بہن گوہر سات سو اٹھائیس ماہ کنڈا بخت نے شوق لہجے میں اسے مطلع کیا۔“

”اور مائی ڈیئر سسٹر یہ ہم سب کے فرسٹ کزن شہیر شاہزاد عسکری۔ معاف کرنا شہیر تم وہوں کا تعارف ہے۔“

نادا ماحول میں ہوا۔ جب فضا میں بادلوں سے ڈھکی چھپی اور نہ دروں کا چند برس رہا تھا ابھی نہیں یہ سب تمہاری اس کے سبب تنگ میرے فراق کی وجہ سے ہوا اس لیے ہزار ہا ہوں کہ تم غلط فہمی کا شکار ہو کر واپسی کی نشان لہ پھیلے۔“

”شکلوں سے اس گھر تک آئے ہو۔“

”لو ہر سنے چونک کر اچھی سرخ آنکھیں شہیر پر جھاڑیں۔“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“

”آپ..... آپ..... آپ..... آپ.....“



"شہر عورت صاف ہے سوتی ہے صفیہ اور نہ ہر مرد و عاصم حسین۔"

"جہاں یہ بات بھی ہے..... آپ نے زندگی اصفیوں کے تحت گزار دی ہے۔ میں آپ کی سہاہن بی بی رہی۔ کم از کم میں کسی ایسے جاہل سے دو چار ہوتی تو یہ قلم بھی نہ کر سکتی..... ایک بیٹے کو باپ سے جدا کرنے کا قلم۔"

"اپنی اچھی سوجی کی بات ہے..... ویسے اب وہ کہاں ہے..... میرا مطلب ہے فراغت کے دنوں میں۔"

"بھئی نے اوپر کی منزل پر ایک کمرہ دے رکھا ہے۔ مہمانوں کی صورت آئے تو وہیں رہنا ہے۔ ویسے آج کل وہ زمینوں پر ہے۔ پختہ عشرے میں یہاں آ جاتا ہے۔ بتا رہا تھا..... پوچھو سکتی ہیں ناظرہ بی بی یہ یہاں سے چلا جائے گا..... آہ! بچے کی زندگی بھی کیا ہے پھر وہی ہو مثل اور بد مزہ کھانے..... جن چاہا آج اسے روک لوں۔ پھر رکھتی..... نہ جانے آپ کیا خیال کرتے۔"

"کیا خیال کرتے..... روک لیتیں..... میں تو کبھی کبھی خیال نہیں کروں گا..... البتہ ایک بات ہے..... شہیر کی گستاخیوں کا موجب سعید بھائی ہیں میں ہمیں شہیرا ہی کی..... کہ یہ آداب پھینچو بیٹھے سکھار رہے ہیں۔"

"اوپر بھی آپ راضی..... نشین میں تدبیر میں..... اور الزام مجھ پر۔ میں جانتی ہوں عاصم..... بھائی نے بیٹے کو پھونکے کے گھر کا راستہ ہی لیے نہیں لکھنا یا کہ پھونکے ہی اس کے دل میں باپ کی محبت اور اپنے حق کا احساس نہ چھوڑے۔ ہائے ہائے میرا بچہ..... سنا تھا اس کے بہت بڑے رئیس تھے۔ انتقال کر گئے۔"

"نہ نہیں۔ ماما کے بھائی رکھیں تھے..... ماما تو بروٹھر تھے۔ جن کی بیٹی شاہناز کی کلاس تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور شادی ہو گئی..... تمہیں یاد نہیں۔ اس شادی پر خود تم نے جو وہ بلا مچا تھا۔ بھائی کے سر پر سہرا دیکھنے کی حسرت دل میں رہ گئی تھی تھا۔"

"وہ تو قدرتی بات تھی..... اور آپ جیسے..... اس وقت پسند کی شادی سب کی نظر میں بہت بڑا جرم تھی۔ مگر جب میں نے شہیر کی ماں کو دیکھا تو ان کی ویرانی ہو گئی۔"

"ہاں ہاں جیسی تو پھونکے میاں نے ظلم کی اپنی کردی اس پر..... شاہناز کو زمینوں کی دیکھ بھلی سوچ دی اور اسے گھر میں قید کر دیا۔"

"میں اپنی بات کر رہی ہوں یا آپ کی نہیں۔" صفیہ جھلا گئیں۔

"صفیہ! تمہارا خاندان ظلم کرنے میں شروع سے طاق ہے۔ کہتے ہیں بھوک جیسا تو بندے کو مارتی ہوگی۔ لیکن طعنہ و تشنیع پہل سے پیچھے کر سکتے ہیں۔ وہ بے چاری بھی مر گئی۔ بیٹے کی پیدائش کے چند گھنٹے بعد اور اس کے مرنے کی خبر نے اس کے والد کو بھی ختم کر دیا۔ شہیر چار سال تک سعیدہ خانم کے گھر میں اچھوتوں جیسی زندگی بسر کرتا رہا اور جب شاہناز صاحبہ بڑی بن کر ان کے گھر میں مل گئی تو وہاں کی رہائش رکھنے اپنی بھیلی کو لے کر چلے تو شہیر خانم نے شہیر کی طرح گھر سے دور ڈال دیا گیا۔"

"بھئی وہ دن تو گزر رہی گئے۔ اب تو وہ خبر سے بی۔ اے کر چکا ہے..... اٹھارہ بیس سالہ لوجان ہے..... مزید تعلیم حاصل کرے گا۔ ترقی کرے گا..... دکھ کس دن تو گزر رہی گئے۔"

"آج میں نے شہیر کو دیکھا تو بہت کچھ مجھے یاد آ گیا..... یاد ہے تمہیں۔ ان دنوں تمہارے گھر میں میرے داخلے پر پابندیوں لگاؤں لگی تھیں..... میں چوری جیسے صرف تمہیں ایک نظر دیکھنے آ جایا کرتا تھا..... وہ مرحوم ہی تھیں۔ جو میرے ساتھ ہمدردی رکھتی تھیں اور تمہیں ایک نظر دیکھ لینے کا سامان فراہم کر دیا کرتی تھیں۔ انہیں تو تمہارے گھر میں ہیٹ بھر کر رہی کھانا بھی نصیب نہیں تھا شاید کوئی چیز میں ان کی پسند کی لے آ اور جھکے سے

انہیں دے آتا۔ اس ہاتھ شہیر سے دلی وابستگی ایک پل میں محسوس ہونے لگی۔ صفیہ! بعض لوگ ہرزہ بول جانے کے لائق نہیں ہوتے..... شہیر بی بی والدہ بھی تمہارے خاندان کا ایک اہم باب ہیں۔"

گوہر ایک ایک بات غور سے سن رہی تھی..... اسے ان باتوں کی اس سے پہلے خبر نہ تھی۔ وہ شہیر کے ذمے میں سوچ رہی تھی۔ اسے تو شاہناز ماسوں کے بارے میں بھی اس سے زیادہ خبر نہ تھی کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں لنگ سے باہر تھے اور اب لیٹ کے آئے ہیں۔ شہیر کا کہنا تو اس دن سے گھر میں شروع ہوا جب اماں اور جوہر آ پابک پارٹی میں شرکت کرنے ان کے گھر گئیں۔ گوہر اچھا لڑکیوں میں مصروف تھی اس لیے نہ جا سکی۔ دائیں پر اماں اس کا قلم پڑھنے لگی تھیں..... وہ شکل و صورت اخلاص سے اس لائق تو نہ لگ رہا تھا کہ ماسوں اس سے پیمانہ کریں۔

تو اصل وجہ یہ تھی کہ وہ سعیدہ ممانی کا سگا بیٹا نہ تھا۔ گوہر کو شہیر سے ما آ گیا۔ پھر وہ ایک دم لاپرواہ ہو گئی۔

"خیر مجھے کیا..... یہ لوگوں کا مسئلہ ہے۔ میرا مسئلہ تو صرف مزید غلطی پر ہو کر مام ہے۔ ان جوہر آ پابک کو بھی ان دنوں بیچا کے ہاں جانا تھا۔ وہ ہوتیں تو مجھے شہیر نہ سوچنا پڑتا۔"

اس نے آنکھیں موند لیں اور دنیا سے بے خبر ہونے میں کوشاں ہو گئی۔

☆☆☆☆☆☆

جوہر آ پابک پختہ بعد لوٹ آئیں۔ آتے ہی اسے گلے لگا کر پیار کرنے لگیں۔

"یہ کاسیالی مبارک ہو گوہر جان۔"

"آپ کو بھی۔"

"انہرے بچے کا تھا تیرا..... مارے فخر کے میری گردن اکڑ گئی۔ کاظم چچا بھی حیران ہر شہرہ تھے۔ ان کی اہوا میں رضا بھائی ہی ہیں تھوڑے بہت لائق..... درنہ سب ایسے ہی ہیں۔ ارے تصور کیوں نہ ہو تو نے..... لوگ قابلیت کے ساتھ ساتھ تیرے حسن بے مثال سے بھی مرعوب ہو جاتے..... جوہر آ پابک کو زمینیاں آراؤ فقط زمین اور تتر تے بے جا عزت تھے۔"

"ارے جوہر آ پابک..... تصویر کی بات کرتی ہیں مثال کچھ یوں ہے نا۔ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ!"

"کیا مطلب.....؟"

"بھئی میں میرے رزلٹ کے دن دو آن لکھے..... اور معاملہ ڈیک کر بلا اور دوسرا تم جڑ جاہ الا ہو گیا۔"

اسی وقت شہیر چلا آیا۔ "کیسے ہو؟" جوہر آ پابک نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں آپ سنا ہیے۔"

"ٹھیک ہوں بھی تو بیلا آیا۔"

"کیا کر رہے ہو آج کل۔"

"کچھ بھی نہیں۔ آشیانہ میں ہوں۔ کچھ دن چین و سکون سے گزارنا چاہتا ہوں۔"

"آشیانہ..... کئی چیز یا کا..... کو سے کا..... کس کا؟"

"ارے نہیں میرے پاپا کا آشیانہ۔ زمینوں کی دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ ٹریکنر خود چلاتا ہوں۔ خوب ویل فور چلاتا ہوں۔ کپاس کی چٹائی میرے ذمے ہے اور..... وہیں کے نڈل اسکول میں بچوں میں علم کی روشنی پھیلانے



میں اساتذہ کی مدد کر رہا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ اسنے دولت مند باپ کے بیٹے ہو یہ سب نہ بھی کرے تو بھی زندگی گزارنا کچھ مشکل نہیں ہے۔"

"جی ہاں۔" وہ مسکرایا۔

"آپ کیا کرتی ہیں؟"

"کیا کرنا ہے بھئی۔ گھر بیٹھے گرا جھڑے رشتے کے انتظار کے ساتھ..... البتہ یہ گھر بہت کچھ کر رہی ہے۔ اور کرنا چاہتی ہے۔"

"ہاں ہم بھی قائل ہیں ان کی قابلیت کے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ہم نے ان کا رزلٹ۔"

"اور سائے جیلنس ہو کر تصویر بندہ بننے کے فیصلے پر ہاں کی تائید بھی کی تھی۔"

"ارے....." شہیرہ حیران رہ گیا۔

"یہ خیر اسنے غلط انداز میں کس نے دی آپ کو۔ ہر اچھی بات کی حمایت کرنا فرض خیالی کرنا بیوں میں۔ پتو پھا جان اپنی ان ہی خوبیوں کے سبب پہلے دن ہی میرے دل میں اتر گئے۔"

"آپ کو خوش ہوئی تاکہ انہوں نے میری ایک مصوم خواہش کا ٹکڑا ٹھونٹ دیا۔" گوہر یوں بڑی۔

"مصوم خواہش۔۔۔۔۔۔ سے ایک نادانی کہیں..... نا جائز آرزو ہے..... آپ کی تصویر کا اخبار میں کیا کام....."

"وہی جو آپ کی تصویر کا تھا۔ ایک نمایاں کامیابی پر داد پانا میرا حق تھا۔ آپ نے دی تک چا سکتے تھے۔ میں آئینہ تصویر بھی نہیں دے سکتی۔"

"میں ایک لڑکا ہوں آئی میں ایک مرد۔"

"اور میں ایک لڑکی ہوں آئی میں ایک عورت۔"

"آف کورس۔"

"جیسے دبا کر رکھنا آپ جیسے مردوں کی فطرت۔"

"اور اس لیے کہ عورت چھپا کر رکھنے کی چیز ہے۔"

"تو کہہ دیجیے بابا جان سے ہند کر دیں دو مجھے اس چارہ پواری میں چھپا دیں دنیا کی نظر سے۔"

"لا حول ولا ایما کیوں کروں۔ آپ خیر سے ایک خواتین کالج میں علم پاری ہیں۔ مستقبل کی بہترین عورت بننے جا رہی ہیں۔ میں تو صرف تصویر کا مخالف تھا۔ تعلیم کا نہیں۔"

"مجھے خوشی ہے کہ پتو پھا جان میرے خیالات سے سہل کھاتے ہیں۔ آپ ان کی اپنی ہیں۔ ان سے مختلف نہیں ہوں گی..... اور یہ بات جو آج آپ کو ذرا مری لگ رہی ہے۔ شاید کچھ دنوں اندر مری نہ لگے۔"

"آپ کو کیسے یقین ہے۔"

"دلوں کی خبر توڑی بہت رکھتا ہوں۔"

"بھئی۔"

"یعنی لہ کون واؤنڈرنگ جان لینے کا دعویٰ ہے مجھے۔"

"واؤ آپ کو میرے دل کی کیا خبر آپ کو کیا پتا کس میں....."

"یہی تو ایک بانی بات ہے مجھ میں..... دلوں کے معاملے میں خاصا تیز ہوں۔ میں میں جان جاتا ہوں کہ کون

کیا..... چاہتا ہے۔"

جو ہر دلچسپی سے دونوں کی باتیں سن رہی تھیں۔

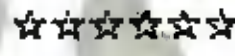
"تم نے سچائی کہا شہیرہ..... گوہر کے بارے میں۔" گوہر نے بہن کو گھورا اور ہنستی ہوئی باور چنی خانے کی طرف چلیں تو وہ بھی ان کے پیچھے چلی۔

"آپ بہت بے وفا ہیں جو ہر آپا..... نئے لوگوں میں کھو کر پرانے لوگوں کی دوستی بھول جاتی ہیں۔"

"اس میں بھولنے والی کون سی بات ہے گوہر..... تمہارے خیالات کون سے بابا جان سے کم ہیں۔ تمہو پر یہ ہے تو تمہیں خود بھی انکار دیتا اگر شہیرہ بے چارے کا اس معاملے میں دخل نہ ہوتا۔"

"وہ کیسے.....؟"

"ہاں تمہیں مخالفت برائے مخالفت میں دلائل دینا۔ خوبی آتا ہے۔ بحث و مباحثہ تمہاری سمجھنی میں جو بڑا ہے۔" جوہر آ پانے اسے حقیقت کا چہرہ دکھایا۔ تو وہ توخوڑی ہی جل بھن گئی۔ پتھر جو ہر آپا چائے لے کر دالان میں چلیں تو وہ اپنے گھر سے کسی طرف بڑھ گئی۔



یہ کسی بہت بڑے دولت مند گھرانے کا ذکر تھا۔ ایک توجہ پسند..... شکر گزار سے ہندے کا چھینٹ سا کلبہ تھا۔ جس میں ماں باپ کے علاوہ تین بھائی اور دو بھینس تھیں۔ عاصم حسنین عسکری..... ایک تیسرا گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے والد غلام حسنین عسکری کی وفات پر دو بہنوں ایک بھائی اور پوڑھی والدہ کا بوجھان کے کندھوں پر آ پڑا تھا۔ عاصم گھر کے بڑے بیٹے تھے۔ والد کی بھرتی میں ان کی اعلیٰ تعلیم محض ایک خواب بن جاتی اگر ان کے پتو پھا (جو کہ برطانوی فوج میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز رہے تھے اور یہ قانونی حکمرانوں کی مہربانی سے ریٹائر ہونے کے بعد ایک طویل و عریض زوری رقبے کے مالک تھے) ان کے مر پر اپنا دست شفقت نہ رکھتے۔ عاصم ایک خور..... ذہین اور لائق نوجوان تھے..... شادی کی کسی تقریب میں سر عبداللہ یعنی ان کے پتو پھا نہ گئے..... وہیں انہوں نے جہاں پار اپنے سالے کے جہاں سماں بیٹے کو دیکھا اور دن و جان سے ان کے معترف ہو گئے۔ ایک دم ہی انہیں اپنی فرزندگی میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔ تقریب میں بہانوں سے بلا کر اپنے پاس بٹھایا اور ایک طرح سے عاصم کے خیالات جان لیے..... جتنی ان کا اندر ہو کر لیا۔ اب یہ تو نقد میر کا شوق فیصلہ تھا..... کہ عاصم اور صفیہ کو جو چھپن سے ہی ایک دوسرے سے متاثر تھے۔ اپنے خواب کو تعبیر دینے کے لیے کوئی جدو جہد کرنے پڑی نہ تاج سے کوئی جگ لڑ پڑی۔ کسی کو کانوں کان اس محبت کی خبر بھی نہ ہوئی اور دونوں کی مٹھنی کر دی گئی۔ سر عبداللہ نے عاصم کی تعلیم کے اخراجات کا بوجھ از خود اپنے ذمہ لے لیا۔ شادی ان کی تعلیم مکمل ہونے پر خیراتی کی۔

تین خدا کا فیصلہ ان فیصلوں سے بہت کر تھا۔ ابھی وہی وہی..... اسے بھی نہ کر پائے تھے کہ ان کے والد غلام حسنین ایک حادثے میں اچانک وفات پا گئے..... عاصم کو پتو پھا نے تو پتھر جانتا ہے۔ ان کے بیٹے یہ بات بھی ناقابل برداشت تھی کہ سر عبداللہ ان کے تعلیمی اخراجات اٹھا رہے تھے۔ لیکن یہ پیش کش تو انتہائی طور پر ناقابل قبول تھی کہ وہ ان کے گھریلو اخراجات کا بار اپنے سر لے لیں۔

گھر کو ایک ساتھان کی ضرورت تھی کہ ان کے نہ ہونے سے والد کا کاروبار ایک نکل نہیں چل سکتا تھا۔ انہوں نے بے حوصلی سے یہ حوائج کو خیر باد کہہ کے شہر کے وسط میں موجود کپڑے کی دکان سنبھال لی۔ اس اقدام سے سر

عبداللہ بے حد خفا ہوئے۔ اس لڑکے سے اپنی بیٹی کی متعلقہ انہوں نے اس کے روشن مستقبل کو یاد کر رکھی تھی..... یہ بات ان کی شان کے خلاف تھی کہ وہ ایک معمولی سا بڑا زون جائے۔ کہ مر عبداللہ جاگیر دار بن جانے پر انسانوں کو رہیں اور عہدوں اور جاگدادوں سے تول کر مقام دینے کے عادی ہو گئے تھے۔ عاصم ان کا نہیں ان کی بیوی کا بھتیجا تھا اور پھر اس نے تعاون کی ہر چیز کسی ایک مجلس سے ٹھکرادی تھی۔ عاصم کے گھر کا نظام اسی طرح چلے لگا۔ کاظم چھوٹا بھائی تھا۔ عاصم نے بھائی کو اپنا آپ بھج کر اپنے خواہوں کی تکمیل اس کے سپرد کر دی۔ اور ایف۔ ایس۔ سی کے بعد اسے ملک کے بہت بڑی سڈیکل کالج میں ڈاکٹری کی تعلیم کے لیے بھیجا دیا۔ یہ نہیں عاصم سے بڑی تھیں..... ماں پر وہ پیشیاں نہ جھٹی ہوئی تھیں۔ یہ بوجہ عاصم کی مدد سے ہی بنے ہوا اور ان دونوں کو اپنی حیثیت سے بڑے کر دے دیا کر رخصت کر دیا گیا..... ان کی رخصتی کے بعد گھر خالی ہو گیا..... عاصم کی والدہ اس گھر کو سنبھالنے کی اہل نہ ہیں۔ گھر کو ایک سیکرٹری مندرجہ جہاں ہمت عورت کے ہاتھوں کی ضرورت تھی۔ سوسپ کی نظریں عاصم پر نظر گئیں اور پھر اگلے برس جو عاصم کی والدہ ٹال کا شکار ہو کر ستر گر گئیں تو عاصم کی شادی اور بھی ضروری ہو گئی۔ خاندان کے بزرگوں نے مر عبداللہ کے ہاں جا قیام کیا..... یہ بڑھداشت لے کر کہ عاصم کو ہر لحاظ سے شادی کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ عبداللہ کے لیے بڑی مشکل گھڑی تھی اور جو ہو سو ہو..... وہ بیات کے پنے اور قول کے لیے ضرور تھے۔ متعلق اپنی خوشی سے کسی تھی۔ مرنا کیا نہ کرنا کے بعد ان کی شادی کر دینے پر مجبور تھے۔ لیکن ان کی ایک شرط تھی کہ شادی کے بعد عاصم ان کے ساتھ ان کے گھر میں رہیں گے۔

یہ شرط بے حد مشکل بننے لگی تھی اور قابل قبول بھی۔ عاصم کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مفذرو ماں اور زیر تعلیم بھائی کو تنہا چھوڑ کر محض بیوی کی خاطر اس سے گھر میں جا آدہ ہوتے۔ ان کی شادی تو ان کے اپنے گھر کی آبادی کے لیے ضروری تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی اس گھر کو چھوڑ جائیں۔ وہ تو بڑی ماں کو یہ بتا بھی نہ سکے۔ چھوٹے کو ان سے بے حد لگاؤ تھا اور پھر ان کے بھائی کے مر جانے پر تو یہ والدین اور بھی بیوقوفی۔ حالات کی اس تشکیش پر منیہ کا خیر ان فطری امر تھا۔ اس کی پریشانی ماں سے چھپی نہ وہ کی۔ وہ کتنا تریب سوچنے میں لگن رہا کہ ساتھ بھی مر جائے اور انہی بھی منٹو نے انہوں نے ایک روز بھاؤج کی مزاج برقی کے بہانے خرا کر عاصم کو اس بات کے لیے تیار کر لیا کہ وہ مر عبداللہ کی بات مان لے۔ شادی کے بعد لوگوں کی انگلیاں ان کی مرضی کی طرف اشارہ کرتی تھیں۔ دو چار دن میں ہی بیوی کو لے کر گھر آ جائے مر عبداللہ خود ان کے پاس ہو کر خاموش ہو جائیں گے۔ جس دن عاصم نے مر عبداللہ کی شرط مان لینے کا پیغام بھجوا لیا تھا پر وہ پھولے نہ مانے۔ اور شادی کی تاریخ خود دئی۔ شادی میں پورے خاندان نے شرکت کی۔ ہر ایک نے اسے مر عبداللہ کی غریب دوستی اور قربا پروری..... خیال کیا۔ منیہ یاہ کر اس کے آگے آگے گھر میں لائی گئیں۔ اور شرط کے مطابق رسم و رواج کے ایک سلسلے کے ختم ہوتے ہی دوبارہ اپنے میکے جا لیں۔ شادی کی شرط جو یہی تھی۔ مر عبداللہ اب بھی عاصم سے بہت خوش تھے۔ ان کا خیال تیارہ کا ر ہا کہ وہ خیر باد کہہ کر تعلیم کے سلسلے میں بیرون ملک تک جا سکتے ہیں۔ ان کی والدہ اور بھائی کا فریج مر عبداللہ برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ بلکہ وہ چاہیں تو ان کی والدہ بھی ان گھر میں منتقل ہو جائیں۔ لیکن عاصم کی خیر طبیعت کو یہ ہرگز گوارا نہ تھا۔ وہ ضعیف ماں کو کیا چھوڑ کر کہیں بھی جانے کو تیار نہ تھے۔ شادی کے چند دن جیسے تیسے گزر گئے عاصم نے منیہ اور پھر پھر جو سے بات کی۔ پھر پھر کو اپنا ہوا دیا تھا۔ انہوں نے بھی اس کا حوصلہ پیدا کیا کہ انہوں نے باپ کے سانسے نہ دیا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ان کے گھر جا کر رہنے و تربی رہتی ہیں۔ باپ غصے میں آ گئے۔ ختمی کے ان عاصم میں انہیں چلے جانے کا کہہ دیا۔ منیہ تین کپڑوں اور ختم

پانچ سو دو چار ملے پھیلنے لڑیوں میں میاں کے ساتھ چلی آئیں۔ اور ان کے کچھ خیر آسودہ گھر میں بڑی آسودگی کے ساتھ رہنے لگیں۔ ان کے بعد دیگرے شہر یا راور جو ہر پیدا ہوئے۔ پھر اسرار نے آنکھ کھولی۔ والد نے انہیں نہ لکھ آئے دیانہ کسی کو ان سے ملنے کی اجازت دی۔ دنوں بھائی شہا نواز اور دلواری بھی باپ کے حامی تھے۔ ایک دن اپنی بھولی کر بھی، بہن کو یاد نہ کیا۔

منیہ کو عاصم کی رقت میں ایک بہترین ساتھی نظر آیا۔ مزاج مل گئے۔ دل میں گئے۔ محبت کے جذبے نے انہیں تڑپائی کا جذبہ بھی پیدا کر دیا۔ عشرت کد سے میں آنکھ کھولنے والی منیہ اس ماحول میں جا نے کیسے روج پس نہیں محذور ساس کی جی جان سے خدمت کی۔ وہ بے چاری پنگ یہ بیٹھے بیٹھے کئی کام پختہ تھیں۔ بھوں کو سنبھالنے رہتیں۔ بڑے گھر کی بیٹی کے آگے بڑی شرمندہ دلی رفتہ رہتی تھیں۔ جسے اس گھر میں آ کر ایک مل کو لکھا۔ ملا تھا۔ انہیں خیر نہ تھی منیہ کی دن بھر کی جھگڑا شوہر کے ایک بیار ہر سے پہلے سے بل بھر میں اتر جاتی تھی۔ نا بہت اچھے انسان تھے۔ ان کی ایمانداری پوری مارکیٹ میں اپنی مثال آپ تھی۔ ان کے اخلاق کے سب معترف تھے۔ لیکن مر عبداللہ کی نظر میں وہ ان کے بہت بڑے بھرم تھے۔ جنہوں نے ان کی بیٹی دعو کے سے ہتھیار کی تھی۔

گزرے تو وقت نے بہت سی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ شاہ نواز اور دلواری کے خیر تک چلے جانے پر مر عبداللہ شہائی کا شکار ہو گئے۔ ان لکھوں میں ان کو بیٹی کی یاد نے خوب متاں۔ لیکن اناد یوار بن کر محبت کے درمیان حائل رہی۔

بھر عاصم کی والدہ ایک طویل علالت کے بعد وفات پائیں اور کچھ دنوں بعد کئی کے کارکنانے سے بازار میں آ کر لگ گئی اور عاصم کی بھری پر پی دکان آتش زدگی کا شکار ہو گئی۔ کچھ بھی باقی نہ بچا۔ وہ دن ایک قیامت کا دن ہی تھا۔ عاصم کی بھری لٹ گئی تھی۔ منیہ تو سوتے ہی ہوش کھو بیٹھیں۔ سوائے صبر کے کوئی چارہ ہی نہ ہلا کھوں رہنے کا نقصان ہوا تھا۔ حکومت کسی کی اتک ٹوٹی کر لی۔ خبر اخبار کی زینت بھی بنی تھی۔ مر عبداللہ تک بھی پہنچی وہ تڑپاٹھے۔ اسی وقت منی کے گھر جا پہنچے۔ جہاں منیہ بیمار پڑی تھیں اور چھوٹے چھوٹے بچے جسموں کے دم و گرم رہتے تھے۔ عاصم کی خبر نہ تھی۔ ان کا دل جل اٹھا۔ خود کی کے اسی عالم میں بیٹی کو اور اس کے بچوں کو جب میں بھر کر خرا آئے۔ عاصم گھر لوٹا تو کوئی گھر نہ تھا۔ صرف ایک پیغام تھا کہ آج سے ان کا بیوی بچوں سے کوئی تعلق نہیں۔ رہنا چاہیں تو وہیں آ جائیں۔ عاصم سے اٹھائے عاصم کے لیے یہ ایک زبردست شاک تھا۔ اس وقت انہیں بھردری سلی و تھلی کی ضرورت تھی۔ تنگناں باتوں کی وہ اپنے گھر کے ایک کونے میں ملنے لپٹے پڑے رہے۔ دنوں ماہوی اور انور دی کا شکار رہے۔ پھر انہیں کاظم کا خیال آیا۔ جسے وہ ہر روز پانچ سو روپے کا قاعدی سے بھیجا کرتے تھے۔ اکاؤنٹ میں موجود تھوڑی بہت رقم میں سے پانچ سو روپے کاظم کو بھجوانے کے بعد انہیں پھر سے کاروبار کا سوجھنا پڑا۔

وہ اپنے آباؤ اجداد کی دیانت کی طرف نکل گئے۔ جہاں ان کی بارہ ایک خیر آہا ز میں بڑی تھی۔ ایک بزرگ رشتہ دار کے مشیر سے انہوں نے کہا کہ ان کی خریداری شروع کر دی۔ بیڑن کے اختتام پر سب کو دے دلا کر ان کے پاس میں بڑا تم ہزار روپے میں بدل چکے تھے۔ یہ خوش آئند قدر جو سولہ دے گیا۔ ایک شام بچوں کے لیے کچھ تھانف کے ساتھ وہ سسرال گئے۔ لیکن مر عبداللہ کے ملازموں نے انہیں اندر داخل نہ ہونے دیا۔ بل گرفتہ سے وہ واپس چلے آئے۔ بد سے سے تھا گھر میں بیوی بچوں کی یاد نے ستایا تو وہ بچوں کی طرح بلک اٹھے۔ ان ہی دنوں شاہ نواز تعلیم مکمل کر کے وطن واپس آ گئے۔ مر عبداللہ کے لیے یہ دوسری شکست تھی۔ شاہ نواز واپس پر ایک

عدد بیوی ساتھ لائے تھے۔ اس کی خبر تو بہت بڑے گھر پہنچ چکی تھی۔ ایئر پورٹ پر شاہنواز کے ساتھ ایک خوب روئز کی کو بیوی کے روپ میں دیکھ کر وہ اسے سوائے گھر لانے کے اور کچھ نہ کر سکے۔ تین دن وہ صرف گھر میں آئی۔ دل تکہ رسائی نہ پا سکی۔ شاہنواز کے اس اقدام نے سب کا دل تو زودیا۔ وہ گھر کے بڑے بیٹے تھے۔ کیا کیا ارمان ان سے وابستہ نہ تھے۔ سب آرزوؤں کی خاک اڑ گئی۔ اور ہجو چپ چاپ تے گھر میں اتر آئی۔ سب اس محسوم لڑکی کو چالاک اور مکار خیال کر رہے تھے۔ جس نے شاہنواز کو حسن کے جال میں پھانس لیا تھا۔ انہیں کیا خبر ہوئی کہ اسیر تو وہ ہو گئی تھی۔ شاہنواز کے جذبوں کی۔ محبت کی..... ان کے خوب صورت انفاظ کی کہ جب شاہنواز نے اس کے والد کے سامنے وامن سوال پچھایا اور انہوں نے بیٹی کی رائے معلوم کی تو وہ اداکار نہ کر سکی۔

محبت، بہت سے خیاب دکھاتی ہے اس نے بھی خواہوں کوچھوڑنا اور شاہنواز کے سنگ پاکستان چلی آئی۔ لیکن یہاں آ کر..... محبت کے محسوم خواب خواب تنہا رہے۔ صدف کے ساتھ ساتھ وہ نو مسلم لڑکی کنیر فاطمہ بھی قید کر دی گئی۔ سر عبداللہ نے جو انگریزوں کے بڑے مداح تھے ایک انگریز لڑکی کو ہجو کے طور پر قبول نہ کیا۔ انہوں نے شاہنواز کو کاروبار زندگی میں الجھا دیا۔ کنیر فاطمہ سے پور کر دیا۔ پھر ایک دن ان کی شادی بڑی دھوم دھام سے اپنے خاندان کی ایک لڑکی سعیدہ سے کر دی۔ کنیر کی کوکھ میں بچہ پرورش پاتا تھا۔ ایک تہہ کے زمانے میں قید حیات کے لمحے اس پر یہ جمل ہوتے چلے گئے۔ شروع میں تو سب کے ساتھ صدف نے بھی بھائی کو نظر انداز کیے رکھا۔ لیکن ایک احساس نے انہیں کنیر فاطمہ کے قریب کر دیا۔ وہ تھا عام سے لڑکی کا احساس..... ایک عیدت نے دوسری عیدت کو اپنے درون کی بہت سے پچھانیا تھا۔ صدف کو خبر تھی۔ عام کی چاہت میں انہوں نے غربت، امانت کے فرق کو بھلا دیا تھا۔ سارے دکھائیں کے برداشت کیے تھے۔ کنیر فاطمہ نے تو بہت کچھ چھوڑا تھا۔ اپنا وطن گھریا، والدین، مذہب، یہاں اس کی تہا ذات سر عبداللہ کے مذہب و عقاب تھی۔ شاہنواز نے بہت کراہیک بار بھی خیریت تک نہ پوچھی۔ انہیں سہلست ہی بندی گئی۔ پورے اہلی خاندان نے جوش و خروش سے اس خاندانی شادی میں حصہ لیا اور کنیر فاطمہ ایک خاموش قیدی کی طرح اپنے کمرے میں بند رہیں اور اسی دن بیٹی بار صغیہ کو اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ اس دن..... عام رات کے لمحات میں دیوار پچھان کر بے نیہ اور بچوں سے ملنے اور دیکھنے چلے آئے۔ یہیں انہوں نے جلی ہار کنیر فاطمہ کو دیکھا وہ انوں کا تعارف ہے۔ وہی آتی تھی نہ کسی طرف انہیں صدف کے گھر سے نکل چھوڑ آئیں۔ بھانج کا یہ احسان صغیہ کے دل میں گھر کر گیا۔ عام کو یہ مخلص تی لڑکی بہت اچھی لگی۔ غیر شستہ اردو میں بات کرتی آنکھیں جھپک جھپک کر انہیں دیکھتی اور انہاں ہی منسوم نظر آ رہی تھی۔ عام کو اس کی منگولیت کے آگے اپنا دکھ بہت چھوٹا لگا۔ اب وہ اکثر اسی بار لینے صغیہ کے پاس آتے گئے۔ رات کے اندھیرے میں خوابیدہ بچوں کو جی گھر کے دیکھتے صغیہ سے اپنا دکھ سکھ کہتے اور چلے جاتے۔

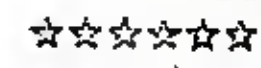
صغیہ کی خاطر انہوں نے اپنا آباؤں گھر چھوڑ دیا۔ ایک دوسرے شہر میں ایک مکان خرید لیا۔ کاروبار پر منتقل کیا اور ایک آندہ بہری شب کنیر فاطمہ کی مدد سے اپنے بیوی بچوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اس کے بعد انہیں بہرا نہ پائیس کی مدتوں خبر نہ رہی۔ ہاں کی بار دوسری کنیر فاطمہ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے وہاں پہنچے لیکن اس تک نہ جاسکے۔ ایک مدت گزر گئی ان کے گھر برداشت کا دن تو نہ رہا..... لیکن ایک گلی بندھی محسول آندہ تی ضرور ان کا مقدر رہی گئی۔ اس عرصے میں بھکتا راو گو بہر بھی ان کے دشمن کی رونق بدھانے آ سوجو ہوئے۔ اور جب طویل... ہاں بعد سر عبداللہ کی موت کی خبر سن کر صغیہ تپ کر پڑے میسے جانے کو تیار ہو گئیں تو وہاں ہاتھار کی بیوی بچوں کے ساتھ کسی کو نہ پایا۔ دلوا دسی۔ اس نے بی اسر تھے۔ باپ کی موت کے بار پو گھر آئے تھے۔

ہیں آ کر صغیہ اور عام کو خبر ہوئی تھی کہ کنیر فاطمہ ایک بچے کو جنم دے کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں اور بچہ ان دنوں کسی بڑی سری ہوم میں پرورش پاتا تھا۔ چار پانچ سال بچہ شیر..... کسی نے صغیہ کو اس بڑی سری ہوم کا پتا نہ بتایا نہ ہی کسی کو خبر تھی۔ نہ ضرورت۔ شاہنواز ایک ماہ قبل ہی بیرون ملک جا رہے تھے۔ ان کی بیوی سعیدہ ان کے ساتھ تھیں اور دو بچے ظہیر اور منیر بھی۔

اور اب اتنے سالوں بعد وہ لوٹے تو بہن بھائیوں کو یاد کیا۔ سوئے اتفاق کہ شاہنواز نے رہنے کو رحم آباد کا ہی انتخاب کیا جو کہ عام کا شہر تھا۔ یوں ایک مدت بعد پرانے ذمہ مندل ہو جانے پر بہن بھائیوں میں تجدید ملاقات ہو گئی اور صغیہ بیگم کو وہ جتنی بھی نظر آ گیا۔ جس کی ساری عمر گھر سے باپ سے۔ خاندان سے اور ہوشوں میں گزر تی تھی۔

شیر کو بھی یہ گھر توڑا توڑا پسند آ گیا تھا۔ اس نے زندگی میں دیکھا ہی کیا تھا۔ اس کے دن رات اسکول کالج اور ہوشوں کی پابندیوں میں بسر ہو گئے تھے۔ اسے پتا نہ تھا کہ ایک کلمہ بھی یاد نہ تھا۔ جو کسی اپنے نے اس کی نذر کیا ہوتا..... کبھی کبھار غیر ممالک کی مہروں سے آراستہ ایک خطا سے مل جاتا۔ جس میں اس کو صرف اس بات کی اطلاع دی جاتی کہ اس کے سالانہ اخراجات کا ڈرافٹ اس کے اسکول یا کالج کے پرنسپل کے نام بھجوا دیا گیا ہے۔ سعیدہ بیگم نے شیر کو باپ سے دور رکھے کو ایک خوب صورت محسوس جواز سے مدد لی تھی کہ وہ ہوشوں ماں سے۔ جتنا بھی پیار محبت سے رکھے گی۔ کبھی کوئی اسے نہیں سراہے گا۔ ہر ایک کی زبان پر کہیں ہوگا کہ بے چارہ ہوشوں ماں کے ذریعہ عقاب رہا۔ اس قہریت سے دوری اچھی ہے۔

شاہنواز تو پوری طرح سعیدہ بیگم کی گھٹی میں تھے۔ اس فیصلے سے اختلاف نہ کر سکے۔ ان کے دل میں شیر کی محبت کے پودے نے کبھی سر اٹھایا ہی نہیں اور نا مصلے بڑھتے گئے۔ اب شاہنواز کی وطن واپسی پر وہی رسم و رنجاداری بھانے کو شیر کو کبھی بلایا گیا نہ گھر میں رہنے کو..... سعیدہ بیگم نے الفاظ کی محبت کا سہارا بھی دیا۔ لیکن جذبوں میں موجود بے نیازی کب الفاظ کو پر اثر بننے دیتی۔ فاصلہ فاصلہ ہی رہا۔ چند ماہ میں باپ اور بیٹے کے درمیان موجود بے نیازی اور بے نیازی اچھی خاصی دلچسپی میں بدل گئی۔



ان سب کو خبر نہ تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ شہج کے لیے خدا نے ایک اور راہ نکالی دی تھی۔ ہوشوں کی رہائش کے ایام میں جب وہ محسن لوہی کا طالب علم تھا۔ فلاں نے ایک لڑکے عدی بن جمال سے اس کا دوستانہ گہرے تعلقات میں بدل گیا۔ یہی بار وہ عدی کے گھر گیا تو کھانے کی میز پر اس کی ملاقات سندرو بن جمال سے ہوئی۔ خدرا بن جمال کی شوخی نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ جمال احمد سے ملاقات ہوئی اور عدی کی تڑپا سے ایک شفیق ماں ہی نظر آئیں۔ جب انہیں خبر ہوئی کہ شیر کی ماں اس کے پیدا ہوتے ہی مر گئی تھیں اور ڈیڈی اس سے بہت سے..... اور دوسرے ملک میں ہیں اور بھری دنیا میں شیر سے بیزار کرنے والا کوئی نہیں ہے تو ان خدا ترس خاتون نے انہیں اس آگے..... انہوں نے حیرت و سراسیمہ سے اپنے سینے کی گہرائی میں چھپا لیا۔ اس کے گھیر سے یوں میں اپنی انگلیاں اٹھاتا ہوں ان کی آنکھوں میں تہ ننگ۔

”بیٹے تپانے ماں کی محبت کے بغیر زندگی کیسے گزار لی؟“  
شیر گھرایا لیکن آنسوؤں میں جھرجھر کرتے اس کی آنکھوں میں آنسوئے۔  
جمال احمد سر عبداللہ سے واقف تھے۔ ایک مدت وہ سندھ اہل کے رکن رہے تھے۔ پھر وزیر بھی بنے۔

شاہناواز کبھی مرعبداللہ کے بیٹے کی حیثیت سے جانتے تھے۔

”بیٹے یہ تمہارا گھر ہے آتے جاتے رہا کرو۔“ جمال احمد نے بھی اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔  
اب وہ اکثر آ جاتا۔ مٹی اس کی منتظر ہوتی۔ کئی چیزیں اس کے لیے چھپا کر رکھ چھوڑتیں۔

”دکھ تم نہیں آئے شعی۔“ اسے وہی بارشعی مٹی نے ہی کہا تھا۔ یہ لفظ اسے بھاگیا کہ اس میں عیاری کی خوشبو رہتی  
ہی تھی۔

”سدرہ نے علم پائی تھی۔ نوالے میرے طلق میں اگلتے رہے۔ تمہیں جنیم پسند ہے نا..... میں نے ایک ڈونکہ  
الگ رکھا یا تھا۔ اور ہاں..... حریرہ بنایا تھا تمہارے لیے ڈبے میں بند چڑا ہے لے جاتا..... واماغ کے لیے بہت  
اچھا ہوتا ہے۔ عدنی کہتا ہے بہت محنت کرتے ہو۔ دن رات پڑھنے میں لگے رہتے ہو۔ اپنی محنت کا خیال رکھا  
کر شعی۔ صحت ہوگی تو تعظیم کا لاکھہ ہوگا۔“ شہیر کا دل بارغ بارغ جاتا۔ بھلا کس نے اس سے اس لہجے میں کبھی  
بات کی تھی۔ اسے تو گئے بندھے گزرتے شب و روز کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بارڈن کی ترخ مزاجی کا سامنا کرنا پڑتا  
تھا۔ اسکول میں تمہوڑا لڑتا تھا۔ تعلیمی لحاظ سے اس کی برتری نے سدا سدا تہ کی نظر میں مقام دیا تھا اسے۔ سر  
عدنان ہاشمی تو بہت ہی مہربان تھے اس پر..... نویں میں کلاس میں فرسٹ آنے پر تمہوں نے اسے اپنے ساتھ لیتا  
آ کر اس کی پیشانی چومی تو پہلی بار..... پیار کی اس لذت نے اس کی روح تک پر نشہ طاری کر دیا۔

سر عدنان ہاشمی کے کہنے پر اس نے ڈیڑی کو خط لکھا۔ اپنی کامیابی کی خبر دی۔ جواب میں خرچ کے ساتھ ایک  
ہزار روپے کی انعامی رقم آ گئی۔

عدنی کے گھر میں آ کر اس نے پہلی بار ایک شفیق والدہ اور مہربان ماں کا چہرہ دیکھا۔ وہ جہ سے زیادہ معصوم اور  
خوب صورت تھا۔ جمال احمد شہیر کی آنکھوں کی چمک سے متاثر تھے۔ وہ کہتے ”راجہ۔“ کھانا یہ لڑکا کسی دن کچھ ہے  
گا۔“ وہ جو صدیوں جنموں سے پیار کا غلبہ کا رہ تھا۔ اس گھر میں آ کر شائستہ ہو گیا۔ ڈیڑی کی ڈیڑی اور مٹی کوگی کہنے  
لگا۔ سدرہ آ پا تو دوسری ملاقات میں اس سے گلے مل گئیں۔ عدنی اور عذرا جزواں کہن یعنی تھے۔ ہر دم ٹڑتے  
جھگڑتے رہتے۔ عذرا نے عدنی کو چلائے کے لیے شہیر کو بجائی بنالیا۔ وہ دونوں بوسوں میں آئے تو سدرہ آپا کی  
شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد ان کے مہیاں اتھار پور پ چلے گئے۔ وہ اکاؤنٹنسی کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔  
سدرہ آ پا ماں باپ کے گھر رہ گئیں۔ انہی وہ بوسوں کا امتحان دے کر فارغ ہوئے تھے کہ پورا اس دنیا میں  
آگئی وہ چھتیاں شہیر نے سب کے ساتھ پہاڑ پر گزاریں۔ دن بھر وہ سدرہ آ پا کے ساتھ رہتا۔ عذرا اور عدنی سیر  
کے لیے نکلتے جاتے وہ سدرہ آ پا کو کبھی دیتا۔ ان سب لوگوں کی محبت نے شہیر کی اوجھوری شخصیت میں خود اعتمادی  
بھری۔ وہ ہر دم خوش نظر آتا۔ سدرہ آ پا کے سارے کام بھاگ بھاگ کر کرنا جن میں اول اول ڈانگ کے  
لٹانے لانا اور عذرا جبری کرانا ہوتے تھے۔

میٹرک میں عدنی نے صرف نمسٹ ڈویژن لی۔ جبکہ شہیر نے ٹاپ کیا۔ جمال احمد اس کی کامیابی کی خبر سن کر  
اسلام آباد سے بھاگے چلے آئے۔ بہت خوش تھے وہ۔ شہیر کو گلے لگایا۔

”میں نہ کہتا تھا راجہ..... اس بچے میں کوئی خاص بات ہے شہیر جیے! اپنے ڈیڑی کو اپنی کامیابی کا ٹیکرا اہارے  
دو۔ بہت خوش ہوں گے وہ۔“ شہیر کے ذہن میں اپنے ڈیڑی کی کوئی ہمبند موجود نہ تھی۔ وہ ان کی خوشی اور پر  
سرت چہرے کا تصور کیسے کر لیتا۔

”جی..... جی ہاں ڈیڑی بچھ دیتا ہوں۔“

میرا خیال ہے وہ تمہیں اپنے پاس بلوائیں گے۔ اعلیٰ تعلیم وہیں سے دلوانا میں گے۔ سدرہ! ہمیں شہیر کی کسی  
لہ رخسوں ہوگی۔ میرا خیال ہے میں خود ان سے بات کروں۔ اگر وہ شہیر کو وہاں رکھنا چاہیں تو یا ہر گھوانے کے  
انتقامات میں خود کردوں گا۔“ شہیر نے مٹی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ اور لب کچلیا  
رہے تھے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

”میں وہاں کیسے جاؤں گا مٹی! سدرہ آ پا۔ وہاں میری ماں تو نہیں ہیں۔“ شہیر کے لہجے میں محرومی کا زبردست  
اساس تھا۔

مٹی کا دل بٹل گیا وہ ٹوٹ کے آگے بڑھیں۔  
”اے میں جو ہوں شعی۔ آئندہ تیری آنکھوں میں آنسو نہ ہوں۔ آپ کیسی باتیں کرنے لگے جمال۔ پاکستان  
میں تعلیم کا معیار کیا کم ہے۔ بچہ کہتا نہیں جانیے ڈیکریٹ ہے گا۔ عباس گھرا کا ڈگری کالج بہت اچھا ہے۔ آپ کیا  
چاہتے ہیں سوئیں ہاں اس کی ترقی کی راہیں بھی بند کرادے۔“

شہیر کو حوصلہ ملا۔ اس نے مسکرا کر دونوں کی طرف دیکھا۔ جمال احمد بولے  
”ابھی جو تم سب کی مرضی میں نے تو شہیر کے اچھے مستقبل کے لیے کہا تھا۔“

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

چھتیاں گزار کے وہ لوگ واپس آ گئے۔ مٹی گرام کے جواب میں ڈیڑی نے ہوٹل کے ایئر لیس پر خط بھیج رکھا  
تھا اور ایک بینک ڈرافٹ بھی اس کے نام کا۔ ڈاکوہ اپنے نام سے اکاؤنٹ کھلوانے لے خط میں لکھا تھا۔  
عزیزی شہیر!

دعا میں۔ اس دفعہ میں نے ڈرافٹ تمہارے نام کھلوانا ہے میٹرک کا طالب علم خالصا سمجھو دار ہوتا ہے۔  
انتظامات کے معاملے میں فکر نہ کرنا۔ میں جانتا ہوں۔ کالج جا کر ضروریات پڑھ جانی ہیں اور پھر سب جانتے  
ہیں کہ تم ایک سابق وزیر اور بہت بڑی سیاسی شخصیت مرعبداللہ کے پوتے ہو۔ اپنے لیے اچھے سے کچھ سوچنا  
لینا۔ کوئی پیش قیمت گھڑی اور دیگر اشیائے ضرورت خرید لینا اور ہاں تعلیم کے مسئلے میں جو شہیر چاہو اختیار کر  
لینا۔ اکاؤنٹ کھلوانا کرے مجھے خبر کر دینا۔

ایک کاروباری سا خط ایک بڑی رقم کا ڈرافٹ۔ دونوں نے اسے کوئی خوشی نہیں دی۔  
لیکن جس دن جمال احمد نے اس کی شان دار کامیابی کی خوشی میں ایک پارٹی کا اہتمام کیا اس دن وہ بہت خوش  
تھا۔

جمال احمد نے اپنے دوستوں کے سامنے بولے فخر سے اس کی کامیابی کا ذکر کیا۔ سب نے اسے تعریفی الفاظ  
سے نوازا۔ پارٹی کے بعد مہمان رخصت ہو گئے تو سدرہ آ پا نے اپنے ہاتھوں سے پلی اوور۔ لون کے خوب  
صدرت کر عاتق وائے نہیں کرتے۔ پانچ سو روپے نقد۔ عذرا نے پاگٹ مٹی سے بچائے پیسوں سے خریدا ہوا  
ٹریک سوٹ۔ عدنی نے اپنے ذوق کے برعکس علامہ اقبال کی شاعری کے قی مجموعے اور مٹی نے قرآن پاک  
مترجم کا عظیم تحفہ دیا تو اس کے دل کی ساری ہندگمیاں ایک دم سے کھل کر من کے آگن میں خوشبو دینے لگیں اور  
جب جمال احمد نے ایک بے حد قیمتی رسٹ و اچ اپنے ہاتھوں سے اس کی کلائی پر ہاتھیں تو وہ بات باغ ہو گیا۔

”سنا ہے یار..... تو بہت امیر ہو گیا ہے۔ ڈانٹ نیش ہونے پر میں اپنے پیسے ہاپس لے لوں گا۔ مگر اب ادھار

سے رہا ہوں۔ اپنی کامیابی کی خوشی میں کل کسی ہوگی میں کھانا کھلا دے گا۔"

"سیدھی طرح کیسے دونا۔ سدرہ آپ کے دیے پانچ سو روپے نظر میں کہے ہیں۔" ہڈر نے عدویٰ کو چڑایا۔  
"بدخیز لڑکی! مجھے تو خبر بھی نہیں کہ سفید لگانے خالی ہے یا۔"

"بہت محسوس نہیں رہے ہو۔ ابھی میرے کمرے میں ایک ایک شے کی جانچ پڑتال تو کر رہے تھے۔ کہ شے کو تم سے کتنا زیادہ دیا گیا ہے یا کتنا کم۔" سدرہ آپ نے لٹے لیے۔  
عدویٰ کھسیا گیا۔

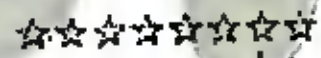
"لیکن مجھے رنج تو نہیں ہوا آپ۔ اس کی کامیابی ڈیزرو کرتی تھی کیا سے زیادہ ملے۔"

"اور وہ تم کسی بہانے خرچ کرادو۔ بڑے آئے چالاک نہیں کے۔" سدرہ آپ نے شہیر کی حمایت کی۔

"یسا نہ کیسے سدرہ آپ۔ میں تو خود سوچ رہا تھا۔ اپنی کامیابی پر مجھے بھی تو کچھ کرنا ہے، ماہر پھر جو کچھ آپ دے چکیں وہ تو اب میرا ہی ہے نام میں جو چاہے کروں۔" شہیر نے عدویٰ کا مان قائم کرنے کو کہا۔

"ہاں ہاں سدرہ آپ اپنے چھتے والی کون ہوتی ہیں۔" عدویٰ کو شاید بہت جلدی تھی۔ سب ہی نہیں پڑے۔

دوسرے دن ڈریم لینڈ کے ہاں میں عدویٰ شہیر، ہڈر اور اس کی ایک عدد دوست بڑے شہانہ سے براہِ جہان تھے۔ ہل کے بڑھ جانے کے خوف سے قطعاً بے نیاز آؤڈر پر آؤڈر دیے جا رہے تھے۔ ایسی ڈشوں کے جنہیں گھر کے میٹروں کسی نہ کسی سبب شامل نہیں کیا جاتا تھا۔



شہیر اور عدویٰ نے ایک ساتھ عیاشی، ڈگری کانٹا میں داخلے لیا۔ عدویٰ کے لاکھ بے پر بھی شہیر نے ہوٹل کی رہائش نہ چھوڑی۔ حالانکہ عدویٰ کے گھر میں نہ جہد کی تھی۔ نہ سامان کی۔ لیکن شہیر کو یہ ذمہ داری پسند نہ تھی۔ پھر بھی ان لوگوں کی محبت میں اتنی کشش تھی کہ وہ فارغ اوقات کا ایک مناسب حصان کے ساتھ ضرور گزارتا تھا۔ سینکڑوں ایئر کے آخری دنوں میں عدویٰ اور شہیر دونوں نے ڈراما ٹیور سے ڈراما ٹیور کی تربیت لے لی۔ دو ماہ میں شہیر ایک ماہر ڈراما ٹیور بن گیا۔ جمال احمد کی لینڈ رو دوران دونوں کے نام لگ گئی۔ سدرہ آپ کے میسوں کام نکلا۔ ہڈر ان جمال کی سہیلیوں کے ہاں کتاب۔ نوٹس، کیڑوں کے ڈیزائن لینڈ اور۔ بے جا۔ اکثر اسے سہیلیوں کے گھر چھوڑ دیتا یہ سارے کام عدویٰ اور شہیر کے ذمے لگ گئے تھے۔

ایف۔ اے کے بعد تو وہ دونوں خوب لمبے لمبے تو گئے تو جوان بن گئے۔

سدرہ آپ کو شہیر سے ہانگے ویسی محبت تھی جیسی عدویٰ سے تھی۔ اور اپنی اخلاقی خوبیوں کے سبب وہ سدرہ آپ کے زیادہ قریب تھا۔ ایف۔ اے میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے پر جمال احمد کی بھین ان کا لڑکا نہ تھا۔ بی۔ اے کے ایک پہلی تھی انہوں نے ہونے والے پرائمرم میں اس کی شہرت کا دعوت نہ سہا آیا۔ تو جمال احمد خود اسے بی۔ اے میں اسٹیشن لے گئے اور جس دن وہ پرائمرم آن اینڈ آیا پورا گھرنی۔ وی کے گرو جمع ہو بیٹھا۔ جمال احمد نے اس کے ہنر وادہ اسے تمام انہا اپنے کا تھیلہ لٹل ہاکس میں تھپتھپا کر لٹل میں لگا رہے۔

ان بھینوں نے شہیر کو بہت سے جوصلے بخش دیے۔ وہ جمال احمد کا احتراموں سے کہتا تھا۔ بی۔ اے کا آخری دن تھیں۔ سدرہ آپ کی محبت میں عیاشی، ہنوں کی جھٹک تھی۔ بیونی ہنوں کی جو نامیں بھی نظر آتی ہیں عدویٰ تو اس کا ہڈر نے ہڈر اور ہڈر ان جمال کے لڑا لٹا سارے چھوٹی ہنوں کی کسی تھپتھپا نہیں ہوتی تھی۔ بے شک گھر میں وہ شہیر پر اہم تھی مگر لڑا لٹا کے باعث پچھنی رہتی تھی۔

اور جب سے ماہر اس دنیا میں آئی تھی گھر کی رہتی میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ ماہر کا قریب دونوں کی خواہش ہوتی دونوں ایک دوسرے سے کھینچتا کرتے۔ اپنی اپنی طرف بلا تے ماہر اپنی تھی۔ کبھی عدویٰ کی بہن جاتی۔ کبھی شہیر کی۔ بس جو بھی کھانے پینے کی چیزیں لاو جتا اس کی ہور ہوتی۔ لیکن درحقیقت عدویٰ کی نسبت شہیر سے زیادہ مانوس تھی۔ عدویٰ ایک لاپرواہو جوان تھا۔ جب کہ شہیر خاموش شہیر، سنجیدہ اور محبت کرنے والا۔

سدرہ آپ ہر خط میں شہیر کا خاص طور سے ذکر کرتیں۔ افکار جب بھی فون پر بات کرتے شہیر کا ضرور پوچھتے۔ ایف۔ اے میں اس کی کامیابی پر انہوں نے لندن سے اس کے لیے قیمتی تحائف بھیجے۔

شہیر کو ان سب کی محبتیں۔ مغرور کرنے کی تھیں۔ زندگی میں جو چیز کم کم گرا چکی تھی۔ اس پر آدمی بہت زیادہ انحصار کرنے لگتا ہے۔ شہیر کا سرنہ یہ بھی اس گھر کی پر خلوص محبت تھی۔ بہت ناز کرنے لگا تھا وہ۔ اس عیار نے اسے جوصلہ ہی نہیں شوٹی اور زندہ دلی بھی بخش دی تھی۔ کچھ کرنے کی۔ کچھ بننے کی امگ بھی من میں پیدا کر دی تھی۔ یہ بھی فیصلت تھا کہ شہیر کو اپنے ماضی کے بارے میں کوئی خبر نہ تھی۔ ورنہ جو کچھ اس کی والدہ کے ساتھ ہوا تھا۔ شاید وہ اسے ہمیشہ کے لیے معصوم رکھتا۔ اسے صرف اپنی تہائی کی خبر تھی۔ ایک انسان کی خبر تھی جو پرنس کے مسلطے میں ملک سے باہر تھا اور اس کا باپ تھا۔ ہوٹل لائف کی خبر تھی یا اپنی کتابوں کی خبر تھی۔ بی۔ اے کا آخری سال تھا۔ جب ایک دن اسے مطلع کیے بغیر شاہنواز عسکری اپنے اہل خانہ سمیت وطن لوٹ آئے۔ اور اس کے کان آن پہنچے۔

ہوٹل کے وزیٹنگ روم میں ایک باوقار اونچے لمبے شخص کو اپنے رویہ و پانچہ کردہ حیران تھا۔

"آؤ..... آؤ..... تم شہیر ہو نا۔"

"جی ہاں شہیر شاہنواز عسکری۔" وہ مسکرائے۔

"کیا وارڈن نے تمہیں بتایا کہ ہم تم سے ملنے آنے والے ہیں۔"

"جی..... جیسا۔ ابرا گروہ کہتے بھی تو میں یقین نہ کرتا۔"

"کیوں؟"

"مجھ سے خفیہ بھی کوئی آیا ہی نہیں۔ میں تو حیران تھا کہ رات گئے کس نے ابرا کیوں زحمت کی۔"

"ہم شاہنواز عسکری ہیں۔ تمہارے والد۔"

"آپ میرے والد۔" وہ ایک دم گھبرا کر بول گیا۔

"ہاں ہاں بیٹے۔ بغیر اطلاع کے اس لیے آگئے کہ تمہیں سر پرانہ کر دیں۔ کیسے ہو بیٹے؟"

شہیر ایک تک اپنے سامنے کھڑے اپنے ہاند کو دیکھے جا رہا تھا۔ جو اسے سر تا پا بخور دیکھ رہے تھے۔ کبھی حیران ہو کر بھی مسکراتا۔

"یہ تم ہی ہونا میرے بیٹے شہیر۔"

انسانی رشتوں کی ڈوری سے بندھے ہو انسان ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ شہیر کے ذہن میں اپنے باپ کی کوئی واضح شکل نہ تھی۔ جب کہ شاہنواز کے ذہن میں چار پانچ سال کا محسوس پچھلوم رہا تھا۔ وہ وہ قدم آگے بیٹھے اور شہیر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے۔

"بیٹا تو بہت بڑا ہو گیا ہے ایک دم جوان۔"

شہیر نرط حیرت سے لنگ ہونے لگا تھا۔ شاہنواز نے اسے اپنے سینے سے لگایا۔ آنسو بہا اختیار آنکھوں میں





بھرا آئے۔

”کیسے رہے پڑ۔ ٹھیک ہونا۔“ انہوں نے اسے سمجھایا۔  
 ”ٹھیک تھا۔“ شبیر کی آواز بھر پور تھی۔  
 ”ابھی میرے ساتھ گھر چلو۔“  
 ”گھر۔“

”تو چلے جاؤ نا بیٹے۔۔۔۔۔ ماں باپ کی محبت ایک نعمت ہے۔ خدا کا شکر ہے جس نے تمہیں یہ دن دکھایا۔ سنو شہنشاہی۔۔۔۔۔ محبت، خلوص اور وفاداری لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا دیتی ہے۔ اپنی ماں سے بیٹوں جیسا سلوک کرنا۔ عزت کرنا، ادب سے پیش آنا۔ بہن بھائیوں سے محبت کرنا۔ خدا کرے اب تم سدا اپنے گھر میں آ جاؤ۔۔۔۔۔ باپ کا دل ہرگز نہ دکھاتا بیٹے۔۔۔۔۔ اور اب جلدی سے ان کے ساتھ چلے جاؤ۔ وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔ جاؤ اللہ کی امان۔“ مخون بند ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆

ایک اجنبی انسان کے پہلو میں بیٹھا وہ ایک اجنبی گھر کی طرف مچھڑتا تھا۔

”بیٹے! یہ کاروباری مسافر قیامت بھی عجیب تھیں۔ تم تو جبار ہے تم یہاں بڑھ رہے تھے۔ تمہاری ممانے کہا ہے کوڑا مٹرب کرنا اچھا نہیں۔ ہوش میں رہ کر زندگی سنبھالنی ہے۔ جب بھی تمہارے سالانہ امتحان کا نتیجہ ملتا ہے تمہاری ممانے اس بات کا مزید تکیہ ہو جاتا۔ مجھے تمہاری قابلیت پر ناز ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ بیٹے اپنی ممانے اور بہن بھائیوں سے کھل مل جانا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اور سوتیلے کا فرق ہم سب کے واسطے کی دیوار بن جائے۔ وہ تم سے پیار کریں گے اور تم میری سب سے بڑی اولاد ہو۔ بہت سی امیدیں تم سے وابستہ ہیں۔ تم نے بہت سارے دن ہم سب کے بغیر گزارے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ ساری سنی پوری ہو جائے۔“  
 شبیر خاموش بیٹھا رہا۔

”تمہاری ممانے یہاں آنے پر بہت خوش تھیں۔ گھر کا اور یہ ادا حصہ تمہوں نے تمہارے لیے آتے ہی سنوار دیا۔ اپنی ممانے میں صفائی کرائی۔ اشیائے ضرورت منگوا کر رکھیں۔ اب تم ہوٹل میں نہیں رہو گے۔ ڈرا پیور روزانہ تمہیں چھوڑ کر آیا کرے گا بلکہ تمہاری ماں ابھی تک وہیں رہ چاہتا ہے۔“

شبیر کے ذہن میں فوراً ہی کی شکل ابھری۔ عدوی کا نقشہ آیا۔ حذرا کی بھولی بھالی شکل دل میں بسی۔ ایک جہاں اس کا منتظر تھا۔ اس کے اپنے اس کے ماں باپ، بہن بھائی۔  
 ”تم خاموش بیٹھے ہو شبیر۔ کیا اپنے پاپا سے مل کر خوش نہیں ہو؟“  
 ایک موبز پر شبیرنگ کو تیزنی سے تھماتے شاہنواز نے اس سے کہا۔  
 ”میں۔۔۔۔۔ میں خوش ہوں بہت خوش۔“

چالیس کلومیٹر کا سفر بہت تیزی سے کٹا اور گاڑی اس اجنبی گھر میں داخل ہوئی جو شبیر کا تھا۔ شبیر کے پاپا کا تھا۔ سب سے دونوں اطراف برقی تقنوں کی روشنی میں گیسٹ کا تازہ روزن جھگڑا ہوا تھا۔ شاہنواز عسکری نے ہارن دیا۔ کسی نے گیسٹ کھولا۔

”فلور بایا۔ بتیاں بند ہیں۔ گھر والے کہاں ہیں۔“

”شاہ سب سو گئے ہیں صاحب جی۔“

”اٹنی جلد ابھی تو صرف ساڑھے دس ہوئے ہیں۔“  
 ”ہاں نہیں جی۔“

شبیر گاڑی سے باہر آیا۔

اسے دیکھا تم نے غنود بایا۔ یہ میرا پاپا شبیر۔“

شبیر بایا کی بونہی آنکھوں میں آنکھوں کی آنکھیں۔

”ہاں بیٹے۔ اپنے گھر۔ تمہاری ممانے نہ بہت خوش ہوں گی۔ وہ خود بھی ساتھ آ رہی تھیں۔ میں نے منع کر دیا۔ شبیر تم سے ملنے کے بے حد شائق ہیں۔ ارم اور شاہزادہ تمہاری آمد کے انتظار میں جاگ رہی ہوں گی۔“  
 ”گھر۔۔۔۔۔؟“

”گھر۔۔۔۔۔ شکر تھیں۔ میں نے وارڈن سے کہہ دیا ہے۔ کوئی ضروری چیز ساتھ لینی ہو تو لے لو۔“  
 ”جی۔۔۔۔۔؟“

”ہاں ہاں جاؤ لے آؤ۔۔۔۔۔ میں گیسٹ پر تمہارا انتظار کرتا ہوں بری اب۔ گھر پہنچنے پہنچنے رات کانی بیت جائے گی۔ جلدی آنا۔“

وہ باہر نکلا گئے۔ شبیر وہیں کھڑا اس راجا تک پیش آنے والے واقعے پر غور کرتا رہا۔ شاہنواز طوٹتی روش چور کر کے گیسٹ سے باہر جا رہے تھے۔ شبیر نے پاس رکھے فون پر عدوی کا نمبر لٹا۔

”یہ شبیر بول رہا ہوں۔“

”شہنشاہی! خیریت تو ہے ٹھیک ٹھاک ہونا۔“ مچی کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

”عدوی کہاں ہے مچی؟“

”سید رہا ہے۔“

”ڈیڑی۔۔۔۔۔؟“

”وہ تو آج شام لاہور چلے گئے۔“

”سدرہ آ پاپا۔“

”وہ بھی سو رہی ہے کہوتہ چکا وہوں۔“

”نہیں مچی!“

”کیا بات ہے شہنشاہی۔ تم کچھ گھبرائے ہوئے لگ رہے ہو۔“

”نہیں مچی۔۔۔۔۔ بس وہ۔۔۔۔۔“

”ہاں ہاں کچھ جو کہنا ہے۔“

”مچی۔۔۔۔۔ میرے والد پاکستان آ گئے ہیں۔“

”کب؟ کب آئے؟“

”کب؟ کب آئے؟“

”کب؟ کب آئے؟“

”چنانچہ مچی مگر اس وقت وہ مجھے لینے آئے ہوئے ہیں۔ م۔۔۔۔۔ میں نے سوچا آپ لیوٹوں کو بتا دوں۔ مچی۔“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”یہ تو بڑی اچھی بات سنائی تم نے شہنشاہی۔۔۔۔۔ اس وقت وہ کہاں ہیں۔ ان سے ملنے بھی ہو گیا۔“

”ملا ہوں۔ وہ گیسٹ پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔“

”صاحب بی بی کنیری بی کے بیٹے ہیں نا۔“ غفور بابا نے ڈرتے ڈرتے تھوڑا مسکرا کر پوچھا۔

”ہاں ہاں غفور بابا۔ لیکن اب شہیر میرا اور سعیدہ کا ہی بیٹا ہے۔ یہ بات آج کے بعد آپ کی زبان پر نہ آئے میں نہیں چاہتا کہ دلوں میں سوچیلے پن کا فرق آئے۔ شہیر میرا بیٹا ہے۔ میرا ولی عہد ہے۔ میری زندگی ہے۔ یہ سب کچھ اسی کا ہے۔ گھر بھی، بہن بھائی بھی..... اور غفور بابا۔ سب مٹاؤں سے کہہ دیجیے۔ شہیر کا حکم ماننا ان سب کے فریضے میں شامل ہے۔“

شاہ نواز ادر چلے۔ غفور بابا بھی ساتھ ساتھ تھے۔

”بیٹے! کیا خیال ہے غفور بابا کھانا کلوادیں۔“

”نہیں... میں نے کھانا کھالیا تھا۔“

”چلو غفور بابا آپ ایسا کر لیں۔“ وہ کچھ سوچنے لگے پھر بولے ”بس آپ آرام کریں۔ میں شہیر کو اس کے کمرے تک چھوڑ آتا ہوں۔“ کورڈور میں چلتے چلتے وہ ایک ایک کمرے کو دیکھ رہے تھے۔

”اصل میں سفر کی جگہاں تھی۔ سب عین سو گئے۔ فجر صبح سے ملاقات ہو جائے گی۔“

وہ پٹریاں چڑھنے لگے شہیر ان کی تقلید میں آگے بڑھتا گیا۔ اوپر بھی کھلی کھلی راہ داری تھی۔ جسے ایک کمرہ کہہ لیں زیادہ مناسب تھا۔ ایک کمرے کا بند دروازہ انہوں نے کھولا۔

”صاحبزادے یہ آپ کی خواب گاہ۔“ وہ پیار سے اسے دیکھ رہے تھے۔

وال ٹو وال اولیمیا قتلین۔ خوب صورت بیڈ۔ آرام دہ پیش قیمت صوفہ۔ ایک دیوار کے ساتھ رامنگ میبل اور بک شیلف۔ کمرے کے پینوں پر دیدہ زیب ڈیزائن کا دبیز قالین کمرے کے رنگ سے مچھل کرنا۔ خوب صورت پھولوں والا۔

”یہ قتلین ام بیجیم سے خاص طور پر تمہارے لیے لائے تھے۔ سعیدہ کا خیال تھا اسے تمہاری شادی تک محفوظ رہنا چاہیے تھا۔ ہم نے کہا نہیں کمرہ ہمارے بیٹے کے شایان شان ہو چاہیے..... اور..... وہ دیکھو کل ہم نے بازار سے گزرتے ہوئے کچھ کتابیں خرید کر تمہارے بک شیلف میں بجا دیں۔ ہم شہیر سے بزنس میں۔ فلم و ادب کی ہیں کیا خبر۔ ویسے ہم نے اپنے تئیں اچھی کتابیں تاشی ہیں۔ پڑھ کر تھکا کہہ سکتی ہیں۔“

انہوں نے شہیر کا ہاتھ پکڑا اور سامنے موجود وارڈروپ کی طرف آئے۔

”اسے کب لو بیٹے!“

شہیر نے وارڈروپ کا پٹ کھولا۔

سامنے کا خانہ سوٹوں سے بھرا تھا۔ ہنگروں میں لٹکے رنگ سوٹ۔

”یہ سارے سوٹ ہم نے اندازے سے لے لیے تھے۔ صرف اس شرط پر کہ کیا باپ کی محبت میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ تصویر کی آنکھ سے اپنے سے بڑے بیٹے کے قد بہت کا اندازہ لگا سکتا ہے اور تمہارے پاپا کا اندازہ درست نکلا۔ بیٹے اپنے پاپا کو اس کی اس کامیابی پر مبارکباد کہو۔“ مٹی پار شہیر مسکرایا۔

”شہیر..... شہیر.....!“

”جی.....“

انہوں نے اسے کندھوں سے تھام لیا۔

”تم کتنے اچھے کتنے پیارے بیٹے ہو۔ تم پر جتنا غرور کی کمی ہے۔ بیٹے..... تم سے وہ روز گریں تمہیں بھولا بھی

نہیں۔ تمہارے اچھے مستقبل کے لیے جدائی کا زہر بی لیا میں نے۔“  
وہ خاموش رہا۔

”اب تم بھی مجھ سے جدا نہیں ہو گے۔ کبھی بھی نہیں۔ اچھا۔ تم شب خوابی کا لباس بدلو۔ میں ابھی آیا۔“  
وہ کمرے سے نکل گئے۔ شہیر حیران پریشان ایک ایک شے کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی دو گھنٹے قبل اس نے تصور بھی نہ کیا تھا کہ دو گھنٹے بعد وہ یہاں ہوگا۔

”ارے تم وہیں کسے وہیں کھڑے ہو۔ دیکھو میں تمہارے لیے دودھ لے آیا۔“

دودھ کا گلاس ہاتھ میں پکڑے دودھ دروازے میں کھڑے تھے۔

”میرے اچھے بابا جندی سے کپڑے بدل لو۔ یہ تمہارا گھر ہے شہیر تم اتنا تکلف کیوں کر رہے ہو۔“ دودھ کا گلاس انہوں نے نچیل پر رکھ دیا۔

”آپ سوچائیے۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ میں کپڑے بدلتا ہوں۔ دودھ بھی پی لوں گا۔“

”جیسے میرے سامنے ہی بیٹا ہوگا۔“

شہیر کو مٹی یاد آگئیں۔ محبت کرنے والی۔ چاہنے والی۔ خیال رکھنے والی۔ کبھی کبھار دودھ کا بیڈ پر ان کے ہاں رو جاتا تو مٹی اس کے آگے بچھ بچھ جاتیں۔ رات کو وہ نیند کی دباہوں میں نئی کھوپڑی ہوتا تب بھی اسے اپنے ہاتھوں دودھ پلاتیں۔ ان دیکھی ہاں کا ہر لمحہ اس کی نظروں میں آتا رہتا۔

”کیا سوچنے لگے۔ بی بی لونا دودھ۔ ایک مدت بعد میں نے بھی چھٹی بار دودھ کا مڑا چکھا ہے۔ بالکل خالص ہے۔ غفور بابا نے اپنے کورڈور میں ہمیشہ باندھ رکھی ہے۔ اپنے ہاتھوں دودھ نکالتے ہیں۔“ شاہ نواز ممتا بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہے تھے۔ شہیر انہیں دیکھا رہ گیا۔

”پہلے ابھی سے لیتا ہوں کپڑے بعد میں بدل لوں گا

آپ آرام کیجیے۔ سوچائیے اتنا وقت ہو گیا ہے۔“

”نہیں شہیر! جب تک نہیں دیکھا تھا۔ نہیں دیکھا تھا..... دیکھ لیا ہے تو مارے خوشی کے خند آنکھوں سے دہر بھاگ گئی ہے۔ آج تم سوٹے رہنا میں تمہیں دیکھتا ہوں گا۔ عمر بھر کی پیاس بجھاؤں گا۔“ شاہ نواز سوچتے رہے۔

”کیا سوچنے لگے ہیں آپ؟“

”کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔“

”آپ یہاں آئے کب ہیں؟ مجھے تو کچھ بتائی نہیں۔“

”کبھی مٹن چارون پہلے بس کام دھند سے اتنے تھے کہ..... میں نے تمہارے ہوٹل والوں کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ بس تمہیں نہ بتانے کا کہہ دیا تھا۔ مجھے ظلم تھا گل سے سرما کی چھنیاں ہونے والی ہیں۔ میں نے سوچا جا کے ساتھ لے کر آؤں گا تو دس بارہ دن تم ابھرتی رہو گے۔“

شہیر نے دودھ کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

”بیٹے۔ شہیر.....“

”جی.....“

”بیٹے تمہیں بھی خبر ہوگی۔ سعیدہ تمہاری حقیقی والدہ نہیں ہیں مگر بیٹے۔ تم ان کی مٹی ماؤں جیسی عزت کرنا اور بے پرواہی نہ کرنا۔ وہ بھی تم سے محبت کریں گی۔ میں چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بہن بھائیوں کے درمیان کبھی

کوئی فرق نہ آئے۔“

”کہاں چلے گئے تھے بیٹا میں تو پریشان ہو گیا تھا تمہیں نہ پا کر دو گھنٹے ہو گئے انتظار کرتے کرتے۔“ شہیرہ نے کہا۔

”نماز پڑھنے گیا تھا حضور بابا کے ساتھ۔ پھر جو ٹنگ کے لیے چلا گیا۔“

”اوہ..... اچھا اچھا۔ یہ ظہور بابا بے چارے سب کو ہی نماز کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ لڑکے نہیں..... ذرا بچے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تم ان کے ہتھے چڑھ گئے۔“

”نہیں بابا..... حضور بابا نہ جگاتے تو مجھے نماز چھوٹ جانے کا سخت المیہ ہی ہوتا۔“

”بہت خوب اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہوٹل کا نظام بہت اچھا ہے۔“

”یہ پابندی کاغ میں بھی ہے۔ میں کاغ بونین کا صدر ہوں۔ ہوٹل میں رہنے کے سبب میں بھی اپنا فرض خیال کرتا ہوں ام لوگ نماز پڑھنے والے کا ناظرہ بند کر دیتے ہیں۔ مسجد میں ایک رجسٹر رکھا ہے۔ لڑکوں کو پانچ وقت اس میں حاضری لگانا پڑتی ہے۔ اور ہر ہفتے پرنسپل صاحب اس رجسٹر کو چیک کر کے اس پر دستخط کرتے ہیں۔“

”واہ..... واہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ ایک ایسا رجسٹر ہمارے گھر میں بھی ہونا چاہیے۔“

”رکھ لیں گے اس پر دستخط آپ کو کرنا ہوں گے۔“ شہیرہ مسکرایا۔

”ہاں لیکن پہلے تو اپنی پانچ وقت کی حاضری لگانا ہوگی۔“ شاہنواز ہنس دیا۔

”اور آپ کی حاضری کی تصدیق ظہور بابا کریں گے اپنے دستخط کر کے۔“ وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

”شہیرہ گھٹیں کے اچھا آؤ اپنی ماسے ٹوکب سے تمہارے انتظار میں ہیں۔“

دونوں ایک ساتھ چلتے ڈائننگ روم میں داخل ہوئے۔ چادروں، بھین بھائی میز کے گرد بیٹھے تھے۔ سعیدہ تریب کھڑکی تھیں۔ شاید کوئی ڈش میز پر رکھ دی تھیں۔

”سعیدہ! نہ کھوں ہمارے ساتھ کون کھڑا ہے۔“

وہ میز پر شہیرہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چپ چاپ کھڑا۔ سعیدہ کا چہرہ کسی قسم کے احساسات و جذبات سے عاری تھا۔ ایک دم انہوں نے منسکراہٹ چہرے پر سجائی۔

”اوہ..... شہیرہ آیا ہے۔ آئیے۔“

”بیٹے اپنی ماسے ٹوک۔“ شہیرہ آگے بڑھا۔

”آؤ اب ماما۔“

”جیتے رہو۔“ رزی الفاظ میں ماسا کی لذت اور چاشنی کہاں سے آتی۔

لڑکوں اور لڑکیوں نے مڑ کے دیکھا۔

”ارم کو بہت اشتیاق تھا بارہا رپو چھانگتی تھی۔ ارے اب دم بخود بیٹھی ہو۔ آؤ ماما اپنے بڑے بھائی سے۔“ شہیرہ نے شاز یہ بھی یہ تمہارے بڑے بھائی شہیرہ۔“ شہیرہ اور سعیدہ نے ہاتھ ملایا۔ ارم نے سلام کیا۔ شاز یہ بھی گئے بڑھی۔

”اچھا تو آپ ہیں ہمارے بڑے بھائی۔“

شہیرہ نے شاز یہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں کوشش کروں گا آپ کی سوچ پر پورا اترنے کی۔ ورنہ اسل۔ ساری عمر رشتوں سے دور رہ کر اس احساس سے دور ہو گیا ہوں جسے رشتوں کا درد کہتے ہیں۔ پھر بھی۔ پھر بھی انسان ہوں..... اور انسان کی سب سے بڑی ضروری محبت ہے۔“

”ایک بات بتاؤ شہیرہ..... اگلے گھنٹوں میں ایک بار بھی تم نے مجھے بابا کہہ کر نہیں پکارا۔“ شہیرہ نے سر جھکا لیا۔ شاید اپنے اٹک چھپانے کو۔

”اصل میں..... آپ کے پاس تو بہت سارے بچے تھے ماما۔ آپ ”بابا“ سننے کے عادی ہیں۔ میرے پاس تو کوئی نہیں تھا جسے میں بابا کہہ کے پکارتا۔ عادت نہیں ہے۔ کوشش کروں گا۔ تو عادت ہو جائے گی۔ میں بھی پکارنے لگوں گا۔“

وہ بے اختیار ہو کر رونے لگا۔ شاہنواز عسکری نے اٹھ کر اسے پانہوں میں بھر لیا اور خود بھی اس کے ساتھ رونے لگے۔ اس کا منہ جو سننے لگے۔ یوں جیسے کوئی ماسا کی ماری ماں اپنے گھڑ سے ہوسے بیچے کو دوبارہ پکارنے والی سی ہو جائے۔

”بابا کا دل چیرتے ہوئی بات کر کے آئندہ ایسا مت کہنا۔“ انہوں نے شہیرہ کے آنسو پونچھے۔

”تم اپنے بابا کے پاس ہو بیٹے۔ اس کی کتابیاں صاف کر دو۔ اب ہم بھی جہاں ہوں گے۔“

شہیرہ نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ جلدی سے آنکھیں رگڑیں۔

”میں بہت خوش ہوں بابا۔ بہت خوش۔ بس اسی لیے رونے لگا۔ آپ ہو جائیے۔ پلیز بابا سائے ون کی چھتیاں آپ کے ساتھ لیں تو گزروں گا۔“

”او۔ کے۔ شہیرہ۔“

وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ شہیرہ کو بھی جلدی خند نے آدیوچا۔

☆☆☆☆☆☆

وردانے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ شہیرہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اٹھ کر بولٹ برہانہ کھولا۔

”میں ہوں بیٹا۔“ ظہور بابا مسکراتے ہوئے سامنے کھڑے تھے۔

”اوہ آپ ہیں بابا۔“

”ہاں بیٹے نماز کے لیے جگانے آیا تھا۔ سب کو ہی جگانا ہوں۔ سوچا آپ کو بھی جگانا دوں۔ شاید آپ نماز پڑھنے کے عادی ہوں۔“

”اچھا کیا آپ نے..... وردانہ آج تو میں سویا تھی ربتا۔“

”بیٹا آپ میرے ساتھ مسجد چلیں گے یا ہمیں پڑھ لیں گے بیٹا لوگ تو کمرے میں ہی پڑھ لیتے ہیں۔“

”وقت پر جاگ گیا ہوں تو مسجد ہی چنوں گا۔ ہوٹل میں بھی پانچ وقت مسجد میں ہی پڑھتا ہوں۔ آپ شہیرہ سے ملنے ہنس کر لیں۔“

وہ ہاتھ روم میں داخل ہو گیا۔

نماز پڑھ کے لوٹا۔ شاہنواز عسکری جاگ گئے تھے۔ ماما سے مل کر کھڑے تھے۔

”صبح پھر بابا۔“ شہیرہ نے قریب آتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ ہے تو کچھ ایسی ہی بات۔"

"مچلو بیٹے ناشتا کرنے کے بعد بقیہ مراحل طے کر لینا۔" شاہنواز نے اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

"سعید وہیں بیٹھ کر خبر ہی نہیں کہہ بیٹے کو کیا پسند ہے اور کیا پسند۔"

"اس میں لٹھی آپ کی ہے۔ گا ہے رگڑ ہے معلوم کرنے دیجے آج ناشتا اس کی پسند کا بن جاتا۔" سعید نے کہا۔

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ جو بھی طے خوشی سے کھا لیتا ہوں۔ آخر یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہی تو ہیں۔ پسندنا پسند نہیں۔" شہیر نے جلدی سے کہا۔

"بڑے سناہرے شاکر ہیں بڑے بھائی۔" ظہیر نے آلیٹ کا ٹکڑا پلیٹ میں رکھا۔ سب ہنس دیے۔

"مچھی بات ہے۔ اسل میں ہوٹل کی رہائش میں اپنی مرضی تو نہیں چھٹی بنا..... میں میں جو کچے کھانا ہی پڑتا ہے۔" شاہنواز کہنے لگے۔

"مچھیے پاپا ٹھیک ہے ہوٹل لائف نے ان میں خوبیاں پیدا کر دیں۔"

"ظہیر بھائی۔ کیا خیال ہے آپ کو ہوٹل نہ بھیج دیا جائے گھر بدر کر کے۔ آپ بھی سدھر جائیں گے۔" ارم بہت تیز لڑکی تھی۔

"جی ہاں۔ ایم کے ہاتھوں میں ہے۔ رجسٹر وغیرہ چیک کرنے ہوں گے وہاں ہی مل مالت بھی ہو سکتی ہے۔"

"پاپا میں اور شیر بھی ساتھ جائیں گے۔"

"نہیں آج صرف شہیر۔ تمہیں یاد نہیں آج تم دونوں کا ایڈمیشن ہوتا ہے۔ میں نے کل پرنسپل سے بات کی تھی۔"

"جی جی جاؤ۔ ڈرائیور کو کارج کا پتا ہے۔"

"ہر وقت سیر و سفر کا نہ سوچا کرو۔ تعلیم کی غمرو۔" سعید نے سٹل لہجہ میں کہا۔

"تو تم دونوں چلے جاتے ہیں۔" ارم نے کہا۔

"نہیں نہیں آپ کا وہاں کیا کام۔" شہیر نے بے اختیار جواب دیا۔

"جی آپ کو اور آپ کی ماما کو کچھ کس دن لے جائیں گے۔ آج تو مصروفیت کا دن ہے۔"

"ہاں ہاں چلے جائیں گے فرصت کے کسی دن۔" سعید نے سرزنش بھرے انداز میں کہا۔

رات گئے دوڑ سے واپس آ رہے تھے۔

"پاپا! اس کے فزائن کی حالت تو نہ گھٹتی ہے۔" شہیر فزائن سیٹ پر ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔

"میں تو مل کی حالت دیکھ کر حیران ہوں۔ تو کڑو کر رہی ہوتے ہیں چیزوں کا استعمال بے دردی سے کرتے ہیں۔ کھلے آسمان تلے پڑا کتنا خام مال ضائع ہو گیا۔"

"تو یہ ظلمت کی شہنشاہت کی ہے مزدوروں کی تو نہیں۔ انہیں تو جس کام پر لگا دیا جائے آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی دیتے ہیں گے۔"

"نہیں کیا خبر بیٹے۔ جی ایم بتا رہے تھے۔ مزدور بڑے حرام خور ہیں۔ سہرا نازرا دھر سے ادا ہوا۔ ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ گئے۔ اکثر خینیں خراب ہو جاتی ہیں۔ متعلقہ لوگ جان بوجھ کر خراب کر دیتے ہیں تاکہ کچھ اور آرام کرنیں۔ بعض تو اتنے کہیںے لوگ ہیں مشینوں کے سٹاپرزے نکال کر پرانے لگا دیتے ہیں۔ یہ مجھے سنے کل پر نرے چند دن سے زیادہ نہیں چلتے اور سارا نقصان مائیک کا ہی ہوتا ہے۔"

"پاپا۔ اس کے لیے ایمان دار عملے کی ضرورت ہے۔ سٹاپرزوں کی نہیں۔"

"تم مزدوروں کی اتنی حمایت کیوں کر رہے ہو۔"

"میں جانتا ہوں پاپا فریب ٹوٹا اتنے جرات والے نہیں ہوتے نہ ہی اس قدر..... بے ایمان۔"

"تمہیں کیا خبر۔ غریب آیت ہفت کی روٹی کے لیے بڑے سے بڑا حرم کر سکتا ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے۔ امیر اپنی تجوری کو مزید بھرنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔"

"!جی ہاؤ (Any how) میں نے انتظامات مکمل کر لیے ہیں۔ اب ایسی بے ایمانی نہیں ہو سکے گی۔"

"کیسے انتظامات؟"

"نقصان کی صورت میں مزدوروں کی تنخواہ کاٹ لی جائے گی۔"

"پاپا! وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔"

"ہاں۔ ہاں۔ مگر یہ تنخواہ نہیں کٹے گی۔ کیونکہ نقصان ہوگا نہیں۔ ہر مزدور اپنی جگہ اس بات کا خیال رکھے گا۔"

شہیر اپنے والد کی اس عجیب و غریب منطق پر حیران ہو گیا۔

"نہیں میں کہتا ہوں کہ نقصان پھر بھی ہوگا ہلکے بڑے دھڑلے سے ہوگا۔ نقصان کے اصل ذمہ دار پھر بھی خوف نہیں کھائیں گے نہیں خیر ہوگی کہ شامت بے چارے غریبوں کی ہی آئے گی۔"

"خدا نہ کرے۔ گھر کے ہوتے ہوئے ہی ہوٹل میں رہے۔" سعید نے زحمت کہا۔

"ہاں..... گھر کے ہوتے ہوئے ہوٹل کی کیا ضرورت۔ اب تو تمہارے شہیر بھائی بھی گھر میں رہیں گے۔"

"اچھا ہے۔ اتنے سالوں بعد انہیں بھی پسندنا پسند کے اظہار کا حق مل جائے گا۔" شاہنواز نے کہا۔

"مگر شہیر بھائی۔ آپ کی بی بی بھائی خاتون بگڑ جائیں گی۔ آپ بھی ظہیر اور شیر بھائی کی طرح پسند کا کھانا نہ پکھنے پر کمرہ بند کر کے احتجاج کریں گے۔" ارم نے فوراً کہا۔

"اور آپ کی ماما کو ان کے لاڈ اٹھانا پڑیں گے۔" شہیر نے سید و اب ان سارے بچوں کے لاڈ ختم۔ اور بڑے صاحبزادے کے شروع۔ آخر اتنا عرصہ ہم سے جدا رہا ہے۔"

"والی ٹاٹ..... اس کا پتا گھر ہے۔" سعید نے کہا۔

"ہاں سعید..... تم کہہ رہی تھیں۔ شہیر کے آنے پر سامان کھولا جائے گا۔ شہیر کی چیزیں اسے دے دینا۔ شہیر میں نے تمہارے لیے رازوں کی بڑی خوبصورت رسٹ واچ لی ہے۔ دیکھو گے تو وہ رگڑ رہ جائے گا۔ تمہارے گھر کے لیے وی۔ سی آر اور پورنیل ٹی وی بھی لایا ہوں۔ یہ تمہاری مرضی ہے۔ اس سہولت سے فائدہ اٹھاؤ یا تمہیں دیکھو کیے گھر میں گزار دو۔" انہوں نے شہیر کو بھیجا۔

"اس کی کیا ضرورت تھی پاپا۔ مجھے ایسی چیزیں سے دلچسپی نہیں۔ ٹی۔ وی پر ڈراما سب کے ساتھ بیٹھ کر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔"

"کتنے اچھے ہیں آپ شہیر بھائی۔ پاپا یہ سیٹ میں اپنے کمرے میں رکھ لوں گی۔" ارم نے سب سے صبر سے کہا۔

"ٹھیک ہے ہر کچھ لیجئے۔ ٹرینوں کے پاس فائبر وقت بہت ہوتا ہے۔" شہیر نے محبت کے ساتھ کہا۔

ارم ہنس دی۔

شاہنواز نے کہا۔

"سعید! خانے پر ہمارا نظارہ کرنا۔ شہیر میرے ساتھ جا رہا ہے۔ آج مل کا دورہ کرنا ہے۔ اتنے ترے سے

شہیر نے اب تک کی زندگی ہوشیوں میں ہی گزار دی تھی۔ عام معاشی اور سماجی معاملات سے نااملد ہوتا تو درست تھا لیکن یہ سچو بوجھ۔ انسانیت غریبوں کا درد۔ یہ سب شاید اس کی کٹھنی میں تھے اس کی انسانیت کا تقاضا تھے۔ اس کی فطرت میں شامل تھے۔ اور پھر وہ پائینکس ٹی بیڑا ہوتا تھا۔ معاشیات بھی اور ہر بات کو جو کتابوں میں لکھی ہوتی ہے بلکہ عطا و اپنا فرض خیال کرتے تھے۔ کتابوں میں سماج انسانیت کے ہی درس ہوتے ہیں۔ خواہ وہ کتاب کسی بڑے بڑے مطلق العنان حکمران کی لکھی کیوں نہ ہو۔

”مگر بیٹا جی! آپ ابھی ان باتوں کے لیے بہت چھوٹے ہیں۔ جب پیسہ پیدا کرنے کا وقت آئے گا تب آئے گا جان کا بھلا معلوم ہوگا شہیر بیٹے۔ میں نے ایک زندگی محنت کرتے گزار دی ہے۔ مجھے زمینداری سے لگاؤ تھا۔ سچی سادگی جاگیر مزدوروں اور ملازموں کے حوالے ہے۔ چاہتا تھا کہ سہاں کدوں لینیں اچھے گیارہ برس کے دھندوں میں۔ جو خراگ میں نے پھینکا رکھا ہے۔ یہ سب تم لوگوں کے لیے ہی تو ہے۔ شب و روز کی یہ محنت میں نے اس لیے کی ہے کہ تم سارے بھائی معاشی طور پر مستحکم رہو۔ بیٹے! اگر..... معمولی معمولی لوگوں کو سہرا چڑھالیا جائے تو کاروباروں میں ٹھہر جاتا ہے۔ یہ ٹیکسٹری ہم نے لگائی ہے۔ زر کثیر خرچ کیا ہے کسی منافع کی صورت کے لیے۔ اور لوگوں کو ان کے کام کی اجرت دینے ہیں۔“

”پاپا۔ مزدوروں کو خوشی اور اطمینان حاصل ہو اور یہ احساس بھی کہ ٹیکسٹری مالک کی ہی نہیں ان کی بھی ہے۔ تو وہ اس پر خوب محنت کر سکتے ہیں اور یہ احساسات حقوق کی ادائیگی اور نئی ہی پیدا کر سکتی ہے۔“

”کیا خیال ہے تمہارا ہم ملکیت سے ہی دستبردار ہو جائیں شہیر خان! نوکر نوکر کے جاسے میں رہے تو اچھا ہوتا ہے۔ تھوڑا سا سرچہ حال تو وہ اپنے آپ میں نہیں رہتے۔ میں دیکھ رہا ہوں گھر میں بھی تم غمور پاپا سے۔ بے شک وہ ہمارے پیشینہ خدمت گار ہیں۔ لیکن پھر بھی تو نوری ہیں۔“

”دشمنوں پر بابا بہت اچھے انسان ہیں۔“

”مجھے کب انکار ہے۔ میں تو بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ ہم انہیں ہمز پر اپنے متاثر ہٹھا کر کھانا کھلانے سے تو ہے۔“

”حالانکہ یہ ہمارے ہی کریم علی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ ہے۔“

”بیٹے! وہ وقت اور تھا۔ حالات اور تھے۔ اس دور کے لوگ سادہ تھے۔“

”لوگ بردور کے ایک جیسے ہوتے ہیں پاپا! اچھے بھی برے بھی۔ آدمی اپنے کردار سے بدوں کو بھی اچھا بنا لیتا ہے۔“

پتا تھا نہ چلا اور گاڑی گھر کے گیٹ میں داخل ہو کر پورچ میں رک گئی۔

”یہ بحث پھر کی اور وقت کے نیچے گھرا گیا۔“ شاہنواز خوش دلی سے سگرائے۔

”نہیں پاپا! اس تو ایسے ہی کہہ رہا تھا اپنے پاپا سے کوئی بحث کیسے کر سکتا ہے۔“

شاہنواز نے قہقہہ لگاتے ہوئے اپنی طرف کا دروازہ دکھوا دیا۔

”ٹیکسٹری گاڑی..... ہوٹل لائف میں یہ بات بیٹے کے ذہن میں کہیں سے آگئی کہ باپ سے بحث نہیں کی جاتی۔ شہیر مسکرا کر رہ گیا۔“

☆☆☆☆☆☆

شام کی جائے کافی تاخیر سے ہی گئی۔ شاہنواز ابھی ابھی گھر آئے تھے۔ ان کی مصروفیات کا دائرہ وسیع ہونے

جاننے کی میز پر شہیر کو نہ پا کر وہ ہنسنے لگا۔

”کون کہاں ہے۔ جائے پر نہیں آیا۔“

پاپا نے بڑے نظریہ سے شہیر کو دیکھا۔ اس کا دماغ بوجھتا ہوا تھا۔

”مگر یہ نظریہ بوجھ چھاننے کی ناقص کوشش کی۔“

پاپا نے لا جواب ہو کر پانی اپنی طرف بڑھائی۔ خاموش رہے پھر بولے۔

”میںہ۔ یہ بچے سدا میرے ساتھ رہے ہیں اور شہیر کو اس گھر میں آنے سے صرف تین دن ہوئے ہیں۔ اس کا دل نہ تھکا تھا۔ سدا جہاز سے دن بھر لیٹ کر رہے۔ جانے کہاں کہاں گھمایا۔ سہ پہر میں لڑکے کے آنے کے لیے گئے۔ ظہیر پریشان ہو رہا ہے۔ اس کی سوزوں ٹیٹی دو لے گیا۔ اسے کہتا جاتا تھا۔ مجھ سے اچھے لگا۔ یہ ہنستے ہیں اس نے اپنی چیزیں میرے گھر لاکھی ابھی نہیں دیں۔“

”کی مطلب؟“ شاہنواز اٹھ سے گئے۔

”شہیر نے گاڑی کی پانی ڈرا پیر سے لے لی۔ ظہیر سے پوچھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔“

”گاڑی استعمال کے لیے ہے۔ ظہیر یا شہیر کی ذاتی سواری ہرگز نہیں ہے۔ اس پر شہیر کا بھی اتنا ہی حق ہے۔“

”اور وہ جہاز بٹا ہے۔ اور سعیدہ بیگم یہ مت بھولا کرو کہ ایک طویش مدت ہم اس کے معاملے میں اپنے حقوق مکمل کر رہا نہیں کر سکتے۔“

”حقوق کی ادائیگی کا یہ مطلب نہیں کہ دوسروں کا حق چھین لیا جائے۔“

”کیا مطلب ہے اس بات کا یعنی شہیر کے گاڑی لے جانے سے آپ کے بیٹے کا حق چھین گیا ہے۔“

”اچھا۔ آج ظہیر صرف میرا بیٹا ہو گیا ہے۔ صرف شہیر کے گھر میں آ جانے سے۔“

شاہنواز کے چہرے پر کچھ آگئی۔

”تم ایسا سوچ رہی ہو میں نہیں۔ شہیر میرا ہی نہیں تمہارا بھی بیٹا ہے۔ اس کے بارے میں بھی ماں بن کر سوچا۔“

”آپ نے تین دن سے کئی ایسی باتیں کر کے میرا دل جا بوا ہے۔“

”میں بھی تین دن سے ہاتھیں ٹوٹ کر رہا ہوں۔ شہیر کے آنے پر تم لوگوں کو گویا سانپ سونگھ گیا ہے۔ آخر اتنے دن اس نے تم لوگوں کا کیا گناہ کر لیا ہے۔“

”میں نے آپ سے کچھ کہا ہے بھلا۔“

”اور کیا کہو گی بھلا..... الناف اور چہرے سب تو خود ہی بتا دیتے ہیں۔“

”آپ بھی تو تین دن سے ہمارے لیے اچھی باتیں ہوتے ہیں۔ ایک ہی نام نہیں پر ہے شہیر۔ شہیر۔ بچیوں کا منہ تڑا ہوا ہے۔“

”بچیوں کا منہ صرف اس لیے اترا گیا ہے کہ میں شہیر کو یہاں کیوں لے آیا ہوں۔ است تو جا اور جا رہا کیوں دے رہا ہوں۔ افسوس ہے سعیدہ..... میں تو خیر اس بات پر سخت رنجیدہ ہوں کہ شہیر کو کسی نے محبت بھرا سانس نہیں دیا۔ کیا نہیں یہاں ہوتے ہوئے بھی اسے ہوٹل میں رکھتا تھا اتنی مدت اس نے باپ کے ہوتے ہوئے بھی تیسوں جیسی زندگی گزار لی ہے۔“

"ہاں ہاں یتیم ہزاروں روپے مالانہ خرچ کرتے ہیں نا۔"

"جیسے..... پیسہ باپ نہیں ہوتا کہ شہمی کا احساس منادے۔ باپ کی کئی چیزیں پوری نہیں کر سکتا۔"

"تو اب یہ کئی آپ پوری کرتا رہے ہیں۔ پھر بچھڑتے کیوں ہیں۔" سعیدہ بیگم کو ایسی باتیں سننے کی عادت نہ تھی۔

"ٹھیک ہے میں نے حل سوچ لیا ہے۔ یہ گاڑی تمہارے بچوں کے اعتراف میں ہی رہے۔ اسے کوئی نہیں چھیڑے گا۔ میں اس کے لیے نئی گاڑی منگوا لیتا ہوں۔"

سعیدہ بیگم نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ بات سیدھی ان کے دل میں تیر کی طرح چھی۔

"آپ تو بات کا ہنگامہ بنانے گئے ہیں میں نے کب کہا کہ آپ دوسری گاڑی خرید لیں۔ ظہیر کو کہیں جانا تھا۔ گاڑی کے بغیر پریشان تھا۔ عادتیں تو آپ نے ہگاری ہیں۔ وہاں آخر اس کے پاس علیحدہ گاڑی تھی۔ عادت ہے ہاں کئی۔"

"کم طرف۔ بے خوف تو میں تھا..... جس نے شہیر کا خیال نہ رکھا۔ بہر حال علیحدہ گاڑی اس کی بھی ضرورت ہے۔"

بات وہیں کی وہیں تھی۔

"کیسی ضرورت..... ڈراما تیرا سے بائیں چھوڑ آئے گا اور جب بھی آنا ہوگا لے آئے گا۔ اور وہاں بائیں اور کالج میں کوئی فاصلہ ہی نہیں ہے۔"

"یہ میرے سوچنے کی بات ہے تمہارے سوچنے کی نہیں۔" وہ اب بھی غصے میں تھے۔

"مفتول خرچی کی ایسی بھی ضرورت نہیں۔ میں ظہیر سے کہہ دوں گی۔ وہ اس کی ملکیت سے دستبردار ہو جائے گا۔ آپ گاڑی شہیر کو دے دیں۔ بے شک اس کے نام کرویں۔ آٹھ ایک عمر کی عمر میں اس کا حساب چکانا ہے۔"

"میں ایسی طریقہ آنگلو سننے کے سوا میں نہیں ہوں جو جی میں آئے گا وہی کروں گا۔ بہت دن تمہارے پیچھے پیچھے چل لیا۔ فرانس میرے ہیں تمہارے نہیں۔"

وہ اونچی آواز میں کہنے لگے سعیدہ دھمکائی ہوئی۔

چائے کی پیالہ تیزی سے حلق میں اٹھانے لگی اور چیز چکھے عطا و میز چھوڑ گئے۔

☆☆☆☆☆☆

شہیر بہت دیر میں نونا۔ کھانا اس نے مٹی لوگوں کے ساتھ کھالیا تھا۔ بس نورانی چل پڑا تھا جس نے آتے آتے دیر ہوئی۔ شاہنواز کے کمرے کی جلی رتی تھی۔ غنور یا یادیر اور میں مل گئے۔

"صاحب آپ کے انتظار میں ہیں۔ بہت دیر لگا دی آپ نے بیٹا!"

"ہاں بابا دیر ہوئی۔ مٹی نے روک لیا تھا۔ کھانا کھائے بنا آئے نہ پیا۔"

"یہ کون ہیں بیٹا!"

"آپ انہیں نہیں جانتے..... وہ مجھ سے بے حد پیار کرتی ہیں ماڈرن بیسیا پیار۔ وہاں ڈیڑھی ہیں۔ سارو آ پاپا

ہیں۔ مٹی سے میرا دست اور غنور..... پیار ہی نہیں۔"

غنور یا یادیر کی آنکھیں سترائے نکلیں۔

"اچھا ابھی دیر ہوئی۔ اتنے سارے پیارے لوگوں میں تم ہو کر آپ ہمیں بھول گئے۔"

نہیں بابا۔ بھولا تو نہیں۔"

شاہنواز کے کمرے کی طرف بڑھا۔ سامنے والے کمرے کے اندر سے آتی آوازوں نے اس کے قدم روک دیے۔

میں چاروں میں ایسا کیا جا رہا ہے اس شہیر کے بچے نے کہ پاپا دی ہوئی چیزیں ہم سے چھیننے لگے۔

میں نے کہا کہ میں نے کہا ہے۔ یہ سیر تھا۔

یہ وہ ایسے ہی کبھی کبھار غصے میں آجاتے ہیں۔ تم ان سے کچھ مت کہنا۔ دو چار دن میں خود ان ٹھیک ہو جائیں گے۔ تم شہیر سے خود ہی کہو۔ جتنے دن جا رہے گا وہی اپنے پاس رکھ لے۔ میں جانتی ہوں وہ جتنے ضدی ہیں۔ اتنے نرم دل بھی۔ ضد میں آگے تو کل ہی نئی گاڑی لے آئیں گے اور نرمی اختیار کی تو پھر تم جانتے ہو۔

پاپا نے بڑی سے بڑی ضد بھی کئی آسانی سے پوری کر دیتے ہیں۔

"مما اوہ شہیر کے سامنے ہی نہیں ٹوک دیتے ہیں۔ یوں جیسے وہ ان کا سب کچھ ہو۔ اور ہم کچھ بھی نہ ہوں۔"

"نئے نئے دن ہیں جان..... روداشت کی عادت ڈالو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ اکیلا ہے تم پورے چار ہو۔"

"ہاں اللہ..... کب تک ایسا کریں گے وہ شاہنواز کی دولت بھی اور محبت بھی صرف تم چاروں کا نصیب رہے گی۔"

شہیر آگے بڑھ گیا۔ اس کا ذہن ان باتوں کو دہرا رہا تھا۔ وہ شاہنواز کے کمرے میں آ گیا۔

"کمال داد گئے تھے بیٹا!" شاہنواز بیڈ پر نیم دراز کی تختیم کتاب میں گم تھے۔ اسے دیکھ کر کتاب رکھ دی۔

"پاپا ایک بہت کے ہاں گیا تھا۔"

"کون سا دوست۔"

"عدی بن جمال۔ میں نے فون پر ان سے بات کی۔ تو مٹی نے عدی کو بھیج دیا۔ اس نے عدی کی کچھل سوارہ

مٹی سب تمہارے لیے ادا ہیں۔ بس میں چلا گیا۔"

"آئی دیر تم سے باہر نہ رہا کرو۔ ہم پریشان رہے۔ گاڑی بھی لے گئے تھے نا۔ چلا تا کیسے کیسے ہو؟ تمہارے

پاپا اپنی سوار کی تو کوئی بھی نہیں۔"

"پاپا عدی کے پاس لینڈ روڈ ہے۔ تم دونوں چلا جا کر تے ہیں۔"

"میں بیٹے پرانی چیز کو اپنا نہیں سمجھتے۔ میں تمہارے لیے گاڑی لے رہا ہوں۔"

"میں پاپا مجھے گاڑی کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو بس آج اس لیے لے گیا کہ وہ اپنی میں کیسے آتا۔ آئندہ

ضرورت نہیں ہوگی۔"

"کیوں؟"

"گاڑی موجود ہے۔ ہم سب مل کر ہی استعمال میں لائیں گے۔ وہ زور سے ضرورت پڑے گی۔ پھر ابھی تو

میں دیر جیسا مگر میں ہی رہوں گا۔ ہوسٹل سے چار قدم پر گاڑی ہے۔ عدی لوگوں کے ہاں جاتا ہو تو وہ لینڈ روڈ

لے آتا ہے اور کسی بات کے لیے گاڑی چاہے ہوگی اور اگر ایسی بات جو بھی ملتی تو آج بھی تو گاڑی لے لے گا۔

وہاں۔ لے لیا کروں گا کبھی کبھار۔"

"نہیں..... نہیں..... تمہیں مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ آخر تم جہان ز کے ہو تمہاری اپنی مصروفیات ہیں۔"

”تمہیں پاپا بالکل نہیں۔ پھر آپ دور تو نہیں ہیں جب بھی ماگزی رینگا آپ سے کہہ دوں گا۔“  
”تمہاری مرضی..... اچھا جاؤ کھانا کھا لو۔ ہم نے تمہارے انتظار کے بعد ابھی ابھی کھانا کھایا ہے۔“  
”پاپا کھانا تو میں نے کھالیا ہے آپ نے ناخن انتظار کی زحمت کی۔“  
”چیلہ ٹھیک ہے۔ ڈیٹا پر ابھی؟“  
”تمہیں پاپا۔“

”تو جاؤ اپنے کمرے میں..... کی سے لے۔“  
”جی نہیں..... اس بلوں گا۔“  
”شیر می کے کمرے کی طرف چلا۔“

”السلام علیکم!“ سب لوگ ابھی تک اہیں تھے۔ ویٹ کے نیوی بھوسٹے پر نیم دار زما سیدھی ہو چکی تھی۔  
”ظہیر نے اس کی طرف دیکھا۔ سب نے ہی سلام کا جواب دیا۔“  
”کہاں رہ گئے تھے آپ بڑے بھائی۔“ ظہیر نے جھٹ کہا۔  
”آئی ایم سو۔ بی ظہیر! کافی دیر ہوگی۔ یہ لوگ اڑنی کی چالیا آئندہ تمہیں یہ کوشش نہیں اٹھانی پڑے گی۔“  
”اگر سے کسی کوئی بات نہیں سمجھتے تو کہیں بھی نہیں جانا تھا۔ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ گاڑی آپ کی بھی ہے۔“  
”ٹھیک ہے میں تو بس یہ کہہ رہا تھا۔ آئندہ اتنے زیادہ وقت کے لیے گاڑی نہیں لے جاؤں گا۔“  
”اسی بھی کیا احتیاط کہیں آنے جانے میں دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔“ سمانے کی الفاظ کو جذبات کا لہر دو اور صاف سے کی بھر پور کوشش کی۔

”پاپا کہہ رہے تھے۔ آپ لوگ کھانے پر میرا انتظار کرتے رہے۔“  
”ہاں جناب آخر آپ بڑے بیٹے ہیں اس گھر کے..... احترام تو سب پر لازم تھا۔“ منیر نے بظاہر ہنستے مسکراتے ہوئے کہا۔ شیر لاکھ کھر سے مان باپ سے دوہرا ہوا۔ تمہا تو ایک انسان۔  
اور انسان مہبتوں نظرتوں اخلاص اور بناوٹ ہر چیز کی پہچان رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان سارے جذبوں کو ملا کر ہی تو..... انسانوں کو بنایا گیا ہے۔

”شکر ہے..... چینیٹس سوچی مانی بندہ برادر..... آئندہ آپ کو اس قسم کا انتظار بھی نہیں کرنا پڑے گا۔“  
”شیر بھائی! ایک بات کیوں۔“ ارم ٹھوڑی کے بیٹے بات چہرے رکھے۔ کبھی سونے کے یا زور پکائے اس سے بچنے کا حکم تھا۔  
”جی کیجیے۔“

”سہ پہر جو نوگ آئے تھے۔ کون تھے وہ؟“  
”میرے دوست تھے۔“  
”سخت بد تمیز تھے۔ اپنی کیش سے ناواقف۔“  
”کیوں؟“

”ہا ہر گاڑی میں نشا بھگے رہے۔ اندر آنے میں کیا قہارت تھی۔“  
”اوہ..... میں نے ان سے کہا ہی نہیں تھا۔“

”آپ نے سمجھا ہوگا کہ میرے دوستوں کو شاید ریپنس نہ ملے۔ ڈیوٹ وری شیر بھائی۔ ہم لوگ اسے

”راخلاق نہیں ہیں۔“ شازدہ بیٹے گروہ لگائی۔

”ان ایم سو سوری مہا..... نے گھر میں ایڈ جسٹ ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ آپ نے نہ مانا ہوگا مگر یقین نہیں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ اب مجھے بھی ملان ہو رہا ہے۔ وہ لوگ کیا خیال کریں گے کہ میں نے اس پائے کو بھی نہ پوچھا۔“  
”یہ آپ سے زیادہ وہم لوگوں کی تو ہیں ہے۔“ منیر نے کبھی ہی خشکی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا۔ شیر میر اے خاموش کھڑا تھا۔  
”پہنہ شیر۔“

”نہیں مہا! جینک بو..... میں نماز پڑھ کر آرام کروں گا۔ بہت تھک گیا ہوں۔“ وہ کور بیڈرو سے ادر کی مٹرن کی تھک چلا گیا۔

☆☆☆☆☆☆

تیسرے دن اس نے پھر عدی کو فون کیا۔ شازدہ عسکری نے اسے زمینوں کی نیر کے لیے کہا تھا کہ وہ غفور پاپا کو تھک لے جا کر دو چار دن زمینوں پر رہا آئے۔ شیر نے ان سے عدی کو ساتھ لے جانے کی اجازت مانگ لی۔  
زمینوں کا سفر جیپ بہتر اٹھار میں کر سکتی تھی۔ عدی اپنی کھٹارا سمیت حاضر ہو گیا۔ شیر اپنے بریف کیس کے ساتھ لیسٹ پر بیٹل گیا۔ ساتھ میں غفور پاپا بھی تھے۔

”ان سے ملو عدی۔ یہ ہمارے سفر کے رہنما غفور پاپا۔“  
عدی نے انکس سلام کیا۔ غفور پاپا نے دعائیں دیں۔

”کیا سب جیسی ہے تجھے یار..... زمینوں پر جانے کی۔ کیا رکھا ہے وہاں۔“

”بہت کچھ عدی! بہت کچھ فطرت کا سارا حسن اپنی بے ساختگی کے ساتھ ان ہی علاقوں میں ملتا ہے۔ میں نے تو کتنے دن سب کچھ فوٹی اور فلم کے ذریعے ہی دیکھا ہے۔ آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گا۔“

”ٹھیک ہے یا رکاش لیس گے ہم بھی قید..... قید بھائی۔“  
”ارے میں تمہارے ساتھ ہوں پھر بھی بھائی کی قید۔“

”ذرا حمل شہی! میرا دل ایک بل بھی ایسی جہنوں پر..... نہیں لگتا۔ لعنت ہے یار..... جہیں خبر ہے میرے جانے والے چہریاں! قسمت کی ماریاں کتنی ناخوش اور پریشان ہو جائیں گی۔“  
”کون؟“

”وہی ساری کی ساری جن کی دنیا میں اس ناخیز کے ہم سے آباد ہیں۔“  
”عدی..... تم..... تم کیا کہہ رہے ہو۔“

”مجھ کہہ رہا ہوں بلکہ یہ بھی بتاتا چلوں کہ یہ تو کلب کی آدمی سے زیادہ لڑکیاں تم پر ایک ساتھ شمار ہونے کا سرمایہ لیے بیٹھی ہیں۔“

”بھوہ..... لا حول ولا.....“ شیر نے برا سامنہ بناتے ہوئے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔  
”وہ لڑکیاں ہیں پیارے شیطان نہیں جو تم لا حول ولا پڑھتے گئے۔“

”مجھے تو تم مخالف ہی دکھتے ہو بہتر ہے اور ان ساری مہتر ماؤں سے بہتر! بلکہ میری طرف سے دست بستہ عرض کر لو مجھ پر شمار ہونے کا ارادہ ترک کر دیں۔ میرے ساتواں کندھے احسانوں کا ایسا بھاری! چہاٹھانے سے



قاصر ہیں اور وہ کھو رہی: اب انسان بن کر بیٹھو ہمارے ساتھ غفور بابا بھی ہیں۔ وہ کیا سوچیں گے۔" شبیر نے آہستگی سے کہا۔

عدی نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

"تم بے شک غفور بابا سے بڑھ چکے ہو۔ اچھے خاصے خوب صورت رہے ہوں گے جوانی میں۔ اور ان پہ بھی بیوقوفوں کی لڑکیاں مارتی ہوں گی۔ کیوں غفور بابا؟" اس نے با آواز بلند غفور بابا کو پکارا۔

"عدی! تم بہت بدتمیز ہو۔"

"مجھ سے کچھ کہانی ہے؟" غفور بابا نے آنکھیں کھولیں وہ بڑے خنوع دشمنوں کے ساتھ کوئی وظیفہ پڑھ رہے تھے۔

"نہیں بابا! کچھ بھی نہیں۔" شبیر نے جلدی سے کہا۔ سفر ایسی ہی باتوں میں کٹ گیا۔ رات سے قبل وہ اپنے گاؤں پہنچ گئے۔ سردی کا موسم پورے جوہن پہ تھا۔ چپ سے باہر نکلتے ہی سرد ہوا میں ان پر حملہ آور ہو گئی۔ عدی نے ٹوٹ کی جیبوں میں ہاتھ چھپا لیے۔ شبیر نے جرسی پہن رکھی تھی۔ انہوں نے جھپٹ بیگ کھول کر ٹانگ کوٹ نکالی کر کندھوں پر ڈال لیا۔

دونوں گھر میں داخل ہو گئے۔ یہ غفور بابا کا گھر تھا۔ اپنی اینٹوں اور گارے سے بنا سرکنڈوں کی چھت والا گھر۔ چکنی مٹی سے لپا ہوا۔ غفور بابا نے اندر جاتے ہی آوازیں لگانا شروع کر دیں۔ ٹپ کی ٹپ سے اٹل خانہ ان دونوں کے گرد جمع تھے۔

"یہ میرا خاندان ہے شبیر میاں..... میری بیوی۔ میری بہنیں بیٹیاں..... پوتے نواسے۔ بہوئیں داماد..... سب کے سب ایک ساتھ رہتے ہیں۔ بڑا اتفاق ہے سب میں۔ بہت ڈرتے ہیں یہ سب میری گھر والی سے اس نے سب کو محبت، خلوص اور بھاری ڈوری میں باندھ کر رکھا ہے۔ یہ دیکھیں..... یہ بھی قطار ہے کمر و زانی۔ سب کو وہ دو کمرے دے رکھے ہیں۔ اٹھنے بیٹھنے کو اسونے کو..... کھانا سب ایک ساتھ کھاتے ہیں۔ محنت جو ایک ساتھ کرتے ہیں۔ تھوڑی سی زمین میں رب نے برکت دے رکھی ہے۔ گندم کا ایک دانہ اور کپاس کا ایک پھول ضائع نہیں ہوتا۔ وہ دیکھیں۔ اور یا زہر ہے۔ بارہ پندرہ پینیسٹین میں پھینک کر کپاس اور ہنڈی ہیں۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ دو دو دینی کتبیں، شبیر بھی۔ سب خالص ہے سچ جب آپ میرے ساتھ چلیں گے تو میں آپ کو آپ کی زمینوں کے علاوہ اپنی چھوٹی۔ وٹی کھیتی اور سبزی کا فارم بھی دکھاؤں گا۔"

"غفور بابا! یہ گھر تو آپ کی چھوٹی سی سلطنت ہے۔ آپ اسے چھوڑ کر تار سے ہاں رہتے ہیں۔"

"نہیں شبیر میاں! یہ بھی ولایتی ہے اسے دفعتی کہہ لیں۔ میں بچہ تھا ابھی جب مر عبد اللہ کے ہاں چھوڑ آیا تھا۔ مجھے میرا بابا۔ اس گھر کو چھوڑوں تو کیسے۔ میری زندگی کی کہانی تو وہیں لکھی پڑی ہے۔ بہت کچھ دیکھا ہے میں نے..... میں تو وہاں تھمائی میں بھی خوش رہا۔ اب صاحب آگئے ہیں تو کیسے چھوڑ دوں۔ ولایت منہ موڑ لوں۔ بڑے صاحب نے مجھ سے وفاداری کا عہد لیا تھا۔ اس عہد کو کیسے توڑ دوں۔ آپ تو بچے ہیں شبیر میاں! آپ کو کیا خبر۔ میں نے تو وفا سب سے کی ہے۔ صغیرہ لہجہ سے بھی..... کثیر لہجہ سے بھی۔"

"یہ کون ہیں؟"

"صغیرہ لہجہ سے آپ کی پھوپھی ہیں۔"

"میری پھوپھی....."

"ہاں میاں..... اگلی پچھ پچھی..... کیا آپ کو خبر نہیں۔"

"نہیں تو۔"

"اچھا اسکوپ ہے یا..... ان پھوپھی صاحبہ کی لڑکیاں بھی یقیناً ہوں گی۔ میں بچہ کلب کی آدمی سے زیادہ نبران سے کہہ دوں گا۔ وہ تم پر غار ہونے کا ارادہ ترک کر دیں۔ کیونکہ عنقریب تم اپنی کزن کو پیارے ہونے والے ہو۔" عدی شرارت سے ہانڈا یا۔

"اوہ لہان نہیں عدی۔"

"بچی تو چپ رہا کرو۔ ان باتوں کا کیا کر بھلا۔"

"تھیک ہے چپ ہو جا تا ہوں لیکن نگر نہ کرو۔ واپس جاتے ہی کھون لگانا میری ذمہ داری۔ بچہ کلب کی نبران نہ کہی لیکن میں چاہتا ہوں تم کسی نہ کسی سے نہ ہو جاؤ۔"

شبیر نے اسے ٹھوٹا..... وہ ہنس دیا۔

.....

"سچ کہہ رہا ہوں۔ کسی نہ کسی کا ہو جاتا اس قدر بڑی ہے اور اب تو اتنے عرصے بعد تمہارے پایا تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہیں سر آنگھوں پر بٹھارے ہیں۔ تمہاری ساری آرزوئیں بھانسی کبے پوری ہو رہی ہیں۔ اب کس بات کا خوف ہے۔ کر لو بیٹا کر لو بیٹا محبت۔ معاملہ سیریش ہو گیا تو پاپا سے کہہ کے..... لیکن بچوں پاں کے ساتھ میرا مطلب ہے شہنائی کی گونج میں اسے ضربے آنا۔"

"مختصر لہجہ اس بند۔ اندر چلو مارے سردی کے ہاتھ پیرا کڑنے لگے ہیں۔" شبیر نے عدی کا ہاتھ تھاما۔ غفور بابا کہاں دہنوں کی اس گفتگو کو خبر نہ ہوئی۔ وہ بولے۔

"چلو بیٹا اندر کمرے میں..... یہ سرد کہاں ہے۔ سرد..... سرد بیٹے۔" غفور بابا آوازیں دے رہے تھے۔ لٹھوں میں ایک خوب صورت سانو جوان کرسٹہ اور لاسچ میں ملیوں اپنے مضبوط شاووں پر گرم شال ڈالنے ان کے سامنے تھا۔

"شبیر بیٹے! یہ میرا سب سے بڑا پوتا ہے سرد..... پانچ بھائی ہیں پاپا کر چکا تھا۔ پھر اس کا پاپا مر گیا..... وہ میرے گھر کو سنبھالے ہوئے تھا۔ میں نے سارا بوجھ سرد کے کندھوں پر ڈال دیا۔ میرا یہ بیٹا بہت محنتی اور جتنا تھا ہے۔"

"سلام سائیں..... سرد بران کے آگے قدرے جھکا۔

"ارے نہیں یا..... تم سے تو ہاتھ ڈا کر بات کرو۔" شبیر نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

سرد نے جھکتے ہوئے غفور بابا کی طرف دیکھا۔

"آپ مالک ہیں شبیر بیٹے۔ ہم لوگ آپ کے ٹک خوار ہیں۔ ہمیں اپنے درجے سے آگے نہ بڑھائیے۔"

شبیر مٹھا دیا۔

"ارے نہیں غفور بابا۔ میں اس ادھی بچے کو تسلیم نہیں کرتا۔ سب انسان بڑا ہیں۔ نسلیں اور رنگ تو میت..... ذاتیں یہ سب انسانیت کے آگے بھاگتی ہیں۔ انسان بن انسان ہی ہے۔ سرد ہمیں اپنا دوست سمجھو۔ ہم سے ہاتھ ڈالو۔ غفور بابا کل ہم سے لے جائیں گے..... بے تکلفی کی لٹھا ہوگی تو مزا آئے گا۔ گائیڈ بھی دوست ہوتا ہے۔ تو بچی مسکرا دے۔"



سرور نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ پھر مدنی نے ہاتھ ملایا۔ غفور بابا نے سرور کو مخاطب کیا۔  
 ”سرور جے چھوٹے صاحب اور ان کے دوست کے لیے کمرہ تیار کراؤ اور ضرورت کا سامان بھی رکھو اور.....  
 میں سفر سے تھک گیا ہوں اور پھر نماز کا وقت بھی ہونے والا ہے۔“  
 ”غفور بابا..... ہمارا گھر یہاں سے دور ہے کیا۔“

”پتا گھر نزدیک بھی ہو تو کہا ہے۔ وہ تو اب ایک ویرانہ بن چکا ہے۔ کمرے بند ہیں۔ صحن میں جھاڑ جھکاڑ کا  
 قبضہ ہے۔ دور رہنے کے قابل نہیں..... چھوٹے صاحب! میرا گھر آپ کے گھر جیسا سجا دیا اور قیمتی تو نہیں پر  
 آپ کو یہاں آرام ضرور ملے گا۔ اگر آپ چاہیں تو میں کل وہ گھر صاف کروا دوں گا۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ کل جا کے دیکھیں گے۔ فی الحال تو کمرہ غفور بابا ہمیں..... بھوک لگی ہے۔“ مدنی نے پیٹ پر  
 ہاتھ پھیرا۔

”کیوں نہیں..... کیوں نہیں.....“ غفور بابا نے جلدی سے کہا۔ ”سرور..... اپنی ماں سے کہو کھانا تیار کر  
 دے۔“  
 ”میں جس غفور بابا کھانا تیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو بھی ان لوگوں نے اپنے لیے بنا رکھا ہو ہمیں بھی دے  
 دیں۔ کیوں مدنی؟“

”کیوں نہیں..... بالکل۔ میں جب بھی مجال پور جاتا ہوں ہمسروں کے ساگ اور تندوری روٹی کی فرمائش کرتا  
 ہوں۔ شہیر بھی تم نے کھایا۔ ایمان سے ٹھنڈا کھن کرہ روٹی، شہیر چوں والا ساگ..... جواب نہیں۔“ مدنی نے  
 نقشہ کھینچا۔

”وہ جی..... ماں نے آج ساگ ہی پکایا ہے۔“ سرور بھولا بھالا سیدھا سا دارچان تھا خوش ہو کر تانے لگا۔  
 ”تو پھر دیر کس بات کی..... ہم..... میرا مطلب ہے ہم اپنے کمرے تک جاتے ہیں..... آپ..... آپ.....  
 غفور بابا ہمارے لیے کھانا بھجوا دیں۔“ شہیر نے جلدی سے بات مکمل کی۔

☆☆☆☆☆☆

مہمانوں کی خاطر دارمی میں نئے بکس میں بند نئے بستر نکالے گئے۔ بڑے بڑے سرخ پاپون والے مہین بان  
 سے بنے پتھوں کو کھیس اور دو دو گدے اوپر پلنگ پوش ڈال کر ریشمی کراف اور کڑھائی والے سفید کٹیوں سے سجا دیا  
 گیا۔ لڑکیاں بوسے کی سرخ انگوروں سے بھری انگلیٹھیاں دیاں رکھ گئیں۔ جانے کہاں سے ایک میڈلائی ملی جس  
 پر کڑھائی والا میز پوش تھا اور امپوتھانا سجا دیا گیا۔ وہ چار ٹھنڈوں کے سفر نے دونوں کو تھکا دیا تھا اور بھوک بھی  
 زوروں پر مٹی دونوں نے سادہ سے کھانے سے خوب انصاف کیا۔ مدنی تو کھانا کھاتے ہی بستر میں گھس گیا جب  
 کہ شہیر سرور کو لے کر گھر سے باہر آ گیا۔ چاندنی رات کا جو بن اپنے عروج پر تھا۔ حد نظر تک پھیلا سبزہ.....  
 سرسراتی ہوائیں کچھ فاصلے پر چٹا ٹوب ویل شناخت پانی کی سوتلی سی دھار چاندنی میں چمک رہی تھی۔ خاموش  
 فضا میں یہ سب کچھ بہت دلربا تھا۔

”سرور.....“

”جی صاحب!“

”تم لوگ یہاں کیسے رہتے ہو؟“

”بہت خوش جی۔“

”میں کہہ رہا تھا..... تمہیں شہری سہولیات کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔“  
 ”نہیں صاحب۔ ہمیں یہاں کی قسم کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ اپنا گھر اپنی زمینیں بھینسیں گائیں..... مرغیاں!  
 اتنے نسیت سبزیاں سب کچھ ہی تو اپنا ہے۔“  
 ”سرور تمہارا دل کتنے چاہتا کہ تم شہر میں پتھر سے بنے بڑے سارے بنگلے میں رہو۔“  
 مدنی نے سے منس دیا۔

”بابا کہتا ہے آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے جی..... خدا مبارک کرے۔ ہم لوگ تو ہمیں کے عادی ہیں۔“  
 ”تم گری میں بھی خود مل چلا تے ہو؟“  
 ”جی ہاں..... کام کی دھن میں گری سردی کی خبر نہیں ہوتی جی اور پھر میں ہی کیا۔ میرے ساتھ اور بھی لوگ  
 ہیں۔ ہم سب مل جل کر کام کرتے ہیں۔ محنت کرتے ہیں۔ چھ ماہ بعد جب یہ بڑی فصل کی ڈھیرنی ہمارے سامنے  
 ہوتی ہے تو ہم گری سردی سب بھول جاتے ہیں۔“  
 ”فصلوں کا کیا کرتے ہو؟“

”جی نہیں تو سال کے خرچ کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں۔ کپاس کی ڈھیرنی سچ کر سال کا خرچ چلاتی ہے میری  
 ماں جی۔“  
 ”اب تم لوگ کیا کرتے ہو۔ کپڑا اور دوسری ضروریات۔“  
 ”جی وہ ہم سب کی ضروریات کا خیال رکھتی ہے۔“  
 ”اچھا..... اس کا مطلب ہے تمہارا گھر معاشی مساوات کے لیے ایک عمدہ نمونے کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے  
 یا تم لوگ اپنا جان نہیں مانتے۔“

”صاحب! جب بنانا تلے ہی مل جاتا ہے تو احتجاج کس بات کے لیے۔ داوی ماں ہم سب کو ایک نظر سے  
 دیکھتی ہے اور ہم جو محنت کرتے ہیں تو یہ سوچ کر ہی کرتے ہیں کہ اس کمائی میں دوسروں کا حصہ بھی شامل ہے۔  
 ماں صاحب! زندگی سے لیا رو دق رانی نکال دنی جائے تو آدمی بھی چنور نظر آنے لگا۔ اسے لیے کرنے اور  
 سروں کے لیے کرنے میں بہت فرق ہے۔ خوشی تو سب ملتی ہے جب آپ دوسروں کے لیے کچھ کرتے ہیں۔“  
 ”سرور.....! شہیر ٹھنک کر رک گیا۔

”جی چھوٹے صاحب۔“  
 ”یہ باتیں تم نے کہاں سے سیکھی ہیں۔“  
 ”یہ باتیں مجھے میرا من سکھاتا ہے جی۔“  
 ”پھر تو تمہارا من بہت خوبصورت ہے۔ تمہارا دل محبت سے بھرا ایک گوارا ہے جہاں امن و سکون ہے۔“  
 ”جی ہے۔ کچھ چٹکان ہے۔“  
 سرور ہنس کر لگا رہا۔

”سرور تم میرے ساتھ چلے چلو۔“  
 ”نیویں چھوٹے صاحب۔“  
 ”اگے پڑھ لو..... اس ملک کو تم جیسے رہن خیال نہ جانوں کی ضرورت ہے۔ ملک کی ترقی ایسے ذہنوں کی  
 منت ہے۔“

"جی... آپ نے کیا کہا؟"

"میں کہہ رہا ہوں کہ تم تعلیم حاصل کرو۔ ترقی کرو۔"

"تمہیں چھوٹے صاحب... پایا کے بعد یہ گھر چھ پر چل رہا ہے۔ میں کیسے جاسکتا ہوں۔ ہاں اپنا شوق میں اپنے دوسرے بہن بھائیوں پر پورا کر رہا ہوں۔"

"اچھا! کس پڑھا رہے ہو۔" شبیر نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"جی ہاں۔"

پاتیں کرتے کرتے وہ کالی دور نکل آئے۔

"چھوٹے صاحب... آپ بھی پڑھ رہے ہوں گے۔ دیے آپ کو ضرورت تو نہیں پڑھنے کی۔"

"وہ کیوں؟"

"آپ کے والد صاحب اتنے بڑے آدمی ہیں۔ پڑھ لکھ کر آپ کی تھوڑا کرنی ہے۔"

شبیر ہنس دیا۔

"بہت بخوبی ہو سہرہ... صرف نوکری کے لیے پڑھا لکھا جاتا ہے کیا؟ میں تو تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ معاشرے میں شعور و آگہی کی روشنی پھیلانے کے لیے۔ جھوٹی و ظرائف کی پہچان کرانے کے لیے۔ انسانوں کی اس ہستی سے اونچے نیچے کا فرق مٹانے کے لیے۔ مجھے دنیا کے اس قانون سے یہاں کے رسم و رواج سے نفرت ہے۔ میں یہاں اس قانون کی حکمرانی دیکھنے کا اتنی ہوں۔ جو امیر اور غریب کا فرق مٹانے۔ جس کی کوئی مصلحت نہ ہو۔ جس کے باہمی اور بھرتی رنگ نہ ہوں۔ قانون کی حیثیت اہل ہو۔ قانون نہ بدلے۔ ہاں انسان کو اپنی ذات میں تبدیلی لانا ہے۔ وہ میں بھی نہیں ہمت کرنے لگا۔ میرا خیال ہے ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ سچ آگے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ تھک گئے ہوں گے۔ چل کر آرام کیجیے۔ دونوں واپس مڑے اور گھر کی طرف چل دیے۔"

☆☆☆☆☆☆

وقت سحر شبیر نے عدی کی بھی کان سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

"کیا کرتے ہو پار... سونے دو... وہ پھر لیٹ گیا۔"

"میرے ساتھ رہو گے تو یہی کہی ہوگا۔"

"واو کوئی زبردستی ہے کیا؟" اس نے لحاف میں منہ چھپانے کی کوشش کی۔

"ہاں زبردستی جلد ہونے کے ساتھ پہلے نماز پھر کوئی اور بات۔" شبیر نے اس کا کان مرہ زودیا۔ عدی کو گرم ہنسنے لگا۔

سردان کے لیے گرم پانی لے آیا تھا۔ نماز کے لیے وہ دونوں اس کے ساتھ چلے آئے۔ کپے آئین اور مکی عمارت والے اللہ کے گھر میں سجود کی چٹائی پر سر رکھ کر بھی شبیر اہل اور غربت کے فرق کو سمجھنے میں کوشاں رہا۔

تا شتا بہت جلد تیار ہو گیا تھا۔ عدی نے خستہ پائے اور کھن کا خوب کھل اٹھا۔ دوہ پتی کی چائے ح... لے کے بی اور شبیر کے ساتھ تیر پڑ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

شبیر کے پروگرام میں اپنا گھر دیکھنے کا شوق بھی شامل تھا۔ حویلی واقعی آسپ زدہ نظر آتی تھی جہاں دن میں باتے ہوئے بھی خوف محسوس ہوتا تھا۔ حویلی سے تھوڑے فاصلے پر ایک انتہائی خستہ حال چھوٹی سی عمارت میں معلم سرمانی چھٹیوں میں بھی علم کی روشنی پھیلانے میں مصروف تھے۔ شبیر مسرور اور عدی کے ساتھ بے جھراک اسکول میں داخل ہو گیا۔ نچے زمین پر بیٹھے سوتی پڑھ رہے تھے۔ اسکول کی عمارت انہیں سردی اور گرمی سے جانے کے لائق نہ تھی۔ وہ کالی دیر اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے باتیں کرتا رہا۔

"اب تو سردیاں ہیں۔ جو پ میں بیٹھ کر گزار رہا ہوں ہے۔ گرمیوں میں یہ بیٹھے کہاں بیٹھتے ہیں۔" اس نے کسی باہر تعلیم کی طرح متعدد سوال پوچھنے کے بعد یہ سوال کر لیا۔

"گرمیاں درختوں کے سائے میں ہی ہوتی ہیں۔ کئی بار میں نے اور مجھ سے پہلے ہیڈ ماسٹروں نے درخواست تڑاری ہے لیکن ارباب اختیار کے کانوں پر جوں تک نہیں رہتی۔"

"میں اپنے پاپا سے بات کروں گا وہ متفقہ مجھے تک آپ کی شکایت پہنچا دینگے۔ میں شہانہ نواز عسکری کا بیٹا ہوں۔ وہ سائے کی وسیع و عریض عمارت میرے آباؤ اجداد کی ہے... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس بے مصرف عمارت کو اسکول بنا دیا جائے۔" شبیر نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"یہ باتیں ہے بیٹے۔" ہیڈ ماسٹر نے نرمی سے کہا۔

"کیسے ناممکن ہے۔ میرے پاپا کا گھر میرا گھر بھی ہے اور میں بہ خوشی اجازت دے رہا ہوں۔ ابھی ایک استاد صاحب نے مجھے بتایا کہ نڈل کے بعد بچوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ چار سٹل دور کے ہائی اسکول میں جانا پڑتا ہے۔ آپ فکر نہ کریں سر! میں پاپا سے کہہ کے اسکول کا درجہ بڑھوانے کی کوشش بھی کروں گا۔ آپ ایسا کریں اپنے ملازموں اور طالب علموں سے یہ گھر صاف کر کے اسکول کا سامان ادھر منتقل کر دیں۔"

"آپ نادانی کی باتیں کر رہے ہیں۔"

"پھر گز نہیں آپ اسکول منتقل کریں۔ اپنے پاپا سے بات کرنا میرا کام ہے۔" وہ اڑ گیا اپنی بات پر۔

"دیکھیے بر خوردار! ہم اپنے گھر کی اجازت کے بغیر ایسا کرنے کے مجاز نہیں۔"

"سر! مجھے کو ان بچوں کی محنت اور جان کی فکر نہیں ہے تو جلد کی تہہ ملی کے بارے میں سوال کرنے کا بھی حق نہیں اگر سردی گرمی نے کسی کی جان لے لی تو۔" وہ چند ہائی ہو گیا۔

"پچھلے سال دو بچے لو لکھنے کی وجہ سے مر گئے۔" ایک استاد نے زبان کھولی۔

"تو... تو آپ کے گھر نے اس کی ذمہ داری قبول کی۔ سر! آپ ظلم کی بولت سے مالا مال ہیں۔ آپ نے بھی کہیں پڑھا ہوگا۔ لیکن میرا تو ایمان ہے جس کام سے نفع انسانی کی بھلائی ہو رہی ہو کسی ذی روح کو ہائی یا روحانی نقصان نہ پہنچ رہا ہو اس کے کرنے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ سامان اٹھوائیں اور چلیں۔"

"صاحبزادے! ہم گھر کی اجازت اور آپ کے والد صاحب کی رضامندی کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔"

"ٹھیک ہے میں کبھی ہی جا کر آپ کے دونوں اعتراض ختم کر آتا ہوں۔" شبیر نے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا۔ دوپہر اس نے جذباتی انداز میں غور بابا سے کر لیا۔ وہ اسے ایک بچے کی ناجائز خند سمجھ کر مسکرا دیے۔ سردی کے لیے یہ بڑی خوش کن بات تھی۔

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریٹریوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”چھوٹے صاحب! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ بڑی عمارت ہوگی اسکول کے بعد بڑھ جائے گا۔ میرے بھائی نہیں پر تعلیم حاصل کرتے رہیں گے گاؤں کے سب لوگ آپ کو دعا کریں گے۔“

”ہاں سرور! سب کا حصہ بنا رہے۔ دعا کرتے ہیں اس لیے تم اس احتمالی حکام کو بدلنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ جو ملک کے غریب عوام کا نسیب ہے اور کچھ نہیں تو میرے گاؤں کے لوگ تو جبر و استبداد اور محرومی کی زندگی سے نکل آئیں۔ تم ایجنٹ کی ترقی ہماری ترقی ہوگی اور ہماری ترقی ملک کی ترقی۔ ہم سب کو مل کر اس معاشرتی ڈھانچے کو بدلنا ہوگا۔ ایک انسان کو غریبی کے قیدی بنانا چاہیے۔ اس سے خود بیان چھین لی جاتی ہے۔ یہی ہماری ہستی اور نفس ماندگی کا سبب ہے۔ میں نکل جاؤں گا اپنے پیسے سے بات کروں گا۔ پاپا کو اپنے گاؤں کے لوگوں کی فکر مجھ سے زیاہ ہوگی۔“

”سرور! شب باہر جانے کے لیے شہر کو سرور کے سہارے کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ میں سے ذہن میں اسکول کی تجویز نے گھر کر لیا تھا۔ اسی خیال کے تحت وہ اکیلا ہی اپنی حریف کی طرف چلا گیا۔ درخت باغ میں لیے وہ حریف کی کمانڈر چلا آیا۔ متحور کرے جن میں سے کچھ متقبل تھے کچھ کھلے۔“

یہ بڑی عمارت صفائی ستھرائی اور ضروری مرمت کے بعد ایک باقی اسکول کے لیے کافی تھی۔ اپنے ارادے کو جلد از جلد عملی جامہ پہنانے کے شوق نے اس کی آنکھوں سے نیند چھین لی تھی۔ مگر وہیں کی طرف سوچ بچار کرتے وہ پندرہ منٹ بعد حریف سے نکل آیا۔ حریف کی بیرونی دیوار کے ساتھ وہ انسانی سایوں نے اسے چھونکا دیا۔ گھر کو خوف سا آیا۔ نسوانی سسکیوں نے اس کی راہ روک لی وہ دروازے پر ہی رکت گیا۔ وہ جو بھی تھے انہیں حریف کی دیوار کے پار تھے شہر نے آواز کے تعاقب میں اپنی قوت باعت دوڑائی۔

”یہ ممکن ہے..... یہ ممکن ہے..... میں تیرے ساتھ چلی بھی آؤں کون توئی کرے گا مجھے۔ میرے باپ کو تو صرف پانچ ہزار کی ضرورت ہے۔ ان پانچ ہزار روپوں کے بغیر میرے گھر بھائی کی شادی نہیں ہو سکتی۔ وہ مجھے بچ کر میرے بھائی کا گھر آباد کرنا چاہتا ہے اور اس بڑھے کدو سے لے کر پانچ ہزار کے بجائے دس ہزار دینے کا وعدہ کیا ہے وہ تیرے ہاتھ میں میرا ہاتھ کس طرح دے دے گا۔“

”میں کچھ کھا کے سو رہی ہوں گا..... اپنی آنکھوں سے تجھے اس کہیں نہ دے گی ڈون میں بیٹھ کر جاتا ہوں دیکھ سکتا۔ اس آواز نے شہر کو بھونکا دیا۔ وہ سرور تھا۔ لڑکی بولی۔“

”سرور..... تو اپنے زانے سے بات تو کر.....“

”کیا کہوں؟ نہیں نہیں یہ تو میں کبھی نہیں کہہ سکتا۔“

”تو پھر گھر چھوڑنے کا مشورہ کیوں دے رہا ہے۔“

”اس لیے کہ مجھے تیری اور تجھے میری ضرورت ہے۔ ہم دونوں بھوک ٹھک میں بھی گزار دے لیں گے۔ تیرا ہانا پھر پیسے کے تیرا ہاتھ میرے ہاتھ میں نہیں دے گا اور میرا ہانا یہ پیسے نہیں دے سکے گا۔“

”سرور! تیرے دادا کے بارے میں اتنی بھینسیں گائیں ہیں..... وہ وہ جانور تیری خاطر نہیں بچ سکتا۔“

”جانور صرف دادا کے یا میرے نہیں اس کے کئی حصے دار ہیں راتو..... وہ کب گوارا کریں گے۔ پھر تو میرے چاہنے کے ہیں..... چھو پھوسوں کے بیٹے سب ہی..... نہیں نہیں راتو..... یہ نہیں ہو سکتا..... میں تیرے جدائی پر صبر کر سکتا ہوں صبر نہ کر سکتا تو جان دے سکتا ہوں لیکن نہیں کر سکتا۔“

لڑکی زور زور سے رونے لگی۔

”کیوں بڑھا تم میری طرف؟ کیوں آیا تم میری طرف؟ کیوں اٹھائی تمہیں ساتھ نبھانے کی قسمیں؟ کیوں دکھائے تھے اپنے منگ چینی کے خراب صرف اس لیے کہ اس بڑھے خزانہ کی تیج جاتے ہوئے میں خون کے آنسو روٹی رہوں۔ تجھ سے کچھ نہیں: وہ میں ہی کچھ کروں گی..... میں ہی.....“

”کیا کرے گی؟“

”جرجی میں آئے گا۔“

”اچھا مجھے سوچتے رہے..... اور اب ایجازت دے شہر سے چھوٹے صاحب آئے ہیں نا۔ دادا ہاں رہیں ہو گا کہ میں کہاں مر گیا۔ چھوٹے صاحب کو گاؤں بھا گیا ہے۔ شاید اب بھی وہ میرے ساتھ چاندنی رات کا نشانہ کرنے جائیں۔ میں کل تجھ سے بات کروں گا۔“

”تو نے کیا کرنا ہے۔ تو نہ دل ہے؟ میں ہی کچھ کروں گی۔“

سرور اس دیا۔

”اچھا اب رکھا۔“

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ سرور آگے بڑھا تو شہر دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ سرور تیز قدموں سے چلا بہت جلد آگے نکلی گیا..... شہر نے باہر نکل کر فاس کی دیوار کے ساتھ لگا کی۔ لڑکی مخالف سمت تیز قدموں سے جا رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے ہونیا۔ وہ صرف اس کا گھر دیکھنا چاہتا تھا۔ آٹھ دس قدموں کے فاصلے پر اس کے پیچھے چھپے چلتا وہ اس کے تعاقب میں جا رہا تھا۔ گڈ ٹری پر چلتے ہوئے وہ دونوں کا کافی دور نکلی آئے۔ راستے سنسان اور درمیان تھے۔ دور دور تک کسی انسان کا نشانہ نہ تھا۔ سرور بھی جاتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ شہر کو راستوں سے شامانی تھی۔ وہ لڑکی کی طرف مڑ گئی۔ شہر بھی پیچھے پیچھے چلا۔ یہاں تک کہ وہ ایک کنویں کے قریب آئی۔ اسے خبر نہ تھی لیکن یہاں کنواں تھا جو گاؤں والوں کے استعمال میں نہیں تھا۔ شہر نے دیرانے میں لڑکی کو رکھا دیکھا تو ٹھنک گیا اور تیز تیز قدموں سے اس کے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ لڑکی نے کنویں کی منڈی پر ہاتھ رکھ کر اندر جھانکا۔ دوسرے بل..... وہ منڈی پر چڑھی..... اور جو بھی اس نے کو دنا چاہا شہر نے پوری قوت سے تھما لیا۔

ایک تیز چالوں اور پھیل گئی۔

”کون ہوں؟ چھوڑ دو مجھے۔“ لڑکی نے ایک دم سڑک اس کی طرف دیکھا۔

شہر نے اسے ہانپوں میں بھر کر منڈی سے بچنے کرا تا رہا۔ وہ اپنا آپ بچرانے کے لیے چلی

”مرنے جا رہی تھی حرام موت..... مرنے نہیں آتی۔ اس کے لہجے میں بھر پور مرد کا لہجہ بند آیا۔“

”تم کون ہو؟ وہ میرے پیچھے کیوں آئے؟“

وہ مشتعل ہو رہی تھی شہر نے اسے چھوڑ دیا۔

”مرنے دو مجھے۔ جی کر کہہ بھی کیا ہے۔ کیا رکھا ہے اس دنیا میں۔“

”نہیں زندگی اتنی سستی نہیں ہوتی بے وقوف لڑکی۔“

”سستی ہو یا مہنگی مجھے کچھ نہیں لینا دینا..... تم اپنی راہ لو..... ورنہ کسی نے دیکھ لیا تو میرے گل کے انعام میں بھر لے جاؤ گے۔“

شہر نے اس کا بازو تھما لیا۔



”رائو کے باپ نے زبان دے رکھی ہے..... اور..... اور شبیر بیٹے۔ یہاں کے ماحول میں اس حرکت کو بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ وہ تو آپ نے دیکھا کوئی اور کچھ لیتا تو دونوں کو گل کر ڈالتا۔“

”مگر حضور بابا! کسی کو زندگی کے ساتھی کے طور پر پسند کر لینا جرم تو نہیں جو سزا بھگتنا پڑے۔ رائو اس بڑے آدمی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔ اس کا دل نہیں چاہتا۔ وہ اسے قبول نہیں کر سکتی۔ زبردستی تو جرم ہے آپ یہ جرم نہ ہونے دیں اسے بچالیں۔ سرور بزدل بنا ہوا ہے آپ کے خوف سے۔ پیسے کیا کمی سے۔ آپ جائیں حضور بابا۔ اس کے والد سے بات کریں۔ میں پیسوں کا انتظام کر لوں گا۔“

”نہ..... نہ..... نہ..... نہ چھوٹے صاحب۔“ حضور بابا نے جلدی سے کہا۔

”میں بابا..... خوشیاں اس کائنات کی رونق ہیں..... اس کائنات میں خوشی کے پھلے ستارے میری خوشی کا باعث بھی ہیں اور میرا مشن بھی میں پیسے لے آؤں گا۔ آپ جانے بات کریں۔“ اس نے فیصلہ کر دیا۔

سرور اس کے ساتھ ساتھ اس کے گھر سے نکلا۔ باتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی تھیں۔

”چھوٹے صاحب آپ انسان نہیں نیکی کا فرشتہ ہیں۔ آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ورنہ رائو کی موت کے بعد میں کب زندہ رہتا۔ میں عمر بھر آپ کی غلامی میں رہنے کو تیار ہوں۔ آپ نے مجھے بنامول خرید لیا ہے چھوٹے صاحب۔ یقین کریں میں آپ کی ایک ایک پائی ادا کروں گا۔ رائو بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس کی ہر اہم میری موت میں اضافہ کر دے گی۔ میں خوب محنت کروں گا۔“

”مگر ان پیسوں کے لیے نہیں اپنے لیے محنت کرنا۔ یہ پیسے ہماری طرف سے شادی کا تحفہ ہوں گے۔“ وہ بہت بڑے دل و ظرف کا مالک تھا۔

”نہیں صاحب آپ کا یہی احسان بہت ہے۔“

”خیر..... میں اور عدنی چائیں گے اور پیسے لے کر آ جائیں گے۔ حضور بابا یہیں رکھیں گے۔ ہمارے آنے تک آئی سمجھ۔“

”جی..... جی ہاں۔“

”اچھا جی اللہ کی امان۔“

عدنی اچھے لکھنے کے قریب بیٹھا تھا۔

”کہاں پھر رہے ہو یا..... میں اکیلا پورہ ہورہا ہوں۔“

”اب پور نہیں ہو گے۔“

”کیوں کیا تم کوئی پھلجڑی چھوڑنے والے ہو۔“

”زبردست خبر ہے۔“

”کیا؟“

شبیر نے ساری بات عدنی کے گوش گزار کر دی۔

”وٹا رفل..... یار تم نے تو اکیلے اکیلے بیٹی کمانی..... مجھے بھی شریک کر لیتے اس فلمی چھوٹیشن میں۔“

”فلمی چھوٹیشن؟“

”ہاں ہاں ایک تجا لڑکی کو رات کی تاریکی اور سناٹے میں موت کے منہ میں جانے سے بچانا۔ گھر پہنچنا، مگر شہی!

”میری بات سنو۔ آؤ وہاں بیٹھ جاتے ہیں۔“

اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔ کھلی سے اسے گھورا۔

”مجھے نہیں سنی کوئی بات۔“

”آؤ میں تمہیں تمہارے گھر لے جاؤں۔“

”مجھے گھر نہیں جانا۔“

”سنو تمہارے بابا کو دس ہزار روپے میں دوں گا۔ اور حضور بابا سے بھی کہہ دوں گا وہ تمہارا ہاتھ سرور کے لیے مانگ لیں گے۔“

”تحت..... تم یہ سب کچھ کیسے جانتے ہو؟“

”میں اس سے بھی زیادہ جانتا ہوں اور مجھے جانتا بھی چاہیے تھا۔“

”آخر ہو کون تم؟ ہجرت ہو جن ہو کون ہو؟“

شبیر مسکرایا۔

”پانگ لڑکی! میں اس علاقے کے جاگیردار شاہنواز عسکری کا بیٹا ہوں..... اپنے گاؤں کے رہنے والوں کے حالات سے باخبر رہتا میرا فرض ہے..... میں تمہاری مدد کروں گا۔ تم خود کشی کا خیال چھوڑ کر میرے ساتھ چلو۔“

”مگر تم..... آپ..... آپ کو کیسے خبر ہے۔“ وہ گھبرا گئی..... گڑبڑانے لگی۔

”ہاں کی لگن نہ کرو۔ سرور میرا دوست ہے اور دوست دوستوں کی ضرورت ہی ہیں۔ تمہیں اس کا گھر یاد کرنا ہے یہ دیران کون تمہارا ٹوکھا نکھل چلو..... چلو میرے ساتھ.....“

”تین میں..... میں آپ کو اپنے گھر کیسے لے جاؤں؟“

”نہ لے جانا..... میں تمہیں باہر تک چھوڑ کر چلا جاؤں گا میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری شادی سرور کے ساتھ ہو گی۔ پر تمہیں بھی وعدہ کرتا ہوں کہ تم خود کشی جیسا نہیں خیال اپنے دماغ میں نہیں لاؤ گی۔“

لڑکی نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

”اچھا چھوٹے صاحب!“

”ہاں بالکل سچ..... ہم ایک دون میں تمہارے بابا کے پاس آ جائیں گے۔ اب چلو کس طرف چلتا ہے۔“

وہ اس کے ساتھ چل دی۔ اسے چھوڑنے کے لیے جاتے ہوئے شبیر کو راستے کی خبر نہ ہونی گرائی کے گھر کے قریب جا کر پتا چلا کہ وہ حضور بابا کے گھر کے ساتھ پہنچ چکا تھا۔

سرور کسی مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا اور شبیر اچھائی ساؤٹی کے ساتھ اس کے کام خنق کی داستان شبیر بابا کو سنار با تھا۔ یوں کہ سرور کو فرود جرم سے انکار کی حسرت ہی نہ تھی اور فقیر بابا خاموش تھے۔

”سادہ کی بات ہے۔ حضور بابا۔ جو ایک بچے کی مجھ میں بھی آ سکتی ہے..... اس میں سرور اور رائو کی زندگی کا سکہ چمکن ہے۔“ سب کچھ بچہ کر شبیر نے سرور کی دکالت شروع کر دی۔

حضور بابا خاموش ہی رہے۔

”آپ بولتے کھلی نہیں۔ دس ہزار کی معمولی رقم خوشیوں کی خریداری میں لگ جائے تو کیا ہے۔“

”بٹے بات صرف دس ہزار کی ہی نہیں۔ صد اور ہٹ دھرمی کی بھی ہے۔“

”کیسی خند..... کیسی ہٹ.....“

یہاں تک تو بات دلچسپ ہے لیکن سرد سے اس کی شادی نہیں۔ نہیں یا رہا ہے یہاں ملا ہوئی ویسے لڑکی ہے کسی؟ خوب صورت ہے؟“

”خوب صورت ہوگی اچھی ہوگی۔ سچ پوچھو تو میں نے دیکھا ہی نہیں۔“

”چہ..... چہ..... تم نے دیکھی ہی نہیں لڑکی..... یقین کرو اگر تمہاری جہد میں ہوتا تو اپنے حق میں وہ دلائل دیتا..... اتنی شہادت کہ وہ سب کچھ بھول بھال میرے عشق میں جلا ہو جاتی اور میں اسے راتوں رات لے کر کہیں چلا جاتا۔ کورٹ میری جگہ کرتا۔“

”عدلی کے بچے..... کوئی تیز بچی ہے یا ویسے ہی کہے جاتے ہو۔“ شہیر نے اسے گھورا۔

”اس گاؤں کے رہنے والے خدا کے بعد پاپا کے آسرے پر ہیں۔ حضور بابا کے خاندان کے لوگ نہیں کیا سمجھتے ہیں اور تم.....“

”حافظ کرنا یا سردی لگ رہی تھی اول قول یک گیا۔“

”خیر معاف کیا..... اب چلو ہمیں ابھی عباس گھر جانا ہے۔“

”عباس گھر.....!“

”ہاں ڈیڑی سے شورہ کرنے۔“

”کس بات کا؟“

”بہت سی باتوں کا۔“

”چلا اچھا ہے۔ میری کلب پارٹنر کی تھی ہو جائے گی۔ مجھے دیکھ کر..... بے چاریوں نے وہاں جانے کس طرح گزارے ہوں گے۔“

”بٹ جاؤ گے میرے ہاتھوں۔“

عدلی نے خود کو بس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ سے پھالیا۔

حضور بابا کو جتنے پتیرہ وہ دونوں چل دیے۔

جمال احمد گھر پر ہی تھے۔ مٹی نے شہیر اور عدلی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دوپہر کا تھا بابا میر پرنگ چکا تھا۔ سرد آ پالان میں بیٹھی تنگ کر رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی اندر آئیں۔ حذر ابھاگی بھاگی آئی۔

”ارے تم آ گئے۔“

”جی آپ کے خضر صفت شہیر صاحب کھینچ لائے۔ در میں تو اگلی شب کسی۔ جین کی جاس میں نکلنے والا تھا۔“

”کیا مطلب؟“ حذر اسے تختوں پر اچکائی۔

”بکنا ہے یہ..... حذر..... تم..... اس کی باتوں میں سنا تا۔ کوئی بات نہ ماننا یہ جھوٹ ہے پر لے در بے کا۔“

”کیا مطلب..... یعنی آپ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ سب سچا ہے۔“

”میرے بارے میں؟“

”ہاں ہاں۔ خضر کا کام کروں رہا ہماں جاؤں۔“ عدلی نے جھوٹ کہا۔

”چوڑو حذر..... اسے تو بات کا پتھر بنانے کی عادت ہے۔ بیٹے! تم کھانا کھاتے تہا بے شک پتھر کلب کا رخ کرنے میں ڈیڑی سے بات کروں گا۔“

کھانے کے بعد وہ جمال احمد کے کمرے میں تھا۔

”ڈیڑی! مجھے آپ سے کچھ کہنا..... اور کچھ مانگنا تھا۔“

”کہو بیٹے۔“

شہیر نے سب کچھ لہہ سٹایا۔ جمال احمد ستراتے رہے۔

”ہاتھیں دہلوں ٹھیک ہیں، دل کو تھکے دانی ہیں۔ لیکن شہیر انہی ایسے کاموں کے لیے تم بہت چھوٹے ہو۔“

”ڈیڑی! مجھے امید تھی آپ میرا حوصلہ بڑھا سکتی ہیں گے۔ میری جرأت کو سہارا دیں گے مگر آپ.....“

وہ اندر دھیر گئی۔

”آپ نو مجھے کچھ بھوکنا ل رہے ہیں۔“

”نہیں بیٹے..... میں جانتا ہوں شاہنواز مسکری اس تجویز کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔ اپنا گھر دے دینا کوئی آسان بات ہے کیا۔“

”وہ گھر بے مصرف ہے کیڑے مکوڑوں کا مسکن ہے۔ ضائع ہو رہا ہے انسانوں کے کام آ جائے تو برا کیا ہے ڈیڑی..... اور..... اور پانچ ہزار کی رقم میں لے جاؤ آپ سے.....“

پانچ ہزار میرے پاس ہیں گویا آپ کی رقم میں آپ کو لوٹا دوں گا۔ لیکن ابی الوقت دس ہزار کی شدت سے ضرورت ہے۔ آپ انکار مت کیجئے گا ڈیڑی۔ بالکل نہیں۔ میں نے وعدہ کر لیا تھا۔ یہ میری انا کا سوال بن گیا ہے میں نے وعدہ آپ کو نہ ضرور کر لیا تھا۔“

شہیر نے اپنے بات بیوروں کی نہیں۔ میں سوچ رہا ہوں تمہارے والد کیا خیال کریں گے۔ تم ابھی ایسے فیصلوں کے لیے ابھی چھوٹے ہو۔“

”آپ بھی میرا وعدہ پست کر رہے ہیں۔ آپ بھی..... آپ تو کہتے تھے انسانوں میں خوشیاں باختماسب سے بڑی ملتی ہے۔ جمال احمد ہنسنے لگے۔“

”ارے..... تم تو تقریر پر پتا مادہ لگ رہے ہو..... بس بابا بس..... مٹی سے روپے لے لو..... مگر سنو!“

جمال احمد نے شہیر سے کہا۔

”وہ ایسی ہی صورت تیا ہوگی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے بات پوری کی۔“

”یہ شہیر کا وعدہ ہے ڈیڑی، بہت جلد لوٹا دوں گا۔“

”اسکی بھی جلدی نہیں۔ جب برسر روزگار ہو جائے سو سمیت لوٹا دینا۔ آخر اس پیسے سے کبھی کمانے چاہے ہو۔“

پنچٹا کدو ہمیں بھی تو ہونے۔“

”ٹھیک ہے سو ڈیڑی لے لیجئے گا۔“ شہیر کا بڑا موڈ درست ہو گیا۔ وہ مٹی کی طرف گیا۔ رقم لینے کی خاطر۔

مٹی کو بھی خبر ہوئی بلکہ عدلی نے مہرچ مسالے کے ساتھ سب کچھ کہہ سنایا۔ سرد آ پا کو بھی پتا چلا۔ گورت تھیں..... شہیر کے احساسات کی دلی کھول کر داد دی۔

مٹی نے تو اس کی پستیانی چوم لی۔

”بہت اچھا کیا بیٹے..... یہ دیہات کے لوگ تو لڑکیوں کو بھیز بکری سے زیادہ اہم نہیں سمجھتے..... بے چاری لڑکی کیسے گزر بسر کرنی اس بڑھے کے ساتھ..... خدا تمہیں اس کا حمد دے گا۔“

”ہاں ہاں شہی ایک عمدہ خوبصورت رفیقہ حیات کی صورت۔“ عدلی نے لقمہ دیا۔

”جی..... اسے سمجھا رہے ہیں بات میں اپنی ٹانگ اڑا دیتا ہے۔“

"تو کون سی بری دعا کی ہے اس نے اللہ تمہیں واقعی صلہ دے گا شہی۔ تم جو دوسروں کی زندگیوں میں روشنیاں پھیلانے کا عزم دل میں لیے اس خوب صورت ماہِ چاند میں رہے ہو تمہارا گھر ستاروں سے جا ہوگا۔ اور یقیناً اس میں ایک چاند چہرہ لڑکی اپنے حسن سے ضیاء پھیلائے گی۔" مٹی تونل سے دعائیں دے رہی تھی۔ شہیر نے سر جھکا لیا۔

"بس کیجیے گی بچے چاند چہرے کے ذکر سے شرنا گیا ہے آپ ایسا کریں یہ سارنی دعا نہیں سمجھیں۔ بلکہ صرف چاند ہی نہیں مریخ، زہرہ، پلوٹو، مشتری، زحل، عطارد..... سارے کے سارے میرے مگر ہرگز نہیں۔" دین تو میں آپ کا شکر گزار بھی ہوں گا اور شرمناؤں گا بھی ہرگز نہیں۔

"چل بے شرم۔" سدرہ آپا نے اس کی کمر پر دھموکا جڑ دیا۔ "ہاں سدرہ آپا، ہڈی تو کھول کر کلب کی مبران کے پاس سے میں کہہ رہا ہے۔ جنہیں اس نے ایک ماٹو بے وقوف بنا رکھا ہے۔" غدار نے دل کی حسرت نکالی۔

عدی ڈھیٹ بن کر ہنستا رہا۔ دونوں سر پہر ہوتے ہی بھر چل دیے۔ راستے میں کچھ دیر کی خاموشی کے بعد عدی نے شہیر کو مخاطب کیا۔ "شہیر ایک زبردست تجویز ہے اگر تم مانو تو....." "کون سی؟"

"ارے بھائی وہ اسکول وانی۔" "گاؤں کے اسکول وانی..... عدی میں تو حیران ہوں اس ملک میں ایسے فرسٹ کلاس استاد بھی موجود ہیں۔" "کیسے؟"

"تم تو اسکول جھنکے ہی نہیں۔ موسم سرما کی چھٹیوں کے باوجود استاد پڑھانے میں لگے تھے۔ کڑور طلباء کو اپنا تینوں وقت دے رہے تھے اور بوشیار اور چین طلباء کچھ پالیٹے کی لگن میں موجود تھے۔ بس کچھ لوگ اسکول میں چھٹیاں ہوتی نہیں۔"

"بہتر فٹن....." عدی نے حیرت اور تعریف کے ملے جلے احساسات کے ساتھ کہا۔ "ایک اسکول کے جتنی اساتذہ اور ایسے ذہین اور لائق طالب علم ہیں بات کے مستحق ہیں کتنا شک ساری سہولتیں مہیا کی جائیں۔" "اسی لیے تو میں آئیڈیالو سے رہتا ہوں۔ تم ایک بات ہے۔ شہیر یا رانا اس سائز میں بہت سوں کو شریک کرنا پڑے گا۔" "یعنی۔"

"سنو....." عدی نے سارنی تجویز اس کے گوش گزار کر دی۔ "عدی! تو نے زندگی میں پہلی بار ایک عقل کی بات کی ہے۔ دل خوش کر دیا ہے۔ عدی بن جمال زرد ہار..... پائندہ باہ..... جو پیارے..... بہت اچھے لگ رہے تو قسم سے۔" "چلو دور ہو..... زانچی نہیں کے..... اچھا شکور ویا تو لگے پیار جتانے۔"

"بہنیں ہڈی۔ تم تو خدا کی قسم میرے بہت ہی پیارے دوست ہو بالکل بھائی جیسے۔ سنو عدی..... بھائی کبھی کبھی۔ اور ان یوسف ثابت ہو جاتے ہیں ہو سکتے ہیں..... لیکن دوست۔ دوست ہی رہتا ہے سدا..... دوست سے بے وفائی کی امید ہو ہی نہیں سکتی۔"

"غدار اند کرے کہ ہم ایک دوسرے کی بے وفائی کا دکھ اٹھائیں۔ شہی..... دوستی کے اس رشتے کو مٹی نے ڈیڑی نے سدرہ آپا نے اور غدار نے بے حد مضبوط کر دیا ہے۔ مٹی تم سے ماؤں جیسا پیار کرتی ہیں۔ ڈیڑی تم پر مان کرتے ہیں۔ سدرہ آپا کے تو تم پیارے بھائی ہو..... غدار تمہاری لاڈلی بہن ہے اور اور....." "اور تم..... میری جان کے دشمن۔" شہی نے قہقہہ لگایا۔

"یہ تو گزرتا وقت بتائے گا کہ میں کیا ہوں کون ہوں۔ بس خود کیا کہوں۔ بہر حال عرض ہے کہ میں تمہارا دوست ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم لفظ دوستی کے معنوں سے آشنا ضرور ہو گے کیونکہ تمہاری اردو مجھ سے کہیں زیادہ سٹرائٹ ہے۔ اچھی ہے۔"

"ٹھیک ہے جناب دوست صاحب ابھی تو اس مسئلے کا حل نکالنا ہے۔" "وہ مسئلہ حل شدہ ہے۔ بس میری تجویز پر عمل کر لو۔" "ٹھیک ہے میں جانتے ہی سب کو مجبور کروں گا..... ایک چھوٹی سی تقریب تنگی کی راہیں آسان کر سکتی ہے تو میرا کیا ہے۔"

سہ پہر کو شہیر اپنے کمرے میں بیٹھا..... پائیکس کی ضخیم کتاب میں گم تھا۔ جب اچانک شاہ نواز عسکری اس کے کمرے میں آ گئے۔ وہ کتاب رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ان کے ہاتھ میں ایک کارڈ تھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔

"بھیلو بیٹے۔" "آ فائبر پاپا۔" "کیا کر رہے تھے۔"

"بس ایسے ہی کتاب دیکھ رہا تھا۔ بیٹھے پاپا۔" "ارے نہیں بھئی بیٹھنے کی فرصت کہاں..... میں تو تمہیں یہ دعوت نامہ دکھانے آیا تھا۔ گاؤں کے متعدد کولوں کی طرف سے مشترکہ دعوت نامہ ہے۔ تقسیم انعامات کی تقریب ہوگی..... بھئی ان لوگوں نے بیٹھے نئے تمہارے پاپا کو سہانہ خصوصی بنا دیا۔" "وہ قدر فٹن بہت اچھی خبر ہے۔"

"مگر تمہارے پاپا نے تو بڑی س میں گم ہو کر ہر شے کو بھلا دیا ہے۔" "اب پھر شروعات ہو رہی ہے پاپا۔ اب آپ شہول سٹیں گے..... یہ تو ایک گاؤں کے چند اسکول ہیں پھر پ بڑی بڑی تقاریب کے چیف ایسٹ بنا کریں گے۔" "نہ نہیں دیے۔" "نائی بنائے۔ اتنی فرصت کہاں۔ خیر میں یہ کہنے آیا تھا۔ چند روزہ جنوری کو تم کالج سے چھٹی کر لینا اور میرے فہر چننا۔"

"ضرور پایا ضرور..... میں تیار ہوں گا کس ہفت جانے ہے؟"

"صبح ہی صبح..... کیونکہ نثر عیب نوبتے شروع ہوگی۔ بھئی یہ بھی ایک پرالم ہے میرے سر..... کئی کام ہیں پشت ایل کر جانے ہوگا۔"

"تو کیا ہوا کام تو آپ روز اندہی کرتے ہیں۔"

"اچھا تمہاری بھی بچی مائے ہے۔" وہ مسکرائے۔

شیر نے سر جھکا دیا۔ وہ بھی مسکرانے لگا۔

"تو ٹھیک ہے چلے پھیں گے۔"

"پاپا آپ یہ تن کر خوش ہوں گے کہ اسی نثر عیب کا دعوت نامہ میرے پاس بھی آیا ہے۔"

"تمہارے پاس بھی؟"

"جی ہاں اور اس کا روڈ پر آپ کا نام چیف گیسٹ کے طور پر رکھا دیکھ کر میرا سر فخر سے بلند ہو گیا۔"

"اچھا..... بہت پیار سے پاپا سے۔"

"ہاں پاپا اور بہت اعتماد بھی ہے ان کی ذات پر..... مان بھی ہے ان کی ہستی کا..... پاپا..... آپ سے مل کر آپ کو پا کر ہی تو مجھے اپنے ہونے کا اپنی ہستی کا یقین ہوا ہے۔ آپ سے پہلے تو میں کچھ بھی نہ تھا۔ خود اعتمادی تو آپ کی ذات نے بخشی۔"

شاہنواز نے اسے اپنے کندھے سے لگالیا۔

وہ تمہیں پڑ کر ہم بھی تو مسرت کے ساتھ توین آسمان پر پرواز کرنے لگے ہیں شیر..... ہمیں بھی تم پر ناز ہے۔ تم بہت پیارے بچے ہو ہالک اپنی ماں کی طرح..... تمہاری ماں میرا انتخاب بھی۔ میری محبت بھی وقت بہر حالات نے اسے ہم سے چھین لیا۔ تم اس کی طرف سے سننے والا آخری تڑپ ہو۔ تم نہیں جانتے کہ ہمارے لیے کس قدر قیمتی ہو۔" شاہنواز نے اسے بچوں کی طرح پیار کر ڈالا۔ شیر کے انگ انگ میں سکون اور خوشی اتر گئی۔

"کتنے محبت کرنے والے پاپا سے جدا تھا اب تک۔" اس نے سوچا۔

"او۔۔۔ کے چودہ جنوری کو آ جانا..... میں کچھ دنوں کے لیے مری لنگا جا رہا ہوں ملاقات نہ ہو سکے تو اس اپنا کھچھٹ کو یاد رکھنا۔"

"ٹھیک ہے پاپا۔" شیر نے مطمئنانہ کے ساتھ کہا۔

پندرہ جنوری کی صبح شاہنواز عسکری کی بیوی سی گاڑی گاڑوں کا رخ کر چکی تھی۔ باپ بیٹا..... ابھرا دھڑکی بائیں کر رہے تھے اور گاڑی فاصلہ مٹانے میں لگی تھی۔ یہاں تک کہ جائے تقریب آگئی۔ آگے کے لوگوں نے اس تقریب کے لیے پورے قصبے کو سجا رکھا تھا۔ تقریب ہائی اسکول کے احاطے میں تھی۔ اسٹیج تک جانے والا راستہ سرخ قہین اور پھولوں سے سجاتا۔ تقریب میں قصبے کے متعلقہ گاؤں کے اسکول اپنے طلباء اور اساتذہ سمیت شریک تھے۔ چنانچہ کچھ پہنچ بھرا تھا۔ اسٹیج کے سامنے معزز مہمانوں کی نشستیں چھپے بچے تھے..... شاہنواز عسکری ٹھیک نوبتے مہمان خصوصی کے طور پر اسٹیج پر جلوہ افروز تھے۔ جبکہ شہر معززین کے ساتھ بیٹا بڑے فخر سے اپنے پاپا کو دیکھ رہا تھا..... تقسیم انعامات کے اس جلسے کی کارروائی شروع ہو گئی۔ بین القصبائی کھیلوں کے مقابلوں میں حصہ لے کر پوزیشن لینے والے طلباء پر امری ڈل اور میزنگ میں تعلیمی میدان میں اول۔ دوم اور سوم آنے والے طلباء..... تقریروں میں درجہ لینے والے طلباء کو انعامات سے نوازا جانے والا تھا۔

"انہی بکلیوں کے سربراہوں نے اسٹیج پر آ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اپنے تعلیمی اداروں کی مشکلات کا..... اور یوں عبدالغفور کے اسکول کے سربراہ کی باری بھی آگئی۔ عبدالغفور ایک بہت بڑا گاؤں تھا پکا۔ کئی مشتمل ایک جاگیر تھی اور اسکول کی حالت ڈگھٹے تھی۔ چار کمرے کے اسکول میں پچھتر بچوں کی تعداد..... تھی۔"

ابن بڑی بڑی نے اعلان کیا۔

جبکہ تمام ہیڈ ماسٹرز صاحبان اپنی اپنی رائے کا اظہار کر چکے..... میں اس تقریب کے معزز مہمان سے اسٹیج آنے کی درخواست کروں گا شرکاء جلسہ کو یہ پاپا نام سن کر خوش ہوگی۔ تشریف لاتے ہیں۔ ہمارے ملک کے..... اور نائب ظم شیر شاہنواز عسکری..... یہ صرف ایک لائق اور ذہین طالب علم ہی نہیں ایک خوب صورت موجد کے..... لہذا جوان ہیں مجھے یہ کہنے میں ہانک نہیں کہ اسے چند سونو جوان بھی اس ملک کو ہمیں تو ملک کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ شیر شاہنواز عسکری یہاں تشریف لاکر اپنے قیمتی خیالات سے نوازیں۔"

شیر ہنترکتے دل کے ساتھ اسٹیج کی طرف بڑھا..... اس کی نظریں اپنے پاپا کی طرف بار بار گئیں..... اس کی بان نے دل کا ساتھ دینے میں بچھکا ہٹ محسوس کی لیکن وہ بڑی اہمیت سے اس پر آیا..... شیر بڑی نے ہانک کے سامنے کیا۔

شیر اب تک کئی مباحثوں میں حصہ لے چکا تھا انعام حاصل کر چکا تھا۔ کالج کی ریزم ادب کا روح رواں تھا..... وزیر کرنے سے نہیں گھبرا رہا تھا..... صرف اس بات سے گھبرا رہا تھا..... جس کی تیاری وہ پورے پندرہ دنوں لگا رہا تھا..... اس نے اپنی بات شروع کی طلباء کو محبت کی تلقین کی۔ اساتذہ کو نکلیں کا مشورہ دیا اور کہنے لگا۔

"ظلم ہمیں آگے دے سکتا ہے..... ہماری اندھیری راتوں کے لیے صبح کی روشنی بن سکتا ہے..... اور ہماری..... ت..... بہت اعزاز اور ننگن ہمیں ترقی بخش سکتے ہیں..... ہم سب کا نصب العین پاکستان ہے یا پاکستان کی سلامتی..... ن اور خوشحالی..... ہم سب کو اپنے خون جگر سے سلامتی ترقی اور خوش حالی کی راہوں کو سیراب کرنا ہوگا تاکہ وہاں..... ن رنگ بھول کھل سکیں..... یہ طلباء قوم کی امانت ہیں..... ان سے کوئی وعدہ لینے سے پہلے ہمیں ان بچوں کی..... الت کرنا ہوگی..... انہیں تحفظ دینا ہوگا..... یہ ایک اتفاق ہے کہ اس جلسے کے مہمان خصوصی میرے والد ہیں..... ن میں ایک طالب علم اور وطن کے اولی سپاہی کی حیثیت سے ایک صاحب ثروت سے جنہیں رب تعالیٰ نے..... ن ترا نعمتوں سے نوازا ہے درخواست کریں گا کہ وہ عبدالغفور میں موجود اپنا بے لطف طویل و عریض..... ن..... ان معصوم بچوں کے لیے وقف کرویں۔ جنہیں دوران انجمن انجمنی مشکلات کا سامنا ہے۔ یہ ملک و..... ن پر ایک احسان ہی نہیں ہوگا بلکہ ایک ایسی نئی راہ ہوگی کہ جس کی تقلید میں چلنے والے بہت سے لوگ پیدا ہو..... ن گے۔ اپنی مدد آپ کا اصول اپنائیں گے۔ اور ایک بچے کی حیثیت سے اپنے معزز والد کی طرف سے یہ..... ن میرے لیے خوشی کا باعث ہوگا۔ میں درخواست کرتا ہوں گا کہ وہ اپنی تقریر میں یہ اعلان کر کے نہ صرف مجھے..... ن طلباء کو خوشی بخش دیں۔"

اتنا کہہ کر اسٹیج سے اتر آیا اور اپنی نشست پر بیٹھ کر خوب صورت رد عمل کا انتظار کرنے لگا۔..... ن بچوں اور شاہنواز عسکری تقریر کر رہے تھے اور شیر کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔..... ن انہیوں نے حویلی کے اسکول کی عمارت بند دینے کا اعلان کیا تو چھال تالیوں سے گونج اٹھا۔ یہ لمحے شیر کے..... ن تھا..... ن میں..... ن ہر ایک کی زبان پر شاہنواز عسکری کی دریا دلی کا قصہ تھا۔ منظم جلسہ..... ن تھا..... ن



نے خوب صورت الفاظ میں ان عمارت کو سراہا۔

آج ہی کے دن سرور کی شادی تھی۔ شبیر نے اپنے پاپا سے شرکت کا اصرار کیا اور عبداللہ پور لے آیا۔ دراصل اسے سرور کی خوشی اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ شاہنواز خاموش بیٹھے تھے۔ اچانک انہوں نے شبیر کو مخاطب کیا۔

”شبیر.....“

”جی پاپا۔“

”یہ طریقہ کار بے حد نادر تھا۔“

”کیوں سا پاپا.....؟“

”میں سب سمجھ رہا ہوں بیٹے..... سب سمجھ رہے ہوں۔“

”یہ تجویر جوان لوگوں نے تحریری طور پر مجھے پیش کی کہ میں اس عمارت کے مناسب پیسے لے کر عمارت اسکول کے لیے دے دوں اور گاؤں کے لوگ چندہ جمع کر کے مجھے رقم دے دیں گے۔ یہ تجویز ان کی جرأت نہیں تمہارا فیصلہ تھا۔ نہیں کبھی ایسا طیارا بھی نہیں آسکتا تھا۔ مجھے کسی پیسے کی ضرورت نہیں۔ میں اتنا گرا ہوا نہیں ہوں کہ پانکی پانکی جمع کر کے مجھے قیمت دہا کی جائے لیکن ایک بات سن لو..... میں نے یہ سب صرف تمہاری معصوم آرزو سمجھ کر دیا ہے۔ میں نے وہ گھر جس میں تمہارے بچے دل نواز کا بھی حصہ ہے ہمیشہ کے لیے اسکول کے نام کر دینے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ لیکن صرف تمہاری خاطر..... کیونکہ نہ تو میں ملک و قوم کا رہنا چاہوں نہ سیاستدان..... نہ مجھے شہرت و ناموری کی طلب ہے نہ اقتدار کی خواہش..... یہ کام بہی لوگ کرتے ہیں اور انہیں کرنے بھی چاہئیں..... لیکن بیٹے ایک بات سن لو۔ یہ پہلی ناجائز حرکت تھی۔ میں نے برا نہیں مانا..... اسے قبول کر لیا لیکن آئندہ ایسا نہیں ہوگا..... اثر را شیڈ۔“

”پاپا..... یہ تو ایک بہت بڑی بات ہے پاپا..... اس سائن کے تھے بیٹھنے والے ایک ایک بچے کا اس جوہلی میں موجود اس سے پانی پینے والے ہر ذی روح کا..... ان اسٹاپ ٹیختھ کا بلکہ سکون کا ثواب آپ کے کھاتے میں لکھا جائے گا۔“

”ایک بزنس میں کے پاپا ایسی چیزیاں کمانے کی بھی فرصت نہیں ہوتی اور جی بہت سے کام ہیں دنیا میں۔“

ان کے لہجے میں تیزی سن گئی تھی۔ شبیر کا منہ تر گیا۔ شاہنواز نے اس کی طرف دیکھا۔

”میں یہ ڈسٹریاں حکومت کی ہیں۔ مگر تیرا توجہ ہم ہی کا ہے۔“

”ڈیپ شروٹ آپ نے کیا ہے اختتام تک حکومت پہنچائے گی آپ کے اس اشارے کو تھی اہمیت دی جائے گی۔ آپ دیکھیں گے۔ میں عدلی کے ڈیڑھ سہ پہر کر ڈیٹی کی بھر پور مرمت کے لیے ٹرانزٹ منظور کر لوں گا اور جوہلی آئین بہترین ہائی اسکول میں تبدیل ہو جائے گی اور اس اسکول کا نام..... سر عبداللہ ہائی اسکول ہو گا اور یوں دادا جان کی روح کو سکون ملے گا۔“

”ایزیر لائیک بریووش۔“

”غفور! پاپا کا گھر آ گیا..... سب نے ان لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ شبیر کو غفور بابا اندر لے گئے۔ انہیں گھر لائی جا چکی تھی۔ شبیر لیجن کے کمرے میں گیا تو کمرہ خالی ہو گیا۔ راناو سرور قہقہے لیا کہ میں تیرا ہی بیٹا پیٹنگ پر بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ غفور بابا کے کہنے پر.....“

”غفور بابا! نہیں تو بیٹھی رہتی ہیں۔ آپ نے راناو بی بی کو.....“

”بچو نے صاحب یہ آپ کا نہیں..... آپ کے جذباتوں کا احترام ہے آپ کے دل میں ہم غریبوں کا کتنا ارا ہے۔ آپ نے جو راہ بچائی ہے۔ اس پر آپ روشنی بن کر سدا چمکتے رہیں گے۔ ہم سب عمر بھر آپ کے انسان مندر ہیں گے۔“

شبیر نے کسی بزرگ کی طرف راناو کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”میں نے تو صرف ظلم کے خلاف آواز اٹھانی ہے۔ ظلم کو دبا دیا ہے۔ بے سہارا کی مدد کی ہے اور یہ سب میرا فرض تھا۔“

”خدا آپ کو لمبی عمر دے۔ کوئی ظلم زندگی میں نہ آئے۔“ شبیر زرب سکر اویا۔ اس نے سوکا ایک ٹوٹ راناو کی طرف بڑھا دیا عبداللہ پور میں اس ریمیں زادے کا ذکر ہر ایک زبان پر تھا۔ جس نے عبداللہ پور کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا تھا ایک لڑکی کو ظلم سے بچا لیا تھا۔ انوں میں ایک ہائی اسکول کی منگوری لے لی تھی۔ اپنا گھر انوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ سب لوگوں کو اس نوجوان کو دیکھنے کا اشتیاق تھا اور نادانی کی محفل رونمائی کی تقریب میں بدل گئی تھی۔

ہر ایک کی زبان پر شاہنواز اور شبیر کا نام تھا۔ لوگ قریب آ آ کر اسے دیکھ رہے تھے اور دیکھ کر حیرت میں جھکا ہو رہے تھے کہ یہ کارنامے ایک انتہائی نوجوان نے کیا ہے جسے انہیں یقین ہی نہ آتا۔

”شبیر۔“ واہبی کے سفر میں شاہنواز اس سے مخاطب تھے۔

”جی!۔“

”عبداللہ پور جا کر میں نے بہت سی باتیں سنی ہیں۔“

”کون سی باتیں۔“

”سننا ہے سرور کی شادی میں اہم کردار تم نے ادا کیا ہے۔“

”جی..... جی پاپا۔“

”کیا مطلب.....؟ یہ ان لوگوں کے ذاتی مسائل ہیں۔ انہیں خود حل کرنے چاہئیں۔ ایسی معمولی باتوں میں ماری مداخلت ہماری پوزیشن آ کر ڈر کر سکتی ہے۔ لوگ کہہ رہے تھے لڑکی کے باپ کو دس ہزار روپے تم نے ادا کیے..... شبیر ابھی تم بچے ہو اور پھر مجھے افسوس ہے کہ مجھ سے پوچھے بنا تم نے اتنا اہم قدم اٹھایا۔“

”پاپا آپ پوری بات تو سنیں۔“

”میں سب سن چکا ہوں۔ ان غریب لوگوں کو اپنے سر چڑھا بہت قحط ہے۔ یہ جتنے بھی نقص ہوں لالچ ان کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ کیا غفور بابا کے ہر بچے کی شادی ہر دس ہزار روپے تم ادا کرو گے۔ شبیر! وہ خدمت دتے ہیں۔ تو تنخواہ نیتے ہیں۔ زمینیں آبا کر تے ہیں تو حصہ لیتے ہیں۔ یہ بالکل ملاحظہ طریقہ ہے تم نے دس ہزار روپے میں اسے دیے؟ آخر کس سلسلے میں اور یہ رقم آئی کہاں سے؟“

”پاپا..... غفور بابا نے وہ رقم عرض حسد کے طور پر لی ہے لو نادیں گے۔“

”تم نے مجھے کہاں سے لیے؟“

”مجھے میرے اکاؤنٹ میں تھے کچھ عدلی کے ڈیڑھ سے۔“

مرنے کا مقام ہے۔"

"نہیں پایا۔ ڈیڑی ایسے نہیں ہیں انہوں نے میرے اس اقدام کی تعریف کی۔"

"کون ہیں وہ؟ کیا نام ہے ان کا؟ کیا کرتے ہیں وہ؟"

"پاپا وہ اس ملک کے بہت اچھے اور نامور سیاستدان ہیں۔ عظیم رہنما ہیں۔ ہماری انسان ہیں۔"

"ہوں گے۔ اور میں بھی تو یہ سیاست دو اپنی اولاد کو سکھائیں۔ میرے بیٹے کو نہیں..... مجھے تمہیں سیاستدان نہیں بنانا تم مردوں کو دے گا میری طرح بڑوں۔ بیٹے ایک بزنس مین کا فرزند ہے کہ وہ اپنی آمدنی میں سے یا قاعدگی سے نوکری کی رقم کو اخذ کر دیتا رہے اور بس..... اور میں یہ کرتا ہوں۔ انعام نہیں اور کرتا ہوں۔ ویٹھہ نہیں دیتا ہوں۔ پر اپنی فیکٹری میں میرے ذمے ہے۔ ایکسٹرنل ڈیپارٹمنٹ کا جو ہے۔ مجھے صرف بنیادی مسئلوں سے نمٹنا ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس نہ وقت ہے اور نہ پیسہ..... اور شہر چونکہ تم بہت ہی سنبھلے ہو۔ اس لیے میں نے تمہاری خاطر یہی اور آفری ترقیاتی اس حوالی کی صورت میں دے ڈالی۔ آئندہ کچھ نہیں دے گا کچھ بھی نہیں۔"

"پاپا۔"

"بیٹے تم صرف تعلیم پر توجہ دو..... تمہاری ذات کے لیے میں لاکھوں خرچ کر سکتا ہوں لیکن ایسے بے معنی کاموں کے لیے میرے پاس کچھ نہیں۔ ہاں وہ ہندی کے ڈیڑی، جمال احمد سے کئی رقم لی تھی تم نے۔"

"پاپا۔"

"یعنی باقی کے پیسے خود دے رہے۔ جاتے ہوئے مجھ سے دس ہزار لے لیا..... اور فوراً ان کی رقم ادا کر دینا تم شاہنواز عسکری کے بیٹے ہو۔ تمہیں کسی سے کچھ لینے کی ضرورت نہیں ادا کرنا شیخ..... یہ میری توہین ہے۔"

"یہ خبر ایک شام سعیدہ بیگم تک بھی پہنچ گئی اور سنتے ہی انہوں نے شاہنواز عسکری کو فون کیا جو اس وقت مل میں تھے۔"

"شاہ آپ نے اپنے بیٹے کے حکم پر عبداللہ پوری کو حویلی اسکول کو دے دی۔"

"ہاں نم نے ٹھیک سنا ہے۔"

"آپ کو خبر ہے وہ جہدی پشتی رہائش گاہ تھی۔"

"جانتا ہوں۔"

"پھر بھی۔"

"ہاں پھر بھی..... یہ بہت بڑا کارٹھاپ تھا۔ برائی نہیں۔"

"شہر بچے اس کی سوچ میں ناچستی ہے۔ آپ اسکول کو ایک دو لاکھ ڈونٹ کر دیتے مگر وہ گھر نہیں۔"

"تم جانتی ہو سعیدہ..... شہر مجھے بے حد عزیز ہے میں نے صرف اس کا مان تو تم رکھنے کو ایسا کیا۔"

"لیکن یہ نسبت تو سبکی پڑ رہی ہے۔"

"سبکی پڑ رہی ہے یا سستی یہ میرا اپنا امر ہے۔"

"اچھی بات ہے کسی دن یہ گھر بھی کسی حقیقی ادارے کو دے کر ہمیں مرکز پر کھڑا کر دیجیے گا۔"

"اسکی بد شگونی کی باتیں نہ کرو سعیدہ کبھی کبھی قبولیت کا وقت بھی ہوتا ہے۔"

"شغور بابا جو کچھ کہہ رہے تھے کیا وہ بھی سچ ہے؟"

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"شہر نے ایسا جیب سے دس ہزار روپے کران کے پوتے کی شادی کرائی ہے۔"

"ہاں وہ کبھی سچ ہے اور آئی اپنی شہریت ہم..... وہ پیر میں نے دیا ہے۔"

"آپ اتنے مہربان کب سے ہو گئے؟"

"کوئی بات نہیں..... روز روز تو ایسا نہیں ہوگا۔ شہر ابھی سنبھل رہا ہے۔ میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔ وہ اب ایسا نہیں کمرے گا۔"

"فطرت بدلتی نہیں جاسکتی۔"

"اگر فطرت بدلتی نہیں جاسکتی تو مجھے شہر کی فطرت پر ہاز ہے سعیدہ..... اس کے پاس اپنی ماں کی طرح ایک ورد

"ہاں ہے۔ وہ وہ مردوں کی خاطر جینا چاہتا ہے۔"

"چلیے آپ بھی اس کے مشن میں شریک ہو جائیں۔ لڑا رہی اپنی جان اپنا مال..... ثواب ملے گا آپ کو بھی"

"وقت کم ہے سب تجھے وہ مردوں کے نام۔"

"یہ باتیں گھر پر بھی ہو سکتی ہیں۔ اس وقت میں مصروف ہوں خدا حافظ۔"

"شاہنواز عسکری نے فون رکھ دیا۔ سعیدہ سچ دہاب کھا کر رہ گئیں۔"

"وہ کھرا ہے تو یہی مسئلہ برہنہ تھا۔ سعیدہ کو تو کسی گل جھین ہی نہیں تھا۔"

"وہ عورتی دریاں پڑتی تھی۔ پورے بیس سال سے۔ کس دن کھنڈر بن جاتی۔ قوم کے کام آگئی تو کون سا

"ذنب ہو گیا۔"

"جانتے ہیں وہ آپ کی یا صرف شہر کی نہیں تھی اس میں سب بچوں کا حصہ تھا اور دل نواز کا بھی آدھے کے

"لک حصہ وہ۔ آپ نے ان سے پوچھا۔"

"شاہنواز کی فکر نہ کرو اس قدر..... اس نے تو پہلے روز ہی مجھے فون پر مبارک باد دی تھی۔ اس اچھے اقدام پر.....

"اے فون اترا اٹھ نہیں اور تم اسے یعنی اس معاملے کو بڑھا کیوں رہی ہو۔ میں نے جو مناسب سمجھا کر دیا۔ ایک

"نہا سنے کی ضرورت نہیں مجھے۔"

"وہ اپنے گھر..... میں چلے گئے۔"

"اب حسب اچھے دیکھو اجازت شہر آیا۔ گھر کی فضا میں بے حد بدلتی تھی۔ سعیدہ بیگم نے اس کے سلام کا جواب

"کئے پھلکے انداز میں دیا۔ ظہیر اور منیر گھر پر نہ تھے۔ ارم اور شازی بیولو کیلو کے بعد جانے کہاں گم ہو گئیں۔ وہ

"سچ میں تھوڑا پریشان سا کھڑا تھا۔ سعیدہ دیکھ لادنگ میں داخل ہوئیں۔"

"پاپا کہاں ہیں؟"

"کہاں ہونا چاہیے انہیں..... جو آنت تم نے ان پر ڈال دی ہے۔ اس سے وہ وہاں تھوڑے کریں۔ گے تو گھر لوٹیں

"نہ۔ ہم تین دن سے سخت پریشان ہیں۔"

"بات کیا ہے ماما؟"

"نہ مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ بات کیا ہے؟"

"پھر بھی یقین چاہیے میں تو بالکل لاعلم ہوں۔"

"ہاں ہاں تم تو لاعلم ہو گئے ہی۔ عذاب تو تم نے اپنے پاپا کے لیے اور ہمارے لیے پیدا کیا ہے۔"

"ہر گاڑی رکھنے کی آواز آئی۔ سعیدہ بیگم چپ ہو گئیں۔"



بے ہماری بہن کو ہماری اکلوتی بہن کو بھی بے جاوت سکھادی۔ ہماری نازوں ہی بہن اس کے گھر میں خاوندوں جیسی نہ کی گزار کر بھی خوش ہے۔“

”شور بابا بتا رہے تھے میری پلو پلو ہیں۔ کیا آپ ان ہی کا ذکر کر رہے ہیں؟“

”ہاں اسی بے خوف کا اور اس کے چال باز شوہر کا..... سارے کچھ نہ کر سکتے والے شرافت کے تختی دار بن بیٹھے ہیں۔“

”مگر بابا آپ نل کا ذکر کر رہے تھے.....“ شہیران کے جگرے موڈ پر خوف زدہ سا تھا۔

”تمہیں میرے مسائل سے کیا دلچسپی؟ تم غریبوں کی بگڑی ہانڈے کا فرغ بن جاؤ۔“

”نہیں بابا! اپنے والد سے زیادہ کس کا خیال رکھ سکتا ہوں میں۔ آپ بتائیں نہ بات کیا ہے؟“

”کیا بتاؤں۔ کیا کر لو گے تم؟“

”ہو سکتا ہے میری ناقص سوچ اس کا کوئی حل نکال دے۔“

”نہیں..... یہ میرے اپنے سوچنے کی بات ہے۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اندر چلے گئے۔

سجینہ وہیں کھڑی تھیں ان کی قبر جبری نگاہ شہیر پر تھی۔

”بہت خوش تھے شاہ نواز..... جوان بیٹا دوست، بازو بن جائے گا۔ بیٹے نے قدم رکھتے ہی مسائل کا طوفان سر

”اٹا۔“ شہیر نے ان کی طرف دیکھا۔ بے بسی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ وہ لاؤنج سے باہر وراٹھڑے کی

طرف آیا۔ کچھ دیر سوچتا ہوا اور پھر گھر کے ٹیٹ سے باہر آ گیا۔

☆☆☆☆☆☆

شہیر حیرت زدہ سا ان کا منہ دیکھ رہا تھا۔

”مگر ما..... میں نے کیا کیا ہے؟ کچھ تو مجھے بھی خبر ہو۔“

”مجھ سے نہیں اپنے پاپا سے پوچھو۔ آ رہے ہیں وہ خود ہی بتائیں گے۔“

شہیر تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ شاہ نواز مسکری تخت پریشان سے اندر داخل ہوئے۔

”م سلام علیکم پاپا۔“

”و علیکم السلام۔“ شاہ نواز کے لہجے میں تنگی نمایاں تھی۔

”خیریت پاپا..... مہاتاری تمہیں کیا آپ پریشان ہیں۔“

انہوں نے کہا جانے والی نظروں سے شہیر کو دیکھا۔ وہ حیرت کے مارے لنگ سا ان کا منہ دیکھنے لگا۔

”میرے لیے اتنا بڑا مسئلہ کھڑا کر کے پوچھتے ہو کہ میں پریشان کیوں ہوں۔“

”مگر وہ کیسے پاپا؟“

”چپ رہو میں اس وقت بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ شاید تم..... تم اپنی ایک عمر کی محرومی کا انتقام مجھ

سے لے رہے ہو۔ تمہارے دل میں میرے لیے نفرت ہے۔ تم میرے دشمن بنے جا رہے ہو۔ تم مجھ کو الیہ کرنا

چاہتے ہو۔“

”پاپا.....“

”بند کرو یہ بکواس۔ اور غور سے سن لو اپنی حدود کے اندر رہو۔ ابھی تم بچے ہو۔ تمہیں میرے معاملات میں دخل

فیہر کرنے کا کوئی حق نہیں۔ غضب خدا کا اتنا بڑا نقصان۔“

”پاپا ہوا کیا؟“

”اچھا کچھ ہوا ہی نہیں.....“

”مگر.....“

”شہیر! میں اس سے زیادہ کچھ برداشت نہیں کر سکتا۔ مل پورے چار دنوں سے بند ہے۔ یہ لاکھوں روپے کا

نقصان ہے جا اور اس کے ذمہ دار تم ہو..... صرف تم.....“

”میں..... میں کس طرح ذمہ دار ہوں پاپا آپ کا۔ میں تو..... پاپا آپ..... آپ۔“ وہ بات مکمل نہ کر سکا۔

”میں سب جانتا ہوں۔ تمہارے دماغ میں کس نے یہ خناس بھرا ہے اور جس نے یہ سب کیا ہے۔ تمہیں

استعمال کیا جا اور اسے بھی جانتا ہوں۔“ شاہ نواز نے گرج کر کہا۔

”بس نے.....؟ کس نے پاپا.....؟ کیا خناس بھرا..... اور میں نے کیا کیا ہے آخر.....؟“

شاہ نواز سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔

”وہ سدا سے دشمن تھا ہارا..... سدا سے ہی..... اسے ہماری ترقی بھی ایک آنکھ نہیں بھائی گندگی میں ریٹک

والے کیڑے دوسروں کو بھی گھسیٹ کر اس طرف لانا چاہتے ہیں۔ بابا جان نے قطع تعلق کا فیصلہ کر کے اچھا کیا

تھا۔ میں نے خواہ مخواہ ہی تمہیں یہ تعلقات کڑا لی۔ بولو..... تمہیں یہ ترغیب عامم نے ہی دی ہے؟“

”عامم..... کون عامم پاپا؟..... میں تو کسی کو نہیں جانتا..... کیا آپ کس کا نام لے رہے ہیں؟“

”ہے ایک مر بھرا..... بابا جان سے گھر لینے والا۔ اسے ہم سب سے نفرت تھی۔ ہماری جاگیروں کے سبب اس

Scanned By Waqar Azeem

شرف الدین صاحب! پاپا سے حد پریشان ہیں۔ بات کیا ہے؟  
 "جناب پریشانی ہی پریشانی ہے..... مزدور مل چھوڑ جانے کی دھمکی دے چکے ہیں۔"  
 "اس کی وجہ.....؟"

"وہ چاہ رہے ہیں سوائے اس کے کہ وہ لبرل لاز کے تحت اپنے حقوق منسب کرتے ہیں۔"  
 "تو آپ لوگوں اور پاپا کا رد عمل کیا ہے؟"

"شیر صاحب! بہانہ ہی تھیست تو ملازمین کی ہے چاہے ہم دس ہزار تنخواہ پر کیوں شکام کر رہے ہوں اصل چیز تو  
 سنا سب کی مرضی ہے شکر کی صاحب ان سے یہ سیرا جرت پر کام لینے ہیں جس دن مزدور وغیرہ حاضر ہوں اس دن کی  
 تنخواہ و کٹ لی جاتی ہے حالانکہ یہ لوگ گزرتے ہی سالوں سے یہاں ملازم ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کو ملازمت  
 پائی ہو۔ چھٹی کا حق حاصل ہو۔ رہائش اور فرائیڈ پورٹ کی سہولیات مہم ہوں۔ غیبی سہولت یعنی میڈیکل ایڈوانس دیا  
 جائے۔ ویسری صورت ان کے لیے ڈیپنری ہو ڈیپنری ہوں..... ایک رہائشی کالونی بنائی جائے..... اور....."

"اور کیا.....؟" شیر نے جلدی سے کہا۔

"اور شیر صاحب! ان سب لوگوں کو کم اجرت دے کر جسز میں زیادہ رقم کی وصولی کے دعوے کرائے جاتے  
 ہیں پہلے یہ سب تو کسی نے اس طرف توجہ نہ دی..... جانے کیسے اس بات کی ان لوگوں کو خبر ہوئی۔ آپ شاید ایک دو  
 بار یہاں آئے ہیں۔ آپ نے انہیں مشورہ دیا مزدور یونین بنانے کا..... اسی مزدور یونین نے یہ ساری خرابی  
 پھیلانی ہے۔"  
 شیر خاموش ہو گیا۔

"شرف الدین صاحب! یہ جو کچھ آپ بتا رہے ہیں ان میں حیران کن کوئی بات بھی نہیں آج نہیں توکل نہیں  
 اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنا تھی۔ میں خود بھی نہیں چاہتا کہ میرے باپا روز قیامت لوگوں کے حقوق کے  
 ذمہ داری ہوں شکر مسابوں! نظریں توکانے سب کے سامنے ہوں مزدور ہمارے معاشرے کے اقتصاد  
 دہانچے کی ریڑھ کی ہڈی ہیں ان کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے یہ انسان ہیں شرف الدین صاحب! اگر..... خدا  
 نے ان کی ذمہ داری ہم لوگوں پر ڈالی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم انہیں اپنی مرضی کے مطابق زندگی  
 گزارنے پر مجبور کریں۔ ان کے موقف کی میں تائید کرتا ہوں۔ انہیں ان کا حق ملنا چاہیے۔"

"شیر صاحب! ابھی آپ ما بھجوا اور نا خبر بکار ہیں شاید زندگی گزارنے کے ڈھنگ سے بھی نا آشنا ہیں۔"  
 "میں سمجھا رہا نا آشنا نہیں ہوں شرف الدین صاحب! میں انسانی حقوق و فرائض سے کلی طور پر آشنا ہوں.....  
 مساوات کا قائل ہوں۔ مساوات ہمارے مذہب کا سب سے ہم اصول! قانون اور قلم ہے۔ جس امیری کے  
 خلاف بھی نہیں ہوں لیکن اس امیری کو ترجیح دیتے ہوں کہ امیر کے مفید لباس پر کسی خریب کے اور مالوں کا خرچ  
 اسے اور نہ کر رہا ہوں۔ میں پاپا سے سفارش کروں گا کہ وہ مزدوروں کے جائز مطالبات مان لیں۔"

"نہ..... نہ..... نہ شیر صاحب۔ ایسا نہ کہیے گا۔ آج وہ بے حد غصے میں تھے۔ انہوں نے میرے سامنے بھی  
 آپ کا ذکر کیا تھا۔ وہ آپ کو اس سارے قصے کا مدار شیرا ہے۔ ہیں۔ یہاں نہ ہو کہ آپ....."  
 "میں! میں جس انداز میں پاپا سے بات کروں گا وہ انہیں بری نہیں لگے گی۔ ویسے یہ سب لوگ میرا مطلب  
 ہے کہ یہاں کام کرنے والے اس وقت کہاں ہیں؟"

جی۔ ٹی۔ ایس کی ایک بس کی سیٹ پر بیٹھا وہ اپنے پاپا کے مسائل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نرووی کے وسط  
 کے ایام میں بھی بس میں گرمی کا احساس ہو رہا تھا۔ پیرول کی یاد دہانیوں میں سے عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ سسٹے  
 برائے کے سگر بیڈوں کا دھواں دماغ پر چڑھ رہا تھا۔ سفر طے ہو رہا تھا..... تھوڑے تھوڑے قہورے قہورے پر لگ اتر رہے تھے  
 سوار ہو رہے تھے۔ بس ایورگرین ٹیکسٹائل ملز کے پچانگ پر رہی۔ شیر نے نشست چھوڑی۔ دروازے کی جانب  
 بڑھا اور بس سے اتر آیا۔

اس نے گیت سے اندر داخل ہونا چاہا بل کے سیکورٹی افسر نے اس کی راہ روٹی۔

"کون ہیں آپ؟ اندر جانا منع ہے۔"

"میں شیر شاہنواز عسکری ہوں۔"

سیکورٹی افسر نے شاید اسے بس سے اترنے دیکھ لیا تھا اس کی بات پر اکتھا کرتے ہوئے پچھا رہا تھا اگر وہ کسی  
 بس کی گاڑی میں ہوتا تو اسے مانتے ہی من پڑتی۔

"بس اس سے تمہیں اپنے پاپا کے ساتھ یہاں آ چکا ہوں۔"

"شرف الدین! کیا کر رہے ہو..... یہ صاحب کے بیٹے ہیں۔" چائے کس نے کہا۔ شیر نے سامنے دیکھا۔

شرف الدین نے اسے اندر آنے دیا۔

"آئیے صاحبزادہ صاحب..... تشریف لائیے..... میں ٹانس نمبر ہوں آپ سے ملاقات ہوئی تھی جب  
 آپ عسکری صاحب کے ساتھ تشریف لائے تھے۔"

وہ اندر آ گیا۔ بھری چھٹی مڑک پر اس کے ساتھ چلتا بائیں طرف مڑ گیا۔



شیر ان کا منہ دیکھتا رہ گیا پھر پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ شاہنواز اپنے کمرے سے نکل کر جانے کی طرف جا رہے تھے۔ اس نے دیکھا ہی نہیں۔

”چھوٹے صاحب.....!“

”کیا بات ہے منظور بابا.....؟“

”کی..... ڈراما کی گاڑی نکال چکا ہے۔ آئیے تاکہ وہ آپ کو عباس مگر چھوڑ آئے۔“

”مگر.....“

”اگر تمہاری بات کیا ہے ابھی اور اسی وقت تمہیں جانا ہے..... یہ تمہاری گستاخی کی سزا ہے۔“

شیر کو سخت بھوک لگی تھی۔ وہ خوش خوشی پاپا کو یہ بتانے چلا آیا کہ مزدوروں نے اس سے مشروط سمجھو کر لیا ہے۔

”ابن پاپا تو قہر و غضب کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ انہوں نے اس کی ایک بھی نہ سنی۔ بھوک پیاس کی تو بات ہی کیا

شیر کمرے سے نکل کر پورے کی طرف بڑھا۔ ڈراما کی گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا..... وہ بیٹھ گیا۔

مارے بھوک کے سر چکر رہا تھا اس نے پشت سے سر نکال لیا اور..... بے بسی آنسوؤں کی صورت آنکھوں میں

آئی۔

ڈراما کی گاڑی سے ہوشل کے گیٹ پر اتار کر چلا گیا۔

رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے گیٹ بند تھا مگر مریے مریے قدموں سے دو آگے بڑھا..... پھر جانے کیا

بیوج کر رہی کے گھر کی طرف چل دیا۔

ان کے گھر کا گیٹ بھی بند تھا..... اس نے اپنے مخصوص انداز میں گھنٹی بجائی۔

گیٹ بند تھا لیکن وہ سب شاید جاگ رہے تھے۔ سب ہی نے اپنی اپنی خواب گاہوں کے دروازے کھولے۔

کیا گیٹ کھل چکی تھیں۔

”کون؟“ انہوں نے ویسے ہی پوچھ لیا۔

”آپ نے کیوں تکلیف کی گی؟“ پوچھ کر کھول رہا تھا گیٹ۔

”اے ماں خدا تے..... مجھے تو پہنے ہی چاہیے تھا کیا تمہیں تو بے شرمی تم تو گھر گئے تھے آج دوپہر..... کہہ رہے

تھے دونوں! ہیں وہ ان کا رات گئے کہاں سے آئے؟“

انہوں نے گیٹ کھولا شیر کی افسردہ صورت پر نظر ڈالی۔

”کہاں رہے ہو پورا دن.....؟ اے میں تو کہہ ہی نہیں کھانا بھی نہیں کھایا تم نے کیسے ڈھال سے لگ رہے ہو۔

رہے پستانا پر سینہ کیسا؟ کیا پیدل چل کے آئے ہو نہیں سے؟“

وہ پریشان ہوئیں۔

سیرہ آئی..... غمزدہ..... غمزدی سب کے سب اس کے سامنے تھے۔

اس کا دل جھرا آیا..... نینس اب وہ آٹھویں، سوئیں کا طالب علم نہیں بچہ نہیں ایک نوجوان تھا۔ بی۔ اے کا امتحان

میں لڑتا تھا..... روتے اچھا لڑتا تھا۔

شکر کرتے گا۔

”تمہیں تو جسے گھر گئے تھے وہی نہیں آیا۔“

”بھولنے کی طرف کے میدان میں جمع ہیں! احتجاج کے طور پر کام نہیں کر رہے..... نعرے بازی سے میں نے یہ مشکل روک رکھا ہے نہیں..... یہ خبر اخباروں میں کسی صورت نہ آئے۔ یہ عسکر کی صاحب کا حکم ہے وہ اسے اپنی بے عزتی گردانتے ہیں۔“

”میں ان لوگوں کی طرف جا رہا ہوں! بات کرتا ہوں ان سے۔“ شیر عقی میدان کی طرف بڑھ گیا۔ اور شرف المندین اسے جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆☆☆☆☆

”پاپا.....“ اس نے ان کے کمرے میں جھانکا شبِ خوابی کے لباس پر براؤن ہائٹ گون میں ملیں وہ سبز پر جھکے جانے کیا دیکھ رہے تھے۔

”کہاں گئے تھے؟ اتنی رات گئے لوٹے ہو۔“

”جی ہوش کی طرف گیا تھا۔“

”کیوں..... مزدوروں کی بغاوت میں کوئی کی باقی رہ گئی تھی جسے پورا کرنے کو تمہاری ضرورت پڑ گئی تھی۔“

”جیس پاپا..... مل بند رہنے سے جو نقصان آپ کا ہو رہا ہے وہ میرا بھی تو نقصان ہے۔“

”جیس کب پروا ہے اپنے نقصان کی۔“

”بہت پروا ہے پاپا..... میں نے ہمدردی ان سے کہا کہ وہ کام سے لگ جائیں۔“

”تم نے ان دو گئے مزدوروں کی منت کی کیوں؟ آخر کیوں؟“ وہ تو اب بھی جھڑک اٹھے۔

”وہ دو گئے کے نہیں ہیں پاپا! بہت قیمتی ہیں ان کا وجود ہماری معاشی سلامتی کے لیے ضروری ہے ان کے

مطالبات تو بہت قانونی سے ہیں پاپا۔“

”کیا قانونی ہے اور کیا غیر قانونی تمہیں اس کی کیا خبر؟“

”میں نے ان سے وعدہ کر لیا ہے میرے کہنے پر وہ کل سے کام پر آنے کو تیار ہیں۔“

نکیا وعدہ کیا ہے تم نے ان سے.....؟“

”ملازمت کی منتقلی..... رہائشی سہولیات، طبی سہولیات وغیرہ وغیرہ..... مل کے آس پاس ہماری کتنی زمینیں

بے کار پڑی ہیں۔ ان بے چاروں کے لیے جن کے پاس رہنے کو چھوٹی سی جگہ نہیں ٹھیک ٹھاک کو اور تعمیر ہو سکتے

ہیں۔“

شاہنواز آنکھیں پھاڑتا سا سوچتے رہے۔

”کیا بک رہے ہو تم؟ یہ کسی بوسیدہ بے کار عمارت کا معاملہ نہیں کہ میں اسے تمہاری خاطر قربان کر دوں۔ میں

نے مل لگائی ہے اپنے مفاد کو..... یہ غریبوں کے لیے کھولا ہوا بیت المال نہیں۔ نہ ہی میرے پاس اتنی آمدنی ہے

کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے ان دو گئے کے لوگوں کی مدد کے علاوہ میں ایسے جفاکش ہزاروں کی تعداد میں

ہیں جو پیسے کا منہ دیکھنے کو ترستے ہیں ابھی بات کرتا ہوں سیکورٹی والوں سے جی۔ ایم سے..... کل کوئی مل میں

داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے تو زوریں میں کل بن انتظام کر لوں گا لبر کا۔ اور تم..... شیر..... تم اس گھر میں

بیسٹ کے لائن بھی نہیں ہو۔ تمہارا اصل مقام وہی ہوسٹل ہے خیردار جو اس طرف کا رخ کیا وہیں رہو تمہارا کام

تعلیم حاصل کرنا ہے۔ لیڈر رہنا نہیں..... کل ہی بلکہ ابھی اور اتنی وقت ہوسٹل چلے جائے تمہارے پیر نے مجھے

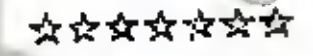
اتنا بھی اندھا نہیں کیا کہ میں اپنا سب کچھ تمہاری خاطر قربان دوں۔“

”کہاں پھرتے ہو؟“  
 ”دوستوں کے چکر میں بہاؤ رہا ہے، بہت اچھی انگلش مودی لگی تھی وہ سب مجھے ساتھ سمیٹ کے لے گئے۔ وہاں پہنچتے پہنچتے ایٹ ہو گئے، شام ہو شہود کیہ کر لو لے آئے میں ڈیڑھ گھنٹے تو لگ ہی جاتے ہیں۔“  
 ”بد تیز لڑکے۔۔۔ بظہر وہ بھی جمال سے تمہاری شکایت کرتی ہوں، کیا ضرورت تھی جانے کی اور وہ بھی دوسرے شہر میں۔ گئے کیسے تھے؟“ ان کے سبجے میں ماں کی ممتا سے خدشے موجود تھے۔  
 ”بس سے مئی۔۔۔“

”اومیر سے خدار اللہ کے تواتر آ رہا تو نہ تھا اب تک اب یہ تمہاری بات بھی ہوتی تھی۔“ انہوں نے سر ہلکایا۔  
 وہ جانے کیا کیا تھی رہیں پھر بجائے جمال احمد کے کمرے کا رخ کرنے کے بچن کی طرف بڑھیں۔ دو آگے بڑھا تو مڑ کر لوٹیں۔

”اب گدھر جا رہا ہے؟ ہو کا سوئے گا کیا۔۔۔۔۔؟ ابھر بچن میں ہی آ جا۔۔۔۔۔ کھانا کھالے۔۔۔۔۔ بعد میں شکایت کروں گی تیری۔۔۔۔۔ چہرہ تو دیکھ لینا۔۔۔۔۔ لگتا ہے صحت یوں سے ہو کا ہے۔“ شہیرا ان کے ساتھ بچن میں آ گیا کھانے کی چھوٹی کرسی پر بیٹھا عدی نے بھی دوسری کرسی سنبھالی تھی۔  
 ”اسے تم کیوں بیٹھ گئے؟“ اندر اور واڑے میں کھڑی تھی۔  
 ”کھانا تمہارے لئے نہیں شہیرا کے لیے گرم ہو رہا ہے۔“

”مئی۔۔۔۔۔ جتا ہے شام سات بجے کھایا تھا۔ اب پورے گیارہ ہو رہے ہیں اور جس کے لیے آپ کھانا لگا رہی ہیں یہ کیا سارا دن جو کا رہا ہو گا۔ کھانا دیں نا بچھ بھی۔“  
 مئی کوٹھی آگئی عدی شیر ہو گیا۔



کتے دن یوں ہی گزر گئے۔ اس نے امتحان دے لیا۔ امتحانوں کے بعد ہوٹل کا کمرہ خالی کرنا تھا۔ اپنا گھر نہ ہوتا تو اور بات تھی اب اسے عدی کے ہاں رہنا عجیب لگ رہا تھا۔ وہ اس سوچ میں تھا کہ کیا کرے۔۔۔۔۔ کہ دوسرے دن پاپائے کاڑھی بیچ دی شہیرا آ گیا۔۔۔۔۔ یا تو وہی لیکن بالکل کسی اجنبی کی طرح۔ رات کے کھانے پر پاپا نظر آئے۔ پہلے سے بالکل مختلف انجان سے پاپا۔ شہیرا کا دم گھٹنے لگا۔ اجنبیت سے پر اس لفظ میں پاپا کے وجود کے سہارے ہی رہا جاسکتا تھا۔ وہ انہیں اور ان کی سرد مہری کو دیکھ کر تیراں رہ گیا۔

رات اپنے کمرے کی طرف آیا۔ کرا بھی اجنبی سا لگا مگر اپنی آرائش اور ساڑھ سا مان کے سبب۔۔۔۔۔ نہ وہ پردے تھے نہ قالین۔ نہ وہ پیش قیمت بیڈ شیٹ۔۔۔۔۔ نہ تیس اور ملائم کسل۔۔۔۔۔ الماری کھولی۔۔۔۔۔ درہنوں سوٹ جو اس نے چھوڑ بھی نہ دیکھے تھے وہاں سے غائب تھے۔ ان چیزوں کا کیا تھا اصل چیز تو پاپا کی محبت تھی وہ تو جھٹکا ہو گئی تھی۔ ان چیزوں کا حجم چھٹی دارو شب و روز بے مصرف سے تھے شہیرا اور منیر کی اپنی مصروفیات تھیں۔ ارم اور شازیہ کے اپنے مشاغل تھے۔ ماما کو آئے دن کی پارٹیوں اور دوسرے بچکاموں سے وقت نہ ملتا تھا۔ اور پاپا جانے بڑنس کے کن دھندوں میں گم تھے۔ وہ ناشتے کی میز پر موجود نہ ہوتا تو فغور پاپا اسے ناشتا کمرے میں بے جا تے۔ سچ، ڈنر پر چلا جاتا تو ٹھیک نہ جاتا تو کسی نے بھی بچھا تک نہیں۔ بس ایک غغور ہا ہا تھی تھے جو اس کا خیال رکھتے۔

عدی بھی ان دنوں فارغ تھا۔ اکثر آ جاتا مگر گھر کے اندر کسی نہیں باہر سے تھی اسے کبھی کبھی ان کی طرف سے کچھ باتیں بھی آتی تھیں۔

پاپا کی حدائق تو تناس کے جانے پر کوئی پابندی تھی نہ اسے پر۔  
 ان ہی دنوں میں سے ایک دن وہ گھر میں داخل ہوا تو گھر کی رونق سے کسی تقریب کا پتہ چلا، غغور پاپائے اسے ایک نئی خاتون کے پاس لاکھڑا کیا۔  
 ”وہ جہاز سے آیا آپ کی بیوی بچھو ہیں۔“  
 ”آ۔۔۔۔۔ اب۔۔۔۔۔؟“

ان دنوں نے اتنا ہیبت سے لگا لیا اور لگیں راتے۔  
 ”انہیں جاننی ہے کیا؟ یہ رونے کا موقع ہے بھلا! آپ اپنے بچھے سے مل رہی ہیں، جدا تھوڑی ہو رہی ہیں، انہیں غغور۔۔۔۔۔“ شہیرا نے مزہ کر دیا۔ ایک خوب صورت شوخ و شازیر لڑکی سفید کرتے پاجامے اور سفید دوپٹے میں ان کے سامنے تھی۔

”اب۔۔۔۔۔ نامہ شہیم! اظہار عرض ہے۔۔۔۔۔ کہ میں آپ کی فرسٹ کزن ہوں جوہی۔۔۔۔۔ آئی میں ۵ برس عمر کی۔ آپ کی بیوی بچھو کی بیٹی۔۔۔۔۔ لیکن یہ بھی عرض کر دوں کہ آپ سے پورے چار برس بڑی ہوں۔ لہذا اتھارٹی مرخصی کے بعد میں آپ کو ہم پور آپ مجھے آپ کہہ کر بلائیں گے اور صورت احوال یہ ہے کہ اے میرے، ہسوں ڈاؤ! تم ہسوں پڑتے ہوئے ڈاؤ، لول اور ناہیلوں کے سارے ہیر روز سے بڑھ کر خوب رہو۔ عین میں میرا آئیڈیل لیکن صحت مند کہ میں۔۔۔۔۔“

آئیڈیل تقریر جہیر نے آہستگی سے کہا تا کہ ماں نہ سن سکیں۔  
 شہیرا نے اسے انتہائی نرمی اور اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھا دیا اصل میں اسے عدی کی بات یاد آگئی تھی اس نے غغور پاپا کو۔۔۔۔۔

”آپ کو پاپا کیسے بڑا پاپا کرتے تھے بھی دکھاؤ، وہ بے محترمہ جو ہر آپا۔“ خلاف معمول اس نے بھی خوش گھاس لہجے میں کہا۔  
 ”وہ کیوں؟“

”ناب سیکرٹ ہے ملاقات رتی تو ہوتا، ہاں گا۔“ وہ سکرایا اور سفید بیگ سے ہاتھیں کرنے لگا۔  
 ☆☆☆☆☆

اسی ملاقات کا نتیجہ وہ بچھو سے بننے ان کے گھر گیا تو جو ہر آپا تو نہیں ملیں۔ پردہ لڑکی ضرور نظر آئی۔ جسے پاپا شہیم کے دل میں اپنا نیت کا ڈھیروں احساس ایک دم جاگ اٹھا اس گھر میں بھی عدی کے گھر کی طرح محبتیں تھیں۔ اسے ہر بخت اور شہیرا تھے گوہر تھی۔ مخلص سے پھوپھا لپا تھا اور ماڈرن چین پھوپھو سفید تھیں گوہر کی شان اور کامیابی پر سارا گھر شہیم تھا رت جسے کی اس رات وہ ایسی کوئل تھا نہ چاہ رہا تھا لیکن آہ پڑا تھا۔ گھرا کر پوری رات وہ سو رہا تھا، جی جاگا تب بھی اس کے ذہن پر گوہر عمر کی کا قبضہ رہا وہ اس کے خواب و خیال کا مرکز بنی تھی۔

ڈنٹ آ گیا۔ حسب سابق اس نے نمایاں پوزیشن لی تھی۔ لیکن اس کا پڑھنے سے حق اپاٹ ہو گیا تھا۔ اس کی پانچ طرف پاپا کی بے تیزی تھی، شاہناز عسکری نے اپنا کہا پورا کیا تھا لال کے سارے حردوں کو برطرف کر دیا تھا لیکن شہیرا کی۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ غریب نوک کیا احتجاج کرتے۔ کچھ کو دوسری طبلوں میں کام لے گیا تھا، کچھ شہیروں کی طرف سے کچھ اور کچھ نے کھتی بازی کا کام سنبھال لیا تھا۔

شاہنواز نے اسے سرسری انداز میں کامیابی کی مبارکباد دی تو اس نے بات بچھری۔

”پاپا میں کچھ دن عہدہ پور میں گزارنا چاہتا ہوں۔“

”جلے جاؤ..... پچھلے دنوں میں نے حویلی سے کچھ قاصدے پر ایک عمارت ہوائی تھی پوری طرح تیار ہے اب.....“

ایک دو گھر سے اپنے رہنے کو ٹھیک کر لیتا۔ ان کے انداز میں وہی روکھا پن تھا۔

”پاپا..... میں کام کرنا چاہتا ہوں، گنا کیسے رہوں گا؟“

”کس قسم کا کام؟ کام تو سب ہو رہا ہے۔ کیسا کام کرو گے تم؟“

”زمینوں کا فصل بونے کا۔“

”کر لیتا پورا اپنا شوق..... ٹریکٹر ڈرائی ہو چکا ہے..... سوزو کی جیب بھی ہے..... پیسے کی ضرورت ہو تو منشی جی سے لے لیتا۔“ (اب انہوں نے اسے پیسے دینا بند کر دیے تھے۔ اسے رقم کے استعمال کا ڈسنگ جو نہ تھا) پاپا کے

لہجے میں نہجرت تھی نہ چاہت۔

شہیر عہدہ پور چلا آیا۔ گو ”آشیانہ“ کے نام سے ایک خوب صورت عمارت اس کے پاپا کی امارت اور

جاگیر دارنی کا نشان تھی پھر بھی اسے رہنے کے لیے جگہ پسند آئی۔

بھرت عدوی کی بھلائی..... اور کچھ وقت اپنے ساتھ گزارنے کی دعوت دی عدوی آ گیا وہ دنوں فارغ تھے ان

دنوں شہیر تذبذب کے عالم میں تھا جب کہ عدوی ایم۔ اے میں داخل لینا چاہ رہا تھا لیکن دشمنوں کا انتخاب اس کے

لیے مسئلہ بنا ہوا تھا اور وہ شہیر کو بھی اپنے ساتھ کھینٹ کر لے جانا چاہتا تھا۔ ایک دن وہ شہر گیا تو ڈاک کے کچھ

لٹاے بھی ساتھ لیتا آیا اجمال احمد ان دنوں وفاقی بارہ لکھنوت میں تھے۔ عدوی نے انہیں بذریعہ خط اپنا احوال لکھ

دیا ساتھ ہی مشورہ بھی مانگا۔ پھر اس نے چند مہینوں کو نامے ارسال کیے۔ خدا غی جانے وہ محبت نامے تھے یا

پتھور اور۔ شہیر اپنے بستر پر نہ تھا اس کی کارروائیاں دیکھتا رہا۔

”کیا ٹکر کر دیکھے جا رہا ہے؟“ گھڑے نہ تو بھی کسی تو دل نامراد کا قصہ۔“

”پانچس ہوئے ہو..... ہم نے ایسا کوئی روگ پالا ہی نہیں۔“ اس نے آنکھیں بند کر لیں بند آنکھوں میں ایک

صورت تانے لگی تو آنکھیں کھولیں۔

”کیا بات ہے گھبرا کیوں رہے ہو؟“

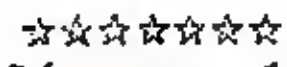
”نن..... جیسے پتھور نہیں۔“

عدوی نے خط لکھ کر خافوں میں بند کر دیے۔ جی بھائی اور بستر پر دراز ہو گیا..... لیکن شہیر کی نیند نہیں کھوئی۔

ذہانت سے پروا نکھیں اس کے ذہن میں پھل چلی رہیں۔ اس نے عدوی کی بطرف دیکھا وہ گہری نیند میں کم

ہو چکا تھا۔

اس نے کاغذ قلم سنبھال لیا۔



جب سے اس نے شہیر کی تمایاں کامیابی کا ذکر سنا تھا، اخبار میں اس کی تصویر دیکھی تھی تب سے وہ بہت بے چین

تھی شہیر ان دنوں کا گیا اب تک لوٹ کر نہ آیا تھا۔ ایسی بھی کیا بے نیازی صرف اخلاص دینے ہی آ جاتا۔ اب

خود سے تو پوچھنا اچھا نہیں لگتا اڑتی اڑتی یہاں تک پہنچی تھی کہ شاہنواز شہیر کی گستاخوں کا سبب ان کے خاندان کو

تھوڑے تھوڑے گھر کو بے حد لال اور رن تھا۔ وہ اس گھر میں رہتی تھی بارہا سرف دہا، وہ تو شہیر سے کسی قسم

کی گستاخی کی امید ہی نہیں رکھتی۔ اس کے خیالات نے سب کو متاثر کیا تھا، شاہنواز، مہموں کے مجیب و خریب  
روایوں پر حیران تھی۔ نئی کلاسیک کب سے شروع ہو چکی تھیں۔ وہ باقاعدگی سے کالج جا رہی تھی، خضوع و خشوع  
سے کلاس پڑھ رہی تھی۔ اس بار بھی اس کے ارادے بہت اونچے تھے۔ شاید وہ مشہور و خبر پر شہر سے مقابلے کی  
روز میں جیتنا چاہتی تھی۔

جو ہر آباہنزار منت سے کہیں لیکن اس نے تاہوں سے مکمل طور پر ہٹا توڑ لیا۔

اس روز گورنمنٹ ٹیسٹ کی تیاری کے لیے کالج سے چھٹی کر لی۔ وہ حسب عادت بڑے سارے مہمن میں گھیم

پھر کر پڑھ رہی تھی۔ ورزش کی ورزش اور پڑھائی کی پڑھائی..... کدو دانے پر دستک ہوئی۔

”خط والا۔“ پوسٹ مین کی مخصوص آواز آئی وہ بے اختیار رو رہا اسے نئی طرف پڑھ گئی۔

کئی خطوط تھے مختلف لوگوں کے نام ایک خط کی تحریر بے اندازہ خوب صورت تھی۔

”شرف نگاہ محمد احترام جناب محترم القیام عالم حسین صاحب عسکری مظلہ و غیرہ وغیرہ۔“

گورنمنٹ لٹافہ پلٹا۔

”بندہ حاجی شہیر عسکری۔“

خواہ مخواہ دل ایک پلٹا کو کا..... ہر کا..... اور پھر دھرتا چلا گیا۔

یہ خوب صورت تحریر جس نے بے اختیار اپنی طرف کھینچا تھا اسے شہیر کی تھی۔ شہیر شاہنواز عسکری کی۔

اسے اس تحریر پر رشک آیا پھر جانے کیا ہوا۔ اس کے لٹافہ چاک کیا حالانکہ جانتی تھی نہیں تھی بلکہ اس پر سختی سے

عمل بھی کرتی تھی کدو سروں کے خط پڑھنا جرم ہے۔

اس کی نظریں کاغذ کی سطح پر دوڑنے لگیں۔

محترم پھوپھا جان!

آداب..... آپ میری کامیابی کے متعلق من چکے ہوں گے۔ مجھے آپ کی دعا میں اپنے کے لیے آپ کے

دراقتس پر حاضری دینا چاہیے لیکن مضرت خواہ ہوں کہ نہیں آسکا۔ آج کل ڈارن ہوں، یوسٹل کی زندگی

تھکن لگاتی تو شہیر میں کہیں دل نہ لگا۔ آشیانہ میں جائے پذیر ہوں۔ زندگی کو مجلس انسانوں کے قریب رہ کر قریب

سے دیکھنے کے لیے۔ ان دنوں میں یہاں کے اسکول میں اسٹریچوں میں تھوڑا سا طہ پٹے چلا جاتا ہوں جو مجھ

نا چیز کے ناقص دماغ میں ہے۔ فارغ اوقات کا یہ استعمال مجھے بہت بھلا لگا ہے۔

جانے آپ کیا خیال کریں۔ اگر شہیر آ یا تو روڈ پر حاضری ضرور دوں گا۔ میری طرف سے اہل خانہ کو آداب

و سلام درجہ بدرجہ.....

آپ کا بیٹا  
شہیر عسکری

شہیر میں کہیں دل نہ لگا۔

یہ شہر ہزار گشت میں کر گویا کے چاروں طرف پھیل گیا۔

ستا ہے مہموں جان کا گھر بہت خوب صورت اور وسیع و عریض ہے جہاں بنگلے سے ہون، اور رات کا فرق محسوس

نہیں ہونے دیتے۔ اچھے سے گزن! تمہارا دل کیوں نہ لگا آ کر کیوں؟ ایک سوچی، نمن میں انگری اور اسے

دشمن کر ڈال رہی۔ اس نے عہدہ پاپا جان کی میز پر دستا۔



بہت سارے دن جیسا کہ ساتھ ٹرڈ گئے مگر اپنے ہی نظام کے تحت گھوہر کے حصے میں گھر کی کئی بندوبستوں  
تھیں کالج جانے سے پہلے وہ سارے کمرہ کی صفائی کرتی۔ اماں ہنستا ہنستا کہیں۔ جو ہر آہ کمرہ کو سنوار دیتیں۔  
سکھانے باقی سارے کام سنبھال رکھے تھے۔ مگر اور ملحقہ ہلیا کی صفائی بھی اس کے ذمے تھی۔ اسرار بھائی  
ہاؤس چاہ کر رہے تھے۔ شہر یا رتوں سال کو دس کے بعد باہر چلے گئے تھے۔ اب بخت سی۔ اسے کے لیے باہر کا  
رخ کرنے کو پرتو لارہے تھے۔ ان کی ضد تھی کہ وہ غیر ملک جا کر ہی بن۔ اسے کریں گے۔ انہیں یونانی بولنا ہی  
پھرتی تھیں۔ آٹھ ہس سال کے لیے جدا ہو، خاصا مشکل تھا۔ پتا تو پایا جان کو بھی کہ نہ تھا لیکن وہ ترقی کی راہ میں  
حائل ہو پسند نہ کرتے تھے۔ وہ تو ساری بخت کر رہی اپنے بچوں کی خاطر رہے تھے۔ اپنے بچوں کا معاشرے میں  
نمایاں مقام ان کی سب سے بڑی آرزو تھا۔

دراصل ان کی اپنی ذات اپنی خواہشوں سمیت اور پوری رہ گئی تھی۔

شدید ترین بخت تھی انہیں راتوں رات عرش کی بلندیوں تک۔ تو نہ پہنچا سکی لیکن طرز زندگی تھوڑا بہت ضرور بدل  
گیا۔

مثلاً کاروباری ضروریات کے تحت ایک عدد ٹیلی فون ناگزیر تھا لگوا دیا گیا۔ گھر کے ایک کونے کو بیلچہ کر کے  
ایسی ہی بنایا گیا۔ جہاں جدید خرخر پر بنے دو کمرے کو جدید طرز پر ہی سجایا گیا اور بچوں کی ضد پر وہاں ایک سرد گرم  
ایئر کنڈیشنر بھی لگوا دیا گیا۔ باقی گھرا ہی طرح رہا جس طرح پہلے تھا۔ مثلاً کھانا کسی خاص کمرے میں نہیں بلکہ  
باورچی خانے میں ہی دسترخوان بچھا کر کھایا جاتا۔ گرما کھا رہا تھا۔ اپنی جھپٹ کے نیچے نزاری جاتیں۔ سرمائی  
شاموں میں آتش دان روشن کر کے دالان کو رات گئے تک نشست گاہ بنایا جاتا۔ جہاں سب کے مشر کہہ سکتے ہیں  
حل ڈھونڈا جاتا اور سکھوں سے لطف اندوز ہوا جاتا پایا جان کے ساتھ میر حاصل بحث کی جاتی۔ گرما گرم میوگ  
پھلیاں اور چٹوڑے کھائے جاتے روزانہ کی سیاسی وغیر سیاسی خبریں پڑھ کر دیکھا جاتا اور جو بھی کانٹا بچا اور ان کی  
ٹیلی کے لوگ کچھ دن گزارنے آ جاتے تو ان کے ساتھ میوہیں اڑانی جاتیں۔ گوہر کو سرمائی راتوں کی پائنتی سے  
بھی اڑھ چار تھی۔

وہ گرم پیر دن کو اماں کے حکم پر جسم پر لاد کر چھت پر آنکھ پھا کر کھن جاتی۔ چہار سو پھلی جانتی میں اس کی  
سوچوں کا آفت بھی تاب ناک اور روشن ہو جاتا۔ وہ پہروں اچھی باتیں سونچتی رہتی کائنات کے حسن پر غور کرتی  
اپنے بلند آدرشوں پر نظر ثانی کرتی اور جب فوت کر آتی تو دالان میں زندگی کے ہنگامے تم ہوا چکے ہوتے رات  
گئے تک نصابی کتابوں کے علاوہ اچھے اردو کے الفا لوی مجموعے انیس افراد اور ناصر کی خوب صورت شاعری  
مستحکم حسین ناز کے سفر نامے اور بہت کچھ اس کے زیر نظر رہتا۔ جو ہر آہ اور اس میں مردوں کے نمایاں فرق  
کے باوجود دونوں میں زبردست ہوتی تھی۔ تاوان پڑھنے کا چسک انہوں نے ہی ڈالا تھا لیکن اس کا مطالعاتی سفر  
بہت طویل ہو گیا۔ وہ دن سے بہت آگے نکل گئی۔

جو ہر آہ کو دیکھنا بچھ سوں سے پر شور و غل ہانی زندگی پسند تھی ایک بنا ہوا اونچے اسٹینس کا مالک خور و جوانان ان  
کا آئیڈیل تھا مارٹن سے بنا گھر وسیع لان قیمتی اشیائے ضرورت، لمبی سی گاڑی، ٹیش قیمت جیوٹری، شاید اولیاس  
مالی شان وغیرہ سب جو ہر آہ کے خواب تھے۔ انہیں اس پرانی طرز سے گھر سے کوئی محبت نہ تھی۔ سو وہ بظن  
آتے تھے۔ وہ تو پھر سے اڑ جانے کو تیار رہتی تھیں۔

ایک یہ گوہر تھی..... اپنی دشمن میں گمن..... اس گھر کی محبت اس کی رگ رگ میں رچ بس گئی تھی۔ اس کے

انہوں کے گھر سے کسی شہزادے کا گزر نہ ہوا تھا۔ یعنی اور ادنیٰ سرگرمیوں کے علاوہ کسی چیز کا خیال تک نہ تھا  
انہوں کو یا جسم کی آرائش ہر بات میں دخل سادگی کا ہی تھا، شادی بیاہی تقریبوں سے اکثر دور رہتی..... کہیں  
بانے کا اتفاق ہوتا بھی تو سرمخزل رہنے کے بجائے کسی کونے کھدوے میں کسی کمرے میں بیٹھی رہتی۔ کٹر  
ناہوش ہی رہتی..... ہاتھیں کرتی تو بس اپنے ہاؤ جان سے یا بھائیوں سے اسے عورتوں کی محفلوں سے ہول  
اٹھا تھا جہاں زبیرات لباس دوسروں کی عجیب جوتی پسندیدہ ترین موضوع ہوتے تھے۔  
جو ہر آہ پا کٹر اسے پھینڈنے کو گھنٹا تھیں۔

بھرتی دنیا میں جی نہیں لگتا  
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

کبھی کہتیں۔

"جانی۔ اچھے اچھے خواب پال لو..... دنیا میں بھی دل لگنے۔ ویسے ایک بات کہوں۔ دل لگانے کو یہ اپنا کزن  
الٹو دفع شبیر عسکری برا نہیں۔"  
گوہر سرخ ہو جاتی۔

"پیشے آپ آپ کو تو بے لگی سوچتی ہے۔"

ماہیوں جان کے آنے سے زندگی میں تھوڑی سی تبدیلی آئی تھی، کسی نہ کسی اقرب کے سلسلے میں انہیں بلاوا  
آ جاتا۔ دلخواہ عسکری تو لاہور میں تھے ان کے ہاں سالوں میں جانے کا اتفاق ہوا کرتا تھا، لیکن شاہناز اب ایک  
نئی شہر میں تھے زسما ان سے دور نہ رہ سکتے تھے اس دن شبیر کی برتھ ڈے پارٹی تھی۔ وہ خود ہی آ کر کارڈ دے گیا  
دونوں بہنوں کو یاد بارتا سید کی۔

اماں سر شام جانے کو تیار ہو گئی تو نکلیں شور مچانے گوہر نے جس پیشہ سے کام لیا تو ان کا منہ بن گیا۔

"اللہ آئین سے..... ایک دو ہی تعلق دار ہیں میرے صاحبزادی کو یہ بھی قبول نہیں۔ پوچھتی ہوں کہس آئے  
یہ شبیر کیسے رہے گی اس دنیا میں۔"

ابیتہ جو ہر آہ پر پیر سے ہی تیار ہوں میں گئی تھیں۔

تیاری تھی کہ کھل ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی سدا کی سادہ دل سادہ مزاج گوہر نے لباس اور آرائش میں  
آہ بھی کوئی اجتنام نہ کیا آسانی رنگ کے سنگ کے سوٹ اور چار موسم کے دوپٹے میں گھٹنے سیاہ بالوں کی چوٹی بنا  
کر وہ کمرے سے نکل آئی سیاہ سینڈلوں میں اس کے پیرو دیکھ کر جو ہر آہ استرا دین۔ پایا جان نے پرانے پتوں کی  
تہہ پر سے دنوں بعد گمراہ سے نکالی گاڑی سرف ایسے سابقوں پر استغناء میں لائی جاتی تھی جب اہل خانہ کو  
کہیں جانا ہوتا۔ گوہر کو امری کالج چھوڑ آتے اور باپسی پر بخت اپنے ساتھ لے آتے سب ہنگامہ گاڑی کی طرف  
گئے۔

ٹیلی فون کی گھنٹی اک تراتر سے بج رہی تھی۔ گوہر اپنی چادر لیتے کمرے میں گئی تو اس نے دالان میں رکھا ٹیلی  
فون اٹینڈ کیا۔

"ہیلو!"

"شبیر شبیر اسپیکنگ۔"





”گوہر جلدی آؤ۔“

دور کہیں سے جوہر آ پائے پکارا۔

وہ گھبراہٹ کے اس عالم میں آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

ٹھیک ذرا بند کر کے باہر بھاگ گئی۔

”کیا بات ہے یہ تمہارا چہرہ اس قدر لال گداں سا لگ رہا ہے۔ آئینہ دیکھ کے آ رہی ہو؟ یقیناً شبیر نظر آ گیا ہوگا۔“ آؤ نے پھر پوچھا۔

”جی نہیں۔“ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے بڑے دلار سے کہا۔

”تو کس کا تھا؟“

”کیا خبر کس کا میں نے تو اٹھایا ہی نہیں۔“

اس نے جھوٹ بول دیا۔

”ہاں آخر شبیر کے گھر جا رہی ہو اتنی فرصت کہاں تھی تمہیں۔“

اس نے اٹھیں گھور کر خاموش رہنے کو کہا۔

دونوں گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

گاڑی ٹیٹ سے باہر روک دئی گئی پورچ میں کچھ شخص عی نہ تھی۔ متعدد گاڑیاں باہر کھڑی تھیں۔

گوہر بیٹھ اترتی۔ اس کی پہلی نظر گرم لباس اور لاٹک بونٹ میں چہرے پر دنیا بھر کی کئی لیے آئے شبیر پر پڑی۔

وہ بے پردائی سے اس کے قریب سے لڑ کر ناچی جیب کی طرف بڑھا ڈرا تینگ سیٹ کا دروازہ کھولتے کھولتے

اس کے ہاتھ تک گئے۔

”پہو بھیا جان آپ۔ السلام علیکم۔“

وہ آگے بڑھ کر عالم حسین کے آگے قدم سے جھکا۔

”جو علیکم السلام۔ کہاں جا رہے ہو میاں؟ بڑی جلدی میں تھے تمہارا خط مل گیا تھا مجھے.... تم ملے ہی نہیں نہ

ہماری طرف آئے۔“

”سید اللہ پور سے ابھی آیا ہوں۔“

گوہر کے قدم وہیں رک گئے۔ ایک سائل میں شبیر میں بہت فرق آ گیا تھا قد بڑھ گیا تھا۔ لیکن وہ کمزور سا لگ

رہا تھا۔ وہ نہیں تندرست لگتا تھا۔ آکھوں کی چمک میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ لیکن چہرہ کس خوش یا اطمینان کی

آماجگاہ نہیں لگ رہا تھا۔

”شبیر میں اتنی دل نہ لگا۔“

گوہر کے: ہاں میں اس کے خط کا ایک جملہ آ گیا۔

اسے نہیں توہ بہترین روٹی چھوڑ کر جاتے کہاں جا رہا تھا۔

وہ جا رہی تھی لپٹائی وہ ہیں کھڑی رہی ماب تک باہر بنا چاہتی تھی مگر شبیر نے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ بس

ہاں کو آ رہا تھا اور گاڑی میں بیٹھ کر جا رہا تھا۔ نظروں سے نہ ہٹا ہوا تھا۔ اسے تو ہوا ہوا۔

”آؤ آؤ صنیہہ.... ہجرتی باہر سے.... یہ بھی کوئی آئے گا وقت ہے تم سننا لے لے۔ میرے بھانجے ہیں اتنا بڑا بھی

دن سنی کا مہیوں منت ہے۔“

”یہ مت بھولو کہ وہ میرے بیٹے ہیں۔“ عالم نے شاہواز نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”ارے گوہر بیٹی یہ تم باپ کے پہلو میں چھپی کھڑی ہو۔ جوہی، جوہی تم لوگ اندر آ جاؤ۔“

ارم اور شاہازی بھی وہیں آ گئیں۔

”اللہ جوہی آ پی۔ کتنا انگار کر رہا ہے آپ نے۔ اور.... اور.... یہ کون ہے؟ آف گوہر یہ تم ہو میں نے سوچا

کوئی بڑی بیٹی ہیں۔“ ارم ہنس دی۔

”اوہ مائی گاؤ.... یہ کیا کہن رکھا ہے تم نے؟ لا حول ولا یہ لباس آج کے دن پہننے کا ہے۔“

”بیٹی اللہ جاؤ بعد میں باتیں کرنا۔“

لڑکیاں گوہر کو کھینچی اندر کی طرف بڑھیں۔

”جوہی آ پی! آپ نے اسے سمجھایا ہوتا۔“

”میں تو اس سے تنگ ہوں میں کیا سمجھاتی۔“

”چلو شاہازی جلدی سے میرا سوٹ نکالو میریون کمر کا زری کے کام والا چلو میں اسے لا رہی ہوں۔“

”نہیں ارم! میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”خاک ٹھیک ہو اپنی سہیلیوں سے تعارف کراتے ہوئے شرم تو مجھے آئے گی کہ نہ بڑھی روح میری گزن

ہے۔ گوہر کم از کم تم اپنے لیے پناہ حسن کی لاج رکھو، ایسا ظلم تو نہ کرو۔“

”نہیں ارم پلیز! میں ہی لباس میں۔“

”بس چپ چاپ کمرے میں چلو لباس بدلو ورنہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں ہانڈھ کر تمہارا حلیہ ٹھیک کروں گی

سمجھیں آئیے جوہی آپا۔ دیکھتی ہوں کیسے نہیں مانتی۔“

ارم اسے گھیسٹ کر کمرے میں لے آئی۔

جوہر آپا کو اللہ نے سونے دیا، تینوں لڑکیوں نے مل کر اس کی درگت بنا ڈالی۔ بیرون کمرے کے سوٹ سیاہ کھلے

بالوں اور جینز نے اسے سرتا پا جہل دیا۔ ارم نے جاسنے کیا لپیٹا پوتی کی آئینے میں اپنا آپ دیکھ کر وہ خلیفہ سی

ہوئی ارم نے اس کا ہارو تھا۔

”میں باہر نہیں جاؤں گی وہاں ظہیر بھائی کے دوست بھی ہوں گے۔“

”تو کیا ہوا! آج تو ان سب کے ہوش کھونے کا دن ہے۔“

”نہیں ارم میں کبھی کسی کے۔“

”ہرے بھائی۔ وہ بے چارے تمہیں دیکھ کر خدا کا شکر ہی تو ادا کریں گے جس نے تمہیں بنایا تم کسی سے بات نہ

کہا ایک طرف بیٹھی رہنا سب مجھ سے پوچھیں گے یہ مشروری الف لیلوی شہزادی کون ہے کہاں سے آئی ہے؟

تب میں فخر سے بتاؤں گی کہ یہ میری انکیولی چھوٹی راج دلار کی ہیں۔“

”جوہی آپا.... جوہی آپا۔“ ظہیر وہ زتے چلے آئے جو جی گوہر پر نظر پڑی تنگ ہو کر رہ گئے۔

”ارے۔ یہ.... یہ.... کون ہیں؟“

ارم اور شاہازی ہنس دیں۔

”ارے.... واہ.... واہ.... واہ! تو پچھان ہی نہ پاؤ یہ گوہر ہی ہیں نا، کہیں میں دھوکا تو نہیں کھا رہا۔“

”نہیں ظہیر بھائی یہ گوہر ہی ہیں۔“

"گناہ ہے ہماری زندگی کا ایک اور سال بڑھ جانے کی خوشی آپ کو سب سے زیادہ ہوئی ہے۔ شکر یہ گوہر جی۔"

وہ چپ رہی۔

"اچھا بھئی! آپ سب لوگ چلیے ایک کانٹے کے لیے بس آپ لوگوں کا انتظار پھر رہا ہے۔"

"چلو گوہر.....! جو ہر پانے اس کا ہاتھ بچڑا۔"

"بس! ہاں نہیں جاؤں گی آیا؟"

"کیوں بھئی؟ آخر کس وجہ سے؟"

"بس۔ میں نے کپڑے بدل لیے۔ نینن وہاں نہیں جاؤں گی ہرگز نہیں۔"

"پانگل ہو تو برہمن سنور کے پنے آپ کو چھپاؤ گی اور پھر بابا جان تو امداد ہیں۔"

"ہوستے رہیں۔ میں غیر مردوں میں نہیں جاؤں گی۔" اس کی سنجیدگی دیکھ کر ارم شانہ بیا اور جوہر جی حائنین۔

وہ ایک بظنی صورت پر نکلی۔

بال کی رنگین دنیا اس کی نظروں سے اوجھل تھی نینن قہقہے بہ خونی..... یہاں تک پہنچ رہے تھے۔ اس نے ارم کی

بک شیلف کا جائزہ لیا۔ کوئی کتاب پڑھنے کے لائق نظر نہ آئی۔ گوریڈور میں نون کی کھٹی تواتر سے بج رہی تھی۔

سب تقریب میں گمن تھے کچھ دیر بعد نینل پھرنا آگئی وہ نون کی طرف آئی ازراہ اخلاق اس نے ریسیور اٹھا لیا

کوئی منیر عسکری کو پوچھ رہا تھا۔

"جی وہ اترا وقت مصروف ہیں آپ تھوڑی دیر بعد رنگ کر نیچے گا۔"

"آپ کون ہیں؟"

"آئی ایم سوئی میڈیٹا ضروری نہیں۔"

"اچھا؟"

"خدا حافظ۔"

اس نے ریسیور دک کر سر اٹھایا۔

"آپ۔" منیر عسکری میں اس کے سر پر کھڑا تھا۔

"جی میں۔ معذرت خواہ ہوں دخل اندازی پر کس سے بات کر رہی تھیں؟"

"کسی سے بھی نہیں۔"

"کوئی تو تھا۔"

"منیر بھائی کا کوئی دوست انہیں پوچھ رہا تھا۔"

"اوہ میں سمجھا..... آپ صرف ٹیلی فون کی خاطر ہال میں نہیں بیٹھیں ویسے منیر کے دوست سے مسکرا کر بات کرنا

ضروری تو نہ تھا۔" اس کا لہجہ جیڑا بہتا سا تھا گوہر نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"مسکرا کر! ہرگز نہیں نون کب سے بچ رہا تھا میں نے سوچا کوئی ایمر جنسی کال نہ ہو جس نے منڈ کر لیا اور بات کرنا

پڑی۔"

"بہر حال آئی ڈونٹ لائیک کہ لڑکیاں غیر لڑکوں سے یوں باتیں مٹھادیں۔"

وہ ایک ٹپ میں دھم دھم کرنا بیڑھیان چڑھ گیا۔

گوہر اسے دیکھتی رہ گئی اسے اس شہر اور سال پہلے والے شہر میں بہت فرق نظر آیا۔ مزاج کے لحاظ سے گوہر

ہاں انداز کا مہر غصہ آیا نینن وہ سوچنے لگی۔

شانہ کی تقریب سے دور وہ کہاں گیا تھا؟ وہ نہیں کیوں آیا اور سب اوپر کہاں چلا گیا؟ کیا اسے واقعی اس گھر اور

سب کے کھیتوں سے کوئی وا۔ بلکہ نہیں اور نہیں تو کس؟

"..... اور اسے مجھ سے رشتے میں بات کرنے کا حق نہیں ہے۔" وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔

نیچے کے ہنگاموں میں اوپر تو شور تین شائیں ہو لیا۔

نڈوئی اٹنگ ہے نہ کوئی ترجم ہے

میری زندگی ہے کیا اک کھی چنگ ہے

جانے کی آواز اور پتہ ساری منزل میں گونج رہی تھی۔

سب بیٹے: یل گل رہا تھا۔

کے تاج رے سے تھے تالیوں کی گونج میں ڈیک کی آواز دنی جا رہی تھی اور پر سے گانے کی آواز ڈیک کی

..... نون کی کھٹی۔ تالیوں کا شور..... ہوتا تھا..... سب کچھ گنڈا ہو گیا۔ ان ساری آوازوں سے گھبرا کر وہ پھر

اپنے کمرے میں چلی آئی۔

"گوہر بیٹے! تم ہال میں نہیں آئیں؟"

جانے کب شاہنواز امداد آئے۔

"چلو اب کھانا کھا لو واپس تمہارا منتظر ہے۔"

"جی ہاں۔"

وہ ان کے ساتھ ڈانگ ہال میں آئی۔

بھر پر سب گھر والے موجود تھے۔ ظہیر اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

"آپ کا لباس بہت جلد بدل گیا۔"

وہ چپ رہی شہیر کھانے پر بھی موجود تھا۔

"شہیر نہیں آیا؟" بابا خان نے شاید گوہر کے دل کی بات جان لی۔

"بھئی کب آتا ہے وہ جو آج آتا ہے اسے اس گھر اور گھر کی خوشیوں سے کوئی مطلب نہیں۔" شاہنواز کے لہجے

میں گئی اور ناراضگی تھی۔

"گوہر پر ہے بھی کہاں؟"

"ہاں میں نے بھی اسے جاتا دیکھا تھا۔"

"نہیں بابا جان! وہ گھر ہیں میں نے انہیں اوپر جاتے دیکھا تھا۔"

"کس؟"

"کالی دیر ہو گئی۔"

"بھائی کی خوشی میں شریک ہو جاؤ تو کیا فرق پڑتا۔" سعید وہ لیس۔

"چھوڑ سعید! یہ اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔"

"جوہر تم جا کے بھائی کو بلا لاؤ۔" اماں کے خون نے جوش مارا۔

"نہاں جاتا ہوں اماں۔" بھنتاٹھے۔

”چھوڑو میاں..... اس گھر کا کھانا اس پر حرام ہے وہ کھانا کھیں باہر سے کھاتا ہے۔“

”وہ کیوں، مومن جان؟“ گوہر بول اٹھی۔

”یہ باتیں تم نہیں سمجھو گی بیٹی۔ اسے مجھ سے ضد ہے وہ میرے مقابل اتر آیا ہے نفرت کرتا ہے ہم سے۔“ شاہناز بولتی ہو گئی۔

گوہر کی بھوکہ اڑ گئی اس نے کھانا برائے نام کھانا اور ارم کے کمرے کی طرف آ گئی۔

شعبیر بیٹھیاں اتر رہا تھا۔ بیک کندھے سے لٹکائے لاگت کوٹ پہنے چیرے پر تکی لیے وہ اس کے پاس گزرا۔

”آپ پھر کتنے جا رہے ہیں؟“

”پانچ ماہ لے لینے آیا تھا؟“

”اس رات میں کہاں جائیں گے؟“

”راہیں دن میں ہی نہیں راتوں کو بھی کھلی رہتی ہیں اور بعض مسافر تو ویسے بھی منزل کے قصبوں کے بغیر ہی پڑتے ہیں۔“

”آپ سا گھر میں ٹریک نہیں ہوئے؟“

”متر ورت ہی نہیں تھی۔“

”کسے آپ کو کیا.....؟ مومن جان پریشان تھے۔“

”کئی دنوں سے انھیں کھانے کے سلسلے میں پریشان ہوں گے۔“

”آپ کھانا تو کھالیں۔“

”کھا چکا ہوں اچھا خدا حافظ..... عدی میرا انتظار کر رہا ہوگا۔“ اس نے جانے کو قدم اٹھایا۔

”تجھے.....“

”جی؟“

”آپ پھر کبھی ہماری طرف آئے ہی نہیں۔“

”آپ نے کئی مجھ سے کی؟“

”شاید.....؟“

”آ جاؤں گا کسی دن انتظار کیجئے گا ویسے شاید آپ کی بی بی اسے شہنشاہ دار کا میاں کی خبر سے اخبار میں پڑھ

آتا ہی پڑے گا اچھے ذہن تھے اچیل کرتے ہیں اور چالانی اور سکاری سے پاک و خوبصورت آنکھیں نیچے پڑ

ہیں۔“ وہ ایک بل کو خوش و خرم شہیر لگنے لگا۔

”اچھا خدا حافظ..... ہاں ایک بات اب میں کبھی فون کریں تو بات کر لیجئے“ کیونکہ آپ تو غیروں۔

یا آسانی بات کر لیتی ہیں میں تو پھر آپ کا مومن زادہ ہوں اب کبھی اتفاق ہو تو پہلو کے بعد فون رکھنا نہ بیجئے گا۔

وہ شتر بھی پار سے چھوٹنے کا خوف کرتا تھا وہ چپ رہنے کے سوا کچھ نہ کرتی۔

”آپ کو بسر کا پتا کیسے چلا؟“

”آپ کے فون پر لکھا نظر آیا تھا۔“

”آپ نے لکھ لیا ہوگا۔“

”میں ساری وارداتیں قلب و جان کے قرعہ خاس پر لکھتا ہوں“ آئی مین ہر دو بات جسے یاد رکھنا ضروری ہو اور اس نمبر کو ہرگز نہیں بھول سکتا یاد رکھوں گا۔“

اب کے اس نے قدم اٹھائے تو پھر رکائیں بڑھتی ہی چلا گیا، گوہر اس کی پشت پر نظر سے جمائے اس کے سر پاپا میں گم ہو گئی۔ اسے خبر ہی نہ تھی پشت پر ارم اور شاہناز یہ کھڑی تھیں۔

”شعبیر بھائی تھے؟“

”ہاں..... ہاں وہی تھے۔“ گوہر شہینا کر رہ گئی۔

”خوب باتیں ہو رہی تھیں؟“

”ایسے ہی عام ہی باتیں۔“

”نمبر ماٹھ..... وہ اکیلی لڑکیوں کو گھیر کر ایسی عام ہی باتیں کرنے کے خوگر ہیں۔“ ارم ہنس دی اس کے لہجے میں عجیب سا مسخرہ تھا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب تو مجھے پوچھنا ہے گوہر۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جین کر صرف انہیں دکھانے کے لیے ہاں تک نہ لگی ہو سچ تھا گوہر یہ سلسلہ کب سے ہے؟“

”ارم.....! گوہر کا چہرہ سرخ ہو گیا شدید غصے کے عالم میں۔

”بی بی ایسی مانی کزن! میں تو ایک بات تمہیں بتا رہی ہوں گھر سے دور رہ کر شعبیر بھائی گھریلو زندگی کے آداب بھول گئے ہیں لڑکیوں کی معصومیت سے حیلان کی فطرت بتن لیا ہے اور آشیانہ میں رہ کر تو وہ بالکل آزاد ہو گئے

ہیں۔ سلسلے وہ باتوں میں مشغول کرنا بہت آسان ہے آج کل ایک پستی ملازم کی بیٹی سے ان کا عشق زوروں پر ہے یہاں گھنٹوں لڑکیوں سے فون پر باتیں کرنا ان کی ہالی ہے پاپا ان ہی باتوں کی وجہ سے تو بدگن ہیں۔“

گوہر کے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ لیکن وہ سنبھل کر بولی۔

”ٹھیک ہوگا یہ سب کچھ لیکن ارم پیاری“ دس اڑاے ٹھیکٹ“ کہ وہ میرے کزن ہیں۔“

”اور میرے بھائی۔“ ارم کی ہنسی کا ساتھ اس نے زبردستی دیا۔

☆☆☆☆☆☆

ایک سردی شام جبکہ مطلع سرد آلود تھا۔ جوہر اسے تحسیٹ گھساٹ کر بازار لے آئیں اور عین اس وقت جب وہ مڑنگ کنارے کھڑی بارش سے بھیک رہی تھیں۔

ایک لمبی سفید گاڑی ان کے قریب رکی کسی نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔

”اگر رحمت نہ ہو تو آ جائے میں گھر تک چھوڑ دوں گا۔“

”جی نہیں، ہم رکشا کے انتظار میں ہیں۔“

”لیکن بارش ہیڑ ہو رہی ہے۔“

”یہ ہمارا پناہ گاہ ہے۔“

”گوہر..... کیا بد تمیزی ہے کبھی تو غصہ ٹاک سے اٹار کر کہیں رکھ لیا کرو۔“

وہ جو بھی تھا سکرانے لگا۔

”یہ ہماری بھورہ ہی میں دبلے کیوں ہو رہے ہیں۔“



”انسان جو ہیں اور ہمیں بارش میں بھینٹا دیکر ہے ہیں۔ دروازہ کھول لے، گوہر تو ایسے ہی خلیق لڑکی ہے۔“  
اس نے کھلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔

جوہر نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے سیٹ پر بٹھا دیا اور خود بھی بیٹھ گئی۔  
”کڑی چل پڑی۔“

”کس طرف جا رہے آپ کو؟“

جوہر نے جھٹ پورا لہجہ میں بتا دیا۔

”آپ دونوں.....“

”جی ہاں، کنٹین ہیں لیکن مزاج مختلف ہیں۔“

”اچھی بات ہے اختلاف، بیگانہ پیدا کرتا ہے۔“ گوہر نے نظریں اٹھائیں۔ ”دو شراب بھدروں آگے ہیں..... بیک واپس رہتا ہے اسے دیکھ رہی تھیں۔“

”بائی واہ، آپ کی تعریف ہے۔“

”مجھے جوہر کہتے ہیں۔ یہ.....“

”جی ہاں یہ گوہر ہیں جوہر نایاب۔“ وہ ہنس دیا۔

”بندہ بھلے ہے، نہیں بڑا ہائی۔“ اس نے اپنا تعارف خود ہی کر دیا۔

گوہر نے جھڑپوں کی طرف دیکھا ہی نہیں۔

”آج می نے زبردستی بازار بھیج دیا، شاید آپ کی حاضر بھیجا تھا، انہوں نے۔“

”جی؟“ جوہر نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

”جی ہاں یہاں نہ آتا تو آپ لوگوں سے کیسے مل پاتا؟“

”گھر آ گیا، وہ دنوں گاڑی سے اتریں۔“

”جاتا ہوں گوہر جی! آپ مجھے گھر آنے کا نہ کہیں گی، لیکن بہت جلد آپ بلائیں گی، لگتا آپ ہی ہوں گی سب سے زیادہ خاطر مدارات کرنے والی۔ اوکے۔ بہت جلد حاضر ہوں گا۔“

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس گئیں۔

☆☆☆☆☆☆

یہ خدمت بہت جلد دور ہو گئی، تیسرے دن تنگ بڑا دن اپنے بزنس میں بیٹے کا رشتہ لے کر آگئیں جوہر ان کے

بیٹے کو بے طرح پسند آئی تھی، شاید وضوح وار خاندان تھا۔ نہیں بڑا دن کی پسند کا نہیں، زکریٰ تھا۔

بابا جان نے ان کے متعلق ضروری چھان بین کی اور ان کے اصرار پر دنوں میں رشتہ طے ہو گیا۔

جوہر کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، شادی کی تاریخ مقرر ہوتے ہی گھر میں ہنگامے در آئے، گوہر کے شب و روز

کی مصروفیات بدل کر رہ گئیں، دن تو اواز کاظم اور ان کے خاندان ہنستے پہلے آگئے اور وہ غیرہ اکثر یہاں رہتیں، گھر

کے دروازے پر کافیا رنگ و روغن تھوڑی سی جھاوٹ ان سب نے گھر کا نقشہ بدل دیا۔ جوہر کے کمرے میں دن بھر

لڑکیاں جمع رہتیں، ڈھولک پہ گیت گائے جاتے، محلے کی لڑکیاں بھی شریک ہوتیں، بابا جان کا روز گھنٹے کی ذمہ داری

اس پر ڈال چکے تھے، محنت اور اسری دن میں کئی بار کارڈ نے کر شہر بھر میں بے پنے جاتے۔

شہر۔ شہر جانے کہاں تھا۔

شہر کے خیال کے ساتھ ہی اسے ارم لی باتیں یاد آگئیں۔ اس نے ذہن کو چمکایا۔

”بندہ کی کے دن سب لوگ جمع تھے، لڑکیوں نے بسی خاصا اہتمام کر رکھا تھا، انہیں تو شرارتوں کا گھر بنی ہوئی تھی، اب انہی لڑکے والوں کے انتظام میں کھڑے تھے، لڑکیاں نیل کی ہنسی لے کر گئی تھیں۔ بابا جان نے لڑکیوں کو

بال جانے سے منع کر دیا تھا۔

اسری بابا جان کے پاس آئے۔

”بھیا! شہر نظر نہیں آیا۔“

”وہ تو گھر پر تھا ہی نہیں۔“

”عبداللہ پور چلے جاتے۔“

”ظہیر، رہتا تھا اب وہ عبداللہ پور میں بھی نہیں ہے، ماموں جان نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔“

”کیوں؟“

”چتا نکس بابا جان۔“

”بہت برا کیا ہے شہر، نواز نے اولاد اچھی ہو یا مری، اولاد میں کے سائے میں ہی روشن چاہیے تم اس کا پتا کرو۔“

”نہیں کیا؟“

”ہاں یہ بات ہے۔“

وہ خاموش ہو گئے۔

لڑکیاں واپس آ چکی تھیں، سسرالی لوگ جوہر کو بندھی لگانے آ رہے تھے، ٹھکانہ ڈھکی چھٹی۔ رات گئے تک شور مچا جا رہا۔

گوہر کو غینہ آ رہی تھی، وہ بابا جان کے کمرے میں چلی آئی، بغیر لباس بدلے قالین پر دراز ہو گئی۔ دن۔ دن۔

اس ناوقت جانے کون تھا۔ اس نے اٹھ کر فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”ہیلو۔“

”ہیلو گوہر۔ کسی ہوا؟“

اس نے بھی آواز پچھانی۔

”ہاں میں نذرت کا طوفان سا اٹھا اور رکھیں گیا۔ اس نے کرڈل دیا، پھر اچھی پہنائی۔“

”گوہر۔ گوہر یہ میں ہوں شہیر۔“

”جی ہاں، یہ جانتے ہوئے بھی میں بند کر رہی ہوں۔“ اس نے ریسیور رکھ دیا۔

”گوہر کسی عام سی لڑکی کا نام نہیں، شہیر، شکر جی۔ اور اس کا دل برابر سے غیرے کی گزر گاہ نہیں اور تمہارے جیسے

اٹک تو اس دل سے بہت دور، میاؤں، اور بھی نظر آ جانے کے قابل نہیں۔“

اس نے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی۔

فون پھر نہیں بجا جانے کب وہ سو گئی۔

”گوہر۔ گوہر!“ کوئی اس پر جھکا اسے جھوڑ رہا تھا۔

تو پیسے نہیں لیے چلا ہوں۔“  
 ”تم تنگ بو میں اسری بھائی کے ساتھ جا رہی ہوں۔“  
 ”کزن ایسا آپ اس قدر اہمیت کا مظاہرہ کیوں کرتی ہیں آخر آپ میری.....“  
 ”جی ہاں آپ کی پھوپھی ڈاؤ ہوں مگر اچھے کزن! میں خود بھی سجدہ و درود پڑھتا ہوں اور چاہتی ہوں کہ  
 میرے بھئی.....“  
 ”ظہیر کے چہرے پر خون چھٹک آیا اس نے فصیحہ کے لیے سب سے پہلے میں کہا۔  
 ”تھینک یو.....“ اور آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆☆☆☆

اگر بڑے کمرے میں سب لوگ جمع تھے تو لوازو اور ان کی بیگم کاظم اور ان کی بیوی عامم..... صفیہ بیگم مسجد  
 پہنچنے سے دو گھنٹے پہلے اور ان سب کو بڑا ایک چچی جان جن کی عمر اس وقت اسی بیچاسی برس کے لگ بھگ  
 تھی۔ یہ سر عبداللہ کے بھائی کی بیوی تھیں۔ خاندان بھر میں ان کی عزت تھی ہر ایک انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھتا  
 تھا اس وقت بھی سب ان ہی کے ارد گرد بیٹھے تھے چچی جان کی صحت قابل رشک تھی سرخ و سفید نورانی چہرہ  
 باندھی جیسے سفید بان۔ وراثت سلامت تھی بیانی روشن تھی نماز روزے کی پابندی اب تک قائم تھی..... لیکن ہاک  
 تھی تھی بے چاری بے اولاد تھیں پوری زندگی دوسروں کے بچوں کو پالنا دیکھنے کے ان کے ناز و فرے اٹھا کر اپنا جی خوش  
 کرتی رہی تھیں جب سے کلکٹر صاحب کی وفات ہوئی تھی۔ کسی نے انہیں تنہا نہیں رہنے دیا تھا۔ دل لواز تو انہیں  
 مان جیسا احترام دیتے تھے۔ مستقل اپنے ساتھ لے گئے اب شاہی میں شرکت کے لیے اپنے ساتھ لے آئے  
 تھے۔

”اے صفیہ! ایک بل کو تو ہمارے پاس بھی کلو کیا گھن چکر بنی ہوئی ہو..... خبر ہے کام سنبھالنے والے بہت  
 ہیں۔ کرنیں گے سب کچھ۔“ چچی جان نے صفیہ بیگم کو روک لیا۔  
 ”چچی اماں..... میرے بغیر ایک کام بھی مکمل نہیں ہو سکتا اور آج اور کل کا دن ہی باقی ہے پھر فرصت سے بیٹھیں  
 نہ باٹھیں کریں گے، کبھی تو آپ میرے پاس ہی رہیں گی..... جانتے نہیں وہوں کی آپ کو۔“  
 ”چچی اماں منہ دیکھنی محبت پر نہ جائیں۔ آپ کو تو ہماری یاد کھی نہیں آئی کجا آپ۔“ دل لواز نے تاؤ دیا۔  
 ”یہ ہمارا ہے آپ کو چچی اماں۔ چلیے میں تو منہ دیکھے کی محبت کر رہی ہوں اس نے کب اس طرف کا رخ کیا  
 ہے کہ میں زندہ رہے یا گزرتی اچھی ہے یا.....“  
 ”آپ ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ کو خبر تو ہے میری ملازمت کس نوعیت کی ہے بھئی! شاہنواز بھائی جی آپ کے  
 نائب ہیں۔“

”سبحان اللہ یہ ہمارا ذکر خیر کس سلسلے میں؟“ شاہنواز اندر داخل ہوئے۔  
 ”آؤ مہیاں آؤ۔ کب سے تمہارا پوچھو رہی ہوں۔“ چچی جان نے پلٹ کر پرانت کے لیے جھنڈ جالی۔  
 ”نہیں چچی اماں! مشکل جان چھڑا سکتے آیا ہوں آؤ! کاڈان یہاں نہ گزرتا تو صفیہ بیگم کو شکایت ہوتی اور عامم  
 مان تو ویسے بھی ہر دم خنار تھے ہیں۔“  
 ”نہیں بھائی صاحب میں کیوں خنار ہوں گے۔ رشتے ٹوٹنے سے نہیں نہیں ٹوٹے۔ صرف صفیہ کا ہی نہیں میرا بھی  
 آپ سے رشتہ ہے یہ رشتوں کو محبت نجر ہی ٹکاؤ سے ویکا جائے تو خوب صورت اور دل کش لگتے ہیں۔ بدگمانی تو

اس نے آنکھیں کھولیں وہ ارم تھی۔  
 دروازے میں ظہیر کھڑا تھا۔  
 ”زیادہ سونا صحت کے لیے اتنا بھی مفید نہیں پاپا آئیے آپ کے خاص مہمان آئے ہیں۔“  
 ”میرے مہمان۔“ اس نے پوری آنکھیں کھولیں۔  
 ارم سرگرمی تھی سچی خیر انداز میں۔  
 ”ہاں جن کے بغیر یہ ساری محفل آپ کے لیے بے رونق تھی۔“

گو ہر کو ارم کی توجہ..... پینے والی تھی یا تو تھی۔  
 ”معاف کرنا میرے لیے سب مہمان بن جائیں۔ میں اپنی کوئی بات نہیں۔“  
 وہ اٹھ بیٹھی جلدی سے بال درست کرتے ہوئے ”پنہ مہیا۔“  
 ”مختار! کیا ہم آپ کو خاص مہمان نظر نہیں آ رہے۔“ چچی جان نے سب سے پہلے کہا۔  
 ”آتے ہیں۔“ ظہیر اندر آ گیا۔  
 ”کیسے ہیں ظہیر بھائی۔“ اسے ظہیر کا انداز تشکو نہ بھایا۔  
 ”آپ کے سامنے ہیں..... دیکھ لیجئے.....“ نیلی پیٹ اور سر کی شرٹ میں وہ خاصا خوب صورت لگ رہا تھا۔  
 ”وہ تو دیکھا ہی کرتی ہوں میں نے حال پوچھا تھا۔“  
 ”کیا نہیں اچھے ہیں کہ رہے..... میں متا عرض ہے کہ آپ کی نظر کرم پر منحصر ہے ہماری حالت زار۔“ گو  
 چہنے لگی۔  
 ”ظہیر بھائی..... پلیز..... ایسی منظر صحت قسم کی گفتگو سے پرہیز لازمی ہے۔ ورنہ حال پتلا ہوتے دیر نہیں  
 کی چلو ارم! کچھ ناشتے وغیرہ کی فکر کریں اور آپ جناب تشریف لے جائیے۔ بھت بھائی کے کمرے میں  
 ناشتے کی طالب ہو تو وہیں پہنچائے دیتے ہیں۔“  
 وہ ظہیر کو وہ کھڑا چھوڑ کر باہر آئی است ارم بھی ساتھ ہوئی۔

☆☆☆☆☆☆

”جو ہر آ پاپا..... خدا کے لیے اب تو اپنی خواہشات کے جنگل سے نکل آئیں! غار منی طور پر ہی سہی پھر نہیں بھائی  
 کی جان نا تو اس اور بھاری جیب جاسنے یا آپ جاتیں..... میں تو بازاؤ کے چکر لگانا کے لگ آ چکی ہوں۔“  
 ”نہیں یہ آخری پھیرا ہوگا۔ اس کے بعد تمہاری چھٹی..... صرف ایک دو پینڈ ہی تو بھیج کرتا ہے یا ایک سیٹ لے  
 ہے۔ آج کا وعدہ کیا تھا چلو لے..... ایک تو یہ کم بخت کبھی سچ وقت پہنچ نہیں دیتے۔“  
 ”ڈیر ائن بھی تو آخر عرض سے اترا ہوا تھا ہاتے ہاتے وقت تو لگے گا۔ آپ کے ذہن کی اختراع کو سمجھ جا۔  
 والے قابل ترس ہیں۔“  
 ”بس، بٹو اس ہنڈ کمرہ اور سیدھی طرح جاؤ۔ دیکھو! ساری کو ساتھ لے جاؤ۔“  
 ”اوہ کے مہم..... آنکھیں دکھانے کی ضرورت نہیں۔“ وہ اسری کی طرف چلی۔  
 ”کیا بات ہے آپ کو کہیں چانا ہے کیا۔“ ظہیر کمرے کے دروازے میں بل گیا۔  
 ”جی ہاں بازار تک.....“



باپ جیے کو بھی ایک نہیں رہے رہتی۔"

"شاہنواز..... اس خاندان کے تم میرا دو ہو..... خاندان کو بچا رکھنا تمہارا فرض ہے۔" چچی جان نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"چچی اماں یہ عاصم بھائی ہی ہیں کئے کئے اور جدا جدا رہتے ہیں۔ ہم نے تو سدا نہیں تریب رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یا جان تو ساری عمر یہی ہی آرزو کرتے رہے کہ....."

"چھوڑو بے بھائی جان..... ہر شخص اپنے معاملے میں آزاد ہے۔ عاصم بھائی اپنے اہل خاندان کے ساتھ خوش ہیں اپنی کمائی کھا رہے ہیں۔ ہم سے مل گیتے ہیں اور کیا چاہیے..... اور اب تو ماشاء اللہ شہری بخت اور اسرا ترقی کی منزلوں پر چل نکلے ہیں۔ بڑے آدمی بن جائیں گے ہم سب کو خوش ہوئی اور وہ گوہر بنیں..... ماشاء اللہ وہ بھی بڑی ذہین بنی ہے۔ مجھے تو بے حد پسند ہے..... اگر میرے بیٹے گوہر سے چھوٹے نہ ہوتے تو میں اپنا دامن عاصم بھائی کے آٹے پھیلا دیتا۔"

دلنواز صلح کل قسم کے بندے تھے خوش گوار سمجھ میں کیے جا رہے تھے۔

"ارے تمہارے بیٹے چھوٹے ہیں تو کیا ہوا خیر سے شاہنواز کے بیٹے تو موجود ہیں جو ہر کی قسمت میں ہیں تھا۔ اسے فیروں کا گھر یاد کرنا تھا۔ لیکن گوہر کو کسی اور جگہ بیابان کی اجازت میں ہرگز نہ دوں گی۔ سبھی عاصم میاں....." عاصم خاموش ہو کر رہ گئے۔

"یہ تو میری خوش نصیبی ہوئی چچی اماں گوہر بننا تو مجھے بھی بہت اچھی لگتی ہے۔"

سعیدہ بیگم نے اپنی جگہ پہلو بدلا۔ کاظم نے دلچسپی دکھاہری۔

"ابوں میں تو کوئی حجاب نہیں ہونا شاہنواز بھائی..... آپ حکم کریں عاصم بھائی انکار کر سکتے ہیں بھلا۔ بھائی آپ ہی نے روایتی انداز میں جموٹی پھیلائی ہوتی اپنی منہ کے آگے....." کاظم نے مسکرا کر سعیدہ بیگم کی طرف دیکھا۔

"کاظم بھائی ابھی تو بچے زیر تعلیم ہیں اظہیر تو ماشاء اللہ فارن جا کر ہی تعلیم مکمل کرے گا۔ گھر کی بات ہے مجھے تو بے حد سونے ملے گا۔ گوہر بنی کو اپنی بہن بنا کر۔"

"اے بیٹی! خدا خدا کرو بڑے بیٹے کو چھوڑ کر چھوٹے کی بات کرنے لگیں..... اے ذہنی صافی اتنی نادان نہیں ہیں نہ ہی شاہنواز کم عقل ہیں۔ بن ماں کا بچہ ہے..... پچھو چچی کے دامن میں جگہ پا کر ماں سے وہ رہی کاظم بھول جائے گا۔ شاہنواز ہم نے تو بچے کو دیکھا ہی نہیں۔" چچی اماں کی ہنسی رکھنے کی قائل نہ تھیں۔ شاہنواز نے یکبارگی سب کو دیکھا۔

"ہاں بھائی جان شہیر نظر نہیں آیا۔ بھئی ہم نے اور ہماری بیگم نے تو بہت ہمت افزائی کی تھی شہیر کی..... بیگم کا امر اور تھا نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے فوراً آپ کو لکھ دیا تھا کہ حویلی اسکول کے لیے دے دیں۔"

شاہنواز کا رنگ رخ بد نہ لگا۔

"شہیر ہے کہاں بھئی شاہنواز.....؟ پچھلے دنوں ملاقات ہوئی تھی تمہارے بیٹے سے پھر نظر ہی نہیں آیا۔"

اتنے سارے لوگوں میں وہ کچھ نہ کہہ سکتے تھے اور بتاتے بھی کیا نہیں تو خود خبر نہ تھی۔

"وہ گھر پر تھرا ہی کہاں ہے ہن تو از بھائی..... پتا نہیں کہاں گھر بتا ہے۔"

"یونہی ہی میں داخل ہو رہے ہیں۔ میں نے بھائی جان کو لکھا تھا۔ شہیر کو میرے پاس بھجو دیں۔ مگر کسی نے

باب تک نہیں دیا۔ پورا ایک سال ضائع کر دیا ہے آپ نے اس کا۔"

"میں نے نہیں دلنواز خواہ اس نے تمہارے پیچھے نہ۔"

"یہ کیسے؟"

"اوہ کسی اور مزاج کا نر کا ہے..... اس میں اور مجھ میں زمین آسمان جتنا فرق ہے جانے کن کن چکروں میں ہے۔ ہدفی موسیقی نے اسے خراب کر دیا ہے۔ راست تو دوست دوستوں کے والدین بھی اسے پکڑنے میں اس نے ساتھ ہیں۔ سعیدہ سے پوچھیں..... انہیں ان کے ملنے والی خاتون نے بتایا ہے کہ شہیر کا ایک دوست اسے اپنی

بہن دینے پر تیار ہے اور آج کل شہیر کا قیام ان ہی کے ہاں ہے۔"

"بھائی جان! یہ اچھی بات نہیں ہے..... آپ نے اس پر کنٹرول کیا ہوتا۔"

"وہ ان کے ہیں۔ سے باہر کی چیز ہے دنہ از بھائی؟ سعیدہ نے جھٹ کہا۔

"ہرا بھگن کا توئی نہ توئی مل ہوتا ہے بچہ..... میں نے جس نکال لیا ہے اور شاہنواز اور عاصم..... تم دونوں میرے آگے بچھو لو گے نہ ہی تمہاری بیویاں۔"

"ٹھیک ہے چچی اماں۔" کاظم اور دلنواز نے تائید کی، لہجہ پر جوش اعزاز میں اپنی جگہوں پر سیدھے ہو

اٹھے۔

ہر اصل یہ ساری بیٹا ٹھیک ان دونوں کی ہی تھی۔ ان دونوں کو عاصم اور شاہنواز کا اشتکاف، اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ

انہیں رشتہ دار کی ایک خوب صورت سنہری زنجیر میں باندھ دینا چاہتے تھے اور کاظم ہوں یا دلنواز دونوں کو ہر سے یہ

خون و آفتاب تھے شہیر دونوں نے دیکھا نہیں تھا۔ لیکن اس کے بارے میں سن چکے تھے اور سن کر اس کا ایک خیالی

بیر دونوں نے اپنے ذہنوں میں بنالیا تھا۔

"آج خیر سے جو ہر بنی کی رخصتی ہے کلک ویسے برسوں اس گھر میں ایک اور تقریب ہوگی۔"

"وکیسی تقریب؟" عاصم نے جھٹ کہا۔

"میں نے کہا تھا تاہم نئے کا حق کسی کو نہیں....." چچی جان نے رعب جھارا۔

"پھر آئی....."

"پرسوں میں گوہر کو بھئی پہنارہی ہوں۔"

"چچی اماں..... سفید رو باکی ہو نہیں۔"

"ہاں بیٹی! خدا ہر کا خیر کا اجر دیتا ہے۔ ہے ہاں کے بچے کو سینے سے لگا کر تم کو اجر ملے گا۔"

"چچی اماں....." جانے کتنے لوگوں نے ایک ساتھ کہا۔

"ہاں ہاں! اچھی وہ بیگم کی تم لوگ فکر نہ کرنا..... وہ میں ساتھ لے آئی ہوں۔"

"چچی اماں..... چچی اماں! میری بات تو سنیں۔ آپ تو یہاں بیٹھی آرڈر دے رہی ہیں اور موصوف کو ہم

نے ہی الوقت دیکھا تک نہیں ہے۔" دلنواز نے شوخی کے ساتھ کہا۔

"ہاں بھئی! اے ہلہا بیٹے! آخر ہم لڑکی کے چاچا ہیں۔ کچھ ہارنی رائے کا احترام بھی ہوگا۔ دیکھے ہا ہا ہا

بیٹے کر دیں۔" کاظم نے بھی دلنواز کا ساتھ دیا۔

"کیا تمہیں اپنی سفید پوش سے والی چچی کا اختیار نہیں۔"

"ہاں جناب! اعتبار دلانے والے بھی کون جنہوں نے خود ایک جھٹک نہیں! بھئی۔ چچی اماں آپ لڑکی کی

"مے ٹوٹے..... یہ تو کہہ رہا ہے..... تو۔ جس کا یہ سارا منصوبہ ہے۔" چچی جان نے آنکھیں دکھائیں۔  
سب نے دنوا کی طرف دیکھا سعید و بیگم کی نگاہوں میں حیرت و رآئی۔

"یہ کیسا فیصلہ ہے دنوا؟" شاہنواز نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"بہت اچھا فیصلہ..... بہت دن میں نے اس معاملے پر سوچا ہے اور یہ فیصلہ مجھے ہر طرح سے مناسب لگا ہے۔  
میں آپ کا بھائی ہوں۔ مجھے ایسا کرنے کا حق ہے۔"

"اگرے بابا سارے حق ہیں سارے ہی حق ہیں..... مگر وہ بھی تو ہونا جس کی منتقلی کا اہتمام چچی جان کی بیٹی  
ہیں اور عام بھائی اور صیف سے پوچھنا بھی لازمی ہے۔"

عام مہر جھکائے بیٹھے رہے۔ مضیہ بولیں۔

"دنوا! بھائی جان کے دل میں ہمارے لیے کوئی نفرت ہو تو ہوا ہم نے تو انہیں اپنے سے جدا کبھی نہیں سمجھا۔  
رہا ذات شہیر اور گوہر کی..... تو خدا نے مجھے یہ کہنے کا موقع دیا ہے میں نے پوری زندگی عام کی رضا کو اپنی سچ  
سمجھا ہے۔ کبھی کسی معاملے میں اپنی رائے کو اولیت نہیں دی۔ لیکن آج اگر عام کو اختلاف بھی ہوتا میں یہی کہوں  
گی کہ میری بیٹی کے لیے اس سے اچھا شریک حیات اور گھن نہیں ہوگا شاید وہ حق ادا ہو جائے جو ہم سب تے  
شہیر کو نہیں۔ یاد۔"

"تو ہم اللہ کریں چچی اماں! دیر کس بات کی ہے انگوٹھی پرسوں ہی کیوں آج ہی کیوں نہ پہناریں۔ مگر کیا  
انگوٹھی ٹوٹے کے بغیر اس کی رضا مندی کے بغیر بھی پہنائی جاسکتی ہے؟"

"اے لو..... آج کل شادی بڑے کی غیر حاضری میں..... ہو جاتی ہے یہ پھر بھی ایک منتقلی ہی ہے۔"

"اگرے کی رضا نارضا کی ذمہ داری ہم پر ہے آپ لوگ گوہر سے پوچھ نہیں آیا! آپ گوہر کو آگاہ کر دیں۔"  
"ایہ ضروری نہیں ہے۔ جو ہرگز شادی بھی ہم نے اپنی مرضی سے طے کی ہے گوہر کی بھی اپنی مرضی سے  
کریں گے۔ لیکن چچی اماں میں ایک دو دن سوچنے کی سہلت دیں۔" عام فوراً کہہ اٹھے۔

"ٹھیک ہے سوچ لو۔ لیکن یاد رہے کہ انجام اثر رہی ہونا چاہیے انجان نہیں۔" چچی اماں نے پھر رعب جھاڑا۔  
"چھری تلے دم تو لینے دیں چچی اماں۔" عام مسکرائے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

گوہر اور امری کو بازار آئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ نہ دو پتہ تبدیلی ہو سکا تھا نہ سیٹ تیار تھا۔ امری اسے لیاقت  
باشا کی یہ کمرے دایس لایکے تھے ہنوز وہ نہیں۔

مڑک پر کھڑا ہونا بھی معیوب لگ رہا تھا اور وہ کان پر بیٹھنے کے لیے گوہر تیار نہ تھی! امری اسے لے کر پارکنگ  
سے پاس آئے وہ ایک طرف کھڑی منہ ہار رہی تھی۔

"میں تو سخت لر جک ہوں! امری بھائی۔"  
"کس بات سے؟"

"میں لڑکیوں کے فیشن اور بلیوسات سے..... بھنا جو ہر آیا کا نینا گھونٹا اگر وہ آج کے دن ہمیں یہاں نہ  
پہنچتیں۔"

"بھئی ایک منٹ اس سامنے والی دکان سے تھوڑے سے پھول خریدوں تم نے یاد دلایا! آپا تو جان نکال  
تیں میری۔" وہ بھاگے بھاگے سامنے کی دکان پر گئے۔ گوہر بے بسی سے انہیں چاہتا دیکھتی رہی۔

"شہی پلیز..... پلیز شہری اون لی غائیہ منٹ روکنا..... شہی..... شہی کے بچے....."

تدبیر کے کالوں میں آواز گھسکتی چلی گئی۔

اس نے دیکھا..... سامنے مڑک پر ایک نوجوان لڑکی بڑے زور واد سے کسی کو پکارتی آگے بڑھی جا رہی تھی۔

اس کے آگے تھوڑے سے قافلے پر وہ شہیر کے سوا کوئی نہ تھا۔ جس نے مڑک دیکھا تک نہ تھا۔

"شہی.....؟" لڑکی زور سے جھتی تو وہ مڑک گیا اور پیچھے مڑک دیکھنے لگا۔

"بہت دیر ہو جائے گی باقی چیزیں پھر بھی لے لینا۔"

"جی نہیں..... میں ابھی اور اسی وقت لوں گی تم نہیں اتنا دم ہے تو مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ۔"

اس نے ہار مان لی اور واپس آ گیا آبادی رنگ کے عوامی سوٹ میں چہرے پر زمانے بھر کی بٹاشٹ لیے وہ  
ان سے ہندوہ بیس قدم دور تھا۔

"بہت تندی ہو تم..... اور پھر مجھ میں اتنی بہت بھی نہیں عذر کہ تمہیں خفا کر سکوں۔" وہ قریب آ چکا تھا اور اس  
زنی سے مخاطب تھا جو کچھ کے خوب صورت احسان چہرے پر سجائے اسے دیکھ رہی تھی۔

"چلو اب..... یہاں چہرہ تمہارے شو فر کا کردار بھائی لے گا....."

"تم نے آئینہ دیکھا کبھی..... اتنے خوب صورت اور ہنڈ سم نو جوان بھی شو ظر ہوئے کبھی۔"

شہیر نے چلتے چلتے اپنے سر اپا کو اوپر سے نیچے دیکھا۔

"میرا خیال ہے تم سچ ہی کہہ رہی ہو عدی نے سن لیا تو جل بھن جائے گا عذرا! پلیز یہی بات ذرا تم اس کے  
سے کہہ دینا زندگی بھر تمہارا احسان رہے گا۔ وہ خود کو بہت کچھ سمجھتا ہے۔"

"کہہ دوں گی..... کسے میں میرا کیا جاتا ہے اور پھر وہ مجھے تم سے زیادہ عزیز تو نہیں مہی تم تو مجھ اپنا جان سے  
زیادہ پیارے ہو خدا کی قسم تم پر تو مجھے بہت زیادہ مان ہے اتنے اچھے جو ہو اسی لیے کبھی بھمار رعب جھاڑتا  
ہوں۔"

"رعب و رعب کچھ نہیں باگڑاؤ کی..... یہ جو تمہارا مان ہے جتنا خواہو! کا بس اسے ہی گانم رکھا کرتا ہوں۔" دونوں  
اس دے۔ گوہر دیکھتی رو گئی! وہ بازار کی بھیڑ میں انہیں کھو گئے۔

"تو ادم نے جو کچھ بتا ہا خدا وہ سچ ہی تھا۔" اس کی آنکھیں بھرا آئیں۔ وہ دیکھنے لگا! امری واپس آ گئے۔  
"کیا سب گوہر.....؟ ارے بھی تم تو کسی شہی ہی چچی کی طرح رونے لگیں۔ ٹھکر نہ کرو..... مجھ سے کچھ بھی نہیں تو  
تھر پینچ جاؤ گی....." گوہر نے چپک کر اپنی صورت جان پر غور کیا اور آنکھیں سٹیڈ پابہ سے صاف کر لیں۔

بازں پھر مارکیٹ کی طرف آ گئے جو ہر کی مطلوبہ چیزیں لے کر گھر کی روانہ ہو گئے۔  
تقریب کے دوران اسے کسی پل چھن نہ آ سکا خود کو کام میں مصروف کیے وہ اپنے دل کا یہ ٹھسا سا غم بھول جانے  
کی کوشش کرتی رہی رخصتی ہو گئی۔ ہٹائے ایک دم ختم گئے کٹر کسی اجڑے چمن کی طرح ویران نظر آنے لگا۔ کام  
تاج نے سب کو حور و نہہ تھا دیا تھا جس کو جہاں جھمکی سو گیا! گوہر کو صبح سے ہی قرار نہ تھا۔ رات گئے وہ دودھ کا

گلاس لے کر ڈنوار ماموں کی طرف گئی، وہ ہلکے پر نیم دراز جانے کیا سوچ رہے تھے۔ ممانی وہاں موجود تھیں۔

”آؤ گوبر بیٹے..... میرے پاس بیٹھو۔“

”آپ کے لیے دودھ لانا گئی، ماموں جان!“

”دودھ بھی پی لیں، گے پہلے تم بیٹھو تو سہی۔“

وہ دودھ کا گلاس تپائی پر رکھ کر ان کے قریب بیٹھ گئی۔

”بیٹے آج سارا دن ہم آپ کو بہ خورد کیٹے رہے۔“

”مجھے..... وہ کیوں ماموں جان؟“

”وہ اس لیے کہ تم ہمیں خاموش چپ اور پریشان نظر آ رہی تھیں۔“

”میں تو میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔“

”بیٹے چشیاں مہائے گھر جانے کے لیے ہی ہوتی ہیں آج جو ہر گئی، کل تمہیں بھی جانا ہوگا۔“

اس نے سر جھکا لیا۔

”میں اپنا دوست سمجھو گوبر بیٹی۔ شاید تمہیں خبر نہیں ہمیں اپنی انھوتی بہن یعنی اپنی آپا سے اتنا جدا پیار ہے اور

اسی ناستے تم ہمیں بہت پیاری ہو۔“

انہوں نے گوبر کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ماموں جان اس کی خبر تو مجھے بھی ہے آج آپ بھی..... معاف کیجئے گا ماموں جان آپ بھی مجھے بہت پیار سے

سنگ رہے ہیں۔“

ڈنوار میں ویسے وہ بے حد شفیق انسان تھے محبت سے پیش آنے والے ان کی بیوی ان سے بھی زیادہ بااخلاق

تھیں، تھیں تو کہیں بھی نہ ٹکے والی چچی جان کا دل سوہ لیا تھا، دونوں میاں بیوی سنے۔

”گوبر بیٹے..... شہیر نظر نہیں آیا آج تو اس کی شرکت لازمی تھی۔“

”ماموں جان! ہر انسان کی مصروفیات اور انوائڈمنٹس کا اپنا اثر ہوتا ہے ان کے دائرے میں ہم لوگ شامل

نہیں ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”شاید انہیں ہم سب کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ہمیں بیٹے! ہم ہی اس کی سب سے بڑی ضرورت ہوں گے، وہ ہم سے جدا ضرور رہنا ہے جدا ہونے نہیں سکتا۔

میں نے بلکہ ہم سب نے سوچا ہے کہ اسے ایک خوب صورت بندھن ملے جگہ کہ قیدی بنا لیا جائے۔“

”کیا مطلب ماموں جان؟“

”بیٹے! تم ایک باشعور اور سمجھ دار لڑکی ہو، تم سے صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں، تم میرے اس معیار پر

پوری اترتی ہو جو شہیر جیسے لڑکے کی بیوی کے لیے میرے ذہن میں موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک دو دن میں

انگوٹھی پہنانے کی رسم ادا کر کے تم دونوں کو ایک بندھن میں باندھ دیا جائے، گوبر بیٹی میں تمہارا ماموں ہوں تو

شہیر کا چچا۔ تم دونوں ہی مجھے عزیز ہو اور تم دونوں ہی میری خوشی۔ میں نے تم سے یہ بات اس امید کے ساتھ کہی

ہے کہ میرے انتخاب پر تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

چچی! تم یہ سن کر حیران ہو جاؤ گی کہ میری اور اس کی ملاقات آج تک نہیں ہوئی، اس ایک رد خطوط کی حد تک

حامل ہے یا پھر بھائی جان کی زبانی جو کچھ سنا ہے اس کے تحت میرے ذہن نے اپنے پیچھے کا ایک خاکہ تیار کر

یا اور اسے خاکے میں خوب صورت رنگ تمہارے تمہارے بھرا دیے ہیں۔“

گوبر ہم صدمہ بخشی جانے کیا کیا سوچتی رہی۔

”بچھلے دنوں شہیر بابا میرے پاس آئے تھے، شہیر بابا ہمارے برسوں پہانے ملازم ہیں، انہوں نے شہیر کے

بارے میں بہت کچھ بتایا، یہ نوجوان میرے اس آئینڈیل سے میل کھاتا ہے جس کی ضرورت اس وقت اس

حاضرے اور ملک کو ہے۔ ہر اچھے مرد کے پیچھے ایک اچھی عورت ہوتی ہے، گوبر اور میں چاہتا ہوں کہ قدم قدم پر

اس کی روشنی و صلاح کار اور شہیر تمہارے سوا کوئی نہ ہو، سو چو تو ذرا شہیر نے جو ماں کی ناپ کی نکل خاندان کی محبت

سے محروم رہا۔ کتنی اچھی طبیعت پائی ہے اگر اس کا ستر تم جیسی لڑکی کی مراد ہی میں کتا تو وہ کیا بن جائے گا۔ متحرک

زندگی مجھے پسند ہے میری بہت خواہرا اور دوسری خواہش یہ ہے کہ برسوں کا کھرا خاندان پھر کچا ہو جائے گا۔ مجھے

آج رات سوچنے کے بعد جواب دو کہ میری یہ تجویز کبھی ہے۔“

”جی ماموں جان میں سوچ کر کبھی جواب دوں گی۔“ وہ چلی آئی۔

☆☆☆☆☆☆

رات کے باقی لیجئے وہ سو نہ سکی۔ بیواؤ عسکری کی باتیں ارم کی نظر پر لگتی..... شہیر اور اس لڑکی عذرا کا سراپا ان کی

پے نکلشی..... ہر چیز اس کے ذہن میں گردش کرتی رہتی۔

صبح سب لوگ جاگ چکے تھے لیکن وہ ہنوز بستر میں تھی لڑکیوں نے اسے ذرا ہنسی اور تیار کر لیا۔ چونکہ

سب کو جو ہر کے ہاں جانا تھا۔

ارم اس کے کمرے میں موجود بالوں میں فرش کر رہی تھی۔

”کچھ سنا تم نے گوری؟“

”کچھ نہیں.....“

”چچا جان نے تمہیں شہیر بھائی کے لیے پروپوز کیا ہے۔“

گوبر نے کوئی جواب نہ دیا۔

”خواہو اور ہی..... میں نے تو سوچ رکھا ہے، تمہیں شہیر بھائی کی دہن بتائیں گی..... اوف..... کہاں شہیر بھائی

ساید مزاج انسان اور کہاں گریبا تھی گوبر..... شہیر بھائی تو تمہیں بہت چاہتے ہیں، جی جان سے عزیز رکھیں گے۔ تم

شہیر کے لیے اظہار کرو، گوری، ہم بہت جلد شہیر بھائی کے لیے تمہیں مانگ لیں گے۔“

”ستوارم..... میری زندگی کوئی فالتو شے نہیں ہے نہ اسے نارغ ہیں تمہارے شہیر بھائی ہوں یا شہیر بھائی

مجھے کسی سے کوئی دلچسپی نہیں، اپنی بات کا بوجھ اٹھانے کے لیے میرے اپنے ہی کندھے کافی ہیں۔“

اس نے قطعیت سے ایک بات کہی اور کرا پھرا گئی۔

☆☆☆☆☆☆

چوہر کے انگ انگ میں سرقتوں کی، بجلیاں رقص کرتی، نظر آ رہی تھیں انہیں نے تو وہ واقعی اپنے خوابوں کی دنیا پا

ئی تھی، سبز خواب کے شرار دوسٹ میں بے حد دل کش اور من موٹی نظر آ رہی تھیں، نیل بھائی پاس ہی مونس نے پر

پٹھے تھے.....

”آئیے آئیے جتا پھالی صاحبہ!“



اس کے استقبال کو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”تشریف رکھیے جناب! ہمیں ایسا استقبال کی ضرورت نہیں۔“

”آپ کی بہن صاحبہ کی بار آپ کا پوچھو گی ہیں انہی کو پھر پہلے ان کے ماموں حضور تشریف لائے تھے، تجھیے میں جانے کیا باتیں ہوئیں تب سے تو آپ کے لیے اور بھی بے چین ہیں۔“  
گوہر کا ماتھا خشکا۔

جوہر نے اسے پیار سے دیکھا۔

”آؤ گوری..... بڑی سنگ دل ہو یہ وقت آنے کا ہے بھلا..... میں صبح سے.....“

”جھوٹ نہیں، جھوٹ نہیں..... کسی کا انتظار، انتظار نہیں آپ کی ہم شیر کو..... بلکہ یہ تو شکوہ کتناں ہیں کہ لوگ ہماری خلوت میں ظل اندازی کر رہے ہیں، چاہے ساج سے بچاؤ کا سرٹیکٹ پاتھ میں ہو تب بھی ظالم ساج اپنا کام دکھانے سے باز نہیں رہتا۔“

جوہر سرخ ہو گئیں..... پناہ بھری نگلی سے نینل کو گھورا..... اسے میں لڑکیوں کا رونا کمرے میں آ گیا اور میں باہر چلے گئے۔ خرا کر جوہر نے گوہر سے پوچھا۔

”گوری! دن تو آواز ماموں نے رات تم سے کون بات کی تھی؟“

گوہر کا شک یقین میں بدل گیا۔ جوہر کو خبر ہو چکی تھی۔

”ہاں.....“

”پھر تمہارا کیا جواب ہے؟“

”کیا ہوتا چاہیے میرا جواب؟“

”ہاں اور کیا.....“

”وہ بول۔“

”شہیرا ایک اچھا لڑکا ہے۔“

”مگر آپ کی نظر میں میری نظر میں نہیں۔“

”کیوں؟“

”آپ کی کیوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں، میں اس رفاقت سے انکار کرتی ہوں۔“

”گوہر! تیا بہن بات تم ماموں جان سے بھی کہہ دو گی۔“

”ہاں۔“

”وہ کیا سوچیں گے؟“

”جو نہیں سوچیں.....“

”میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ تیرا یہ شہیرا سے خاندان کا منگولو ترین لڑکا ہے۔“

”میں نے منگولوں کی ذہنی کاٹھیک نہیں لہرکھا اور منگولوں کو آپ کے خیال میں ہے وہ حقیقت نہیں ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہیں؟“

”جی کہہ رہی ہوں۔“ میں نے منہ پھلایا۔ بات وہیں رہ گئی۔

”تو جوہر! پس چلی گئیں۔ اماں نے اسے اکیلا پا کر بات شروع کر دی۔“

”جوہر سے کیا کہا ہے تم نے؟“

”وہی جو میرا فیصلہ ہے۔“

”تم کیا اور تمہارا فیصلہ کیا؟“

”میں ایک عاقل و بالغ، باشعور لڑکی ہوں اماں۔“

”ہرگز نہیں! دنوں ازلے غلطی کی جو تم سے پوچھا۔“

”تو کیا کرتے؟“

”چپ چپ تے انگوٹھی پہنا دیجئے۔“

”کیا میں ہمیں لیتا؟“

”کیسے نہ پہنتیں۔“

”واہ زہد تھی تو کسی صورت نہیں ہو سکتی۔“

”اگر ایسی بات ہے تو زبردستی ہی ہوگی۔ کل تمہیں انگوٹھی پہنائی جانے گی۔ وہ تم بہت بھری محفل میں انکار کر

یا۔“ اور صاحبزادی اچھا بندہ ہے رشتہ بہرہ تم تو نہیں نہیں رہتی۔“ میں نے تم تو یوں ہی خاطر پورنی زندگی

پہننا۔“ اس نے کہا۔ یہی سنی سنی ہے رشتہ بہرہ۔“ جانی ہونا تمہارا وجود وہ پھر سے خاندانوں

ہونے کا جہان ہے۔ ماں کی خوشی ہلاکت تمہیں منگولو ہے، اسے لو دکھتے لو جتنے چاہو۔ میں نے بھی اس

ذمہ لیا ہے..... کل ہی یہ صر جھوڑ کر چلی جاؤں گی، میسے والوں کو بھی کی وہ روٹیاں کھلی ہماری نہیں ہوتیں۔ تم

خوش رہتا..... ساری زندگی تمہارے باپ نے اپنی منوا کی ہے ایک بات میری مانی تھی کہ باپ کی جگہ تم نے

لے لی۔ باپ نے سکھایا ہوگا تاکہ چلو بات رہ جائے اور ضد بھی پوری رہے۔“

”اماں! آپ بابا جان کو ان تمام بند میں انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا جو کچھ کہا ہے میں نے خود ہی کہا ہے.....“

”بپ کا ہتھیار وہ نہیں جو آپ چاہتی ہیں۔“

”پچھیں کیسے خبر ہے؟“

”ہے نا مجھے خبر۔“

”ظلم خبر ہے تمہیں۔ وہ اتنا سعادت مند اور لائق ہے کہ انکار نہ ہی نہیں سکتا، کیا چاہتی ہو تم، کہ میں اس بہانے

اپنے محروم ہونے کو کیجے سے نہ لگ سکوں، بہر حال کل شام تمہیں انگوٹھی پہنائی جائے گی۔ تمہارے انکار کی صورت

میں میرا دخل رہتا ہوگا جو میں نے کہہ دیا ہے۔“

اماں غصے میں بھری کمرے سے باہر چلی گئیں۔

وہ پھر باہر نہیں آئی، دوسرا دن طلوع ہو گیا، جوہر آیا، گیارہ بجے بجے آئیں، شام کی تقریب کے لیے تھوڑے

تھوڑے کتے کافی لوگ مدعو کر لیے گئے تھے۔ اماں بھائی! دنوں ماموں کا ظلم چھا..... اور بھائی جانے کیا کیا خرید

لائے۔

جوہر اپنے اسے آتھی گلانی رنگ کا کاٹھار سوٹ پہنایا، کیوں..... اسے طبع آزمائی کی اس کے چہرے

پاک کر لیا، لگے دینے میں اس کا چاند چہرہ چمکنے لگا۔

عجیب و غریب رسم تھی جس میں لوگ افسردہ دلی کے ساتھ ٹریک تھے، لڑکا سرے سے موجود نہ تھا اور لڑکی اپنے

تذبات و احساسات پر بند بندھے ماں کی خاطر قربانی دینے چلی تھی۔ داناں میں بچے میٹوں اور کرسیوں پر سب

برا بھان تھے۔ ارم اور شازیہ بھی سب میں موجود تھیں اور سعیدہ بیگم بھی وہاں کی ماں کی حیثیت سے۔

لڑکیاں گوبر کو لے آئیں صنفیہ بیگم کی نظریں اپنی بیٹی کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

بچی پھر اپنی تھی جانے کس سبب اتنی خفا تھی۔ پھر بھی ایک مشرقی لڑکی ہونے کے ساتھ شرم و حیا میں چھتری اس وقت نہ جاتے ہوئے بھی ایک بندھن میں بندھ جانے کے لیے تیار تھی۔

صنفیہ بیگم کا دل بھرا آیا آگے بڑھ کر نبیوں نے گوبر کی پیشانی چوم لی۔

خاندان کے دستور کے مطابق بچی جان نے بزرگ ترین سستی ہونے کے اعزاز پر گوبر کے ہاتھ میں شاہناز کی لائی ہوئی انگلی پھینکی اور چاروں طرف سے مبارک سلامت کا شہرچہ گویا شاہناز نے سب سے پہلے گوبر کے ہاتھ پر روئے رکھے پھر باری باری سب نے کچھ نہ کچھ دیا۔

”خدا خوشی کے نئی دن دکھائے پھر بھی اس محفل میں موجود ہونا تو کتنی رفتی ہوتی۔“

”اوپر..... اس فرسودہ رسم و رواج کے بارے ماحول میں شادیاں دو دلوں کی خاطر ہوتی ہی کب ہیں وہ جسمانی طور پر موجود ہونا روحانی لحاظ سے بھٹے جہاں نہیں ہوتا سب خوش رہتے۔ آخر ہمیں فکر کرنے کی ضرورت ہی کیا لڑکیاں تو سدا ہاں باپ کے نظریہ ضرورت پر قربان ہوتی چلی آئی ہیں۔ کبھی جاگنا دے لیے کبھی رشتوں کے استحکام کی خاطر کبھی کسی اور مجھیری تلے دب کر۔“ اس نے کچھ لیتے دل و دماغ کے ساتھ سوچا۔

”شاہناز! پہلی فرصت میں اسے گھرا ڈاؤر دلتواڑ کے پاس بھیج دتا کہ وہ مجھ سے بڑھ لکھ سکے۔“

”جی بہتر چنگی اماں۔“

”دوسرے مشاغل سے فرصت ملے گی تو پڑھائی کی طرف متوجہ ہوں گے لائٹ صاحب!“ گوبر منہ ہی منہ میں بیڑالی۔ سر جھکا کر چہرہ تھوڑا سا آٹھل کی اونٹ میں تھا اس لیے کسی کو خبر نہ ہوتی۔

رات گئے اپنے بستر پر دوا دوا اپنی زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

لوٹ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں! من چاہی مرادیں پالیتے ہیں۔ اس کا حال تو بھول شانہ

انہ نے بھی نہ پائے تھے گرفتار ہم ہونے

والا تھا اسے ہنسی آگئی بزرگوں نے جس انسان کے ساتھ اس کی زندگی کا چلو ہانڈہ دیا تھا اسے خبر ہی نہ تھی اور وہ اپنی زندگی کی رنگینیوں میں سر بہ پا فرق تھا وہ شوخ اور چلبلی لڑکی جس کی سنگت میں شبیر کے لبوں سے پھول جھڑتے نظر آ رہے تھے اسے دشمنی جاں کٹنے لگی۔

دوسرے دن ارم نے فون کیا۔

”کیسی ہو گوبر؟“

”ایک دم بد اور بکواس سخت الجھن کا شکار۔“

”اچھے ہوئے تو اہم سب بھی ہیں یہ کیسا مذاق کیا ہے وادی جان نے تمہارے ساتھ؟ سہلا ایسے بھی رشتے ہوتے ہیں! فریقین کی مرضی کے بغیر طے پا جانے والے ظہیر بھائی کے تو مارے خواب بکھر کر رہ گئے ہیں۔ وہ تمہیں شدتوں کے ساتھ پسند کرنے لگے ہیں گوری! مرنے ہیں تم پر کبھی سے اپنے کمرے میں بند ہیں۔“

”وہ اور خوش نصیب ہوتے ہیں ارم! جنہیں من چاہی زندگی ملتی ہے میرے نصیب میں بھی کچھ تھا۔ لیکن ڈونٹ ڈری یہ ممکن ہے شادی نہیں..... میری پھر پڑساؤں میرے ہی ہوں گے اور میں ایسے شخص کا ساتھ ہرگز قبول نہیں کر سکتی۔ جس کی زندگی میں میرے سوا کسی بہت کچھ ہو۔“

”میں تمہیں بھائی سے کہہ دوں امید کا ذہن اپنے ہاتھوں میں رہنے دے۔“

”کچھ نہیں کہہ سکتی..... میری زندگی کی ذمہ داری میرے ہاتھوں میں نہیں ہے جانے اگلے لمحے میرے ساتھ کیا ہو اور جان واپس نہ لیتے وہ نہیں ہوتے جو پہلے ہوسکتے تھے۔ میں نے تو شبیر کو بھی ایک اچھا انسان سمجھا تھا لیکن اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔“

”تو میں نے تم سے غلط تو نہیں کہا تھا تم میری کزن ہو تو شبیر میرے بھائی ہیں! میرا اور ان کا خون ایک ہے۔ اس کا بے جا گناہ کیسے کرتی۔“

”ارم پلیز یہ بد موضوع چھوڑ کر کوئی اور بات کرو۔“ اس نے خود ہی ایک بات تیار کی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

بانت کے جانے کے تمام انتظامات مکمل ہو گئے شبیر کے بعد وہ بھی عازم سفر ہونے والے ایک ڈاکٹر تھے۔ ان کی سیٹ بک کرانی یا کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن کراچی جانا تھا۔ اسنی کراچی تک ان کے ہاتھ پورے تھے۔ دیر پا صبح سے ان کے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ نیل بھائی انتظامات میں پیش پیش تھے۔ کئی دنوں بعد پاپا جان کی آواز آئی کہ پھر رحمت ہی جا رہی تھی! ایئر پورٹ پر چاروں میں پاپا جان کی گوبر کی آنکھیں آنسوؤں سے پر تھیں بخت

یا بھائی کے سر پر ہاتھ رکھ کے اسے تسلی دیتے تھے اسے ایک طرف لے آئے۔

”گوبر! تم اس قدر پریشان کیوں رہتی ہو؟“

”نیلن تو! بخت بھائی آپ کا ہم ہے۔“

”سنو شبیر مجھے مارتا۔“

گوبر کے چہرے پر اس نام نے ناگہاری کا احساس پھینا دیا۔

”میں تو اسے جگہ بتاتی نہیں سکا..... میرا خیال ہے اسے کسی نے بتایا ہی نہیں۔“

”چھوڑ لے بخت بھائی۔“

”نیلن! گوبر! اب تو تمہارا مستحق اسی سے ہے! اسے ہے! وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ بیمار پاتا ہوا پورٹی میں داخلہ لے رہا ہے۔ میں نے بھائی ماموں کا پلڑا اس سے دے دیا ہے! اور ان کا پیغام بھی! وہ حق بتاتے رہیں گے سب کچھ۔“

یہ جو ہر آ پا اب تک نہیں آئیں کہاں رہ گئی ہیں۔“

وہ آنے والے راستے کی طرف دیکھنے لگے! اماں قریب آ کر دو دھرتی پڑھ کر دم کرنے لگیں! جہاز کی روانگی پر ہنچو دیر ہائی تھی وہ ہا ہا جان کا ٹھیکوٹوں سے بھر پھر بخورن رہے تھے! اچانک نیلن بھائی کی چمکی دکتی گاڑی موڑنے بہا مد ہوئی! کار پارک کر کے وہ باہر نکلے تو شبیر ان کے ساتھ تھا۔

”نیلو مائی ڈیز کزن!“ بخت نے بھاگ کے اس کو گلے لگا لیا۔

”اچھے صاحب! میں دووہ میں سے کھنیا بچھ کر نکال دیا نیلو مائی ڈیز کزن..... ہاں پاپا خون پھر خون ہے یہ ان کی جگہ کہاں؟“

”ارے نیل بھائی.....“ بخت شبیر کو چھوڑ کر نیلن بھائی سے اپٹ گلے بٹتے پختے کہنے لگے۔

”آپ میں اور شبیر میں کوئی فرق نہیں! آنکھیں تو دونوں ہی عزیز ہوتی ہیں! بائیں ہو یا دائیں..... ضرورت ہاں ہی ہوتی ہے اور پھر یہاں تو مسئلہ یہ بھی ہے کہ آنکھیں ہیں ہی تو۔“ بخت نے ایک شوخ نظر گوبر پر ڈالی۔ نیلن ہنس پڑے! شبیر انہیں دیکھنے لگا۔ جیسے وہ سب باہل ہوں یا وہ خور۔



”ویسے شیریار ایہ جاوے ہوا کیسے میرا مطلب ہے یہاں کیسے آئے؟“

”اس وقت تو اپنی جوہر آ پا کے شوہر نامدار کے رحم و کرم کے سہارے آیا ہوں البتہ آنے کا ارادہ بھیجا کا تو راستے میں عدلی کی کٹھنرا جواب دے گئی لٹ کے لیے نکلے تو مختصر راہ یہ حضرت بن گئے۔“

”تمہیں نہیں بخت تمہاری جوہر آ پائیں زبردستی لے آئی ہیں۔“

”بخت ایہ نیکل بھائی خاصے شریر ہیں بالکل اپنی جوہر آ پا کی طرح کمپ مار رہے ہیں جیپ خراب ہو گئی ہے راستے میں لٹ کے لیے کھڑا تھا تا کہ وقت پر پہنچ سکوں ان جناب کی سواری یا وہ ہماری سوائے اتفاق وہاں نہ گزری اور..... اور..... بات کرتے کرتے وہ ایک دم اماں سے مخاطب ہوا۔

”آداب پھوچو چو جانی.....“ کہاں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا گوہر پاس ہی کھڑی تھی۔

اس نے ایک نظر اسے دیکھا ناگاری کے ساتھ..... اس پر ایک کڑوی سبیلی نظر ڈالنے کے بعد جو روح سے تھک اتر گئی وہ بخت سے باتوں میں لگ گیا۔ انگوٹھی گوہر کے ہاتھ میں تھی۔ کاتوں کی جھین اس کی انگلی کو کیا رو، کو بھی ڈھکی کرنے لگی ایک دم وہ خاصا خوش و خرم لگنے لگا موسم کی تبدیلی اس پر بھی اثر انداز ہوئی تھی باریکہ کپڑے کے سفید ٹکڑوں میں بلوس وہ ہمیشہ سے زیادہ اچھا لگ رہا تھا شام کے سارے ڈھلنے والے وقت تھا میں خاصی جیس زوون تھیں وہ ہار ہار رونال سے پسینہ پونٹھ رہا تھا اس کی طرف پشت کے کھڑا تھا بھری بھر گردن پر ترشے ہوئے نم دار سیاہ ہال بے حد بھینے لگ رہے تھے وہ بے اختیار اسے دیکھے جارہی تھی جس کے توجہ ہے ہاکی سے فضا میں کھڑے تھے جہاز کی روانگی کا وقت ہو گیا بخت پنجرہ لاؤنج کی طرف جانے لگے تو سر ہی رنجیدہ ہو گئے شیر آگے بڑھا دو تھیں اس کے پاس کھڑا تھا۔

”اچھا تو آپ نے فون یہ جان کر رکھ دیا کہ دوسری طرف میں تھا۔“ کتنی بے موقع بات کہہ رہا تھا وہ۔

”جی ہاں! اس نے تڑ سے کہا۔“

”ویری گڈ“ لیکن پوچھ سکتا ہوں کہ کیوں؟“

”تھانا ضروری نہیں کیونکہ جی آپ خود بھی سمجھتے ہیں۔“

”کاش آپ نے میری اس پیش قدمی کا جواب مثبت انداز میں دیا ہوتا۔ میں بہت سوچ سمجھ کر آپ کی طرف بڑھا تھا اور میں آپ کی اس بے رحمی کا مطلب بھی نہیں سمجھتا۔“

”گوہر آپ کو سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں آپ کے پاس دل بہانے کو اور بھی بہت کچھ موجود ہے۔“

”میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا گوہر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔“

”زیادہ معصوم بننے کی کوشش نہ کریں میں گوہر ہوں گوہر عاصم آپ کی بھی پستی تو تری ہے وقوف میں ہوں عذرا جہاں میرے دل میں کسی دل پھینک نو جوان کے لیے ذرہ بھر جگہ نہیں خواہ اس سے میرا بیرونی کاٹا کیوں نہ جوڑ دیا جائے۔“

”کیا..... کیا..... دل پھینک..... ذرہ بھتی کاٹا تا یہ سب کیا شرافات ہے۔“

”یہ انگوٹھی دیکھ رہے ہیں۔ جو میری انگلی سے کانٹوں بھری بازو بن کر پڑی ہے یہ آپ کے نام پر مجھے ذرا پہنا ہی گئی ہے..... لیکن..... لیکن میں.....“

اس سے آگے کچھ نہ کہا گیا اور نکل اڑیں کہ آنسو سے کمزور حلقو ثابت کرتے وہ آگے بڑھ گئی شیر ہوتی اسے دیکھا رہ گیا۔

دوسرے زمانہ و مکان سے ہے تیار اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد اوپر اوجھڑا کھا سب لوگ پارکنگ کی طرف چلے گئے۔ وہ اپنے آپ کو مارل کرنے کی کوشش میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئی۔ شیر اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کونٹا کی سیاہ سڑک پر ایک گاڑی کے بریک تپتے پائے شیر بھاگ کر اس کی طرف گیا سب گاڑیوں میں بیٹھ چکے تھے اور بابا جان گوہر کا انتظار کر رہے تھے گوہر گاڑی کے قریب سے گزری۔

”میری شکی..... مجھے دیر ہوئی ڈرا کیوں جیپ لے جائے گا۔ میرے ساتھ ہی آیا تھا..... مگر تم اس دیر لے کر اس نے پختہ عدلی بہت پریشان ہو رہا تھا اور اسل بیڈی کے وی آئی۔ پنی مہنا تھیں کی آنہ کا پختہ نہ پڑتا تو وہ آتا پانچھے آنا پانچھیں تو خیر ہے نا کیوں بے چاری سر جہاز منہ پھاڑتا تو گھر سے نکلنے سے، ہیں چنڈا ب پانچھو..... پختہ نہیں تم تو ڈرا کیوں گے سیٹ ہی منہ لگو گئے۔ عجوت کی لیڈر شپ تمہیں ایک آنکھ بھائی جو ہے۔“ عذرا گاڑی سے باہر نکل کر وہ سری طرف سے پھر پھرتی گوہر نے ایک نظر دیکھا تھی تیار تیار کیا۔

”میں اسے بند رہے تھے۔“

”گوہر بیٹی جلدی سے آؤ۔“

”میری نازن میرا رن دیے جا رہے تھے۔“

”یہ شیر کہاں چلا گیا؟“ عاصم اسری سے پوچھ رہے تھے۔

”پتہ نہیں بابا جان..... ابھی تو نہیں موجود تھے۔“

دوسرے پختہ کہا شیر گاڑی کے ڈاکٹر کی طرف جا رہا تھا اسری بھائی نے گاڑی گاڑیوں کی قطار سے نکالی اور پورٹ روڈ پر بیڑھنے گئے شیر عذرا کی گاڑی سمیت نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ نیکل بھائی کی گاڑی بھی وہاں آگے بڑھ چکی تھی۔ وہ کھڑکی کی طرف رخ کیے..... خالی نظروں سے باہر نکلتی رہی۔

☆☆☆☆☆☆

زندگی کتنی بے معنی ہو گئی تھی اس کا اندازہ اسے آج کل ہو رہا تھا جوہر آ پا تو گئی ہی تھیں بخت بھائی کے نام پر گھر لگن خالی ہو گیا اسری ان دنوں ڈاکٹروں کے آخری سال میں تھے تجددگی سے محنت کر رہے تھے وہ اسے ہمارے گھر میں جہاں ہو کر رہ گئی۔ رات کو اس نے جوہر آ پا کی بک ٹیلف کھگالی پورا نابل پڑھا۔

بند فرحت کی گفتگو کو بڑھ کر جوہر آ پا کی کم پنی اور شنوئی کی بے وقوفی پر جھوٹا دھار روئی۔ اب تو جوہر آ پا کی نہیں جس جوان کی کم پنی پر اس کا مذاق اڑاتیں۔ پھر اس نے ”سفید گلاب“ نکال لی۔ ہیر سنر سیکل کے کنارے اسے جوہر آ پا کے نیکل بھائی نظر آنے لگے۔ لیکن نیکل بھائی جیسے مرد اس کا آنپڈل نہ تھے اسے تو بابا جان نے اپنے بھانڈے حوصلہ پار صب سمجھاوار۔ معاملہ فہم محبت شناس، کبھی کبھی اسے لگتا بابا جان رضیہ فرحت کے ابو بھائی ہیں لیکن اپنی منزل پالینے والے ابو بھائی یا اور چنی خانے میں بیڑھی پر بیٹھے اماں کے ہاتھ کی گرم گرم ہاڈوروشیاں لمانے ان سے باتیں کرتے اپنا دک سچان سے کہتے وہ اسے بہت اچھے لگتے۔

”اب اپنے بابا سے بے حد شرمی اس کا آنپڈل بابا جان سے سیکل کھاتا ہی تھا مگر آج کے دہر میں ایسے مرد اب تھے جو بناوٹ کی بند حقیقت کو عمر بھر رکھنے والے ہوں جنہیں زندگی میں ترتیب اور دھیمان پسند ہو۔ جو اپنی زندگی کے بنگاموں سے دور رہتے ہوں جنہیں دوسروں کے نرم و ہنرک احساسات کی بہت زیادہ پرواہ نہ ہو۔“ اسری کی خاطر جینے کو زندگی سمجھتے ہوں جن کا وقت اپنے اہل خاندان کے لیے ہو۔ سوچتے سوچتے اسے کبھی لگتا۔



”ارے میں کہاں کھو گئی یہ دنیا ہے یہاں بابا جان جیسے بندے کم کم اور نیکل بھائی جیسے بندے کثرت سے ہیں اور شبیر.....“

شبیر تو دنیا کے مردوں کی خطرناک قسم میں شامل ہیں۔ وہ خطرناک قسم جو خود کو آزاد اور متعلقین کو قید میں رکھتا پسند کرتے ہیں۔“

اس کی تباہی کے احساس نے بابا جان کو بھی پریشان کیا دوسرے دن وہ کرنل محمد خان کی ”بہ سلامت روی“ لے آئے۔

”تمہارے لیے لایا ہوں بیٹے..... مگر میں بدمذہبی ہوں تمہیں پڑھ کر آدمی سارے جہانوں کی سیر ایک ساتھ کر لیتا ہے۔ کوئی اور کتاب تمہاری نگاہ میں ہوتی تارنا۔ لیتا آؤں گا۔“

”شکر یہ بابا جان! وہ خوش ہو گئی۔“

دوسرا دن اس نے جامن کے درخت تلے چھٹنگا چار پائی میں پڑے پڑے کتاب پڑھتے گزار دیا۔ شام کو اس کا مہوڈ خوش گوار تھا، گرم اور شازی نے بشیرا طلاع کے ہلے بول دیا۔

اماں خوش ہو گئیں ساتھ ہی اس کی شامت بھی آگئی، کتاب تلے کے لیے وہ باورچی خانے میں بند ہو گئی ازم اور شازی بھی اس کے پاس آگئیں، کام میں اس کی مدد کرنے لگیں۔

”بہت سکھڑ ہوتی گوہر جس گھر میں چاکو گئی قسمت جاگ جائے گی اس گھر کی ہمیں تو ممانے کاٹنا دیا ہے مفت کی توڑنے کے عادی ہو گئے ہیں ایک انڈیا تک فراہمی کرنا نہیں آتا۔“

”تعریف کا شکر یہ۔“

”شکر یہ تو ان کا ادا کرو۔“

”کن کا؟“

”ارے بھئی ظہیر بھائی کا ایک سب سے پہلے ہمارے ہاں سے چائے پی کر گئے، شاد ہوئے چار ہے تھے تمہاری خانہ داری پر قسم سے یہ دلواؤں لگانے شبیر بھائی والا چکر نہ ڈالا ہوتا تو..... تم میری بھابی ہو تیں..... میرے ظہیر بھائی کی دلہن۔“ ازم برنجیدہ ہو گئی۔

”ارم اتم جانتی ہوں میرے ہاتھ میں شبیر کے نام کی انگوٹھی ہے۔“ اس کے لہجے میں جانے کیا تھا نا گواری غصہ یا کچھ اور.....

”ہاں..... ہاں..... جانتی ہوں..... یہ تمہاری عرق قید کی نشانی ہے تمہاری نارضا مندی کے باوجود..... لڑکی کو بولڈ ہونا چاہیے اپنے حق میں بولنا کسی قانون کے تحت جرم نہیں۔“

”جیسے ازم! میں ایسا نہیں کر سکتی ایسا نہیں کر سکتی، مجھ میں مجبوریاں ہوتی ہیں..... منہ بند کر دیتی ہیں۔“

”تمہاری مرضی..... ورنہ تمہارے انکار پر کس کی مجال ہوتی کہ تمہیں اس بندھن میں جکڑ دیتا۔“

”ارم.....؟“ وہ رونے لگی۔

”تم نے سچ کہا تھا ارم..... شبیر کی عادات بہت خراب ہیں ایک لڑکی کو تو کئی بار خود میں نے اس کے ساتھ دیکھا ہے۔ بخت بھائی کی رہائی کے وقت وہ آیا تھا۔ اسے تو اس منگنی کی خبر بھی نہیں ہے۔ ایسے لوگ ان بندھنوں کی پروا کرتے ہیں شام آرام وہ تو اس لڑکی کے اشاروں پر ناچتا ہے..... میں نے دیکھا اور سچے جلتے کڑھنے کے اور کچھ نہ کر سکی۔“

”میں تو خود حیران ہوں امدنی سست اور گواہ چست والا معاملہ ہے، موصوف کو خبر ہی نہیں اور یہاں خوشی کے نلاد بانے بھانے چاچکے ہیں۔“

گہر خاموش ہو گئی اماں باورچی خانے میں داخل ہوئیں تو بات کا موضوع بدل دیا گیا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

سب لوگ چلے گئے، لیکن وہ اسی موضوع پر سوچتی رہ گئی بارہا جی چاہا کہ انگوٹھی اتار کر دور کہیں پھینک دے۔ لیکن ہر بار اماں کا سراپا سامنے آ گیا، بہت خوش تھیں وہ اس بندھن پر جیسے بہت بڑی دولت پائی ہوں ہوں نے۔

بابا جان مطمئن تھے اسری خوش تھے جو ہر آہ پر سکون تھیں، شبیر سے مل کر نیکل بھائی بھی متاثر ہوئے تھے۔ لیکن ایک وہ خود بھی جو اس کی حقیقت سے آشنا تھی اور اس..... اور اسی سبب تمہا ایک آگ میں جلی جا رہی تھی۔

کلام کاغذ سے فارغ ہو کر وہ اپنے مخصوص ٹھکانے پر آگئی، ابھی چھٹنگا چار پائی میں گھس کے کتاب کھولنے لگی تھی کہ فون کی بیل بجتی گئی، گھر پر اماں اور سکھاں کے سوا کوئی نہ تھا۔

”گوہر..... گوری..... ذرا دیکھنا تو کون ہے۔“

”آئی اماں۔“

وہ اندر کی طرف چلی اماں تخت پر سکھاں کے ساتھ بیٹھی سبزی بھاری تھیں، گھٹنی بھی جا رہی تھی۔

”گوہر! آج فون رکھ نہ دیتے جیسے گا..... بہت سی باتیں کہنا اور سننا ہیں آپ سے اس انگوٹھی کے حوالے سے جو میرے ظلم میں نہ ہوتے ہوئے آپ کے ہاتھ میں ہے اور بقول آپ کے زبردستی آپ کو پہنا دی گئی ہے۔“

اس نے کھٹکوا براہ راست شروع کی۔

”ارے آپ شبیر ہیں۔“

”آف کورس میں ناچیز میں اسی شام سے ہی انجھن میں مبتلا ہوں..... بہت جلد آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کچھ مصروفیات کے سبب ایسا نہ کر سکا یہ بے دقتی کس کی ہے لاجول ولا مجھے بزدلوں کو بے وقوف نہیں کہنا چاہیے..... ہاں یہ کہ یہ ظلم آپ پر کس نے کیا؟ میرا مطلب ہے زبردستی کا ظلم۔“

”آپ خود ہی پوچھ لیجئے..... آپ کے بھی تو کچھ کچھ لگتے ہیں وہ سب منجھوں نے یہ سب کچھ کیا.....“

”وہ سب تو ہو جائے گا یعنی میں نے پوچھ لیا ہے اور باقی پوچھ بھی لوں گا۔ لیکن مجھے آپ سے یہ سوال کرنا ہے کہ آپ کو یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ آپ کو ہر عاظم ہیں۔ میرے کسی پیشینی نوکر کی بے وقوف بیٹی یا نذرانہ بھائی نہیں ہیں اور میرے جیسے دل پھینک ہی آپ کو قطعاً ضرورت نہیں، کس بنیاد پر کس سبب آپ نے یہ سہاری باتیں کہہ دیں، کس نے حق دیا آپ کو اتنی باتیں کہنے کا؟ ایک معمولی سی انگوٹھی ہاتھ میں لیکن نینے سے رشتے مستحکم نہیں ہوا کرتے اور نذرانہ بھائی جمال کا نام اتنی تھیک سے لینے والوں کو میں اپنا دوست کہنا اور سمجھ نہیں سکتا۔“

”کس نے منت کی ہے آپ سے دوست بھینے کی۔“

”آپ ان ہی میں خوش رہیں جن کے ہم سے آپ کے شب و روز میں رہتے ہیں۔“

”واقعی وہ لوگ نہ ہوتے تو میں کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔“ اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”لیکن گوہر بی بی..... اس بات سے دل پھینک ہونے والا اس کا کوئی تعلق نہیں جڑتا۔ آپ نے مجھے کہیں

دل جھپکتے ہوئے دیکھا..... چہ..... چہ..... کون سے جتوف دل سے محرومی برداشت کرتا ہے۔ شاید آپ نے ایک شعر کا مشہور مصرعہ نہیں سنا۔

دل گیا..... ساری کائنات گئی

اور پھر دل اسکی چیز ہی نہیں دل تو سینے میں بجز کتا ہی اچھا لگتا ہے کسی کوڑے کرکٹ کے ڈبیر پر پڑا کیسے بچتا ہے۔

"میں نے جہنم دیکھا..... کیونکہ میری زندگی آپ کے ساتھ انوار کی کرنی ہے..... آپ..... جن سے پہلی ملاقات نے میرے دل پر خوشگوار اثر چھوڑا تھا۔"

"کاش آپ نے اس تاثر کو قائم رکھا ہوتا۔" وہ شاید بولے سے ہنستا تھا۔

"وہ تاثر میں تو قائم رکھنا چاہتی تھی آپ نے اسے توڑ دیا۔"

"میں نے..... کیسے محترمہ میں تو بچھڑنے کے سخت خلاف ہوں اسکی حرکت میں نہیں کر سکتا۔"

"آپ بھر مذاق کر رہے ہیں۔"

"جی نہیں میں بھیدگی سے آپ کی بات سن رہا ہوں۔ فرمائیے۔"

"میں مختصر بات کرنا چاہتی ہوں شہیر صاحب! میری اماں نے زندگی میں بہت سی محرمیاں پائی ہیں جن میں اول اول سیکے کی محبت ہے میں ان کا دل نہیں توڑ سکتی تھی میں نے مانی جان کی پستانی اٹھوئی کواسی سبب اب تک نہیں اتارا لیکن مجھے یہ بھی خبر ہے کہ آپ میں اور مجھ میں بہت فرق ہے شاید آپ کے خیال میں گلی ٹریکوں سے

گپ شپ کرنا دوستی رکھنا ملنا جانا معیوب نہ ہو..... لیکن میں اسے برداشت نہیں کر سکتی ہو سکتا ہے آپ کو یہ اقدام بھی پسند نہ آیا ہو یعنی منجھی والا..... آپ چاہیں تو انکار کر دیں..... تاکہ آپ کے اور عذرا کے درمیان کوئی دیوار کھڑی نہ ہو۔"

"اوہ پوشٹ! پ ہند کر دیں یہ کواں..... آپ نے یہ کیا عذرا عذرا کی رٹ لگا رکھی ہے۔"

"بہت غصہ آتا ہے آپ کو اس نام پر۔"

"آنا بھی چاہیے۔"

"مبارک رہے آپ کو آپ کی چاہت..... میں ابھی اٹھوئی واہین کرتی ہوں شہیر صاحب! آپ کی باتی برائیاں کاٹیل برداشت نہیں..... لیکن یہ دکھ ہرگز بھول جانے والا نہیں..... کہ..... وہ روئے لگی۔"

"آپ عذرا کو چاہتے ہیں وہ آپ کے لائق ہے آپ اس سے شادی کریں گے..... مجھے کوئی ملال نہیں..... میں ذہر ہوتی آپ کے سر منڈھے جانے کو تیار نہیں۔"

"گوہر..... گوہر پلیز..... اتنی غلط باتیں نہ کرو۔"

"کیسے نہ کروں میں نے اپنی آنکھوں سے اسے آپ کے ساتھ دیکھا ہے اپنے کانوں سے آپ کی باتیں سنی ہیں۔"

"گوہر..... میں اب سمجھ رہا ہوں ساری بات تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئی ہو۔ گوہر..... اس منجھی کو قبول کرنا یا نہ کرنا اہم دونوں کا اپنا ذاتی مسئلہ ہے لیکن عذرا کا ذکر اس انداز میں کر کے اس کے بارے میں اتنے گھٹیا انداز سے نہ سوچو تمہاری باتوں نے مجھ کو دکھ دیا ہے۔ عذرا میری بہن ہے..... میرے دوست کی بہن ہے..... میں اس سے

بیزار کرتا ہوں! اس کا احترام کرتا ہوں! ماں جانی بہن بھی ہوتی تو اس سے زیادہ محبت نہ کر سکتی جو عذرا کو مجھ سے ہے گوہر..... میں پچھلے دو دن لاہور گزار کے آیا ہوں..... میری ملاقات چچا جان سے ہوئی..... نہیں نے مجھے یہ سب کچھ بتایا..... اور وہ دادی جان جو تمہیں اٹھوئی پہنا نے کی خطا دار ہیں انہوں نے مجھے بھی ایک اٹھوئی عنایت کر دی..... تمہارے نام کی اٹھوئی..... جس پر مجھے تو ذرا بھرا احترام نہ تھا..... لیکن تم نے گوہر..... تم نے مجھے چند الفاظ میں بہت بڑا دکھ بخش دیا۔ رشتوں کی محبتوں اور ساتوں کی پہلی شریک تو اعتراف ہے..... جب وہ ہی نہ ہو تو رشتے کیا کر سکتے ہیں تم چاہو تو اٹھوئی اتار کر پھینکو کوڑے دے دینا..... مجھے بڑوں کے فیصلے کا پاس رہے گا اس لیے اٹھوئی میرے پاس رہے گی اور اٹھوئی پر اتنی کیا موقوف میں سزا خود کو اس بندھن کا قیدی سمجھتا رہوں گا خدا حافظ!"

رابطہ کٹ گیا۔ وہ ریسیور ہاتھ میں لیے کھڑی رہ گئی۔

"اے کس کا فون ہے گوہر جھٹ کر ہی رو گئی ہو تو یا تک نہیں۔"

اماں جانے کب سے نکال رہی تھیں۔

وہ ریسیور کھ کر پلٹ آئی۔

"راٹنگ بھر تھا اماں!"

"تو یہ کونسی..... راٹنگ بھر اسے طویش بھی ہوتے ہیں۔" وہ بڑبڑائیں۔

"یہ راٹنگ بھر تھا رازنٹ بھر ہوتا تو صاحبزادی کا سارا دن وہیں گزر جاتا۔"

وہ پھر جاگن تیل آگئی..... باز دوسرے پرکھے آنکھیں بند کر کے جانے کیا کیا سوچتی رہی۔

☆☆☆☆☆☆

شام کو باپا کا کان سے بولے تو بہت خوش تھے۔

مصنفیہ..... مصنفیہ.....

وہ باپو جی خانہ کی طرف چلے گئے۔ گوہر کھانا لگا رہی تھی اماں بہ پٹری میں تھیں مہینے گاڑش ترتیب سے رکھ رہی تھیں۔

"آج تمہارے پستانی کا فون آیا تھا۔"

"بھائی جان کی..... اماں چلندی سے باہر آ گیا۔"

"ارے بھئی نہیں بلتواڑ کا۔"

"! چھا اچھا کیسا سے دلواڑ؟"

"ٹھیک ٹھاک..... نجم اس خبر کا پوچھو جو میرے پاس ہے؟"

"تو یہ کیا خبر ہے۔"

"شہیر نے ایچ۔ اے میں داخلے لیا ہے اور وہ دلواڑ کے پاس ہی رہے گا۔"

"اچھا کہاں ہیں وہ اب؟"

"یہ اس نے نہیں بتایا لیکن مزے کی بات سنو..... شہیر وہاں پہنچا تو دلواڑ کے بچوں نے کاظم اور اس کی ٹیلی سٹہ اچھا بھلا بھلا کھڑا کر کے اسے اٹھوئی پہنا دی۔"

"خوش تو ہے شہیر؟"



”بھی میں کیسے پوچھتا..... ظاہر ہے خوش ہو گا ہی تبھی تو انکو بھی باہن لی بچی جان بھی کمال کی خاتون ہیں بھی ہمیں تو سب نے غیر ضروری سمجھ کر خارج کر دیا ہے لڑکی والے بھی لاہور والے ہی ہیں اور لڑکے والے بھی خود ہی سب کچھ کیے جا رہے ہیں۔“

”دلخوار نے اچھا کیا شہیر کو داخلہ دلوا دیا میں تو اس بات پر بہت خوش ہوں۔“  
”ہوتی رہنا خوش..... لیکن ایک بات اور ہے ایک اور فون بھی آیا تھا میرے پاس۔“  
”کس کا؟“

”تمہاری سہیلہ بھائی کا۔“

”کیا کہہ رہی تھیں؟“

”بہت کچھ۔“

”پھر بھی؟“

”سب کچھ شہیر کے بارے میں ہی تھا کہنے لگیں عاصم بھائی..... آپ اگر یہ سوچ کر لڑکی دے رہے ہیں کہ وہ شاہنواز کی جانگاہ کی مالک بنے گی تو غلط ہے..... شاہنواز شہیر سے کوئی تعلق نہیں رکھتا چاہے جاگیر پر ہو یا شہر میں شہیر کی شہرت اچھی نہیں ہے شاہنواز اسی کی وجہ سے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے آج کل بھی دیہات کی ایک لڑکی کو وہ بھگا لے آیا ہے پولیس اس کی تلاش میں ہے۔“  
”اوہ میرے خدا..... پھر.....؟“ صفیہ نے جبران پریشان ہو کر کہا۔

”تم تو جانتی ہو صفیہ! میں سنی سانی باتوں پر یقین کرنے والا نہیں اور پھر سہیلہ بیگم اس کی سوتیلی ماں ہیں۔ تم سوچو صفیہ! گرائی ماں ہوتی تو کیا بیٹے کے عیب اس کی ہونے والی بسرال میں کھول کر رکھ دیتی..... لیکن میں الجھ بھی گیا ہوں صفیہ! اگر شہیر میں یہ ساری خرابیاں اچھی ہوئیں تو کیا ہوگا؟“  
”پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے.....؟“ صفیہ تو اڑھد پریشان ہو گئیں۔

”میں خود بھی پریشان ہوں صفیہ..... آخر بیٹی کا معاملہ ہے اور بیٹی بھی کسی خاصوش طبع۔ بلکہ زور و جوش۔ خدشات کرے گا اس پر کسی تم کا سایہ بھی بڑے۔ صفیہ! میری یہ بیٹی ایک غیر معمولی ذہین اور حساس بچی ہے۔ اس کے لیے اس کا ہم مزاج شریک زندگی منتخب کرنا ہمارا اہم ترین فرض ہے۔ ہمیں ایسا بندہ ہرگز ہرگز ہرگز غلط فیصلہ اس کے لیے عمر بھر کا روگ بن جائے..... میں سوچ رہا ہوں کہیں ہم نے واقعی اسے اپنے کسی غلط فیصلے کی نذر تو نہیں کر دیا۔“

”عاصم! بچی ایک دو بار یہاں آیا ہے۔ میں نے تو اس کے مزاج میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔“

”بے وفائی کیا بات میں مت کرو۔ ایک دو ملاقاتوں میں انسان کی چھان بین ہو جاتی ہے کیا؟ اور پھر تم آج کے دور کے انداز دو کھو۔ انسان دیکھنے میں جو کچھ ہوتے ہیں ویسے دراصل نہیں ہوتے۔ کیا خیر اصلیت کیا ہے۔ صفیہ میں تو بہت زیادہ مشکور ہوں۔ ہمیں اپنی بیٹی کو دلخوار یا بچی جان کی خواہش کی ہیبت تہہ چھانے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔“

صفیہ سوچنے لگیں..... سنی ویر عاصم ان کا چہرہ دیکھتے رہے۔

”عاصم..... عاصم..... میں سوچ رہی ہوں۔ آپ کو بھائی دلخوار سے بات کرنی چاہیے..... بلکہ بھائی جان

ناہنواز سے ہی۔“

”کیسی بات کہہ رہی ہو..... دلخوار کی بات اور ہے..... لیکن شاہنواز سے کیا کہنا سفتا..... وہ تو صاف بچ جائیں گے یہ کہہ کر یہ میری نہیں بچی جان اور دلخوار کی خواہش تھی۔ ان ہی نے یہ سارا کھڑا کچھ پھیلایا تھا۔“  
”پھر.....؟“

”پھر کیا..... سوچ رہا ہوں کہ معاملے کی گفتیش دلخوار کے سپرد ہی کرنی چاہیے وہ ہی ہر اچھے برے کا ذمہ دار بنا تھا۔“  
”تو فون کر دیجئے اسے۔“

”تمہیں فون نہیں کرنا۔ میں خود جاؤں گا لاہور..... اسکی باتیں فون پر طے پانے سے رہیں۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ کب جائیں گے آپ؟“

”ایسے کام میں تاخیر کیسی۔ کل ہی چلا جاتا ہوں۔ یا ساری اس وقت کہاں ہیں۔ کہہ دو کل کے لیے میری سیٹ تک کرواؤں۔ ٹکٹ لے آئیں۔“

”کیوں نہیں بھی ساتھ ہی چلی چلوں۔“

”ضرور چلو..... بلکہ تمہارا ہونا ضروری ہے۔ ضروری ہی کیا۔ میرا خیال ہے بات تمہیں کرنا چاہیے۔ تمہارا میکے ہے ہم تو ابھی پچھلے جرائم کی سزا بھی نہیں بھگت پائے ہماری بات کو ویسے بھی بہت گہرائی کے ساتھ سوچا جائے گا۔“  
”نہیں کیا جائے گا۔“

”ٹھیک ہے ہم دونوں ہی چلے جاتے ہیں۔ جو بات بھی ہوگی منہ در منہ ہو جائے گی۔“

”مناسب تیاری کر لینا..... ایک دو دن میں ہوائیں آ جائیں گے۔“

”گو ہر گھر میں اکیلا رہ جائے گی۔“

”کیا فضول بات کہہ رہی ہو۔ گھر سے محفوظ جگہ بھی کوئی ہے۔ سکھان موجود ہے اسری ہیں۔ صفیہ بچی کو اپنے آپ پر اعتماد کرنا بھی سکھاؤ۔ اعتماد بخشو اسے..... اپنا اچھا برا خود سونپنے کی مہلت دو..... اور پھر دو تین دن کی بات ہے۔“

”آپ تو ایک ہی حسرت میں حد سے گزر جاتے ہیں۔ میں نے تو یونہی ایک بات کہہ دی تھی۔“

”اکیلے رہ جانے میں خرابی بھی کوئی نہیں ہے۔“ وہ مسکرائے۔ صفیہ بیگم نے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ جن دنوں اول اول اپنی بھائی اور بھتیجیوں کے لیے کچھ تحائف کا انتخاب تھا۔

☆☆☆☆☆☆

گوبر نے آج کالج سے چھٹی کر لی۔ صفیہ اور عاصم حسین کے جانے کا وقت گیا رہ بچے کا تھا۔ اس نے ان کا مختصر مسافری سامان پیک کر دیا اور ٹیکسی آئی تو انہیں خدا حافظ کہنے دروازے تک گئی۔ ماں کی ساری سزا اور یاں آج اسے بھانا تھیں۔ باورچی خانہ بھی خود ہی سنبھالنا تھا اور شایاں ان ایک دو ایام میں ساری تعلیمی مصروفیات کو اپنی طرف رکھنا تھا۔ سکھان سارے گھر میں پوچھنی لگے بچی تھی۔ گوبر نے جھاڑ پونچھ کرنے کے لیے سب سے پہلے بابا کے کمرے کا رخ کیا۔ گزرے دو دونوں سے وہ کسی ڈانوا ڈول ہی ہو رہی تھی۔ ارم کی باتیں شہیر کا کھٹکی بھر اچھا اس کی وضاحت۔ سب اس کے! بہن میں ایک تو اتر کے ساتھ گھوم رہے تھے۔ وہ اڑھد پریشان تھی بے یقین تھی۔ نہیں بچی قسم کے فیصلے کن لمحات کا سامنا کرنے سے شہرارتی تھی اور اس الجھن کا راز وہاں بھی کسی کو نہ بنا سکتی تھی۔

سوچ رہی تھی کسی طور پر جو ہر آپ کو جتنا کران سے مشورہ کر کے اپنے دل کی بے خبری دور کرے لیکن ہمت نہ رہی تھی۔

اس نے ٹیلی فون کی طرف قدم بڑھانے۔ مگر قبل ازیں کہ وہ ریسیور اٹھاتی فون کی تھنٹی بجی۔

”ہیلو.....“

”ہیلو..... گوبیر بول رہی ہو؟“

”جی ہاں جان..... آداب!“

”جستی رہو۔ حاتم بھائی وکان پر نہیں ملے۔ کہاں ہیں اس وقت؟“

”آپ کو کیسے پتا چلا؟“

”میں نے فون کیا تھا ملازموں نے بتایا کہ وہ نہیں ہیں۔ میں نے سوچا گھر پر ہی ان سے بات کروں۔“

”مگر وہ تو ابھی ابھی لاہور کے لیے گھر سے روانہ ہوئے ہیں۔“

”لاہور کیوں؟ کس کے پاس؟“

”دلخواز ماموں کے پاس..... چچا جان کے ہاں بھی جائیں گے۔“

”پہلے یہاں کی خبر تو لیں حاتم مہیاں۔“

”کیوں مایا! کیا ہوا؟“

”ارے بیٹی کیا نہیں ہوا ایک پریشانی تھا پریشانی ہے۔“

”خبر بت.....“

”اس شبیر نے تو ہماری ٹاک کٹوا دی۔“

”وہ کیسے مایا۔“

”کیا ٹاؤں میرے دل میں اب تک ہول اٹھ رہے ہیں۔ پولیس اسے گرفتار کرنے آئی تھی۔“

”پولیس..... شبیر کو..... مایا جان یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ پولیس کہاں آئی تھی؟“

”پولیس ایک مجرم کو گرفتار کرنے ہمارے گھر آئی۔ بیٹی اس گھر کے دروازے پر لڑنے لگی ہیں۔“

”مگر کس جرم میں؟“

”انجوائے جرم میں وہ ایک لڑکی کو گاؤں سے اٹھالایا ہے۔“

”لڑکی کو..... کہاں ہے وہ لڑکی.....؟“

”کیا خبر کہاں چھپا رہی ہے۔ پرچہ کٹ چکا ہے اس کے خلاف گوبیر ان لڑکے نے ہماری جان عذاب میں کر دی ہے۔ اب عہدہ ہمارے ماموں ویسٹ جرمٹی گئے ہوئے ہیں۔ میں اکیلی عورت کیا کر سکتی ہوں۔ کیا کروں۔“

لڑکا جانے کتنا خیالوں میں رہتا ہے پونیورسٹی میں داخلہ کروایا تھا دلواؤں نے جو دن حاضری بھی نہیں دی کہ وہاں سے بھاگ آ رہا ہے۔ شاہناز کو بیٹے کی کشتی پاکستان کھینچ لائی تھی۔ خیر ہوتی تو وہ ایسے رہ جاتے۔ یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتے۔ جانے کیا ہوگا۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔ کیا کروں۔“

”مایا! شبیر ایک ذہین اور تعلیم یافتہ لڑکا ہے اسے ایسی گھٹیا ترکات ذریعہ تو کس دیتیں۔“

”یہ اس نے سوچا ہوتا تب نا..... اصل میں ایک روز مل خاندان نے اس کی عادتیں بگاڑ دی ہیں۔“

”کون سا خاندان مایا جان؟“

”یہی ہی سرچڑھا رکھا ہے اسے ان لوگوں نے۔“

”کون ہیں وہ؟“

”کوئی جمال احمد ہے..... اس کی بیوی بیٹیاں۔“

”مایا جان۔ مڈرمان جمال اسی خاندان کی ہے.....؟“ گوبیر نے جھٹ پوچھا۔

”ہاں ہاں! اسی لڑکی کے پیچھے وہ دلواندہ ہوا جا رہا ہے۔ مجھے تو ان کے گھر کا پتا معلوم ہے نہ ٹیلی فون نمبر اور نہ کہہ

دیتا لڑکے کو اپنے جال میں ضرور پھنسا سکیں مگر اتنی سب تو نہ دین کہ وہ بے راہ روی کا شکار ہو جائے۔“

گوبیر کا ذہن جھنجھٹا گیا۔ یہ سب کیا تھا؟ آخر کیا۔ ظاہر میں جو کچھ تھا قاتل نفرت تھا۔ شبیر کے الفاظ اس کے

کانوں میں گونج رہے تھے۔

”سچ کیا تھا۔ اس کی تیز کرتا خاصا مشکل تھا۔“

”دلخواز ماموں جان سے بات کریں آپ..... پاپا بھی چند گھنٹوں میں وہیں ہوں گے۔ وہ بھی سن لیں گے۔“

”تھین میں اس پولیس کا کیا کروں جو باہر گشت کر رہی ہے۔ لوگوں کو کیا جواب دوں۔ مزم میں ہوں یا میرے

بیٹے یا شاہ نواز۔ شیے باعث فخر ہوتے ہیں۔ اس لڑکے نے تو ہماری لڑکیاں ڈیوٹی۔ عزت خاک میں ملا دی۔“

”مگر میں کیا کر سکتی ہوں مایا۔ میں تو کوئی مشیرہ دینے کے قابل بھی نہیں۔ آپ فوراً لاہور فون کریں دلخواز

ماموں خود ہی سنبھال لیں گے۔“

”ام جھما..... اوکے..... خدا حافظ۔“

گوبیر وہیں کرسی پر تک گئی..... گھومتا سر ہاتھوں میں تمام لیا۔ جستی بھی مضبوط اور بھاری ہوتی صبرت حال

پریشان کرنے والی ہی تھی۔

”شبیر..... شبیر تم کیا ہو..... آخر کیا..... دور میرا تمہارا یہ بے نام سا ایک بندھن..... اس میں خدا کی کون سی

صلحت پوشیدہ ہے۔ میں تو ایک امن پسند لڑکی ہوں۔ معاشرے میں امن و سکون پسند کرتی ہوں۔ اور تم..... تم

جانے کیا چاہتے ہو۔ اور اگر..... تم جن پر ہوا اور مایا جان کی باتیں ایک الزام ہیں تو پھر پولیس کو کیا پڑی ہے ایک

عزت دار آدمی کے گھر پر پہرہ دینے کی۔“

”بی بی! ہر کوئی آیا ہے۔ بل ہو رہی ہے۔“ سکھان دروازے میں کھڑی تھی۔

”جاؤ دیکھو کون ہے؟“ اس نے آنکھیں بند کر کے ٹیلی فون اسٹیڈ سے سر ٹیک دیا۔

پھر اچانک اسے خیال آیا۔ یہ بات جو ہر آپ کو بتانا چاہیے۔ اس نے ان کا نمبر لایا۔

لائن پر ان کا کوئی ملازم تھا۔ اس نے جو ہر آپ سے بات کرنے کا کہا اور انتظار کرنے لگی۔

برآء سے میں ہندسوں کی آہٹ تھی..... جو ہر آپ سے فون ریسیو کیا۔

”ہیلو.....!“

”ہیلو جو ہر آپ!“

”کیسی ہو گوبیر..... کچھ پریشان لگ رہی ہو..... کیا بات ہے۔“

”آپا..... آپ میں واقعی بہت پریشان ہوں..... میری زندگی کے ساتھ جانے کیا ہونے والا ہے۔ آپ نے

ایک مشتبہ شخص کو میری زندگی سے وابستہ کر کے جانے کن گناہوں کی سزا دی ہے مجھے۔“

”کیا ہوا؟“

"بی بی! میں تو اندر کھڑی تھی۔ مجھے کیا خبر۔ دروازے میں ہی تو موئے پولیس والے کھڑے تھے۔ باہر کیسے بجاتی۔"

"اب کیا کریں سکھاں؟" اسے کوئی راہ نظر نہ آئی۔

"وہ تو ٹیکل بھائی کو بھی اس بات سے بے خبر رکھنا چاہتی تھی اور ان کے والدین کو بھی۔ کیلی جو ہر کیا کرتی۔"

"سکھاں تم ایسا کرو۔۔۔۔۔ ان سے چا کے کہہ دو کہ گھر کوئی مرد نہیں ہے جو آپ سے بات کر سکے۔۔۔۔۔ مگر نہ نہ۔۔۔ ایسا نہ کہو۔"

اس نے پھر بھاگ کر جو ہر کا نمبر ملایا۔ وہ شاید فون کے قریب موجود تھیں۔

"آپ! میں کیا جواب دوں۔۔۔۔۔ وہ گھر کسی مرد کا پوچھ رہے ہیں۔"

"کہہ دو گھر کوئی نہیں اور یہ بھی پوچھ لو کہ وہ یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔ کیوں میں آ جاؤں۔"

"نہیں آپ! آپ آئیں گی ڈرائیور ساتھ میں ہوگا خواہ مخواہ کی تشہیر ہوگی۔ آپا۔۔۔۔۔ آپا۔۔۔۔۔ یہ کیا مصیبت آن پڑی۔ جیسے ناوہ شہیر کی وجہ سے آئے ہیں۔ مگر نہیں اس گھر کا پتا کس نے دیا؟ کیسے خبر ہوئی انکس؟"

"گوری! میری بیاری بہن اگر تم میرا آنا مناسب نہیں سمجھتیں تو صحت کر دو اور خود ہی پوچھ لو۔ آخر وہ انسان ہی ہیں۔ اس ملک کے قانون نافذ کرنے والے ادارے کے ملازمین اور تم چاہتی ہو نا فرد جرم کسی مجرم پر ہی عائد ہوتی ہے۔ کیا شہیر دانی ہات ہی نہ ہو کوئی اور وجہ ہو۔ تم صحت کر دو اور دروازے پر جا کر پوچھ لو۔"

گوہر تھقی دیر سوچتی رہی۔

"اچھا آپا۔۔۔۔۔ تقدیر میں یہ دن تھا تو شکوہ کیسا۔ میں جا کے پوچھتی ہوں۔"

☆☆☆☆☆☆

دو دروازے پر آئی اور واہ اندر سے بند تھا سکھاں نے دروازہ کھولا۔ دروازے کی اوٹ سے گوہر نے دیکھا

باوردی پولیس کے تین آدمی دروازے پر کھڑے تھے۔

"گھر کوئی مرد نہیں ہے۔ آپ کو جو کہتا ہے بی بی سے کہہ دیں۔"

"آپ عاتق صاحب کی کیا گتھی ہیں بی بی؟"

"یہ کوئی ضروری سوال نہیں ہے۔ آپ بتائیں آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"ہمارے پاس شہیر شاہ نواز ولد شاہ نواز عسکری کے ہارنٹ گرفتاری ہیں۔ ہم اس کی تلاش میں ہیں۔ پولیس

نو اطلاع ملی ہے کہ وہ یہاں رہتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے گھر موجود نہیں ہے۔"

"آپ کو ملتے والی سیاطلان یا لکس مٹلا ہے۔ وہ یہاں رہتا تو کیا آتا بھی نہیں ہے۔"

"ہمارے پاس دو دو نمبر شدہ لکس کیوں کی برآمدگی کا حکم نامہ بھی ہے جنہیں شہیر نے لخوا کر کے کبھی چھپا دیا ہے۔"

"لیکن ہمارا ان باتوں سے کیا تعلق آپ شہیر کو تلاش کریں۔ ایک عزت دار گھر کے باہر کھڑے ہو کر اس گھر کے پینڈوں کے لیے رسوائی اور ذلت کا سامان تو پیدا نہ کریں۔"

"پولیس کو اپنے ذرائع سے ملنے والی اطلاع غلط نہیں ہوتی۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ دونوں لڑکیاں اندر موجود ہیں۔"

"آپ کو قطعاً ایک بے بنیاد الزام کے تحت ہماری توجہ دینے کی اجازت نہیں۔"

"میں پولیس انسپشن عہد شدہ پورکا اے۔ اس۔ آئی ہوں۔۔۔۔۔ میرے پاس سرچ وارنٹ ہیں اور میں اس گھر کی

"پولیس شہیر کی گرفتاری کے لیے اس کی تلاش میں ہے۔"

"اور مانی گاڈ۔۔۔۔۔ تمہیں کس نے بتایا؟"

"مائی جان نے۔"

"کیا تم یہ سچ نہ ہو۔"

"کیسے سچ نہ ہو۔ کوئی بھی شخص اتنا برا جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

"پھر اب کیا ہوگا؟"

"آپا۔۔۔۔۔ اماں بابا آج ہی لاہور گئے ہیں۔ اسری بھائی بھی گھر نہیں ہیں اور مانی نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ آپا میں تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ شہیر ایسا ہوگا۔"

وہ یہ کہتے کہتے رو پڑی۔۔۔۔۔ سسکیاں ماؤتھ میں سے گزر کر جوہر کے کانوں میں پڑیں۔ وہ بھی بے چین ہو گئیں۔

"شہیر ہے کہاں؟"

"مجھے کیا خبر؟"

"اس کا کوئی ٹھکانا کوئی ٹیلی فون نمبر؟"

"کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں۔ میں کیا کروں۔ اس معنی کی خبر میرے کان تک بھی پہنچ گئی ہے آپا۔۔۔۔۔ رشتے داروں میں بھی ہے۔ ملنے والے بھی جان گئے ہوں گے اور اب شہیر بچا گیا تو اس کی خبر بھی سب کو ہو جائے گی۔ وہ کیوں ایسا کرتا ہے۔ اس نے ایسا کیوں کیا۔۔۔۔۔ آپا۔۔۔۔۔ کیا اسے خبر نہ ہوگی کہ یہ تعلق کے راستے ہیں۔ اس کا مستقبل خراب ہو جائے گا۔ ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں گی اور کچھ نہیں تو اسے اپنے اونچے خاندان کی لاج رکھ لینا چاہیے۔ آپا۔۔۔۔۔ اسے ڈھونڈیے۔ اسے سمجھائیے۔ اماں نے میرے لبوں پر اپنی تین آرزوؤں کی تکمیل کا قتل لگا دیا ہے۔ میں تو کچھ بولنے کے قابل بھی نہیں رہی۔"

"بی بی!۔۔۔۔۔ گوہر بی بی!۔۔۔۔۔ باہر پولیس والے آئے ہیں۔"

"پاپ۔۔۔۔۔ پولیس۔۔۔۔۔"

"بہا کہا پولیس۔۔۔۔۔ جوہر نے بھی سن لیا تھا۔"

"آپا!۔۔۔۔۔"

"تم ایسا کرو سکھاں کو باہر بھیج کر بہا کراؤ۔ میں تمہیں خود روٹ کر لوں گی۔"

"نہیں آپا۔۔۔۔۔ نہیں تم فوراً آ جاؤ۔ مجھے ڈرگ رہا ہے۔ پولیس یہاں کیا کرنے آئی ہے۔ کیوں آئی ہے۔"

"تم اسے سمجھو۔۔۔۔۔ سکھاں کو جانے پوچھے کیا بات ہے۔"

گوہر نے ریسپونڈ کر دیا۔ کاپٹی ڈالتی باہر آئی۔ سکھاں اس سے بھی زیادہ گھبرائی ہوئی تھی۔

"بی بی! اب کیا ہوگا۔"

گوہر نے لگتی۔ آنسو پاپ کر کر نہیں بھگوانے لگے۔

"تم سے کیا کہا ہے انہوں نے؟"

"گھر میں کوئی مرد موجود ہو تو باہر بھیج دو۔"

"جگ ہی کون کون تھا؟"





ملائی لینے کا جواز ہوں اور آپ کو پتا ہے سرچ وارنٹ کے ساتھ تو کسی سے پوچھتے کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی مگر میں بذاتہ خود شرارت کا قائل اور قہر دان ہوں اور چاہتا ہوں کہ ان لڑکیوں کو نہیں آپ نے چھپا رکھا ہے چپ چاپ ہمارے حوالے کر دیجیے ورنہ بی بی میں مجبور ہوں گا کہ اندر داخل ہو کر انہیں ہلاک کروں۔

آپ کیا کہہ رہے ہیں..... کیا چاہتے ہیں۔ تہہ تم کسی شہیر کو جانتے ہیں نہ میں لڑکیوں کی خبر ہے۔ آپ یہاں سے چلے جائیں۔

آپ کو شاید خبر نہ ہو کہ آپ کے گھر کے چاروں طرف پولیس کا پہرہ ہے۔ آپ ان لڑکیوں کو کہیں اور منتقل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ عام حسنین عسکری اس شہیر کے معزز اور شریف انسان ہیں۔ ایک پولیس مین کی حیثیت سے میں اپنا فرض ادا کروں گا۔ لیکن انسان کی حیثیت سے میں احتیاط کر رہا ہوں کہ آپ کو کون کا نام درمیان میں نہ آنے پائے۔

آپ شہید یہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ یہاں پر کوئی نہیں ہے سوائے ایش خانہ کے۔ آپ جا رہے اور اورا پنے کس کی نئے سرے سے تفتیش کیجیے۔

دروازے پر پولیس وین کے ساتھ ایک اور گاڑی رکھی۔ گوہر نے یہاں اختیار کھان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

سکھاں باہر دیکھو کون آیا ہے۔ کہیں نکل بھائی تو نہیں آئے۔ وہ گھبرا گئی۔

سکھاں نے باہر جھانکا۔

پتا نہیں بی بی یہ تو کوئی جیب ہے۔ ابھی ابھی زکی ہے۔

گوہر دروازے سے ہٹ گئی۔ آنے والا پولیس والوں سے کچھ کہہ رہا تھا اس کی نظریں آنے والے کی شکل تھیں۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ یہ آواز اس کی جانی پھانی تھی۔ شک یقین میں بدل گیا۔ کیونکہ چند لمحوں بعد کریم کلر کے شلوار ٹیٹس میں پولیس..... شہیر عسکری اس کے سامنے تھا۔

گوہر کے چہرے پر ہوا یان اڑ رہی تھی۔ شہیر نے حیرانی سے اسے دیکھا وہ اندر بھاگ آئی۔

ان ہی پولیس والوں نے جو سرچ وارنٹ لے کر اس گھر پر چھاپ مارنے آئے ہیں۔ جنہیں یقین ہے کہ آپ یہاں ہیں۔

وہ آپ کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے تو آپ کو کچھ اور سمجھا تھا۔

میرے بے ڈوب مرے کا نظام ہے کہ آپ..... آپ ایک مجرم ہیں۔ آپ کو کیا فرق پڑے۔ عزت تو میری اور میرے بابا کی خراب ہوئی۔ جب اس گھر کے دروازے سے پولیس آپ کا کھنڈنی پہنا کر لے جائے گی۔ کاش آپ نے کچھ سوچا ہوتا۔

اپنی بیگمناں کا کوئی ثبوت مردست میرے پاس نہیں ہے لیکن میں بہت جلد اپنے بے وار ڈاس کے ساتھ تمہارے پاس آؤں گا۔ میں تمہاری عزت کا تحفظ ہوں دشمن نہیں۔ پولیس کو مجھے گرفتار کرنے کا ارمان نہ۔ کیونکہ بعض افسران کی جیبیں ایک موٹی رقم گرم کر چکی ہے لیکن فکر نہ کرو۔ یہ گرفتاری اس دروازے پر نہ ہو گی۔ پولیس مجھے پھانسی نہیں۔ میں یہاں سے نکل کر شہر پولیس اسٹیشن پہنچ جاتا ہوں۔ تم نے بہت بڑا الجھن دیا ہے جو یہ اس سنگ رقم کی ہڑت کی میری بہن اور ہر عورت میری ماں ہے جن کی حفاظت میں اپنا فرض خانی کرتا ہوں اور تمہیں خبر ہے کہ ہر کسی کی راہ بڑی سخت ہوتی ہے۔ میں جہاد لہو چار رہا تھا ایک نظر تمہیں دیکھنے کو اس برف آ گیا۔ اچھا تو نہ آتا۔ جب میں یہاں سے چلا جاؤں تو انہیں بتا دینا کہ میں شہیر تھا۔ وہ فوراً میرے ناقب میں۔ ڈر نہیں گے اور تم ان کے لائٹھی سوال و جواب سے قح جاؤ گی۔

وہ پولیس جانے کو پلٹا اور تیز قدم اٹھاتا دروازے پر پہنچ گیا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

بی بی عبداللہ پور پولیس اسٹیشن کے احاطے میں رکی۔ شہیر نے ڈرائیونگ سیٹ سے ایک جست لگا کر باہر نکلا کر اعرا احمد گھسا۔ پولیس کا عملہ اندر دفتر میں موجود تھا۔ ایک سپاہی دروازے پر کھڑا تھا۔

اپنے افسران کو مطلع کر کے ایک مجرم شہیر عسکری اپنے جرائم کے ثبوت کے ساتھ باہر موجود ہے۔ اس کے بچے میں خطر تھا۔ سپاہی نے حیران ہو کر اسے دیکھا اور اندر چلا گیا۔

سر آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔

شہیر پلٹ کر جیب کی طرف آیا۔

میں اندر جا رہا ہوں۔ آپ سب لوگ بھی وہیں آ جائیے گا۔

بہتر شہیر جی۔ ایک نو جوان نے جواب دیا۔

شہیر مطمئن انداز اور پرسکون چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

مجھے شہیر کہتے ہیں۔

ایس۔ ایچ۔ اے اے نے ہنسی اور پراٹھا کر گردن میز جی کر کے اسے بغور دیکھا۔

تو تم بو خیر اسکے دوہرے دانے کے حامل مجرم۔

ہاں میں..... جسے آپ کے سب آرزو تھیں مگر گرفتار نہیں کر سکتے۔ میں اپنی انوائی ہوئی لڑکیوں اور ان کے

شوہروں کے ساتھ آیا ہوں۔ ان کا بیان لے لیجئے اور مجھ پر فرد جرم عائد کر کے مجھے حوالہ دے دیں۔ میں بند کر دیجئے۔

”نوجوان تم کیا کہہ رہے ہو۔ ایک تو چوری اور پھر سیدھی زوری۔“

”آپ کو یہ دکھانا کہ آپ کے عملے نے میرے ہاتھوں میں ہتھیاری نہ پہنائی۔ محترم جو شخص اپنے آپ کو خود قانون کے حوالے کر دے اس کے لیے زنجیروں کی کیا ضرورت۔ میں اقبال جرم کرتا ہوں ایسے۔ ایچ۔ او صاحب۔ میں نے دو اجڑے گھروں کو بچانے کا جرم کیا ہے۔ دلوں کی بستیاں بسائے رکھنے کا جرم کیا ہے دو خواتین کو عدم تحفظ کے احساس سے بچانے کا گناہ کیا ہے۔ آپ کا قانون اس جرم کی جو سزا دے مجھے قبول ہے۔“

”نوجوان..... تم اپنے جلیبے سے ایک معقول انسان اور باتوں سے تعلیم یافتہ نوجوان لگتے ہو۔ تمہیں ان باتوں میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم جو بھی کہو کہتے رہو لیکن تمہارے خلاف ایف آئی آر درج کرائی جا چکی ہے۔ وہ لڑکیوں کے اغوا کی اور تمہیں خبر ہے یہ جرم حدود آؤ۔ ایف آئی آر کے تحت آتا ہے۔“

”سب جانتا ہوں۔ سب خبر ہے لیکن یہ بھی جانتا ہوں قانون کو اندھا آپ لوگوں نے بنا رکھا ہے۔ دراصل قانون اندھا نہیں ہے اس میں بہت سی گنجائش موجود ہے۔“

”میں قانون کے متعلق کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا نور محمد..... اس نوجوان کو حوالہ دے دیں۔“

ایس۔ ایچ۔ او نے ریسیور اٹھایا۔

”السلام علیکم..... وہ کسی اسرائیلی ہی کا فون تھا۔ ایس۔ ایچ۔ او نے اختیار اختیار کر لیا۔“

لائن پر ڈی۔ آئی۔ جی صاحب تھے۔

”تمہاری لکھی ہوئی ایف آئی آر کے مطابق ایک عظیم شہرہ منگول تمہارے پاس از خود پہنچ چکا ہوگا۔“

”کیا میں جان سکتا ہوں۔ یہ ایف آئی آر تم نے کن شاہد کی بنیاد پر درج کی۔ مسٹر ایاز رسول۔ اپنے بھرتا اتار دو۔ تم معطل کیے جا چکے ہو۔ ایف آئی آر تمہارے خلاف درج ہوئی کہ تم نے صحیح طریقے پر تحقیق کیے بغیر ایک شریف نوجوان کو ڈسٹرب کیا۔“

”سر..... عملے نے جو رپورٹ دی تھی۔“

”جو اس بند کر دو۔ عملے نے رپورٹ تمہارے حکم پر تیار کی۔ تمہاری مرضی کے مطابق..... اس لیے کہ پچاس ہزار کی رقم تمہارا پیسہ بھر کے تمہارا دامغ خراب کر چکی تھی۔ تمہیں فرض یا نہیں تھا۔ صرف ان لوگوں کی خوشنودی مطلوب تھی جو تمہاری عمرانی اور سرپرستی میں دن دہانے سے ڈاکے ڈالوانے اور غریبوں کو لوٹنے کا بیج بھل کرتے ہیں۔ جنہوں نے اس علاقے میں غریب کی زندگی عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ میں نے یہ کس بذات خود حل کیا ہے۔ ایسا ایسا غدار انسانوں کی عمرانی میں۔ اسے میرا ایک نیا تجربہ ہی کہہ لو..... میں ایک سپاہی کے روپ میں اس گاؤں کی جلیبوں میں پھر رہا ہوں۔ ساری مصنوعات لی ہیں میں نے۔ ابھی اور اس وقت اپنی سیٹ چھوڑ دو۔ تحریریں حکم نامہ بھی پہنچنے والا ہے اور تمہاری جتنی نیئے والا اس۔ ایچ۔ او بھی اس بے بنیاد مقدمے کو وہی خارج کرے گا..... اور تمہیں کچھ ہی آتا ہے میرے پاس..... جواب دہی کے لیے..... میں تم پر بھی فوجداری کیس کے بغیر عائد نہیں

لوں گا۔ کیونکہ میں انصاف پسند ہوں۔“

رابطہ کٹ گیا۔ ایاز رسول پھر کرسی پر بیٹھ نہ سکا۔

دو نوجوان اور ان کے ساتھ موجود لڑکیاں اندر آ چکی تھیں۔ شبیر نے انہیں دیوار کے ساتھ رکھی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود کرسی پر بیٹھ گیا۔

اسی اثنا میں باہر ایک موٹر سائیکل رکا۔ سب نے دروازے کی طرف دیکھا۔

”مجھے سرفراز علوی کہتے ہیں۔ تقرری کے حکم نامے کے ساتھ حاضر ہوں۔“

وہ جا تک شبیر کی طرف متوجہ ہوا۔

”میں شبیر عسکری ہوں۔“

”وہ شبیر صاحب ڈی آئی جی صاحب نے تاکید کے ساتھ ذکر کیا تھا۔ اچھا ہوا آپ خود ہی یہاں شہر شریف فرما ہیں۔ ڈی آئی جی صاحب کے حکم پر میں نے عبداللہ پور کے چند روسوا افراد کے بیانات لیے..... ان لوگوں میں سے چند ایک تھے جو نہ جانے کس کس کی بنا پر آپ کے خلاف ذہر ڈال رہے تھے۔ یا سکندر پور کے مبین واسطی جنہوں نے آپ کے خلاف کیس درج کرایا۔ ورنہ ہر شخص آپ کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ آخر ان لوگوں کو

آپ نے کیا گھول کے پلایا ہے۔“

”صرف جتنی خلوص اور محبت۔“

”قابل تقلید نسخہ ہے۔ میرا خیال ہے پولیس کا کلک سے اپنا لے تو مجرم خوف کھائیں گے شریف لوگ اعتماد کریں گے جبکہ فی زمانہ معاملہ بالکل الٹ ہے۔“

”میں ہاں پولیس کا اعتماد پنا کر ہی یہ معاش لوٹا۔ دن دہانے جرم کرتے ہیں اور پولیس کی بے پرواہی بلکہ مہمانہ غفلت کے سبب غریب لٹ جاتے ہیں۔“

”تصا اہل میں ہے کیا؟“

”جی جو عام لوگوں نے آپ کو بتایا ہوگا اور جو میں ڈی آئی جی صاحب کو بتا چکا ہوں۔ یہ لوگ بیانات کے لیے حاضر ہیں اور میں بھی..... میں چند دن کی رخصت پر آیا تھا۔ مجھے شام کو بلا ہوا۔ پڑھائی کا خاصا حرج ہو چکا ہے۔“

”آپ..... آپ اسٹوڈنٹ ہیں؟“

”جی ہاں ایم۔ اے پر پوئیس کا۔“

”سبحان اللہ سبحان اللہ ابھی سے یہ عالم سے تب کیا ہوگا جب..... ویسے میرا مشورہ ہے عسکری صاحب آپ پولیس کی ملازمت اختیار کیجئے گا۔ اس لیے آپ کو آپ جیسے انسانوں کی ضرورت ہے۔ ایاز رسول صاحب پلیز چارج دے دیجئے مجھے۔ تاکہ میں بے بنیاد ایف آئی آر کو اختتامی کارروائی کے بعد داخل دفتر کر دوں اور رپورٹ اوپر پہنچ دوں۔“

ایاز رسول کے چہرے پر ہوائیاں تیز اور جی تھیں۔ اس نے فائل کھولی۔ سرفراز علوی شبیر سے باتیں کرنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆

”میں..... میں..... میں.....“ شبیر نے آواز کو بیروں میں گونج رہی تھی۔



”مئی.....! جی..... عذرا..... بھئی کہاں ہیں سب لوگ؟“  
 مئی نے اپنے کمرے کے دروازے سے جھانکا۔ شبیر بھاگ کر ان کی طرف گیا۔

”مئی..... مئی.....!“

شبیر ان سے لپٹ گیا۔

”آپ کو مبارک ہو مئی۔ آپ کے بیٹے کا ایک چھوٹا سا مشن کامیاب رہا۔“

”کیا ہو مئی؟ لڑکیاں اپنے اپنے گھروں میں چلا گئیں؟“

”صرف لڑکیاں اور مئی وہ بد عنوان افسر بھی معطل ہو گیا۔ جس نے مجھے گرفتار کر کے جیل میں ڈالنے کی سوچ رکھی تھی۔ مئی ڈی۔ آئی۔ جی صاحب بہت اچھے انسان ہیں ان کے دفتر کے دروازے ہر انسان کے لیے کھلے ہیں اسی سبب میں تو سیدھا ان کے پاس چلا گیا۔ انہیں صورت حال بتائی مئی انہوں نے تو کمال کر دیا۔ خود ایک سپاہی کے روپ میں عبداللہ پور پہنچ گئے۔ ساری تحقیق خود کی۔ مجھے بے گناہ پا کر شہ سے انتہائی محبت سے پیش آئے مئی وہ سارا معاملہ مدفع دہج ہو گیا۔“

مئی نے شبیر کی پیشانی چوم لی۔

”شخی ایہ بات بہت اچھی ہے۔ لیکن اب بھی تمہیں بہت کچھ کرنا ہے بیٹے۔“

”مجھے بھی خبر ہے مئی۔ پتا ہے ڈی۔ آئی۔ جی صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ ابھی میری سفارش کرتے ہیں۔ تاکہ میں بہ طور اسپیکر تعینات کر دیا جاؤں۔ میں نے یہ مشکل انہیں کمال کیا کہ سر! ابھی تو مجھے پراہنا ہے۔ بہت کچھ کرنا ہے۔ میری مئی مجھے بہت بڑا فسر دیکھنا چاہتی ہیں۔ اس لیے نہیں کہ بڑے افسر کے پاس پیسہ بہت ہوتا ہے بلکہ صرف اس لیے کہ بڑے افسر کے اقدارات کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے اور وہ انہیں حق داروں کے لیے استعمال کر کے معاشرے کو پر امن بننے میں مدد دے سکتا ہے۔ مئی وہ بہت خوش ہوئے۔ ان کی تو میرے ساتھ دوستی ہو گئی۔ ہاں جو اس کے کہہ اگلے سال ریٹائر ہونے والے ہیں۔“

”اس کا کیا ہے تیرے ڈیڑھ بیٹی تو تیرے دوست ہیں وہ کون سے جران ہیں۔“ شبیر نے قہقہہ لگایا۔

”مئی..... آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے آپ بھی میری۔“

”ہاں ہاں سہلی عی ہوں تمہاری۔“ مئی نے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”شام میں جا رہا ہوں مئی.....!“

”بالے بیٹے! بھری کانون آجاتا۔ آسنے کی تاکید کر رہا تھا۔“

”وہی تو میں بتا رہا تھا۔“

”شبیر..... اندر آ جاؤ مجھے تم سے بہت کئی باتیں کہنا ہیں بیٹے۔“ وہ بہت خوش تھیں۔

وہ اندر آیا اور صوفے پر بیٹھ گیا مئی ساتھ بیٹھ گئیں۔

”شبیر بیٹے۔“

”جی مئی.....“

”اس گھر پر تمہارا ڈیڑھ سارا حق ہے شبیر!۔“

”میں نے کب کہا کہ نہیں۔ حق تو تمہیں دیتی ہیں اور آپ کو مجھ سے محبت ہے۔“

”نہیں بیٹے اس کے علاوہ بھی ایک بات ہے۔“

”وہ کیا مئی؟“

”ہے ایک بات..... جو آج سے پہلے خود مجھے بھی معلوم نہ تھی۔“

”آج کیسے معلوم ہوئی؟“

”تمہارے الہم میں ایک تصویر دیکھ کر۔“

”تصویر دیکھ کر..... تصویر دیکھ کر کون سی بات معلوم ہوئی جس نے میرا حق آپ پر واضح کر دیا۔“

”بیٹے بہت بڑا حق..... تصویر میں تمہارے ساتھ تمہارے والد ہی ہیں۔“

”اجھا وہ تقسیم انعامات کے جلسے والی تصویر ہے جی ہاں مئی وہ میرے والد ہی ہیں۔“

”شخی تب تو یہ محبت بالکل بھی بے غرض نہ تھی۔ شخی میں تمہیں کیسے بتاؤں میرے بچے۔ میں تو..... میں تو.....“

”مئی..... تم نے میرا وہ بچہ ہے بچے۔ تو تو وہ اتنی میرا بیٹا ہے شخی..... کچھ کچھ کا بیٹا..... یہ تمہارے والد۔ جن کے ہم کا بھی مجھے غم نہ تھا۔ انہیں میں نے اسی ہسپتال میں دیکھا تھا۔ تمہارے والد کی حیثیت سے جب وہ میرا شکر یہ ادا کرنے میرے پاس آئے تھے۔“

”آپ کے پاس میرے پاپا..... یہ کیسی خبر ہے مئی؟“

”ماں بیٹے۔ بیان دنوں کی بات ہے جب تم پیدا ہوئے۔“

”میں پیدا ہوا..... آپ کو کیا خبر مئی..... میں کہاں پیدا ہوا۔ کب پیدا ہوا کیونکر پیدا ہوا۔“ وہ مسکرایا۔

”مجھے سب خبر ہے۔ سب خبر..... کتنے برس گزر گئے ہاں ہاں اس وقت تو عدی اور عذرا بھی نکلیں تھے۔ میں

یہ چیزیں سے گزرتی تھی میرے بچے ہونے والا تھا۔ گرنے سے پہلے کے اندر ہی ختم ہو گیا۔ آپ ریشم کے ذریعے

سردہ بچہ پیدا ہوا۔ میں سخت علیل تھی چار ماہ مجھے ہسپتال کے کیمبل وارڈ میں رہنا پڑا۔ کیمبل وارڈ نمبر تین میں سات

دن میں بے ہوشی رہی۔ ہوش میں آئی تو بچے کے رونے کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ سردہ کے بعد کئی

مدت میرے ہاں کئی بچے نے جنم لیا تھا اور میں بیٹے کی از حد خواہش مند تھی۔ میں نے ڈاکٹر زاہرہ زوسوں سے

بلکہ تمہارے ڈیڈی سے تقاضا کرنا شروع کر دیا بچے کا..... میری حالت کے پیش نظر کسی نے مجھے نہ بتایا کہ بچہ

چکا ہے اور مجھے بچہ لادیا گیا مجھے خبر نہ تھی وہ تم تھے شخی چھوٹے سے کمزور سے مصوم سے بیٹے..... تمہاری ماں

تمہارے پیدا ہوتے ہی مر گئی تھی..... میں نے تمہیں اپنی آغوش میں بھر لیا۔ میری ممتا تم پر ٹار ہو گئی۔ تمہیں دیکھ کر

مجھے نئی زندگی مل گئی..... اور شاید تمہیں بھی کہ دونوں سے تم بچل کے دوہ کہ منہ لگا رہے تھے نہ کسی اور چیز کو.....

شخی..... (وہ رونے لگیں) شاید تمہیں ممتا کی ضرورت تھی اور مجھے بچے کی ہم دونوں ہی بہل گئے.....

میری رگوں میں دوڑا لہو دودھ کی صورت تمہاری زندگی کا ضامن بن گیا اور مجھے..... میری ممتا کو تمہارے

وجود کے سہارے نے زندگی دے دی۔ تم پورا ایک ماہ میری آغوش محبت میں رہے۔ جمال ان دنوں باہر تھے۔

ڈاکٹر نے ان کے مشورے پر تمہارا وجود میری جمبلی میں ڈال دیا تھا۔ لیکن ایک ماہ بعد یہ خبر نکلی کہ طرح بچہ

گرمی کہ تم میرے پیٹے نہیں ہو۔ جمال نے فون پر مجھے بتایا حقیقت سے آگاہ کیا۔ کیونکہ تمہارے والد شاہنواز

تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے..... وہ دن بھی میرے لیے قیامت جیسا ہی تھا۔ جب تم مجھ سے جدا ہو

گئے۔ اسی دن میں نے تمہارے والد کو دیکھا وہ میرا شکر یہ ادا کرنے آئے تھے۔ لیکن مجھے ایک دشمن نظر آئے

تھے۔ میں نے ان سے کہا۔

”بھائی صاحب اس بچے کی ماں نہیں ہے اسے میری ضرورت ہے آپ اسے میرے پاس رہنے دیں۔“

انہوں نے رکھائی کے ساتھ ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا۔

"اس سچے کی ماں نہیں ہے خاتون! سنیں باپ آپ ہے۔ اسے میں پرہیزگاروں دے سکتا آپ کو۔ یہ باری خاندانی روایات کے لیے ایک وجہ ہوگا..... میں اسے اپنی زندگی میں رکھ سکتا ہوں۔ لاکھوں روپے بھی خرچ کرنے پر تیار ہوں۔ لیکن اپنے بچے پر سنے پانک کی مہر لگانے پر تیار نہیں ہوں۔"

ابو اس نے بے دردی سے میرے سارے جذباتوں کا خیال کر دیا۔ تم بیٹھے گئے پھر اٹھ گئے لیکن ایک نئے منہ جو وہ کئی گرنی کا احساس ایک من موبہ ہے۔ جہنم کی نری برہوں یاد رہی تھی پانی رشتا جسے خبر نہ تھی تم کیسے رہے نہیں رہے لیکن یقین کرو شہنشاہ ایک سال دو ماہ بعد عذرا اور عدنی جڑواں بچوں کی صورت میں میری زندگی میں آئے تب بھی میں تمہیں نہ بھلاؤں گی۔"

انہوں نے اسے اپنے ساتھ نہیں لایا۔

"میں تمہاری ماں ہوں۔ شہنشاہ..... سچ سچ تمہاری ماں۔"

"ماں..... ماں..... ماں....." شہنشاہ سسکتا اٹھا۔ اس کی آنکھیں مڑ سنے لگی۔ مٹی نے بے تحاشا اسے چوما۔ شہنشاہ انہیں بہنو روکھتا رہا۔

"شہنشاہ! میرے بچے یہ بھی تقدیر ہی ہے۔ پھنڈے کی انداز سے لے لیں۔ تمہاری اور عدنی کی بڑی اور محبت بھی شاید لیو جس دوڑنے والے اس خون کی جڑوں میں منت گئی۔ شاید خوشیوں نے اپنے آپ کو پہچان لیا تھا۔ جو میرے وجود سے تمہارا وجود میں اتر گیا تھا۔ یہی کشش تمہیں ایک دوسرے کے قریب لاتی۔"

"امی..... اچھی مٹی..... پیارنی مٹی..... یہ خبر میرے لیے دنیا کی سب سے بڑی خوشی کی خبر ہے۔ ایک مضبوط تعلق۔ ہم سب کے درمیان موجود تھا۔ کیسی اچھی بات ہے یہ۔ مٹی..... مٹی..... امی میں آپ کو عزیز تھا تو آپ میرے پیچھے کیوں نہ آئیں۔"

"میں بہنو جو مٹی بننے..... بتایا ہے پورے چار ماہ پہلے ہی اور پھر بحال بھی ملک میں نہ تھے اور کوئی ایسا نہ تھا جو تمہارا پتا کرنا جمال آئے تو شاہنواز کو نہ ڈھونڈ سکے۔ آج جب میں نہیں بتاؤں گی شہنشاہ دیکھنا وہ کتنے خوش ہوں گے۔ کتنے خوش۔ جلدی سے سدرہ کو خط لکھو اسے بتاؤ۔ تم باق ہو جسے اس کی ماں ایک عرصے سے ڈھونڈ رہی تھی۔"

شہنشاہ میں ایک بیچل سی سچ مٹی خبر اچھی ہو پوری انسان اسے بہت جلد اپنے پیاروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ شہنشاہ نے اس خوشی کو دل سے محسوس کیا اسے گوبر یاد آئی۔ گوبر..... جو اسے متاثر کرنے والی پہلی بڑی مٹی تھی۔

گوبر..... جو اس کی چند عزیز چیزوں میں سے ایک تھی۔ وہ بے اور وقار کی مالک گوبر خوب صورت اور حسین گوبر..... وہ گوبر جس کی ذماتہ نے اسے سدرہ کو متاثر کیا تھا۔

گوبر کی یاد کیا آئی..... ایک ترم کا احساس بھی ساتھ سے تھی۔ کتنا یہ تیز تھا وہ..... مارے ترم کے یہ خبر کسی کو نہ دے سکتا تھا..... کہ اس کو گوبر سے منسوب کر کے ایک اگلی مٹی اس کے ہاتھ میں پہنچا دینی تھی۔ اگر وہ ب میں رکھی اگلی مٹی ہاتھ میں لے وہ مٹی کی طرف گیا۔ جوتن پر کسی سے باتیں کر رہی تھیں اسے دیکھتے ہی انہوں نے بات ختم کر دی۔

"....." وہ سر جھکائے ان کے سامنے کھڑا تھا

"کیا بات ہے بیٹے۔ میں جہاں سے بات کر رہی تھی۔ بہت خوش ہونے ہیں، ادھیڑن کر۔"

"مگر مٹی آپ یہ سن کر خوش نہ ہوں گی؟"

"یہ..... اگلی مٹی ہے مٹی۔"

انہوں نے اگلی مٹی ان کے سامنے کر دی۔

"لو بیٹو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ مگر یہ کس کی ہے۔"

"میرنی ہے مٹی!"

"تسہاری؟"

"جی ہاں! مٹی کی اگلی مٹی۔"

"اوہ میرے خدا! یہ سچی مٹی ہے جس کی خبر ماں تک کو نہیں ہے۔"

"خبر تو مجھے بھی نہ تھی۔ لاہور کیا تو بیچا جان۔ نے کچھ کچھ سے بغیر چچا! ماں سے لہا اور انہوں نے مجھے پہنا

"امی..... مٹی کی مٹی؟ کون ہے وہ بڑی؟ کیا تم نے اسے دیکھا ہے مٹی ہے ہو؟"

"مٹی..... کیسے کی کیا بات ہے؟ کتنے کو تو غدرانے بھی! اسے دیکھا ہے۔ لیکن یقین ماسیہ یہ سب کچھ ہے خبر ہی میں

"....."

"کون ہے وہ؟"

"میرنی پھوکی بیٹی ہے۔"

"نام کیا ہے؟"

"میرنی....."

"کیا کرتی ہے؟"

"مٹی..... کر رہی ہے۔"

"تم کیسے ملے اس سے؟"

"بچپن کے شہر دیکھا تھا۔"

"اور ماں کو بتایا تک نہیں۔"

"مٹی..... آپ نے مجھے ٹریٹ فارورڈ مٹھے میں مدد دینی ہے۔ یہ کہنے میں مجھے کوئی پاک نہیں کہہ دے مجھے اچھی لگی تھی۔ میں نے سوچا تھا۔ کچھ نہ کچھ کر سیر بننے کے بعد آپ کو بلکہ سب کو بیٹوں کا اور مٹی پھوکی کے آگے دامن پہلا کر اسے مانگ لیں مٹی پر چلنے کیا ہوں۔ داخواز بیچا نے سب کچھ آپ ہی آپ کر دیا۔" اس نے سارا کچھ سہولت سے بتا دیا۔

"....." مٹی نے بتایا ہے مٹی اس کے مطابق تو میں یہی اندازہ نکال رہی ہوں کہ وہ بہت اچھی بیٹی ہے۔"

"....." شہنشاہ بڑبڑایا۔ مٹی نہ سمجھ سکیں۔ گوبر کی باتیں کرتی رہیں۔

شہنشاہ نے گوبر میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ غدرانے یہ سن کر کہ مٹی اس کا وہ دھڑکنے والی ہے اپنی ساری سہولتوں کو بہہ جانے پر مدد کو کر لیا تھا اور ہال ان کے بچے ہوں مٹی غدرانے غدرانے سے کھانچ کھانچ کے اپنی آہستہوں میں لے



”حوالات میں.....“

”نہیں.....“

”یقین کرو..... حوالات میں ہی ہوں۔ ملک کا محکمہ پولیس خاصا ترقی یافتہ ہو گیا ہے۔ مجرموں کو ضرورت پڑے تو ٹیلی فون پر اپنے پیاروں سے دل کی باتیں آسانی سے کہہ سکتے ہیں۔“

”تھوٹ بول رہے ہیں آپ..... دیکھیے میں بہت پریشان ہوں۔ اماں بابا لاہور میں ہیں لاہور کی کال اب تک نہیں مل سکی اسری بھائی صبح کے گئے اب تک نہیں ملے۔ میں گھر پر اکیلی ہوں۔“

”حوالات میں نہ ہوتا تو تمہیں تھانڈ ہتے دیتا۔“

”مذاق بند کریں۔ مگر آپ کو کیا؟ کسی کی پریشانی کا آپ کو کیا احساس؟“

”ہاں! کسی کی پریشانی کا اس ناچیز کو کیا احساس! لیکن کسی نے یہ بھی تو نہیں پوچھا کہ کیا افتادہ جھ پر آن پڑی تھی۔“

”آپ بنا ڈیگارا کرتے۔“

”بتا تو رہا ہوں۔ دو دونوں لڑکیاں عبداللہ پور کی تھیں۔ دونوں کی شادی ونے سے کے تحت ہوئی تھی..... ووٹ

سٹہ جانتی ہوا دلے بدلے کی شادی کو کہتے ہیں۔ غلام رسول ہمارا خریب مزارع ہے۔ اس کی بیٹی کی شادی سکندر

پور کے گاؤں کے ایک محض بی بخش کے بیٹے غلام سرور سے ہوئی اور بیٹے عباس کی شادی نبی بخش کی بیٹی سے۔

غلام رسول ایک شریف آدمی ہے۔ عباس اس کا اکتوتا بیٹا..... ساجد و بہت اچھی لڑکی ہے وہ نبی بخش کے گھر میں

بیاد کرتی اور اس نے خود کو گھر کا حصہ سمجھ لیا۔ پورے گھر کے کام کا بوجھ اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھالیا اس کی بہت

تھی۔ نبی بخشوں نے سرور کے دل میں اس کی جگہ بنا دی۔ وہ ماں بہنوں سے احتجاج کرنے لگی۔ ماں کو بدکلامی سے بل

دکھانے سے روکنے لگا۔

ابھر سرور کی بہن رضیہ جس کی شادی عباس سے ہوئی تھی۔ اپنے گھر میں خوش باش تھی۔ کیونکہ صرف عباس ہی

کہا غلام رسول اور اس کی اہلیہ بھی اپنی بہنوں سے شفقت سے پیش آتے تھے۔ پچھلے برس کی ایک عید رضیہ نبی بخش

منے اپنے میٹھے لگی تو ماں باپ نے اسے روک لیا عباس لینے آیا تو بھئی کے بھانے اس کی بہن ساجدہ کو اس کے

ساتھ بھیج دیا کہ ہم اپنی بیٹی اپنے گھر دیکھتے ہیں تم اپنی بہن کو لے جاؤ۔ ساجدہ ایک بل کو سرور اور گھر سے دور

رہنے کو تیار نہ تھی۔ لیکن غیرت کا تھا ضابطہ تھا کہ عباس سے اپنے ساتھ لے آئے سو وہ لے آیا..... ڈیڑھ سال

ہوتے تو آیا۔ ان دنوں میں دونوں لڑکیوں کے ماں بچوں نے بھی جمع کیا۔ ساجدہ کے سر اٹل والے شائے عباس

رضیہ کے پاس گیا تو اسے دھکے دے کر نکال دیا گیا۔

تک آ کے غلام رسول نے یہ مسئلہ یونین کونسل کے چیئرمین کے سامنے پیش کیا۔ جبکہ سرور یا اس کے گھر والے

ساجدہ کو لینے آئے شامیوں نے کسی سے پوچھ کر کہا۔ سکندر پور کے زمیندار نبی بخش کے ساتھ جو گئے۔ انہوں نے

قیمت دے دیا کہ ایک سال بچے اور رضیہ کے ذمہ سال کے اخراجات کی رقم مبلغ پندرہ ہزار روپے دے کر دو ہجرت کو

لے جائیں۔ ابھر کسی نہ کسی طرح رضیہ سے رابطہ ہوا۔ وہ اس ظلم کے حق میں تھی اور ریل سے پہلے گھر آنا چاہتی

تھی۔ میں پچھلے دنوں وہیں تھا عباس نے مجھے بتایا..... میں اپنے طوطہ پر اس مسئلے کا حل سوچ کر تھی بخش کے بیٹے

غلام سرور سے ملنا..... وہ بے چارہ تھی اپنے والد اور والدہ کے زیر نصاب بیوی سے ملنے سے ڈر رہا تھا۔ منے نے

واڈوں اور جوانوں کو ایک دوسرے کے سامنے اکٹرا لیا۔ ہم نے مل کر صلاح و مشورہ کیا اور ایک رات عباس اپنی

مئی تعارف کے لیے جہاں وہ سر جھکانے ان کی شرارتوں کے جواب میں بے بسی کے ساتھ مسکراتا رہا اور پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔ شام کے لیے اپنا سامان پیک کرنے لگی وہیں موجود تھیں پہلے سے اس کا سامان تیار کر رہی تھیں.....

”شہن..... بیٹے غیرت کا مظاہرہ کبھی نہ کرنا..... دل برداشتہ بھی نہ ہونا۔ ہم سب تمہارے اپنے ہیں یہ مگر اور اس کے پاسی بروم تمہیں دیکھ کر کہنے کو تیار ہیں۔ ہماری خوشی اس میں تھی کہ شہن ہوا تو تم سے محبت کرتے تمہیں اپنے ساتھ رکھتے اگر وہ تمہیں نہیں پہچان پارے تو کیا ہوا۔ تمہیں کبھی کسی قسم کی شفقت کی ضرورت نہ رہے گی۔ خود کو ٹھانہ سمجھنا..... تمہارے ڈیڑھی تمہارے تعلیمی اخراجات کا بوجھ بھی اٹھا سکتے ہیں۔ رہائش بوسٹل میں ہی رکھنا۔ عزت نفس کو بچانے کے لیے یہ ضروری ہے۔ تم نے تو ساری عمر ایسی جگہوں پر گزار کی ہے۔ خدا جلد ترقی نصیب کرے گا۔ لیکن ایک اور بات بھی ہے شہن۔ ابھی تم معاشرے کی سدھار کا بیڑا اٹھانے کے قابل نہیں ہو۔ یہ دنیا بے حد ظالم ہے۔ اکثر بے گناہ ہی اس کے عذاب کا شکار ہو جاتے ہیں ہر قدم پر تمہارا سامنا ڈی۔ آئی جی صاحب جیسے انسانوں سے نہیں ہو گا۔“

”آپ نے سچ کہا مئی..... لیکن یہ انصافی کہیں بھی ہو نیچے مشتعل کر دیتا ہے۔ میں ظالموں کو کچل دینا چاہتا ہوں تاکہ ظلم کا نشان مٹ جائے۔ دنیا ظلم و ستم سے پاک خوب صورت کی جگہ ہو جہاں رہنے کو دل چاہے۔ جہاں خوشیاں ہوں ایک دوسرے کی ہمدردی ہو محبت ہو۔“

”بیٹے! ظلم ظالموں کو کچل ڈالنے سے ختم نہیں ہوتا۔ ہاں مگر محبت کی نرمی ظلم کو جاتی موت آپ مارتی ہے۔“

”واہ مئی..... پھر آپ کو خبر ہی نہیں نرمی ظلم کو پھینے کا مومن دیتا ہے اسے شتم نہیں کر سکتی۔ اسے قانون کی بااثری اور اصولوں کی سختی سے پابندی پڑے سے اکتیر سکتی ہے اور میں خود کو ان دونوں عزائم کی نذر کر کے خوشی محسوس کروں گا۔“

وہ مسکرائے لگیں۔

”چنانچہ ماں سے زیادہ سیانا ہے چلو جی ماں نے بھی مان لیا ہے۔ اب تو خوش۔“

وہ ہنس دیا۔ مئی نے پوچھا۔

”ہاں پھر کب خواہ گئے ہمیں ہماری ہونے والی بہو سے۔“

اسے پھر گویا نا آگئی۔ وہ مسکرایا۔

”جب آپ چاہیں گی۔“

”ٹھیک ہے دو بارہ آگئے تو پہلا مسئلہ یہی ہو گا۔“

مئی جلی تفران سے آگے بٹھا کر وہ ٹیلی فون کو ریڈور سے اپنے کمرے میں لے آیا اور اس کی انگلیاں اس نمبر کو تھامنے لگیں۔ جو اس کے دل پر نقش تھا۔

”چلو شیر بول رہا ہوں۔“

”جی..... آپ..... آپ اس وقت کہاں ہیں؟“

”پولیس چلی گئی تھی نا؟“

”وہ لوگ تو اسی وقت چلے گئے تھے۔ میں نے بتا دیا تھا کیا آپ ہی تھے یہاں آنے والے۔ یعنی شیر مگر آپ اس وقت کہاں ہیں؟“

بھن کو اور سرد اور اپنی بھن کو لے کر اپنے اپنے گاؤں سے باہر پیش بانی وے پر۔ مجھ سے آئے۔ میں نے ان دونوں جھڑوں کو وہاں سے پکب کیا اور شہر لے آیا۔ نئی پیش کو ان کی خیر ہوئی۔ تو وہ اپنے زمینداروں کے پاس بھاگا۔ جن کے پاس میں جہاں اور رضیہ کے درمیان صحیح سنائی سے معاملہ طے کرانے میں ان کی مدد لینے کی غرض سے جاچکا تھا اور مجھی بہت سے معاملات میں وہ مجھ سے خاک کھانے لگے تھے۔

انہوں نے نئی پیش کو مشورہ دیا کہ وہ مجھ پر دہرے ہوئے فوجی کا مقدمہ درج کرانے سے اس کی بہادری کو بھگا لے گیا ہوگی۔ سکندر پور اور عبداللہ پور کا مقدمہ فائدہ عبداللہ پور ہی ہے ایسی۔ ایچ۔ او عبداللہ پور نے ہماری رشوت لے کر میرے خلاف ایف۔ آئی۔ آر کاٹ دی۔ یہ تو مجھی اس مقدمے کی اصلیت۔ اس کے بعد کی صورت حالی یہ تھی کہ وہ لوگوں کو جہاں شہر میں کام کرتے ہوئے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوش تھے۔ پولیس میری گرفتاری کے لیے کوشاں تھی مگر تپتی تو آپ کی مانی جان نے کہہ دیا کہ لڑکا واقعی ابوشاہ ہے۔ جہاں سے اسے گرفتار کر لیں میرا شوہر یا ان کا خاندان اس معاملے میں دخل نہیں دے گا۔ تب پولیس کو میرے خلاف طبعی ثبوت ملی گیا۔ سکندر پور کے زمیندار عبداللہ پور والوں سے پرانی دشمنی رکھتے تھے۔ انہیں شاہنواز عسکری کی بے عزتی کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ میرا وہ چار دن حوالات گزارنا کوئی چھوٹی سی بات نہ تھی۔ لیکن میں نے ایسا نہ ہونے دیا۔ خود جا کر ڈی۔ آئی۔ جی صاحب سے ملا سربراہ عیاش رضیہ اور ساجدہ کے بیانات قلمبند کرانے۔ بلکہ ان سے درخواست کی کہ وہ خصوصی ٹیم بھیج کر وہاں آباہی کے اس عمومی مسئلے کا جائزہ لیں اور خاص طور پر اس مسئلے کی تحقیق و تفتیش کرائیں۔ وہ مجھ سے مل کر خوش ہونے اور ساتھ بھی۔ میرے کہنے پر نیم تو نیم وہ خود وہاں تشریف لے گئے۔ لوگوں کے بیانات خورد خورد اور فیصلہ دے دیا۔ میں تو آج بہت خوش ہوں گوہر۔ دو گھروں کو آباد کر کے اور..... ایک عدد بیماریاں قی ماں پاک۔ ایک بد عنوان افسر کو معطل کرانے۔ ایک افسر کی اصلاح کر کے دیکھ کر مگر تم..... تم تو بہت دنوں سے تنگ رہو۔ آج تو کچھ زیادہ تن پریشان ہو۔ انکو بھی واپس کرنے کو بے چین بھی ہو گیا کروں میں آج لا بہرہ دار ہوں۔ آؤں گا تو۔“

”اماں بابا بھی وہ ہیں۔“

”چھو پچا جان اور پچو پچو۔ ایسی گڈ بچہ تو کوئی دیر نہیں گئے گی۔ انکو بھی واپس کر دوں گا۔ ان کے سامنے تم آزاد ہو جاؤ گی۔“

”نہ..... نہ..... شاید سنا ہے کچھے گا۔“

”کیوں؟ تمہاری خوشی تو اسی میں تھی۔ چند دن پہلے مہر تھیں۔ میں ہی پس: پیش سے کام لے رہا تھا۔“  
 ”تین اب نہیں ہوں۔ پلیز آپ انکو بھی مت لوٹائے گا۔“

”کیوں؟ کیوں نہ لوٹاؤں۔ میں تو خاصا امن پسند ہوں غیروں کو رنجیدہ نہیں دیکھ سکتا تم تو پھر بھی میری ایک عزیز شے ہو۔“

”ہے مگر کیا..... پھر یو لا۔“ کبھی تم نے مجھے سوچنے کی سمجھنے کی کوشش کی گوہر۔ ”وہ اس کی آواز کا منکر تھا۔“

”اس کی نصرت ملی ہی نہیں آپ سے پارے میں اتنا بچوں لیا کہ.....“  
 ”کہ ضرورت سے قائم کرنے کو کافی رہا.....“  
 ”یہ فرمائیے!“ اس کی بات کاٹنے پر وہ تپتی تھی۔

”جڑ۔ نہ اب وہ لحاظ کا نظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ ہم اتنی بھنی بزرگ قسم کی چیز نہیں ہیں اور اگر یہ شائستگی ملے یہ وہ جاسم: ہم اس کے سزاوار ہرگز نہیں ہیں۔ ہاں میں پوچھ رہا تھا یہ عذر ایست جمال والا سارا چکر ہے.....“  
 ”تو لیتے لیتے گئے ہمارے اور وہ غریب مزدوروں کی بیویاں۔ گھبریں تو سوچ سوچ کر پاگل ہوتا رہا۔“

”یہ نا بہت ضرورتی ہے کیا؟“

”یہ فیصلہ نتیجہ۔“

”تو سنا ہے پیرانے میرے ذہن نے سوچ بچار کے بعد قائم کی ہو۔“  
 ”تاہن سے ایک ہم تا ممکن۔“

”تو؟“

”وہ اس لیے کہ پیسے یہاں کی دو چار بھٹھرا قاتوں میں تمہاری آنکھوں میں میرے لیے ایسے گہو ہرنے اس... بات کاٹ دی۔“

”یہ صرف میری عمر تجربے سے خالی سی میری قابلیت مشکوک تھی..... شاید ایسا ہوا کہ نا تجربہ کاری اور عدم قابلیت نے ہی میری سوچوں کو بد رنگ دیا ہو۔ لیکن..... میں نے یہ فیصلہ از خود کیا تھا۔“  
 ”تو نہیں جان سکتا کہ تم نے یہ فیصلہ از خود کیا تھا۔ ہاں اپنا فیصلہ از خود واپس ضرور لیا ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”یہ بات ہے۔ شاید اس محبت اور جانت کو مجھی شکل دینے کا ایک بہانہ ہے جو میرے دل میں روزاؤں تمہارے لیے پیدا ہوئی تھی۔“  
 ”تو تم نے اس رشتے کو قبول کر لیا ہے تو میں تمہارا رقیب سنی ہوں۔ تم دونوں کے معاملے آج کے بعد نہ ہو گی۔ نہیں۔ ہیں گے ہم دونوں کے دوست اور دشمن بھی مشتہ کیوں گے۔ یہ مجھی جو نہ میری اور نہ تمہاری تکیہ پر ہونی جو ہر اس بزرگوں کا فیصلہ ہے۔ بلکہ میرے ذہن خیال میں خدا کا فیصلہ ہے۔ یہ مجھی تو تقریباً ہر وقت ہے۔ شاید اس محبت اور جانت کو مجھی شکل دینے کا ایک بہانہ ہے جو میرے دل میں روزاؤں تمہارے لیے پیدا ہوئی تھی۔“  
 ”تو تم نے اس رشتے کو قبول کر لیا ہے تو میں تمہارا رقیب سنی ہوں۔ تم دونوں کے معاملے آج کے بعد نہ ہو گی۔ نہیں۔ ہیں گے ہم دونوں کے دوست اور دشمن بھی مشتہ کیوں گے۔ یہ مجھی جو نہ میری اور نہ تمہاری تکیہ پر ہونی جو ہر اس بزرگوں کا فیصلہ ہے۔ بلکہ میرے ذہن خیال میں خدا کا فیصلہ ہے۔ یہ مجھی تو تقریباً ہر وقت ہے۔ شاید اس محبت اور جانت کو مجھی شکل دینے کا ایک بہانہ ہے جو میرے دل میں روزاؤں تمہارے لیے پیدا ہوئی تھی۔“

”تو تم نے اس رشتے کو قبول کر لیا ہے تو میں تمہارا رقیب سنی ہوں۔ تم دونوں کے معاملے آج کے بعد نہ ہو گی۔ نہیں۔ ہیں گے ہم دونوں کے دوست اور دشمن بھی مشتہ کیوں گے۔ یہ مجھی جو نہ میری اور نہ تمہاری تکیہ پر ہونی جو ہر اس بزرگوں کا فیصلہ ہے۔ بلکہ میرے ذہن خیال میں خدا کا فیصلہ ہے۔ یہ مجھی تو تقریباً ہر وقت ہے۔ شاید اس محبت اور جانت کو مجھی شکل دینے کا ایک بہانہ ہے جو میرے دل میں روزاؤں تمہارے لیے پیدا ہوئی تھی۔“

”تو تم نے اس رشتے کو قبول کر لیا ہے تو میں تمہارا رقیب سنی ہوں۔ تم دونوں کے معاملے آج کے بعد نہ ہو گی۔ نہیں۔ ہیں گے ہم دونوں کے دوست اور دشمن بھی مشتہ کیوں گے۔ یہ مجھی جو نہ میری اور نہ تمہاری تکیہ پر ہونی جو ہر اس بزرگوں کا فیصلہ ہے۔ بلکہ میرے ذہن خیال میں خدا کا فیصلہ ہے۔ یہ مجھی تو تقریباً ہر وقت ہے۔ شاید اس محبت اور جانت کو مجھی شکل دینے کا ایک بہانہ ہے جو میرے دل میں روزاؤں تمہارے لیے پیدا ہوئی تھی۔“

”یہ بتا ضروری نہیں..... لیکن یہ بتا ضروری..... ہے شبیر شکر کی اکہ نن نے کسی پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ فیصلہ ہی کیا؟ یہ شاید میری فطرت میں شامل ہے خوبنی ہے پانہانی ہے اتنی ہی بات کہ میں کسی یا بھی اتنی جلد بھروسہ نہیں کرتی۔ اپنے ذہن و دل کی بات مانتی ہوں۔ مگر ان پکب تو بھروسہ آپ پر بھی نہیں کرتی ہیں۔ پھر بھی آپ کی طرف سے پہنائی گئی انکو بھی میرے ہاتھ میں موجود ہے نا چونکہ آپ نے خود تو میری پیش منہا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ آپ میرے رشتہ منکر نہیں صرف امیدوار ہیں رفاقت کے۔ آپ سے تو مل ہی نہیں یا نہیں! اس کا فیصلہ مجھے کرتا ہے۔ میں جانتی ہوں زندگی کسی ایسی امرزاں شے کا نام نہیں جتہ



مصلحتوں کی خاطر کسی غیر مستحق آدمی کے ساتھ گزار دیا جائے۔ آپ اگر یہ سوچتے ہیں کہ چند ملاقاتوں نے میرے دل میں آپ کے لیے پسندیدگی بھری ہے تو آپ فطری پر ہیں۔ آپ چہرے میرے سے ایک خوش شکل خودمانسان ہیں۔ جسے ہر دیکھنے والا پسند کر سکتا ہے کہ حسن انسانی فطرت کی سب سے بڑی ضروری ہے۔ آپ کا کردار میری نگاہ میں اس وقت تک مشکوک ہے جب تک میرا دل مطمئن نہ ہو جائے۔ رہا آپ کا اخلاق وہ ابھی میں نے دیکھا نہیں۔ بالکل اسی طرح آپ کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ آپ میرے کردار اور اخلاق کے بارے میں کچھ تحقیق کریں آپ کا بھی ایک معیار ہوگا۔ انسان کو پرکھنے کا۔ اگر ہم دونوں ایک دوسرے کے مقرر کردہ معیار پر پورے نہیں اترتے تو ہمیں حق حاصل ہے کہ ہم رفاقت کے حسین دھوکے سے صاف فٹا جائیں آپ کے کردار کو شک کی دلدل سے نکالنے کے لیے ایک ایسا بات کا بیج دے گی۔ اس کا فیصلہ لوگ نہیں میرے دل وہ مانع کریں گے۔ ہاں ایک بات کے لیے معذرت خواہ ہوں کہ میں نے عذرا بہت تھکا ہوا تھا آپ کے رشتے کو بڑے غلط انداز میں سوچا۔ اس بات نے مجھے یہ سہمی دیا کہ نظر آنے والی چیزیں ہمیں غلط انداز میں سچی ثبوت مہیا کر سکتی ہیں۔ آنکھوں سے دیکھنے کے بعد کانوں سے سننا بھی ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اپنی اس فرسٹ پر میں نام نہیں ہوں کہ..... میں نے کانوں سے جو باتیں سنی تھیں وہ دوسروں کی کہی ہوئی تھیں..... آپ کی کہی ہوئی نہیں۔

شکوں بلکہ جو قسم کی اس لاشکو نے شہیر کے دل پر ایک بوجھ لا ڈالا۔ جبکہ وہ اس وقت خوشی کے عالم میں گوہر سے بھی اچھی اچھی باتیں کرنا چاہتا تھا۔

"گوہر شہیر! میں نے بھی آپ کے آنکے ہاتھ نہیں جوڑے کہ آپ انہیں بند کر کے زندگی کا سطر طے کرنے کے لیے میرا ہاتھ تھام نہیں۔ آپ کو ہر قسم کا حق حاصل ہے۔ جو جی چاہے کیجیے گا۔ مجھے بھی غشی ہوگی کہ آپ نے میرا ہاتھ بزرگوں کی خواہش کے احترام میں نہیں جھنڈے اپنے لیے معتبر پا کر تھاما ہے۔"

"جی نہیں..... آپ نے کس بات کو کب سمجھ لیا ہے؟"

جواب میں وہ خاموش رہی۔

شہیر نے خدا حافظ کہے بغیر ریسیور کر لیا پر سچا دیا۔

☆☆☆☆☆☆

بہت سی خوشیوں پر گوہر کی سگندنی اور صاف گوئی غالب آ گئی۔ انہی ترواں مزاج کے ساتھ وہ لاہور کے لیے عازم سطر ہوا۔ اسٹیشن پر عدلی سے ریسید کرنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ لیکن انہی ترواں مزاج کے عالم میں۔

"کیا بات ہے عدلی؟ ایسے ہی غصے میں مجھے تو اپنے کمرے میں ایڈ کر مہنہ بگاڑتے رہے اسٹیٹس کیوں آئے؟"

"گلاست....." اس نے جھڑکا۔

"نیا شائبہ؟"

"وہی..... یہ کچھ شہیر شکرانی..... اگر تمہیں پڑھنا ہے تو انہی نے وہ راز خدا میں مت اچھو..... اور اگر سیاست کا عدلی پر کالی ہے تو پھر عہدہ اہل کے ہوتے ہیں ان کے ساتھ حال کہتے رہو۔ پڑھنے پڑھانے کی یہ بات ہے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے کیریئر ان جانے گا۔ ایسے ہی تھا یہ ساری حرکات۔ وہ خود کے بھوکے

انہی کیسے نہیں کر رہے ہو؟" شہیر مسکرا دیا۔ مگر خاموش رہا۔

"تھیں ہو چکے۔ مسکرانے کی کیا تک ہے۔ پتا ہے تمہیں کتنی اہم کلامز کتنے ضروری لیکچر دے کر دیے ہیں تم کو؟"

"تم جو بیٹھے بیٹھے بار میرے۔ ہمیں کچھ کی فکر..... تم نے سنا، ہم نے سنا، تم نے پڑھا، ہم نے پڑھا لیا۔"

"ہیو، کہہ دو..... تم نے امتحان دیا، ہم نے دے لیا۔ تم نے ڈگری لیا، ہم نے لے لی۔ لو کی وہ مجھ میں اور تم کو ترقی ہے۔"

"تو یہ انگریزوں کی ضرورت نہیں اپنے اور میرے تعلیمی ریکارڈ کو فرصت میں دیکھ لیتا۔" شہیر نے بھی انگریزوں کو دیکھا۔

"نہیں زخم لے ڈوبے گا کسی دن۔ چلو جی ٹھیک ہے، کیا ضرورت ہے آپ کو ضروری کی آپ شوق سے ملک و ملت کا تم کھا لیتے۔ ہم پڑھیں گے۔" عدلی نے ہاتھ کے اشارے سے شہیر کی روکی۔

"تم جیسے بد مزاج آدمی سے بات تو نہیں کرنا چاہیے لیکن تمنا پڑ رہا ہے۔ کل شام ڈیڑی کا فون آیا تھا۔"

"اچھا کیا کہا ڈیڑی نے؟"

"شہیر سے تھے شہیر سے کہہ دینا، بے شک ہم رہنمائی کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن ابھی وہ رہنمائی کے لیے بہت زیادہ ہے۔ ناگھل اور اجور ہے۔ پہلے تعلیم پھر کوئی اور بات۔ چھوٹی چھوٹی سیاسی و عہدہ داروں کے مستقبل پر فی سراج اثر انداز ہو سکتی ہیں اور معاملات میں یوں براہ راست ٹوٹ جانا اچھا نہیں ہوتا اور اگر شہیر نے میری بات انی تو میں خطا ہو جاؤں گا۔"

شہیر خاموش ہو گیا۔ جمال احمد کی ہاست کو وہ پھر پر کبیر سمجھتا تھا اور ان کا ہر حکم ماننے میں اپنی عافیت بھی۔

"اور کیا کہا؟"

"وہ یہ کہ مجھے تم جیسے سر پر بھرے ہاشی کی ہر دم حفاظت کرنی چاہیے۔" شہیر نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

"میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ وہ اس غرض کے لیے تحریریں ہدایت نامہ لکھوادیں تاکہ سماج دشمن عناصر کی غلط انداز نظروں سے محفوظ رہا جاسکے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں عدلی۔ میں خود کو اسٹڈی کے لیے وقف کروں گا۔ تم دیکھ لینا عدلی، شہیر وعدہ کیسے بھاتا ہے۔"

"جی ہاں تارقی سے۔"

"خدا کرے کہ تم اتنے دیکھا سکو۔"

شہیر نے ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا۔

☆☆☆☆☆☆

دل نواز اپنے آفس میں دفتری مصروفیات میں غم تھے۔ آج کل گھر میں ان کی ہمشیر، سنیہ اور ان کے شوہر۔ تم سنیہ کی آمد اور پھر ایک نازک ترین سٹے کا الجھاؤ ان کے لیے پریشانی کا سبب بنے ہوئے تھے۔ دل نواز

انہی اپنے خاندان کی ایک غیر متاثرہ شخصیت تھے۔ یہ انعام انہی لوگوں کو قدرت کی طرف سے مقابے کا اپنے

انہی پر اعتماد کرتے ہیں ان کا احترام کرتے ہیں۔ وہ ڈیڑھ ساری شہرت عادات کا پناہ گاہ بننا چھوڑتے تھے۔

اپنے چار بیٹوں اور عدلی کے لکھنؤ متاثرہ تھے۔ لیکن متاثرہ انہی تھے کہ تعلیم کی غرض سے لاہور بھیج دیے گئے۔ ایڈ۔ اے کے بعد

انہی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ جی۔ ایس۔ ایس۔ ایس کا امتحان دے کر کچھ عرصے کے لیے گھر واپس آئے تو

گھر خوسیا مست سے ہانکھی نظیر ہے۔ بلکہ وہ زمانہ انہوں نے شہر کی سرکار کی ازبک کوئی مہمہ کو تائیں پڑھ کر گزار دیا۔ پوسٹ مل جانے پر گھر سے دور چھا، اسے تو پھر پلٹ کر نہ آسکے۔ خوبی خندہ کہ کھارنی اپنی سرخی کی نہ ہونے کے باوجود انہیں ایک اچھی بیوی ملی جس نے انہیں معاشرتی میدان میں اپنی بہترین شخصیت کو ابھارنے میں غیر ارادی طور پر مدد دی۔ ان کی ذات کو استحکام دیا۔ اور زمانے میں وہ غالب علم بن گئے۔ جب شاہنواز لندن سے واپسی پر ایک ہمدردی بھی ساتھ لے آئے اور گھر بھر کے غصے کا اٹکا۔ سب سے پہلے انہوں نے ریزہ ریزہ ہو کر اس سے کہا اور اس کے طے جیسے احساسات نے انہیں بھی خاصا ڈمگرب کیا۔ لیکن وہ ایک پرکھیل انسان تھے۔ کسی چیز کے بارے میں کوئی فیصلہ بہت سوچ بچار کے بعد دیتے تھے۔

شاہنواز کے دوران کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ان دنوں بھائیوں میں بھی نئی نئی باتیں نہ ہوتی تھیں۔ ان کی فضا چھینا ہوتی۔

شاہنواز خالتتہا جاگیر دارانہ مزاج کے حامل تھے۔ دلنوا شخصیت کو اہمیت دیتے تھے خواہ وہ کبھی اپنی مفاسد اور بے مایا انسان کی ہی کیوں نہ ہو انہیں انسانی انذار کا بے حد پاس تھا۔ پھر شاہنواز نے اپنی زندگی کی غارت کچھ اس انداز سے اور پراگھاتی تھی کہ دلنوا زبان تک پہنچنا تو دور کی بات نہ دیکھنے کی بہت بھی نہ کر سکتے تھے۔ شاہنواز کا یہ انداز بھی انہیں ہانک نہ بنایا تھا۔ گھر آئے تو گھر کی فضائوں میں موجود گھنڈے انہیں آنے والی لڑکی یعنی اپنی بھائی سے دور ہی رکھا۔

ایک شام از روئے اتفاق وہ یاغ میں نظر آ گئی۔ گلابی رنگ کے شلو اور سوت اور بڑے ہار سے دوپٹے میں دلنوا اس انداز کو جاکٹ ہی سمجھے اور منہ پھیر کر اندر جانے لگے کہ اس نے مخاطب کر لیا۔  
"تو آپ ہیں مسز دلنواز عسکری۔ اہم۔ اے فائز کے استوڈنٹ۔"

"جی..... جی ہاں۔"

"بوسے دلوں سے سن رہی تھی آپ کا نام۔"

"میرا نام..... اس گھر میں کسی کو اتنی فرصت ہے تو نہیں۔"

"کیوں نہیں ہے؟ غور آپ کو ہر دم یاد رکھتا ہے۔ اکثر آپ کی باتیں کرتے رہتا ہے۔ آپ دیکھنے میں اتنے ہی اچھے ہیں جتنا ظنور نے بتایا تھا۔ دلنواز: کیا باقی گھر والوں کی طرح آپ بھی مجھ سے نفرت کرتے ہیں جیسے دونوں سے گھر میں موجود رہ کر بھی آپ نے مجھ سے ملنا گوارا نہ کیا؟"

"دیکھیے خاتون! محبت اور نفرت دونوں جذبے بلا کسی سبب پیدا نہیں ہو جاتے۔ دونوں کے لیے کوئی سبب چاہیے۔ میں بنا دیکھتے آپ سے نفرت کرنے لگا۔ آخر کیوں اور کس لیے؟"

"کیا یہ بتانا ضروری ہے کہ میں مسز شاہنواز ہوں۔"

"یہ بھی کیا یہ بتانا بھی ضروری نہیں کہ آپ مسز شاہنواز کیوں ہیں۔" دلنواز مسکرائے تو وہ بھی مسکرائی۔ انہوں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کہاں سے آئی۔ کیسے آئی۔ کیوں آئی۔ لیکن وہ چار ملا کا توں میں اسے جان اور پہچان گئے وہ بہت ہی مشرقی لڑکیوں سے کہیں بہتر ایک لڑکی تھی۔ یہ لڑکیوں اس سبب مسلمان نہیں کہ مسلمان گھر میں پیدا ہوئیں اور وہ مسلمان ہوئی تھی اس مذہب کو فلاح و اصلاح کا بیج جان کر۔ اسے شاہنواز سے کم اور مذہب سے بہت زیادہ تھی۔ وہ ان کی رفاقت سے زیادہ ایک اسلامی محنت پسند رہنے پر جوش تھی۔

اس گھر میں اس کا واحد دست ان کا خاندانی ملازم ظنور تھا۔ جو اپنی ٹوٹی پھوٹی اور وہ میں اس کی باتوں کو غیر سنی

نہ اب اسے کبھی اسے مطمئن کر دیتا تھا۔ وہ دو چار دن سرمائی پھٹیوں کے سبب دلنواز کو اس گھر میں گزارنا دوسرے دن انہوں نے اپنی اس نو مسلم بھائی کے ساتھ علم و ادب اور مذہب پر بات چیت میں گزار دیے۔ ان باتوں میں جو کچھ تھا۔ وہ انہیں نے نینز ناظمہ کے اندر منتقل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

جب وہ لاہور واپس آ گئے تو ان کے ذہن میں کثیر فاضلہ کی شخصیت کا خاکہ بہت اچھے انداز میں اجاگر ہو چکا۔ وہ حالات سے کئی کروٹیں لیں۔ وہ دوسری بار جب دلنواز گھر گئے تو ان کی خاندان کا ماحول عموماً شاہنواز کے گھر آدھونے والا بچپان کی دوسری شادی سعیدہ بیگم سے ان کی محبت اور..... اور کثیر فاضلہ کی موت تھا تھے۔

دو چار دن و ششدر شاہنواز کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ جو خوش باش بھٹے سعیدہ بیگم کے ساتھ مل کر قہقہے لگا رہے تھے۔ جس بول رہے تھے۔ بہت سی باتیں مقدس یادوں کی طرح دل کے نبھاں خانوں میں چھپی رہتی تھیں کثیر فاضلہ کی ایک یا تو تھی۔ شاہنواز نے شہر کو جو اس وقت لہو لہو تھا۔ کسی ماحول پر سرسری میں چھوڑ دیا تھا۔ جانے کی سبب۔ شاید سعیدہ بیگم کے کہنے پر کہ وہ شہر کو اس خاندان کی تاریخ سے نکال دینا چاہتی تھیں۔

پھر کئی سالوں بعد جب دلنواز کی شادی بھی ہوئی وہ بیرون ملک چلے گئے۔ دلنواز کو اپنی مصروف زندگی سے اتنا دل نہ ہی نہ سکا اور جب شہر ان کے سامنے آیا تو انہیں بہت اچھا لگا۔ بلکہ ابھی اسے صرف سنا ہی تھا کہ وہ انہیں اہل گھر بنایا تھا۔ دیکھا تو چاہت و محبت کا رنگ گہرا ہو گیا۔

آج وہ آفس میں بھی اس پریشانی سے نجات نہیں پاسکتے تھے۔ سعیدہ بیگم کی مخالفت کی ساری کہانی ان کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ شہیر خاندانیت کے اس شہر سے واپس رہے۔ انہوں نے دل میں جذبہ پائے اور عظیم حسنین اس فلسفے کو سمجھنے سے قاصر تھے۔

تازہ ترین بات نے تو جلتی پر تیل ڈال دیا تھا۔ خود فیہ آیا یہی بھڑک اٹھی تھیں۔ شہیر کی یہاں مذم موجودگی اس کے خلاف جاری تھی لیکن دلنواز ہر بات کو حقائق کی نظر سے دیکھنے کے عادی تھے۔ انہوں نے وہیں بیٹھے اپنے اپنی جھٹکی کی درخواست لکھی۔

اور دوسرے دن عبداللہ پور جانے کا پروگرام بنا کر گھر آ گئے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

"حد کرتے ہیں دلنواز بھی۔ بالائی بانڈ کہاں چلے گئے۔ انہیں خبر نہیں ہم صرف ان کی خاطر یہاں رکے ہوئے ہیں گھر پر بھی کیلی ہے۔" دوسرے دن دلنواز کی ردا گئی کی اطلاع پر عامر خفا ہو گئے۔ چچی جان بھی وہیں ہو جو تھیں۔

"لوہین! تمہیں بھی خبر نہیں دلنواز کے جانے کی۔"

"چچی جان! تجھے جھوٹ بول کے کیا لینا تھا۔ ابھی میں بستر میں ہی تھی کہ وہ گاڑی اور ڈرائیور سمیت غائب ہوئے۔"

"میں کہہ رہا تھا چلے جاتے وہ یوں گھر تو نہ رہا جا۔" امینہ نے غصے سے کہا۔

"آپ کمال گرتی ہیں سفید پاپے کے سبب انہیں حرج پھونڈنے کی کیا ضرورت تھی۔ کسی نہ ورنی کا بہت سے ہی ہوں گے۔ آجائیں گے۔"

"تو کیا عامر سارا کاروبار چھوڑ کے اسی کے انتظار میں یہاں بیٹھ رہے گے۔" چچی جان نے جھٹ کہا۔

"بی بی! آخر وہ اتنی دیر سے آئے ہیں۔ گھر پر کاروبار سب چھوڑ چھوڑ کر آئے تو نہیں آئے ضروری کام



سے ہی آئے ہیں۔"

"چچی اماں! آپ تو بس یونہی بات لے کے بیٹھ جاتی ہیں۔ آپ کسی غیر کے گھر میں نہیں ہیں ان کے بھائی کا گھر ہے۔ کاروبار چلتے ہی رہتے ہیں۔ عاصم بھائی ایک دو دن اور رہ جائیں گے تو کوئی فرق نہ پڑے گا۔ دلخواز اتنے غیر ذمہ دار ہرگز نہیں ہیں۔"

ابھی یہ بات ہوئی رہی تھی کہ کاظم وہ ہیں آگے ان کے ساتھ ان کی بیوی اور بچے بھی تھے۔

"تو یہ ہے بھابی! جو آپ نے خود سے ہمارے گھر قدم بھی رکھا ہوا۔" کاظم کی جیم نے مزید جہم سے گلے ملنے ہوئے شکوہ کیا۔

"آج میں نے زبردستی ان کی چھٹی کرائی اور یہاں مصیبت لائی۔ بچے بھی مایوس ہو چکے تھے بھائی جان آپ ہی آجاتے بھائی کوان کے دلارے بھائی کے ہاں رہنے دیتے۔"

عاصم ہنس دیا۔

"ایک تو تم عمر تمس بہت جلد ذاتیات پر اتر آتی ہو۔ اس کا کیا علاج کیا جائے۔" کاظم نے بیوی کو مخاطب کیا۔ "ذاتیات کا کیا سوال ہے بھابی نے خود ہی فرق واضح کیا ہے۔ سائوں میں آتی ہیں اور یہیں کی جو کردہ گئی ہیں۔"

"نہیں بھابی سارہ ایسی کوئی بات نہیں تھی حالات ہی کچھ ایسے تھے یہاں رکے بنا چارہ ہوتا تھا۔" عاصم حسنین نے وضاحت کی۔

"خیر یہ بھائی جان! ابھی تھوڑے دن ہوئے ہم لوگ وہاں سے آئے ہیں۔ ایسی کیا بات ہو گئی۔ اچانک کیسے آ گئے؟"

"کیا بتاؤں گا ظم! لوگوں نے اپنی باتوں سے ہمارا ہاتھ بند کر رکھا ہے۔ سعید و بھابی ہی سکون کی سانس نہیں لینے دے رہے ہیں۔ شہیر میں سوطرح کے سبب انہوں نے میرے سامنے نکال کے رکھ دیئے میں بیٹی کا پاپ ہوں گاظم۔ کیسے گوارا کر لیں ایسے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے دنوں کے پاس آنا ہی تھا۔ جس کے کہنے پر میں نے یہ رشتہ قبول کر لیا تھا۔"

"کیا کہا سعید و بھابی نے؟" کاظم نے فوراً پوچھا۔

"یہ پوچھو کہ کیا نہیں کہا۔ انواز نے تو اس معاملے میں توئی بچھی لی ہی نہیں۔ غور سے میری بات بھی نہیں سنی۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ کسی نندے اور گرین کی شادی سے زیادہ اہم نہ ہوئی لیکن میری زندگی کا معاملہ ہے کاظم۔ دنیاں اپنے خیر میں خوش نہ ہوں تو ماناں پاپ ہمیں سے نہیں رہ سکتے۔"

"بھائی جان! آپ کی بات بالکل درست ہے۔ لیکن ایسی بھی کیا آئی ہے۔"

"شہیر تو بہت اچھا لڑکا ہے۔ بہت ہی اچھا اور اچھی تو وہ پڑو رہا ہے۔ شادی تو نے میں تھوڑے دن باقی ہے۔ آپ ابھی سنہ قدر لگ کے بیٹھتے ہیں۔"

مارو نے شہیر کی دیکھ لی۔ وہ ایک دو بار ان کے ہاں آیا تھا نہیں بہت اچھا لڑکا تھا۔

"بھابی سارہ کردار کی عمارت تو بچپن سے ہی تعمیر ہونے شروع ہوتی ہے۔ جوانی تک پختہ اور مشہور ہو جاتی ہے۔ پڑو لکھ کر فارغ ہو کر وہ افسر تو بن سکتا ہے اچھا انسان نہیں۔ جو بچپن سے دنیا نما بن گیا۔ یہ غلطی کی زندگی میں وہ بد بننا بھی کیا۔"

"اماں جان! آپ شاید غلط کہہ رہے ہیں۔ میں نے اپنی عمر کا کچھ حصہ اور دنوں نے سارے تعلیمی سال ہوش میں گزارے ہیں۔"

"تو دار کی تعمیر میں خون بھی بہت سا کام کرتا ہے۔ نجیب الشرفی بھی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ آخر وہ شاہناز کا اہل نہیں اس کا ماں۔"

"اماں جان! آپ یہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ عرصہ گزرا میں نے آپ کے لبوں سے کینز فاطمہ کی خوبیاں سن کر دل ان کی شرافت و عظمت کا ایک دل کش بت کھڑا کر لیا تھا اور شہیر کو بھی اسی زاویے سے دیکھتا ہوں۔ دیکھنا ہے کہ بھائی شاہناز میں بھی سوائے بے پردائی اور غیر مستقل مزاجی کے اور کوئی عیب نہیں۔"

کاظم نے ان کی بات کاٹ کر کہنا شروع کر دیا۔

"شہیر ہمارے خاندان کا بچہ ہے ہم سب اس کے بزرگ ہیں اس کی اپنی سیدھی باتوں کے لیے ہم اس سے بات کر سکتے ہیں۔ وضاحت لے سکتے ہیں اسے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع دے سکتے ہیں۔ ایسی باتیں تو ہم بھی سنی ہیں۔ ہمیں بھی بتانی گئی ہیں لیکن ہم نے تو آنکھیں بند کر کے اعتبار نہیں کیا صلحوں و ملازموں کا بھی پال رکھا ہے۔" کاظم کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"اے ہم کوئی دشمن تھوڑا ہی تھے گوہر ہشام کے۔ کچھ دیکھ کے ہی فیصلہ کیا تھا۔" چچی جان کو بھی موقع مل گیا۔ اس لئے یعنی یہ گھوڑاوار نے بھی موقع غنیمت جانا۔

"اس کا پانا کیا مشکل ہے۔ میں تو تین دن سے برابر اسے فون کر رہی ہوں۔ آج وہ آجائے گا بلا لیں گے۔ بات صاف ہو جائے گی۔"

"پالنگ ٹھیک ہے۔ ہم بھی ہمیں رک جاتے ہیں۔ سب کے سامنے ہی فیصلہ ہو جائے گا۔" کاظم نے کہا۔ "ٹھیک ہے جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔" عاصم ہنر رضا مند ہو گئے۔

☆☆☆☆☆☆

شام کے چند گھنٹوں طرف پھیل چکے تھے۔ جب شہیر نے انواز کے گھر میں قدم رکھا۔ آ منہ خاتون اسے ان کرنے کے بعد سے اس کی منتظر تھیں۔ باقی اہل خانہ اپنے مہمانوں سمیت ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ عجیب منہ خاتون پھر ان میں سے نہیں۔

"آؤ شہیر..... بڑی شرمندہ سے تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔ انجی سے بڑے آدمی مت۔ بٹو۔ فون پڑ پڑھا۔ پاپ ہو سکتے ہو۔"

"آئی ایم سوری چچی جان..... کئی دن غیر حاضر رہا تھا۔ آج سہ پہر کا سارا وقت لائبریری میں گزار دیا۔" یہ سارا چکر کیا ہے؟ عاصم تو اس حد تک بجز کا یا ہے سعید و بھابی نے کہ وہ تمہارا نام لینا پسند نہیں کرتے تھے یہاں آئے تھے۔"

"نہا نے..... مگر وہ کیوں؟" وہ حیران تھا۔

"کوئی لڑکیوں والا قصہ..... غذا بہت جمال کا ذکر جہاں احمد صاحب اور ان کی جیم کی حکایت اور بھی بہت ہے۔"

"اوہ..... تو کو با یہ سارا جان ان کا ہی پہلا لایا ہوا ہے۔ شہیر کے قدم رک گئے۔ دو گھنٹہ کی باتیں نہ کرنے کی چچی جان..... یہ سارا چکر کیا ہے؟ عاصم تو اس حد تک بجز کا یا ہے سعید و بھابی نے کہ وہ تمہارا نام لینا پسند نہیں کرتے تھے یہاں آئے تھے۔"

موجودگی میں گوہر بیگم کے والدین کو واپس کر دوں۔ اگر ضرورت پڑے تو....." اسے حصاراً لیا۔

"بیٹا! یہ کیا کہہ رہے ہو۔ بنا سوچے کچھ کوئی بات کہنا اچھا نہیں ہوتا۔"

"نہیں چچی جان..... میں نے یہ سب سوچ کچھ کر ہی کہا ہے۔ آپ لوگوں نے ازخود ایک فیصلہ کر دیا۔ میں سعادت مندی کا اظہار کے طور پر اسے قبول کر لیا۔ مگر نہ سمجھتی تھی کہ اس بات کی ابھی ضرورت بھی نہ تھی۔ پھر جاننا ہی سچی صاحبہ کے مزاج ہی نہیں ملے۔ بار بار انوں پر مجھ سے نفی کر چکی ہیں۔ میں نے اس بات کو بہت سنجیدگی سے نہیں لیا کہ نہ کیا ہوں یا نہ لے لی۔ اور ناچائشی کے سبب انکی وسوسن باتیں سوچ لیتے ہیں لیکن میرا نہ معاملہ ہی اور ہے۔"

"نہیں شہیر! تم اپنی زبان سے انکار مت کرنا۔ نہ ہی انہیں اور تمہیں واپس دیتا۔"

"چچی! زندگی اسٹاک کے سپارے گزرتی ہے اور زمانہ نہیں ہر لمحہ میں اعتماد کا رشتہ نہ بڑھتا ہے۔ نہ قائم ہے۔ تم بھی نامان ہو..... اور تمہیں بولنے کا حق نہیں ہے۔ یہاں ہم سب جو ہیں۔ تمہیں خبر ہے تمہارے چچا عبداللہ پڑھتے ہیں۔ تمہارے خاطر..... تم انہیں بے حد عزیز ہو شہیر..... کہہ رہے تھے کہ مراد سے معاملے میں اگر شہیر بے تصور ہوا اور سعیدہ بھائی سازشی بن گئیں تو وہ ان سے قطع تعلقات کر لیں گے۔ بھائی جان کی بھی صاف صاف سنا دیں گے۔"

"پاپا کا کوئی قصور نہیں چچی..... وہ تو یہاں ہیں ہی نہیں۔"

"مت کرو اپنے باپ کی طرف داری۔ تم نہیں جانتے مراد جیک ہوں تو عورتوں کی مجال نہیں کہ وہ ایسے جوڑو کر سکیں سعیدہ بھائی کو تمہاری راہ میں کائے بچانے سے کیا ملے گا۔ ان کے اپنے بیٹے ہی ہیں۔ ان کے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔"

"آمنہ کو بے حد ڈال تھا۔ شہیر نے اپنے آپ کو بلکہ انہیں مارل کرنے کی کوشش کی۔"

"چھوڑیے چچی..... وہ میری ماں ہیں۔ میں ان کے خلاف کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ ارے میں تو آپ کو ابھی اچھی باتیں سناتے کو بے تاب تھا۔ آپ یہ باتیں نے نہیں۔"

"سب سے مل لو..... باتیں ہر دم میں ہوتی رہیں گی۔ وہ اسے اندر نہ آئیں۔"

"عام حسنین اور کاظم ایک کونے میں بیٹھے ہاتھیں کر رہے تھے۔ دوسری طرف خواجہ حسنین۔ شہیر کو کچھ کر سفید بیگم کی آنکھیں بھرا آئیں۔ وہ بھی دروازے میں تک کر ایک تک انہیں دیکھنے لگا۔ سب لوگ تیس کی طرف متوجہ ہو گئے۔"

"پچھو بی۔" وہ کہہ اٹھا۔ ان کی طرف بڑھا۔ سفید بیگم نے اپنے بازو پھیلانے۔ شہیر ان کی طرف بڑھتے بڑھتے رک سا گیا۔ ان باتوں نے درمیان میں تھوڑا سا فاصلہ پیدا کر دیا۔ اس نے عام حسنین کی طرف دیکھا جن کے چہرے پر نفرت۔ یہاں تک کہ شہیر نے آ رہی تھی۔ وہ جھجک کر رہ گیا۔"

"اوہ! شہیر آیا ہے۔" عام حسنین کا انداز معنی خیز سا تھا۔

"السلام علیکم چھو بھیا جان!"

"کیسے ہو بیٹی؟ خشک نکھال؟"

"جی ہاں....."

"انوار سے کئی بار تمہارا پوچھا۔ تمہارا کلمہ تمہیں وہ ہی نہیں۔"

"نہیں شہیر! تمہیں پوچھا جاننا۔ آج ہی نوٹ ہوں۔ میرا مطلب ہے نفی واضح۔ آپ کیسے ہیں نا پتا چاہتا تھا کہ آپ فارغ ہوئے ہیں۔"

"ہاں..... ہاں..... انوار سے کچھ کام تھا۔" عام حسنین نے نظریں چرائیں۔

"شہیر! اب ہر شہیر..... کاظم نے اپنے ساتھ ان کے لیے جلد بنائی۔"

"نہیں چھو بیٹو مت ہی ہوں۔"

"وہ خواتین کی طرف آ گیا۔ سفید بیگم نے اسے اپنے بازوؤں میں بچر کے پیچھے لیا۔ ان کی آنکھیں جانے کیوں نم ہو گئیں۔ چچی جان نے دور کے شہیر کی ایک آنکھیں دیکھی۔"

"اے شہیر چنا آیا ہے۔ اسٹاک تو رہے ہیں..... اسے میں نہیں بڑھانی چھوڑ کر کیوں گئے؟ وہ تمہیں کو ہاتھ کرنے کی مہربانی کی گئی۔ اب تو اس طرف قدم بھی نہ بڑھو..... وہ وہاں تمہارے ہمدرد تھوڑا ہیں۔ شاہزادہ بھی کہاں کے..... میں..... انہیں احساس دہتے تو اتے سے اپنے شہر کا رتی اذار سے میں چھوڑ کر خود سعیدہ کو لے کر چلے جاتے۔ سعیدہ تو انہیں ہے۔ پیکی کی خوشیوں کو لگن چاہتی ہے۔"

"چچی جان! یہ کیا ڈر کر رہے نہیں آپ۔" آمنہ نے انہیں ٹوکا۔

"اے میں تو کچھ کہے بنا نہیں رہ سکتی۔ لے کے آتا ہوا ہر ام بچہ دیا میرے پیچھے پر..... ایک ایک کو خیر کرنی پھرتی..... انوار کے آگے وال نہ گئی تو آگے کے کان بھرے۔ یہ عام تو کانوں کے پیچھے ہیں۔ تم سے بات کریں سعیدہ تو آنے وال کا بھلا معلوم ہو۔"

"عام حسنین کا علم بھی ادھر آگے۔"

"مکانوں کے کچھ نہیں ہیں چچی جان۔ ایسی باتوں پر دل تو خوف کھا چاہی ہے نا۔"

"اے خوف کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ آؤ کی اپنی عقل سے کام لے۔ ذرا سوچے..... بجائے کان کو ہاتھ لگانے کے کتے کے پیچھے بھاگنا پڑتا تو ناشتہ ہی نہیں۔"

"شہیر ہر جھکائے سب کی سن رہا تھا۔"

"میں بھی صرف آپ سے پوچھا اور کاظم سے ہی اپنا درد سکھواتے آیا ہوں۔ اطمینان پانے آیا ہوں۔" عام حسنین نے پڑھتے۔

"تو ہماری ماں بھی..... اے ہم تو ایک نظر میں دونوں کا حال جان لیتے ہیں۔ اپنی ہنسی کے لیے ہم نے کوئی ایسا وہاں نہ کیا نہیں چنا..... تم دیکھ لیتا شہیر ہر زمانے میں ایک اچھا انسان ثابت ہوگا۔ دو آج بھی اچھا ہے اور آئندہ بھی اچھا رہے گا۔"

"کیا بات ہے پچھو بی..... آپ سب مجھے کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں؟"

"مت کچھ پوچھو بیٹا..... جن کی باتیں بدلتی سے ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔ وہ بچے پچھارے ایسے ہی دنیا کی ٹھوکروں میں رہتے ہیں۔" چچی جان رو پڑیں۔

"چچی جان! آپ تو بہت زیادہ جذباتی ہورہی ہیں۔ خدا نخواستہ ایسا معاملہ ہمارے شہیر کے ساتھ کیوں ہو۔"

"میں بھائی جان کو سب کچھ بتا چکی ہوں جو میں نے شہیر سے سنا ہے وہ مطمئن ہیں۔ آپ اپنی کہے جا رہی ہیں۔"

"ہاں شہیر بیٹے! سعیدہ بھائی کی باتوں نے ہمارا جین و سونہ جین لیا۔ اب میں مطمئن ہوں۔ تمہاری کسی



منیسا اندر آگئے۔

"یہ خوب رہی میاں.....؟"

دلنواز نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ گوہر نے دونوں کو آداب کہا۔

"ارے بھائی صاحب آپ۔"

"اچھا کیا تم نے دلنواز ہمیں گھر میں چھوڑ کر خود ادھر آگئے۔"

"آپ کو میرا خیال نہیں تھا اماں..... ماموں جان کو تو تھا۔ بابا اور آپ تو مجھے یہاں چھوڑ کر بھول گئے۔"

"ارے بھائی آتے۔ سو بار آتے لیکن ایسی رازداری کی کیا ضرورت تھی۔ ہم منع تھوڑی کرتے۔ دو دن آ منہ

بنا تھی نے زیر ہوتی رو کے رکھا..... تیسرے دن ہمیں آنا ہی پڑا۔ خبر ہوتی کہ تم یہاں ہو تو ہم اسے تو ناراض نہ

کرتے۔ کچھ روز اور دلیتے۔"

"تو اب چلے جائے رو کا کس نے ہے بلکہ جس جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ چلے چلے۔" گوہر بیٹیوں کو باری باری

دیکھ رہی تھی۔

"یہ ٹھیک ہے۔ آنا جانا لگا ہی رہے۔ ہم وہاں جائیں تم یہاں آؤ..... ہمارے یہاں پہنچتے ہی تم چل پڑو تو ہم

بھی تمہارا ساتھ دیں۔" گوہر کو سلام آداب کا موقع ہی نہ ملا۔

"ویسے ابھی میں جانے کا نہیں! انہوں نے اطمینان سے کہا۔

"ابھی ابھی تو آئے ہیں ماموں جان۔ چائے تک نہیں پی۔"

"کہاں عاقب ہو گئے تھے۔"

"کچھ نہ پوچھیے کہ کہاں کہاں گیا۔ ویسے ہی اوقت تو اپنی پیاری بھانجی جان کے ہاں سے زبردست قسم کے

ناشتے کے بعد ادھر آیا ہوں۔ ناشتے کے ساتھ ہی مزے مزے کی باتیں بھی سننے کو ملیں۔ بھئی یہ بھانجی جان بھی

خوب ہیں۔ باتوں کا ہنر کوئی ان سے سیکھے۔ اگر یہ سیاسی لیڈر ہو تیں تو مخالف کے بیٹے بڑی خوب صورتی سے

ادب کرتیں۔ میں نے ناں لیا ان کی شیریں زبانی کو ان کی خود اعتمادی کو لہجے کی خشک کو۔"

"ماموں جان! آپ بڑے خوش نظر آ رہے ہیں۔" گوہر نے کہا۔

"رازی بات ہے چنا! وہ اخبار ایک طرف رکھ چکے تھے۔"

"شاہنواز بھی ملے تم سے۔"

"نہیں ابھی تو وہ غیر ملکی دورہ ختم کر کے واپس نہیں آسکے۔ ہاں ان کے بیٹے بیٹیاں تھیں اور غفور ہا ہا تھے۔ بے

چارے اس عمر تک خدمت کیے جا رہے ہیں بھائی جان کی۔ آپا! یہ وہ داری بھی بڑی خانہ خراب قسم کی شے ہے۔

میں تو حیران ہوں..... غفور بابا ان سب کو بزبانت کیسے جا رہے ہیں۔ بچوں کی طرح پورے گھر میں دوڑاتی ہیں

انہیں بھانجی..... لاجول والا۔ اب تو انہیں چاہیے کہ اپنے گھر لوٹ جائیں۔" دلنواز کانوں کو ہاتھ لگا رہے

تھے۔

"سرکاری ملازمین کو میں نے ایک دن بھی گھر پر مامور نہیں کیا۔ حالانکہ یہ ایک رواج بن چکا ہے۔ دو تین گھر لو

لازم ہیں تو آ منہ مجھ سے زیادہ خوف خدا رکھتی ہیں۔ ہمارے بچے اپنے ملازموں کی بھی عزت کرتے ہیں۔" دو

گوہر کو ہاتھ سے تھے۔

"اچھا بھئی تم گوہر سے باتیں کرو۔ جس ذرا کپڑے وغیرہ بدل لوں۔" عاصم اٹھ گئے۔

وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کچھ دیر پہلے فون آیا تھا ڈی آئی جی صاحب کا۔ دلنواز سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ مجھ سے تعارف ہوا تو انہوں نے سب کچھ مجھے کہہ سنایا۔ میں سب جان گیا ہوں..... سب کچھ..... انہوں نے ایک پیغام تمہارے لیے بھی دبا تھا بیٹے..... کسا بھی تمہیں صرف تعلیم کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ باقی مسائل زندگی بھر حل ہوتے رہیں گے۔"

"عاصم بھائی! آپ نے ہمیں تو بتایا نہیں۔" سارہ جلدی سے پوچھیں۔ "پہلے کسی کی بات کا یقین تو آپ نے کیا..... ظاہر ہے بابا پولیس کے ایک انسپکٹر کی بیٹی ہوئی تھی۔ آپ یقین کیسے نہ کرتے۔ ہم تو ظہیر سے اچھے فیئرے۔" کاظم نے شکوہ کیا۔ عاصم نے مسکرا کر شبیر کو مخاطب کیا۔

"بیٹے! ابھی اتنے بڑے بڑے کام اپنے ذمے نہ لو۔ بہت عمر بڑی ہے۔ معاشرہ ایسے انسانوں کو باغی کا نام دے دیتا ہے یہ معاشرہ رسم و رواج کی بھاری زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ زنجیریں اسے بہت عزیز ہیں۔ اس کو جو جھکا عادی ہو گیا ہے..... ان زنجیروں کو ہٹانے کی بات کرو تو گڑبگڑا کرتا ہے۔"

"چھو پنا جان کا تنوں بھری راہ پر نکلے پیر چل کے بھی میں انسانی فطرت کا کام کر سکتا ہوں۔ ظلم نہیں ہو اسے روکنے کے لیے میرے ہاتھ آگے ضرور بڑھیں گے۔ آپ اسے میری کمزوری کہہ لیں۔ میرا جرم سمجھ لیں۔" بیٹے ایسے جرم پر گزرتیں کمزوری بھی نہیں۔ لیکن پھر بھی کم از کم اتنا سوچ لو کہ تمہاری تعلیم میں خلل پڑ سکتا ہے۔ اسٹڈی کا خرچ ہو سکتا ہے۔"

"نگر نہ کریں۔ وہ کسی میں چند دنوں میں پوری کرنوں گا۔"

"تو ایسا کرو۔ پولیس کی نوکری کر لو۔ ڈی آئی جی صاحب بتا رہے تھے۔ انہوں نے تمہیں آفر بھی کی تھی۔ ٹھیک ہے۔"

شبیر عاصم حسنین کی بات سن کر نہیں دیا۔

"جے تو ٹھیک مگر....."

"مگر کیا.....؟"

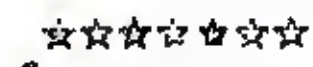
"مجھے صرف انسپکٹر نہیں ایک ذمہ دار افسر بننا ہے۔"

اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ وہ بھی سنجیدہ ہو گئے۔

"ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔"

سب ہی اس گفتگو میں حصہ لینے لگے تھے۔ باتوں کا سلسلہ طویل ہو گیا۔ یہاں تک کہ یہ محفل کھانے کی میز تک جانے کے لیے برخاست کی گئی۔

دل صاف ہو گئے۔ سارا اخبار اتر گیا۔ آئینے صاف و شفاف نظر آنے لگے۔ کھانے کی میز پر بچوں نے اپنی دلچسپ باتیں بھی جاری رکھیں..... اور شرارتیں بھی۔



دلنواز تو جب لہجے سولو تھے۔ عاصم حسنین نے رخت سفر باندھ لیا اور گھر چل دیے۔ تین گھنٹوں میں وہ اپنے گھر پہنچ گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ماموں بھانجی حرسے حرسے کی باتیں کر رہے ہیں۔ گوہر تخت پر بیٹھی سبزی بنا رہی ہے اور دلنواز اخبار ہاتھ میں لیے سرسری نظر اخبار پڑا لے ان سے کپ کر رہے ہیں۔ دروازہ کھلتا تھا۔ عاصم اور

صاف بیٹھل اتار کر وہی تخت پر سیدھی ہو بیٹھیں۔

”آپ کیا کھائے گا ماموں جان دوپہر کے کھانے میں۔“

”بھئی مدت گزری تمہاری اماں بتاتا کرتی تھیں۔ قیہ پینا۔۔۔ میں ہوٹل سے آتا تو فرمائش کر کے چلو کیا کرتا۔ اگر آج بھی۔۔۔ چائیس تو۔۔۔ اور سنا ہے تم کہا بہت اچھے بناتی ہو۔ تم سے تو آؤ رڈ پر بھی بنوائے جاسکتے ہیں۔ کیا ہوں کے ساتھ مٹر پلاؤ تو ویسے بھی ضروری ہو جاتا ہے اور سوٹ ڈش کے طور پر گھگی کا حلوہ ہو جائے تو کیا کہنے۔“

”اے میں قربان۔۔۔ آج کاپلی مرتبہ بھائی نے کھانے پینے کی خواہش کی ہے ابھی جارہی ہوں باورچی خانے میں۔ یہ گوہر کیا کھائے گا کہا بہت۔۔۔ اتنے دن تمہاری دلہن نے پنگ سے اترنے نہیں دیا۔ آج سارا کام میں خود کروں گی۔ گوری تم اپنے ماموں کو اندر لے جاؤ۔ آج کل کا موسم بھی عجیب موسم ہے۔ نہ چوب اچھی نہ سہا پہ۔۔۔ اپنے کمرے میں جا بیٹھو۔۔۔ تمہارے ہا ہا بھی وہیں آ جائیں گے۔ کھانے کے وقت بلوالوں کی تم لوگوں کو۔“

”پلیے ماموں جان!“

گوہر سب کچھ چھوڑ چھاڑ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”واہ واہ گوہر۔۔۔ تمہارے کمرے میں آ کر گمان ہونے لگا ہے جیسے بھول کر کسی غلام کے کمرے میں آ گئے ہوں۔ ہر طرف کتابیں کلم کا پیاں۔۔۔ کاغذ۔“

”ماموں آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے یہ کمرہ سو کوئی کہاڑ خانہ ہو۔ دیکھیے تو یہی کسی ترتیب اور نظام سے ہے کتابیں کاغذ کلم ہر شے اپنی جگہ پر ہے۔ آپ نے اگر لاہور جا کر اس انداز میں ذکر کیا تو میرے کزنز مجھے کوئی خطی سا شاعر سمجھ لیں گے یا کوئی دیوانہ تصور۔۔۔“

”اے یہ اتنی بڑی الماری کتابوں سے بھری ہے۔ دیکھ سکتا ہوں کہ اس میں کبھی کتابیں ہیں۔“ انہوں نے گوہر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنی کہنے لگی اور الماری کھول لی۔

”اوہ مس گوہر صاحبم! یہ انگریزی ادب بھی آپ پڑھتی ہیں!“ انہوں نے مصنوعی حیرانی سے آنکھیں کھولیں۔

”جی ہاں انگریزی کی مس زریہ کہتی ہیں انگریزی ادب پڑھو۔۔۔ سوانہ بتائی ہوئی کچھ کتابیں خرید لی ہیں۔“

”گوہر اپنی کوئی رائے نہیں۔“

”کمال کرتے ہیں ماموں جان! ہمیں اپنے ملک کے ادیبوں اور شاعروں سے غفل آگئی ہے غیر ممالک کے ادیبوں کے بارے میں کیا جانتے ہیں۔ ہماری حالت تو یہ ہے کہ ہم کسی بھی شاعر کو اس کی ایک غزل کے حوالے سے کسی ادیب کو ایک افسانہ پڑھ کر بڑا شاعر یا ادیب قرار دے دیتے ہیں۔ باہر کے ادیبوں کو بھی نصاب کی کتاب میں موجود ادب سے ہی پوچھنا پاتے ہیں۔“

بچپلے دنوں میں نے ایک غزل پڑھ کر شاعر کا محمود کلام خرید لیا۔۔۔ اس غزل کے سوا کچھ بھی نظر نہ آیا۔ مس زریہ ہم لڑکیوں کی آئیڈیل پروفیسر ہیں۔ ان کا مشورہ آنکھیں بند کر کے مانا ہے جس نے اب پڑھ رہی ہوں۔ پڑھ لوں گی تو خبر ہوگی۔ ابھی تو صرف انگریزی میں اپنی استعداد بڑھ رہی ہوں۔ منتخب کرنے کا وقت بھی شاید آ جائے گا۔“

”بات سنو۔۔۔“ انہوں نے کتاب کی ورق گردانی موقوف کرتے ہوئے کہا۔

”تمہاری ساری باتیں میرے سر پر سے گزر رہی ہیں۔ مجھے کبھی شاعری اور ادب میں دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں باہر ضرور چاہتا کرتا ہوں روزانہ۔ بہر حال تمہارے اولیٰ ذوق نے مجھے خوش بخشی۔ بی۔ اے کے بعد کیا ارادہ۔۔۔“

”یہاں یونیورسٹی تو ہے جس پر انیویٹ ایم۔ اے کر لوں گی۔“

”پہ انیویٹ کیوں۔۔۔ ریکارڈ کیوں نہ۔۔۔ بھئی لاہور میں نہیں جوں۔ لے جاؤں گا تمہیں اپنے ساتھ۔ کرٹینا ایم۔ اے ویسے کس مضمون میں کرو گی؟ شہیر کا مضمون تو پالکس ہے۔“ گوہر نے شہیر کے نام پر سر جھکا لیا۔

”نہیں ادب سے دلچسپی ہے ایم۔ اے اردو کر لیتا۔ سیاست اور ادب لازم و ملزوم ہیں۔ ادب میں سیاست نہیں آتا۔۔۔ اور سیاست میں ادب۔۔۔ شہیر تو ابھی سے لیڈر بننا چاہتا ہے۔ مسائل حل کرتا پھرتا ہے لوگوں کے۔۔۔ اپنے اپنے گھر میں اچھی کہا لیاں مل جایا کریں گی۔“

”گوہر شہیر ہو کر رہ گئی۔ دلتو نے اس کے چہرے پر لگاؤ کی۔“

”گوہر اتم شہیر کے ذکر پر اتنی خاموش کیوں ہو گئی ہو؟“

”نہیں تو ماموں جان!“

”بیزرگوں سے جھوٹ نہیں بولتے بیٹا۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بڑی دیر بعد اس نے کہا۔

”ماموں جان!“

”میں کم عمر اور نا سمجھ تھی لیکن ماموں جان! مجھے معاشرے میں سرانجام کر چلنا پسند ہے۔ جھکا سر میری موت ہوگا۔ عورت معاشرے میں اپنے متعلقہ مردوں سے پہچانی جاتی ہے۔ باپ بھائی شوہر بیٹا۔ یہ چار ستون اس کی امت کو زندگی بھر سہارا دیتے ہیں۔ ان چاروں میں سے کسی ایک کا فضل مجھے جیسی حساس لڑکی کو ریزہ ریزہ کر سکتا ہے۔ میں اپنے والد کے کردار و اخلاق پر فخر کرتی ہوں۔ میرے بھائی بھی معاشرے کے اچھے افراد ہیں۔۔۔ اس گھر میں اپنی زندگی کا کافی حصہ گزار چکی ہوں۔ میری عمر اس گھر میں گزرے گی جو میرا سہلی گھر ہوگا۔ میں ایسے شخص کے ساتھ چند دن بھی نہ رہ سکتی ہوں۔ وہاں سب کچھ اس کے شانوں پر لوگوں کے غصب شدہ حقوق کا پو پو ہوگا۔“

”تو تمہیں بھی بدظن کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔“ دلوا نے جھٹ کہا۔

”لیکن میں آپ کو بتا دوں ماموں جان! میں نے اپنی زندگی کے معاملات میں کسی کی باتوں میں آنے سے بجائے اپنے ضمیر کے فیصلے کو ماننے کا عہد کیا ہے۔ شہیر نے مجھ سے بات کی تھی۔ سب کچھ بتایا تھا۔“

”لیکن تم پھر بھی متکلم ہونا تمہا نہیں کیا تم نے۔ میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اس کی صفائی میں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا۔ ہاں کل تمہیں عبد اللہ پر ضرور لے جاؤں گا۔ انسان کے بعض اعمال اس کے کردار کی کھلی تصویر بن کر چاروں طرف پھیل جاتے ہیں۔ وہ بدیوں یا نیک اعمال۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور کانوں سے سن لینا اور اپنے ضمیر کی روشنی میں حتمی فیصلہ کر کے فیصلہ دے دینا۔“

”آپ کی کجی تو آج شتم ہونے والی ہے۔“

”چھٹی کا کیا ہے۔ بڑھائی بھی جاسکتی ہے۔ ساری عمر تو ایوٹی پر رہا ہوں۔ اتنا حق بھی نہیں رکھتا۔ بہر حال شرم تم تیار رہنا۔ ہم عبد اللہ پور نکل رہے ہیں۔“

”ہم دونوں ہی.....؟“ وہ حیران تھی۔

”اسری بھی چل سکتے ہیں عام بھانگی کے لیے بھی کوئی مہلت نہیں ہے۔ جو براہِ نیکل کے جانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔“

”فحیک ہے ماسوں جان! بس میں اور آپ ہی جائیں گی۔“

عام حسنین سے اجازت و لوازمات لیتے پھرے۔ گوہرنے دودن کے لیے درخواست لکھ کر اسری کو دے دی۔ شام سے کچھ دیر قبل وہ دونوں جازم سڑک پر ہو گئے۔ کولر کی سیاہی اور کھاتی سڑک پر گاڑی کی اگلی نشست پر لوازمات کے ساتھ بیٹھی وہ باتیں کیے جا رہی تھی۔

بھاری دھیمکھو کا گز ہو رہا تھا۔ سامان سے لہے خوف ناک حد تک اونچے ٹرک۔ پوریوں سے بھرے لیے لیے نرالی شور مچاتے ٹریکٹر انسانوں سے بھرنی بلکہ اور لوگوں سے اور تھیں۔ کبھی ٹرک کراہتے ہوئے گاڑی آدھی کچے راتے پر اتارنا پڑتی۔ ٹرک میزھا ہونا نظر آتا تو گوہر جھٹ و لوازمات کا ہاتھ تھام لیتی۔ اسے لگتا ان کی گاڑی ٹرک تلے آ کر دب جائے گی۔ لوازمات بھانپ گئے۔

”گوہر بیٹے!“

”جی ماسوں جان!“

”بیٹے! حالات بھی ان میز سے ٹرکوں کی طرح ہوتے ہیں۔ سہانگی کا بوجھ لادے۔ انسان کو ڈراتے رہتے ہیں..... ٹرک جانے کا خوف اس کو بے چین رکھتا ہے۔ وہ پناہ تلاش کرتا ہے۔“

وہ چپ رہی۔

”چھوٹی سی عمر میں انسان کو اتنے ٹرک منڈ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ عمر بٹنے کھیلنے کی ہوتی ہے۔“

”بعض لوگ ایسا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔“

”میری نظر میں وہ بے حوصلہ اور کم ہمت ہوتے ہیں۔ انہیں زندگی گزارنے کا سلیقہ نہیں آتا۔“

”یہ بے حوصلگی اور کم ہمتی نہیں ماسوں جان! ایک قسم کا حفاظتی قدم ہے۔ زندگی کے معاملات میں سوچ بچار بہت ضروری ہے۔ پھر جیسے کو تو میدان لگتی رہے ہیں۔ ہاں کسی منصوبے کے بغیر سوچے سمجھے آزاد کروا لیا گئے چلے جاتے ہیں۔ باندھ دیرک جاتے ہیں۔ آگے ڈال دو چارہ کھانے لگتے ہیں بھوک لگی ہو تو احتجاج سے قاصر ہوتے ہیں۔ تکلیف کا اظہار نہیں کر سکتے۔ انسان اور حیوان میں فرق ہونا چاہیے۔“

”گوہر! کہیں یہ سب ڈھکا چھپا انکار تو نہیں۔ تم شاید واضح کرنا چاہتی ہو کہ تمہیں شہیر کی ہمراہی میں زندگی گزارنے سے انکار ہے۔“

”نہیں ماسوں جان! مجھے روایت پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کرنے سے انکار ہے۔ میں سب کچھ خود ہی بنا سچتا اور محسوس کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کہہ دیں! انہیں کہہ دیں جو ہر آپا کہہ دیں! ساری دنیا کہہ دے کہ وہ بچا انسان ہے۔ میں مان لوں۔ شاید مجھے ماننا بھی چاہیے۔ آپ سب میرے نزدیک محترم ہیں۔ لیکن معاف کیجئے گا ماسوں جان! اگر میں نے اسے چھاندا پایا تو.....؟ کیا سبکی ہوگا کہ میں رفاقت کو ایک ناگوار بوجھ کے طور پر اٹھائے زندگی گزاروں گی؟ یا آپ اور باقی لوگ خوش رہیں گے؟ میں ایک عام سی لڑکی ہوں پابند رسم و رواج ان حدود و قیود۔ لیکن میری سوچنا ہی ہرگز نہیں ہے۔ مجھے گورنٹ کی ایسی زندگی سے نفرت ہے کہ وہ پیدا ہو جادھر تکھیل دیا جائے وہاں..... ان کی مرضی کی زندگی گزارے۔ مختلف ادوار میں مختلف افراد کی خدمت کر۔“

ادھر جاتے۔ میں معاشرے پر اپنے خاندان پر اپنے گھر پر اپنے نقوش ثبت کرنا چاہتی ہوں۔ جہاں کے دکھ اور شہ میں میری رضا شامل ہو۔ میں ان لوگوں کے لیے اپنی توانائیاں صرف کرنا چاہتی ہوں۔ جنہیں میرا دل تسلیم کرتا ہو۔ یہ نہیں کہ دن بھر کلید کے تیل کی طرح جھٹ کر رکت کی تا، کیکیوں میں چھپ چھپ کر اپنی نامرادی دکھائی پر آنسو بہانی رہوں۔ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن ایک اچھے رفیق سفر کے ساتھ مل کر عزت و شہرت میرا ہی منجائے نظر ہے۔“

بائخاز نے حیرت بھرے انداز میں گوہر کی طرف دیکھا۔ وہ اٹھنا کی جذبہ باقی ہو رہی تھی۔

”ماسوں جان! یہ سچ ہے کہ شہیر کی وضاحت کے باوجود میری نگاہ میں اس کا کردار مشکوک ہو گیا ہے۔ دوسرے اور مفروضے مجھے ڈراتے ہیں۔ شک پریشان کرتے ہیں۔ میں نے پہلی نظر میں جو رائے اس کے متعلق قائم کی تھی پھر ادماغ اکثر اس کی نشی کرتا ہے۔ میں اپنے اندر اٹھنے والے سوالوں اور اعتراضوں کو دبانے میں ناکام رہ رہا ہوں۔ لیکن ان سارے مسائل کا حل بھی ہے: روز ہی جو آپ نے سوچا ہے۔ میرا خیال ہے میرے اطمینان نوکالی رہے گا۔ اگر میں نے شہیر کو اکثریت کی رائے میں ویسا ہی پایا جیسا میں نے پہلی نظر میں سوچا تھا یا جیسا آپ اسے ظاہر کرتے ہیں تو میرے دل و دماغ کی تمام رضامندیوں اسی کے حق میں ہوں گی۔ ماسوں جان! میں اسی باتیں باہا جان سے نماں سے یا جو ہر آپ سے نہیں کر سکتی..... صرف آپ سے کوئی ہوں صرف آپ سے۔ یہ جرات آپ کی اس محبت نے بخشی ہے جس کا اظہار آپ کی شادی میں آپ کی طرف سے ہوا۔“

”شکر ہے کوئی تو ہے جسے ہم اپنا اس حد تک محتسب خیر خواہ اور ہمدرد سمجھتی ہو..... لیکن حیرت بھی ہے کہ اپنے اس نیر خواہ کی رائے ماننے سے انکار کی ہو۔“

”ایک وجہ ہے اس انکار کی۔ آپ میرے ہی نہیں دوسروں کے بھی خیر خواہ ہیں نا۔ اور مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ آپ باذاتی عزیز از جان کی جیسے بھی ایک تہم کا انکار بھی کر بیٹھے تو آپ کی رائے اتنے مصلوب کر دینے کے حق میں نہ ہوتی۔ آپ کے اندر کے نرم گوشے اسے بچا لینے کے خواہاں ہوں گے۔ یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے ہر انسان کی نفسیات پر لاگو ہوتا ہے۔“

”گوہر! تمہارا مجرم اتنے بڑے جرم میں ملوث نہیں ہے۔ اس نے تو صرف احتسابی طبقے کا ساتھ دینے کا جرم کیا ہے۔ اپنے علم اپنے اثر و رسوخ اپنے تعلقات اپنے حوصلے اور جرات کو جائز مقام پر استعمال کیا ہے۔“

گوہر مسکرائی۔ سفر آسان ہو گیا کیونکہ باتوں کا رخ بلکہ پھٹکے موضوع کی طرف مڑ گیا۔ لوازمات اپنی خوب صورت باتوں اور شہیر انداز کی مدد سے اسے چسواتے رہے۔

☆☆☆☆☆☆

حیدر اللہ پور کی ایک سہانی صبح گوہر کے سامنے تھی۔ نئی تعمیر شدہ رہائش گاہ کے ایک بیڈروم کے در پیچے سے باہر نئی وہ گاڑی کا نظارہ کر رہی تھی۔ یہ خواہ گاہ جہاں اس نے رات گزار لی تھی۔ بڑے دن شہیر کے تصرف میں تھی وہاں وارڈ روم میں اس کے استعمال کی کئی چیزیں رکھی تھیں جن میں سے ایک اس کے مخصوص کلبوں کی آدھی تھیں۔ تم بھری شیشی تھی۔ اس کا شیوگم کٹ تھا۔ استعمال کے چند جوڑے پہنے تھے۔ شب تہانی کا لباس تھا۔ ایک سلیر اور ایک پٹاوری چھل تھی۔ بسز بھی غالب اس کے استعمال میں رہا تھا۔ اس کے کلبوں کی خوشبو پڑی تھی۔ اپنی عادت کے مطابق سر تھپے کے اوپر رکھنے کے بجائے گدی سر پر رکھے آنکھیں بند کیے وہ کلتھی دہ سوچتی

ارم سے اس رہائش گاہ میں شبیر کے قیام کی کئی وجوہات بتائی تھیں۔

”تمہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا ناممکن ہے۔“ اس نے سوچتے سوچتے جھر جھری سی لی۔

بستی والوں کو دلچسپانہ آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ صبح ہی صبح غنور ہانڈے کے گھر والے بھاگے چلے آئے۔ وہ غسل کر کے قارغ ہوئی، ٹیکے بالوں کے ساتھ باہر آئی تو کئی عورتیں حویلی کے کپڑے میں موجود تھیں۔

دلنواز ایک آرام کرسی پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔

”یہ شبیر میاں کی منگ ہے نہ ہراں بی بی؟“

انہوں نے ایک اوجیز عمر خاتون کو مخاطب کیا۔

”اے میں قربان۔ تو یہ ہے اپنی صفید بی بی کی بیٹی۔ ماشاء اللہ۔ چشم بد دور۔ آ بی بی آؤ۔ ادھر میری اکھوں کے سامنے بیٹھو۔ میں رنج کے تمہیں دیکھ لوں۔“

”سے ہراں! اپنا شبیر میاں کیا کم ہے۔ اللہ نے جن سورج کی جوڑی ملا دی ہے۔ اسے بے کیا نور چمک رہا ہے چہرے سے۔ بستی خوش نصیب ہوئی جسے شبیر میاں جیسا ہند نصیب ہوگا۔ میں تو ہر دم کہتی تھی۔“ گوہر نے دلنواز کی طرف دیکھا جو کتاب کی اوٹ میں شہر پر بچوں کی طرح مسکرا رہے تھے۔

عورتیں باری باری اس کے سر پر ہاتھ رکھنے لگیں۔

کئی ایک نے فرط مسرت سے اس کی خوب صورت پیشانی چوم لی۔

چھوٹی چھوٹی بچیاں اسے ایک تک دیکھ رہی تھیں۔ ایک گندم کے سبرے خوشوں کی رنگت جیسی سنہری بی بی جس کے بال دھوپ میں سونے کی طرح چمک رہے تھے آگے بڑھ آئی۔ اس نے اجماعی مصومیت کے ساتھ گوہر کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ اس کی دیکھا دیکھی اور بھی بچیاں اس کے ارد گرد جمع ہوئیں۔

ایک دن گیا وہ سالہ بچی نے اپنی بھوئی کے کان میں سرگوشی کی۔

”وہ حویلی والے چھوٹے میاں صاحب تھے وہ سوہنے سے اونچے لمبے ان کی دلہن ہے پ۔ ماں نے آپ مجھے بتایا تھا..... اللہ قسم تم ماں سے جا کر پوچھ لو۔ سوئی ہے نا؟ چھوٹے میاں صاحب یہ بی بی ڈگری لینے گئے ہیں۔ بہت دور۔ آئیں گے تو یہاں ہوگا ان کا..... ماں نے ان کی وہ بٹی کے لیے بہت سوہنا چیزیں والا جوڑا بنوایا ہے اور تھے دائی جوتی بھی۔ ماں کہہ رہی تھی شادی میں ہم سب جائیں گے سبر میں یہ بڑا گھر ہے بیڑے میاں صاحب کا..... گل ہے گل.....“

گوہر نے اچانک اس کی طرف دیکھا تو وہ بھینپ گئی۔

”بی بی! میاں صاحب کہہ رہے تھے آپ کوگاؤں کی سیر کا شوق ہے۔ آپ تیار ہو جائیے۔ میں آپ کو لے چلوں گی۔“

گوہر کی نگاہوں میں اس نوجوان خوب صورت لڑکی کے لیے اجنبیت تھی جسے اس نے پہنچا لیا۔

”میں رانو ہوں جی! مسرور کی بیوی۔ غنور بابا مسرور کے دادا ہیں۔“

گوہر غنور بابا سے بھی آگاہ نہ تھی۔ مسرور اور رانو کی اسے کیا خبر ہوتی۔

”گوہر! تم تیار ہو جاؤ گا۔ میں بس بیٹھ کر تمہارا انتظار کروں گا۔ اتنی دیر میں تمہاری انہریری سے منتخب کی ہوئی یہ کتاب بھی پڑھ لوں گا۔“

واندر چلی آئی۔ سگیلے بالوں کو برش کر کے ڈھیل ڈھالی چوٹی بنا کر چادر لے کر باہر آگئی۔ ساری خواتین کسی بناؤں کی صورت اس کے ساتھ چل دیں۔

رانو اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے گوہر کا حیرت گیا۔ ساری عورتیں بھاگ کر اسے نہانے لگیں۔

”بی بی سنبھل کر چلیں..... آپ سڑکوں پر چلتے والی ہیں۔ ان راستوں پر چلتے بڑی اوجھڑائی ہوگی آپ کو۔“ رانو ہنس لگے میں چکی۔

”چھوٹے میاں کو تو گاؤں بڑا پسند ہے۔ آپ کو اکثر بیاں آنا پڑے گا۔ چنانچہ لیجیے۔“ وہ زربت مسکرائی۔

”تب وہ سنبھال لیا کریں گے۔“ قریب ہی سے ایک اور شوخ آواز آئی۔ گوہر نے بے اختیار اس طرف دیکھا۔

”بیزرینڈ ہے بی بی! مسرور کی بہن چار ہفتے پہلے گھر خود کو لالت صاحب کی بیٹی سمجھتی تھی ہے۔“ سرخ و سپید رنگت خوب صورت دانتوں کی فرمائش کرتی مسکراتی اچھی لگتی رہی تھی۔

”کوئی بات نہیں۔“ وہ بھی مسکرا دی۔

”چھوٹے میاں کی طرح آپ بھی اسے سر پہ چارہ لیا ہیں۔ دو ستاروں نے کرتے تو دادا نے اسے کبھی ہائی اسکول تک نہیں بھیجا تھا۔“ رانو نے پھر وضاحت کی۔

”اے گلے مت کر دو میرے بھائی! سب سے زیادہ سر چڑھی تو تم ہو چھوٹے میاں کی بھائی کی شکایتیں لگاتی ہیں۔“

”کان کھینچتی ہو اس کے جلا کسی جرم۔ بی بی..... بھائی تو کنوئیں میں کود کر جان دے رہی تھی۔ چھوٹے میاں نے اسے بھیا کے میرے بھائی کے گلے میں لٹکا دیا ہے چارہ ہوگا رہا ہے۔“

”بی بی کوئی غیر تو نہیں ہے۔ جو اس سے بات چھپائیں گے اور مسرور کو تو چھوٹے میاں نے خرید لیا ہے بی بی۔“

”ہاں جہاز کی رقم میرے لاپٹا باپ کو نہ دیتے تو آج میں اس دق کے مارے بوڑھے کی بیوہ ہوتی مسرور کی بیوی نہ ہوتی۔“

”کیا مطلب؟“ گوہر نے دلچسپی ظاہر کی تو لڑکیوں نے ساری کٹھا کہہ سنائی۔ بگڑے یا توں کا ایک طویل سلسلہ

بیترو دیا۔ شبیر کی قصیدہ خوانی میں بچیاں لڑکیاں بڑی بوز حیاں سب شامل تھیں۔

”بی بی! گاؤں تک کی یہ کئی سڑک..... یہ بانی اسکول سب ہی تو شبیر میاں کے احسان ہیں۔ گاؤں کے ٹرکے لڑکیاں ان سڑکیوں کو ششوں سے پڑھ لکھ رہے ہیں۔ کھیتوں کی ہریالی ان ہی کے دم سے ہے۔ پہلے علاقے کے زمیندار غریبوں کے نام سے قرض لکھوا لیتے تھے۔ شبیر میاں نے سب کو بلا سو قرضے دلوائے ہیں۔ ہمیں کھاؤ بیچ

خیر نے میں آسانی ہوئی ہے۔ رنج کی فصل اتنی بہتی کہ قرضہ چکا کر بھی گھر بھر گیا۔ ان کا دم تو اس گاؤں کے لیے ہر گت سے۔ گھروں میں خوشحالی دوڑنے لگی ہے۔“

اس عقیدت کو سن کر گوہر کو گمان گزرنے لگا کہ بعد دنوں کے وہ شبیر کو تیر نہ سمجھتے لگیں۔ بیزرینڈت۔ وہ آپ ہی

آپ مسکرا دی۔

”بی بی.....!“ بارغ کے سبز تھلیس فرش پر وہ اس کے گرو تھیرا ڈالے بیٹھی تھیں۔

”بی بی! چھوٹے میاں کی ماں انگریز عورت تھیں بھلا؟“ زربت کو بڑی کھوج لگی تھی۔

ایک خاتون نے اس کی کمر میں دھمو کہ چڑویا۔

"بہت بولنے لگی ہے تو زینبی: تیری یہ جرات۔ تو ایسے سوال کرے۔"

"یہ حقیقت ہے نہ ہراں ہائی..... اور زینب نے پوچھنا تو برا کیا ہے؟"

"اچھا بی بی سچ و سچ وہ اٹریڈ نہیں۔" انہوں نے بھی تیرائی کا اظہار کیا۔

"ہاں انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔"

"پھر؟" کئی ایک نے اشتیاق ظاہر کیا۔

"پھر ایک بچے کو جنم دے کر واپس گئیں۔"

"اوہ۔ یہ تو بہت مزہ تھا۔ چھوٹے میاں پھر کس کے پاس رہے؟" ان سب کے چہرے غم کی تصویر بن گئے۔

گوہر اس نازک موضوع پر کچھ نہ کہنا چاہتی تھی۔ پر جانے کیوں وہ کہنے لگی۔ جو کچھ بتانا مناسب تھا۔

وہ کافی تھک چکی تھی تارم کی میر کے بغیر لوٹ آئی۔ راتوں اس کی گریویدہ ہو چکی تھی۔ زینب نے بھی وہاں سے

جانے کا نام نہ لیا۔ بھاگ بھاگ کے اس کے کام کرتی رہی۔

"گوہر بی بی۔ آپ کوئی کی روٹی اور ساگ دیکھا لگتا ہے۔"

"ہاں بی بی تازہ کھن کے ساتھ۔" زینب نے گراہ لگائی۔

"کیوں کیا آج تم نے کھانے میں یہی چیزیں بنائی ہیں؟"

"میں بی بی آج تو سرور نے دم پخت بنایا ہے۔"

"دم پخت۔" گوہر نے حیرت کا اظہار کیا۔ "وہ کیا ہوتا ہے؟"

"وہ جی میں اور سرور گئے تھے چڑاؤں۔"

"سب؟"

"جی شادی کے بعد۔ وہاں اس کا ایک دوست ہے۔ وہیں بنانا سیکھا تھا اس نے۔ صبح سویرے سرور اور منظور

مل کر ہماؤں کر رہے تھے۔ سالم بکرے کا پیٹ چاک کر کے اس میں چاول بھرے جاتے ہیں اور اسے ٹوکوں پر

پکایا جاتا ہے۔"

"اوہ مائی گاؤر اتنا یہ سالم بکرے میں اور ماموں جان کھا نہیں گے۔"

"اور نہیں تو کیا۔ شام کے لیے داہی نے صحت مند مرغیاں اتنی سے ڈرے میں بند کر دی ہیں۔ تجھے مرغی کا

بھنا ہوا سا بنانا آتا ہے۔ بہت اچھا چھوٹے صاحب کو تو گرم گرم تندوری روٹی بے حد مرغوب ہے جتا ہے بی بی

کہتے ہیں روٹی پر روٹی نہ لگنی جائے۔ لذت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں پر تھے تو چاہے رات کے پار وہ بکے ہی کھانا

کیوں نہ کھاتے۔ روٹی تازہ پکا کے دیتے تھے ہم لوگ۔"

"اوہ ایسی بھی کیا خدمت گزار رہی۔"

"نہ بی بی! بعض لوگ اسے ہی اچھے اتنے عیار سے ہوتے ہیں کہ ہر شخص انہیں چاہنے پر مجبور ہوتا ہے۔"

راتوں کے بچے میں بہن کا سارا پیار چھپا تھا۔ آنکھوں میں احترام اور تقدس کی جھلک تھی۔

"بی بی آپ کو خبر نہیں کہ..... صاحب میرے ماموں کی بیٹی ہے۔ چھوٹے صاحب کو دعائیں دیتی ہے۔ اس کا

گھر آباد ہو گیا۔ سرد رہا شہر میں تو کمری کرنے لگا ہے۔ وہیں ایک چھوٹے سے گھر میں دونوں آباد ہیں۔ عباس

اور رضیہ بھی وہیں ہیں۔ چھوٹے صاحب نے تو مال گمراہ کیا۔ یہ مسئلہ بڑے بڑوں سے بھی حل نہ ہو رہا تھا۔ بی

میں کیا سے کیا ہو گیا۔ ایسے لوگ پیار کرنے پانگہ پوچھا کے لائق ہوتے ہیں۔"

"بی بی۔ رضیہ اور صاحبہ والا واقعہ تو مثال بن کر رہ گیا ہے۔ گاؤں میں ایسے اور بھی کئی مسئلے تھے۔ لڑکے لڑکیوں

کو زینبی جی مل کر لیے۔ بی بی گاؤں میں شادی شدہ لڑکیوں کو ماں باپ زبردستی اپنے گھر بٹھا لیتے ہیں۔ جب

لے والے لینے آئیں تو دو چار ماہ کے خرچ کا تقاضا کرتے ہیں۔ غریب لوگ پیسہ ادا کرنے کے قابل نہیں

ہوتے۔ بھوکے لے جاسکتے۔ پیسہ بیٹے کے سدور سوو کی طرح بڑھتا ہی رہتا ہے اور ایک دن گھر بڑھ جاتا ہے۔

انہیں سرسراہ میں لڑکیوں پر ظلم کیا جاتا ہے۔ ان کے شوہر سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنے رہنے پر مجبور

ہوتے ہیں۔ کہیں لڑکیاں اسی سالہ بڑھوں سے بیاہ دی جاتی ہیں۔ بے چاریاں اف تک نہیں کر سکتیں انکار کو

بندھنا سمجھا جاتا ہے۔ لڑکیاں اپنے والدین کی عزت و آبرو کے پاس میں قربان ہو جاتی ہیں۔ عمر بھر سکتی رہتی

ہیں۔ روتے سکتے زندگی گزار دیتی ہیں۔"

زینب یہ باتیں کہتے ہوئے عام سی لڑکی نہیں لگ رہی تھی۔ بلکہ کوئی منگ لگ رہی تھی۔ گوہر نے حیران ہو کر

اتار دیکھا۔ لیکن بولی کچھ نہ۔

☆☆☆☆☆☆

رات کو وہ سب پھر اس کے پاس جمع تھیں۔ وہ بھی ان سے مذاکراتی نہ گھبرائی۔ باتیں کرتی رہی۔ راتوں سب

بڑھتی بڑھتی بھینچا۔ دلواوازی اس کے گھر سے ہٹ آئے۔

"گوہر بی بی! اس رات دن ہم نے آپ کی صورت ہی نہیں دیکھی۔ اکیسے جتنے پورے ہوتے رہے۔"

"سوہنی ماموں جان۔ اصل میں ان سب کے ساتھ میں گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔"

"ماموں جان ایک بات تو بتائیں۔"

"ہاں کہو۔"

"ماموں جان! یہاں پر بونیز اسکول موجود ہے کیا گزرا اسکول نہیں بن سکتا؟ میرا مطلب ہے ٹل یا ہائی

اسکول۔"

"وہ بھلا! گویا شیر کی چوٹی تو تم نے محسوس کر لیا۔ جان لیا تم نے وہ سب کچھ جو تمہیں سکون دے سکتا ہو، مطمئن

ہو سکتا ہو۔"

"جی ہاں ماموں جان! اور میں اس پر شرمندہ بھی نہیں ہوں کہ میرے مفرد ضمیر غلط نکلے کیونکہ کھوج میرا پہلا

حق تھا۔ آپ نے یہ حق استعمال کرنے میں میری مدد کی آپ کی شکر گزار ہوں اور بہت زیادہ مطمئن بھی ہوں۔"

"ہاں جان! زندگی اتنی بے مصروفی سے ہرگز نہیں ہے کہ آپ اسے بداعتقادنی کے ساتھ بے وقافیوں کے زہر

بٹھینے میں اتنا زور دے سکتے گزار دیں۔"

"بہت خوب! بہت ہی خوب! تلاش کا مرحلہ طے ہو گیا عمل کا مرحلہ جاری ہونے والا ہے۔ مبارک! احد

مبارک۔ لیکن گوہر بی بی! انہیں کچھ دہرے میرا مطلب ہے ابھی نہیں بھی تو اپنی تعلیم مکمل کرنا ہے۔ میں نے عاصم

بنائی سے کہہ دیا ہے۔ تم میرے ہاں چلو گی۔ اسم۔ اسے! ہیں کریگی۔ یہاں کا ماحول اور فضا محدود ہیں۔ وہاں کی

بات اور ہے اور تمہیں ایک وسیع تعلیمی ماحول کی ضرورت ہے۔"

گوہر خاموش تھی۔ بلنوازا سے بخور دیکھنے لگی۔

"یہ..... تم..... میری بات پر خاموش کیوں ہوئی ہو؟ کیا اپنے باپ کی طرح تم بھی غیریت محسوس کرتی ہو؟ ہم

ہیں اور خود! اس قاصد محسوس کرتی ہو۔ گوہر! تمہارے ہاں کو میرے جاگیر دار باپ سے اختلاف تھا مگر میں صرف



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



ایک دن بار کا بیٹا ہوں۔ اپنی ذات میں انتہائی لیبرل ہوں۔ منکسر المزاج ہوں۔ انسانی اقدار کا پاسدار ہوں۔ گوہر کو ہلکی آگنی۔ ارے آپ نے تو پوری فہرست گتیاں اپنی خوبیوں کی کر بیسے آپ ایک سخت گیر انسان بھی ہوتے ہوں جان تو پھر بھی میرے ماموں تو تھے ہی۔ میں تو کچھ اور سوچ رہی تھی۔

”کیا؟“

”ایسی پیش کش کاظم چچا بھی کر چکے ہیں اور وہ بھی بہت اصرار سے پایا اگر آپ کا احسان لینا پسند نہ کریں گے تو انہیں مجھے وہاں بھیجے سے نریزاں ہیں اور بابا تو میری خاطر رہیں ایک چھوٹا موٹا گھر بھی لینے کو تیار ہیں۔ صرف اپنی خودداری اور اتنا کو بھانسنے کے لیے کسی سیب میں نہ سوچا لیا تھا کہ پرائیویٹ انیم۔ اسے لڑلوں گی۔“  
”تاکہ کوئی جھگڑا نہ نہ رہے۔ انہی مائی گاؤں میں غلط سوچنے میں تم سب کی۔ بھلے تم کاظم کے گھر ہی رہ لو لیکن پڑھو وہیں نہ کر رہی۔ جس کل نریزاں کہوں گا نام بھائی سے۔ زور نہ آتا آگے نکل چکا ہے اور یہ ہیں کہ ابھی تک اپنی نام تیرا عزت نفس کے بت کو سینے سے لگا کے زندگی گزارے جا رہے ہیں۔ بھئی گوہر! اب تو اس بڑی اتنی فائدہ مند کیا جانا چاہیے۔ اب انہوں اور جاگیرداروں کا دور قریب قریب ختم ہے۔ غریب کو خود نشانیہ کو عرصہ ہو گیا ہے۔ معاشرے میں وہ لوگ اپنی ہستی کے تحفظ کے ساتھ ہی رہے ہیں۔ نیاقت اور قابلیت ترقی کا ریتہ۔ پوچھا ہے۔ لوگ کسی کے احترام میں آ رہے قدر تک جھکنے بھول رہے ہیں۔ اب تو عالم بھائی کو چاہیے کہ وہ صرف ترقی نہ ترقی کو یاد رکھیں۔“  
گوہر جس وی بلکہ ہستی چلی گئی۔

”مجھے معلوم ہے۔ بلکہ میں نے بھی ایک ایسا منظر دیکھا ہے۔ جب آپ آپا کی شادی میں بیمار سے ہائے تھے۔ ہائی گھاس لیے آپ کے سر ہانے کھڑی تھیں۔ آپ آنکھیں بند کیے مزے سے کبے جا رہے تھے۔“ بھئی کہہ جو دیا ہے وہ نہ لیا تھا میں نے۔ دونوں پہلے ہی پی لیا تھا۔ بلکہ آٹھ دن ہوئے پی چکا ہوں۔ اس نے جیتے جیتے بات سہل کی۔

”صرف یہ ہی کیا۔ اکثر ایسی محسوس بھی ہوتی ہیں جب میں باقاعدہ تھا ہوتا ہوں کہ رات میں وہ وہ نہیں پیا اور صبح مجھے یاد بھی نہیں رہتا۔“

”زندہ ہوا ماسوں زندہ پاؤ۔ آپ تو کیسے کرائے پر پانی بھرنے والے ہیں۔“  
”گوہر! ایک شخص ہی آہا ان کے لیون پر آگئی۔“ ایک اچھا جیون سماجی زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ میں اس معاملے میں بے حد خوش نصیب ہوں۔ ایک بہترین خاتون بہرہ شریک سفر ہے جس کی ہمراہی میں خوشیوں کے رنگ گہرے اور برکتوں کے پوچھ بے حد ہلکے محسوس ہوتے ہیں یہ احساس جاننا فخر ہوتا ہے کہ کوئی آپ کی خاطر وقت ہے۔“

گوہر کے قصور میں شیر در آ رہا۔ معنی خیز مسکراہٹ لبوں پر آن بسی۔

رات کے جانے کسی پہر اس کی آنکھ کھلی۔ چھت پر بارش کے موٹے موٹے قطرے کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ ایک مسلسل غم میں بدل گئی۔ ہادلوں کی گرج کی جھک پانی کی برستی پوچھا لڑیں۔ لمحہ بھر تو ایک انجام سامانوف ان پہ چھایا رہا۔ دلی زور سے دھڑکا ہوا تھو پیر سنسائے پھر وہ مارل ہوئی۔ انہو ٹیٹھی۔ وریق چل کر کھڑکی کی طرف آئی۔ ہر کھڑکی کا ایک پت کھول کر باہر دیکھا قضا کو مہیب آمد تیرہاں نے خوف ناک بنا دیا تھا۔ بجلی نہ چمک رہی تھی۔

نہ کی۔ اچالے نے چکا چوند پیدا کر دی۔ پانی اپنی پوری قوت سے برس رہا تھا۔ اسے کسی چیز سے خوف آتا تھا۔ یہی ہادلوں کی گرج جھک ہی تھی۔ جی چاہا بھاگ کے دلہنواز کے کمرے میں چلی جائے۔ انہیں جگا دے۔ لیکن ہادی نیند خراب ہو جانے کے ارے وہ ایسا نہ کر سکی۔

بال پھر زور سے گرجا۔ اس نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا اور بے اختیار وارڈ روب کی طرف چلی آئی۔ ہاں شیر کے مخصوص کلون کو خوشبو رچی ہی تھی۔ اس نے برقیوم کی شیشی اٹھائی۔ انگوٹھے کے ہلکے سے دباؤ پر اس نے بیان اس خوشبو سے بھیک گیا۔ خوشبو چاروں اور پھیل گئی۔ وہ پھر اپنے بستر کی طرف آئی۔ وہ خود کو تباہ محسوس نہ کر رہی تھی۔ خوشبو۔ جو اس کے ارد گرد بگڑا اس کے وجود میں پھیل گئی تھی۔ اس خوشبو نے ایک مجسم شکل اختیار لی۔

شیر کا کمر اس کا بستر اس کی خوشبو اور پھر اس کا تصور یہ سارے ٹکڑے ٹکڑے اس کی تہائی دور کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جانے کیب وہ پھر سو گئی اور جب جاگی تو فجر ہو چکی تھی۔ حوائج ضروریہ سے فراغت پا کر اس نے نماز ادا کی۔ اب بھی ایرا لود تھا۔ سیاہ اور سفید بادل ایک دوسرے میں مدغم ہو کر سرخی شکل اختیار کر گئے تھے۔ حد نظر تک ان کا نام و نشان بھی موجود نہ تھا۔ صبح صادق چمکیلے اجالوں میں نہ بدل سکی و حلقی شام اور ترقی رات جیسا سال آ رہا تھا۔ بارش اتنی نہ ہوئی تھی جتنے بادل تھے پھر بھی بستر اور درخت وحل دھلا کر بڑے خوب صورت لگ رہے تھے۔ شاہ چارواٹھا کر باہر آگئی۔ لہذا شاید اب تک سوراہے تھے اس نے انہیں چکا تاب بھی مناسب نہ سمجھا اور چلی گئی۔ روح میں اترتی تازگی کے بحر میں قید سیدھی سڑک پر چلتی وہ بہت دور نکل آئی۔ سڑک کے اطراف لہلہاتے خیت ماسکت تھے۔ فضا جاسوش تھی۔ بادل گویا صبح کی آمد کے احترام میں باادب تھے۔ ابھی چپ چاپ فضا پر بیٹھے تھے۔ بجلیاں تھک کر آرام کرنے لگی تھیں۔ دو آگے بڑھتی گئی اور نکل آئی۔ اسپتے ہی خیالوں میں کم موسم کی آفرین کا شکار ملی ہم پتہ سڑک چھوڑ کر پلٹ کر ڈی اختیار کرتے ہوئے اسے احساس ہی نہ ہو سکا۔ وہ چلتی گئی ان کے دائرے ہاتھ ایک بہت بڑا بارغ آ گیا۔ آم جامن لیون، گھترے امرود کے درخت کیوں کے جھنڈے سولہ ہی جگی دیوار کے پار کا سال سے حد خوب صورت تھا۔ خود رو بیلیوں سے ڈھکی زمین رنگ برنگے پھول۔ ان کے ساتھ ہی گلاب کے کچھ سرخ انگارہ دیکھتے گلاب سفید گلاب چینی کی کے پھولوں کا کچھ سفید سفید نرم و انب پھول بہت بھلے لگ رہے تھے۔ ان پھولوں کی بھئی بھئی مہک اسے اندر کھینچ لے گئی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ نوہر پھولوں نہری وادی میں آگئی۔ اسے پھول بہت عزیز تھے۔ لیکن لیون چمن میں اپنی سرسبز شاخوں سے لپٹے پھول خوب سو رہی اپنی آخری حدوں کو کیوں نہ چھو لیتا پھول توڑ لینا اسے جرم لگتا تھا۔ اب بھی اس کا دل بابائیلی کے ذمہ یوں پھول اپنے دامن میں خیر لے کو لیکن اس نے دل کے سارے تقاضے اپنے اصل پر قربان کیے۔ بارغ کے پھول سچ ایک صاف شفاف پانی کی ندی بہ رہی تھی۔ ٹھنڈا پانی چمکتا پانی۔ اس نے جھک کر پانی پینو میں بھر لیا۔ ہتھی جو گلابی تھی۔ پانی سے پانی کے سبب سرخ ہو گئی۔

ندی پار کرتے ہوئے اس نے ہاتھ اپنی چادر کے پلو سے پونچھ لیا۔ بارغ کے دوسرے کنارے پر آ کر اس نے ہانسنے دیکھا۔ منظر بے حد خوب صورت تھا۔ سورج بڑی بڑی سے طلوع ہو چکا تھا۔ لیکن سیاہ بادلوں کے پار کہیں نہ تھا۔ مشرقی افق کے بادل نارنجی سے ہو گئے تھے۔ وہ اتنی سمت چل پڑی۔ اسے بہت کچھ یاد آنے لگا۔ یوں کی ایک شام شیران کے گھر آ یا تھا۔ تو جوہر آ پانے سوال کر کے اسے رنج کر رہا تھا۔

عبداللہ اور کے جنگلوں میں رہتے ہو کیا لطف ہے وہاں زندگی کا؟ نہ شور شرابا نہ رنگینی نہ باؤ ہو۔

خاموشی زندگی۔“

”آپ کو کیا خیر زندگی اپنی اصلی صورت میں وہیں تو دیکھنے کو ملتی ہے۔ میں تو علیٰ البصیح ہی باہر نکلتا جانا ہوں۔ تم از کم دو میل سڑک کرنا ہوں روزانہ۔ بیڑی تازگی محسوس ہوتی ہے۔ شہر میں تو آپ نہیں بھی چلے جائیں وہیں گھوڑا دھماں آپ کی جان ہی نہیں چھوڑتا صاف لٹھا کہاں سے ملے گھر کے مشرقی جانب چھوٹی چھوٹی سرسبز پہاڑیوں کا سلسلہ ہے۔ ان پر سو جو دھمکیرے درخت آسمان سے گھے ملتے نظر آتے ہیں۔ آپا ہلکے آپ جس طرف بھی دیکھیں دھرتی آسمان ایک دوسرے سے ملتے ہی نظر آتے ہیں۔ آسمان ایک بہت بڑا پالہ نظر آتا ہے جس میں آپ میں ہم سب تید ہیں۔ خیر آپ کو اس کی کیا خبر۔ آپ کو تو صرف اپنے آنگن سے نظر آنے والے آسمان کی خبر ہے۔ چھوٹے سے آسمان کی۔“

یو مسکرائی۔ اس خوب صورتی نے اسے بے حد متاثر کیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے اسی سلسلے تک پہنچ جائے ان درختوں کو ہاتھ لگا آئے جو آسمان کو چھو رہے تھے۔ لٹھا پر چھانے پر اسرار اندھیرے کے باوجود مشرقی سمت بڑھتی چلی گئی۔ بادل بہت گہرے ہو گئے۔ اچانک ہی سرسبز اندھیرا تاریکی میں بدلنے لگا۔ گوہر نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی نگاہ بہت دور تک نہ پہنچ سکی۔ اندھیرے نے راستوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لٹھا کی خاموشی ایک زبردست گرج نے توڑ دی۔ بادل میں اس کے سر پر گرے۔ بجلی بڑے زور سے چمکی۔ گوہر بے اختیار جھک گئی اس نے سر گھٹنوں میں ڈبے لیا۔ اس کا پورا وجود سرسبز کے باوجود سینے میں ڈوب گیا۔ وہ اٹھی۔ ایک قدم آگے بڑھایا تھا کہ موٹے موٹے پانی کے تفریے اس کے وجود پر برس گئے۔ دو بے اختیار بھاگی۔ بدحواسی میں اسی سمت دوڑی چلی گئی۔ جدھر پہلے ہی جا رہی تھی۔ ماحول بے حد خوف ناک ہو گیا تھا بارش ہو چھاؤنی صورت برسنے لگی۔ مشرق سے مغرب تک برق ابرائی چلی گئی۔ اب بادل ایک تو اتر سے گرجنے لگے تھے اس کے ارد گرد دور دور تک کوئی درخت تک نہ تھا۔ اسے اپنی نادانی پر وہ رو کر غصہ آ رہا تھا کیسا وقت تھا جب وہ ایڈووکیٹ کے شوق میں اکیلی نکل آئی تھی۔ اس کا دل لرز کر رہ گیا تھا۔ اپنی ساری قومیں جمع کیے دفاع کی فطری کوشش کے طور پر وہ بلا کسی تعین کے چلی جا رہی تھی ایک زبردست دھماکا ہوا۔ کان پھاڑ دینے والا دھماکہ تڑپیک کہیں برق مرنی تھی۔ گوہر کی جان نکل گئی۔ اس کی چیخ دھماکے میں دب کر رہ گئی۔ دو بے دم ہو کر زمین پر گر پڑی۔ اسے ہوش ہی نہ رہا۔

☆☆☆☆☆☆

ان نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔

”ارے یہ کیا“ وہ بے حد حیران تھی۔ برقی بارش گھورا اندھیرے اور سبز زمین کے بجائے وہ ایک نرم و گداڑا ہستہ اور نرم کھیل میں چھپی تھی۔ لٹھا بھر تو وہ حرکت ہی نہ کر سکی۔ بڑی ہمت سے ہاتھ اوپر کرتے ہوئے اس نے لیل بنایا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس کی نظروں کے سامنے سفید براق چھت تھی اس نے جسم اپنے دائیں جانب دیکھا۔ پھر بائیں جانب۔ پھر اوپر نیچے پھر اس کی نظر دائیں جانب کرسی پر بیٹھی اس نوجوان لڑکی پر جم گئی۔

اس کی آنکھوں میں بے تحاشا حیران بھری تھی۔

”ارے آپ جاگ گئی ہیں۔“ وہ اٹھ کر اس کے قریب آئی تو گوہر ایک ہم اٹھ بیٹھی۔ ”کون ہیں آپ؟ میں کہاں ہوں؟“

گوہر اٹھی۔ اس نے قدم فرش پر بچھے گداز کا لین پر رکا دیے۔ لڑکی نے اس کے شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ ”گوہر اپنے نہیں آپ ایک گھر میں ہیں۔ اسے اپنا گھر ہی سمجھیے۔“

”بس۔ تمہا یہاں کیسے آئی؟“ ”شکر کیجیے۔ آپ بھیا کی جیب کے پہیوں تلے آنے سے بچ گئیں۔ آپ وہاں بھیالائے ہیں۔ آپ برقی بارش میں ہمارے گھر کو آنے والے تھاتے پر بے ہوش پڑی تھیں۔“ ”جی.....! گوہر کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ”ہم سب کا مشترکہ فیصلہ درست ہی ہے۔“ ”کیسا فیصلہ؟“ گوہر اور بھی گھبرا گئی۔

”بجلی کہ آپ کوئی آسانی حوزہ ہیں باکوہ قاف کی پری۔ کتنی حسین ہیں آپ۔ میں مسلسل دو گھنٹوں سے آپ نے سر ہانے بیٹھی تھی سوچے جا رہی ہوں۔“

”دو گھنٹے۔ میں دو گھنٹوں سے یہاں ہوں گھر کیسے کون مجھے یہاں لایا میں تو۔ باہر۔“ ”آپ کو یہاں آئے تو تم گھنٹوں سے بھی زیادہ ہو چکے ہیں۔ آپ بڑی بری حالت میں تھیں کچھ شرات بت۔ ایک ہم سنیں لیکن اتنی نے آپ کے کپڑے بدلے۔ آپ کا جسم صاف کیا۔ میں نے آپ کے ہال سنوارے اور پھر یہاں لٹا دیا۔ بھیا خود کھڑے اور نہ بڑی پریشانی ہوئی۔ اتنے خراب موسم میں ڈاکٹر مل جانا بھی محال ہوتا۔ اچھا آپ لیٹ جائیے تمہا آپ کے لیے دودھ نے آؤں۔ لیکن۔ کیا آپ ہلکا ناشتا لینا پسند کریں؟“

”نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ میں گھر جاؤں گی۔“ گوہر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے دراز ہال اس کی کمر پر مل کھا کر رہ نئے۔ اس نے اپنے آپ کو دیکھا۔ اس کے جسم پر اس کا اپنا لباس نہیں تھا۔ کسی اور لباس میں بیٹھ گئی وہ ہال کھلے نشا اور کافی حد تک گھلنے لگی۔

”ارے آپ اٹھ کیوں گئیں آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ لیٹی رہیے بھیا نے کہا تھا آپ کے کہ ہوش میں آنے پر نہیں ہلا لوں۔“

وہ جلدی سے دروازہ پار کر گئی۔ گوہر کو سب کچھ یاد آنے لگا۔ وہ خوف ناک سناں جب کہیں بجلی گرنے پر وہ اس کو ٹھٹھی تھی۔ اس سے آگے سے کچھ خبر نہ تھی۔ باہر قدموں کی آہٹ ہوئی اس نے بیڈ پر کھادو پڑے بے اختیار اپنے سر پر لیا۔ اس لڑکی کے ساتھ سیاہ پینٹ اور سرسبز جرسی میں بیٹھ ایک نوجوان بھی اندر داخل ہوا۔ گوہر کا دل حرکت گیا۔ اس نے دوپٹے میں اپنا وجود چھپانے کی سعی کی۔ وہ شخص ہاتھ سینے پر پائے سے اس سے کئی قدم دور کھڑا تھا۔

”اس جسارت پر معذرت خواہ ہوں بلکہ لٹھی لیکن سخت مجبور تھا ایسا کرنے پر۔ آپ اس خوفناک موسم میں بے یار و مددگار اس دیرانے میں بے ہوش پڑی تھیں۔ آپ کی مدد کرنا میرا فرض تھا۔“

گوہر نے ایک نظر ابرو پر لپکے کر پھر نظریں جھکا لیں۔ وہ سخت خوف زدہ تھی اس ماحول کو طاسی سمجھ رہی تھی۔ شاید بات کے ہاتھ لگ گئی تھی اور سامنے دیو پر یاں انسانی شکل میں کھڑے نظر آ رہے تھے۔ اس نے پھر سامنے دیکھا۔ لڑکی تو کسی پری جیسی بن حسین تھی آنے والا نوجوان بھی کوئی خودیہ دیو پوزاؤ تھا۔ اس کی زبان گنگ ہو کر رہ

مہنگی۔

”مہم..... مجھے۔ داپس جانا ہے۔“

”بہ صد شوق۔ لیکن کچھ دیر بعد۔ تاکہ آپ کی طبیعت کچھ اور بھی سنبھل جائے میں آپ کو چیک کرنے آیا ہوں۔“ وہ آگے بڑھا۔ گوبر سہمی ہوئی تو تھی اور بھی زردی پڑ گئی۔

”ڈونٹ وری اجنبی لیڈی! میں ڈاکٹر ہوں اور انسانوں کی مدد میرا دہرا فرض ہے۔“ اس نے دیوار کے ساتھ گلی میز پر پڑا اچھا میڈیسن باکس کھولا اور بلڈ پریشر کا آلہ باہر نکالا۔ لڑکی نے آگے بڑھ کے اس کا بازو تھام کے سیدھا کیا۔

”میں ٹھیک ہوں مجھے کسی چیک اپ کی ضرورت نہیں میں جانا چاہتی ہوں۔“

”دیویرج۔ دیویرج۔ ہم زبردستی آپ کو یہاں روکیں گے بھی نہیں لیکن آپ ابھی چپ چاپ بیٹھیے۔“ لڑکی مسکرائی۔

”آپ گھبرائیے نہیں۔ آپ انسانوں کے دم سے آباؤ ایک گھر میں ہیں۔ یہ شریر لڑکی میری اکلوتی بہن ہے مگر اس کا بڑا ہونہار بھائی ہوں۔ ابھی کچھ دن پہلے لندن سے آیا ہوں۔ ڈاکٹری کی اعلا تعلیم مکمل کر کے اور میزانا ہارون امجد واسطی ہے جبکہ سامنے کھڑی یہ چڑیل مسماۃ نیلما واسطی ہے گھر کے سارے افراد کل سے ایک شادکام میں گھمے ہیں۔ میں ماموں واسطی کو پک کرنے نہ جاتا تو آپ کا جانے کیا ہوتا۔“

”میں آپ کی شکر گزار ہوں ڈاکٹر ہارون واسطی۔ لیکن اب ایک پل یہاں نہیں رک سکتی اور خود کو بادل نکل بہت محسوس ہو رہی ہوں۔“

”وہ تو آپ کا بی۔ بی بھی بتا رہا تھا۔ لیکن آپ کم از کم دوپہر کا کھانا تو ہمارے ساتھ کھا لیں۔ ارے ہاں۔ آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ کہاں سے آئیں اور وہاں کیا کر رہی تھیں؟“

یہ سوال اس کے لیے خاصا مشکل تھا کہ وہ کون تھی؟ یا کہاں سے آئی تھی؟ اسے تو اب یہ فکر تھی کہ ماموں دلواند اس کے یوں غائب ہو جانے پر کتنی پریشانی اٹھائی پڑی ہوگی۔ وہ اسے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ کیا سوچا ہوا انہوں نے۔ اب تو شاید غفور بابا کے سارے گھر والوں کو بھی علم ہو چکا ہوگا۔

”کیا اب بھی بارش ہو رہی ہے؟“ اس نے بے اختیار شمالی سمت کے درہے کی جانب دیکھا۔

”نہیں۔ بارش تو صرف ایک بیانیہ تھی۔ آپ کی اور ہماری ملاقات کا۔ بری اور قسم ہو گئی۔ اب تو آسمان بالکل صاف ہے۔ بادل کا ایک کٹرا بھی کہیں نہیں ہے۔“

”مہم..... میں..... اب میں گھر چلی جاؤں گی۔ مجھے جانے دیجیے۔“

”کمال کرتی ہیں آپ۔ سنا آپ کو یہ خبر ہے کہ آپ اپنے گھر سے کتنے فاصلے پر ہیں۔ نہ ہمیں یہ علم ہے کہ آ۔ کا گھر کہاں ہے۔ ایسی صورت میں جانے کی بات ایک دم لفظ ہے۔ ویسے آپ ہماری مہمان ہیں۔ بنا کہ کھائے تو کسی صورت نہیں جاسکتیں۔“ ڈاکٹر ہارون واسطی نے ہنستے ہوئے اس پر باصرح کیا۔ وہ جو سخت گھبرا ہوئی تھی اسے ان کی یہ ہنسی بڑی پر اسرار سی لگی۔ ہارون واسطی نے بے غور سے دیکھا۔

”آپ بے حد متشکر اور پریشان نظر آ رہی ہیں۔ یقیناً کمزری یہ عزت دار لوگوں کا مسکن ہے۔ جو عزت منہبوم سے بھی آئینا ہیں اور میرے لیے تو اتنی بات کافی ہے کہ آپ ایک تنہا نوجوان خاتون ہیں اور بس۔ آپ کو یہاں رکنا گوارا نہیں تو میں ابھی اور اسی وقت آپ کو چھوڑنے پر تیار ہوں۔ بولیں کہاں جانا ہے آ۔“

”میں آپ کو چھوڑ آؤں۔“

”کہہ راتی نادان نہ تھی۔ جانتی تھی کہ اس کے تانا اس علاقے کی ایک ممتاز ترین شخصیت تھے بہت ہی مشہور۔“ سرورف شاہنواز عسکری اور دلواند عسکری سے بھی سب آگاہ ہوں گے۔ یہ بات تھی عجیب ہوگی کہ سر عبد اللہ کی نواہی راہ گزر پر بے ہوش پڑی کسی کو مل گئی۔ وہ اجنبی لوگ اسے اٹھا کر اپنے گھر لے گئے اور پھر گھر چھوڑ آئے۔ اس نے اپنے بارے میں کچھ بھی بتانا مناسب نہ سمجھا۔ ڈاکٹر ہارون واسطی اسے دیکھ رہے تھے اس کی طرف سے اب کے منتظر تھے۔

”میں عبد اللہ پور جاؤں گی۔“

”عبد اللہ پور..... وہ تو یہاں سے دو تین سال کے فاصلے پر ہے وہاں آپ کس کے ہاں جائیں گی۔“

”غفور بابا کے ہاں۔“

”غفور..... کون ہیں یہ..... نیلما۔ تم جانتی ہو انہیں؟ وہ آپ کے کیا لگتے ہیں؟“ انہوں نے بیک وقت دونوں سے بات کی۔

”میں ان کے ہاں مہمان ہوں۔ میرے ساتھ اور لوگ بھی ہیں اور میرا خیال ہے اس سے زیادہ کچھ بتانا ایسا ضروری بھی نہیں۔“ گوہر کا لہجہ تعویذ اخذ ہو گیا۔

”ایزیو لائیک۔ چلیے تیار ہو جائیے۔ میں جیب نکھڑا ہوں آپ نیلما کے ساتھ پوریج میں آجائے گا۔“ وہ کمر اٹھانے لگا۔

گوہر کو لفظ واسطی نے گھری۔ ”بیج میں ڈال دیا تھا۔ یہ نام اس نے ایک دو بار شیر کے لمبوں سے سنا تھا اور جب سے خود کو انتہائی غیر محفوظ تصور کر رہی تھی۔ نیلما اس کی قریب آئی۔

”نیلما واسطی! آپ کا بے حد شکر ہے آپ نے ان لمحات میں جو خصوص اور محبت مجھے دی ہے اسے یاد رکھوں گی۔“

”جی ہاں وہ میں نے اسی وقت بھلا دیا تھا اب تک پر بس کر دیا ہوگا نور مائی نے۔ لیکن آپ ان کپڑوں میں اتنی اچھی لگ رہی ہیں۔ یقیناً کچھ بے بالکل نیا سوٹ ہے ہارون بھائی لائے ہیں اور میرا دل نہیں چاہ رہا کہ آپ اسے اتار دیں پلیر۔ آپ اٹھ کر نہ کیجیے گا۔ آپ کا انکار مجھے دکھ دے گا۔ میں آپ کے کپڑے بیگ میں ڈالوا دیتی ہوں۔“

”نیلما! آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں یہ کپڑے کیسے لے لوں

”جیسے کوئی کسی کا محبت بھرا ہاتھ لے لیتا ہے۔ لگتا ہے یہ لباس بنایا بھی آپ کے لیے گیا تھا۔ آپ نے انکار کیا تو بادل دکھ جائے گا۔ دیکھیے نا آپ اسی جہانے مجھے اس گھر کو بلکہ ہم سب کو یاد رکھیں گی۔ ارے ہاں آپ اپنا اور بس تو بتائیں۔ میں ہارون بھائی کے ساتھ آپ سے ملنے آؤں گی۔ آپ مجھے بہت یاد آئیں گی۔“ گوہر اس کی محسوسیت فہمی گفتگو پر اسے غور سے دیکھنے لگی۔

”نیلما واسطی! میں نے تو آپ سے گھڑی دو گھنٹی گفتگو بھی نہیں کی۔“

”تو کیا ہوا۔ بعض لوگ بس ایک نظر میں دل میں گھر کر لیتے ہیں چاہے بات کریں یا نہ کریں۔ ان کی صورت ناپائی رہتی ہے محبت کے لیے۔“ وہ ہنس رہی۔ ایک چالیس سالہ خاتون گوہر کی چادر لے آئی۔

”نور مائی اپنی بی بی کے کپڑے بیگ کر کے بیگ میں ڈال دو۔“



”جی اچھا بی بی۔“ وہ واپس چلی گئی۔

”ایک بات کہوں آپ سے براست مانے گا۔“

”ضرور کہیں۔ برا ماننے کی کیا بات ہے۔“

”آپ صرف مجھے ہی نہیں ڈاکٹر ہارون واسطی کو بھی اچھی لگی ہیں۔ ماسون واسطی کو بھی پسند آئی ہیں۔ لیکن سب کی سوچ کا انداز اور رشتوں کا تعین مختلف ہے اور تم کی بات یہ ہے کہ اس ہستی کے نام سے بھی ہم آشنائیں۔“

”گوہر مسکرا کر رہ گئی۔ اپنا نام پھر بھی نہ بتا سکی۔ وہ بتانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اپنی حقیقت سے بے خبر رکھنا چاہتی تھی۔ اسے تو خوف آرہا تھا۔ وہ دنواڑ عسکری کو کیا بتانے کی کہ دن کے چار پانچ گھنٹے اس نے کہاں گزار دیے ہیں۔ اسے تو یہ سوچ کر بھی خوف آرہا تھا کہ یہ واسطی خاندان یقیناً وہی ہے جس کا ذکر شہیر نے کیا تھا۔ اگر شہیر خبر ہوگئی کہ میں..... اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔ اسے جلد از جلد یہاں سے جانے کی فکر تھی۔ ہر قیمت پر..... ہر حال میں۔ اسے ہارون واسطی کی شرافت نیلما کا خلوص سب کے سب معنوی لگ رہے تھے۔ اسے صاف لگ رہا تھا کہ وہ دشمنوں کے چنگل میں پھنس کر رہ گئی ہے۔“

”آپ نے نام نہیں بتایا کیا آپ اپنا نام بتانا ہی نہیں چاہتیں یا.....“ گوہر نے نیلما کی طرف دیکھا اس کو آنکھوں میں شوق اور مایوسی ایک ساتھ تھی۔

”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے۔“ وہ اپنا نام بتاتے بتاتے جھجک گئی۔ جی چاہا کوئی اور نام بتا دے لیکن.....

”مجھے گوہر کہتے ہیں۔“ وہ ان مشکل حالات میں بھی جھوٹ نہ بول سکی۔ اپنا نام اس کے لبوں سے پھسل کر گیا۔

”گوہر۔ واہ واہ کیا خوب صورت نام ہے۔ بھیا بھیا کیا شے ڈھونڈ کے لائے ہیں۔ کاش آپ کوہ قاف سے آئی پر ہی ہوتیں اور یہاں آ کر بھی لذت کے نہ جاتیں۔“

”ہم پھر ملیں گے۔“

”کب؟“ اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

”بہت جلد۔“ اس نے اپنا ہاتھ نیلما کی طرف بڑھایا تو اس نے ہاتھ نظر انداز کر کے گوہر کو گلے لگا لیا۔

☆☆☆☆☆☆

”میں نے زمرگی میں بہت کم لوگوں سے روبرو رکھا ہے۔ بہت کم لوگوں سے متاثر ہوا ہوں اور لڑکیوں کی قوم میں آپ پہلی لڑکی ہیں۔ جسے دیکھ کر میں کچھ ہونے پر مجبور ہوا ہوں۔“

گوہر جھکی نشست پر چادر میں اپنی لپٹائی خاموش بیٹھی تھی۔

”آپ کے چہرے پر جو وقار ہے جو شائستگی ہے وہ عام ہے ہوشی میں بھی اسی طرح موجود تھی۔ جیب کی بنا لائسنس کی روشنی میں میری نظر آپ پر پڑی میں نے جیب رک دی۔ ماسون بھی میرے ساتھ نیچے اترے۔ آپ گرجش سے بے خبر راستے پر پڑی تھیں۔ ماسون آپ کو اٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔ لیکن میں نے اسے روک دیا۔ ماسون میرا ہنسی ہے۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ لیکن جو بھی ہو وہ ماسون ہی تھا ہارون نہیں اور ہارون تو صرف اپنی نسبت اپنے اراوے اپنی سوچ کی خیر ہوسکتی ہے ماسون کی نہیں۔ میں نے آپ کے جوہر کو ایک مقدس امانت جان کر

جیب میں لا ڈالا۔ اس سس لو میں اور میرا دل ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ میں نے جیب میں ہی آپ کو فرسٹ ایڈ دی۔ اور آتے ہی نیلما کے اچھی بہن کے حوالے کر دیا۔ اچھے انسان ہے بس اور کمزور لوگوں کی بھرپور اعانت کرتے ہیں۔ آپ عورت تھیں۔ بے ہوش و حواس اور ہم لوگوں کے رحم و کرم پر۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں آپ کو اپنی منزل تک پہنچا کر مرخرو ہو رہا ہوں۔ خدا کے حضور اپنی ذات کے آگے اور آپ کی نگاہ میں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ غفور یا اس کے خاندان سے آپ کا کیا کیا تعلق ہے۔“

”جی۔۔۔۔۔۔“ وہ پھر گرا بوائے لگی۔  
”فحیک ہے اگر آپ نہ بتانا چاہیں تو زبردستی بھی نہیں۔ ویسے ایک بات کہوں۔“

”یہ سوت میں نے ریاض میں ایک مختصر قیام کے دوران خریدنا تھا اور میرے ذہن میں نیلما ہی تھی۔ بڑے ذہن سورت لکھے تھے وہ جب میں نے اسے خریدا۔ بعض لوگ اچھا لباس پہن کر خوب صورت لگتے تھے ہیں اور بعض نہیں اچھے لوگوں کے ساتھ مل کر دید و زیب ہو جاتے ہیں۔ یہ سوت بے حد خوش نسیب ہے۔ جسے آپ نے قبول کر لیا۔ آپ اس لباس میں بہت اچھی لگ رہی ہیں۔“ گوہر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

”آپ ایک حسین باریک کر ہارون واسطی کے دل میں رہیں گی۔ اور بار بار موسم تو بس آپ ہی کے نام ہوگا کہ آپ..... خیر..... وہ دیکھیںے سائے غفور کا گھر نظر آ رہا ہے۔ میں آپ کو دروازے پر گھنٹا دوں یا۔“

”دروازے پر اتنی چھوڑ دیں۔“

”میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔“ وہ ایک ہمہ نشین ویے۔

”جی کیا نہ سوچا تھا آپ نے۔“

”عبداللہ پوری حد تک پار کرنا آپ سر عبداللہ کو جانتی ہیں؟“

”جی..... جی نہیں۔“

”وہ اس علاقے کے زمیندار تھے۔ اصل میں یہاں کے لوگوں کو وراثت میں زمینوں اور جائیدادوں کے ساتھ ساتھ دشمنیاں بھی ملتی ہیں۔ میرے دادا حضور کبیر واسطی اور سر عبداللہ کی آپس میں بے خاش تھی جو ورثے میں شہناز عسکری اور میرے والد میں واسطی کوئی۔ ابا حضور چاہتے ہیں۔ دشمنی کا یہ روگ ہم بھی پائیں۔ اپنی موت و حیات کے مظاہرے سے اپنے دشمنوں کو متاثر کریں۔ لیکن مجھے تو اس دشمنیوں پر ہنسی آتی ہے۔ یہ علاقہ ہمارے لیے ممنوع ہے۔ لیکن آپ کی خاطر پیٹا۔ رہیں اپنے والد کی نافرمانی کر رہا ہوں۔“

گوہر کا دل دھڑک گیا شہیر کی بات صدنی صدہ درست تھی۔

”میں اسی سبب اپنا؟ شیان عباس مگر میں بنا رہا ہوں۔ پرنس بھی وہاں کروں گا اور گھر بھی وہیں بناؤں گا۔ ماسون واسطی ایسے کاموں کے لیے فٹ ہے۔ وہ ابا حضور کے نقش قدم پر چلے گا۔ ہارو دھار کے مناظر میں حصہ لے گا۔ وہ تو پڑھائی سے بھی جی چراتا ہے۔ میں نے اسے زبردستی داخل بنا دیا ہے۔ پنجاب نے نیورٹی میں پڑھ رہا ہے۔“

گوہر کا دل پھر دھڑکا۔ جیب رک گئی۔ ہارون واسطی نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے آپ کا شکر ہے۔“ انہوں نے ہاتھ جیب میں ڈالا۔

"یہ میرا وزینٹنگ کارڈ ہے کسی وقت ضرورت ہو تو۔ میں آپ کا منتظر رہوں گا۔ میرا مطلب ہے ہرج فون نمبروں پر آپ کی آواز کا۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔ اس نے کارڈ لیا۔ ہارون نے نیچے اتر کر کھڑکی کھولی۔

"آپ کا بے حد شکر یہ ہارون صاحب! ایک اچھے انسان کے انسان دوست رویوں کو میں بھی ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ خدا حافظ۔"

اس کے اترتے ہی وہ چپ نکال لے گئے۔

گوہرنے ادھر ادھر دیکھا اور ایک کھیت میں چھوٹے بچے کھیل رہے تھے۔ حد نظر تک کوئی نہ تھا۔ وہ غنور بابا کے گھر میں داخل ہوئی تو کھن میں ساگ چھٹی راتوں سے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"بی بی آپ!"

"ہاں راتو....."

"آپ اکیلی کیسے آئیں۔ میں تو جی بارش کی وجہ سے نہ آ سکی۔ ناشتہ سرور لے گیا تھا۔"

"راتو۔ میں صبح سے گھر سے نکلے ہوں۔"

"تو بارش میں آپ کہاں تھیں اور اکیلی گھر سے کیوں نکلیں؟"

"سخت غلطی کی میں نے مگر..... راتو اب تم میرے ساتھ چلو۔ ماموں میرے لیے پریشان ہوں گے۔ تم بس اتنا کہو جتنا تم صبح سے میرے ساتھ تھیں اور بارش کے لمحات میں نے تم لوگوں کے گھر میں گزارے۔"

"مگر بی بی!"

"راتو میں تمہیں سب کچھ بتا رہی ہوں۔ لیکن یہ سب کچھ میں ماموں جان کو نہیں بتا سکتی گی۔ پلیز راتو۔" اس نے گویا التجا کی۔

دونوں ایک ساتھ نکل دیں۔ گوہرنے سب کچھ سن کر ہنسنے لگا۔

"اوہ میرے خدا آپ اشن واسطی کی حویلی میں گئی تھیں۔ یہ آپ نے کیا کیا۔" اس نے کالوں کو ہاتھ لگائے۔

"بی بی! اولوگ تو آپ کے خاندان کے جانی دشمن ہیں۔ میں تو حیران ہوں کہ آپ وہاں جا کر لوٹ بھی آئیں۔ وہ تو وہ تو۔ وہ آپ کو سر عید اللہ کی دوستی کو۔ کیسے یہاں تک چھوڑ گئے۔ آپ خیر خیریت سے تو ہیں نا بی بی۔ آپ محفوظ تو ہیں نا بی بی؟ بی بی۔ آپ عہد کریں حویلی سے اکیلی کس یا ہر نہ نکلیں گی۔ کوئی نیکی آپ کے کام آگئی۔ جو آپ وہاں سے صبح سلامت لوٹ آئیں۔ خدا نے اپنا کرم کیا۔ بی بی! یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے شبیر میاں کے خلاف پرچہ کٹوا دیا تھا وہ ہرے انخوا کا۔ تھا نیدار کو پورے پچاس ہزار روپے رشوت دی گئی۔"

گوہرنے راتو کی طرف دیکھا۔ "بی بی! ان واسطیوں نے اس گھرانے کی کسی عورت کی جھٹک تک نہیں دیکھی۔ آپ نے ان سے کیا کیا۔ آپ۔ آپ۔"

"تم ٹھکر نہ کرو انہیں اس کی کوئی خبر نہیں کہ میں کین ہوں۔"

"آپ بھولی ہیں بی بی۔ انہیں اگر اس کی خبر نہیں تو بہت جلد ہو جائے گی۔ دیکھتوں میں ایسی باتیں بہت دیر چھپی نہیں رہتیں۔"

"راتو! ڈاکٹر ہارون بہت اچھے انسان ہیں۔ ان کی موجودگی میں صرف احساس تحفظ ملتا ہے۔ بے سکوتی اور پریشانی نہیں۔ وہ اپنے خاندان سے بے حد مختلف ہیں۔"

"خدا کرے آپ کا یہ اعزازہ درست ہوئی بی بی۔ خدا کرے یہ بات سب سے چھپی رہے اور چھوٹے صاحب کو بی بی تم سے ہو کہ آپ۔"

"راتو!" گوہر کا لہجہ تیز ہو گیا۔ "میں مانتی ہوں یہ میری غلطی تھی لیکن وہاں جا کر میں ایسے حالات کا شکار نہیں ہونی چاہتی تھی یا میرے خاندان کو یا تمہارے چھوٹے صاحب کو شرمندگی اور ندامت کا سامنا کرنا پڑے۔"

"آئین۔" راتو نے آہستگی سے کہا۔

بانواز برآمدے میں بڑی میز پر پاؤں پیارے کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھے۔ راتو کپڑوں والا بیگ آبرو کے کمرے میں رکھ آئی۔ بانواز کو دیکھ کر گوہر کا دل بھرا آیا۔ بارانی موسم کے وہ خوف ناک لمحے ذہن میں تازہ آئے۔ وہ بھاگ کے ان کی طرف بڑھی۔ راتو بھی آگئی تھی۔

"ماموں جان! اس نے بے تابا نا نہیں پکارا۔"

"ارے بیٹا تم۔ کہاں چلی گئی تھیں۔ بھئی راتو ہماری بی بی کو ہمیں بتائے بغیر مت لے جایا کرو۔ وہ سرور بھی ناشتا کے بالابالا چلا گیا۔ ہم یہاں بیٹھے پریشان ہو رہے تھے کہ اتنی تیز بارش میں گوہر کو کیا سوچھی۔ جانا ہی تھا تو ہم بی بی ساتھ چلے چلتے۔ بیٹے ایسے موسم میں گھر سے یوں باہر نہیں جایا کرتے۔"

"آئینہ بھی ایسا نہیں ہوگا ماموں جان۔" گوہرنے ان کی ہانہ تھام لی۔

دن تازہ مسکرانے لگے۔ گوہر کو بے حد ندامت ہوئی۔ وہ دلخماز کو کتنا بڑا دھوکا دے رہی تھی۔ اس کا ضمیر اسے کچھ کے انکار ہاتھ۔

"بیٹھو دیکھو تمہاری عدم موجودگی میں میں نے اتنی موٹی کتاب پڑھ ڈالی۔ تمہیں شکوہ تھا ہم کتابوں سے دور بناتے ہیں ہم نے تمہارا شکوہ دور کر دیا۔"

گوہر جواب میں کچھ نہ کہہ سکی۔

"گوہر! تم کچھ پریشان ہی ہو۔"

"جی..... جی نہیں۔ بی بی! ماموں جان!"

"یہ جی نہیں اور جی ہاں کچھ کیا مطلب ہے۔ کیا الجھن ہے۔ بجھی میرے بعد تو آ رہی ہشاش بشاش ہوتا ہے۔ تم نے شاید بہت زیادہ دوا ک کر لی ہے۔ جی تھک گئی ہو۔"

"میں جاؤں گی۔" راتو نے پوچھا۔

"ہاں راتو۔" راتو نے قدموں چلی گئی۔

بانواز نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔

"بیٹے! کیا بات ہے۔ تم کچھ کہنا چاہ رہی ہو؟"

"جی۔ کچھ نہیں۔ آپ کتاب کی بات کر رہے تھے۔ کیسی گئی آپ کو میری پسند۔"

"تمہاری طرح بے مثال۔ فلورا کے کردار میں مجھے تم نظر آتی رہیں۔ ہانہمت ہاشور اور بہادر لڑکی۔ انہی کتابیں تمہارا حوصلہ بلند رکھنے میں مددگار رہیں گی۔ اسے بھی یعنی فلورا کو مسائل نہیں محسوسات ڈراتے تھے۔ میری تو بس یہی دعا ہے کہ اپنی امیدوں کے سلسلے میں مایوس ہو کر تم کبھی بے حوصلہ نہ ہو۔ خدا تمہیں ہمیشہ کامیاب کامران رکھے۔ تمہارے احساس کو کبھی کوئی نہیں نہ گئے۔ سچے اور کھرے لوگ بہت جلدی یعنی مقابل کے ایک معمولی سے جھوٹ پر ہی ٹوٹ بھوٹ جاتے ہیں۔"

"لوہرا بڑی خاموش ہو بنی! عبداللہ پور میں تمہارا دل اتنا زبردہ بھی نہیں لگا تھا کہ۔"

"نہیں ماسوں! میں خاموش تو نہیں ہوں۔ بس رازہ کے نظارے میں گم تھی۔"

"میں آج ہی عاصم بھائی سے بات کر دوں گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ وہ دن تمہارے ساتھ گزار کر اتنے دن کی ستانے لگی ہے۔ کاش میری بھی تم جیسی ایک بیٹی ہوتی۔ اٹل لکچہ بل سی۔ خود شناسی ہم ماسوں بھانجی میں خوب سمیٹتی رہے گی۔ شامیں اچھی بسر ہوا کریں گی۔ یہ وعدہ رازہ کا اسٹڈی میں ہم تمہاری عنکبوت زد کریں گے۔"

"میں وقت دیں گے۔"

"لوہر مسکرائے لگی۔"

"میں آپ کو بہت عزیز ہوں ماسوں۔"

"ہاں شہیر کے ساتھ مل کر بہت عزیز ہو جاتی ہو۔ بعض چیزیں بعض چیزوں کی ہمراہی میں بہت زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ ایسے ہی تم۔"

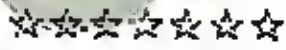
"تھیک یو۔" اس نے بلناؤ کی طرف دیکھا۔

"لوہرا کیا تمہارے اس سرہرے کا آنکھوں دیکھا حال میں اسے بتا دوں۔"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں ماسوں۔"

"وہ نہیں دے۔" گھر نہ کر رہا درہن میں تمہارا اچھا رازہ داں اور دوست رہوں گا۔ تمہیں صحیح مشورہ دے گا۔ شہیر توڑا سا مشکل انسان ہے اسے سمجھنے میں بھی تمہاری ضرورت مدد کروں گا۔ میں تم دونوں کے وجود میں عسکری ناندان کی انقلابی صورت دیکھ رہا ہوں۔"

"گوبراں موضوع کے لیے تیار نہ تھی۔ اس نے بات کا سوسو بخ بدل دیا۔"



"چیر مارے دن گزار گئے۔ بابا اپنے وعدے کے مطابق اسے لاہور چھوڑ آئے۔ گھر چھوڑتے وقت وہ خاصی اداس بھی تھی۔ لیکن ڈیڑھ ساری بھئیوں کے تصور سے پر جوش بھی تھی۔ ریلوے اسٹیشن پر بلناؤ ماسوں اور کاظم بچا دونوں ہی موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر دونوں ان کی طرف لپکے۔ گوبر کے سر پر دونوں نے ہاتھ رکھا۔ پھر عاصم مسکین سے ملے۔ دونوں اسے اپنے اپنے گھر لے جانے پر مصر تھے۔ عاصم نے فیصلہ بلناؤ کے حق میں دیا۔ کیونکہ وہ کاظم سے بڑے تھے۔ کاظم نے بڑے بھائی کے فیصلے کو خوشی سے قبول کر لیا۔ لیکن شرط بھی تھی۔ جتنے دن عاصم لاہور ہیں گوبر بھی ان کے ساتھ کاظم کے ہاں۔ کے۔ بلناؤ نے اسے بخوشی قبول کیا، ہر خود بھی ان کے ساتھ آئے۔"

"گوبر کی گھر میں آدھ بچوں کی عمیر ہو گئی۔ چچا نے بڑی محبت سے گوبر کو تین دنوں میں پورے شہر کی سیر کرا دی۔ بچے ہر دم ان کے ساتھ ہوتے۔ گوبر باپ کی ہمراہی میں خوش رہتے اور ہر تفریح کی جگہ پر اس کے کانٹا کارول ادا کرتے۔ بچوں کو تاریکی شائقوں کی تاریخ از بر یاد تھی۔ نئی جگہوں کا علم تھا۔ وہ دو عمارتوں کی تعمیری تکنیک سے بھی بھرپور طریقے سے آگاہ تھے۔"

"چوتھے روز عاصم واپس جاتے ہوئے اسے خود ہی بلناؤ کے ہاں چھوڑنے آئے۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ لفظ میں خاصی خٹکی تھی۔ بلناؤ ٹیلی لان میں تھی۔ شہیر بھی وہیں موجود تھا۔ بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہا تھا۔ لان میں خاصا شور مچا رہا تھا۔ ان لوگوں کو آتا دیکھ کر سب کے ہاتھ اپنی جگہ رک گئے۔"

"اگر میرے خدا۔ ماسوں کو کتنا یقین ہے۔ میرے بچے اور کمرے ہونے کا اور میں ہوں کہ اتنا بڑا جھوٹ پوئل بچکی ہوں ان سے۔ جھوٹ موٹ کا اعتماد چہرے پر سجائے ان کے سامنے بیٹھی ہوں۔ میں انہیں کیسے بتا دوں کہ میں دن کے چار پانچ گھنٹے ایک اجنبی بلکہ پراجمبی لوگوں کے ساتھ گزار آئی ہوں اور لوگ بھی کیسے ہمارے خاندان دشمن۔" وہ اندر ہی اندر کانپ لگی۔ ڈاکٹر بارون واسطی کا خوب صورت چہرہ اس کی نظروں میں محوم گیا۔ اس نے اپنے لباس پر نظر ڈالی۔ یہ لباس۔ جو اسے بے ہوشی کے عالم میں پہنا دیا گیا۔ چاہے تھا کہ ہوش میں آتے ہی اتار دیتی۔ یہ لباس پہن کر وہ گھر آگئی۔ اس نے تینما واسطی کی ڈاکٹر بارون کی باتیں خاموشی سے سنیں اور پھر ڈاکٹر بارون کے تعریفی الفاظ میں گم ہو گئی۔ یہ سب کیا تھا۔"

"یقیناً ایک خیانت۔ ایک بھی تک جرم اور جو وہ ڈاکٹر بارون کی پتا ہوں میں رہی۔ ان کے بازو اسے زندگی دینے کے لیے ہی بڑھنے پڑھے تو سہی۔ ان باتوں نے اسے اتنا تواسہی۔ وہ ایک غیر مرد تھے۔ ایک اجنبی انسان تھے۔ غیر مرد کی نیت ہی نہیں۔ اس کا لمس بھی گناہ میں شمار ہوتا ہے اور اس سب کی مجرم وہ آپ ہی تھی۔ جو اندھا ہند گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ اگر وہ ایک نیک طبیعت انسان نہ ہوتے۔ ایک شریف انفس آدمی نہ ہوتے۔ اگر وہ یہ جان جاتے کہ میں سر عبداللہ کی نواسی ہوں۔ اگر انہیں یہ خبر ہو جاتی کہ میں شہیر کی مگھتر ہوں۔ تو اگر وہ مجھے قید کر لیتے۔ ایک دو راتوں کے لیے۔ تو میں ان کا کیا بکا کر لیتی۔"

"وہ بلناؤ کی موجودگی کو نظر انداز کر کے کمرے میں آگئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ لٹاری میں رکھے بیگ میں سے اپنا ایک اور سوٹ نکالا اور جلدی سے تبدیل کر لیا۔ وہ کچھ دیر اور ان کپڑوں میں رہتی تو شاید وہ سانپ جھوکتا بن کر اس سے لپٹ جاتے۔ وہ بستر پر گر کر بے اختیار رہنے لگی اور اپنے آج کے کیے کا احساس اسے بہت زیادہ ستانے لگا۔ اسے لگتا جیسے ابھی اس نے کوئی رگھن و سنگین خواب دیکھا تھا۔ اس نے جلدی سے بانچہ روم میں گھس کر وضو کیا اور خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئی اسے شہیر شدت کے ساتھ یاد آیا۔ احساس جرم اور بڑھا اور وہ اور زیادہ رونے لگی۔"

"بلناؤ نے دروازہ پر دستک دی۔"

"گوبر۔ گوبر۔ کھانا کھانا ہور رہا ہے بھی۔ کیا کر رہی ہو۔"

"آئی ماسوں جان!"

"میر پر بیٹھے بلناؤ نے اسے بغور دیکھا۔"

"بات سنو تم روئی ہو کیا؟"

"جی نہیں۔"

"پھر یہ آنکھیں کیوں سرخ ہیں۔"

"صاحب چڑا گیا تھا۔"

"داد بھئی بچی! تمہیں تو ملدے دھونے کا ذہنگ بھی نہیں آتا۔ ایسی حرکتیں تو بچے کرتے ہیں۔"

"وہ بڑبڑکی مسکرائی اور بھوک نہ ہونے کے ذہ جو دکھانا زہر مار کرنے لگی۔"



جاتے ہوئے کچھ اور مسائل اس کے ساتھ تھے آتے ہوئے کچھ اور پریشانیوں کی ہمراہ تھیں۔ دوسرے کی ذات نظر میں جھلوک ہو تو غم اور طرح کا ہوتا ہے۔ اپنی ذات اپنی نظر میں مستہ نہ رہے تو دکھ اور طرح کا۔"



"آئیے عاصم بھائی! بھئی خوب انتظار کرنا آپ نے۔ میں آمنہ بیگم کی محنت آپ کے بتائے ٹھکانے لگانے سوچ رہا تھا۔ بھئی آمنہ بلانا انا بعد میں پہلے چائے کی میز سجاؤ۔ کھانے سے زیادہ کھانے کی خوشبو خطرناک ہے۔ اسے برواقت کرنا خاصی جرات کا کام ہے اور ہم یہ جرات پورے دو گھنٹوں سے دکھا رہے ہیں۔"

"آج تو ہاف ڈے تھا۔ اگر اس وقت تک جناب آفس میں ہوتے تو۔" آمنہ خاتون بھی بڈلہج تھیں۔

"وہ اور بات تھی۔ دیکھو بھائی کون چھوڑتا ہے۔ پیڑز آمنہ تم کچھ کروور نہ مجھے حکم دو۔"

وہ مسکراتی ہوئی گوہر کی طرف بڑھیں۔ اسے گلے لگایا۔ عاصم کو سلام کیا اور اندر چل دیں۔ شیر باجھہ جھاڑنے عاصم حسین کے قریب آیا۔

"آداب عرض ہے پتہ پچا جان!"

"جیتے رہو بیٹے کیسے بوڑھے حنائی کیسی جارہی ہے؟"

"ٹھیک ہوں بڑھائی بھی ٹھیک جارہی ہے۔"

"آپ کیسی ہیں گوہر؟" اس نے ایک نگاہ انداز گوہر پر ڈالی۔

"السلام علیکم! گوہر نے است و کھائی۔"

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہیں؟"

"آپ کے سامنے ہوں۔ یقیناً اچھی ہوں۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ دونوں ایک دوسرے سے فاصلے آسنے سامنے بیٹھ گئے۔

"بھئی تمہارا بیٹا بڑے سستی خیر نجات سے دو جا رہا تھا۔ جاؤ کیلونا۔"

"کیوں شرمندہ کرتے ہیں پچا جان؟ وہ تو بیٹے کی سچی سچی گئے تھے۔"

"ہاں پر خوردار! ان کے سامنے بچوں کے ہاتھوں تمہاری کلی اڑ جائے بات ہے بہت بے عزتی والی۔ بھئی اب اپنے شیر بھائی کے بغیر ہی کیلونا۔" لونا نے آواز لگائی۔ "لیکن پہلے اپنے پھوپھا جان اور گوہر باجی سے لو۔" بچے بھی قریب آچکے تھے۔ دونوں سے ملے اور وہ بھی وہیں رک گئے۔ آمنہ خاتون نے اندر سے ہی چا۔ تیار ہونے کی نوید دی تو لونا سب سے آگے اندر کو بڑھے۔

دوسری صبح آمنہ خاتون نے لونا کے آفس اور بچوں کے اسکول چلے جانے کے بعد فراغت محسوس کر ہوئے۔ گوہر کو اس کے کمرے میں اپنی پسند کا سامان جانے کے لیے مستحق میں پڑے بیڈ کو رکھنا اور برو۔ وغیرہ اس کے سامنے رکھ دیے تھے۔ بھئی بھی وہیں موجود تھیں۔

"اے گوہر بیٹی! اس گھر کو اپنا گھر ہی سمجھو۔ تمہاری مانی جیسی عورتیں دنیا میں بہت کم ہوتی ہیں۔ اس کے پار محبت اور خصوص کا تہہ ختم ہوتے والا خزانہ ہے۔ گھر ایسی عورتوں کے ہم سے ہی بنتے ہوتے ہیں۔"

"بھائی بھئی چچی اماں! آپ کی تعریفیں تو اچھے بھیلے انسان کا دماغ خراب کر دیتی ہیں۔" وہ مسکرائیں۔

"آپ تو مجھے ٹھیک ٹھاک نظر آ رہی ہیں مانی۔" گوہر نے انہیں چھیڑا۔

"یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بڑے بندے کو چچی اماں ٹھیک بھی کر دیتی ہیں۔"

"لو اب تم مجھے سمجھانے لگائے نہیں۔ اپنی حقیقت کا مجھے ہی پتا ہے۔ تم میاں بیوی کا دم ہے مجھے برواقت کرنا! لونا کے گھر میں ہوتی تو کب کی مر کھ گئی ہوتی۔"

"اب ہمیں سچا کا درجہ بھی نہ دیں چچی۔"

"ارے بیٹی اتنا شگوار ماحول ہو تو جینے کو دل خود بہ خود چاہتا ہے۔ تمہارے چچا کے بعد دنیا میں کہاں جگہ تھی تیری۔ تم 'لونا'۔ یہ بچے تم سب میرے دل کا چین ہو۔ اپنا بیٹا بھی ہوتا تو لونا سے زیادہ فرما نبردار اور چاہنے والا نہ ہوتا۔ خدا تمہارا سہاگ سدا سلامت رکھے۔ ہو۔"

"کچھ دینا نہیں ہمیں بھی چچی اماں۔ بھئی آپ بڑی ساستدان ہیں۔ یوں تو بڑا کتنی رہتی ہیں۔ شیر بڈ لائق بچہ ہے۔ بڑا باندہار ہے۔ اب جھوٹے منہ بھی ایک حرف نہیں نکالا منہ سے۔ دیکھ لیا چچی۔ آپ بھی منہ دیکھنے کی یاد ہیں۔ دل سے نہیں چاہتیں۔"

"ارے جو بڑے کے اتو کب آیا اور چھپ کے باتیں سن رہا تھا۔"

"چھپ کے کیوں سنا کر بڈرو سے یہاں تک آتے آتے ستارہ ہا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ چچی اماں کے ہاتھ لکھوں پر میرا ڈر خیر بھی آئے گا۔ مگر کہاں۔ آپ نے تو حرف ملاست بھی نہیں کیے۔"

"لیکن شریف آدمی! تم صبح صبح بونورشی جانے کے بجائے اس طرف کیسے آ گئے؟"

"پچا جانی کا حق تھا۔ گوہر بیگم کو بونورشی لے جانا ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو تیار ہو جائیں گوہر بیگم۔ ہندہ اپنی طبیعتی مسروریت چھوڑ کر یہاں آیا ہے۔" اس کا انداز کلمی طور پر اپنا نیت بھرا نہ تھا۔ وہ وہیں چچی اماں کے ساتھ تک گیا۔

"میں منتظر ہوں۔ آپ تیار ہو جائیے۔"

گوہر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے آمنہ خاتون کی طرف دیکھا وہ سمجھ گئی۔

"یہ کام تو بعد میں بھی ہوتے رہیں گے بلکہ میں اپنی مرضی سے تمہارا کمر اسٹوار دوں گی۔ تم جاؤ۔ تیار ہو جاؤ۔"

"مانی! وہ کچھ کہتا چاہ رہی تھی۔"

تھپی وہ اس کے ساتھ باہر آ گئیں۔

"میں شیر کے ساتھ جاؤں گی! اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔"

"اوپر کی گرل! یہ ہندہ ہندہ ہے جس کے ساتھ تم دنیا کے آخری کونے تک بھی جا سکتی ہو۔ احتیاط کے ساتھ جینا سمجھو خدا نے تم دونوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا بہترین موقع دیا ہے اور شیر اس کا مل ہے کہ تم اس کے ساتھ دنیا کے آخری کونے تک بھر پور اعتماد کے ساتھ چلی جاؤ۔ وہ تمہارا شریک حیات ہے گوہر۔"

"اوپر کے مانی! میں آ رہی ہوں۔" اس نے جھٹ کہا۔ تیار ہو کے وہ آئی تو آمنہ خاتون نے بتایا وہ باہر اس کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ باہر چلی آئی۔ اسے آتا دیکھ کر شیر نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ گوہر گریے سوز و کی کو پہنچتی رہ گئی۔ جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان شیر خاصا سچ رہا تھا۔ وہ سدا گاڑی میں بیٹھا ایسے لگتا تھا یا گوہر کو دیکھ کر اکتا رہا تھا۔ بہر حال اس وقت بڑی آفت قسم کی شے نظر آ رہا تھا۔ بالکل ایک خود مشرور شہزادہ وہ چپکے سے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر جیسے تھے۔ خالی ہاتھ۔ گوہر نے جب تک کراس کی طرف دیکھا۔

"آپ کی انٹوشی۔" اس نے اچھورا سا سوال کیا۔

"احتیاط کے بغیر کچھ دل کو نہ لگ رہی تھی۔ جیسا اتار رہی۔ مگر تم نے تو اب تک یکن رکھی ہے۔"

"اور ہندہ سے اعتماد کے ساتھ۔ آپ کو مستحضر جانتے ہوئے۔" اس نے ہمت کر کے جواب دے ہی دیا۔

"زبے نصیب۔" اس نے کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔



”آپ کو میرے ہاتھ میں موجود انگوٹھی نے کوئی خوشی نہیں دی؟“

”اپنی خوشی کو محسوس کرنے میں اس کے ہونے یا نہ ہونے کا تعین کرنے میں مجھے بھی کچھ وقت لگے گا بہر حال اب تو جیسے خاصہ وقت ہو گیا ہے۔“ اس نے گاڑی آگے بڑھا دی شہیر کی ہر بات میں یہ اس کا زندگی کا پہلا سفر تھا اور شہیر کی معنی خیز مردہ مہر کی کوئی شہیرا کرنے میں ایک ناقابل بیان لطف پہنچا تھا۔

﴿.....﴾

”میں عبداللہ پور تھی۔“

”ظاہر ہے آپ کے نانا حضور کی جاگیر ہے عبداللہ پور۔ آپ کو جانا ہی تھا وہاں۔“ شہیر نے اپنی مسکراہٹ اس سے صاف چھپائی۔

”میں اسے کسی کی جاگیر سمجھ کر پیش کشی کے لیے نہیں گئی تھی۔“

”پھر..... پھر کس لیے؟“

”اس لیے کہ وہ ایک مدت آپ کی جائے رہائش رہی۔“

”میری جائے رہائش سے آپ کو کیا ہو گیا؟“

”آپ کے ہر معاملے سے مجھے دلچسپی ہے۔ عبداللہ پور نہ جاتی تو شاید ایک طویل عرصے تک غلط فہمیوں کا زور دوروں میں بٹکتی پھرتی۔ شہیر! آپ مجھے عذرا بہت مجال سے نہیں دوائیں گے۔ وہ کہاں رہتی ہے۔“

”گو ہر در حقیقت اپنی زیادتیوں کی حلقی کرنا چاہتی تھی اور اپنی غلط فہمیوں پر یہ اسی کا اظہار ندامت ہی تو تھا۔“

”کیا ضرورت ہے تمہیں اس سے سننے کی۔ آدمی کو ایسے انسان سے ملاقات کی غلطی نہیں کرنا چاہیے جس کے لیے دل میں ابھی احساسات ہی نہ ہوں۔“ اس نے لہجے میں بے گمانی بھری۔

”مجھے ہر وہ شے عزیز ہے شہیر جس کا حلق آپ کی ذات سے کسی نہ کسی حد تک ہے۔ کیا عذرا آپ کی بہن ہو ہے؟“ شہیر نے اسٹیئرنگ پر دونوں ہاتھ جماتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

”اجناب.....!“ اس چہرے نے سے لفظ میں بہت سے معنی چھپے تھے۔ وہ بہت سے عجیب و غریب احساسات سے چارہ بھگتی۔ خاصا بٹھنڈی رو گئی۔

”اور شاید سب سے زیادہ تمہیں ارم عزیز ہے۔ آٹھ میرے ساتھ اس کا بہت زیادہ گہرا تعلق ہے۔ وہ میری تھی بہن ہے شاید یہ احسان بھی مجھ پر ہے۔“

”وہ اب بھی کچھ نہ کہہ سکی۔ لب لب کر رہ گئی۔“

”ہاں ہاں کہہ نا۔“

”شہیر! مجھے خبر نہ تھی۔ ارم آپ کے خلاف ایسی بے بنیاد باتیں بنائے گی۔ بیوی شہیر..... میں یہ بھول گئی کہ اس کے اور آپ کے درمیان بڑا عجیب رشتہ ہے۔ ورنہ میں وہ زوال انکی کسی بات کا اعتبار نہ کرتی۔“

”چنانچہ بتا رہے تھے رانو سے تمہاری بڑی وہ سزا رہی۔“ وہ اب بھی سنجیدہ تھا۔

”جی ہاں۔ وہ بہت اونچی لڑکی ہے۔“

”مسرور کے دکھ کچھ میں ساتھ دینے والی بہت ہی اچھی بیوی اور شریک سفر بھی۔“ اس نے بڑے عجیب میں کہا۔

”جی!“

”ہاں ہاں..... مسرور کی اور اس کی پسند کی شادی ہے۔ جان دے رہی تھی مسرور کی خاطر..... پھر وہ بچوں کی ڈاؤنی ہوئی۔“

”سرہنشاہید خدیوہ پر جان دینے والی لڑکی کو.....“ وہ مسکراتی تھی۔

”اپنے آپ سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ یہ میرا خیال ہے ذاتی خیال۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی میرا ہے کہ جان دینے کی ہمت ہر لڑکی میں نہیں ہوتی۔ گوہر! آدمی جان اتنی کی خاطر دے لیتا ہے جسے اپنی زندگی کا محور سمجھتا ہو۔ جس کے بغیر جینے کو بے کار سمجھتا ہو۔ مزہ تو اتنی زندگی کا ہے کہ آپ کسی کی

ناظر چاہی کی آخری حد تک محض ہوں۔ میں نے سوچا تھا مجھ میں اور تم میں منگنی کا یہ بندھن ایسے جذبے پیدا کر دے گا۔ ہم ایک دوسرے کی خاطر جنم لے گے۔ ایک دوسرے کی خاطر زندگی گزاریں گے۔ زندگی اپنا نہیں گے۔ حالات سے دو دو ہاتھ ہوں گے۔ لیکن تم نے..... تم نے ہر قدم پر میرے حوصلے پست کیے۔ ایک طرف سے میرے احساسات میرے جذبے کا قدری کے ساتھ چھیلو ڈاڑھے۔“

”شہیر! شہیر! یہ آپ.....“

”نہیں! میں کچھ کہہ رہی ہوں۔ محبت کے رشتوں میں اعتماد بنیاد ہے۔“

”تم نے بنیاد بننے ہی نہیں دی۔ تمہیں اور مضبوط بنیاد..... اس رشتے کی عمارت کو ٹھنک اور بے اعتمادی کے تیشے سے توڑ پھوڑ ڈالا ہے۔ تم نے مجھے سمجھا ہی نہیں۔ کوشش بھی نہیں کی۔“

”آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں نے آپ کے جذبے کا قدری کے ساتھ آپ کیلئے دیے ہیں۔ سستی غلط بات آپ نے بہ دی۔ اور کہنے سے پہلے کچھ نہیں سوچا۔“

”بہت سوچا ہے۔“

”آپ جسے محبت کہتے ہیں میں اسے ایک نظری کشش کے سوا کچھ نہیں سمجھتی جو آدمی کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ جو اکیسویں کر..... بعض لوگ اس کشش کو ایک چہرے کا پابند بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اکثر بے صبر سے اور ناشکرے۔ چہروں کے کولرس خوب سے خوب تر کی تلاش میں انہار لگاتے چلے جاتے ہیں اپنے ارد گرد۔ لیکن میں آپ سے وہ وفا نبھانا چاہتی ہوں۔ جس کا ذکر کتابوں میں ہے۔ جسے چندا تمہیں لوگوں نے اپنایا ہے اور جو انہایت اور شرافت کا تقاضا ہے۔“

شہیر نے نردن قدرے موڈگمات کی طرف دیکھا۔ اس نے بات جاری رکھی۔

”جی ہاں اور شہید میری وفا بھی اس موڈ تک نہیں پہنچی کہ جان دے؛ دینا؛ سامان مرحلہ لگنے لگے۔ بہر حال آپ کو چاہیے کہ آپ وہ رنگ اپنے ہاتھ میں نہیں لیں کہ مجھے یقین ہو کہ آپ نے میری بات پر اعتبار کر لیا ہے۔“

”کیا اعتبار؟ شرط صرف یہی رہ گئی ہے تاتے انگوٹھیوں کے نہیں انسانوں کے جڑتے ہیں گوہر عسکری۔“ شہیر کو اس ذکر سے جڑتیا ہوئی تھی۔

”تو نیچے۔ میں بھی اتار رہی ہوں انگوٹھی..... رکھ نیچا سے اپنے پاس۔ ہم اس بات کو ایسے ہی نبھائیں گے کسی ظاہری حوالے کے بغیر۔“

شہیر نے ایک دم اسے دیکھا۔ ”پلیز گوہر..... چچی اماں سے ڈرو۔ ناطقہ بند کرو میں گی تمہارا۔ انگوٹھی اتار کے دیکھو تو سب ان کے سامنے۔“ وہ مسکراتے لگا۔

”تو گویا انگوٹھی ضرور ہی ہے۔“ وہ اقرار کرنا چاہتی تھی انگوٹھی کی اہمیت کا۔



"ہاں۔ آج سے سارے شکوے گلے اور جھگڑے ہند۔ تمہارے ساتھ یہ زندگی کا پہلا سفر ہے۔ بہت دیکھات کی انگوٹھیاں موضوع بحث بنی رہی ہیں۔ اب ان کا ذکر بھی نہیں ہوتا۔ یہ ہمارے والدین اور بزرگوں تسلی اور اطمینان کا سبب ہیں۔ ہم دونوں کی ذات کا حوصلہ تو بس آپس کا پھانسی اور اعتماد ہی ہوگا۔ زندگی کسی دیوانہ سے حسین خواب کا نہیں ایک سچ حقیقت کا نام ہے۔ خدیشیاں صرف رب کی مہربانی سے ملتی ہیں۔ ہنگ و دو سے ٹھکر پر سارے کام امید کے سہارے جیتے ہیں۔ ہم امیدیں دل میں لیے کوشش کرتے ہیں اور میری کوششیں ذرا کے لیے نہیں اجتماع کے لیے ہیں گوہر..... مجھے آج تک کوئی ایسا نہیں ملا جس سے میں دل کا حال کہہ سکوں۔ اس جدوجہد میں میرا ساتھ دے سکتے۔ جو میرے دل جذبے کو مہرا ہے۔ مجھے مزید حوصلہ بخشنے۔ گوہر اس جدوجہد کا شوق کیا ذکر..... میں تو اپنی ذات کے بارے میں بھی آج تک کسی سے حل نہ بات نہیں کر سکا۔ عدوی میرا جگر دوست ہے۔ بہت پیارا جان نثار اور مخلص..... مٹی میری ماں ہیں اور ڈیڑھی پب جیسے سدرہ آ پا کا وجود ایک نور ہے۔ عذرا کا پیار پا کر مجھ جیسے محروم محبت نے جانا کہ میں بھی خدا کا عنایت کردہ بہت بڑا شخص ہے۔ لیکن گوہر..... ان سارے رشتوں میں وہ بات پھیرنا ہوتی۔ ایک فاصلہ تو پھر بھی موجود رہا۔ انہوں نے مجھے پیار دیا۔ وہ فریقتے..... یہ پیار ان کا حسن ہے۔ شبیر تو ایک تنہا انسان کا نام ہے جس نے ہاتھل میں آنکھ کوئی تو ماں کے پیار سے اپنی مائیلی سانس سے بھی قلب دور ہو گیا۔ فرسری میں پلا بڑھا۔ پوری زندگی ہوشلوں میں رہا اور بڑا ہو گیا انہوں کے ہونے ہوئے بھی کتنا اکیلا رہا۔ گوہر..... کبھی تم نے میرے بارے میں اس انداز سے سوچا۔ کتنا نصیب ہوں میں بھی۔ ماں کے وجود کی واضح شکل بھی میرے پاس نہیں۔ اس کا تصور بھی میرا نہیں۔ ماں جان۔ کیسی تھی۔ کیسی ہوگی۔ بچہ اپنے ماں باپ کا پر تو ہوتا ہے۔ مجھ میں اپنے باپ جیسی ایک بات بھی نہیں۔ چاچو کی ہیں میں اپنی ماں پر مین ہوں۔ اگر میں سچ سچ اپنی ماں جیسا ہوں تو پھر خوش نصیب بھی ہوں۔ کسی اچھی ماں کا بڑ ہوں۔ میرے اندر خون کی روانی کے ساتھ ساتھ اچھائی اور ذہنی ہے۔ ماں زلمہ نہ رہی۔ کچھ دے نہ سکی۔ لیکن میرے لیے یہ کافی ہے جو مجھے مل گیا۔ خوب صورت دل اور صاف ضمیر اور ماں دونوں ساتھ ہوں تو اور چاہیے کچھ کیا۔ شاید ان ہی کے سبب میں تنہا رہ کر بھی غلط ماہوں پر نہ چلا۔ بچکنے سے بچ گیا گوہر! جب میں بہت چھو تھا..... تب بھی..... ہاں تب بھی مجھے ہے حد شعور تھا۔ محرومی کے دکھ کو کھینے کا شعور۔

ہوش کے چوکیدار زین بابا کی غربت کا شرم میرا دل شدت سے محسوس کرتا تھا۔ زمان بابا کے چھ بچے تھے۔ سرکاری کوارٹر کے چھوٹے کمرے میں سارے کے سارے ایک ساتھ رہتے تھے۔ بیچارہ قلیل تنخواہ میں ان سب کی زندگی کا اندھن مہیا کرتا تھا۔ تا کافی خدا نا کافی لباس اس کا ایک بیٹا میرے جتنا تھا۔ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ جب بھی میں لان میں بیٹھ کر پڑھتا وہ میرے پاس آ جاتا۔ میں اس کے لیے کتابیں لے آیا۔ اسے پڑھانے لگا۔ ہوسٹل کے وارڈن نے ایک دن اسے میرے پاس بیٹھا دیکھا تو ڈانٹ کر بھگا دیا۔ میں نے ان سے کہا: "مرا میں اسے پڑھا رہا ہوں بے چارے کو پڑھنے کا شوق ہے۔"

"کیا پڑھے گا وہ تم میں اور اس چوکیدار کے بیٹے میں بہت فرق ہے۔ شبیر عسکری۔ حقیر لوگوں کو نہ لگانا اچھا

نہیں ہوتا۔ تمہارے والدین ہمیں اس بات کے پیچھے دیتے ہیں کہ ہر طرح سے تمہاری حفاظت کی جائے۔"

"ان میں اور مجھ میں کیا فرق ہے سر.....؟"

"تم ایک بہت بڑے آدمی کے بیٹے ہو شبیر..... وہ لوگ کلاس آدمی کا بیٹا۔ بہت بڑا فرق ہے تم دونوں کے درمیان۔ اس لڑکے کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے تمہاری عادتیں بگڑ سکتی ہیں۔ یہ لوگ انسان ہوتے ہیں مگر جانوروں کیسے۔" میں نے حیران ہو کر اپنے وارڈن کو دیکھا۔

"میں تب سے ہی اس پر غور کر رہا ہوں۔ یہ فرق کس نے پیدا کیا۔ کیا خدا نے؟ یا ہم انسانوں نے۔ میں زمان بابا کے اور بھی قریب ہو گیا۔ ان کے گھر جانے لگا۔ اپنے جیسے کا کھانا چوری چوری بچا کر ان کے ہاں لے جاتا۔ ان کے کسی بچے کو کھانا بنا دو دھکا کھلاں ان کے شیرخوار بچے کو دے آتا۔ ایک دن پھر دیکھ لیا گیا۔ مجھ پر تھقی ہونے لگی۔ وقت آگے بڑھتا رہا۔ میرے نظریات پختہ ہوتے رہے۔ میں اب بچہ نہیں تو عمر لڑکا تھا۔ تھوڑا سا ذمہ دار۔ اب میرے ہاتھ میں پیسے بھی تھے۔ میں اکثر ان سے ضرورت مندوں کی ضرورتیں خرید کر اپنے بے چین دل کو چین بخٹار رہا اور ایک دن جب زمان بابا کا میرا ہم عمر بیٹا نسوے کے سبب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا تو میں دل گیا۔ اتنے پیسے میرے پاس بھی نہ تھے کہ وہ کسی ڈاکٹر کی فیس کے لیے دے جاسکتے۔ وہ بوڑھے زمان بابا کا سہارا تھا۔ اس کی موت پر وہ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ کوارٹر میں اس کے بیٹے کی بے گور وکشن لاش پڑی تھی اور ساتھ ہی موجود پرنسپل کے بیٹے میں ان کے اکلوتے بیٹے کی سالگرہ کا جشن تھا۔ جس میں بہت سے لوگ مدعو تھے۔ میں سرعبدالقدک پاتا تھا اس لیے پرنسپل صاحب کا منظر نظر تھا۔ پھر اپنے اسکول کا لائسن طالب علم بھی تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو مدد کی تھی مجھ سے رسم راہ اور دوستی رکھنے کی۔ مگر میں اس سالگرہ میں شریک نہ ہو سکا۔ زمان بابا کے کوارٹر میں اس کے بیٹے کی لاش کے قریب بیٹھا رہا۔ اسے نہلائے میں بابا کی مدد کی۔ پرانی چادر کے کٹن میں لپیٹ کر میں زمان بابا..... اور اس کے جیسے دو لوگ قبرستان میں لے آئے۔ نماز جنازہ پڑھ کر دفن دیا اور لوٹ آئے۔ اس گھر میں آگ نہیں چلی۔ اسکول کے درجہ چہارم کے ملازموں نے مل کر دوسری بیچ کھانے کا بندوبست کر دیا۔ پرنسپل صاحب کے گھر جشن سالگرہ کے سلسلے میں پکینے والے عمدہ کھانے دوسرے دن خراب ہو جانے کے سبب کوڑا گھر میں پھینک دیے گئے۔ تیسری صبح میں اسکول میں داخل ہو رہا تھا۔ تو پرنسپل کی گاڑی گیٹ پر رکی۔ زمان بابا گیٹ پر کھڑا تھا۔

"بھئی سنا ہے تمہارا بیٹا مر گیا ہے۔ علاج کرایا ہوتا نا۔ ایک تو نم جاہل لوگوں میں یہ بات بہت بری ہے۔ مرض بڑھ جانے پر داویلا کرتے ہو۔ حالانکہ شروع میں ہی ڈاکٹر کو بکھانا چاہیے۔ بچوں کا خیال رکھا کرو۔ آج کل برطانوی سرودی کی لہر آئی ہوئی ہے۔"

انہوں نے فرض ادا کر دیا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا دونوں کو دیکھتا رہا۔ میں اسکول سے کارٹ میں آ گیا۔ مگر یہ تو مجھے اور درجے میں نہیں بلکہ اور بھی بڑھے ہوئے محسوس ہوئے۔ قدم قدم پر زمان بابا جیسے لوگ نظر آئے۔ میں اس وقت بھی بے بس تھا اس وقت بھی۔ میں نے بی۔ اسے کیا تو پاپا آ گئے۔ انہوں نے مجھے پیار دیا۔ پناہ دی۔ میں خود کو بوسہ دیا جانتے لگا۔ میں نے سوچا اب میں اپنے دل میں پلٹنے والے دکھ کا ازالہ کر سکتا ہوں۔ اب میرے پاس پیسہ بھی ہے اور اظہار کی قوت بھی کام کرنے کو ایک پلیٹ فارم بھی مگر۔ میرا یہ عمل پاپا کو پسند نہیں آیا۔ وہ میری ذات پر لاکھوں ٹرچ کر سکتے تھے۔ بے مایہ۔ بے سہارا لوگوں پر نہیں۔ میں انسانیت کی بھلائی کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھ سے خفا ہو گئے۔ میرے کیے ن سزا خریں کو

دی۔ اپنی اہل سے سب کو بنا کر۔ ان کے جائز حقوق چھین کر۔ گوہر! کچھ لوگ مجھے سختی اور پابلی کہتے ہیں۔ اپنا جہان کا دشمن سمجھتے ہیں۔ ارم کی تمی کا خیال ہے میں صرف اس لیے ان کے شہر کی دولت لٹا رہا ہوں کہ تمہیں ارم اور شازدہ کا حق چھین لوں۔ ان کا خیال کتنا غلط ہے۔

گوہر میں جب اس گھر میں تھا تو ملازموں سے ان کے بدتر سلوک پر میرا دل جل جاتا تھا لیکن میں سمجھ کر اپنی پوزیشن میں نہ تھا۔ میں کیا چاہتا ہوں..... میں کسی کو نہیں سمجھا سکتا۔ شاید میں قہقہے مٹانا چاہتا ہوں، انسانوں کے درمیان موجود تفریق جو بوجھتی چلی جا رہی ہے۔ جدید ٹیکنالوجی نے تو انسان کے لیے کیا کیا ہے۔ صرف تباہ کاری پیدا کی ہے ایک ہائیڈروجن بم کے سامنے لاکھوں انسان کیڑے مکوڑوں سے بھی کم حیثیت رکھتے ہیں۔ مشینیں انہوں نے تو خراب انسانوں کی روزی بچی مار ڈالی ہے۔ یہ لوگ! آخر کہاں جائیں گے۔ زندگی کیسے گزاریں گے۔ ایک گنڈا ڈیسر کو صرف سائیکل کرنے کے برابر بنا دے۔ ہفتے بھر موت کے منہ میں جا کر خائف ناک مشین چلانے والوں کو چند سو روپے افسر کو رشوت کی میوٹی میوٹی رقم کا سہارا۔ مزدور ایک دن تک جیوری کے تحت غیر حاضری کرے تو یہ ہارڈی ختم۔ اسپر لوگ چند ہزار ہوں گے۔ عمریت نام رقم پر مسک رہے ہیں۔ کروڑوں لوگ محرومی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ راجول رو رہا ہے انسانیت دم توڑ رہی ہے۔ کسی دن مر جائے گی۔ مگر خدا نہ کرے کہ انسانیت کو موت آئے گوہر..... یعنی تم نے کسی بے حال حالتوں کی حالت پر غور کیا۔ جس کے پاس اپنا اولاد کا پیٹ بھرنے کے لیے بھی پیسے نہ ہوں اور اس پر تین تین چار چار لڑکیوں کی جوانی کا بوجھ لگا رہا ہو۔

کس کس بات کا رد نام دیا جائے۔ آخر کس کس بات کا۔ ہماری یونیورسٹی میں طلباء کی کئی تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ لیکن ان پانچ چھ ماہ میں ان میں یہ نہیں جانا سکا کہ وہ کیا کر رہی ہیں۔ سوائے آج کل میں لڑائی جھگڑے اور دھیس کا مشورہ گالی گلوچ لانا تھا پانی اور فائرنگ کے۔

ہمارے عظیم قائد نے ہمیں فکر و نظر کی آزادی سکے درس دیے ہیں۔ لیکن ہم نے اس آزادی کا مطلب سمجھا اور لیا ہے۔ ہم میں خود کو نوانے کی جہت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ہم اپنی بات کو درست اور باقی سب کی بات کو مرام غلط قرار دیتے ہیں۔ ہم میں سچائی کا فقدان ہے۔ ہم اتفاق سے بیٹھا رہ سکتے۔ یہ بات بڑوں سے شروع ہوئی ہے اور چھبھوں میں بھی ہو چکا ہے۔ حیوانوں کی طرح ہم طاقت کو سب سمجھتے ہیں۔ طاقت کے ملے پر سب کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم وقرامت سے نہیں۔ قوم کے لیڈروں ہوتے ہیں جو اس کے لیے کچھ کر سکیں۔ ہمارے لیڈروں کا سارا زور بیان بازی پر صرف ہوتا ہے۔ خوب صورت الفاظ میں قوم کے دربار کا اظہار کرنے وہ شرس اور کہہ دیتے ہیں۔ کسی جیل کے اسے کا اس کمرے میں چند مکمل سہولیات سمیت نظر بند ہو کر تو یہ بات بانی کی پل ہزارا پار کر لیتے ہیں۔ معاشرے کو ان کی نہیں جتنی غم خواروں کی ضرورت ہے۔ ایک شخص کے پاس خدا کی بخشی دولت بے حساب ہے۔ وہ اس میں سے تموڑی ہی دولت ان پر بھی لگا دے۔ جنہیں خدا سے جانے کس سبب محروم رکھا ہے۔

ایک شخص کے پاس علم نمل یا نوانہ ہے۔ وہ اسے ان کے لیے استعمال میں لے آئے جو اس سے طلب کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علم کی عمدی ہے۔ پہلے علم چند لوگوں کے پاس ہوتا تھا۔ اب گھر گھر میں ہے۔ ابھی تم نے غور کیا تو ہر علم سنا شے کا نام ہے۔ ہر ایسی ایچائی کا نام جو نونش انسانی کو فائدہ پہنچا سکتی ہو۔ علم ہی ہے۔ ہم نے علم سے مختلف اقسام کے ہم بنا لیے ہیں۔ ہر ذراں میلوں سے مار کرنے والے میزائل تیار کر ڈالے

۔ کائنات کو پیدا کر لی ہے۔ اس صدی کی خطرناک ترین اہلحت ہیراٹن سے نسل انسانی کو تباہ کرنے کا عمل کر دیا ہے۔ لیکن اس ختم سے مساوات کو جاری نہیں کر سکے۔ انسانوں کے بنیادی حقوق کا تحفظ نہیں کر سکتے۔ ہم میں پابلی ہونے کا فقدان ہے۔ اپنا ذات کے دائروں میں بند ہم زبان سے اجتماع کی بھدروں کا پار کرنے سے زندگی گزارنے چلے جا رہے ہیں۔

ابھی لیڈر شپ ہمیں نصیب ہوئی تھی۔ بد قسمتی سے کوئی لیڈر نہیں دیکھا ہے۔ یہ بھی تو وہ بھی شاید ہی بگڑ میں گم اور اپنی ذات کو عقل و فہم کے سہارے کسی حد تک فہم پہنچا سکتا ہے۔ گوہر..... ہمارا یہ مذہب جس کی بنیادیں ڈالنے عرب کے ایک شہر مکہ کی گلیوں سے رکھی گئیں۔ یہ مذہب ہمیں جاہ و حشمت، اقتدار اور اپنی حاکمیت سے بہت کرنے سے سختی سے منع کرتا ہے۔ لیکن شاید ہم اس دور سے۔ جب ہم نے قیصر و کسریٰ جیسے بڑے بادشاہوں کو قوت الہامی سے شکست سے دوچار کر کے فارس اور روم کی سلطنتوں کو عالم اسلام کا حصہ بنا دیا تھا۔ ہم ان دور میں جڑ گئے تھے۔ اللہ کے نام پر اللہ کی بخشی قوت سے حاصل کردہ دولت پر اپنی نظریں جم کر ہم اسے اپنا بن بیٹھے تھے۔ یہ بگاڑ اکثریت میں نہیں اقلیت میں پیدا ہوا تھا اس اقلیت میں جو آج تک اکثریت پر حکومت لینی آئی ہے۔ اندر ہی اندر جس کے دل سے یہ عزم بھی نکلا ہی نہیں کہ زمین کے اوپر موجود سارے خزانوں کی صرف وہی مالک ہے۔ اور۔۔۔۔۔ ہم یونیورسٹی کے گیٹ تک بھی آئے۔

گوہر بڑے غور اس سے کی باتیں کرتے تھے۔ ایک دم جو گئی۔ ایک طویل سانس اس کے لبوں سے اُڑا رہی تھی۔ اس نے ہنور شہر کو دیکھا۔ ان لمحوں کے بعد جو اس کی تربت میں گزر گئے تھے وہ اسے کوئی اور انسان نہ رہا تھا۔ ساری دنیا سے علیحدہ اور مختلف۔

"شہیر! اس نے اسٹیئرنگ پر رکھے شہیر کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ جو گاڑی روک چکا تھا۔

"شہیر! " وہ دور کہیں کھولی ہوئی تھی۔

"ہوں۔"

"ہم دونوں اپنی اپنی ذات کے دائرے میں گھومتے زندگی کا سفر نہیں کریں گے۔ کچھ کام کریں گے۔ مل کر آگے بڑھیں گے۔ نام ہنور کی جاہ و حشمت کی اقتدار اور حاکمیت کی خواہش سے بالکل بالاتر ہے۔ یہ میرا..... وہ شہر کی کا جو تہا رنی ایک اچھے انسان کی شریک حیات ہے۔ وعدہ ہے یا نکل پکا اور سچا وعدہ۔"

"سچ؟"

"شہیر! تم بھی خود کو تنہا نہ سمجھنا۔ کسی بھی معاملے میں۔ کسی بھی مسئلے پر۔ میں رفاقت کے سارے حق بھانسنے کی پیش کش کروں گی۔ دنیا اچھے انسانوں سے اتنی بھی خالی نہیں۔ بہت سے لوگ ہمارا ساتھ دینے کو تیار ہوں گے۔ ہمارے اس ملک میں اتنی بے رحم اور سنگ دل معاشرے میں کم از کم ایک دو مثالیں تو ہمارے سامنے ہیں۔ بے نسبت خدمت اور بے غرض انسانوں کی۔ ہم ان ہی کی صف میں شامل ہو جائیں گے۔ کسی نہ کسی دن اپنے مقصد کا تہذیبی معاشرہ تو پالیں گے۔"

"واقعی....." شہیر نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر یقین چاہا۔

"بالکل واقعی۔" اس نے یقین سے کہا۔ شہیر نے اس کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ کر عہد کو مکمل کر دیا۔

"ارے۔ وہ دیکھو عدی! میرے غائب ہو جانے پر پریشان ہے۔ آؤ..... آؤ..... نکلو باہر۔ میں تمہیں عدی سے غور کروں۔ دیکھو! شہیر! ہرگز نہیں۔ اس بے چارے کو یہ خبر ہی نہیں کہ ہم دونوں..... اور تانے کی ابھی

ضرورت بھی نہیں۔"

وہ باہر آئی۔ عدی ان کے قریب پہنچ چکا تھا اور حیران ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"سارے ہتیری گاڑی سے منگناڑک کی ہڈی۔ بات کچھ غیر معمولی ہی ہے۔"

"عقل۔ عقل۔ ہوش سے کام لو۔ یہ۔ یہ میری فرسٹ کزن گوہر ہے۔ اس کا ایڈیشن کرنا ہے۔"

"اوہ۔۔۔۔۔ آئی ایم سوری۔ آداب۔" بے چارہ خواہ مخواہ ہی نرمی ہو گیا۔

"کوئی بات نہیں عدی بھائی۔۔۔۔۔ لوگوں کو نمانت ہوتی ہے۔ بات سے بات بتانے کی۔"

عدی حیران ہوا۔ پھر مسکرا دیا۔

"یاد تم نے بھی ان کا ذکر کیا ہی نہیں۔"

"ضرورتی نہیں سمجھا تھا۔۔۔۔۔ بہر حال زیادہ حیران ہونے سے گریز کرتے ہوئے سیدھے آفس جاؤ اور فارم لے آؤ۔ اتنے میں میں گوہر کو یونیورسٹی کے اس جنگل سے متعارف کراتا ہوں۔ اذکے۔"

"بس باس۔" وہ چلا گیا۔ سر کو ادب سے جھکانے ہوئے۔

"یہ سب لوگ بڑی محبت کے ہیں گوہر۔ عدی کے ڈیڈی جنرل صاحب ہیں نا۔ آج کل بھی اسمبلی کے ممبر ہیں۔ اصول کی بات پر مشنری کو خیر یاد کہہ دیا۔ میری ان کی ای بات پر بہت ہنسی ہے۔ جب کہ عدی ان باتوں سے دور بھاگتا ہے۔ وہ تو پانچ گھنٹے کو آف تاگہالی سمجھ رہا ہے۔ صرف ڈیڈی کے ڈر سے۔"

کئی لڑکوں نے ان دونوں کو ایک ساتھ جاتے دیکھ کر غور سے دیکھا۔ کئی لڑکیوں نے آپس میں کھس پھسری۔

ان کی طرف اشارے کر کے وہ سب سے بے نیازا سے لے پھرتا رہا۔

"یہ ہمارا ڈپارٹمنٹ ہے۔ اتنا دور بھی نہیں ہے۔ آجایا کر کا رخ اوتوت میں۔"

اسے نہیں بلکہ میں خود آ جاؤں گا۔ یونیورسٹی میں عدی کی بڑی دھماک ہے۔ ڈیڈی کی وجہ سے نہیں۔ اس کی طاقت کی وجہ سے۔ کوئی لڑکا ظاہر نظروں سے دیکھے تو صرف اتنا کہہ دینا کہ عدی کی ہونے والی بھالی ہوں۔ پھر دیکھنے کیسے چوڑھی ہوتا ہے۔"

"اچھا۔۔۔۔۔ بڑی عجیب بات ہے عدی سے یہ بات چھپائی جائے اور یونیورسٹی کے باقی لڑکوں کو بتا دی جائے۔"

"اور کچھ نہیں۔ وہ صرف اس بات پر جان نکال لے گا کہ اسے بتائے جاتا ہے۔ مہنگی کیسے کرنی۔"

"تو یہ بات تو بڑی زیادتی کی ہے ان سب کو بتانا چاہیے تھا شہیر! تمہیں۔ مہنگی کیا سوچیں گی۔"

"انہیں بتا دیا تھا۔ بڑی لگن ہے انہیں، تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں۔ عذر دینے تو کرید کرید کر ایک ایک بات پوچھی تمہارے بارے میں۔ کسی ہو۔ کئی خوب صورت ہنسی ذہین لائق باوقار۔"

گوہر ہنس دی۔ ان دیکھی ہی۔۔۔۔۔ سدرہ آ پا۔ ڈیڈی سب اسے اچھے لگنے لگے۔

"کیا یہ سب بہت اچھے ہیں شہیر؟"

"ہاں بہت اچھے میرے خوابوں کے انسانوں جیسے کاش میں ان کا حقیقی بیٹا ہوتا۔"

"پھر آج ہم دونوں ایک ساتھ یہاں نہ ہوتے۔"

"ہاں گوری۔ کچھ کھد کر ہی کچھ پایا جاتا ہے۔" شہیرا سے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

گوری۔۔۔۔۔ یہ عام سا لفظ جو اتفاق سے اس کے نام کی مختصر صورت بھی تھا، شہیر کے لبوں سے ادا ہونے لگا تھا۔

۔۔۔۔۔

تو اس خاندان میں پیدا ہونے کا مقصد صرف یہی ہو۔ یعنی تمہیں پالینا۔"

"یاد تمہاری مہی اس لیے یہاں آئی ہوں۔ صرف تمہیں جنم دینے۔"

"ان نہ ہوتا تو تمہیں ظہیر کے لیے نام نہ پایا جاتا۔"

اور میں موت سے پہلے مر جاتی۔"

اب نہ تمہیں مروگی بے وقت۔ خدا سے التجا کر کے تمہیں لمبی مدت کے لیے اٹھ لوں گا۔" وہ ہنسا۔

"تو رن۔ ایک بات تو بتاؤ۔"

۔۔۔۔۔

"تیس تمہیں کب سے عزیز ہوا؟"

تو ہر نے چلنے چلنے اس کی طرف دیکھا۔

"اب بھئی ہمارے ہاں آئے تھے۔ مجھ پر رعب چھاڑ رہے تھے تب سے۔"

"اور انہی پہلے پر جہاں ظہار نظر تے بلکہ ظہار دیکھنے کرنے لگی تھیں دو۔"

"اب تو احتجاج تھا تمہارے بے گاتہ روپے کے خلاف۔ اپنا حق مانگنا کوئی بری بات تو نہیں۔"

"ہاں تمہارا منگنیتر ہو کر غیر لڑکیوں کے ساتھ پھرتا رہوں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔" اس نے خود ہی فرو جرم دہلی۔ خود ہی دہائی دی۔

"وہی مسکرا دی۔" کاش اس کی جہیں پر لکھا ہوتا کہ وہ تمہاری بہن ہے۔ ہم میں بدگمانی پیدا نہ ہوتی۔"

"تمہاری جہیں ناز پھانٹا نام تہمت کراؤں گا تاکہ یونیورسٹی میں موجود لڑکیاں جو مجھے پاکیزہ سمجھتی ہیں جان لیں تم بڑی۔۔۔۔۔"

اس نے بات اور جوڑی چھوڑ دی۔ شرارت کے ساتھ۔ گوہر ہنس دی۔ عدی ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اس کی ادا پردوںوں دک گئے۔

☆☆☆☆☆☆

۔۔۔۔۔ نین دن میں وہ اس نئے ماحول میں پنپ گئی۔ یہاں کی دنیا وہ یمن کا بچ سے یکسر مختلف تھی۔ شہیر اور عدی دن

دن نہ ہوتے تو شاید وہ بیٹوں بیٹوں محسوس کرتی رہتی۔ ایک دو لڑکیوں سے اس کی خاصی صاحب سلامت ہو گئی

انت کے لمحات میں شہیرا کو اس کے ساتھ ہونا۔ عدی کی اور اس کی ٹوک جھونک اور چھیڑ چھاڑ میں وقت اچھا

لگتا جاتا۔ بڑے دن معمول کے مطابق گزر گئے۔ آف بیٹے میں وہ باہر چلی۔ شہیرا کیلا اس کی طرف آ رہا تھا۔

"عدی بھائی کہاں ہیں؟"

"خبر نہیں۔ سگ میرے ساتھ آیا تھا۔ پھر نظری نہیں آیا۔"

حالانکہ اس الوی ہم نے کل جان چھڑائی تھی یہ کہہ کر کہ کل کی چائے مع سارے لوازمات کے اس کے ذمے

ہی۔ تو ہر تم چلو۔۔۔۔۔ اپنی مخصوص میرٹھ میں اسے ڈھونڈ کر آ رہا ہوں۔

"نہیک ہے۔" وہ عجیبی کیے ٹیر یا کی طرف چل دی۔

اتن وہ کچھ دور ہی گئی اور بڑی کم صبر رہش پر چلتی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک آواز نے اس کے قدم روک



”لو فیصلہ گوہری کرے گی۔“

”کس بات کا؟ کیسا فیصلہ؟“ وہ پہلے ہی پریشان تھی اور سہمی گئی۔

”اس بھالو کو آپ کا منگیترا ہونے کا شرف حاصل ہو گیا اور ہمیں خبر ہی نہ ہوئی۔“

”بھئی! کہہ تو رہا ہوں سب کچھ میری عدم موجودگی میں ہوا۔ میری کسی قسم کی رضا مندی کے بغیر..... میری اطمینان میں کیوں گوہری.....“

”جی..... جی ہاں۔ یہ سچ کہہ رہے ہیں۔ یہ فیصلہ ہمارے بزرگوں نے ہی کر دیا۔“

”یعنی می اور ڈیڈی کچھ بھی نہ تھے اس کے..... کم از کم آپ لوگوں نے مطلع کیا ہوتا۔ شبیر می کو مجھ سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ انہوں نے مجھ سے اظہار نہیں کیا۔ لیکن میں جانتا ہوں انہیں کتنا دکھ ہوا ہوگا۔ وہ لاعلم گھر میں بیٹھی ہیں اور اس کی منتکشی ہو گئی۔“

”ندی بھائی! آپ یقین کریں۔ یہ سب کچھ بڑے عجیب حالات میں ہوا۔ شبیر تو آپ ہی کے ہاں تھے۔“

شبیر نے مختصر الفاظ میں ساری کہانی دہرا دی۔ تو وہ جو اتنا بگڑا ہوا تھا۔ پل میں ہی ٹھیک ہو گیا۔

”ندی۔ تمہاری اسی ادا پر تو میں غار ہوں۔ پس میں بن جانے والی۔“

”نو..... نو..... تو یہ بات نہیں۔ سزا تو میں نے سوچ لی ہے۔ پورے ایک ماہ کی چائے اور لوازمات تمہارے ذمے۔“

”مارے گئے۔“

”پڑوا نہیں..... یہ سزا ہے..... اور سزا ہر حال میں بھگتنا پڑے گی۔“

”پلو تمہارے درمیان ہونے کی خوشی میں جب کسی نہ کسی طور یہ پوجھا ٹھکانا لے گی۔“

”ہرا.....“ ندی نے نعرہ لگایا۔

☆☆☆☆☆☆

ایک مرد سے پیر جب دو یونیورسٹی سے گھر پہنچی۔ ڈرائنگ روم سے بہت سی آوازیں ایک ساتھ آ رہی تھیں۔

شبیر ہمیشہ اسے اندر چھوڑ کر گھر جاتا تھا۔ کبھی کبھی سب کے ساتھ چائے پی لیتا۔ کبھی کھانے تک بھی رک جاتا تھا۔ چئی اماں اور اس میں بڑی دوستی تھی۔ ان ہی کے گلے سے لگا بیٹھا رہتا۔ ادھر ادھر کی باتیں سناتا۔

کچا بے پرکی اڑاتا۔ گوہری کپڑے بدل کے باقی کے پاس آ جاتی۔ لیکن کے کام میں ان کا ہاتھ بٹانے۔ تھوڑی دیر میں دلناواز آ جاتے تو چائے میز پر لگا دی جاتی۔ آج چائے کون تھا۔

ان نے اور شبیر نے آگے پیچھے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا۔ گوہری کے قدم وہیں رک گئے۔

”آئیے۔ آئیے محترمہ مارک کیوں نہیں؟ ڈر نہیں ہم سے۔“

”ارے جناب ہم اے بی بی ہیں غیر نہیں۔ آپ ہمارے شبیر بھائی کے ساتھ یونیورسٹی سے لوٹی ہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ ارم انھہ گراس کی طرف آئی۔ سعیدہ بیگم نے ان دونوں کو دیکھا۔ شبیر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”شبیر بھائی! بڑی عمر ہے جناب آپ کی۔ ہم سب آپ کا ذکر کر رہے تھے۔“ شبیر نے اوہٹا آواز میں کہا۔

دونوں ان سب کے قریب آ گئے۔

”آداب ماما! سنی ہیں آپ؟“ شبیر کے آداب کا جواب سعیدہ بیگم نے سر ہلا کے دیا۔ ظہیر اور ظہیر نے ہاتھ ملایا۔ گوہری نے سلام کیا۔

”ہیلاس..... اس کو ہر باڈ آر یو۔ آپ یہاں کیسے۔“ گوہری نے اس اجنبی نوجوان کو جو بڑی اپنائیت سے اس سے مخاطب تھا حیران ہو کے دیکھا۔

”آپ اتنی حیران کیوں ہو رہی ہیں۔ کیا آپ نے مجھے نہیں پہچانے؟“

”جی نہیں۔ آپ کون ہیں؟“

وہ اونچی آواز میں ہنس دیا۔ ”میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ آپ کو ہزاروں میں پہچان سکتا ہوں۔ آپ کیسے پہچانیں گی۔ آپ تو بے ہوش تھیں۔ آپ نے مجھے دیکھا کب ہے..... آپ وہی ہیں نا۔ سکندر پور جانے والے راستے پر بھیا کی بیپ تھے آتے آتے ٹپک جاتے وانہ۔“

”جی..... آپ کون ہیں؟“

”میں..... ماموں واسٹی ہوں۔ ڈاکٹر ہارون واسٹی کا چھوٹا بھائی۔ امین واسٹی آف سکندر پور کا بیٹا۔ اب تو آپ نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔“

”جی..... جی ہاں۔“

”آپ حیران ہوں گی؟ آپ کا نام میں کیسے جان گیا؟“

لہجہ بھر بعد وہ خود ہی بولا۔

”صاحب! آپ تو ہمارے گھر کی اہم فرد بن کر رہ گئی ہیں۔ جس کو دیکھو آپ ہی کا دیوانہ ہے۔ ہم آپ کو آج انوں میں کھوج رہے تھے۔ آپ زمین پر ہی لیٹ گئیں۔ نیکو آپ کے لڑاؤں میں مری جا رہی ہے۔ اور بھیا ان کی تو پوچھی ہی نہ۔ جانے کیا جاؤ کر دیا آپ نے۔ بھیا پہلے ہانے ہارون واسٹی سے ہی نہیں۔ بڑے تنہائی پسند ہو گئے ہیں۔ ماں ہی اور باپ جانی کو تنہا مانے سب کچھ بتا دیا ہے آپ کو خبر نہ ہوگی۔ لیکن عبداللہ پور والے تو ہماری جان کے دشمن ہیں۔ میں تو جان پر کھیل کر بھی ان کے وار عوں سے آپ کا پتہ پوچھ آتا۔ بھیا نے روک دیا۔ ماں جی آپ کے ہاں آنے کو بے قرار ہیں۔ کیا آپ کا گھر بور میں ہی ہے۔ میں آج ٹی گرام کرتا ہوں انہیں یہاں بلانے کے لیے۔ ویسے آپ یونیورسٹی میں کیا کرنے آئی ہیں؟ کیا داخلہ لیا ہے۔ چھوڑیے صاحب آپ کو تو ہمارے بھیا کا گھر بسانا ہے اور اس کے لیے آپ جتنی اب ہیں اتنی ہی کافی ہیں۔ آپ پڑھ کر کیا کریں گی۔ اور اب آپ:..... کس طرف جا رہی ہیں۔ نہیں تو میں آپ کے ساتھ چلوں۔“

ماموں واسٹی کے ڈیسروں سوال بہت ہی وضاحتیں آئیں میں گڑبڑ ہوئی تھیں۔ وہ تو اب تک یہ سن کر نہ سن سکی تھی کہ دو ماموں واسٹی ہے۔ باقی باتیں تو پوری توجہ سے سن لیں۔ پائی تھی۔ جواب کیا آتی۔

”ماموں صاحب! میری کلاس فیلوزمیر انتظار کر رہی ہوں گی۔ پھر ملیں گے۔ خدا حافظ۔“ وہ بھاگ ہی پڑی۔

اور اپنی جگہ کھڑا ماموں واسٹی ایک مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا رہا۔ روزانہ میز پر آ کر وہ دھڑلہ سے کرسی پر بیٹھی۔ بہت دیر اپنے حواس کو قابو میں کرتی رہی۔ اس نے واسٹی کو سوچتی رہی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی تھی۔ تنہا کے لیے موت کو نہ راتوں کر نہ لے کے بعد وہ سوچتی تھی کہ زندگی کی کتاب کے یہ اور ان پھٹ چکے ہیں۔ کوئی انہیں نہیں پڑھ سکے گا۔ کس کو بھی خبر ہی نہ ہوگی۔ مگر اوراق تو کتاب کا صفحہ ال بے اس کے سامنے سجے تھے۔

”اے ونو.....“ اس نے سر ہاتھوں میں قہقہہ لیا۔ شبیر اور ندی خاصی تاخیر سے آئے۔ لیکن وہ اب تک پریشان ہی تھی۔ خود کو سنبھال کے انہیں آتا دیکھنے لگی۔ چونہ جانے کس بات پر بحث کرنے چاہئے تھی۔

”اے ونو.....“ اس نے سر ہاتھوں میں قہقہہ لیا۔ شبیر اور ندی خاصی تاخیر سے آئے۔ لیکن وہ اب تک پریشان ہی تھی۔ خود کو سنبھال کے انہیں آتا دیکھنے لگی۔ چونہ جانے کس بات پر بحث کرنے چاہئے تھی۔

”اے ونو.....“ اس نے سر ہاتھوں میں قہقہہ لیا۔ شبیر اور ندی خاصی تاخیر سے آئے۔ لیکن وہ اب تک پریشان ہی تھی۔ خود کو سنبھال کے انہیں آتا دیکھنے لگی۔ چونہ جانے کس بات پر بحث کرنے چاہئے تھی۔

”اے ونو.....“ اس نے سر ہاتھوں میں قہقہہ لیا۔ شبیر اور ندی خاصی تاخیر سے آئے۔ لیکن وہ اب تک پریشان ہی تھی۔ خود کو سنبھال کے انہیں آتا دیکھنے لگی۔ چونہ جانے کس بات پر بحث کرنے چاہئے تھی۔

”اے ونو.....“ اس نے سر ہاتھوں میں قہقہہ لیا۔ شبیر اور ندی خاصی تاخیر سے آئے۔ لیکن وہ اب تک پریشان ہی تھی۔ خود کو سنبھال کے انہیں آتا دیکھنے لگی۔ چونہ جانے کس بات پر بحث کرنے چاہئے تھی۔

”اے ونو.....“ اس نے سر ہاتھوں میں قہقہہ لیا۔ شبیر اور ندی خاصی تاخیر سے آئے۔ لیکن وہ اب تک پریشان ہی تھی۔ خود کو سنبھال کے انہیں آتا دیکھنے لگی۔ چونہ جانے کس بات پر بحث کرنے چاہئے تھی۔



”تم..... یہاں نہ ہوتیں تو شاید ہمارا آنا نہ ہوتا۔ ارم کو کسی کل چین نہیں تھا۔“ سعیدہ دیکھنے سے اگلے لگانے ہوئے کہا۔

”آٹھ کو بھانجی سے اور پھر ہونے والی بڑی بہو۔“ چچی اماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہو تو جب بنے گی دیکھی جائے گی۔ ابھی تو صرف بیٹی ہے۔ دل لگ گیا ہے بیٹی یہاں؟ ماں باپ بہن بھانجیوں کے بغیر اپنے گھر کے بغیر۔“

”ارے تو یہ گھر کسی غیر کا ہے۔ سعیدہ دلہن.....؟“

دل کیسے نہیں لگے گا۔ ماموں جان چھڑکتا ہے۔ ماں اپنے بچوں سے زیادہ پیار کرتی ہے۔“

”اور شہیر بھانجی تو.....“ چودہ سالہ عامریل اٹھا۔ آٹھ گیم نے اسے گھورا۔ سولہ سالہ مسافر نے شہو کا دیا۔ اس کی رہ گئی۔

”بڑے پیش ہیں جناب کے۔ بڑی آزادی ہے۔ لگتا ہے لائٹ صاحب ہوٹل چھوڑ کر ادھڑی آ گئے ہیں۔ دن رات تمہاری غلامی کر رہے ہیں۔ ارم نے سرگوشی کی۔ گوہر کو بہت بری لگی۔ اس نے منہ بنایا۔“

”اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے۔ جو کچھ ہے سننا ہی پڑے گا ویسے گوہران بے چاریوں کا کیا ہوگا۔“

”کن کا۔“ گوہر نے جھٹ پوچھا۔

”جو موصوف اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہیں ان قصوں کا کیا ہوگا۔“

”ارم..... میں کوئی بات نہیں سنوں گی۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا اور وہاں سے اٹھ گئی۔ ارم بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔

”تم غنا ہو گئیں۔“

”بات ہی ایسی ہے۔“

”سچ بھرا کہہ رہی ہو.....“

”کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ اس کی خبر خود مجھے ہے۔ آئندہ مجھ سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کرنا۔ انڈر اسٹینڈ۔“

”ارے تم پرانہوں نے جادو کر دیا ہے۔ کانٹے کو دوڑ رہی ہو۔“

”جو بھی کیا ہو میں شہیر کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سنوں گی وہ اچھا ہے یا برا۔ میں نے اسے دل سے قبول کر لیا ہے۔ ایک سنگت کی حیثیت سے اس کی مداخلت اس کی حماقت میرا فرض ہے اور وہ ایسا ہرگز نہیں جیسا اکثر تم نے بیان کیا ہے۔“

وہ اپنے گھر سے داخل ہو گئی۔ اور فوراً ہی ہاتھ ارم میں جا گھسی ارم ڈرائنگ روم میں آئی تو شہیر وہاں نہیں تھا۔

”کہاں چلے گئے شہیر بھائی؟“

”کیوں نہ آئے ایک ہل..... اے ہم جو یہاں بیٹھے تھے۔ اس کے دشمن۔“ سعیدہ کا لہجہ طعنیہ تھا۔

”ارے دلہن! ہوش کی دوا کرو۔ کہہ رہا تھا اپنے دوست کو چھوڑنے جا رہا ہے۔ ایئر پورٹ۔ تمہارے سامنے ہی تو فون پر بات کر رہا تھا۔“

”ہاں سعیدہ بھانجی اور ہمال صاحب کا بیٹا ہے نامہدی اسے چھوڑنے جا رہا تھا۔“

”اچھا اچھا وہ عدی عذرا بدت ہمال کا بھائی اے آٹھ بھانجی! ان لوگوں نے ابھی تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔“

”یوں ابھی کیا بات ہے۔ وہ لوگ تو جان چھڑکتے ہیں شہیر پر۔ بھانجی شہیر نے ایک عمر ان کی صحبت کے بارے ہی کاٹی ہے۔ خدا نخواستہ ایسا کیوں ہو۔ آپ سلامت سوچا کریں۔“

”تمہیں کیا خبر آٹھ بھانجی..... ان ہاتھوں کو نہیں سمجھتی ہوں۔“

”ہمس نکھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ آپ جانیں آپ کا کام۔“ آٹھ گیم نے ہنستے ہنستے کہہ ڈالا۔

رات کے کھانسنے کے بعد دلخواہ حسب معمول اپنے گھر سے نکلتے تھے۔ ظہیر اور شہیر عامر اور مسافر کے ساتھ نہیں لےتے تھے ارم اور شاز یہ گوہر کے پاس تھیں۔ چھوٹی عاتکہ اپنے باپ کے پہلو میں بیٹھی ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ چچی ان دن آج جلد بستر پر چلی گئی تھیں۔ آٹھ اخلافا سعیدہ کے گھر سے آ گئیں۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔

سعیدہ گیم کے دماغ میں کئی سوال بالکل بچا رہے تھے۔ میر تو ایک بہانہ تھا۔ دراصل تو وہ شہیر اور گوہر کے بارے میں چھان بین کرنے آئی تھیں۔

”آٹھ بھانجی! سنا ہے شہیر اکثر کبھی رہ جاتا ہے آپ کے ہاں۔“

”تو کیا ہوا اس کے چاچو تو اسے سنا پنا بڑا پنا کہتے ہیں۔ بہت چاہتے ہیں اسے..... وہ ہے بھی پیار کے لائق بہت دت کرتا ہے میری۔ ہوٹل کی بی بی خود اس نے لگ رہی ہے۔ میں نے تو کہا تھا عدی بھی نہیں رہ جائے۔

انہی قارغ ہی رہتی ہے۔ پردہ نہیں آیا۔ شہیر اس کی وجہ سے بائبل میں رہتا ہے۔ دونوں ایک ساتھ پڑھ لیتے ہیں۔“

”وہ تو سب نیک ہے مگر آٹھ بھانجی۔“

”جی کیسے کیا بات ہے؟“

”تمہیں گوہر کو یہاں نہیں رکھنا چاہیے تھا۔“

”کیوں؟“

”کاظم کی بیوی ہوشیار ہے اس نے یہ مصیبت اپنے گلے میں نہیں ڈالی۔“

”کیسی مصیبت بھانجی؟“

”جوان جہان لڑکی کی ذمہ داری۔“

”کیسی ذمہ داری۔ گوہر بی بی تو نہیں ہے۔“

”یہی تو سب سے بڑی بات ہے۔“

”کیسے؟“

”لگتا ہے تم لوگوں نے ان دونوں کو بڑی آزادی دے رکھی ہے۔“

”کیسی آزادی؟“

”دیکھو آٹھ بھانجی! ذہن صاف ہی ہے۔ کل کلاں کوئی گزیر ہو گئی تو صفیہ آ پا اور عاصم بھائی تم سے باز پرس کریں گے۔“

”بھانجی!“ ساری بات آٹھ کی سمجھ میں آ گئی۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”آپ نے کئی ہلکی بات کہہ دی۔“

"میں شیر کے کرتوت اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔"

"کیسے کرتوت..... شیر جیسے بیٹے پر آپ کو فخر ہونا چاہیے تھا۔ مگر آپ سوتیلی ماں ہی ہیں نا..... مگر ایک بات یاد رکھیے آپ کی ایسی باتیں شاہنواز بھائی کا دل میلا کر سکتی ہیں شیر کی طرف سے دلنواز کا نہیں۔ وہ ہر بات کو اپنی عقل سے سوچتے اور دل سے پرکھتے ہیں۔ گوہر اور شیر کے متعلق ایسی بات کہنے سے پہلے آپ کو سوچنا چاہئے تھا۔ یہ آپ کو گھر ہے آپ یہاں ہزار بار آئیں۔ لیکن آنکھوں سے دیکھ کر میرے ساتھ مت کریں۔"

"اوہ بھئی تم تو فخر ہو گئیں میں نے تو ایسے ہی ایک ہاتھ کہہ دی تھی۔ شیر تمہیں مبارک رہے۔ بھائی کا بیٹا بھی تو پیارا ہی ہوتا ہے۔ ابھی بچھلے دنوں دلنواز شاہنواز سے لڑ بھگڑ کے نئی گاڑی شوروم سے نکلوا لائے تھے شیر کی خاطر ہوسٹل کے اخراجات پورے دو سال کے ادا کر دیے ہیں شاہنواز نے..... مجھے تو خوش ہوئی ہے۔ کسی قابل ہو جانے کا تو ہم سب مل کر گوہر کو دلہن بنا کر لے آئیں گے۔ میں تو بس اتنی بات کہہ رہی تھی کہ لڑکا لڑکی کے ازادانہ میل جول پر لوگ ہاتھ نہ بٹائیں۔"

"کوئی باتیں نہیں بناتا۔ میں حیران ہوں آپ اتنے سال غیر مالک میں گزار کے آنے پر بھی ایسی تنگ نظری کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ بھائی کل اور آج میں بہت فرق ہے۔ میں آج کے نو جوانوں کو زیادہ باشعور سمجھتی ہوں۔ انہیں اتنے برے کی تیز شاہد ہم سے بھی زیادہ ہے۔ اچھائی اور برائی تنگی اور بدمی کا واضح تصور ان کے سامنے ہے اور شیر میں تو عام لڑکوں والی کوئی بات ہی نہیں۔ اس کی اٹلیلی شیر اس کا دائرہ کار وہ نہیں جو آپ سمجھتی ہیں۔"

"اے تو میں نے کب شیر کو غلط کہا ہے۔"

"وہ کھپا گئیں..... تمہوڑی دیر پہننے کی کئی بات سے بھی انکر گئیں۔"

"آپ نے جو کچھ دیکھا اور سمجھا وہ سب غلط تھا۔ بھائی صاحب کے دل میں ابھی تک شیر کی طرف سے سل ہے۔ اتنے مہنگوں سے وہ شیر سے ملے تک نہیں۔ دلنواز کہہ رہے تھے۔ شیر کے لیے گاڑی خریدتے ہوئے بھائی ہاں ان پر احسان کر رہے تھے۔ گویا بھیک دے رہے ہوں۔ کیا ان کے دل میں خدا کا خوف نہیں ہے۔ وہ اسے عروم کر کے کر گیا تو اب کتنا چاہتے ہیں۔" آنکھوں سے آنسو گھسٹا گیا۔ انہوں نے دل کی بھڑاس نکال دی تھی چاہی تاکہ آئندہ سعیدہ تنیم کو ایسی کسی بات کہنے کی ہمت نہ ہو۔ ماحول رنج سا ہو گیا تھا۔ وہ زیادہ وہاں نہ رکھ سکے۔ اپنے کمرے میں چلی آئیں۔ دلنواز کا تکیہ گو گو میں بھر کر اس کے کمرے میں بے جا رہے تھے۔

"نی وی دیکھتے دیکھتے ہوگی۔"

آنسو اپنے شوہر کو غور سے دیکھنے لگیں۔ بچوں کے لیے ان کے دل میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ساغر اور ہار سے بھی وہ اتنی ہی پیار کرتے تھے مگر عاتق چوٹی تھی سب سے اور پھر پیارنی سی بیٹی بھی تھی جو بہت لاڈلی تھی۔ ہاں ان کے پیچھے چلی آئیں۔ کتنے پیار سے وہ عاتق کو کھیل میں چھپا رہے تھے۔

"یاد دیکھ رہی ہو؟"

"کون نہیں..... سوچ رہی تھی جو بچے باپ کے پیار سے آشناء ہوں..... کتنے بد نصیب ہوتے ہیں..... دل! پاسار سے باپ ماؤں کے مر جانے پر ایسے ہو جاتے ہیں۔ جیسے شاہنواز ہو گئے ہیں۔" ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"وہ مرد نہیں ہوتے..... انسان بھی نہیں ہوتے..... جو محبت کے رشتوں کو پلٹا میں بھولتا جاتے ہیں۔ میں انہیں مجذب نہ ان سمجھتا ہوں۔ ویسے تم اس قدر افسردہ کیوں ہو اچھی بھلی سعیدہ بھائی کے پاس گئی تھیں۔"

اپنے کمرے میں آ کر دلنواز کو ساری بات بتا دی۔ آنسو نے۔ وہ جانے کیا سوچتے رہ گئے۔

"باپ کے دل سے بے دخل کرنے کے بعد بھی انہیں جین نہیں آیا۔ میں بات کر دوں گا بھائی جان سے۔ شیر کو وہ اس کے حال پر چھوڑ دیں اور اپنی تنیم کی زبان بند رکھیں۔ نہیں تو میں انہیں اس گھر میں آنے سے ہی روکوں گا۔"

"نہیں دلنواز! کسی کو مدد منانے سے تو نہیں روکا جاسکتا بہر حال انہیں اتنی جرات نہیں ہونی چاہیے۔"

"چھوڑو اس بات کو نہیں سب سنبھال لوں گا۔"

"اب دیکھیے گا..... ایک دو دنوں میں عاصم بھائی کے کان بھر دیے جائیں گے وہ دو روزے آئیں گے۔ بیٹن کو نے جانے کے لیے۔"

"نہیں نہیں اب وہ ان کی چالوں کو سمجھ گئے ہیں ایسے بچے بھی نہیں ہیں کہ روز روز بہکاوے میں آتے رہیں گے۔ میں نے آپ سے کہا تھا۔ بلکہ میں کل ہی بات کر دوں گا ان سے اور اب چاہے کچھ ہو شیر کو ہوسٹل میں بھی نہیں رہنے دوں گا۔ اپنے گھر میں ہی رکھوں گا۔ آئندہ..... ہمارے پورا خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ ایک کیا اس شیر میں کا بوجھ میں اٹھا سکتا ہوں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ وہ خود کسی کا زیر بار احسان نہ کہے۔ میں کل ہی بھائی جان سے کتنی بات کرتا ہوں..... اور پھیلے تو صرف ہوسٹل اور تنیم کے اخراجات ان سے ادا کرائے تھے۔ اب ایک معقول رقم بھی ہر ماہ شیر کو دلواؤں گا۔ دیکھوں گا کہ سعیدہ تنیم کیسے شیر کے حقوق غضب کرتی ہیں۔"

"آپ نے بھی حد کی..... تنگی کی جگہ نکاح کر دیا ہوتا۔ ان کے منہ خود بہ خود بند ہو جاتے۔"

"جانتی ہوں ہمارے اس ہندو مذہب سے متاثر معاشرے میں نکاح کو نہیں رخصتی کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ہاتوں کا کیا ہے وہ پھر بھی بنتی رہتیں..... آئندہ آپس کے رابطے اور تائید سے مضبوط ہوں تو دونوں میں فرق نہیں آسکتا۔ عاصم بھائی نے گوہر کو میرے گھر بھیجا ہے اس کی مکمل ذمہ داری مجھ پر ڈال کر ہی۔ اب وہ آسانی سے ان کی باتوں میں نہیں آئیں گے اور اگر اب کوئی ایسی ویسی بات ہوئی نا تو میں کسی کو مطلع کیے بغیر ان دونوں کے اس رشتے کو مضبوط ترین کر دوں گا۔" انہوں نے حرف آخر کہہ دیا۔

صبح شیر اسے لینے نہیں آیا۔ تیار ہو کر وہ کئی بار پورچ میں اسے یا اس کی گاڑی کو دیکھ آئی۔ آرام وغیرہ بھی ابھی سو رہی تھیں۔ دلنواز تیار ہو کے دفتر جا رہے تھے۔

"ارے گوہر بیٹی تم..... شیر نہیں آیا نا۔"

"جی نہیں....."

"آئی ایم سوری مجھے بتانا یاد ہی نہیں رہا۔ وہ تو کل کا عباس مگر چلا گیا ہے۔"

"عباس مگر....."

"ہاں۔ عدلی کی مگر اور ڈیڑی نے بلوایا تھا اسے۔ عدلی کی بیوی، لیکن لندن میں رہتی ہیں..... ان کا سیریس قسم کا ایک سیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ سارے گھر والے ادھر جا رہے ہیں۔ شیر انہیں کراچی تک چھوڑنے جائے گا واپس آنے میں اسے وہ چار دن لگ جائیں گے۔"

"سدرہ آیا گا ایک سیڈنٹ سوئیڈ..... ماموں آپ کو کیسے خبر ہوئی۔"

"بھئی رات کو شیر کا فون آیا تھا۔ بارہ بجے کے قریب۔ اسی نے بتایا ہے..... بہت پریشان تھا ان سب کی وجہ سے میں نے زیادہ بات نہیں کی۔ میں ابھی ڈراما ٹیور کو بھجواتا ہوں۔ تمہیں چھوڑ دے گا۔"

"جی....." وہ سوالیہ انداز میں بولی۔ شاید یہ پہلا دن تھا جب اسے یونیورسٹی تنہا جانا تھا اور پورا دن تنہا گزارنا تھا۔

"جینی؟ شبیر تم سے پہلے یونیورسٹی چھوڑ دے گا۔ خود اعتمادی پیدا کرو۔ اس کے بغیر چلنا بھی سیکھو..... ایمر ہنسٹی طور پر۔" وہ مسکرائے۔

"اوکے ناموں جان....." وہ بھی مسکرا دی۔

ماہی بلار ہی تھیں۔ وہ تاشٹے کی میز پر آگئی۔ چچی اماں سعیدہ و عظیم آمنہ خاتون بیٹیوں و ہیں موجود تھیں۔

"سعیدہ ماہی! ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ اتنی دور سے آئی ہو۔ کچھ دن رہ لوگی تو کیا بگڑ جائے گا۔"

"نہیں چچی! ابھی تو کاظم کے ہاں بھی جانا ہے۔ ان کی بیوی شکوہ کرتی ہیں کہ صنیہ تو تنہا ہیں۔ تبھی زیادہ تعلق داری ہے۔ مجھے غیر جھگڑتی ہیں آپ..... بے چاری بے حد عزت کرتی ہیں۔ پچھلے دنوں کتنے چاؤ سے دعوت دے کر آئی تھیں۔ جب بھی صنیہ آپ کے ہاں آتی ہیں میرے گھر کا چکر ضرور لگاتی ہیں۔"

"چلو۔ تم نے اتنا تو کیا کہ بچوں کو لے کر آگئیں۔ شاہنواز تو لاہور آ کر بھی ادھر کا رخ نہیں کرتے۔"

"چچی لاہور تو لیبر کورٹ میں آئے تھے۔ چچی پر حاضر ہو کر لوٹ گئے۔ کوئی ایک روگ ہو تو..... بات کئی دور جاتی ہے۔ شبیر تو یہاں آ گیا۔ کئی مسئلے ان کی جان کو چمٹ گئے۔ دنواڑ ہیں تو اپنی نوکری میں مست۔ انہیں مل کے ساتھ ساتھ زمینوں کا نظام بھی سنبھالنا پڑتا ہے۔ سکندر پور والوں سے دشمنی اس نے مول لی۔ خواہ خواہ کا نشانہ یہ بن گئے ہیں۔ امین واسطی نے بھگیس ایئر رقبے پر قبضہ کر لیا ہے۔ دن رات اسی مسئلے میں الجھے رہتے ہیں۔ سنا ہے وہ بہت بد معاش اور چال باز آدمی ہے۔ انہیں زرعی معاملات اور زرعی قانون کا کچھ جانتے ہیں۔ وہ بھگیس ایئر زمین بڑپ کرنا چاہتا ہے جو پورے دن لاکھ کما ہے۔ چھیڑ چھاڑ کی شبیر نے۔ زمین گئی سب کی۔"

"اے جی! جس بات کی خبر نہ ہو اسے اتنے اعتماد سے نہ کہا کرو۔ زمین کا یہ جھگڑا تو بہت پرانا ہے۔ تمہارے سر جنت مکانی کے وقت کا۔ وہ لوگ تو اس زمین کی خاطر مرنے مارنے پر تیار ہیں۔"

"ہاں ہاں۔ ابھی ایک ہفتہ ہوا۔ ہمارے دو حرارے زخمی ہو گئے۔ ان کے نوکروں نے فائرنگ کی تھی۔" وہ جلدی سے بولیں۔ گوہر چونک گئی اور غور سے ان کی باتیں سننے لگی۔

"پھر پورٹ کرائی یعنی صاحب نے؟" آمنہ نے پوچھا۔

"ان لوگوں نے دفعہ ۱۰ کا مقدمہ درج کر کے سب کو حوالات میں بند کر دیا۔ اب سب ضمانت پر رہا ہوئے ہیں۔ اصل میں امین واسطی کا کاروبار ہی یہی ہے۔ یعنی دن رات زمینوں پر رہتا۔ ان ہی معاملات میں حصہ لینا۔ شاہنواز زمینوں وہاں جانیے پاتے اور آپ جانیے آنگھ او جمل پیمار او جمل۔"

گوہر باہر آگئی۔ ذرا نیورولناز کو چھوڑ آیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

"ہیلو مس گوہر....." دور سے کسی نے صدادی۔ وہ بے اختیار رک گئی۔ اس سے تھوڑے سے فاصلے پر کوئی ہاتھ بلا رہا تھا۔ تیزی سے اس کی طرف آتا۔ اس نے پہچان لیا۔ وہ مامون واسطی تھا۔

"ہیلو..... کبھی ہیں۔" اس نے گرم جوشی کے ساتھ اس کا ہاں پوچھا۔ گوہر کی سانسیں رک کر گویا بحال ہوئیں۔

"اچھی ہوں۔"

"بڑے دنوں سے آپ کہیں ملی ہی نہیں۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ "یہ آپ ایک ہم باہنسی لگا ہوں سے کیوں

پہر رہتی ہیں۔ کیا آج بھی نہیں پہچانا۔"

"نہیں..... نہیں اب تو پہچانتی ہوں آپ کو۔ آپ مامون واسطی ہیں۔"

"شکر خدا کا اور نہ میں تو سمجھا تھا کہ....." وہ ہنس دیا۔

"کل بھیا مجھ سے ملنے آئے تھے۔ اپنی بے وقوفی پر مجھے سخت غصہ آیا۔ کم از کم آپ کا ایڈریس تو میں نے پوچھ لیا ہوتا۔ آپ کے بارے میں انہیں بتایا تو حیران رہ گئے۔ انہیں یقین ہی نہ آیا کہ آپ اس شہر میں ہوں گی۔"

"کیوں۔ کیا یہ شبیر بہت ہی خاص لوگوں کا ہے....."

"ارے ذرا۔ میرے کہنے کا مطلب تھا کہ انہیں آپ کے دوبارہ ملنے کی کوئی امید ہی نہیں تھی۔ وہ پھر آئیں گے صرف آپ کی خاطر..... شاید نیلما بھی ان کے ساتھ آئے مس گوہر؟ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کس شعبے سے متعلق ہیں۔"

"اردو ڈپارٹمنٹ۔"

"اوو۔ آئی سی۔ مگر آئیف بات ہوں آپ سے....." وہ رک رک کر بولا۔

"آپ کے ساتھ ایک دن پوٹیکل سائنس ڈپارٹمنٹ کے کچھ لڑکے تھے۔"

"جی کب.....؟"

"آپ ان کے ساتھ گیسٹ پرکھڑی تھیں۔ میرے کچھ دوست ساتھ تھے۔ ورنہ آپ سے ملتا۔ کون لوگ تھے....."

"نہیں یاد نہیں....."

"کمال ہے۔ شاید آپ ہر بات بہت جلد بھول جاتی ہیں۔ لیکن مجھے وہ اچھی طرح یاد ہیں۔"

"جی....."

"جی ہاں۔ وہ ہمارے علاقے کے ہی لوگ ہیں۔ وہ لڑکا تو بہت تیز ہے بہت چالاک۔ آپ اسے کیسے جانتی ہیں؟"

"کون سا لڑکا؟"

"شبیر شاہنواز عسکری۔"

"آپ اسے جانتے ہیں؟"

"اپنے دشمنوں کی پہچان مردوں کو ہر دم رہتی ہے۔"

"جانی رہتی....."

"آپ..... آپ....."

"مس گوہر پلیز..... آپ کو حکم تو نہیں دے سکتا کہ ہارون واسطی کا چھوٹا بھائی ہوں۔ لیکن بنا دینا چاہتا ہوں کہ آپ اس لڑکے سے دور رہیں۔"

"ہیں..... میں اس سے کیسے نہیں ملوں گی۔ یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"یہ ہونا چاہیے اور اس لیے کہ آپ میرے بھائی ڈاکٹر ہارون واسطی کی پسند ہیں۔ ان کا انتخاب ہے۔ چند دنوں میں ان سے مل سوب ہوں گی اور چند دن بعد ان کی بہن..... اور مامون واسطی یہ برواٹھ نہیں کر سکتا کہ اس



تم نہ کریں اور ہاں سکندر پور والے کسی طاقت کے مالک ہیں تو انہیں یہ طاقت ٹیک کاموں میں استعمال کرنا چاہیے۔ زاہد چلتی لڑکیوں کو روک کر ان پر دہنوں جھا کر نہیں۔

وہ آگے بڑھ گئی۔ ماموں واسطی کا خون کھول کر رہ گیا۔ اسے اس انداز میں کبھی کسی نے ذیل نہ کیا تھا۔ وہ باہر خود بیک و وجہہ جوان تھا امیر خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کے ارادے گرد جانے لگی لڑکیاں پھر کرتی تھیں۔ ان کی شائیں مختلف لڑکیوں کی ہمراہی میں تفریح کرتی گزرتی تھیں۔ وہ گوہر جیسی لڑکیوں کو منٹ میں سیدھا لڑنے کے لڑ بھی جانتا تھا۔ وہ طاقت کے استعمال کو ہبٹ نخر خیال کرتا تھا۔ لیکن یہ لڑکی جو اس سے چند قدم لے ٹاٹھے پر گردن اونچی کیے غصے سے کھوٹی چلی جا رہی تھی یہ لڑکی اس کے لیے عام لڑکی نہیں تھی۔ اس کا ذہن اسے اپنی بھائی تسلیم کر چکا تھا اور ان کے خاندان میں اور جو کچھ تھا اپنی عزتوں کی حفاظت جان دے کر بھی کی جاتی تھی۔ گوہر کے انداز کا طلب پر اسے بہت غصہ آتا تھا۔ لیکن جلد ہی وہ ڈائل ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر بارون کی پسند نے نازا شاکر شادیدہ بھائی ہونے کا حق ادا کرنا چاہتا تھا۔

"ہیلو ماموں واسطی.....!" شازیدہ رحمان سامنے کھڑی مسکراتی تھی۔

"ہیلو کبھی ہو شازیدہ؟"

"نائن.....! آپ سنا ہے ماموں واسطی آپ یہاں کس سلسلے میں؟" اس نے دور جاتی گوہر کو دیکھا۔

"ہنگ..... کچھ نہیں۔ بس یوٹی لکڑا تھا۔"

"ماموں واسطی!..... بات صرف وہی چھیننی چاہیے جو چھپ سکتی ہو۔"

"تھیں اس سے کیا؟"

"بڑے ماکڑ ہو رہے ہو..... اتنا عرض کروں کہ اس چٹان سے سر پھوڑو گے تو ٹوٹ جاؤ گے۔"

"کس چٹان سے..... میں سمجھا نہیں۔"

"وہ جو سامنے جا رہی ہے۔"

"شازیدہ رحمان! غلط مت سوچو..... شی ازلائیک اے سسر۔ رین (وہ میری بہن کی طرح ہے)۔"

"اچھا..... تم ان رشتوں کو بھی مانتے ہو۔ اس کی خبر آت ہوئی۔"

"ہر انسان ایسے رشتوں سے آگاہ ہوتا ہے۔"

"لیکن ماموں تمہارے لیے پرائیم تو پھر بھی ہوگا..... شاید جگہ یقیناً شبیر عسکری یہ بھی برداشت نہیں کرے گا کہ تم اس کی منگیت کو بہن سمجھ کر ہی اس سے دوہا ہوا کرو۔"

"منگیت..... شبیر عسکری..... یہ کیا بکواس ہے شازیدہ.....؟"

"ہاں ہاں ماموں واسطی صاحب! یہ بات تو یونیورسٹی کے کئی لوگ جانتے ہیں۔ وہ اس کی فرسٹ کزن ہے ساتھ ہی منگیت بھی۔ تم نے گوہر کے ہاتھ میں انگوٹھی ضرور دیکھی ہوگی۔"

"نہیں..... نہیں..... یہ جھوٹ ہے۔"

"جھوٹ سچ معلوم کرنا ہی ہے تو چند قدم کا فاصلہ ہے خود پوچھ لو تا اس سے۔"

ماموں واسطی نے گوہر کی طرف دیکھا جو برا آدھے کی پٹی میز جی پر قدم رکھ رہی تھی۔ وہ بے اختیار اس کے پیچھے بھاگا۔

"مس گوہر!..... مس گوہر!.....!"

کے بھائی کی ہونے والی بیوی سکندر پور کی غیرت کو کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھ لے۔ آپ اس سے کہہ دیں۔ آپ نہیں کہیں گی تو میں..... مجھے بات کرنا اچھی طرح آتا ہے۔ میں اسے کہہ دوں گا۔

گوہر اسے دیکھتی رہ گئی۔ چکا بکاسی۔

"آپ کو میری ذاتی زندگی میں مداخلت ہونے کی ہرگز اجازت نہیں ماموں واسطی۔ اور آپ نے مجھے اپنے بھائی سے منسوب کیسے کر دیا۔"

"یہ میرا نہیں میرے بھائی کا فیصلہ ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ مجھے آپ کی ہر حالت میں حفاظت کرنی ہے۔ خاص طور پر اپنے اس دیرینہ مخالف خاندان کے اس لڑکے شبیر شاکر شادیدہ عسکری سے۔"

ان کا لہجہ فیصلہ کن تھا اور گوہر اس کا منہ تک رہی تھی۔

.....

"مسز ماموں واسطی! آپ کو میرے بارے میں کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنا اچھا برا میں خود جانتی ہوں۔ میری حفاظت آپ کا فرض نہیں جس کی ذمہ داری ہے اس کے باہر بھی خاصے مضبوط ہیں۔ اتفاقاً آپ کے ہتھے چڑھ جانے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ علم بھر کے لیے میرا خلیک لے لیں اور وہ ڈاکٹر بارون واسطی..... انہیں کس نے حق دیا ہے از خود ایسا فیصلہ کرنے کا۔ آئندہ یونیورسٹی کے احاطے میں مجھ سے بات کرنے کی جرات نہ کیجیے گا۔ آپ کو خبر ہوئی چاہیے کہ میں ایسی بے تکلفی..... کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ نہ تو لان کی کسی روش پر کھڑے ہو کر کسی لڑکے سے کوئی بات کر سکتی ہوں۔ کتنی زبردستی رہنے کے بعد وہ پھینکا پڑی۔"

ماموں واسطی جو پچھلے پہلے خوشگوار انداز میں اس سے بات کر رہا تھا پھر جتن جتانے پر آتا تھا..... اب اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں غصہ اتر آیا..... خون سا چھلکنے لگا۔

"آپ جانتی ہیں۔ آپ نے کتنے گھٹنے ہمارے گھر میں گزارے ہیں.....؟ اگر ہم....."

"جانتی ہوں مگر وہ ایک مجبوری تھی۔ میں نے جان بوجھ کر آپ کے گھر میں قدم نہیں رکھا تھا۔"

"آپ کو بھیا ایک مقدس امانت کے طور پر گھرائے تھے۔"

"یہ انسانیت کا تقاضا ہے کہ دوسروں کی عزت کو امانت سمجھا جائے۔"

"شاید آپ کو خبر نہیں سکندر پور کے باقی بڑی طاقت کے مالک ہیں..... ہم لوگ چاہیں تو علاقے کی مسیروں لڑکیوں سے ہر دم ہمارا گھر خراب ہے۔ آپ ہماری شرافت کا یہ صلہ تو نہ دیں۔"

"کیسا صلہ.....؟ آپ نے اور آپ کے بھینانے بھری برسات میں مجھے اسی راستے پر پڑا رہنے دیا ہونا۔ نہ اٹھاتے..... تاکہ احسان کا یہ بھاری بوجھ مجھ پر نہ لدا ہوتا۔"

"احسان کی تو کوئی بات نہیں محترمہ گوہر صاحبہ..... بات تو معیار کی ہے۔ آپ کو خبر نہیں بارون بھیا بہت فقیر انسان ہیں بہت اچھے....."

"مسز ماموں واسطی.....!" وہ تھوڑی سی نرم پڑ گئی۔ یہ نئی بھی ایک خونخوار تھی۔ ماموں واسطی نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"اگر آپ کے نفس سے بھائی ڈاکٹر بارون واسطی کو ہر روز ہی ایک لڑکی اسکا بے کسی کے عالم میں ملتی رہے تو کیا وہ سب کو اپنے لیے چن لیں گے؟ پھر آپ انہیں کہہ دیجیے گا۔ میری نظروں میں ان کا جو مقام ہے وہ اسے





وہ اور سرد سے ہے نیاز پکارے چلا جا رہا تھا۔

گو ہر رنگ گئی..... وہ قریب آیا۔

"آپ میرے پیچھے چلے آئے ہیں۔ فارگناڈ سیک میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ آپ کے ایک احسان کے بدلے میں آپ کو....."

"نہیں نہیں! میں اس لیے نہیں آیا۔ میں تو آپ سے پوچھنے آیا تھا کہ....."

"کیا پوچھتا ہے آپ کو.....؟"

"کیا آپ شہر عسکری کی منگتیر ہیں؟"

"جی ہاں..... اور ان کی پچھتھی زون بھی..... اور سچ پوچھنا چاہیں تو....."

"اف میرے خدا! میں کیا سن رہا ہوں..... تم..... تم..... سر عبداللہ کی نوادی ہو۔ شاہناز عسکری کی بھانجی....."

اور میرے بلکہ میرے خاندان کے دشمن کی ہونے والی بیوی۔"

"جی ہاں۔ اور ان سارے حقائق پر مجھے فخر ہے۔" وہ کندھے جھک کر آئے بڑھتی۔ مامون واسطی کتنی دور اسے جاتا دیکھا رہا۔

☆☆☆☆☆☆

بارانی سرمائی شام اپنے جوتین پر تھی۔ واسطی ہاؤس کے بڑے سارے صدر بردارے پر ڈانس پاروں واسطی کے سرخ بھیر دکھڑی تھی۔ گھر کے سنانے میں ان کی شوخی خبری آواز بہاروں کا پیغام بن کر انجمن تو نیلما اپنے کمرے سے باہر نکلی..... اور کورڈور سے گزرتے بھائی سے لپٹ گئی۔

"بھیا..... پیارے بھائی!..... کب آئے؟"

"میرا خیال ہے ابھی ابھی آیا ہوں۔ شاید گاڑی سے ٹپتے ہی اندر داخل ہوا ہوں۔"

"اسنے دن کیوں لگا دیے....."

"ایک دم پاگل ہو تم نکلی۔ بھتی ایک عدد ہاسپتال کے لیے جگہ کا انتخاب ہی اتنا بڑا مسئلہ تھا..... کہ اب تک حل نہ ہو پاتا۔ شکر کرو کہ میں نے جگہ بھی لے لی ہے اور عذرت کا سنگ بنیاد رکھی چاہتا ہے۔ نکلی..... نکلی بیاری تو بہت خوش ہوئی یہ سن کر کہ میں نے اپنے لیے وہیں پر ایک گھر بھی لے لیا ہے۔"

"گھر.....؟" نیلما نے حیران ہو کر ان کا منہ دیکھا۔

"ہاں ہاں بھتی..... آخر تیرے بھیا کو رات کہیں بسر کرنا ہوگی۔ دو چار کھٹے آرام گھر بنا ہوں گا۔"

"تو وہ کون سا مشکل بات ہے ہاسپتال میں ایک کمرے کو بیڈروم بھی بنایا جاسکتا ہے۔" نیلما نے لا پر ہائی بکھائی۔

"نو..... نیور..... گھر تو غیبت دہانا پڑے گا۔"

"کیوں؟"

"نیوں کی کیا بات ہے۔ گھر بنا نا ہی پڑتا ہے اپنے لیے۔"

"جی نہیں آپ اپنے لیے نہیں۔ ہزاری بھائی جان کے لیے یہ سب پوچھ کر ہے ہیں۔"

"لا حول ولا.....! ہارون واسطی دل کی بات نکل جانے پر پشیمانے۔"

"مامون بھائی کا خط آچکا ہے جناب میرے پاس۔ تم لوگ دو چار روز میں لاہور جا رہے ہیں اور جاتے ہی

بٹ منگنی کروں گے۔"  
"کس کی منگنی.....؟"

"اوہ ہونے بھونے بن رہے ہیں آپ..... آپ کی منگنی اب کس کی....."

"منگنی..... میری..... کس کے ساتھ اور میری منگنی کالا ہو یا مامون سے کیا تعلق ہے؟"

"بہت گہرا تعلق....." نیلما نے آنکھیں بند کیں پھر کھولیں۔

"مثلاً کیا۔ دس اڑاے ٹیکٹ کہ آپ کی گوہر صاحبہ لاہور میں رہتی ہیں۔ مامون بھائی کے ساتھ پڑھتی ہیں۔

۔ مامون بھائی سے مل چکے ہیں اور ہم لوگوں کے پہنچنے پر ان کے گھر جایا جائے گا۔ خود وہ تو کیا ان کے والدین بھی

نہرے ہانگے جیلے بھیا کو، کچھ کر دل ہار بیٹھیں گے۔ شادی کے لیے رضامند ہو جائیں گے اور یوں ایک بہت ہی

بیاری ہی لڑکی میری بھائی بن کر اس گھر میں آجرا جان ہوگی۔ مجھ سے لڑے گی۔ رلائے گی۔ ہو سکتا تو....."

"نکلی..... نکلی..... یہ سب کیا ہے۔ ابھی کچھ تو ترس کھاؤ اپنی زبان نرم و نازک پر۔ ہاں ماں جی کہاں ہیں اور

!اجان؟"

"اپنے اپنے کمروں میں ہیں۔ آج تو سردی ضرورت سے بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ جانے کیا ہوگا۔ چاروں اور

باروں ہی بادل ہیں۔ ارے آپ کا کمرہ تو انتخابی سرد ہوگا۔ میں جا کر بیٹھ جاتی ہوں۔ آپ..... آپ ماں جی سے

پہلے۔ لاپتے بریفٹ کس مجھے دیجیے۔ میں آپ کا بیڈروم کھولنے دیتی ہوں۔" نیلما بریفٹ کس ہاتھ میں سے لے کر

ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ دائیں طرف کے ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ تو یہ کچھ حیران رہ گئے کہ مامون واسطی اور ماں جی بیٹھے

باتیں کر رہے ہیں۔

"ارے مامون.....! تم کس وقت آئے.....! خیرت ہے۔ نکلی نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ تم آئے ہو۔"

"اسے معلوم ہی نہیں آپ کو کیسے بتاتی۔ آپ کب آئے بھیا۔" وہ ان سے لپٹ گیا۔

"ابھی ابھی..... بس نکلی سے مل کر ماں جی کی طرف آ گیا۔"

"آداب ماں جی!"

وہ ماں کے قریب بیٹھے تو انہوں نے ان کے سر پر پیار بھرا ہاتھ رکھا۔

"کیسے ہو بیٹے..... اتنے دنوں سے تمہاری ماہود کچھ رہی ہیں۔ خط ہی لکھ دیتے اگر فرصت نہ تھی۔ کسی لوگر کے

ہاتھ خیریت کی اطلاع بھیجو اپنے۔ کتنے ٹھوکر ہو تم ہارون..... ماں کا تمہیں کوئی خیال نہیں کیوں پریشان کرتے

ہو ماں کو کیوں دکھ دیتے ہو۔"

"ماں جی..... ہارون واسطی نے ان کی آنکھیں میں سر رکھ دیا۔"

"نہیں ماں جی..... میں تو بھول کر بھی دکھانے کی نہیں سوچ سکتا۔ یقین کریں۔ بے حد مصروف رہا۔ آج ہی

اراسی فرصت ملی اور بھگا آیا۔"

"میں نے تمہاری جدائی کا پیمانہ ڈکھانا ہے ہارون.....! تم ایک طویل مدت باہر گزار کر آئے ہو۔ اب تم سے ایک

بک جدار بننے کو جی نہیں چاہتا۔"

وہ ماں جی آپ بس دعا کریں کہ میرا مشن مکمل ہو جائے۔ میں نے جو سوچ رکھا ہے اس کو عملی جامہ پہنا سکوں.....

اس جی! اسی ذات کے لیے ہر کوئی زحمتی گزارتا ہے۔" نیا آپ کو خوشی نہیں کہ آپ کا بیٹا! اجتماع کے لیے زحمتی

گزارنا چاہتا ہے۔“

”کیوں نہیں ہے خوشی..... پر میں ماں ہوں ہارون! میرے حقوق کا خیال رکھنا تمہارا اولین فرض ہے۔“  
 ”تو ٹھیک ہے۔ آگیا ہوں آپ کے پاس۔ ہاسپٹل کی تعمیر میں رکھی رہے میں آپ سے اجازت نہیں لوں  
 جانے کی۔ سو فیکلڈ آپ خود کہہ دیں۔“ وہ مسکراتے لگیں۔ ہارون نے ہنرے تیزوں سے انکس دیکھا۔

”ہاسپٹل..... ہاسپٹل..... ہاسپٹل..... عاجز آ گیا ہوں یہ لفظ سن کر..... بھیا اس دنیا میں بہت سے اہل  
 ہیں درہم بدل رکھنے والے۔ آپ کے بغیر بھی معاشرہ چل رہا ہے۔ آپ کی بھی سرکاری ہاسپٹل میں عمدہ تنخواہ  
 کام کر سکتے ہیں یا اٹلی پیانے پر اپنا کلینک کھول سکتے ہیں۔ لاکھوں روپے ماہانہ کما سکتے ہیں۔ آپ..... آہ  
 غریبوں کا مفت علاج کرنا چاہتے ہیں۔ کیا دین گے یہ غریب لوگ آپ کو..... میں آپ سے کہہ رہا ہوں.....  
 بابا کی ساری جائیداد بھی ایسے عمل کے لیے ناکافی رہے گی۔ سخت نفرت ہے مجھے خلیفہ گندے لوگو  
 سے..... بدلتوق چہرہ سے..... جنہیں اپنی صفائی ستھرائی کی خبر ہی نہیں۔ جو چند روپے صابن پر خرچ کر کے  
 لباس نہیں دھو سکتے۔ آپ کی دوائیں ان کی زندگی نہیں سنواریں گی۔ آپ کو پھر ان کی معاشی زندگی کا بوجھ  
 اٹھانا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے اتنے کیوت سے بھیا تم کو بلغم اور جراثیموں میں گھر کر کہیں کھو جائیں  
 آپ کو ایسا ہاسپٹل بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ کام آپ حکومت پر چھوڑ دیں۔ حکومت نے بھی تو چپے چپے  
 ڈیپنریاں کھول رکھی ہیں جہاں سے مفت علاج کی سہولتیں ان لوگوں کو حاصل ہیں۔ آپ اپنی سوچیں۔ ایک  
 بہت بڑا مسئلہ درپیش ہے ہم سب کو..... اسے حل کریں۔“

”ماموں.....!“ لگتا تھا انہوں نے اپنے بھائی کی کوئی بات سنی ہی نہیں۔ ”یہ تم بے وقت پڑھائی چھوڑ کر  
 کیوں آجاتے ہو۔ ابھی کچھ روز بعد چھٹیاں ہوتیں آجاتے۔ لگتا ہے تمہیں پڑھائی سے کوئی دلچسپی نہیں۔“  
 ”بھئی تو بات ہے۔ آپ نے مجھے ہار میری آدھا کھا ہم سمجھا ہونا تو ضرور پوچھتے۔“

”ہاں ہاں فرمائیے۔ کیوں تشریف لائے آپ۔“ انہیں اب بھی اس کی باتوں کا لال تھا۔  
 ”آپ تو بہت ناراض لگ رہے ہیں جب کہ میں صرف آپ کی جگہ سے یہاں آیا ہوں اور جو بات میرے دل  
 میں ہے وہ سب سے پہلے ابا جان کو بتاؤں گا۔ بھیا..... میں آپ کا بھائی ہوں۔ آپ کے اچھے برے کی فکر  
 سے زیادہ کے ہوگی۔“

”ست بھولو کہ تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔“

”کاش یہ اجماعی ہوتا..... تو اس کی یہ مجال نہ ہوتی۔“

”کس کی مجال؟“

”نہیں نہیں..... کچھ نہیں۔ ماں جی۔ ابا جان کہاں ہیں۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”اپنے کمرے میں ہی ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے آپ ماں جی سے باتیں کریں۔ میں ابھی ان سے مل کر آ رہا ہوں۔“ ماموں وہاں سے اٹھ گیا۔

ہارون واسطی نے اس کی باتوں کو قطعاً غیر اہم سمجھتے ہوئے والد سے ادھر ادھر کی کہنا سنا شروع کر دی۔

”ہارون! ایک بات پوچھنا تھی تم سے۔“

”ضرور پوچھیں ماں جی۔“

”بیٹا.....! جس لڑکی کی تعریف کرتے کرتے یہ دونوں یعنی ماموں اور نینما سرے جا رہے ہیں تم واقعی اس

”کی کو پسند کرتے ہو؟“ کی حسین رنگ لہروں کی صورت ان کے چہرے پر آ کر پل میں گزر گئے۔  
 ”آپ سے کس نے کہا؟“

”مجھے سب پتا ہے ہارون میری جان..... یہ بے جا ہے..... میں ایک جاہل عورت ہی تھی۔ پر ماں تو ہوں  
 میرے پاس تم سے محبت رکھنے والا تم پر غار ہو جانے کی آرزو کرنے والا دل تو ہے۔ میں نے سدا سے سوچ  
 لیا تھا آج بھی اپنی سوچ بر قائم ہوں کہ اپنے چندا کی شادی اسی لڑکی سے کروں گی جسے وہ پسند کرے گا۔ دیکھ  
 ہارون۔ خدا نے کیسی رحمت کی۔ تیرے بابا ہر..... میں کہتے رہے کہ تیری نسبت خاندان کی کسی لڑکی سے ملے کر  
 ہوں۔ لیکن میں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ مجھے خبر ہے یہ کائنات کا ایک بڑا ظلم ہے شادیاں بھین میں ملے نہیں  
 مانی چاہئیں۔ خدا نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ شادی میں لڑکے لڑکی کی مکمل رضامندی ہو..... ہارون.....  
 ہارون..... میں نے جب سنا..... کہ ایک لڑکی تیری برسات میں بے یار و مددگار راہ میں پڑی تھیں لی..... تم  
 اتنا اٹھا کر گھر لے آئے۔ تم نے اسے ایک سندن انڈیا کی طرح چھوٹے اپنے پاس رکھا اور پھر بحفاظت اس  
 لے منزل تک چھوڑ آئے..... تو میرا سرخسر سے بلند ہو گیا کہ میں ایک شریف اور غیرت مند بیٹی کی ماں ہوں۔  
 نے انسانیت کا بڑا پاس ہے۔ یہ جو بیٹی ہاں ہارون یہ جو بیٹی ظلم و ستم کی نا انصافیوں کی حق تلفیوں کی بہت بڑی  
 اتان اپنے اندر دفن کیے ہوئے ہے۔ ان کا ایک ایک چپاں بات کا گواہ ہے۔ یہاں کئی مظلوموں کے آنسو  
 نیا بے کس کی فریاد..... مٹی بے آسرا لڑکیوں کی چیخیں وٹن ہیں۔ مجھے اس گھر سے نفرت ہے ہارون..... پھر بھی  
 ات بھوک میں اس میں رہ کر..... جیتے ہوئے سانس لے رہی ہوں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں خوف زدہ ہوں.....  
 اتان اپنے کیے کی سزا پاتا ہے۔ میں ڈرتی ہوں ہارون..... کہ خدا نہ کرے کہ کیے کی سزا میری بیٹی کو ملے۔“

”ماں جی..... ماں جی۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں! میری سبھی میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔“

”خدا کرے تم سمجھتی نہ سکو۔“ انہوں نے دل میں کہا اور بولیں۔ ”گو ہر بیٹی کے والدین سے بات کر کے  
 اپنے بیٹے کے لیے مانگ لوں۔ چندا تمہارا گھر آ رہا ہوگا۔ لیکن آجانے کی تو میں بھی تمہارے ساتھ رہوں  
 فی۔ تمہاری دنیا میں بے حد خوش و خرم۔“

”ماں جی..... آپ کئی اچھی ہیں ماں جی! آپ کو اپنے بیٹے کا کتنا خیال ہے۔ آپ نے تو تین ماہ گئے مجھے  
 چھوڑ دیا۔ مگر ماں جی آپ کو خبر کیسے ہوئی کہ وہ لاہور میں رہتی ہے.....؟“

”مے ننھے کیسے خبر ہوئی۔ خدا سلامت رکھے تمہارے بھائی کو وہی نکون کر لایا ہے۔ ساری مہموں ات ہی  
 پاس ہیں۔ اور وہی نہیں لے جانے گا۔“ ہارون واسطی ماں کا منہ دیکھتے رو گئے۔

”بیٹا..... آپ تو واقعی بہت زیادہ شکیم ہیں۔“

”ہاں صرف ایک مکمل ماں ہوں اور بس.....“

”ماں جی.....! میں سخت تنگ ہوا ہوں۔ دن نھر کام کرتا رہا ہوں۔ پھر ڈرا بھونگ بھی خود ہی کی ہے۔ اپنے  
 لے میں جا رہا ہوں۔ نہاؤں گا۔ فریضہ بیکر بابا جان سے ملوں گا اور پھر مجھے بھوک بھی نہ بہت لگی ہے۔  
 نا جاننے تیار بھی ہے یا نہیں۔“

”میں خود جا کر پھاگتی ہوں۔“

”نہیں نہیں! بہت ساری ہے ماں جی۔ آپ آرام کریں۔ وہ اتنی اچھی ہی لڑکی ہے جو اب..... اسے آپ سے  
 زیادہ میرا خیال رہتا ہے۔ سب سنبھال لے گی۔ دچھاس چڑا ہوں۔“ وہ کمرے سے نکل آئے۔

جس طرح اچانک وہ گیا تھا۔ ایک دوپہر اچانک ہی لوٹ آیا۔ سخت پریشان تھا۔ ہوشل پہنچے ہی برقیہ کسر الماری میں پھینکتے ہی وہ دلوں کے ہاں چل پڑا۔

"ہیلو شہیر بھائی...!" عاتکہ نے اسے دیکھتے ہی خوشی کا اظہار کیا۔

"ہیلو چھوٹی کزن۔" شہیرا سے چھوٹی کزن کہہ کر پکان تھا۔

"کبھی ہیں بھئی آپ..... اور یہ سب لوگ کس طرف ہیں؟"

"اندر ہیں۔ شہیر بھائی آپ کہاں چلے گئے تھے؟ دادی جان تو آپ کے لپٹا اس ہو گئیں۔ اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہیں کھانا بھی وہیں منگوائی ہیں۔"

"چندا اوہ میری وجہ سے کمرے میں بند نہیں ہوئیں۔ سردی بہت زیادہ ہے۔ آپ سنائیں آپ نے..... ہیر کتنا یاد کیا عامر سا غرنے کتنا مس کیا۔ چاچو جانی نے کب کب کی محسوس کی۔ چاچو نے کتنی ڈشز میرے لیے چم کر رکھیں اور..... اور....." وہ مسکرایا۔

"اور کیا؟"

"اور آپ کی گوبر بھائی نے ہمارے ہاتھوں سے گزارے"

"وہ..... وہ بھی دادی جان کی طرح کمرے میں بند ہیں۔ انہوں نے ہمارے ساتھ کرکٹ نہیں کھیلی۔ ساغر کو پارٹیز بھی نہیں نہیں بیڈیشن میں..... اور..... اور..... مجھے کسی دن بھی کوئی کہانی نہیں سنانی۔ بہت اداس ہیں شہیر بھائی بہت پریشان۔"

عاتکہ چلتا پھرتا نیکرو فون تھنی گوجر کی ایک ایک بات اسے بتاتی تھی وہ بھی کرید کرید کر پوچھتا اور مزے لیتا تھا۔ لیکن اب دیکھ محسوس کر رہا تھا کہ کم از کم گوبر بھائی کو جانا چاہیے تھا۔

"اب کہاں ہیں آپ کی گوبر بھائی؟"

"یونیورسٹی گئی ہیں انہی آجائیں گی۔ آپ اندر چلے نا مٹی لیکن میں ہیں بڑے اچھے اچھے کھانے بن رہے ہیر آج۔ ڈیڑی کے مہمان آرہے ہیں اچھا ہوا آپ بھی آگئے..... شہیر بھائی آپ کو بھی شاہی کھڑے پستہ ہیر نا..... میرا جی چاہتا ہے میں سارے کے سارے کھا جاؤں اپنی نے سارے ہی کھڑے پک کر دیے ہیں۔ مہمان جہاز سے آرہے ہیں ایک دو گھنٹے یہاں رکھیں گے اور ساری چیزیں اپنے ساتھ لے جائیں گے میں آپ کے لیے ایک پورا ایکٹ چھپا لوں گی۔"

"دیکھو گڑیا! میری خاطر چوری جیسا گناہ مت کرنا ہاں تمہارا دل چاہو رہا ہو تو میں باجگ لانا ہوں ایک ایکٹ۔ چاچو تو بہت پیاری بہت اچھی خاتون ہیں وہ یہ سویت ڈش ہمارے لیے بھی بنا سکتی ہیں۔"

"کون بہت پیارا بہت اچھا ہے اور کس کے لیے کیا بنا سکتا ہے۔" آمنت بیگم نے ایک دم اسے مخاطب کیا۔

"ارے..... آپ..... آپ ہی کی تعریفیں ہوتی تھیں بابا! آپ تو سرتاپا تعریف ہی تعریف کے قائل ہیں حسین صورت حسین سیرت ماہر خانہ دار بلند اخلاق اور جانے کیا کیا۔"

"بس۔ بس زیادہ پھیلو نہیں۔ دلوں کے ہوتے ہوئے مجھے دوسرے کسی عاشق نامرادی ضرورت نہیں یہ تعریفیں تم اپنی بہن کی کرنا میرے لیے وہی کافی ہیں اور عرض سے میری بہت زیادہ تعریف کرتے ہیں میری خوبیوں کو تسلیم کرتے ہیں ہاں یہ تم اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے کچھ بتائے بغیر ہی شہیرا آکر چاہے کیا ہو تم۔ چار دن

ان کا کہیں پناہ سکتے چار دن تک کہ نہیں پہنچ سکتے میں نے ہاتھ کر لی ہے بلکہ ہم دونوں نے فیصلہ کر لیا ہے تم نہ ایک دن یونیورسٹی سے غیر حاضر رہنے کی کوشش کی تو تمہارا سوشل بائیکاٹ کیا جائے گا شریف آدمی اس لیے پرتو بنا۔ نیا پورنی زندگی کا وارو مدار ہے۔ کیوں اپنے شاندار تعلیمی کیریئر کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو اپنے آپ پر نہیں تو ہم پرتوس کھاؤ ہمیں تمہاری خاطر کتنے لوگوں سے جنگ کرنا پڑی ہے آج شام دلوں تمہارے ساتھ جائیں گے..... تم اب ہوشل میں نہیں رہو گے یہیں ہماری نظروں کے سامنے رہو گے اسی گھر میں....."

"نکر چاہتی جانی..... میں....."

"کیوں؟ کیوں آخر؟ دو چار دن میں یہ انقلاب کیوں آ گیا؟ مادام! آپ ایک معصوم بندے پرتوس نہائیے۔ کیوں اسے پابند کرنا چاہتی ہیں اس بے چارے غریب آدمی کو گھر راز نہیں آ سکتا ہوشل کا عادی ہے۔ پھر چاہتی..... وہاں زندگی کسی ڈسٹن کے تحت نرتی ہے۔ یہاں۔"

"ماں ہاں یہاں تو انسان جیسے ہی نہیں ڈھور ڈھور رہتے ہیں انہیں ڈسٹن کی کیا خبر۔"

"چاچو! آپ تو فٹا ہونے لگیں۔ کم از کم سفر سے لوٹ کر آنے والے اپنے بھتیجے سے حال احوال تو پوچھا۔"

"چچا! میں نے پہلے تم جاؤ اور اپنا سامان لے آؤ۔ وہ آگے تو کان سے پکڑ کے لے جائیں گے اور میں نہیں جاتی کہ میرے ساتھی بڑے سارے بھتیجے کی یوں محبت مند بے عزتی ہو جائے۔"

"سناسے آج گھر میں بڑے بڑے کھانے پک رہے ہیں۔"

"پاپے کی کوشش مت کرو۔"

"بھئی بھوک لگی ہے سخت قسم کی اور اتنی زبردست خوشبو میں ایمان خراب کر رہی ہیں۔"

"او مسکرانے لگیں۔ آگے آگے چلیں تو وہ بھی ان کے ساتھ کچن میں آگیا ہاتھ دھو کر میز کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھا۔"

"شہیر! تمہیں اتنے دن وہاں لگانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"چاچو! اچھا اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ بہت عزیز ہے اور میں وقت کا ایک پل غلط جگہ پر استعمال نہیں کرتا۔"

"اپنے لیے بیٹا سیکھو شہیر! زمانہ کسی کو کچھ نہیں دیتا۔"

"مجی خود غرضی ہے چاچو پیاری جو معاشرے کو بے حس کے اندھیروں میں دھکیل داتی ہے آپ مجھے سمجھنے کی دہش کریں۔ مجھے حوصلہ دیں۔ مجھے اچھی راہ بچائیں..... کم از کم آپ تو میری لٹی نہ کریں! آپ چاچو پیاری معاشرہ ہمارا منتظر ہے۔ انسانیت کی ہم سے بڑی امیدیں ہیں..... میں..... میں..... انسانیت کی اس فریاد پر اپنے ان ہند نہیں کر سکتا اندھا نہیں بن سکتا مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔"

"دنیا کے یہ قانون بہت پرانے ہو چکے ہیں شہی..... کسی رنگ آلو بقل کی طرح ہیں جسے خود اس کی اپنی چاچی بٹھولنے سے قائم رہتی ہے۔"

"شاید آپ یہ بھی جانتی ہوں..... کہ تیل کا ایک قطرہ اسے کھولنے کے لیے کافی رہتا ہے میں بھی وہی قطرہ بننا

چاہتا ہوں جو رسم و رواج کے سارے مذاہب کو لوٹ لٹھل کھول کر خالق کو آزاد کر دے انسان کو اس کا فرض یا اولاد پہنچ جائے۔ کیا میری بد نہیں کر سکتیں میں یا ہونے والے انکیشن میں کھڑا ہو رہا ہوں۔ میں یونہی سٹی لے پر میسر آنے والے پلیٹ فارم سے اپنی جدوجہد کا آغاز کروں گا بہت سے درد مند بل والے لوگ میری آواز میں اپنی آواز ملا دیں گے۔

میں ہر دم ان لوگوں میں رہنا چاہتا ہوں اور اس لیے میرا ہوشل میں رہنا بہت ضروری ہے۔  
 تم..... انکیشن لڑو گے؟ شیر! تم جانتے ہو لوٹو از اسے وقت کے زیاں کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔

”ہوسکتا ہے میرے خیالات جان کر وہ اسے وقت کا زیاں نہ سمجھیں ایک مشن سمجھیں میرا جہاد خیال کرے چاہیے اس ملک کو قانونیت نے قانون کا لبادہ اوڑھ کر اپنے جان میں قید کر رکھا ہے میں یہاں خدا کے بنا قانون کی بالا ہستی دیکھنا چاہتا ہوں انگریزوں نے ہمارے مرد آہن کے حوصلے اور ہمت سے کھیرا کر ہمیں آزا دیا۔ ہمارے اجسام کے گرد لپٹی زنجیریں تو کٹ گئیں ہمارے دل بھی آزاد ہو گئے لیکن ہمارے دماغ اب غلامی کی زنجیروں سے آزاد نہیں ہو سکے چاہیے..... میں دماغوں کو آزادی کا احساس بخشنا اپنا فرض خیال کرتا ہوں اور اپنی تاعمر جدوجہد کے بعد اگر ایک دوا انسانوں کو بھی ایسی آزادی دلا نے میں کامیاب ہو جاؤں تو اسے جیت سمجھوں گا۔“  
 آمنتیگما سے بکھلتی رہ گئیں۔

”بیٹے! یہ باتیں تم دلخواہ سے ہی کرتا تمہاری باتیں شاید بہت اونچی ہیں اور میں ایک عام سی خاتون ہوں۔“  
 ”اد کے مادام.....“ وہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

☆☆☆☆☆☆

گوہر ایک بڑی الجھن اور پریشانی کا شکار تھی زندگی کبھی کبھی اپنے گزرے لمحوں کا حساب بہت جلد مانگ ہے کسی عمل کے گزر جانے پر ہم سمجھتے ہیں کہ یہ لمحے کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے لیکن بعض لمحے بڑے ظالم ہو جتے ہیں بل سانسے آ کر تڑپاتے ہیں پریشان کرتے ہیں کیا یہ ضروری تھا کہ ماموں واسطی بھی یہیں موجود ہو اسے خوف سا آ رہا تھا یونہی سٹی سے آف ہو جانے پر بھی وہ وہیں موجود تھی لائبریری میں کسی کتاب کی واگردانی کرتے ہوئے اس کا دل دھڑک رہا تھا ہاتھ پیروں میں سنسانت تھی ماموں واسطی کی باتیں اس کا نوں میں گونج رہی تھیں ابھی کچھ دیر نہیں وہ اسے ملا تھا پہلے دن والا ناموں تک ہی نہیں رہا تھا اس کے چہرے پر کھل چھائی تھی آنکھیں خطرناک لگ رہی تھیں۔ بالکل اجنبی..... اور ختم ہی آگئیں۔  
 ”گوہر بیگم!“ اس کے مخاطب کرنے کا انداز ہی ترالا اور انوکھا تھا وہ اس کی آواز پر رک گئی۔  
 ”قبل ازیں میرا پروگرام کچھ اور تھا..... بالکل ویسا جیسا دستور زمانہ ہوتا ہے لیکن اب میرا پروگرام کچھ اور بن گیا اپنی چیزیں بچھوٹی نہیں دیا کرتے۔“  
 ”کیا مطلب؟“

”آپ! بقول آپ کے شیر عسکری کی منگیتر ہیں لیکن میرے خیال میں ہماری امانت ہیں آپ کے ان غیر صورت باتوں میں مہدی رہے گی تو صرف میرے بھیا کے نام کی۔ ورنہ نہیں..... میرا نام ماموں واسطی میں امین واسطی کا بیٹا ہوں سکندر واسطی کا پوتا۔ زمانہ ہمارے خاندان کی تاریخ سے آگے ہے ہم لوگ اپنی غیر

فی حفاظت جان دے کر بھی کرتے ہیں دنیا کا کوئی شخص زیادہ دن ہمارے ارادوں سے بچ کر نہیں جی سکتا باغی کی آواز ہمارے گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں جا سکتی اس وجود کو بھیا کے بازوؤں نے پناہ دی ہے یہ وجود سدا کے لیے ان کا ہونا ہے آپ تیرے جہان میں واحد لڑکی ہیں جن سے وہ محبت کرنے لگے ہیں آپ چاہیں تو بڑی نمان سے سکندر پور میں سکندر پور والوں کی بہو بن کر آ سکتی ہیں آپ نے گزرتی تو ماموں واسطی دھونس مساندنی اور حفاظت تینوں کا استعمال بخوبی جانتا ہے اور آپ کو راہ راست پر لانا اس کے ہاتھ ہاتھ کا کھیل ہے لیے..... کہاں ہے آپ کا دولت کدہ اور کب میرے والدین آپ کو میری بھائی کے طور پر مانگتے آئیں؟“  
 ”مستر واسطی.....؟ آپ کتنے گھٹیا انسان ہیں آپ کو کسی لڑکی سے بات کرنے کی تیز بھی نہیں ہے۔“  
 ”آپ کہہ سکتی ہیں آپ کو حق ہے لیکن یقین کیجیے میں گھٹیا نہیں ہوں اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے جدوجہد بنا کر کرتے ہیں اور میں بہت بہادر ہوں۔“

”آئی جیسٹ پو..... نفرت ہے مجھے ایسی بھاری سے۔“  
 ”تھینک یو جیسٹ گے یہ الفاظ بھی۔“  
 ”اعت سبھی جی ہوں میں آپ پر زنجیر ہو جائیے۔“

”ذو۔ کے۔ لیکن میری بات یاد رہے میں اپنا جواب لینے ضرور آؤں گا“ آپ کے پاس دو دن سوچنے کے لیے ہیں خدا حافظ.....“ وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔  
 اور تب سے گوہر سوچ میں پڑی تھی اسے کیا تہمتی کہ معتدل دن رات گزارتے چند ماہ بھی نہ گزریں گے کہ وہ اتنے بڑے امتحان میں ڈال دی جائے گی۔ اب میرے خدا! یہ سب کیا ہے مجھے کیا کرنا چاہیے کدھر جاؤں میں..... یہ ساری باتیں کس سے کہوں کاش میں نے ماموں جان کو ساری بات اسی روز بتا دی ہوتی آج ان سے حال دل تو بہ لیتی۔ وہ از حد پریشان تھی جانے تھی یہ وہ ہیں بیٹھی رہی ماموں کا ڈرا بچو آج چھٹی پر تھا۔ نہیں تے کہہ دیا تھا کہ خود ہی آ جائے اس نے گھڑی دیکھی چار بجتے کو تھے دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان نہ تھا وہ پریشانی کے اسی عالم میں گیٹ تک چلی آئی ابھی اس نے قدم ٹیٹ سے باہر دکھایا تھا کہ شیر کی کانہی ایک جھکے سے سامنے رکی۔ کتڑی کا شیشہ تیزی سے نیچے اتار کر اس نے ہاتھ بلایا اسے دیکھ کر انجالی سرت چہرے پر آگئی تھی کتنا خوش تھا وہ.....

”ہیو..... تم آنا.....“ اس کے لہجے میں بے تابی تھی۔  
 ”شیر! کچھ کر بھی تم صدمی رہ گئی! مرے مرے قدموں سے چنتی اس تک پہنچی سر می تھری جیس سوٹ میں! بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بڑے خاصا لہجے سے بیٹھا تھا۔ وہ قریب آئی تو اس نے دروازہ کھل دیا۔“  
 ”گورن! ایسی ہو؟“ جیس آج یونہی سٹی چھوڑنے کا ارادہ نہیں تھا کیا..... اتنی بڑھا کہ بچی مت ہو۔ گھر ٹولڈ بیڈل کے بغیر بھی اچھا چل جائے گا۔“ وہ زبردستی مسترد کی۔

”بھئی مان لیا توئی تو دن سے راہ ہوتی ہے بڑی بیٹھے بیٹھے خیال آیا تمہیں لے آؤں تمہارے بغیر ایک ہل ہاں دل نہیں دیا تمہیں لے لو مجھ سے۔“

وہ اب بھی چپ تھی شیر نے چونک کے اسے دیکھا چپ رہ کے پھر بولا۔  
 ”میں جانتا ہوں گوہر! تم مجھ سے خفا ہوئیں نے اتنے سارے دن وہاں گزار دیے۔ لیکن بھوری ہی انسی تھی۔ ایسے چار کرنے والے لوگ تمہیں ملے ہوتے تو تمہارا رد عمل بھی یہی ہوتا۔ سب بہت پریشان تھے۔ انہیں



اور چونک گئی۔ ایک ایک حرف اسے ڈرانے دھمکانے لگا۔

"بس..... گوہر! میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا، تمہیں سمجھنا نہیں سکتا کہ مجھے کیا چاہیے مجھے تو بہت کچھ چاہیے تمہاری ذات کی..... ایک انجمن ہی تو چاہیے جس میں بیماری شمع کی روشنی بھی ہو، ذوق کے پھولوں کی خوشبو بھی ہو، جانثاری کا تین بھی ہو۔ تھک جائیں تو تمہارا، جو میری شکل بنا رہا، ابھی من جائے، حالات کی کڑی وجہ، اور تمہارا حوصلہ، میری چھاؤں کا کام بھی دے، پاپس ہو جاؤں تو تمہارے الفاظ زندگی کا ولولہ اور لگن بھی بخش سکیں، جب کبھی حالات چہرے سے مسکراہٹ نوجائیں تو تم میرے چہرے کا ہنس بھی من جاؤ، ایسے سب کچھ مجھے مل جائے، ناگوہر تو پھر میں تمہیں ہوں، عمر ویوں کے سارے دکھ پل میں سمٹ جائیں..... تم مجھے یہ سب کچھ دے دینا، گوہر..... بس کچھ..... پھر میں بہادر ہوں گا..... اس جنگ میں جو میں نے زمانے کے فریب و لالچ کے خلاف لڑنے کی نشان دہی ہے اس جنگ میں آسانی سے ہاروں گا نہیں۔ میں اپنے مقاصد یا لوں گا۔ سارے اعلان مقاصد..... اور جب معاشرے میں ہر طرف امن اور یقین ہوگا، مظلوم ظلم سے نجات پا جائیں گے۔ تب ہم یعنی میں اور تم اپنے پیارے ملک کے سرسبز لٹھے کے کسی ایک کونے میں ایک چھوٹے سے گھر میں سب سے دور اپنی دنیا بنا لیں گے۔ گوہر!..... میری زندگی..... مجھ سے وعدہ کرو۔ تم میرے اختیار پر پوری اترو گی۔ تمہاری طرف سے مجھے کبھی نا یقینی نہ ہوگی..... میں جانتا ہوں تم فیشن کی دوڑ میں اندھا دھند بھاگنے والی مغرب زدہ لڑکی نہیں ہو، تم ایک حقیقی مسلمان لڑکی ہو۔ اور تمہارا راستہ وہ راستہ ہے..... جو خدا نے تمہارے لیے بنایا ہے۔ تمہارا آئیڈیل اللہ تعالیٰ ہے..... لیڈن ڈیانا۔ سارہ فرگوسن..... دیکھا..... زینت امان نہیں۔ بی بی فاطمہ علیہا السلام ہیں۔ تم ان کے قدموں کی خاک کھینچنا چاہتی ہو....."

گوہر کی آنکھیں بھرا آئیں۔ وہ رونے لگی۔

"شیر!..... کبھی کبھی ہمارے دل کی باتیں کوئی دوسرا بھی کہہ دیتا ہے، خدا کی قسم۔ میں..... میں سوچتی ہوں! ہر بات کا خلیفہ، شخص صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک نیک، نبی، شریف، نبین پاک، باریبی اور عظیم ماں ہے۔ میں بھی یہی سب کچھ بننا چاہتی ہوں۔ تمہاری ذات کے حسین رنگوں میں مدغم ہو جانا چاہتی ہوں، تم سے جدا ہو کے نہیں..... میں..... میں تمہاری امیدوں کو..... حقیقت کا رنگ دہوں گی، تمہیں کبھی مایوس نہیں کروں گی..... پانچویں شیر..... علی بی بی..... یہ سب کچھ جو تمہارا منہجائے نظر ہے، یہ سب میری بھی تو آرزو ہے۔"

"ہاں..... یا تو آیا....." وہ ہمیشہ کوئی اہم بات یا دانے پر مخاطب کی اہم ترین بات بھی نظر انداز کر دیتا تھا۔

"یار لوگوں کا خیال ہے مجھے یونیورسٹی انٹیکشن میں حصہ لینا چاہیے تم کیا کہتی ہو، ان بارے میں؟"

"نیک خیال ہے آدمی کو سدا متحرک اور فعال زندگی گزارنا چاہیے۔"

"گویا تمہیں اس حماقت پر کوئی اعتراض نہیں؟"

"حماقت کیوں؟"

"بھئی میں نہیں چاہتی جانی جاتی ہیں۔"

"اور ماموں جان؟"

"ان سے میری سفارش تم کر دینا۔ سنا ہے تمہاری بات مانتے ہیں وہ۔"

"کوشش کروں گی۔ میرا خیال ہے انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

سنبھالنا میرا فرض تھا۔ گوہر میں نے چند روز سہمی آفراس نظام خانوں کا دورہ کیا تو تھا۔ پناہوں ان کا..... پھر ان صاحبوں کا تو حساب ہی نہیں جو انہوں نے مجھے زندگی کے اتنے سالوں میں دیے۔ سدرہ آ پا ایک ہولناک ایکسٹرنٹ کا شکار ہوئی ہیں، خدا جانے ان کا کیا ہوگا۔ میں بے حد پریشان تھیں، وہ اپنے سارے بچوں پر جان بچھاؤ کر رہی ہیں، خضر اپنی جگہ بے نال تھی۔ عدلی بے چارہ تو کچھ سمجھتی نہ پارتی، تو ڈیڈی ان لوگوں سے پہلے چلے گئے۔ عدلی نے ویزے وغیرہ کے لیے بھاگ رہی تھی اور میں بھی اور عذرا کو بھی ساتھ ہی سنبھالنے لے رہا۔ حوصلہ دینا رہا، وہ تو مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہتی تھیں، لیکن میرے پاس پاسپورٹ نہ تھا اور وقت بہت کم تھا، خود سوچو گوہر ان حالات میں میں کیا کرتا، کیا کرنا چاہیے تھا مجھے؟ کیا تم میری مجبوری اب بھی نہیں سمجھیں۔"

"نہیں شیر! میں نے تو ایسا سوچا نہیں تھا۔ تم نے جو بھی کیا، یہی ہونا چاہیے تھا، کچھ تقاضے اخلاق اور انسانیت کے بھی ہوتے ہیں۔ میں تو..... میں تو آج کافی دیر کتابوں میں تم رہی، بس اسی لیے چہرے پر بارہ بجے نظر آ رہے ہیں، میں تم سے خفا تو نہیں ہوں، بالکل بھی۔"

"گوہر! عذرا تمہیں سلام کہہ رہی تھی اور یہ بھی کہا ہے تمہیں اپنی بھانجی کہنے کا از حد ارمان ہے۔" گوہر اس ذکر پر شرمناک ہو گئی۔

اس کے ذہن میں مومنہ واسطی کی باتیں گھوم رہی تھیں، وہ تو شاید شیر کی بات ہی نہیں سن رہی تھی۔

"گوہر..... گوہر....." اس نے اسے پکارا۔ "کہاں تم ہو؟"

"نہیں..... کچھ نہیں..... کچھ بھی نہیں۔"

شیر نے بغور ان کے چہرے کی طرف دیکھا تو خود سنبھال کر وہ مسکرائے گئی۔

"چاچی کے ہاتھوں کے کھانوں کا جواب ہی نہیں آج چاچو کے کچھ مہمان یہاں سے مندر رہے ہیں ان کے لیے اے دن ڈشز بنانی ہیں چاچی نے انجان سے لطف آ گیا گوہر! تم ایک چھوٹا لایا کرو ان کے ساتھ۔ سیکھ لو یہ سارا ہنر میں بھی چاچو کی طرح ایک خوش نصیب مرد بننا چاہتا ہوں، پاپا کی طرح نہیں وہ مجھوں کی قدر نہ کر سکے۔ کھو بیٹھے سب کچھ..... میں..... میں زندگی بھر تمہیں اپنے دل کے ساتھ رکھوں گا گوہر! تمہاری خامیوں کو اچھائیوں میں بدلنے کی خواہش کروں گا، دیکھو نا گوہر! دنیا کا کوئی بھی انسان خامیوں سے مبرا نہیں ہے..... میں بھی..... مجھ میں بھی کئی خامیاں ہوں گی، بس ایک خالی ہر حال میں ناقابل قبول ہوگی، خواہ میری ہو یا تمہاری۔"

"وہ کیا.....؟"

"سب وقتائی..... ہر جاتی پن..... ایک سرو کے لیے اس سے زیادہ باعث افتخار کوئی بات نہیں ہوتی۔ اس کی بیوی ایک قابل اعتبار پاپا کہا: عورت ہے۔ وہ معاشرے میں بڑی شان سے سر اٹھا کر چل سکتا ہے، زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہوگا جس پر میں تم سے بات نہ کر چکا ہوں گا۔ مجھے بھی تمہاری طرف سے اعتماد کی رسید چاہیے کہ تمہاری نگاہ میں میں بھی ایک قابل اعتبار مرد ہوں۔ میں چاہتا ہوں گوہر! تمہاری زندگی کی کڑب پر کوئی ایسے الفاظ نہ ہوں جو دونوں میں سے کسی ایک کی سمجھ سے بالاتر ہوں، تمہاری زندگی بھی میرے سامنے ہے، میں تمہاری زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب با آسانی پڑھ اور دیکھ سکتا ہوں، اور آئندہ بھی ایسا چاہوں گا۔ ایک دوسرے کو پرکھنے کے لیے ہمارے پاس خدا کی ذات اور اپنے دل کے سوا کوئی پیمانہ نہیں۔ ہمیں کسی محتسب کی ضرورت نہیں، ہم خود ہی ایک دوسرے کے محتسب ہیں، ہر معاملے کو پرکھ سکتے ہیں، ایک دوسرے کا حساب رکھ سکتے

اے! ہوا کہ عذرا اور مجی بھی اس کے ساتھ ہیں اس نے عذرا کی طرف دیکھا۔ آسانی رنگ کے پورے بازو کی  
اس اور شلواری میں آسانی چار جٹ کا دوپٹہ سر پر اوڑھے ہم رنگ جوتی پہنے اور شمال کندھوں پر ڈالے وہ اس لئے  
نیا کی معصوم ترین لڑکی نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھرا آئیں جانے کس خیال کے تحت اس نے ساتھ  
... دئے بے اختیار عذرا کا ہاتھ تھام لیا۔  
"ندی.....!" شاید وہ بھی گھبرائی ہوئی تھی۔

"اے! عذرا کی عذرا مانگی ڈیڑھ..... ایسے نکار سے قدم قدم پر ہمیں دیکھے کو بلیں گے۔ برائی سے نا آشنا کی بنا،  
ق: بائی سے بچار ہے تیرے کمال کی بات نہیں کمال کی بات تو یہ ہے آپ برائی میں گھر کے بھی لٹس کے غلام نہ  
... اپنے ایمان و یقین اور سہرے اصول کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اپنی ایزی عذرا سوچ لو کہ ہمیں اس  
اے! نہیں کرنا ہے۔" وہ بولوں نے رک کر مزہ کوئی کہہ دیکھا ان کی نکالیں تو شاید یہ منظر دیکھ ہی نہیں رہی تھیں۔ ان  
نی روح سردی میں اٹکی تھی۔

"ندی! تمہارے ڈیڑھ یا اتنا ہاتھ میں لینے آئے ہوں گے۔ انہیں دیکھتے رہو..... بخون پر انہوں نے کہا تھا کہ  
بت پرر کے رہنا ہم خود ہی پہنچ جائیں گے۔"  
"ہاں مئی..... ہم گیٹ کے بائیں طرف رک جاتے ہیں اور ضرور لینے آئے ہوں گے۔"  
تینوں مطالبہ جگہ پر رک کر انتظار کرنے لگے۔

"عذرا! یہاں تو قیامت کی سردی ہے میں تو برف بن جاؤں گی۔"  
"دستانے پہن لو..... نکال وہاں میرے کندھے سے لٹکے بیگ میں ہیں۔"  
"ہاں نکال دو....." عذرا کے دانت بچ رہے تھے۔ پانچ منٹ دس منٹ بلکہ پورے پندرہ منٹ گزر گئے۔  
ندی! ہم کب تک یہاں کھڑے رہیں گے۔" مئی گھبرائی ہوئی تھیں۔  
"کیا خبر مئی....." عذرا بھی انتظار سے تنگ آ گیا تھا۔  
ذیب یوزھا انگریز..... عذرا سے گمرا گیا..... وہ غلط میں گیٹ کے راستے اندر آ رہا تھا۔  
"سوری.....!"

"عذرا! یہاں بھی معذرت کا دروازہ ہے مجھے تو امید نہیں تھی۔"

"تھوڑی بہت انسانیت انھی زندہ ہے نا۔" عذرا نے جواب دیا بیماری لانگ کوٹ..... بڑے سارے ہیٹ  
اور سفید پینٹ اور سفید بیٹوں والا بوڑھا انگریز پھر اس کے قریب سے گزرا..... ہاتھ میں پکڑی عینک تاک پر جما  
... بغیر عذرا کو دیکھنے لگا پھر اس نے جیب سے پوسٹ کارڈ ساڑھ کوئی شے نکالی۔ کبھی وہ عذرا کو عذرا کو یا مئی کو  
... دیکھا اور کبھی اپنے ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو پھر ایک دم وہ چلا یا۔ بڑی شستہ زبان میں انگریزی بولتے ہوئے۔

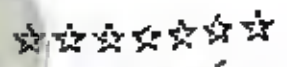
"تو جہان! کیا تم عذرا بن جہاں! وہاں یہ لڑکی عذرا بنت جہاں ہے اور یہ خاتون مسز جہاں احمد ہیں۔"  
ایک انگریز کے منہ سے اپنے نام سن کر عذرا بوکھلا گیا اس نے احتیاطاً انداز میں سر ہلایا۔  
"جہاں!..... یہ ہم سب ہی ہیں مگر آپ نے نیسے جانا؟"  
اس نے تصویر آگے کر دی۔ جس میں وہ تینوں سردی آپا کے ساتھ موجود تھے۔  
"اوہ میرے بچے..... تم نے ایک بوڑھے آدمی کو کتنا تنگ کیا میں تمہیں تلاش کرتے کرتے تھک گیا اور اب  
... پتہ چلا کہ وہ کہاں سے تھک گیا تھا تمہارا پتا کرنے میں یہاں نہ آتا تو تمہیں پانی نہ

"خدا کرے..... یہ بارم لوگ کب تک رہے گئے یہاں؟"  
"ایک دو دن ہی....."  
"میرے خلاف خوب ذہر گھولا گیا ہوگا۔"  
"جی نہیں..... ایک بار میرے جھڑک دینے پر مت ہی نہیں ہوئی بات کرنے کی۔"  
"اچھا کسے جھڑکا تم نے؟"  
"کسی کو بھی ایسا ضروری نہیں۔"  
"گوری! کیا ہاتھی تم نے میری خاطر نہیں جھڑک دیا۔ ٹھکرا دینا۔"  
"ہم نہیں کھاؤں گی جتا اب اس بات کی۔"  
وہ مسکرایا۔ "ار کوئی اہم بات؟"

"چچی اماں نے خوب خوب ہلے لیے مائی چانے کے..... مجھے شدت سے احساس ہوا کہ چچی اماں ہمارے  
خانہدان کی ایک تو بلی ٹھکر بڑوگ خاتون ہیں۔ شہینا انہیں تم سے بہت چار ہے اور پھر دلوازا ماموں نے تو حد کر دی  
یہ کہہ کر کہ تمہاری ماما یعنی سعیدہ بیگم ہاں گھر میں آ کر..... ہار آئیں لیکن شیر کے بارے میں لگائی بھائی کر۔  
نہیں۔ ورنہ وہ انہیں ادھر آئے سے روک بھی سکتے ہیں۔"  
شیر خوشی سے پھولے نہ پایا۔

"اچھا..... گو ہر ایسے نہیں نے کہا میری خاطر۔ اوہ میرے خدا۔ میں تو خود تو ادھی شکوہ کناں رہتا ہوں۔ محبت  
تو میرے ارد گرد چاروں طرف موجود ہیں مگر..... اس نے اپنا پایاں ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔  
"گوری! تم میری زندگی میں واقعی ہمارے ہیں مگر..... اس نے اپنا پایاں ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔  
میری بیگم ہیں میں خود کو طاقتور محسوس کر رہا ہوں، اندر باہر پر سکون ہو رہا ہوں..... اب میں اپنے آپ کو شکیل  
آزادانہ کر سکیوں گا۔ آج کے دن ان لٹوں میں میں مجھے ایک پریشانی ہے وہ ہے سردی آپا کا ایک سیٹ نہ نہ  
کرے وہ جلد از جلد زندگی کی طرف لوٹ آئیں۔"

گھر آ گیا..... دونوں گاڑی سے اتر کے اندر چل بیٹے۔ دن لاؤنج میں جہاں چچی اماں ان دونوں کی منتظر  
تھیں۔



اتنا بڑا ایئر پورٹ ندی نے کبھی خواب میں نہ دیکھا تھا ایک وقت میں کہتے قوی شکل جہازوں دے پر موجود  
تھے پانچ دس منٹ میں ایک ہی پرواز کی رہا مئی یا آہ کا اعلان..... ہر رنگ اور فنل کے لوگ۔ سب اپنی اپنی وہ  
میں گن بیٹے مسکراتے بائیں کرتے 'تقیہ لگاتے کوئی ٹیک کہتے تھے۔ مغرب میں جنس بے حد دوزاں شے کا نام  
ہے۔ نکلے جسم گوری گوری پنڈ لیاں دیکھ کر عذرا کا دل ڈوبا جا رہا تھا اسے لاج آ رہی تھی وہ ایک بے ضرر سا  
شرمیلا تو جہان تھا پھر بھی شاہراہوں پر کسی سینما ماؤں میں..... شادی کی کسی تقریب میں۔ کوئی سفر کرتے  
ہوئے۔ کسی حسین چہرے کو نظر بچا کر دیکھ لینے کی قسم نہیں تھی۔ بلکہ شیر نے تو اس کا نام چھپا کر رکھ چھوڑا تھا۔  
لیکن کسی حسن کو زمانے سے چھپ کے نظر بچا کے ہ کی لینا اور بات تھی۔... اور کھلے بدنوں انسانیت کی یہ تو ہیں اور  
بات..... اس کا دل دھڑک گیا رہا تھا بلکہ لڑ رہا تھا۔ نہ کیوں کے اجسام پہ مٹھ لیاں جسم چھپانے کا کام ہرگز نہیں  
دے رہے تھے بلکہ چھپے خطوط کو واضح کرنے میں مدد نہت ہو رہے تھے اسے اور بھی زیادہ لاج آئی جب اسے

"اودہ جناب! معذرت خواہ ہوں! آپ کو تکلیف اٹھانا پڑی۔ یہ جگہ ہمارے لیے تیسرا جنبی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"آپ..... آپ کون ہیں جناب؟"

"میں کون ہوں....." وہ ہنس پڑا۔ بڑی جواہر مہی۔ "بڑا دلچسپ سوال ہے لیکن یہ سارے سوال و جواب کا ڈری میں۔ میں ہاسپٹل پہنچتا ہے۔"

"عدی! ان سے پوچھو..... جمال اور افتخار کہاں ہیں۔" مہی کہہ کر بڑی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

"جناب! میری بڑی بہن کا سیریس ایسیڈنٹ ہوا ہے۔"

"خداوند نے اپنا کرم کیا ہے۔ وہ بہت جلد آئیں گے۔ وہ بڑی پیاری بچی ہے اور وہ ماری وہ میری جان ہے۔ ان کا بیشتر حصہ میرے ساتھ گزارتی ہے۔ بچے ڈاکٹر ہنری کی سب سے بڑی کمزوری ہیں۔" ان سب کو ساتھ لے کر باہر آ رہے تھے۔

"ڈاکٹر ہنری!"

"آف کورس..... ڈاکٹر ہنری..... اب بھی ڈاکٹر ہی ہوں نا ڈاکٹر کے لیے مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ریٹائر کر بھی رہا نہیں ہوتا اپنے نام کے ساتھ اپنے اعزازات اور ڈگریاں سجائے ڈاکٹر ہی کہنا یا جانا رہتا ہے۔ مجھے ڈاکٹر ہنری کہتے ہیں ہنری جوزف۔"

انہوں نے عدی کے پاس رکھا بیگ اٹھا لیا تھا اور مزے سے کندھے سے لٹکائے آگے آگے جا رہے تھے۔ ان کی عمر کے بارے میں صحیح اندازہ لگانا مشکل تھا..... پھر بھی عدی کے خیال میں وہ پھسترا تی کے درمیان تھے۔ لیکن انتہائی چاق و چوبند اور پھر تیلے۔ ان کے قدموں میں لڑش نہیں جو انہوں جیسی متنبہ بچی تھی۔ کافی دور چل کر انہوں نے ایک گاڑی کی ڈگنی کالا لاک کھولا عدی نے ٹرائی پر رکھا سامان ڈگنی میں بھر دیا۔

"چلو چلو! اپنی اپنی سیٹ سنبھالو۔ عدی! دن جمال تم میرے ساتھ ہال سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔"

عدی نے ان کی طرف دیکھا اور گاڑی نشست پر بیٹھ گیا۔ وہ ابھی گاڑی سے باہر تھے۔

"عدی۔۔۔ سب کیا ہے؟" عدی ان لمحوں میں خاموش ہی رہی تھی خوف زدہ انداز میں بولی۔

"خدا نے ہمارا اعتماد بحال کرنے کو ایک اچھا انسان بھیج دیا ہے۔ بیگانوں اور انجانوں کی اس گھرنی میں۔"

ڈاکٹر ہنری نے ڈی ایویٹنگ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

"تیار۔ چلنے کے لیے۔"

"بالکل! عدی نے جواب دیا۔"

انہوں نے سیٹ سنبھالتے ہی گاڑی اسٹارٹ کی اور گاڑیوں کی قطار سے نکال کر چمکتی سیاہ سڑک پر ڈال دی۔

"سبز جمال! آپ کی بیٹی سدرہ۔ مجھے بہت عزیز ہے۔ میرے دل کا صدا میں۔ پراثر ہیں۔ خدا نے اسے

ہماری طرف لوٹا دیا۔ آپ اطمینان سے بیٹھیں۔ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ڈاکٹروں کا تاک میں

دم کر دیا ہے۔ میں نے ایک طویل مدت اس ہاسپٹل کے انچارج کی حیثیت سے عوام کی خدمت کی ہے۔ وہ

میرنی میں تھے۔ لیے بھانگ دوڑ کیسے نہ کرتے سارے کے سارے سر جن میرے شاگرد ہیں۔ بڑا احرام کرتے

ہیں میرا۔ پوری پوری راتیں وہ بھی میرے ساتھ جاتے۔ ہے ہیں۔ زندگی تو اب پروالے کے ہاتھ میں ہے۔ بھان

انسان بن جاتے ہیں۔ ہم نے اپنی طرف سے بھرپور کوشش کی ہے۔ خدا سے روکے گا مگر اسے اس کی زندگی مانگی ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ سب کچھ اٹھائیں گے۔"

"خدا کہے۔ میری مٹی تو پچھلے چار پانچ دنوں سے ایک پلی پھین نہیں پاسکتی۔ میری بہن اور میں بھی۔ ہم سب انہیں بہت چاہتے ہیں۔"

"چاہت بڑی طاقت ور شے کا نام ہے۔ چاہتیں بڑے کام کی چیز ہیں۔ خدا کہے کہ کوئی کسی کا ہو۔ بہت نائن ہونا ہوں شہب دیکھتا ہوں کہ کسی کے ارد گرد مجھوں کی چھاؤں ہے۔"

عدی نے حیران ہو کے ڈاکٹر ہنری کو دیکھا۔ وہ تو بھتتا تھا..... کہ کسی مغربی انسان کے پاس درد مندوں ہی نہیں

"بچے! تم نے اپنا تعارف ہی نہیں کر لیا۔"

"جی سر۔" وہ مسکراتے لگا۔ پھر اس نے مختصر الفاظ میں اپنے ہلکے سب کے بارے میں بتا دیا۔

"بہت خوب۔" وہ سادہ تمہارے بارے میں جو کچھ بتایا کرتی تھی سب درست ہے۔ مجھے زندگی بہت پسند ہے۔ تو جوان آدمی! سارے شوخ و شنگ لا پر داؤ اور لا اہالی نرکوں میں مجھے اپنی جوانی کا ٹکس نظر آتا ہے۔ ہاں

سنو۔ سدرہ تم سے زیادہ ایک اور نو جوان کا نام بنتی ہے۔ وہ کیسا ہے کہاں ہے وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا۔ اسے اپنی اتنی پیاری اور اچھی بڑی بہن کے لیے آنا چاہیے تھا۔"

"وہ تو آ رہے تھے ہم سب نے روک دیا۔ ڈاکٹر صاحب! وہ پہلے بھی اپنا قیمتی وقت ادھر ادھر گزار کر ضائع کر چکے ہیں۔" عدی نے جہلی بار جواب دیا اور اپنی ساری دماغی طاقت انگریزی بولنے میں صرف کر دی۔ ڈاکٹر

ہنری نے ہلکے دیو مر رہیں سے اسے بغور دیکھا اور مسکرا دیا۔

"اودہ عدی پیارے یہ ہے تمہاری جڑواں بہن! عدی! جہاں ایک بے حد شرمیلی بچی۔"

"جی سر۔" ڈاکٹر ہنری نے ہاتھ پیچھے کر کے عدی کے سر پر رکھا۔

"خدا تمہیں ایسی زندگی دے۔"

"اب میں سر!"

وہ ہنس دیا۔ "تم تو بہت نظر میں ہی بنے تھے تمہارے کیا کہنے۔" وہ اسے پیار سے دیکھ رہے تھے۔

گھڑی تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ عدی اور عدی کے اداس چہروں پر گھوڑی سی ٹھانیت آگئی تھی۔ ٹی بیج کر رہی تھیں۔ خدا سے مدد کی طلب گار تھیں۔ عدی اسے گوشیوں میں اٹھیں! ڈاکٹر ہنری کی باتیں بتا

رہتی تھی۔

اچانک گاڑی ایک بڑے سیاہ گیٹ کے سامنے رکتی۔ جس سے آگے سرخ بجری کی چوڑی سی روڈ تھی اور دونوں اطراف بہت بڑے ان۔ عدی نے ایک دم ڈاکٹر ہنری کی طرف دیکھا۔

"یہ آپ کہاں آئے۔" ڈاکٹر صاحب! یہ ہاسپٹل تو نہیں ہے۔"

"بے شک! بے شک لیکن ایک ڈاکٹر کے گھر کو آپ دوسرے الفاظ میں ہاسپٹل کہہ بھی سکتے ہیں۔"

"شکر ہمیں تو۔"

"آپ کو ہاسپٹل جانا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔"

"تو پھر....."

"فوجوان اشرفی والے اپنی مہمان نوازی کے سبب مشہور ہی تھی۔ یہ بڑا خاص آٹھ ایک انسان ہے جسے کیسے گوارا کرے کہ تم لوگ اس پریشان حال میں اسے دیکھنے چلے جاؤ۔ پہلے تو بڑی ہی دلچسپی سے اسے دیکھنا اور پھر اسے ہاتھ منہ دھونا بڑی اہمیت کا سا ہشتہ کرنا چاہئے یا کافی لیٹا۔ اس کے بعد باہر چلے۔"

انہوں نے نیچے اتر کر گیسٹ کھولا اور گاڑی اندر لے آئے۔

"عدی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" غدر اسٹنٹائی۔

"سب سے ڈر کی؟" عدی اسے اسے ٹوکا۔

ایک آہنی جو بیٹھنا ان کا ملازم تھا۔ گاڑی سے ان کا سامان اتارنے لگا۔ تینوں نیچے اترے۔ مٹی کے چہرے پر موجود گوداری صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اور چہرے پر ہنسنے کے لیے کسی بھی زبان کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ ڈاکٹر ہنری نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں الفاظ کے بجائے احساسات سے یہ باہر کرانے کی کوشش کی کہ انہیں اس پریشان حال خاندان سے از حد مدد دینی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

تیسرے دن اس نے یونیورسٹی جانا ہی گولی کر دیا۔ شیر حسب معمول اسے لینے کے لیے آیا تو وہ رات کے لپاس میں میز پر بیٹھی چائے کے سب سے لے رہی تھی۔

"یونیورسٹی نیڈی۔ ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔"

"دہنیں۔"

"کیوں؟ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ دیکھو زیادہ دیر نہ لگنا۔ آج مجھے بہت سا کام ہے۔ میرے لیے ایک کپ چاہئے بناؤ۔ میں چائے پیتے ہوئے چچی اماں سے کپ شپ بھی کر لوں گا۔"

"شیر! میں آج نہیں جاؤں گی۔"

"مہیا سہیل۔ کیوں اور کیسے نہیں جاؤ گی؟"

"بس ویسے ہی۔"

"یہ کوئی بات ہے بھلا جانتی ہو۔ کتنا عاری ہو گیا ہوں تمہارا وہاں چند لمحوں سے تمہارے ساتھ نہ گزارا ہوں تو لگتا ہے زندگی خالی خالی ہی ہے۔"

"بھئی! کیسے جاؤں آج سرزادہ نمیسٹ لے رہے ہیں اور میں نے تیاری نہیں کی۔"

"غدر لنگ ہے۔ تم اور نمیسٹ نہ دے سکو یہ تو کوئی بات ہی نہیں۔ مت اڑا بات کو۔ میں نے یونیورسٹی سے کچھ دن پہلے میں تمہارا مضمون پڑھا ہے۔ بلکہ ایک دوست نے سفارش کی تھی کہ اسے پڑھوں۔ گوری! خدا کی قسم میں حیران رہ گیا کہ تم نے ایسا اونگے اونگے لڑکی نے نہ سچے الفاظ کہاں سے لے لیے۔ معاشرتی بے حسی کے موضوع پر تم نے خوب لکھا ہے۔ بہت خوب۔ لہذا تم نمیسٹ دے سکتی ہو۔"

"شیر! مضمون اچھا لینا اور بات ہے اور نصاب کی کتاب میں سے نمیسٹ نہ لے اور بات کہہ جو دیا تیاری نہیں کی۔"

"دقیق بھی ہو جاؤ تو کیا ہے۔"

"شیر! تم اتنی ہی بات کو ذاتی مسئلہ بنا رہے ہو۔"

"دہنیں گوری! ایسا نہیں ہے۔"

"پہر؟"

"پہر یہ ہے کہ آج میں نامی نیشن پیپر داخل کرانے چلا ہوں تم بھی وہاں ہوتے تو اچھا ہوتا۔"

"نیرتی دعائیں تو تمہارے ساتھ ہیں۔"

"او۔ کے۔ چائے مت بناؤ چار پارہا ہوں۔" وہ ایک دم خوشگوار موڈ کے ساتھ کمر اچھوڑ گیا۔ گوہر میز پر بیٹھی وہ

نہ گاڑی کا دروازہ پوری نوبت سے بند ہونے کی آواز آئی۔ تو گوہر کے دل میں دھماکا سا ہوا۔

تنی خوشی ہوتی اسے۔ اگر آج وہ بھی شہیر کے ہمراہ ہوتی لیکن وہ کیسے جاتی۔ آج کا دن ایک ظالم دن تھا۔

اب ماموں واسطی نے اس سے جواب مانگنا تھا۔ اس کی راہ روک کر اس سے پوچھنا تھا۔ اور اسے کیا جواب دینی۔

یہ جس۔ صرف اسی کی بہت سے اس نے آج کے اہم دن یونیورسٹی نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

یاد ان کسلندی کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھی نصابی کتب کا مطالعہ کرتی رہی۔ حسب معمول شہیر سے پیر نہیں

ایا۔

"گوہر۔ گوہر۔" آواز خالقون اسے پکار رہی تھیں۔ اس نے کتاب بند کی اور باہر آئی۔

دیکھو یہ درمیں تھیں۔

"جی مائی!"

"کہاں نہیں تم۔" بھئی ایک بل کو اس کا ہاتھ کو ہی سنبھال لیا۔ دلناز کے لاڈ نے اسے سر چڑھا رکھا ہے۔

یان غدا میں ڈال رکھی ہے۔ آج دفتری اجلاس ہے صاحب بہادر رات گئے سے پہلے لوٹنے کے نہیں اور

اسے ایک ہی جمن لگی ہے۔"

"کیا ہوا ہے مائی۔"

"ہونا کیا ہے۔ ہم نے تو ایک بار بھی کسی بچے کی سالگرہ کا جشن نہیں منایا۔ دلناز تو بچہ پکاوا کے فریبوں اور

ذہاروں کو بھجوا دیتے ہیں اور بس اور ایک یہ سزا انصاف ملی ہیں آئے دن ان کے ہاں تقریبات۔ ان کی بیٹی

مانگہ کی کیکلی ہے ارے وہی سوہلی کی گول مٹولی ہی پچی۔ پھولے پھولے گل لوں والی جسے دلناز پھینچا کرتے

ہیں۔"

"جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔"

"آج اس کا سالگرہ ہے۔ صاحبزادی کا تھکے مسکری کوڑ بردست تجھے کی ضرورت ہے۔ ایسا کرو تم ساغر کو۔"

اب تو شہیر کو بھی جانے کیا ہو گیا ہے۔ آج وہ بھی نہیں آبا لے جانا اور تختہ ولادت دینا۔ تم ساغر کے ساتھ چلی جاؤ۔

مانگہ کو بھی لے جاؤ۔ کسی سے بچل جانا، تختہ لیتے ہی لوٹ آنا۔"

"مائی! میں۔۔۔۔۔ وہ حیران تھی۔"

"ہاں بھئی! تم کیوں نہیں۔ انسان نہیں ہو کیا؟"

"وہ تو ہے مگر۔۔۔۔۔"

"اگر مگر کچھ نہیں۔ فوراً تیار ہو جاؤ۔ ساغر ساغر۔" وہ واہس مڑ گئیں۔

اس نے تیار کیا ہونا تھا۔ وہ پہر میں نہائی تھی بلکہ گلابی سوٹ میں ملبوس تھی۔ چادر لے کر اور میٹھل پہن کر باہر

آئی۔

"گوہر باقی۔ آپ نے اس چڑیل کو منع نہیں کیا۔" ساغر بڑبڑا رہا تھا۔ مٹی نے اس کا ہاتھ پکھیل بگاڑ دیا تھا۔





مخالف ٹیم ہارنے کے قریب تھی کئی کئی کے سخت آرزو کے آگے اس نے ہیٹ پھینک دیا تھا۔  
 ”کوئی بات نہیں، کھیل آج نہیں توکل جیت لیٹا رکھے کے مانے، جوئے آئی راہ بٹڑ رہو ساغر صکری۔“ گوہر نے مسکراتے کہا تو وہ بھی مسکرائے گا۔

وہ دنوں اسے ساتھ ساتھ لیے لبرٹی میں محبوس رہے تھے۔ اور وہ تھی کہ..... ہر ایک تیز رفتاری کے ساتھ جاری تھی۔  
 ”عائقی؟“ ساغر نے پاؤں زور سے زمین پر مارے۔

”کچھ لینا ہے تو لڑو لڑو چلو واپس۔“

”ساغر۔“ گوہر نے تھمتی سے اس کا نام لیا۔

”گوہر! جاگنا۔ اس عاتکہ کی بچی کو دیکھیں۔ نو لڑائی نہیں کی کوئی چیز پسند ہی نہیں آ رہی۔ اس کی وہ پھوٹا غبار وہ سبھی گویا جنت کی جہنم ہے۔ جس کے لیے زمینی تھمتی کا کارہ ثابت ہوں گے۔“

عاتکہ کا منہ پہلے ہی بنا ہوا تھا۔ اب تو اس نے زور دیا اور آواز سے رونے کی تیاری کرنی اور قبل ازیں کہ وہ آواز نکالتی وہ بازو اس کی طرف بڑھے کسی نے اسے ہاتھوں میں پھیر لیا۔

”بری بات ساغر صکری! اتنے پیارے بچوں کو دلائے نہیں ان کی ہر بات مانتے ہیں۔ آؤ گڈ بے بی خریداری کے اس سلسلے میں ہم نہ ماری مد کرتے ہیں۔“ گوہر نے ایک دم سڑک دیکھا۔ کیونکہ اس آواز سے وہ آشنا تھی۔

ساغر منہ کھونے اس اجنبی کو دیکھ رہا تھا اور کھسیانا ہو کر ستر نہیں رہا تھا۔

”کیوں ہے بی بی آپ کو لینا کیا ہے۔“ اس نے گویا گوہر کو دیکھا تک نہ تھا۔

دھدھوری پا کر عاتکہ کے بسور تے چہرے پر شہر و خروا گیا۔

”چلیے ہم آپ کو اس سامنے والی شاپ پہلے چلتے ہیں۔“

”وہ کیسے جناب؟“ ساغر فرما دیا۔

”آپ جناب نہیں ماسون بھائی! آپ کی یہ جڑ بھی لگی ہیں۔ میری یونیورسٹی فیلو ہیں اور ابھی بہت کچھ۔ یہ تعلق تھا کرتا ہے کہ میں؟ آپ کو اجنبی نہ سمجھیں۔ آئیے میرے ساتھ۔“

گوہر گم صم صی ہو کر رہ گئی۔ جس کا ڈر تھا وہ قیامت آتی تھی بلکہ زیادہ خطرناک انداز میں۔ وہ ساغر کے پیچھے پیچھے چل رہی۔

عاتکہ براس نے جانے کیا جادو کیا تھا۔ دوسری دکان پر جاتے ہی اسے ایک مارٹل سے بنا پیارا سا گھر اور ایک سونے چائے بلکہ بولنے والی پیاری سی گڑیا پسند آتی تھی۔ مارٹل سے بنا گھر بہت ہی خوب صورت تھا۔ گھر نے لان میں مصنوعی گھاس چھٹی تھی۔ چار کرسیاں اور ایک میز بھری تھی خوب صورت پورچ میں چھتھی سرخ لٹو پٹا کھڑی تھی۔ گوہر کے پر س میں موجود سارے پیسے جو کہ اس کے اپنے تھے اور باقی مائی نے احتیاجاً زیادہ دے دیے تھے۔ ان گھنٹوں کی خریداری میں لگ گئے۔ ساغر بے چارہ خون کے ٹھونٹ پی کر رہ گیا۔ ایک اجنبی کی موجودگی میں وہ کیا کر سکتا تھا۔

”اور بھی کچھ لینا ہے مس گوہر۔“

”جی نہیں بس عاتکہ کو ہی پرینٹ خریدنا تھا۔“

”چلیے میرے ساتھ ایک کپ چائے ہی پی لیتے۔“

”نہیں ماسون واسطی صاحب۔ میں پہلے ہی میچ کا گھس پر چھوڑ کر آیا ہوں اس عاتکہ کی بچی کی وجہ سے اور اب

زیادہ لیت نہیں ہونا چاہتا۔ آپ کا بے حد شکر ہے۔“ ماسون نے گفٹ بیک اٹھا لیا۔  
 ”چلیے آپ کو آپ کی گاڑی تک چھوڑ آؤں۔“

”جی نہیں ہم کسی سے آئے ہیں۔ مجھے گاڑی چلانے کی اجازت نہیں۔“

”ابہ تو پھر نکلتا کیسا۔ آئیے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔“

”نو ٹھیک۔ یو ماسون واسطی۔ ہم چلے جائیں گے۔“ وہ جھٹ بول اٹھی۔

”مس گوہر! اتنی بے گانگی بھی ابھی نہیں میں دل سے آپ کی قدر کرتا ہوں۔ آپ ایک بھائی کی پیار بھری آفر کو ٹھکرانے کی زیادتی کر رہا ہیں۔“

”ماسون صاحب! بانگیا ہیں ہی زیادتی پسند۔ بے چارے شیر بھائی اکثر ان کی زیادتیوں کا شکار رہتے ہیں۔ سچ بھی ناراض ہو کر گئے ہیں۔ انہوں نے آج خواجھا ہی چھٹی کر لی۔“  
 گوہر نے ساغر کی طرف دیکھا۔

”ہاں ہاں! میں نے خود آپ دونوں کی باتیں سنی تھیں۔“ شیر کے ذکر پر ماسون کے چہرے پر ناگواری کی لہر آ کر گزر گئی۔

”لیکن یہ ہمیں ایسی اذیت نہیں دینا کی ہمیں یقین ہے۔“

وہ آگے آگے چل دیا۔ پیکٹ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھے۔ عاتکہ نے اس کی انگلی تھام رکھی تھی۔ وہ ایک مہول کی طرح ان کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھی۔ ساغر چلتے چلتے رک گیا۔ شاید اس کے جو گرد کے تیسے ڈھیلے ہو گئے تھے۔ وہ جھک کر تیسے کسے لگا۔

”گوہر! آپ کو آج میری بات کا جواب دینا تھا۔“ ماسون نے جھٹ اسے مخاطب کیا۔  
 ”جی ہاں مجھے معلوم تھا۔“

”پھر آپ آئیں نہیں۔“

”کیونکہ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔“

”کیوں؟“

”وہ ذیک ناممکن ہے۔“

”کیسے؟“

”لڑکیاں زندگی کے فیصلے صرف ایک بار کرتی ہیں۔ فیصلے بدلنے والی لڑکیاں کبھی مجھے پسند نہیں رہیں۔“  
 ”آپ کا خیال ہوگا امیرا یہ خیال نہیں۔ ڈاکٹر بارڈن واسطی شیر سے نا کھورے بہتر انسان ہیں۔“

”آپ جان لیجئے شیر میز کی زندگی کا محور ہے۔ میری خواہشات کے جنگل جتنے بھی وسیع بلکہ لامحدود ہوں اس کی ذات سے شروع ہو کر ہی پر ختم ہوتے ہیں۔ میں خوش نصیب ہوں جس نے کسی تک وود کے بغیر ایک تابناک مستقبل کا خاکہ پالیا ہے۔“

”میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میرا بھائی آپ کے خوابوں میں کھو کر جی رہا ہے۔“  
 ”بیان کی زیادتی ہے۔“

”کچھ بھی ہو۔ جان لیجئے کہ میرے فیصلوں کو بھی موت نہیں آ سکتی۔“  
 ”آپ شاید لڑکی کو کمزور شے تصور کرتے ہیں۔“

"ہرگز نہیں آپ کی بہادری اور حوصلے نے مجھے یحییٰ آپ کا مداح بنا دیا ہے۔ میں آپ پر فخر کرتا ہوں۔"

"وہ تو اپنی طرف سے پیسے دے رہے تھے۔ باقی نے منع کر دیا۔"

"اے دادا! عاتکہ بی بی دادا! کیا خوب صورت رہائش گاہ ہے۔ چاچی! اس میں تو روشنی کا بھی نظام ہے۔ ارے کھڑکیوں پر پردے بھی لہرا رہے ہیں۔ لو بجھتی لہرونی دروازے پر تکی بھی ہے۔ چلو جانکا ڈیر تم اندر چلو جا لڑیٹھو میں تکل کروں گا۔ تم دروازہ کھولنا مجھے ریسو کرتا اور وہاں ہی میں اپنی سرخ نیوٹا میں مجھے چھوڑ آنا ہو شل۔" شہیر معصوم بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا۔

"شہیر! بالکل بچہ ہوتے..... ابھی گوہر کے ساتھ جاؤ اور اسے واپس کر دو۔" آمنہ خاتون سنجیدہ لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"مامی؟" گوہر مستثنائی۔ کتنی عجیب بات کہہ رہی تھیں وہ۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں جانکی۔"

"تج کہہ رہی ہوں۔ تعلق کی میں نے جو اسے ساتھ بھیج دیا۔ بھلا ہو جو تو مسز انضال علی کے ہاں تو ہر ماہ ایک تقریب ہوتی ہے۔ کیا ہم ہر ماہ ایسا تھا نہیں دیتے رہیں گے۔ تحفے کے لیے بھی کوئی حد ہوتی ہے سو دو سو چار سو پانچ سو۔ یہ کیا کہہ....."

"تو اس میں سیکے کی کون سی بات ہے عاتکہ بی بی گڑیا پر پینٹ کر دیں اور گھرا اپنے پاس رکھ لیں۔" شہیر نے ذرا ایک ٹیک مشورہ دیا۔

"عاتکہ پھر منہ بسورنے لگی۔"

"بی بی سیریس بی بی ایزی عاتکہ! شہیر ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ کو یہ خرچہ بند ہے تو آپ کے کمرے میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔ آپ اپنی فریڈ کو یہ گڑیا دے دیں بہت پیاری ہے۔ دیکھ لیجئے گا ایسا تھا اور کسی کی طرف سے نہیں آیا۔" گوہر نے عاتکہ کا بازو تھاما۔

"ہاں! بیٹر۔ یہ گھر مجھے پسند آیا ہے۔ جب یونیورسٹی الیکشن جیت کر میں صدر بنو جاؤں گا تو ایک پارٹی دونوں کا تم سب لوگوں کو..... تم یہ تھو مجھے پر پینٹ کر دینا۔ کیونکہ مجھے یہ گھر بہت پسند آیا ہے۔ میں اسے مال کے طور پر لکھ چھوڑوں گا اور کسی دن یہاں ایک گھر بنواؤں گا۔ جہاں میں اور میرے بچے چین سے رہیں گے۔"

شہیر نے شہرے تگا ہوں سے گوہر کی طرف دیکھا۔ اس کے خطا ہوتے اور سامان بحال ہونے لگے۔ وہ اس کا ہاتھ نہیں اٹھاتا۔

"بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں عاتکہ۔ ایسا قیمتی اور پیارا تھا تم اپنے شہیر بھائی کو ہی دینا۔" آمنہ خاتون نے بھی ناصحت کی۔

"او۔ کے مٹی۔" عاتکہ راغنی ہوئی۔

"چلو آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں تیار کر دوں اور گوہر پلیز تم یہ گڑیا گھنٹ بچہ میں پیک کر دو۔ بیچہ اور ڈورٹی ڈارٹی میں ہوں گے۔ قینچی اور گم وغیرہ بھی۔"

"تھیک ہے مامی! آپ اسے تیار کرادیں۔"

وہ ان کے پیچھے پیچھے چلی۔ سامان نے کر دیا پس آئی تو شہیر وہیں بیٹھا تھا۔ مسکراتا ہوا اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔

"اے بے نیاز سنگ دل نڈکی!" وہ اب بھی مسکراتا ہوا تھا۔ گوہر نے اس کی طرف دیکھا۔

"تم نے ماہر دولت سے یہ نہیں پوچھا کہ آج کے دن ہمارے ساتھ کیا ہوا۔ ہم کتنے خوش ہیں۔ اسے خوش اسنے

گھر تک کا سفر خاموشی میں ہی کٹ گیا۔ بس اگلی نشست پر بیٹھی عاتکہ جو بی بی ماسون واسطی سے انہیں دو گئی تھی۔ اس سے باتیں کرتی رہی۔ گجڑی گیٹ پر روک کر وہ اترا۔ ساغر خود ہی دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ گوہر نے بھی ماسون کے آنے سے پہلے دروازہ کھول دیا۔ عاتکہ کو اس نے خود اتارا۔ ساتھ رکھا سامان اٹھا کے ساغر کے ہاتھ میں دیا۔ اور خود ڈرائیو تک سیٹ کی طرف بڑھا۔

"ارے۔ ماسون صاحب! اپنی دفعہ تو آپ حاتم طائی۔ حضور راہ بلکہ سب کچھ بن گئے اور ہری پارٹی آئی تو بھانگے کے گجڑی میں چاہیے۔ آپ نے ناچانے کی ایک پیرالی ہی سہی۔ مٹی! ارڈینی سے آپ جیسے اچھے انسان کی ملاقات بھی ہو جائے گی۔"

"کوئی بات نہیں ساغر عسکری۔ گڈ بوائے ایسی ملاقاتوں کے بڑے موافق آئیں گے۔ وہ یوگنڈا لک بانے! اے۔" ایک نظر گوہر پر ڈال کر اس نے زن سے گاڑی نکالی۔ گوہر کے سامنے صرف غبار رادی باقی رہ گیا۔

"چلیے باقی۔"

ساغر نے اسے پکارا تو وہ جیٹ کی طرف بڑھی پورج میں شہیر کی سوزوکی کھڑی تھی۔ گوہر کا دل دھڑک گیا اس نے جھٹ ساغر کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنے کا لب کھولے۔ لیکن کہہ نہ سکی۔ اس کے قدم ہلکے کھڑے تھے۔

☆ ☆ ☆

عاتکہ تحفوں کا لاجھاٹھائے بھانگی بھانگی اندر ملی۔ ساغر نے لان کا رخ کیا۔ اس کے قدم ہلکے ہلکے تھے۔ شہیر اس سے خطا ہو کر گیا تھا۔ یہ بات۔ اپنی بگناہ سے تو اس بات کا خوف تھا کہ ابھی عاتکہ اور ساغر ساری بات کو سنا لیں گے۔ اور بتائے بنا چارہ نہیں ہوگا کہ بازار میں مل جانے والا کون تھا؟ وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو عاتکہ شہیر کی گود میں بیٹھی تھی اور آمنہ خاتون تحفے کھول کر دیکھ رہی تھیں۔

"! وہ مائی گاؤ گوہر..... یہ مکان کتنے کا ہے....."

"چھوڑیے چاچی! اللہ نے اتنا کچھ دے رکھا ہے جتنے کا بھی ہو۔ اللہ خوش رکھے ہماری عاتکہ جیمہ تو رخصتی ہو گئی ہیں۔"

"اور یہ گڑیا بھی ساتھ میں لے لی۔ گوہر! میں تو نہیں سمجھ پا رہی کہ یہ سب کیا ہے۔"

"مٹی..... گوہر! میں نے اپنے پیسے بھی لگا دیے۔"

"گوہر! کیا میرے دیے ہوئے پیسے؟"

"ہاں مٹی! یہ تو بھرے بازار میں ہی رونے بسورنے لگی تھیں۔ میں کیا کرتی۔"

"جی ہاں۔ آپ کیا کرتیں۔ ساغر بھائی مجھے ڈانٹ ڈپٹ کر واپس لے آتے دو تو اچھا ہوا کہ ماسون بھائی مل گئے۔"

"ماسون بھائی؟" آمنہ خاتون نے جھٹ پوچھا۔

گوہر نے شہیر کی طرف دیکھا۔ وہ ان سے ذرا دور قائلین پر عاتکہ کا گھر رکھے اسے بغیر دیکھ رہا تھا۔ اس طرف توجہ ہی نہیں تھا۔

"ہاں مامی! یونیورسٹی کا ایک لڑکا ہے۔ ماسون۔ مجھے جانتا ہے ازراہ اذاتی رک گیا۔"



خوش کہ عام معافی کا اعلان کر چکے ہیں۔ اور اس طرح تمہاری جان بخشی ہوگئی ہے۔ ہم اس وقت بھول چکے ہیں کہ صبح تم نے ہمارے ساتھ گستاخی کی ہے ہمارے توہین کی ہے۔ ہماری خوشیوں میں شرکت سے انکار کیا ہے۔ گوہر جو اپنے تئیں خود کو اس سے بھی بڑا مجرم سمجھ رہی تھی۔ جو اب میں کچھ نہ کہہ سکی۔

”گوہر! کاغذات نامزدگی داخل ہو گئے ہیں۔ گوہر! جو نئی یونیورسٹی میں یہ خبر پہنچی۔ لڑکے لڑکیاں دوزخ سے بچنے آئے۔ آفس کے باہر ہجوم تھا۔ بے کراں ہجوم۔ کئی منچلوں نے وہیں غم سے بازی شروع کر دی۔ مجھے کندھوں پر اٹھا کر آفس تک لے گئے۔ میں تو اب بھی نہیں سمجھ سکتا کہ اتنے لوگ مجھے جانتے ہوں گے کہ مجھے پسند کریں۔ نہیں احمد کے اصرار پر مجھے اس ہجوم کے سامنے ایک مختصر سی تقریر کرنا پڑی۔ گوہر! لڑکے تو مجھے بولنے کا موقع بھی نہیں دے رہے تھے۔ بس چاروں طرف تالیوں کی گونج تھی جس میں میری آواز دب کر رہ جاتی تھی۔ میرے علاوہ صدر کی نشست کے لیے تین اور لڑکوں نے بھی کاغذات داخل کرائے ہیں ان کا تعلق طلباء کی مختلف جماعتوں سے ہے جو کہ عدم ہیں۔ ان کے پاس اپنی اپنی جماعتوں کے پروگرام اور منشور ہیں۔ لمبے چوڑے دعوے ہیں۔ ہرے پاس..... میرے پاس ایسا کوئی منشور نہیں۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں گوہر! آٹھ دس دن جو ہمیں اپنی کونویٹک کے لیے ملیں گے۔ ان دنوں میں طلباء و طالبات کو آ کر کچھ تو جانا ہوگا کہ مجھے صدر بن کر کیا کرنا ہوگا؟ ایسا کروا کر زبردست قسم کا پروگرام یعنی منشور تیار کر دو گوہر۔ آخر تم میں لکھنے کے معاشرے کی ذمہ داری کون کون سے جراثیم موجود ہیں۔ اور..... اور..... تم میرے بارے میں بھی جانتی ہو اور میرے ارادوں سے بھی آگاہ ہو۔ زندگی میں ایک کام مجھ سے نہیں ہو سکا اور نہ ہی کبھی ہو سکے گا۔ وہ یہی ہے یعنی لکھنے کا کام۔ میں کبھی سہولت سے ایک خط بھی نہیں لکھ سکا۔“

گوہر بھی مسکرانے لگی۔

”شعی! تم نے آج تقریر کرتے ہوئے کیا کہا؟“ اسے اشتیاق تھا۔

”کیا کہتا۔ سوائے اس کے کہ۔ میں طلباء کو اچھا نہیں سمجھتا۔ مقررہ راستے سے بنا کر نئی ڈگر پر چلانا چاہتا ہوں۔ حقیقی اور عملی زندگی کی طرف لانا چاہتا ہوں۔ کھتیں پھیلا کر چاہتا ہوں۔ بھائی چارے اور اخوت کو رواج دینا چاہتا ہوں۔ خیبر سے کراچی تک احساس وحدت پیدا کرنا چاہتا ہوں اور طلباء یونیورسٹی کو سیاست دانوں کی تازہ نگاہ نہیں بنانا چاہتا۔ بلکہ یونین کی کارکردگی کو یونیورسٹی کے احاطے میں موجود طالب علموں کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ یونیورسٹی کو صرف تعلیمی ادارہ رکھنا چاہتا ہوں۔ نظم و ضبط کی مثال بنا چاہتا ہوں کہ مہذب معاشرے کے لڑکوں کو اس پر رشک آنے لگے اور یہ کہ اگر ہماری ذات اپنے اس ماحول کے چند مسائل حل کرانے میں کامیاب ہو جائے تو یہ میری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔“

”دنڈرقل! اونڈرقل! سمجھو کہ منشور تیار ہو گیا۔“

”کیا مطلب؟“ شبیر نے احمقانہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں..... ہاں..... رات میں لکھ دوں گی سب کچھ لیکن شبیر جو کچھ میں لکھوں گی وعدہ کرو کہ تم اس پر عمل کر کے اسے زندگی بھرنا ہو گے۔ اپنے الفاظ پر مجھے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔ دو بے حسنی ثابت نہیں ہوں گے۔“

”وعدہ جناب وعدہ! جنٹل پراس! ہم تو چاہتے ہیں کہ ہمارے لیے کوئی راہ دشمنین کی جاسے۔ منزل کا نشان دیا جائے۔ جدہ جہد کے لیے کوئی کار ہو..... مجترمہ گوہر غامض مسکرتی صاحب آپ کچھ فرمائیں گی بندہ اپنی بھرپور کوشش اس پر لگا دے گا۔ لیکن خیال رہے وہ سب کچھ ملک و ملت کے مفاد میں ہو۔“ گوہر ہنسنے لگی۔

”تم تو بس تیار بیٹھے تھے تقریر کرنے کو۔“

”جج بے کے غور پر تمہارے سامنے ہی تقریریں کیا کروں گا۔ کم از کم فی الوقت گندے انڈوں اور نمائندوں کا ہاتھ نہیں رہے گا۔ کچھ جانبداری تو ہوگی نا۔“

”بہت خوب! تو جج بے ابھی سے سیاست دان بننے کی سوچ رہے ہیں۔ خواب دیکھنے لگے ہیں۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ ہنسنے ہوئے انکار کر رہا تھا۔

”پھر.....؟“

”سنا تو یہ سبیل مذکورہ کہہ رہا تھا۔ وہ یاد آیا مزے کی بات سنو۔ کچھ دوست ہیں تو کچھ دشمن بھی۔ مقابلے پر نے والا جانتی ہو کون ہے؟“

”نہیں؟“

”ارے بھئی دبی دشمن جاں۔“ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

”کون؟ کون دشمن جاں؟“

”سکندر پور والوں کا نور چشم مامون واسطی۔“

لوہر کا دل تیزی سے دھڑکا۔

”میں جانتا ہوں یہ سراسر دشمنی کی بنا پر ہے۔ وہ کسی صورت ہم سے کم نہیں رہنا چاہتے نا۔ اس کے حامیوں نے ان آفس کے باہر نعرہ بازی شروع کر دی۔ لگتا ہے اس نے اپنے ہی خواہوں کو بھی سب کچھ بتا رکھا ہے۔ ان لانداز میں ذاتیات کا خاصا دخل تھا اور ایسے محتالوں میں ذات درمیان میں آ جائے تو معاملہ خاصا نازک ہو سکتا ہے۔“

لوہر کی نگاہوں میں مامون واسطی کا سراپا آ گیا جو ابھی کچھ دیر قبل اسے اس گھر کے گیٹ پر چھوڑ گیا تھا۔ وہ تو اٹا کرنا ایسا ہوا کہ کھیل کے جنون میں ساغرا آتے ہی لان میں رگ گیا اور نہ۔ وہ تو ضرور ذکر کر رہا ہر بات کا۔ نہ جبر جبری ہی آگئی۔

”لیکن ایسی بھی کوئی بات نہیں گوری! یونیورسٹی میں اگر بحیثیت لیبر اس کی دھاک ہے تو شبیر بھی تم پاؤں نہیں اور ہوتا سکی ہے کہ خاموش اثریت سچائی اور شرافت کا ساتھ دیتی ہے۔ میں خاصا پر امید ہوں۔ میرے ذہن چند بے رنگ نامیں گئے اپنی مسافت بروئے کار لانے کا موقع ضرور ملے گا۔ بس تم جلدی سے منشور لکھنے کی تیاری کرو۔ چاہو تو مجھ سے ڈسکس کر لو۔“

”نہیں شعی! ڈسکس کی ضرورت نہیں۔ میں لکھ دوں گی تم چیک کر لینا جو بات غیر مناسب لگے گاٹ ریٹا۔“

”تھینک یو اس تعاون پر۔“

”کوئی ضرورت نہیں۔ میں بھی تو اس تعلیمی ادارے کا حصہ ہوں اپنا فرض ادا کروں گی۔“

”ارے ہاں یاد آیا۔ یعنی اس لائن کے لیے زبردست لفاظی کی بھی ضرورت ہوتی ہے ہو سکے تو ایک گرامر ماسٹر بھی تیار کر دینا جو میرے اندازوں کی خوب صورت نقلی تصویر بنے۔“

”ہر مسکرا دی۔“

”رقابت! اپنا اثر دکھارتا ہے آپ جناب بھی خوب صورت الفاظ بولنے لگے ہیں۔“

”آپ کی کرم نوازی ہے حضور؟“ وہ اور بھی آواز میں ہنس دیا۔

"تم اسد ہو یعنی لیو۔؟" اس نے سوالیہ انداز میں کہا حیرت کے ساتھ۔  
 "کیوں کوئی شک ہے؟"  
 "نہیں بات یہ ہے کہ میری تاریخ پیدائش ۱۲ اگست ہے۔"  
 "ارے۔۔۔ ۱۲ اگست۔"  
 "کیوں؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "بھئی حیرت انگیز بات ہے۔ یعنی تاریخ پیدائش ایک ہی۔ فلذا برج بھی ایک۔"  
 "کیا تم..... تم بھی ۱۲ اگست کو پیدا ہوئے تھے؟"

"ہاں میں بھی۔ گوری ہم اپنی شادی کی تاریخ بھی یہی رکھیں گے۔ اسے ایک یادگار ترین دن بنا دیں گے۔  
 ایسے اب تو کسی ماہر علم نجوم سے رجوع بہت ضروری ہو گیا ہے۔ اسد سے اسد کی رفاقت۔ یعنی شیر کا شیر سے  
 مقابلہ۔ ہا..... ہا..... وہ ۳۰ مئی بار اس کے سامنے اس طرح نہیں رہا تھا۔  
 "خدا خیر کرے جنٹل کا بادشاہ جنٹل میں اپنے سوا کسی کی حکومت پسند نہیں کرتا اور خیر پھر کسی وقت ہمیں بتاؤں  
 گا۔ اس مسئلے کے بارے میں فی الحال تم اس تقریر اور منشور کا سوچو۔" وہ ایک لخت سنجیدہ ہو گیا۔  
 ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

بیارے غدی اسدا خیش رہو۔

سوچتا تھا۔ زندگی میں کبھی کسی کو ایک صفحے کا خط بھی نہ لکھ سکوں گا۔ لیکن تمہارے دور جانے پر پتا چلا کہ جدائی  
 کے لیے خطوں کو اتنا بے تاب کر دیتے ہیں کہ وہ سب بھی ہو جاتا ہے جو قصور میں ممکن نہیں ہوتا۔ اسد وہ آپا کی  
 طبیعت کے پارے میں سن کر احمینان بھی ہوا اور پریشانی بھی۔ یہ کیسی عجیب بات ہے..... کہ وہ پورے چھ ماہ  
 ہسٹریٹ پر ہی رہیں گی۔ بولنے اور بولنے سے قاصر۔ لیکن صد شکر کہ ان کی جان بچ گئی۔ مئی کیسی ہیں..... عذرا  
 مددہ آپا کے پاس رہتی ہے یا گھر میں۔ ڈیڑی نے خون پر بات کی پانچ منٹ میں کیا کیا کہا سنا جاتا لائن کئی تو دل  
 برا ہو گیا۔ مئی چاہا ڈر کر تم لوگوں تک پہنچ جاؤں۔ لیکن ایسا ناممکن تھا۔ گو میں آج کل بے حد مصروف ہوں لیکن دیکھ  
 لو نہ تمہیں ایک ضویل خط لکھنے کے لیے وقت نکال لیا ہے میں نے۔ ڈیڑی کو جب میں نے بتایا کہ میں انکیشن میں  
 کھڑا ہوں باہر تو وہ بے حد خوش ہوئے۔ مجھے جھلکا جھٹکا۔ غدی! ڈیڑی کی ایسی جھلکا افزائیاں ہر موڑ پر میرے  
 قام آتی ہیں۔ وہ میرا آئیڈل ہیں۔ میں ان کے کردار کی ساری خوبیاں اپنے وجود میں خیر نے کی سلی تا عمر کر رہا  
 تھا۔

تمہیں یاد ہو گا عدی اسکندر اور واہن سدا۔ جس میں لڑکیوں کے اغوا کا جرم عاید کیا گیا تھا مجھ پر اور اس حوالے  
 سے ایٹن واسطی بھی یاد ہیں گے۔ ان کا لڑکا ہامون واسطی میرے مقابلے میں انکیشن لڑ رہا ہے۔ خانہ دانی دشمنی  
 یونیورسٹی کے احاطے میں بھی آ گئی ہے۔ آج کل انتہائی مہم اپنے زوروں پر ہے۔ دئی۔ تی صاحب نے میری  
 برخواست پر اپنے اختیار رات کا استعمال کرتے ہوئے اس مہم کو یونیورسٹی کی حدود تک محدود کر دیا ہے۔ پھر بھی وہ  
 دنیا بھی کوئی چھوٹی سن چکے نہیں۔ کوئی گوشہ کوٹا ایسا نہیں جہاں بیہرز نہ ہوں۔ ہر لڑکا ہر لڑکی اپنی اپنی جگہ مستعد  
 ہے۔ اپنے اپنے پسندیدہ امیدوار کے لیے۔ تم ساتھ ہوتے تو یہ لطف کچھ اور ہوتا۔ فہم ائمہ میری مہم کا انچارج  
 ہے۔ مجھ ممتاز فیاض شوکت اور جاوید بھی بھرپور ساتھ دے رہے ہیں۔ مجھے تو بس یہی خبر ہوتی ہے کہ فضاں  
 ہشت، مجھے ایک اجتماع سے خطاب کرنا ہے۔ عدی! اگر کے میری باتیں جو بے غور سے سنتے ہیں۔ شاید یہ ان الفاظ

تختہ پیک ہو گیا۔

"یہ گھر کیسا ہے گوری؟" شبیر نے اس گھر کی طرف اشارہ کیا۔  
 "اس کی ڈھانٹ کا تیر پور عکاس۔ جس نے بھی اسے بتایا۔"

"حیرت ہے کیا بعض لوگ دوسروں کے خوابوں کی عملی صورت اجاگر کرنے میں بھی ماہر ہوتے ہیں؟ لگتا ہے  
 بنانے والے نے میرے ذہن میں جھانک لیا ہے۔ میں نے تمہارے حوالے سے جو خواب دیکھے ہیں ان تک  
 چھوٹا سا ہی مگر ایسا ہی ایک گھر اول اول ہے۔ کیا تمہیں پسند آیا؟"  
 "میں خوابوں کو دل گئی کے سوا کچھ نہیں مانتی۔ فرض کر رہی ہوں میرے لیے ایسا گھر نہ بنا سکے تو؟"  
 "تو یہ کہ تم رفاقت سے انکار کر دینا۔" شبیر نے مذاق میں بات اڑائی۔

"نہیں شبیر عسکری! ایسا نہیں ہو سکتا۔ رفاقت کی تمنا ان تمام چیزوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ ہمیں تو بس ایک  
 انسان عزیز ہوتا ہے۔ پھر اس کی زندگی میں جو کچھ بھی ہو ہم اسے اپنا مقدر سمجھتے ہیں۔"  
 "اتنا بھی پرکینیکل نہ بناؤ مجھے گوری! جس میں حسین خواب نہ ہوں! مقلید نہ ہوں۔ آرزوئیں نہ ہوں! زندگی  
 وہ بھی نہیں۔ اچھی امیدیں انسان کو اندر سے زندہ رکھتی ہیں۔ کیونکہ اندر کی دنیا کو بھی تحریک کی ضرورت ہوتی ہے۔  
 اور تحریک کے لیے زندہ ہونا ضروری ہے۔"

"یعنی آپ چاہتے ہیں میں بھی ایک ایسے گھر کا خواب دیکھنے لگوں آپ کے ساتھ مل کر۔"

"آف کورس؟" شبیر نے مزے سے اقرار کیا۔

"ٹھیک ہے جناب! جب تک ایسا ایک گھر آپ کا نہیں ہوگا۔ میں آپ کی دنیا میں آنے سے انکاری ہوں  
 اور آپ جانتے ہی ہیں میں اپنے امانتے کی کتنی پکی ہوں۔"  
 "بہشت۔ ابجا پسند لڑکی۔ ارے یاد آیا۔ یہ تمہارا اشارہ کیا ہے۔ تاریخ پیدائش کے حساب سے؟"

"میں ستاروں پر یقین نہیں رکھتی۔"

"کیا مطلب؟ گویا ستارے تم پر یقین رکھتے ہیں۔ آئی مین..... تم۔۔۔ وقت کی گردش اپنے حق میں کر سکتی ہو۔"  
 "جی نہیں اتنی بھی اہم ہستی نہیں ہوں۔ اس نے منہ بنایا۔  
 "بھئی میں نے تم سے تمہاری ڈیٹ آف برتھ پوچھی ہے۔"  
 "کیا کرو گے مجھے زندگی کا ایک سال تم ہو جانے پر تحفے لینے کا کوئی شوق نہیں۔"  
 "تختہ جنس دوں گا کسی نجوی سے زانچہ تیار کرادوں گا اپنا اور تمہارا کہ تم ایک دوسرے کے لیے کیسے ثابت ہوا  
 گے۔"

"حی! تمہیں ان باتوں کی پرواہ ہے؟ آئی مین فٹ پاتھ پر بیٹھو ان کچھ لوگوں کی باتوں کی باتوں کی لکیر وا  
 کی۔"  
 "فٹ پاتھ۔ کسی باتیں کرتی ہو۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا اب تو اپنی قسمت کا حال پوچھنے کے لیے آپ کو کچھ  
 پہلے وقت لینا پڑتا ہے پانچ سبھرا نہیں دینا پڑتی ہے۔"  
 "ترس آتا ہے مجھے ایسے لوگوں پر جو قسمت کے حال پر یقین رکھتے ہیں۔"  
 "بہر حال میں پھوپھو سے پوچھ لوں گا نہ بتاؤ تم۔ لیکن عرض ہے کہ میں برج کے اعتبار سے اسد ہوں۔"

جو ایک ہی ملک ایک ہی قوم کے تازہ اذبان کو ترقی کے راستے سے ہٹا کر ادنیٰ متوق اور وسائش کی تہذیب میں نا انصافی کے سمیٹے سانس میں الجھا کر باؤں میں لٹرتے بے زارنی اور دشمنی کے بیج بو دیتے ہیں۔ ان چہروں کو جو لعلوں کو جلا کر ہشت گرد بنا دیتے ہیں بے نقاب کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہوگی۔ ان لوگوں کو کیفر کر دینا ان کی ہم اپنا سفر صحیح راہوں پر جاری رکھیں گے۔

یہ وہ مذاق مست اڑانا ہے سب کچھ میرے دل کی آواز ہے مجھے اس پر عمل کرنا ہے۔ انٹیلین ہارورڈ تاریخ کو دہا ہے۔ ہمیں صرف آنیوں بعد۔ یہ ان بھی ایک کڑی آزمائش ہیں۔ بیجان آمیز اغیر یعنی سے لے آسن و یاں میں ہمارا رکھنے والے۔ پیارے ندی، اوغا کرنا میں اپنے سارے ارادوں میں کامیاب ہو جاؤں۔ میں نہ آؤں انہوں کو تازگی بخش سکوں انہیں صاف ستھرا کر سکیں۔ معاشرے کو نوے فیصد لوگ سخت ترین خود فریبی کا شکار ہیں۔ یونیورسٹی میں سو ہو وہاں ہاں؟ خراں معاشرے کا حصہ ہیں بلکہ نمائندہ ہیں۔ وہ تعلیم اس لیے حاصل کرتے ہیں کہ زندگی کی حدود سے کوئی اچھی نوکری تلاش کر سکیں۔ وہ کہتا ہیں اس لیے پڑھتے ہیں کہ انہیں یاد رکھنے کے امتحان میں اچھے نمبر حاصل کر سکیں۔ میں ان میں یہ نمونہ پیدا کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کتابوں میں ناسی اچھی باتیں ملنے کے لیے بھی دل و دماغ میں محفوظ رکھیں۔ کچھ ایسا ہی ان کا مقصد ہو۔ چھوڑنے کے لیے بھی تیار ہیں۔ وہ اچھے امین ہوں انہیں انسانیہ کا احترام آتا ہو۔ وہ شہرت اور تکیہ نامی کے لیے نہیں کرتا ہوں کی ہمدردی اور خدا کی خوشنودی کے لیے کچھ کر دکھائیں۔

مزے کی بات سنو عدوی! ان آٹھ دس دنوں میں کئی سیاسی راہنماؤں کی طرف سے شہر سگالی کے جذبات سے پر پھیلاؤت مجھ سے نام آئے۔ کئی ایک سے فون پر بات ہوئی۔ ان میں سے سب کے سب مجھے اپنے دامن شفقت و محبت میں پناہ دینے کو تیار تھے کئی ایک نے ملاقات کا شرف بھی بخشا دوست تعاون بڑھایا۔ طلبہ کی تلاج و ہیرو کے بھانے سوئی تو م دینے کی آفر بھی کی، میں نے ہر ایک کی بات سنی ہر ایک کی ہمدردی پیش کشوں پر غور کیا۔ شاید میں انتہا پسند ہوں! بے اعتبار ہوں یا ضرورت سے زیادہ، مشریت، قادر اور ہوں۔ کوئی مجھے اپنی قبیل کا نظر نہیں آیا۔ میں نے ان سب سے معذرت کر لی۔ یہ کہہ کر کہ میں طغلی کتب ہوں مجھے سیکھنے، سمجھنے اپنے مقصد کو واضح کرنے دیکھنے اپنے طمع نظر کو عام کرنے دیکھنے خود کو کچھ کرنے کے تامل پایا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔

عدلی اماموں واسطی اپنی ہم پر بے دریغ عیسے لگا رہا ہے۔ آئے دن کسی ہوٹل میں کسی نہ کسی جہانے وہ لوگ جمع دہتے ہیں، بوٹس اڑانی جاتی ہیں۔ میرے پاس آئیے کاموں کے لیے کوئی رقم نہیں ہے۔ اور تو اور..... پایا کو میرے اس اقدام کی خبر بھی نہیں ہے..... اور دلتواڑ چچا میرے لیے اتنا کچھ کر چکے ہیں کہ ان سے ایک اپنی مانگنے کو بھی نہیں خواہا نہیں کرتا۔ تم حیران ہو گئے سب کچھ میرے جماعتی اقا کرو ہے ہیں۔ یہاں تک کہ ہیرز بھی ہم نے کسی آرٹس ڈینٹرس سے نہیں تیار کرائے۔ لڑکیوں نے یہ ذمہ داری از خود اپنے ذمے لے لی ہے جانے کیسے یہ سب کچھ کیا۔ بڑا لطف آتا ہے۔ جب ہم دور سے دیکھتے ہیں کہ سامنے کسی گراؤند میں طلبہ کا بہت بڑا اجتماع ہے۔ قریب جاتے ہیں تو خبر ہوتی ہے کہ کوئی شعلہ میاں متر رہا ہے اجلی اجلی و حار تقریر میں کسی شہیر شاہنواز کی تقریر کے جھمکے سجے اوصاف بیان کرنے میں لگی ہے۔ میں بھی کسی کو نے میں کھڑا اس تقریر کو سننے میں لگا ہوتا ہوں اور عدی چچا پوچھو تو اندر ہی اندر راز جاتا ہوں، کانپ جاتا ہوں! بے اعتبار نام آنکھوں کے ساتھ دل مجھو دیا ہوا جاتا ہے کہ خدا مجھے یہ سب کچھ کرنے کا حوصلہ دے دے۔

کا اثر ہے ہو (وہ گویا کا ذکر گول کر لیا) خیر چیور وہ۔ شاید یہ میرے اخلاص کا اثر ہے۔ میں نے اپنے لیے ہا جہ وہ بند کھین رکھی ہے۔ اس کا کیا کہ حسب ذیل ہے۔ (مشہور منجمن نقل کر رہا ہوں)

- 1- کسی بھی اجتماع میں ایک شخص اپنا سر بڑا نہ ہو تو وہ اجتماع ایک بے تنظیم گروہ کے سوا کچھ نہیں ہوتا میرا عہدہ صرف برائے عہدہ نہیں ہو گا بلکہ اسلٹ ترین ذمہ داری کا لوجہ ہو گا جسے اپنے اہم خیال لوگوں کے تعاون سے نظر بنی احسن الخاسوں ہو۔
- 2- طلبہ کی معاشرتی و سماجی حیثیت سے متعلق ہمیں پچیس سال پرانی روایت منائی جائے گی۔ وہ ملک میں بد امنی اور نا انصافی کا مظاہرہ کرنے والا ہر ذول ہمت نہیں ہوں گے۔ بلکہ آئین منظم جماعت ہوں گے جو طلبہ انہیں مزاحمت کی آئینہ دار ہوگی۔
- 3- یونین کے سارے عہدہ ہدار چلی تو اس طاقت و پختہ اور منجملہ کارکردگی یونیورسٹی کے ماحول کو بہتر بنانے میں صرف کریں گے اور وہ صرف اپنے حامیوں کے ہی نہیں بلکہ یونیورسٹی میں موجود تمام طلبہ و طالبات کے فرائض انجام دہوں گے۔
- 4- یونین دہشت گردی سکھانے کی اکیڈمی کے بھانے اغوت اہمائی چارے اور اتحاد کا سبق دینے والا ایک اعلا ہدر سے ہوں گے۔ جہاں ایثار و محبت۔ اعلا تقویٰ ماحول اور وقت کی پابندی سب پوزیشنز کے مقصد ہوگا۔
- 5- اپنا عہدہ آپ کے ذریعہ اصولی کے تحت یونین اپنے فنڈز انتہائی مناسب طریقے سے خرچ کرے گی۔ اپنے کا استعمال بے معنی تقاریب نہ کرنا۔ پوزیشنز پر نہ کرنا۔ بلکہ حق و طلبہ و طالبات کے لیے ہوگا۔
- 6- یونیورسٹی کی حدود میں اسلحہ اور منشیات پر عمل پابندی ہوگی۔ مسائل کو اپنی گنت و شنید کے ذریعے حل لیا جائے گا۔ طاقت کے استعمال سے نہیں۔
- 7- مسئلہ خواہ طلبہ کا ہو خواہ عوام الناس کا، مذہبی ہو یا معاشرتی اور سماجی اجتماع کا طریق کار بدل دیا جائے گا۔ طلبہ یونین کے عہدہ ہدار ان مسائل کو اپنے اہماتہ کے ذریعے اعلا کمان تک پہنچائیں گے۔ تشدد کی رو سے حتی الوسع گریز کیا جائے گا۔ بات بے بات جلوس پر تشدد مظاہرہ، توڑ پھوڑ، حمل و غارت، جلاؤ گھیراؤ وغیرہ وغیرہ ان سب پر پابندی ہونی۔ انفرادی خلاف ورزی پر سربراہانہ کو حل حاصل ہوگا کہ وہ مذکورہ طالب علم کو ایک خاص مدت کے لیے تعلیم کے لیے نااہل قرار دیتے ہوئے ادارے سے نکال دے۔
- 8- ہم سب اپنے طرز عمل سے اس خوف کو مٹانے کی کوشش کریں گے جس کے تحت شرنا و اپنی بیٹیوں کو یونیورسٹی یا بعض دوسرے اداروں میں پڑھانے کا سوچ کر ہی گھبرا جاتے ہیں۔ ہم یونیورسٹی کو اپنی گھر بنا لیں گے جہاں رہتے ہوئے لڑکیاں خود کو خیر محسنوں محسوس نہ کریں بلکہ انہیں اپنے بیانیوں کی طاقت اور غیرت پر غرہ اور خود کو محفوظ و مامون خیال کریں۔
- 9- اساتذہ کے احترام کو صرف زبانی جمع خرچ کی حد تک محدود نہیں رکھنا جائے گا بلکہ طلبہ میں اس عمل کو یقینی بنایا جائے گا۔ جس قوم میں غلاموں کی عزت و احترام کا جذبہ باقی نہ رہے، اظہار طوقی طور پر بہت پس ماندہ ہو جاتی ہے۔ اساتذہ اور طلبہ کے درمیان موجود ایک مضبوط ترین تعلق اور رشتے کو ان مخلوط پراہانہ کیا جائے گا جہاں ذمہ داری احترام، شفقت، محبت، عزت، محنت، لگن اور فرض شناسی ہر جذبہ اپنی جگہ واضح صورت میں موجود ہے۔
- 10- ملک دشمن عناصر کی زیر زمین تنظیموں کو یونیورسٹیوں کے معاملوں میں پھینکے گا کوئی موقع فراہم نہ کیا جائے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

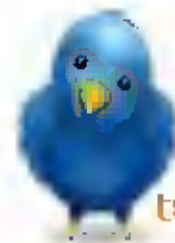
# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)

"اولاد ولا۔ کیسے بچی خواہ ہیں آپ۔ کیسی عجیب امیدیں ہیں آپ کی۔ میں نے آج تک ایسی بات کسی اور سے نہیں سنی۔"

جادو آج سن لی۔ عدی اتم ایسا کرو۔ جا کر یونیورسٹی کے نمبر پڑھائی کرو۔ شاید وہ مل جائے۔  
"میری ضرورت نہیں ہے بات کرنے کی۔ وہ میرا بیٹا ہے میں ہی اس سے بات کروں گی۔ ماں کی دعاؤں کے وہ جیت گیا ہو تو آپ کو تو دکھ ہی ہو گا نا۔"  
"ال احمد نہیں دیے۔"

"اورت ہونا محدود دھکل ہے بات مجھ ہی نہیں سکتیں۔ وہ مجھے بہ نسبت تمہارے زیادہ عزیز ہے۔ اس کی جیت اورت تم سے زیادہ مجھے ہے۔ پریشانی کے ان لمحات میں بھی میں ایک ہل سے نہیں بھولا اور اب بھی تم سے اور بے شک ہوں۔"

دن وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ شاید ٹیلی فون کرنے گیا تھا۔ جمال احمد ڈاکٹر ہنری کو شبیر کے بارے میں بتانے لگا۔

"کسی بھی قوم کو اس کے سرکردہ افراد کی روشن سوچ ہی ترقی کی شاہراہ پر گامزن کر سکتی ہے۔ پاکستان سے میرا تعلق ہے۔ مجھے عزیز چیزیں اس سرزمین پر میری بھی ہیں۔"

"تو کسے ڈاکٹر ہنری؟" جمال احمد چوہان گئے۔  
"نہیں نہیں۔ بس دیکھیے نا یہ لڑکا شبیر آپ کے حوالے سے مجھے عزیز ہو چلا ہے۔ تو بانی جدوجہد مجھ جیسے اس دوست انسان کے لیے باعث فخر ہے۔ دنیا کے سارے انسان آدم کی اولاد ہونے والے ہیں۔ وہ بات کا رخ بدل گئے۔"

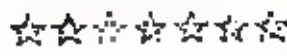
جمال احمد فون کی طرف لپکے۔  
"شبیر کے فون کی آس میں وہ زور سے بولے۔  
"نیری! آپ لوگ جلد آ جائیں۔ آیا کی طبیعت ٹراب ہو گئی ہے۔" غلام نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نیا اور؟" انہی نے تھوڑے پہلے تو ہنسی کی تھی۔  
"نہیں اچانک ہی بگڑ گئی طبیعت۔ ڈاکٹر نے کے لیے بھی حیران کن بات ہے۔ ڈاکٹر ہنری کہاں ہیں۔ ہو سکے تو یہ بھی مطلع کر دیجیے۔ انتظار بھائی ڈاکٹر زائن میں ہیں جانے کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ کس کی رپورٹ کچھ ملے۔"

"نہیں آج ظاہر بھی ہو گیا۔"  
"اچھا اچھا ہم ابھی آ رہے ہیں۔ ڈونٹ وری۔"  
"ماں احمد ڈاکٹر روم میں آئے۔ ٹی منتظر بیٹھی تھیں۔ شاید شبیر کی کوئی خبر ہو۔"

"ان پاکستان سے نہیں تھا اندرا کا تھا۔ ہم لوگوں کا جی باپ مل جاتا ہے۔"  
"یوں؟ کبھی کبھار پہلے ہی تو آپ آئے ہیں؟"  
"ماں اتم ڈاکٹر ہنری کو صورت حال بتانے گئے۔"

"سز جمال آپ یہیں رہیں۔ ہم لوگ جا رہے ہیں۔ عدی نے فون کیا تو اسے بھیج دیں گے۔" ڈاکٹر ہنری بھی بیان ہو گئے اور جمال احمد کے ساتھ باہر نکل گئے۔



اگر کامیاب ہو گیا (یا ر لوگوں کو عدی صد میری کامیابی کا یقین ہے) تو سب سے پہلے تمہیں مطلع کروں گا۔ میرے فون کا انتظار کرنا۔ مٹی سے کہتا میرے لیے دعا مانگیں۔ عذرا کو مجھے یہ سن کر خوشی ہوگی۔ اسے بھی کہنا وہ بھی دعا کرے کیونکہ بہنوں کی دعائیں بھی خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ ڈیڈی نے بتایا تھا کوئی ڈاکٹر ہنری ہیں۔ بہت ہی اچھے سے بزرگ سدرہ آپ کی تعریفوں نے انہیں میرا مشتاق بنا دیا ہے۔ یہ سدرہ آپ اپنی بس بادشاہ ہیں۔ کر دی ہوں گی جائزتا جائزتا تمہیں اور وہ بے چارے کچھ بیٹھے ہوں گے مجھے کوئی ہمسائے تم کی چیز انہیں میری طرف سے آداب پہنچا دینا۔ اور ان کی تصویر بھی مجھے ضرور بھیجنا چاہتے والوں کے لیے کئی دل میں جگہ بن جاتی ہے نا۔ میں بھی انہیں کس کر رہا ہوں۔ انتظار بھائی کیسے ہیں! بہت سارے نپے جذبات ان تک بھی پہنچاؤ۔ تمہارے جواب کا منتظر رہوں گا۔ ماہرا کو میری طرف سے ڈھیروں پیار۔

شبیر عسکری

عدی اردگرد بیٹھے سارے لوگوں کو یہ بھٹ پڑا کر سنار ہا تھا۔ ڈاکٹر ہنری بھی وہاں موجود تھے۔ وہ سب کو باری باری دیکھ رہے تھے۔

"ڈاکٹر ایہ خط میرے بیٹے شبیر کا ہے۔" مٹی نے بڑے فخر سے انہیں بتایا جمال احمد اس کے خط سے اپنے ذہن میں بننے والے اس کے پروگرام کے خاکے کو ڈاکٹر ہنری کو بتانے لگے۔

یہ محفل اس فلیٹ کے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بھی تھی جو سدرہ کا تھا۔ خط بھی اسی ایڈریس پر موصول ہوا تھا۔ اور بیٹے ہی عدی نے اسے کھول لیا تھا۔  
"آج کیا تاریخ ہے عدی؟" مٹی نے جلدی سے پوچھا۔  
"اتفاق سے وہی تاریخ مٹی! جو آپ کے لاڈلے کے لیے بہت اہم ہے۔ اب تک ہر جیت کا فیصلہ یقیناً وہ چکا ہوگا۔"

"ارے ہاں! جمال! آپ کے پاس یونیورسٹی کا نمبر تو ہوگا۔" مٹی بے چین ہو گئیں۔  
"میرے ہاتھ ہی پھول رہے ہیں۔ شہی کہ ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا خدا شہا ستہ وہ بزرگ کیا تو....."

"تو کیا ہوگا۔ چھوٹی چھوٹی شکستیں بڑی کامیابیوں کا زینہ ہوتی ہیں۔" جمال احمد نے سخت لہجے میں کہا۔  
"یہ آپ کا خیال ہوگا۔ ماں تو صرف اپنے بچے کے بارے میں سوچتی ہے۔ شہی نے خوشیاں بہت کم دیکھی ہیں۔ وہ ہار گیا تو اس دکھ کو اپنے دل پر لے بیٹھے گا۔"

"وہ ہاتھ جو حاصل کر رہا ہے بہت نہیں ہے جتنا آپ سمجھتی ہیں سز جمال احمد۔" وہ اب بھی سنجیدہ تھے۔  
"بار جیت ہی تو زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے ہر ماہ حوصلہ نہیں۔ ہر پیلوڑا ہے۔"  
"اطلائے عرض ہے کہ بار جیت سے کہیں زیادہ متحرک شہی کا نام ہے۔"

"آپ کے خیال میں ہوگا۔ مگر مجھے خبر ہے۔ اسے زندگی میں کسی شے سے نفرت ہے تو شکست سے۔ وہ ہار آیا تو ٹوٹ جائے گا۔"

"شکست سے نفرت اچھی بات ہے۔ شکست سے نفرت بھی آدمی میں تحریک پیدا کرتی ہے۔ وہ جیت کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ لیکن اسے ہر قسم کے حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ انہی سے تو شبیر نے کوئی بات دل پر لے لی تو زندگی کے مسائل سے کس طرح نمٹ سکتے گا۔ کامرانیاں! نا کامیاں تو ہر قدم پر اس کے ساتھ ساتھ ڈول گئی۔ وہ اب کے ہار بھی جاننے تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

اپنا دوش کا سٹ کرتے ہی وہ شبیر کے کہنے پر گھر لوٹ آئی تھی۔ لیکن حد درجہ ہنس مہین تھی۔ پچھلے پندرہ دن اس کی نظروں میں ایک تو اتر سے گردش کر رہے تھے۔ شبیر نے اسے انتہائی مہم میں کوئی لیڈنگ رول ادا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس کی شراکت اچھی تقریر لکھ دینے کی حد تک تھی۔ ایک دن اس نے تقریر لکھ کر سامنے رکھی شبیر چمک کر بولا۔

"چچی اماں! ادھر توجہ دیجیے۔" وہ پاس ہی بیٹھی تھیں۔

"غالب کو تو جانتی ہیں نا آپ چچی اماں۔"

"ہاں بیٹے! دیوان غالب کی حد تک تو جانتی ہوں۔"

"کیا خوب کیا ہے حضرت اسد اللہ غالب نے"

دیکھنا تحریر کی لذت کہ جو اس نے کھا

میں نے یہ جانا کہ یہ دن کی میرے آواز ہے

"ظہریے جناب! یہ کس دیوان کا شعر ہے۔ غالب کے اشعار میں اتنے کچھ کی اجازت نہیں ہے آپ کو۔" گوہر تو گویا غالب کے شعری ہارنے کی سب سے بڑی نگہبان تھی۔

"بھئی! کیا تیری ہے میں نے ان کے معرکتہ الزامہ شعر کو اپنے حسب حال ہی ٹوٹا دیا ہے۔ چچی اماں! اسے کہتے ہیں انڈرا سٹینڈنگ۔"

"کیا؟" چچی اماں نے ٹیک ناک پر جمائی۔

"وہی ہم آہنگی۔"

"وہ کیا ہوتی ہے؟ لڑکے! میری قابلیت اس حد تک نہیں ہے۔ میں نے تو چند اردو زبان کی مذہبی اور ادبی کتابیں ہی پڑھ رکھی ہیں اس گٹ پٹ کی مجھے کیا خبر۔"

"آپ کا کیا تصور یہ سارے عظیم اور نامور شاعر زلف و رخسار میں ہی الجھے رہے عکس و دانش کی طرف آئے جوتے تو آپ کو بھی خبر ہوتی چینی ہم آہنگی کی۔ بھئی چچی۔ بڑی بوڑھیاں کہا کرتی ہیں۔ شادی بیاہ کے کچھ عرصہ بعد۔"

"کیا! کیا کہتی ہیں لڑکے؟"

"بھئی کہ اوئی! بہن! اللہ کا شکر ہے میاں بیوی میں بن آئی ہے۔ یہ بن آنا میرا خیال ہے اسی چینی ہم آہنگی کو کہتے ہیں۔"

"اوہ میرے خدا! کیسی بھکی بھکی باتیں کرتا ہے یہ لڑکا۔ میاں شادی سے پہلے ایسی باتوں کی اجازت نہیں۔ یہ بعد کی باتیں ہیں۔"

"اوہ میری سویت چچی اماں! آپ کو کیا خبر۔ کس چیز کی ضرورت پہلے ہوتی ہے اور کس کی بعد میں۔ آپ کے زمانے کے رسم و رواج ہی کچھ اور تھے۔ سنا ہے آپ کی مہنگی میں پہلے اور نکاح چھ سال پہلے ہوا تھا چھوٹے

بواہا ہے۔"

چچی اماں شرما سئیں۔ کسی نئی نویلی لہن کی طرح۔

"تو یہ ہے لڑکے! کیا کیا کتے نکال لیتے ہو۔"

"ابہر سنا ہے کہ مغلٹی آپ کے پیدا ہوتے ہی ہو گئی تھی اور آپ کا دادا اباسے جو کہ اس وقت چار سال کے تھے۔

"ابرا! باگیا تھا۔"

نور بہا اختیار جتنے گوی۔

"کیا کہاں ان کا پردہ۔ پیدا ہوتے ہی۔"

"جی ہاں۔ عین رسم و رواج کے مطابق میں نے تو یہاں تک بھی سنا ہے کہ چچی اماں کو ہمہ وقت برقعے میں رکھا

جاتا تھا۔ ڈرتھا کہ ادا ابا جو شہر سے سچے تھے پوری حویلی میں درزا بھاگا کرتے تھے کیا خبر کس وقت ان کے نرے کی طرف آنکلیں اور بے پردگی ہو جائے۔"

"شبیر! خدا کے لیے بات کو تاتو نہ بڑھاؤ۔" آمہ خاتون بھی جتنے نہیں۔

"نرے چاچا جانی! مہانے کی مجھے کیا پڑی۔ مجھے خاندان کے بزرگوں کی زبانی علم ہوا مغلٹی کے بعد تو چلو پردہ بن بھی تھا۔ نکاح کے بعد تو حد سے گزر گیا۔ ایسی پابندی کہ گویا دیکھ لیے جانے پر نکاح ہی ٹوٹ جائے گا۔"

"اے نور! چچا اماں گھبرا گئیں۔"

"فکر نہ کریں۔ اب تو بے چارے ڈیڑھی صاحب متوں مٹی کے جاسوئے اب نکاح کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ جنت میں ایک آراستہ بھراستہ محل میں وہ آپ عیسیٰ و قادیانہ کے منتظر ہوں گے۔ ہاں گوہر میں بتا رہا تھا۔ تمہیں رسم و رواج کے متعلق کتنی مستحکم خیالات ہے جس سے نکاح ہے جو محرم ہے و مسازنے ہم ماڑ ہے اس سے تو ہو گیا پردہ

اور اپنی سارے جہان سے۔ کاسے کا پردہ کہاں کا پردہ۔" اس نے عورتوں کی نقل کی۔

"بیچے! وہ زمانہ شرافت کا زمانہ نہیں تو تھا۔" چچی اماں کی بات پر آمہ خاتون چڑھی گئیں۔

"نرے بیٹے! یہی چچی اماں۔ ان پر دوں کی اصلیت کچھ نہ سمجھ سکتی تھیں ہی معلوم ہے۔ اللہ بخشنے خود چچا ابا اپنے عشق کی ناستا میں ہمیں سنا یا کرتے تھے گھر والوں کو دھوکے میں رکھ کر آپ سے ملاقاتوں کے قصے مزے لے لے کر

سنا یا کرتے تھے۔"

چچی اماں کی ٹو خیز حسینہ کی طرح شرما کر رہ گئیں۔

"اچھا! پرزے میں رہ کر انہی سب کچھ ہوتا تھا۔" شبیر نے بات کو ہوا دی گویا اسے کچھ بھی معلوم نہ ہو۔

"اور نہیں تو کیا۔ وہ خود بتاتے تھے کہ چچی اماں خیر سے....."

"بھئی چاچا جانی! اس وقت تو یہ چچی اماں نہیں ہوں گی لے کے سارے فسانے کا تاس مار دیا آپ نے۔" شبیر نے پھر کھینکا لالا اور آمہ خاتون کی بات کاٹ دی۔ آمہ خاتون کو بھی اس ذکر میں لطف آنے لگا تھا۔

"تم سنو تو شہمی! جب چچا ابا چھٹی پر گھر آتے۔ تو چچی کو چھین نہ ملا علی الصبح گھر والوں کے جاگنے سے قبل ان کے لیے بہترین ڈشز اپنے انھوں تیار کر کے ان کے کمرے میں لے جاتیں۔ اب سچ چچا ابا کھانے کے کمرے

میں آتے ہیں۔ سب سے پہلے ان کے کمرے کی طرف کہ بر خوردار! بھائی صاحب! ناشتا کر لیجیے۔ اعلیٰ حضرت کی ضیعت ناشتے پر ناک نہیں ہے، ادا جان فکر مند دادی جان! لگ پریشان۔ حکیم صاحب بلائے جاتے ہیں۔

بھوک اڑنے کی شکایت کی جاتی ہے۔ کئی خیرے سببوں میں جھٹ پٹ تیز بھوک نکلنے کے شربت حاضر اور اصل حالے کی کسی کو خبر نہیں۔"

"کہ ایک مور شاگل نے سونچ سے چوری چوری اک رانجھے کو اپنے ہاتھوں کی شیرینی کا اسیر کر لیا ہے۔" شبیر نے نکتہ اٹکایا سب ہنس پڑے۔

"ویسے چاہتی جانی! لگتا ہے دنوں بچا سے آپ کا افیئر بھی خاندانی کی بنیاد پر چلا ہوگا۔ وہ آپ کی ذات سے



زیادہ آپ کے بہتر خانداری کے معترف ہیں آج تک۔" شہیر نے انہیں اپنے مزاج کے شکنجے میں جکڑنا چاہا۔  
 "شہیر! آئندہ خاتون نے احتجاج کیا۔  
 "اچھا! آپ ہماری اتنی پیاری دادی جان کے سر بہتہ راز کھول رہی ہیں تو کیا ہم آپ کی ذات کو زیر بحث نہیں  
 لاسکتے۔" وہ جھٹ بولا۔  
 "تم اپنی اس تقریر کی ریہرسل کر، صاحبزادے جو تمہیں آج عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے کرنا ہے۔"  
 آئندہ خاتون نے بات کا موضوع بدل دیا۔  
 "آج کل کے لڑکے جنوں کے بنتے ہیں۔ ایک بات پوچھ لو ادویز کے رکھ دیتے ہیں سارے بچے۔ پچھلی  
 سات پشتوں کی تاریخ دہرا دیتے ہیں۔"  
 "چچی اماں! آپ اڈر اسٹینڈنگ کے معنی سمجھ جاتیں تو یہ سارا فساد کھڑا نہ ہوتا۔ یہ سارا کچھ آپ کو سمجھانے کے  
 چکر میں ہی پیش آ گیا۔"  
 "اب سمجھ گئی ہوں! اور دعا کر رہی ہوں کہ خدا اسے قائم رکھے۔"

☆☆☆☆

گوہر برآمدے کی سڑکیوں پر چلتی بے چینی سے شہیر کا انتظار کر رہی تھی۔ کئی بار اس نے یونیورسٹی کے فیس پر  
 رنگ کیا لیکن ہر بار نمبر بچھ ہی ملا۔ گاڑی رکنے پر اس نے سراٹھایا۔ دلواؤز آفس سے لوٹے تھے۔ ڈرائیور ان کا  
 بریف کیس تھا مے اندر آ رہا تھا۔ وہ لان میں بچوں کے پاس رک گئے تھے۔ واپس آ کر ڈرائیور نے گاڑی  
 گیاراج میں کھڑی کر دی دلواؤز برآمدے کی طرف آئے۔  
 "بیٹو گوہر بیٹا!"  
 "اسلام علیکم ماموں!"  
 "یہ آج بے وقت یہاں کیوں بیٹھی ہو؟"  
 "بس ویسے ہی۔"

"ماما وہ شہیر کہاں ہے بیٹی آج انکیشن تھے کیا ہوا اس کا دفتر انکیشن میں مگر کریش تو فون بھی نہ ٹر سکا۔"  
 "انکیشن تک تو نہیں واپس آئے۔"  
 "تم..... تم کیوں واپس آ گئیں؟ اس کے ساتھ ہی آ جاتیں۔"  
 "نہیں ماموں! وہاں بہت شہ تھا بڑی بڑا بازی تھی۔ آپ جانتے ہیں نارڈنٹ کے وقت کیا ہوتا ہے۔"  
 "ہاں! وہ تو ٹھیک ہے۔ ویسے وہ تو تم نے بھی ڈالا ہوگا۔ آٹا کیسے لگ رہے تھے۔"  
 "خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ماموں! اسٹیج کے حامی بھی غائب یہ جوش اور متحرک لگ رہے تھے۔ آخری وقت  
 تک ان کی طرف سے لڑکیوں پر خاصا دباؤ رہا۔"  
 "یہ تو انکیشن کے قوانین کی خلاف ورزی ہے۔"  
 "خلاف ورزیوں یہاں نہیں ہو رہی ہیں؟"  
 دلواؤز سر ہڈا کر رہ گئے۔  
 "چلو اندر آ فون کر کے پتا کرتے ہیں۔"  
 "واٹھ گئی۔ ان سے ساتھ اندر آئی۔"

فون کی گھنٹی بجتی رہی کسی نے فون نہ سیدھا نہیں کیا۔ تھک ہار کے اس نے ہسٹل کا نمبر ملا یا۔  
 کسی لڑکے کی آواز آئی تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔  
 "بچے یہاں مسٹر شہیر عسکری ہوں گے۔ کرہ نمبر ۱۱ میں ہوتے ہیں۔"  
 "شہیر! ہوا عسکری! آپ کون ہیں؟"  
 "میں! میں ان کی کزن یول رہی ہوں گوہر عسکری۔"  
 "اوپہ مس گوہر! آپ کو خبر نہیں۔ کسی نے آپ کو نہیں بتایا؟"  
 "تیا؟" گوہر کا دل دھڑک دھڑک مینا۔  
 "یونیورسٹی میں گولی چل گئی۔ انکیشن کا نتیجہ ہر وہک دیا گیا ہے۔"  
 "اوپہ نہیں.....؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔"  
 "شہیر کہاں ہیں۔ رات ہو گئی اب تک گھر نہیں آئے۔" گوہر نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔  
 "وہ ہسٹل میں ہیں۔"  
 "ہسٹل؟ کیا ہوا انہیں؟" گوہر کی چیخ نکل گئی۔  
 "ڈنٹ ڈری کس گوہر! شہیر عسکری تو خیریت سے ہیں اور کچھ لڑکے زخمی ہو گئے ہیں۔"  
 "کس نے فائرنگ کی؟ کون ہیں ایسے بے درواؤگ....."  
 "مظلوم نہیں..... کون ہیں پولیس نے ناکہ بندی کر رکھی ہے لڑکے لڑکیاں جو وہاں موجود تھے انہیں نہیں جانے  
 دیا جا رہا۔ پولیس اور یونیورسٹی حکام کا خیال ہے ہتھیار جو بھی ہیں اعلیٰ میں ہی انکیشن موجود ہوں گے۔"  
 "تھینک یو مگر آپ نے ہسٹل کا نام نہیں بتایا۔"  
 "مگج رام ہسٹل۔"

گوہر نے فون رکھ دیا مرنے مرنے قدموں سے چلتی وہ دلواؤز کی طرف آئی اور ساری صورت حال انہیں بتا  
 دی۔ وہ اسی وقت ہسٹل کی طرف چل دیے۔  
 گوہر پچھڑ برآمدے کی سڑکیوں پر جا پہنچی ماموں! اسٹیج کا چروان کی نظروں میں محوم رہا تھا اس دن گھر کے  
 کیت پر انہیں ڈراپ کرنے کے بعد وہ اسے صرف ایک بار ملا تھا اپنے دوستوں کے ساتھ تھا۔ جو اس کے لیے  
 بڑا پارٹنر تھا۔ اس کے لڑکیوں سے دور مانتے چلے تھے اور جگہ جگہ ان کو گھیر کر ماموں! اسٹیج کے اوصاف حمیدہ  
 بیان کر رہے تھے۔ وہ اپنی نکاس کی چند لڑکیوں کے ساتھ کھڑی تھی موضوع بحث یونیورسٹی انکیشن ہی تھے کہ  
 ماموں! اسٹیج اور اس کے دوست ان کے قریب آ گئے۔  
 "بیٹو! یوری پاؤی۔" وہ لڑکا جانے کون تھا۔  
 "بیٹو.....! سب ان کی طرف توجہ ہو رہی۔"  
 "ان سے تو آپ واقف ہوں گی ان کا تعارف کیا کرنا؟"  
 "اس کرپ کی خاص الخامی ہستی میں جانتی ہیں بلکہ بہت اچھی طرح جانتی ہیں انکر کی بات نہیں ہے شجاعت  
 اور فن۔" ماموں نے اس کی آنکھوں میں تھکانا۔ اس کے چہرے اور لہجے دونوں میں اچھا وقت۔  
 "کیسی ہیں آپ گوہر.....؟ انکیشن کے دوستوں میں تم ہو کر آئی اپنی ذات کو قبول ہی بیٹھتا ہے انشاء اللہ آپ



سے جلد ملاقات ہوگی۔" اس نے بہت کچھ یاد دلانا چاہا۔  
 "ظاہر ہے ہم لوگ کلاس فیلو نہ سیں یونیورسٹی فیلو تو ہیں نا ماسون واسطی صاحب۔" اس کی کلاس فیلو ویلا کا شیری نے وضاحت کی۔

"یہ بات آپ اپنی ان کلاس فیلو کو سمجھائیے۔۔۔ جو ہنسنے لانے میں تباہت محسوس کرتی ہیں۔"  
 "مسٹر ماسون واسطی انکیشن کے بعد تو آپ سے منتہا ہم سب کی مجبوری بن جائے گی صدرا تاتا بھی غیر اہم نہیں ہوتا۔" بیٹلانے اسے شہ دی۔

"آپ کے منہ میں کھی شکر۔۔۔ صدرا تے تو ایسے مٹی دار بندے کی منتظر جب میں چند دنوں کی بات ہے۔ اس فیصلہ طلباء ماسون کے حق میں ہیں۔" شجاعت الوری نے ڈیک ماری۔

"شجاعت الوری! کسی نتیجے کے بارے میں انسان کو اتنا خوش فہم بھی نہیں ہونا چاہیے بارادہ جیت لازم و ملزوم ہیں۔" وردہ اعظم بڑی کھری لڑکی تھی۔

"ماسون واسطی نے زندگی میں ہار کا منہ کبھی نہ کھینچا ہے اور اب بھی نہیں ہارے گا۔" ماسون کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"ہاں گوہرا! میں سچ کہہ رہا ہوں میں نے اپنے ارادوں کو کبھی حسرتوں میں نہیں بدلنے دیا ارادے کی چٹان کو قائم رکھتا اور سرتوڑ کو شش کرنا ہی مرہ کی شان ہے۔۔۔ وقت بنائے گا کہ میں اپنی بات کا کتنا پکا اور سچا ہوں۔"

وہ اب بھی اس کی آنکھوں میں جیانت رہا تھا گوہر کا چہرہ تن گیا۔  
 "ارادے کی پختگی ہی منزل کی طرف جانے کا راستہ آسان کرنے ہے" مسٹر ماسون واسطی ان معائنہ میں بھی کسی سے کم نہیں ہوں مجھے بھی اپنے اصول اور عزائم بہت عزیز ہیں۔"

"مسٹر ماسون! آپ نے ہمیں مشکلوں میں ڈال دیا ہے۔" راضیہ فخری نے ہنس کر کہا۔ ماسون کے چہرے پہ سوالیہ شہر گیا۔

"ہاں ہاں بھی! ایک طرف شہر عسکری ہیں۔ ہمازی کلاس فیلو کے کزن بلکہ سگھتر۔۔۔ دوسری طرف آپ ہیں! آخر ہم لوگ کس کا ساتھ دیں۔"

"اس میں تردد کی کیا بات ہے۔ آپ لوگ رشتوں ناقول کو نہیں کرنا کہ نظر رکھیں اور شیخ اور ماسون واسطی میں سے جو بھی آپ کو اپنی رائے کا حق وار نظر آئے اسے بوجہ رک دوٹ دے دیجیے۔" گوہر نے لفظ چبا چبا کر دیکھے۔

"ماسون واسطی کسی چھپی ہوئی شے کا نہیں ایک مروکا نام ہے اور اس نام سے یہاں کے لوگ بہ خوبی واقف ہیں۔" ماسون نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"آپ ایک منٹ میری بات سنیں گی۔" اس نے جھٹ اسے مخاطب کیا وہ اس کے ساتھ قہوڑا سا آکر نکل گئی۔

"مٹی فرمائیے۔" اس کے انداز میں نفرت اور کٹھور پن تھا۔  
 ماسون بھی تاتا تاتا سا کھڑا تھا۔ "میں نے اسے کھلایا تھا کہ وہ میرے مقابلے سے ہمت بردار ہو جائے ورنہ اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلا گا۔"

"پھر۔۔۔؟"

"پھر کیا؟ وہ اپنی ہسٹ دھری سے باز نہیں آتا کیا پیدی کیا پیدی کا شور با۔۔۔۔"

"لنگو تیج مسٹر ماسون واسطی ایاد رہے کس آپ مجھ سے میرے کزن کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔"  
 "جی ہاں جانتا ہوں میں آپ کے احترام میں یہ چاہتا تھا کہ اس کا ہم سے براہ راست دشمنی کا رشتہ نہ ہو۔۔۔۔"

شہ سیدھی انگلیوں سے نکل آئے لیکن اب جو کچھ ہوگا اس کی ذمہ داری اسی پر ہوگی۔  
 "کیا ہوگا؟ کیا کریں گئے آپ؟"  
 "یہ وقت بتائے گا۔"

"وقت کو جو بھی بتانا ہوگا بتا دے گا میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی تھی اچھا ہوا آپ مل گئے آپ نے اپنی بات کا جواب مانگا تھا میری طرف سے ہزار بار انکار ہے میں ایسی گھٹیا حرکتوں سے نفرت کرتی ہوں شہیر اور میں ایک دوسرے کی زندگی کا اہم ترین جزو ہیں۔ کبھی جدانہ ہونے کے لیے ایک دوسرے کی زندگی میں آئے ہیں اور مجھ

آپ کی ذات سے کوئی خوف نہیں اس لیے کہ میں انسانوں کی مکروہ خواہشات کے آگے نہیں صرف خدا کے حضور جھکتا جاتی ہوں وہی میرا محافظ ہے میرا چھابرا اسی کے ہاتھ میں ہے۔"

"ایٹھا باؤ! آپ کو جواب دینا تھا آپ نے دے دیا کچھ لیجیے کہ انکیشن ہمارے درمیان پہلا راؤنڈ ہے اور ضروری نہیں کہ پہلا راؤنڈ جیت جائے ورنہ فاتح بھی بن جائے جیت ہار میں بھی بدل جایا کرتی ہے۔"

میں آپ سے پھر کہہ رہا ہوں آپ کے ہاتھوں پر ڈاکٹر ہاروں واسطی کے نام کی مہندی نہ لگی تو میں۔۔۔۔ جینا مجھ بڑا دین کا موت کو گلے لگانا پسند کروں گا۔ کاش آپ نے مغفبت کی راہ اختیار کی ہوتی۔"

گوہر نے جانے کے لیے قدم اٹھایا تو وہ بھی پیچھے چل دیا۔  
 "بھئی! ایسی بون سی پرائیویٹ بات تھی۔" بیٹا کا شیری نے مسکرا کر استغناء کیا۔

"تھی: یک بات۔۔۔۔ کیا ایک بھائی اپنی بہن سے کوئی ذاتی مسئلہ سکس نہیں کر سکتا۔" ماسون واسطی نے سب کی حیرانی دور کر دی گوہر بھی دکھاوے کو مسکرائے گی۔

رات کے دوسرے پہر برآمدے میں بیٹھے ہوئے اسے کئی باتیں یاد آ رہی تھیں جن کا تعلق ماسون کی ذات سے تھا۔

☆☆☆☆☆☆

ناشتے کی میز پر حسب معمول صبح کے سارے اخبار موجود تھے جانے کے گھونٹ بھرتے ہوئے شاہنواز اخبار دیکھنے لگے۔ وہ وقت کی کمی کے سبب اخبارات کی سرخیوں پر نظر ڈالتے تھے کوئی بہت زیادہ اہم خبر ہوتی تو پوری پڑھ ڈالتے یہ ملک کا سب سے بڑا روزنامہ تھا ناز بہترین خبریں: ہی میں سب سے پہلے آیا کرتی تھیں آج کل وہ اخبار کچھ زیادہ باقاعدگی سے دیکھ رہے تھے کہ انیم ٹیکس اور سینٹرل ایکسپریس کے نکلنے سے متعلق خبریں تو اتر سے آ رہی تھیں تاجروں اور کارخانہ داروں نے نئے نئے قوانین کو ماننے سے انکار کر دیا تھا حکومت اور تاجران کے درمیان بات چیت جاری تھی اخبار کا صفحہ پلٹے پلٹے ایک چار کا لمی سرخی پراچا تک ان کی نظر تک گئی۔

"بیٹا اب یونیورسٹی میں با معلوم افراد کی زبردست قاترنگ۔ صدرا تاتا شہر عسکری زخمی ہونے سے ہال ہال بچ گئے ایک گولی سنسناتی ہوئی ان کے قریب سے گزر گئی۔ طلباء نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا کئی طالب علم شدید زخمی ہو گئے۔" شاہنواز عسکری سیدھے ہو بیٹھے چائے کی پیٹلی ہاتھ سے رکھ دی دوبارہ یہ سرخی پڑھنے لگے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بچے تفصیل درج تھی جلدی جلدی خبر پڑھتے ہوئے ان کی بے چینی اور قہراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ لمحہ بھر کو وہ کچھ سوچنے کے قابل نہ رہے پھر جلدی سے ڈرائنگ روم میں رکھے ٹیلی فون کی طرف بڑھے دلنواز عسکری کے گھر کا نمبر ملایا بڑی وقت پیش آئی شاید لائین مسدود تھی۔

"ہیلو....." رابطہ ملتے ہی وہ تیز آواز میں بولنے لگا۔  
"ہیلو..... کون صاحب بول رہے ہیں؟"  
"میں شاہنواز عسکری ہوں۔"  
"اوہ پاپا..... آپ.....؟"  
"کون شبیر..... شبیر یہ تم ہو..... اوہ مائی گاڈ....."  
"خیریت پاپا....."

"شبیر..... بڑی مدت بعد وہ بیٹے سے مخاطب تھے پوری شفقت ساری کی ساری ان کے لہجے میں سم آئی تھی۔  
"شبیر.....! ابھی ابھی میں نے ایک خبر پڑھی ہے۔ میرے اوسان خطا ہو گئے کیا یہ سچ ہے شبیر۔"

"جی ہاں پاپا۔ یہ سچ ہے۔"  
"تم نے انکیشن میں حصہ لیا ہے؟"  
"جی ہاں کل انکیشن بچوں ہی تھا۔"  
"شبیر..... تم نے قسم کھا رکھی ہے اپنے باپ کو بھدو دیتے کی۔ کیا ضرورت ہے ان بکھیڑوں میں انکیشن کی تمہیں کچھ ہو جاتا تو؟"

"پاپا! موت جب آتی ہے تو کسی سے پوچھتی نہیں موت تو اپنے گھر کے آرام وہ بستر پر بھی آ جاتی ہے گر آتی ہو تو۔"  
"پتھر کیا ہے سارا؟"

اس نے انکیشن تفصیل بتا دی۔ "منہ تو رہا ہوں وہی وقت..... دلنواز کہاں ہیں وہ کس مرض کی دووا ہیں انہوں نے روکا نہیں میں پہلی فلائٹ سے پتھر رہا ہوں اتنی تیز کرنا میرا۔"

"پاپا..... پریشانی کی کوئی بات نہیں انکیشن ہو چکے ہیں رات گئے میری کامیابی کا اعانہ بھی کر دیا گیا شام کے اخبار میں یہ خبر پڑے کہ آپ کو بے حد خوشی ہوئی کہ آپ کا بیٹا طلبہ یونین کا صدر ہو گیا ہے۔"  
"منت بھیجتا ہوں میں انکی خبر پڑے مجھے تمہاری ضرورت ہے شبیر ان عہدوں کی نہیں اٹھے شہرت اور ناموری چاہیے ہوں تو میں بھی بابا جان کی راہ اختیار کر سکتا تھا کیا پڑے تو نہیں..... شہرت سے مجھے خون خرابہ کی زندگی سے جہاں قدم قدم پر آویں خدشوں اور خطروں میں گھرا رہے مجھ سے تو تمہاری خبر کا ہی ہونا ایک آگ ہی نہیں جھانکنا ہوا ہی تم نے اوسان باسٹل سے اٹھ کر میرے نیسے مسائل پیدا کر دیے ہیں۔"

"پاپا.....! آپ انکیشن کی کوشش کریں..... شہر پندرہ لوگ ہر حال میں حالات خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہاں تک نہ ہو گا کوئی اور وہاں تک نہیں ایسا ہو سکتا تھا۔"  
"وہی اور وہاں ہونا ہوتا ہے میری باا سے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ پاپا کوئی نہیں دیتا بات تو ایک ہی تھی میں نے بھی پاپا شہرت اور ناموری کے لیے

نہیں ذمہ داری نبھانے کے لیے اس منصب کی خواہش کی ہے آپ دیکھ لیجئے گا یہ آخری خرابی ثابت ہوگی اب یونین میں کبھی کوئی ہنگامہ نہ ہوگا۔"

"خام خیالی ہے تمہاری..... بس تم ہو ہی بے وقوف..... پائل، غیبتی۔"  
"آپ کو حق ہے پاپا جو مناسب سمجھیں کہہ لیں۔ وہ اس ذمہ سے ڈھکی چھپی کے۔"

"آل انڈیا کریمٹ سر۔ میں خود آپ کو فون کرنے والا تھا..... وہاں میں لینا چاہ رہا تھا آپ کی دلنواز چاچا تو بہت خوش ہیں وہ میری فتح کو حق کی جیت سمجھتے ہیں آپ دیکھیے گا پاپا۔ معاشرہ کیسے سیدھی ڈگر پر چلتا ہے۔"  
"ہونہہ بڑے بڑے سیدھی راہ پہ چلنے والے پر خود ہار تم جیسے کئی دیمانے آئے اور منہ کی کھا کر چلے گئے۔ ذرا اس صدمہ اور دارت سے مستحق ہو جاؤ۔ ذمہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

"پاپا.....!"  
"میں جو کہہ رہا ہوں سچ ہے۔"  
"پاپا..... اس نے التجائیہ انداز میں کہا۔"

"بس ازی دی لاسٹ وارنگ..... ورنہ بات نہ کرنا مجھ سے۔ میں پہلے ہی تمہاری ایسی حرکتوں سے تنگ ہوں۔"  
انہوں نے فون بند کر دیا اور ساتھ بڑی کرسی پر سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔

یہ خبر ملک کی سرحدیں پار کر کے جمال احمد تک بھی پہنچ گئی۔ سدوہ کوشکا گو کے ہاسپٹل میں منتقل کرنا پڑا تھا۔ افتخار آج کل ایک ضروری پراجیکٹ پر کام کر رہے تھے جنہیں ملتا جمال تھا جمال احمد کی پوری شبلی کا امریکا جانا پڑ گیا یہ خبر بھی انہیں امریکا میں ہی موصول ہوئی لیکن شبیر کی کامیابی کی خوشی سدوہ کی تکلیف اور فائٹنگ کے اندر اس ناک واقعے کی پریشانی میں کہیں مہو ہو گئی انہوں نے مسز جمال احمد کو اس بات سے بے خبر رکھا ممدی اور عذرا کو بھی تاکید کی اور نہ وہ تو وہی وقت شبیر کو اپنے پاس بلا لینے کا شور مچا دیتیں جس روز انہیں اطلاع ہی ای روز انہوں نے پاکستانی سفارت خانے کی معرفت ملک کے اعلیٰ حکام سے بات کی وہی اس پنجاب یونین کو فون کیا آئی جی سے ڈسکس کیا اس مسئلے کو۔ وزارت داخلہ کے ذمہ دار افراد کو متنبہ کیا۔ تب ہی وہی اس صاحب نے شبیر کو اپنی رہائش گاہ پر ملاقات کا وقت دیا۔ "یہ جمال احمد صاحب سے کیا تعلق ہے تمہارا شبیر عسکری۔"

"جمال احمد میرے بزرگ ہیں محسن ہیں بہادر ہیں وہ میرے ہی نہیں معاشرے کے سارے نوجوان کے بچے خواہ ہیں۔"  
"آج ان کا فون آیا تھا اس سانحے میں ذاتی دلچسپی شاید وہ تمہاری وجہ سے لے رہے ہیں بار بار تمہارا پوچھ رہے تھے۔"

"شبیر سہرا میری وجہ سے نہیں۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں! منصفاانہ انکیشن کے تحت عدو منتخب ہو چکا ہوں۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ہمیشہ سے تعلیمی اداروں کے طور پر عمل سے تالاں ہیں۔ انہیں سماجی حس کا شکوہ رہا ہے۔ یہ بے حس صرف اسی ادارے پر حق نہیں قوم کے ہر فرد پر غلبہ پانچویں مہینے لیڈر ہوں یا حکام صرف ایک بیان کو ضروری خیال کرتے ہیں کہ کسی کو ملک کی تقدیر سے کھینچنے کی اجازت نہیں دی جائے گی! غصہ کروانی کرنے والوں کو پھیل دیا جائے گا اب ان خدا کے بندوں کو کون بچائے گی! ملک کی تقدیر سے کھینچنے والے آپ کی اجازت



ضروری کب سمجھتے ہیں انہیں کسی این او ایس کی ضرورت کب پڑتی ہے ایم ایم نے نذر سے ساتوں سے بے کراؤن تک کسی ظالم کو اس کے انجام تک پہنچا دیکھا ہی نہیں۔ کچلے جاتے ہیں یا بے ہوش جاتے ہیں تو بس بس سب سے عوام اور معصوم غلبا..... سر! میں تو کبھی احسان کا یہ بھارتی بوجھ اپنے کندھوں سے نہ اتار پاؤں گا میرے دوست! میرے خانی میرے گرد آسٹی! پورا بن کر جمع ہو گئے اور نہ کوئیوں کی بوجھ بڑھائے ایک سانس لے لینے کی مہلت بھی نہ دتی کسی کے بازو زخمی ہیں کسی کا سینہ کسی کی ٹانگیں کسی کے ہاتھ ٹھنڈے ہو گئے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ لیکن یہ نقصان بھی تم نہیں سے نہیں پوری رات ہسپتال کے آپریشن تھیمز کے باہر موجود رہا! امجدہ قرانی ہماری جامعہ کا ہیونرری طالب علم ہے کسی مفلس گھرانے کا چشم و چراغ۔ غریب ماں باپ کا اٹھوٹا سہارا۔ گولی اس کی پسلیاں چیرنی آگے نکل گئی۔ پورے ساتالیس گھنٹے وہ موت و حیات کی جنگ میں رہا۔

تارے باسپتال میں ایک طالب علم کی زندگی بچانے کا خون نہ تھا۔ میرے مرتضیٰ طلباء کی دائرہ نگ مٹی سب نے اپنے بازو آگے کر دیے اپنے بھائیوں کی زندگی بچانے کو۔ میری خوش نصیبی سے کہ میرا خون فادانے کے کام آیا۔ اسے کچھ ہو جاتا سر! تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرتا۔ کون کہتا ہے سر! طلباء اپنے دشمن آپ ہیں! لنگھنا رام میں تلے دھرنے کو جگہ نہ تھی ہماری ہمیں بھی رات کی تاریکی کے خوف سے بے نیاز وہاں موجود نہیں اپنے بھائیوں کی زندگی کی دعا کیے مانگ رہی تھیں انہوں کی بوتلیں اتنی متناہر میں تھیں کہ جتنی کسی کے ہاتھ سلور میں جگہ ہی باقی نہ رہتی تھی۔ ہر چند شریعت عوام کے گناہوں کا بوجھ پوری قوم پر نہیں لادنا چاہیے ہمیں بلکہ ہم سب سے ہر فرد کو ایسی کافی بھیڑوں کو تلاش کرنا چاہیے سر! یہ قانون نافذ کرنے والے ادارے کی تکلیف نہیں تو کیا ہے کہ پوئیسٹی کے احاطے میں پولیس کی موجودگی میں مذہم و ہتھیاب ہو سکے نہ اسلٹل مگا۔ یہ کیسے ممکن ہے سر! میں جانتا ہوں سر! یہ سب کیا ہے اس سازش میں کون کون سے لوگ شامل ہیں۔ بھیڑوں کے گلے کی گرائی ہی بھیڑیے کر رہے ہیں تو بچھو کچھ کچھ کس سے کی جائے ڈر مار کے ختم کیا جائے کاش ہم نے ان واپان بھان رکھنے کی خاطر اپنے حق لڑوں کو متروک کیا ہوتا۔

"یہ کیسے ممکن ہے شہیر۔ بالکل بچوں جیسی بات کہہ دی تم نے۔"

"میں جانتا ہوں سر! لیکن قانون کے سائے میں لاقانونیت کا بیٹا تک کیل بھی تو پتا چلے بدداشت ہے اس بہت چھوٹا تھا تو پوئیس میں کو کچھ کر مجھے احساس تحفظ ملتا تھا۔ میرا دل فرج مسرت سے لہریز ہو جاتا تھا۔ کیونکہ مجھے اس وردی سے روشناس کراتے ہوئے نہیں دیا گیا تھا کہ یہ معاشرے کے ذمہ دار افراد کے جسم پر چلتی ہے وردی کی صورت ملک سے وقاداری تو م کی خدمت اور قانون کی بالادستی کا فرض ان پر عائد ہو جاتا ہے لیکن جوں جوں میں باشعور ہوا میں نے سنا دیکھا اور محسوس کیا کہ وردی کا مقصد وہ نہیں ہے۔ وردی بے سہارا لوگوں کو خوف زدہ کرنے انہیں لوٹنے آزار پہنچانے کا اجازت نامہ ہے یہ ہر حکومت وقت کے ایجنٹ ہوتے ہیں صاحب اقتدار کی خوشنودی کے لیے ہر ظلم کو گزرنے کا حوصلہ رکھنے والے بھادر ہوتے ہیں مجھے نفرت سے سر! اس نظام سے۔ اس قانون سے اور پھر اب تو مجھے عملی تجربہ ہو گیا ہے۔ بلکہ ایک بار پہلے بھی ہو چکا ہے۔ ایک جنویشن قلم انسانوں کی تقدیر کیسے بدل دی جاتی ہے۔ اس نے امین راستی و لامار اقصیٰ کہہ سنایا۔

"سر! اس مجھے میں ڈی آئی جی احمد ابراہیم صاحب جیسے فرض شناس لوگ بھی ہیں مجھے پتا چلتا ہے کہ وہ آئی جی ہو گئے ہیں کٹل ہی انہوں نے اپنے نبرد سے کا چاروں؟ سنبھالا ہے۔ میں خود ان سے ملوں گا یہ میری خوش نصیبی ہے کہ ایک بہترین انسان اس ادارے کا سربراہ ہو گیا ہے۔"

"اچھا..... آئی جی احمد ابراہیم تمہارے بھی دوست ہیں جنہوں نے تمہاری مدد کی۔ اچھی بات ہے شہیر عسکری تم ان سے ملو۔ ہو سکتا ہے اس ادارے کے مسئلے کا حل نکل آئے ویسے شہیر عسکری اب بھی تم لوگوں نے یہ بھی سوچا۔"

"کیا سر؟"

"جب ایک گھرانے کا سربراہ ایک مرد ہوتا ہے تو اس کے کندھوں پر چار پانچ بچوں کے مستقبل کا بوجھ ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اس میں نورنگر مندر رکھتا ہے جس میں جس ادارے کا سربراہ ہوں وہاں بچوں کی تعداد ہزاروں میں ہے ان سب کی ذمہ داری بھی پر ہے۔ یہ سب مجھے یقین دہانی میں کب چاہوں گا کہ ان میں سے ایک بھی آہٹ میں ہونے لگی دوسرے کے ہاتھوں آزار اٹھائے۔ میں کو شش کرتا ہوں ہر معاملے سے ہاتھ دھوئے گی ان سے کچھ دیکھنے کی ان کے مسائل حل کرنے کی پر جانے یہ سب کچھ کیسے ہو جاتا ہے۔"

"سر! یہ سب کچھ ان ماحولوں کے سبب ہوتا ہے جو آپ میں اور طلباء میں موجود ہیں خیال کیا جاتا ہے کہ فاصلے تو قائم ہو قائم رکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ لیکن میٹر اخیال ہے سر! احترام امین بزرگ یہ دوستی سے زیادہ کسی نے نہیں پایا جس کے دربار میں آنے اور جانے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ چونکہ امین کا باپ شاہ تھا لیکن فرس نیشن پر مجھے یوسید پوریے پر غریب اور مساکین کے ساتھ بیٹھنے میں اسے کوئی عار نہ تھا۔ جس نے اعلان کیا تھا کہ وہ جس کے سامنے جواب دہ ہے۔ یہاں تو ہم نے اظہار احترام کے بیچہ علیحدہ دپوٹو کوئی ہٹا رکھے جیسا یہاں فائنے چن ڈر ہے جین صد ہندیاں ہیں احترام وہ ہوتا ہے جو کسی کی اعلیٰ کردار کے سبب دوسرے دلوں میں فٹن آپ پیدا ہو جاتا ہے..... اور قریب میں برخلیوں ہوں تو احترام میں اضافہ ہوتا ہے کی نہیں مجھے امید ہے سر! آپ مجھے اور میرے ساتھ کام کرنے والے لوگوں کو کم از کم مسائل کی نشاندہی کی خاطر اپنے قریب ہونے کا موقع ضرور دیں گے بلکہ ہمیں ہی کیا میں تو پ امید بھی رکھوں گا کہ ہر طالب علم کے نیچے آپ اپنے پاس وقت نہ ہار جائیں گے انصاف کی خاطر..... آپ کے دل میں ہم سب کی جگہ ہے..... آپ واقعی ہمارے بھائی خواہ ہیں آپ کی شفقت بھری محبت اس احساس و اجاگر کرنے کی جواہر میں اضافے کا سبب ہوگی..... اور آپ جانتے ہیں سفر کی شرط اعتبار ہے۔ خود اعتماد ہو جانے کے بعد زندگی کی راہیں ہم پر اور بھی آسان ہو جائیں گی۔"

"وہی اسی سبب شہیر کو بخور دیکھتے رہ گئے۔"

"شہیر عسکری! جس طرح ہر باپ یہ چاہتا ہے کہ اس کی اولاد اس کا نام روشن کرے بالکل اتنی طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ میری زیر نگرانی عرصہ تعلیم گزارنے والے میرے سارے بچے اس ملک کی نیک نامی کے کام میں نہ کہ مجرم اور بدعشت گرد بنیں چور ڈاکو اور قاتل بنیں اس تم لوگوں سے ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں خدا کرے غلو میں محبت اور سادگی کا یہ نسخہ آخر ثابت ہو..... اور ہمارا ادارہ ساری اخلاقی بیماریوں سے پاک نہ بنائے۔"

اس شام شہیر بے حد خوش تھا احمد ابراہیم صاحب نے اس سے تہائی میں ملاقات کی تھی اپنی نشست سے اٹھ کر اہتمام آگے بڑھ کر انہوں نے اسے گلے لگا کر اس کی پیٹھ چھکی۔ تو اسے اپنے آپ پر خشک آیا۔

"کیسے ہو جگ میں؟ بھئی آج کے اخبارات نے بہت کچھ لکھا ہے تمہارے بارے میں میں تو شاید تمہیں بھول ہی جاتا۔ لیکن صدر میں کرتے پھر میری نظروں میں آ گئے۔"

"وہ ہنس دینے شہیر بھڑکا تھا ان کے مذاق کو۔"

"لیکن سر! میں ایک شیفت پولیس انسپکٹر کو بھی نہ بھول پاتا..... یہی ذمہ داری مبارک ہو آپ کو!"

”میں نہیں اچھے لڑکے..... یہ سب میرے لیے خوشی کا پیغام نہیں لڑکے کا مقام ہے میرا کڑا امتحان ہے ابھی چارج ہی سنبھالنا ہے کہ یہ واقعہ سامنے آ گیا ہے میں نے یہ بھی کچھ نہیں مقلدہ فرا کو تخت ہدایات جاری کی ہیں مزید اڑ پالیس تھنے انیس دیے ہیں۔ میں جانتا ہوں مجرم سزا پا بھی جائیں تو نشانہ بننے والے مظلوموں کے ذمہ اذیت دینے نہیں چھوڑا کرتے جو نقصان ہو گیا سو ہو گیا لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ مجرم سزا کے مستحق قرار دے دیا جائے تو نہیں ممکن ہے کہ ایک عرصہ کسی کو ایسی پاداشی پھیلائے فی جرات ہی نہ ہو۔ دیکھو تمہارا کیا خیال ہے۔“

”میرا دشمن کوئی نہیں تھا سزا ہاں میں ظلم یا انصاف سے باز رہتا اور سنی سی کا دشمن ہوں یہ کام دینی کر سکتے ہیں جنہیں ان چیزوں سے پیار ہوگا۔ جب میں نے اپنی آنکھوں سے کسی کو کچھ کرتے نہیں دیکھا تو کیسے کسی کا نام لے دوں.....“ احمد ابراہیم سوچ میں پڑ گئے۔

”میں اس کیس کی فائل جھکے کے ایک ایماندار اور محنتی نو جوان انیس پی کے سپرد کر رہا ہوں..... اس امید کے ساتھ کہ وہ سارا معاملہ سنبھال کر حق تک پہنچ جائے گا۔ ہاں تم سنا نہیں سنے جو ہمیں محکمہ پولیس جوائن کرنے کا مشورہ دیا تھا سو میں اب بھی منتظر ہوں۔ مجھے خوشی ہوگی تم میں بہت سی خوبیاں ایک ساتھ ہیں ہمارے ملک میں سزا خور سزا کا محکمہ کچھ ایسا ایسا اور پراثر نہیں ہے ایک پولیس آفیسر کو بیک وقت پولیس آفیسر بھی بننا پڑتا ہے اور سزا خور بھی..... تم اچھے پولیس آفیسر بھی ہو گئے اچھے وکیل بھی اور سزا خور بھی!“

شیر پر خیاں انداز میں دیکھ کے ساتھ مسکرایا۔ ”کیا کر سکتا ہے ایک شیر محترم آئی جی صاحب ایک شیر کیا کر سکے گا۔ کاش میرے پاس ناکوں کی تعداد بھی شیر ہوتے اور آپ کے پاس لاش و دانتیاریت اور آپ پولیس کے سارے جھکے کو ہی بدل ڈالنے ملک و قوم کے اعلیٰ ترین مفاد میں۔“

”کیا سونہ رہے ہو؟“ وہ مسکرائے۔

”میں اپنے مقام پر رہ کر بھی آپ کی خدمت کر سکتا ہوں! بلکہ مجھ اور پولیس کے تعاون کی یہ مثال بھی بہ مثال ہوگی۔“

وہ ہنس دیے۔ ”تم باتیں بھی دلچسپ کرتے ہو۔ مجھے آج خبر ہوئی۔ اب تو تم پر فرض ہو گیا ہے۔ گھسے گا بچہ مجھ سے بات کرنا اپنے مسائل مجھ سے ڈسکس کرنا۔ میرا سب تعاون تمہاری مدد کے لیے ہر دم بڑھا رہے گا جب چاہو طلب کر لو میں آج ہی تمہارا دوست ہوں۔“

”تھینک یو سیر! تھینک یو سیر! بچہ۔“ وہ بہت خوش تھا۔

شاید منزل بے حد قریب تھی اس دن و انصاف کی منزل عدل و رواداری کی منزل شاید یہ قربانی تھی۔ نوجوانوں کا بہہ جانے والا خون۔ ان کے جسموں پر گئے زخم۔ وہ حیران تھا۔ وہ کسی صاحب کے تعاون پر۔ احمد ابراہیم صاحب جیسے سربراہ محکمہ پولیس کی تعیناتی پر ان کے حسن سلوک پر۔ عوام کی طرف سے ملنے والے ہمدردی اور تعاون کے پیغاموں پر۔ بہت زیادہ حیران تھا وہ۔ شاید اس لیے کہ وہ نووارد تھا۔ نوآواز تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس سے پہلے بھی کئی آئے تھے بے لوث فدیوں سے لہدے پھندے۔ اس جیسا۔ جوش و خروش سے کہ ان کا استقبال بھی یونہی کیا گیا لیکن وہ سچ نہ کر سکے نہیں جنگل کے قانون نے انہیں درحالی موت کی سزا دے دی ان کے لب سے دیے۔ یا پھر انہیں بھی نشوونگی پالیسی پر پہلے پر مجبور کر دیا۔ کس انہیں بھی شریہ لیا گیا۔ وہ خیر دن کے حق میں کام کرنے لگے۔ بیٹروں کی پونٹاگ میں چھپ کر۔ کسی کو خبر نہ ہو سکی۔

دراصل شیر دنیا کے ان چند لوگوں میں سے ایک تھا جن کے دل میں جانے کب یہ یقین گھر کر لپٹا ہے کہ دنیا کے سارے انسان بنیادی طور پر اچھے ہیں شاید یہ احساس وہ پیدا ہونے پر ساتھ ہی لے کر آتے ہیں ان کا یہ اعتماد لافانی ہوتا ہے شاید وہ اپنے کردار کے آئینے میں اپنی نہیں ایک ابن آدم کی تصویر دیکھ کر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ”انسان“ خوبیوں اور اچھائیوں سے بھرے ایک وجود کا نام ہے شیر تعویذ سا خوش نصیب بھی تھا اسے جمال احمد لگے تھے ”میل گئی نہیں سدرہ آبی کی محبت میرا آگئی تھی پھر عدی جیسا بے غرض اور کھرا نوجوان اس کا بھائی تھا ہڈی جیسی معصوم لڑکی اس کا ذمہ تھی آ منہ خاتون تھی بلناؤ مسکری تھے چچی اماں تمہیں حضور بابا تھے اس کی دنیا میں سرور اور رونا جیسے سیدھے سادے لوگ بھی تھے احمد ابراہیم صاحب جیسے ایماندار آفیسر بھی وہی تھی صاحب جیسے شفیق استاد بھی۔ اور ایک خوبصورت باوقار لڑکی گوہر بھی جس کی آرزو خواب اور امیدیں شیر کی دنیا سے مختلف نہ تھیں وہ کیسے یقین نہ کرتا کہ دنیا میں بسنے والے انسان اچھے ہیں۔ وہ سعید و عظیم کو شاہیناز مسکری کو اشمن واسطی کو ماسون واسطی کو صرف کم فہم سمجھتا تھا۔ انسانیت کا دشمن نہیں وہ ان سب کے مزاج مہجوں سے بدلنا چاہتا تھا انہیں قائل کرنا چاہتا تھا نیکی اور اچھائی کی افادیت کا اس کے ارادے نہ صرف نیک تھے بلکہ معصوم بھی۔ محبت کے پھولوں سے بھی دنیا اس کا سب سے اہم خواب تھی اور محبت کے پھولوں کی آبیاری وہ خون جگر سے بھی کر سکتا تھا اسے بے حس انسانوں سے بھی نفرت نہیں تھی اس دن کی سنگ دن سے خوف کھا تا تھا۔ اس نے برما اس کا اظہار آئی۔ جی صاحب سے بھی کر دیا۔

”سرا مجھے ڈر لگتا ہے کوئی ناقابل فہم مصلحت آپ کے بڑھے ہاتھ کو پیچھے نہ بنا دے آپ ہار نہ مان جائیں..... معاشرے کے بے رحم اصولوں سے۔“

”اچھا سوال کیا تم نے بیگ مین اس کی اگر میں از خود وضاحت کرنا تو بڑا بڑا چھانڈ لگتا۔“

ہر طبقے اور ہر خیال کے لوگ اپنے اپنے ایک دائرے میں زندہ رہتے ہیں کچھ چیزوں کو اپنی اہم ضرورت خیال کر لیتے ہیں اور بھی کبھی اپنی ضرورتوں کے اسی دائرے کو قائم رکھنے کے لیے وہ انسانوں سے حالات سے مناسبت کر لیتے ہیں انہیں نے اسی مناسبت کے خلاف سدا جنگ کی ہے اپنی آرزوؤں کے دائرے کو بس اتنا رکھا ہے کہ میرے دائرہ میں میں سا جائیں۔ میں اذیت پسند بھی ہوں لوگ اپنی خواہشات کے لیے دوسروں کو اذیت دے ڈالتے ہیں میں فرائض کی خاطر خوب کواذیت میں ڈالنے سے نہیں گھبراتا۔ میں بے حس بھی ہوں مگر صرف اپنی ذات کے لیے تکلیف میرے لیے تکلیف ہی نہیں رہتی۔ میں خدا پر کمال یقین رکھتا ہوں اس کی رحمت کی امید کے ساتھ..... پتا ہے بیگ مین۔ مثال کے طور پر ایک شخص آپ سے کہتا ہے یہ کام کرو ورنہ کوئی بار دوں گا۔ تو وہ آپ کو کوئی مارنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ صرف آپ کی ضرورتوں کے دائرے کو منتشر کرتا ہے آپ کو ڈرا کر کہتا ہے آپ زندگی کو سب سے بڑی ضرورت سمجھتے ہیں اس لیے خوف کے سبب کوئی انتہائی غیر فوٹو فی کام نہ چاہتے ہوئے بھی پل میں کر دیتے ہیں اگر آپ زندگی سے ایک پل کو یہ سوچ کر بے نیاز ہو جائیں کہ ہر ذی روع کو روز رو نہیں ایک تباہ مرنا ہے تو آپ اپنا آپ بچا سکتے ہیں ہمدردوں کے ہاتھوں میں کچھ پلٹن کر نہیں رو سکتے۔ میں نہیں جانتا کہ آئندہ لکھوں میں انہیں چیزیں بخش چیزوں پر غلبہ حاصل کر لیں اور میری ضرورتوں کا دائرہ وسیع نہ جائے لیکن جہاں تک میری اس جنگ کا تعلق ہے تو مسئلہ یہ ہے کہ ایک دستخط شدہ دستخط ہر دم میری جیب میں ہوتا ہے کہ کیا شیر کب اس کی ضرورت پڑ جائے۔ میں نے جو زندگی گزار لی ہے اس میں میں خواہشوں کا غلام کبھی نہیں رہا بلکہ خواہشیں میرے زور پر یہ غلاموں کی طرف میرے ضمیر کے زندان میں قید رہی ہیں اور میں ہر دم ان



کے معاملے میں اتنا بااختیار رہا ہوں کہ جب چاہوں ان کو سنگین موت سے ادجار کر دوں۔“  
شیر نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں اور ان کے احساسات کو دیکھا۔

”اس بے نیازی نے اپنی ذات سے بے پروائی نے مجھے وہ دولت دی ہے جو آج کے ترقی یافتہ دور میں بہت کم لوگوں کے پاس ہے۔ سکون کی دولت دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے چار گھنٹے بھی آرام کے لٹ جائیں تو میں بستر پر لیٹتے ہی نیند کی داریوں میں گم ہو جاتا ہوں، صبح کی صبح کی نیند سوتا ہوں اور جاگ کر اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے پہلے سے زیادہ مستعد پاتا ہوں اپنے آپ کو۔“  
شیر کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ مضطرب سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”سرا کاش! میں آپ کا ادنیٰ سا سب آرڈینیٹ ہوتا تو رات آتے جاتے آپ کو سیلوٹ کرتا۔ لیکن یقین چاہیے میرا دل آپ کو نذرانہ عقیدت پیش کر رہا ہے، اور میری روح آپ کے پاس ادب میں آپ کے حضور جھکی جا رہی ہے۔ کیا مجھے اجازت ہے کہ میں ایک عظیم انسان کے ہاتھ ادب سے چھوڑ کر آنکھوں سے لگا لوں۔“  
وہ جو شجیرہ تھی اس کی اس وارثی پر قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

”ڈونٹ ہری ان ہاتھوں نے بجز مومنوں پر ڈانڈے بھی برمائے ہیں، کیا خبر کتنے بے گناہ ان کی زد میں آ گئے ہوں۔“

”نہیں سرا! بعض نگاہیں دلوں میں جھانکتے کا ادراک رکھتی ہیں۔ میں میں لکھی تحریریں پڑھ لیتی ہیں مجھے یقین ہے کہ جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو ان ہاتھوں نے اذیت نہ دی ہوگی۔ اور نہ تو شیخوں کی خبر رکھتا ہے اس کی طرف سے جڑا دوزخیوں کے حساب کتاب پر دینی جائے گی اعمال پر نہیں۔“  
وہ مسکرایے۔ شیر نے ان کے نرم نرم سرخ و سفید ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔

☆☆☆☆☆☆

”آئی۔ جی پنجاب احمد ابراہیم کی خدمات صوبہ سندھ کے حوالے کر دی گئیں۔“ صبح کے اخبار کی شہ سرٹی پڑھ کر اخبار گوہر کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ وہ آگے کچھ پڑھ نہ سکی! اسے شیر کی مصروفیات کے بل پل کی خبر بھی ان ملاقاتوں کے احوال بھی کہہ سنائے تھے، شیر نے ان کے بے مثال تعاون کی خبر بھی اسے دی تھی، ساغر اسے پکار رہا تھا۔

”گوہر پانچھی..... گوہر پانچھی..... یعنی کہاں ہیں آپ؟ آپ کا فون ہے۔“ وہ گوہر کی طرف لپکی جاتی تھی اس خبر نے شیر کو بھی پریشان کیا ہوگا اور اسی کا فون ہوگا اس نے ریسیور کان سے لگا لیا۔ ”ہیلو شیر۔ اخبار دیکھا تم نے؟“

”صبح پتیر۔ مس عسکری..... ایک اجنبی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”کون ہیں آپ؟“

”جانے تم ہی بار آپ یہ سوال کریں گی۔ شاید میرے گھر میں میری بھابی بن کر آ جانے کے بعد تک بھی..... یہ میں ہوں آپ کا بیک خواہ مامون واسطی۔“

”کیوں فون کیا آپ نے؟“

”سوچا شاید آپ نے آج کا اخبار نہ دیکھا ہو۔ آپ کو اطلاع دے دوں کہ آئی جی صاحب صوبہ سندھ کو ہجرت کر دیے گئے ہیں۔ وہاں مسائل یہاں سے زیادہ ہیں، اور ان جیسے فرض شناس گھیر مسائل حل کرنے میں

زیادہ خوش رہتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

”اوہ یوشٹ اپ.....“

”خفا کیوں ہوئی ہیں یہ میرا نہیں اعلیٰ حکام کا فیصلہ ہے، مجھ سے ناراضگی کیسی؟“

”آپ مجھے کیوں سنا رہے ہیں کیا دلچسپی ہے آپ کو ان کے جانے یا نہ جانے سے۔“

”نہیں مجھے تو نہیں دلچسپی آپ کے شہر صاحب کو ہے، شاید بہت زیادہ دلچسپی۔“

”یہ ہمارا اپنا معاملہ ہے۔“

”نہیں نہیں جنہیں بعض معاملے دوسروں کے بھی ہوتے ہیں صرف آپ کے اپنے نہیں! بالواسطہ یا بلاواسطہ

دوسرے بھی ملوث ہوتے ہیں بعض اہمتر نہیں۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”کچھ نہیں..... بس بتانا چاہ رہا تھا کہ یہ نرائسٹراما میں واسطی کا پہلا تجربہ ہے، شیر عسکری صدر یونین کے لیے۔“

فون..... فون..... فون..... رابطہ کٹ چکا تھا۔

اور گوہر صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”کیا بات ہے پریشان کیوں ہو گویا؟“ گوہر نے دروازے پر کھڑا شیر اس سے پوچھ رہا تھا اور

ریسیور ابھی تک اس کے کان سے لگا ہوا تھا۔

”کس کا فون ہے؟“

”گلاب۔ کسی کا بھی نہیں۔“ اس نے ریسیور کرپٹل پر دکھ دیا۔

”تو صورت پر بارہ کیوں بچ رہے ہیں؟“

”شیر! اصل میں میں ابھی ابھی ایک اہم خبر۔“

وہ بے پردائی سے ہنس دیا۔ ”تم آئی۔ جی صاحب کے بارے میں پڑھ لگی ہو یقیناً اسی سبب پریشان ہو۔“

”ہاں..... ہاں..... شہی! اب اس کیس کا کیا ہو گا؟“

”کیا ہوتا ہے؟ ایس۔ پی اورنگ زیب ایک فرض شناس آفیسر ہیں اور یہ کیس ان ہی کے سپرد ہے۔“ شیر تو

بالکل مطمئن تھا۔

”مگر..... احمد ابراہیم صاحب۔“

”گوری! سندھ میں ان کی ضرورت یہاں سے زیادہ ہے۔“

”وہاں بھی شہر پسند عناصر کو ان کی تقرری پسند نہ آئی تو۔“

”تو ملک خدا تک نہیں۔“ شیر ہنس دیا۔

”ویسے گوری! شہر پسند عناصر اور آئی۔ جی صاحب کا آپس میں کیا تعلق ہے۔“ وہ ذرا تاخیر سے چونکا۔

”چند دن پہلے چارج سنبھالا ہے انہوں نے آئی جی صاحب کو سنبھالنے سے منع نہیں ہو جا رہا کرتے۔ آخر کسی نے۔“

”گوری! اور انتظامیہ کے اعلیٰ ترین افسر ہیں، کسی پرائمری اسکول کے ماسٹر نہیں۔ چند دن تو کیا چند گھنٹوں میں

تو فرانسٹر ہو سکتا ہے۔“ اس نے سمجھانے کا انداز اختیار کیا۔

”پرائمری اسکول کے ماسٹر سے لوگوں کو اتنی شکایات نہیں ہوتیں شیر! جتنی عوام الناس کو ایک فرض شناس اعلیٰ



افسر سے ہو سکتی ہیں۔ یہ ٹرانسفر ان لوگوں کی سازش بھی تو ہو سکتا ہے جو معاشرے میں کسی صورت امن کی تک نہیں دیکھ سکتے۔

”اوہ ڈوٹس ورنی گوہر۔ دو لوگ کیا کر سکتے ہیں۔ کیا اوقات ہے ان کی۔ کیا سمجھتی ہو تم۔ اعلیٰ عہدیدار کوئی ہے یا کلمہ پتلی ہیں جو ان کے ہاتھوں میں کھیل سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں اور انصاف پسندی صرف ایک انسان کیوں موقوف کی جائے۔ ہو سکتا ہے آنے والے آئی۔ جی احمد ابراہیم صاحب سے بھی زیادہ فزیشن شمس ہو میں تو ایک ہی بات جانتا ہوں سچ کو ہمیشہ سچ ہی ملا کرتا ہے۔“ اس کے لہجے میں یقین بول رہا تھا۔

”ہو سکتا ہے یہ تمہاری بھول ہو۔ اگر سچ کو سچ ہی ملا کرتا تو معاشرے میں اتنے دکھ درد نہ ہوتے اتنی غم نا کہا گیا نہ ہوتی۔“ گوہر نے دلیل دنی۔

”یہ غم تاک کہا گیاں ہزاری ہزدنی سے کم ہستی سے جنم لیتی ہیں۔ سچ سے نہیں۔ یہ دنیا جس ڈگر پر چل نکلی۔ اس سے کالے تو انہیں نے ظالم کو کھلم کھلا اور معظوم کو مظلوم ترین بنا دیا ہے۔ لیکن سچائی ایماوری اور جرات من کے سہارے ہم ان کالے قانون سے نجات پا سکتے ہیں۔ سچ کے ذریعے سچ کو پاسکتے ہیں۔“

”سچ کانٹوں بھری راہ ہے۔۔۔۔۔ شہیر اس پر چل کر دکھ اذیت اور محرومی ہتی ہے خوشی نہیں۔“ گوہر خوف زدہ شاید۔

”بالکل غلط۔ یہ نہیں کہ سچ کانٹوں بھری راہ نہیں۔ بلکہ یہ کہ سچ کی پاسداری میں جو دکھ اذیت اور محرومی ہے۔ وہ ایک الوبی اور بادی سکون کی منتظر ہوتی ہے۔ الوبی سکون خمیر کے اطمینان میں ہے اور خمیر کبھی جھوٹ اطمینان نہیں پاتا۔ فریب اسے خوشی عطا نہیں کر سکتے۔ گوہر! تمہیں خوش ہونا چاہیے۔ شہیر کی بہادری اور حویہ پر۔ تم دیکھنا۔۔۔۔۔ ایک دن ہزاری اس خوب صورت دنیا کا جسے ہم پاکستان کہتے ہیں۔ پورا نظام بدل کر جائے گا۔“

”ایک دو آدی کیا کر سکتے ہیں۔ کیا کر سکیں گے ایک دو آدی؟“

”کاش! تم سبے ہاسپٹل میں ہے چین دیے قرار پھرتے طلباء و طالبات کا جھوم دیکھا ہوتا گوہر۔“  
 ”کسی نا خوشگوار دن و شبے پر جھوم کا اگھا ہو جانا اور بات ہے اور کسی مہم میں سر و پیڑ کی بازی لگانا اور بات۔“  
 ”ہر انسان کے پاس ایک عدد دل اور ایک عدد دماغ ہوتا ہے اور ہر دل اور ہر دماغ اپنی جگہ خاصے اہم ہوتے ہیں۔ ان اہموں میں موجود سارے اندازوں کے پاس کچھ کر گزرنے کا جذبہ ہوتا ہے لیکن پروگرام نہیں کہ انہیں کیا کرنا ہے۔“

”شہیر! تم انسانوں کی سوچ ان کے دل و دماغ کے بارے میں کچھ زیادہ پر امید نہیں ہو؟“  
 ”یعنی میں یہ سچ مان لوں کہ اچھی باتیں صرف کتابوں میں لکھتے اور پڑھنے کے لیے ہوتی ہیں۔ صفحات کا حساب ہو جاتی ہیں اور عملی زندگی میں اچھی باتوں کی نہ جگہ ہوتی ہے نہ گنجائش۔ نہیں گوری! ایسا ممکن نہیں ہے۔ ہیر مدتوں سے بنے مدتوں سے چلتے اس نظام کو بدنا ہونا۔ ہمیں اپنے فرائض کو پہچانا ہوگا۔ ہمیں کچھ دیکھنے کے اصول پر نہیں چرنا ہونا ہوگا۔ ہمیں اذبان سے یہ بات نکالنا ہوگی کہ کچھ نہ روا اور سب کچھ ہوا۔“

”کون مانے گا تمہاری بات۔ کون دے گا تمہارا ساتھ۔ یہاں تو مل نہ سکتے پر چین لینے کا رواج ہے۔“  
 ”شہیر مستکرا دیا۔“ چھین چھینت کی نویت ہی کب آئے گی جب ہر شخص اپنی اپنی تہل از خود دینے کو تیار ہوگا۔“  
 ”گوہر کے ذہن میں مامون واسٹی کی باتیں گزریں گیں۔ اس کے خطرناک غزائم کا ڈرنا سے اندر اتنا اندر

لنا نے جارہا تھا۔  
 ”بعض لوگوں کی لغت میں دینے کا لفظ ہوتا ہی نہیں شہیر! اور لینا وہ اپنا پیہ اتنی اور خاندانی حق سمجھتے ہیں۔“  
 ”ایسے چند لوگوں کو راہ راست پر لا کر معاشرے کے حصار کے کام کی شہس بنیاد ڈالی جا سکتی ہے۔“ شہیر گوہر کا اندازہ سمجھ گیا تھا۔

”اور یہ چند لوگ ٹھیک ہونے کے ہرگز نہیں ہیں۔ جانے کب سے انسانوں نے ناند اپنے پیشے میں۔ حقوق سب کر رہے ہیں اور چین سے ہیں۔“

”اٹنی ماڈ۔۔۔۔۔ تمہاری مایوں کن باتیں تمہارا تلخ مشاہدہ مجھے میرے مشن سے دور نہیں!۔۔۔۔۔“  
 ”نوں کی کھنٹی بجنے لگی تو دونوں خاموش ہو گئے۔ گوہر کا دل دھڑکا۔ یقیناً لائن پر باروں، اٹنی اتنا۔ اس نے لپک۔۔۔۔۔ ہیر کی کھنٹی بجنے سے قبل اتنا ریسورٹ اٹھا لیا۔“

”ہیلو۔۔۔۔۔! شہیر اس کے چہرے کے بدلنے تاثرات دیکھنے لگا۔“

”ہیلو۔۔۔۔۔ جمال احمد بول رہا ہوں۔“  
 ”جمال احمد۔“ گوہر کا چہرہ سوال بننے ہی لگا تھا کہ شہیر نے اس سے ریسورٹ لے لیا۔  
 ”ہیلو۔۔۔۔۔ شہیر بول رہا ہوں ڈیڈی۔“

”شہیر بیٹے۔ کیسے ہو۔ دونوں سے ٹرائی کر رہے تھے شہیر ہی نہیں بل پارہا تھا۔ لو اپنی مٹی۔ با۔۔۔۔۔“

”ہیلو۔۔۔۔۔ شہیر نے لیے۔ پھر اس دلتے کی وجہ سے تو از حد پریشان ہو گئیں۔“  
 ”ہیلو۔۔۔۔۔ شہیر کا۔“ شہیر کے چہرے پر دیا جہاں کا سکون اور مسرت۔ اٹنی اتنا۔۔۔۔۔“

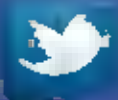
”ادھیارے بیٹے! تم خیریت سے ہوتا۔ ٹھیک ٹھاک ہوتا۔ شہیر اٹنی جان مجھے سچ سچ بتانا۔ میں۔۔۔۔۔“  
 ”نوں رہتی ہوں تمہارا خیال تمہاری سدرہ آ پا کی سمجھ نہ آتے والی پھاری دونوں ہی میرے لیے تھیں۔۔۔۔۔“

”مٹی۔۔۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بالکل ٹھیک۔ لیکن مٹی! پریشان ضرور ہوں میری جان۔۔۔۔۔“  
 ”تے ٹر کے موت و حیات کی کشش سے یہ چار ہو گئے۔ یہ تکیف کجی میری اپنی تکلیف ہے۔ سب۔۔۔۔۔“  
 ”سخت نہ ہوں۔ میرا دل بے چین رہے گا۔“

”تمہارے ڈیڈی نے اریاب اختیار سے بات کی ہے۔ انشاء اللہ شہر پینڈو کے پکڑے جائیں گے۔“  
 ”سدرہ آ پا کیسی ہیں؟“

”کیا بتاؤں شہی! دو مسلسل بے آوش ہے۔ تمہارے ڈیڈی مجھے تسلیاں دیتے ہیں کہ یہ بے آوش۔۔۔۔۔“  
 ”نہی ہے لیکن میرا دل بھل کھاتا ہے۔ کیا خبر یہ لوگ مجھے بہاؤ اور سے رہے ہوں۔ وہ کجی کھینک ہی نہ۔۔۔۔۔“  
 ”خدا اپنا کرم کرے گا مٹی! آپ مایوس نہ ہوں۔ نیک امید رکھیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اٹنی اتنا۔۔۔۔۔“  
 ”ت سے وطن واپس آ جائیں گے۔“

”شہی!“  
 ”نئی مٹی!“  
 ”شہی! تمہارے ڈیڈی مجھے آج تک ایک کم فہم نادان عورت ہی سمجھتے ہیں۔“



"نہیں جی! ایسا نہیں ہے۔ وہ آپ سے مذاق کرتے ہوں گے درحقیقت جو کچھ سمجھتے ہیں اس کی مجھے خبر ہے۔"  
"خیر! وہ کچھ بھی سمجھتے رہیں۔ اولاد کے لیے ماں ایک معتبر قسم کی شے ہوتی ہے اور ماں کی بات اولاد کے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔"

"آف کورس آپ حکم کریں گی۔"

"شہسی! غصہ اور انتقام کے جذبے آگ کا سمندر ہیں اور آگ ہر شے کو جلا کر بھسم کر ڈالتی ہے نرم، ہلکی برہاری غلوں اور گزرا انسان کی عظمت کے مظہر ہیں۔ انسان جتنی بڑی ذمہ داری کے لیے چنا جائے۔ اتنا بڑا طرف اور حوصلہ بھی اس کے پاس ہو۔ ذات کے دشمنوں کو معاف کر دینا پیغمبروں اور ولیوں کا وصف تھا شہسی اور ہم لوگ ان عظیم ہستیوں کے نقش قدم پر چل کر فلاح کی راہ پاسکتے ہیں۔"

شہیران کے الفاظ پر غور کرنے لگا۔

"مئی! آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔"

"وہی کچھ جو ایک مسلمان ماں اپنے جرنی اور بہادر اور نیک بننے کو کہہ سکتی ہے۔ بدی کو بدی سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں مگر تیشی سے کم ظفری کا مقابلہ کرنے کے لیے بلند ظفری کی ضرورت ہوتی ہے شہسی۔ تم ہزاروں طالب علموں کے لیڈر ہو۔ حسن سلوک کا مظاہرہ کرنا۔ طلباء کو بدے کی آگ میں مت جھونک دینا۔ جو منشور عدلی نے پڑھ کر سنا یا تھا اس پر حرف بہ حرف عمل کرنا۔ خدا کے سوا کسی کے آگے جھک جانا مجھے پسند نہیں لیکن سب سے بڑا نقصان اس کا مقابلہ کو اپنا گرویدہ کر لینا اس سے بڑی اور کوئی فتح نہیں۔ ڈاکٹر ہنری تمہیں دعا میں دے رہے تھے اور نصیحت بھی کر رہے تھے کہ دنیا اس کے لیے محبت و اخوت کے لیے بنائی گئی ہے۔ اسے بے سکونی خود غرضی انتقام اور سنگ دل کی نذر نہیں ہونا چاہیے۔"

"اد۔ کے مئی! بس اتنا کافی ہے۔ میں آپ کی اس تقریر دل پذیر کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ اگر حاشیہ سے کے بڑے بگ حسن سلوک سے شرمندہ ہو کر اپنے گھناؤنے عزائم سے تائب ہو سکتے ہیں تو شہیر کو اس کے سوا اور چاہیے بھی کیا۔ آپ بس اپنے شہسی کے لیے دعا کیجیے گا کہ وہ آپ کی نصیحتوں پر عمل کرنے کے لائق رہے۔ عمل کر سکے۔"

"اجھا شہسی! تمہارے ڈیڑھی بل بڑھ جانے کے ذریعے آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ میں تمہیں خط لکھوں گی۔ گوہر کو دعا میں دینا۔ خدا کرے جلد میں اسے دیکھ سکوں۔ خدا حافظ۔"

رابطہ کٹ گیا شہیر نے ریسیور رکھتے ہوئے گوہر کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر کھٹے مہذبہ ہارنگا بولوں کی جھلک گوہر بھی مسیوس کر رہی تھی۔ شہیر نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ کے ہلکا سا وزن گتہ ہر پر ڈالا۔

"ساتم نے مئی کیا کہہ رہی تھیں؟"

"ماں اپنے بننے کو کوئی غلط درس نہیں دے سکتی۔"

"ہاں گوہری! وہ مجھے عظیم انسان کی کسی نمایاں منزل تک پہنچا دینا چاہتی ہیں۔ بہت سی امیدیں وابستہ ہیں ان کا میری ذات سے۔ دو چاہتی ہیں۔ اس سانچے کے ذریعہ افراد کو معاف کر کے پینورسٹی کی فضا میں امن کے قیام کے بنیادوں میں لکھنا جانتا یہ مرحلہ کیسے طے ہوگا لیکن میں آج اپنے ہی۔ سی صاحب سے بات کروں گا۔ میں اپنی اتنی چنگی کئی کی بات کا مان رکھوں گا۔ شاید شرمندگی کو دسب سے بڑا انتقام تصور کریں اور آئندہ ایسا کوئی سا شہر و نمانا ہو سکے۔"

گوہر جب جواب دے سکتی رہی۔  
"یہ تم گھوڑ گھوڑ کر کیا دیکھ رہی ہو۔ میں نے کوئی ناقابل فہم بات تو نہیں کی۔"  
"نہیں نہیں شہیر۔ میں سمجھا ہر سوچ رہی تھی۔"  
"کیا۔۔۔؟"

"معاف کر دینا۔۔۔۔۔ پرانے زمانے کا دستور تھا۔ اب معاف کر دینا بڑی بڑی کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔"

"میں تم سے سزا زیادہ اتنا پرست ہوں گوہری! لیکن انا کی دیواروں میں قید ہو کر بسا اوقات آدی اپنے آپ سے بھی پیچھے جاتا ہے۔ میں اب میری ان لوگوں کا ہوں۔ جنہوں نے مجھے اپنی حمایت اور اعتماد سے نوازا ہے۔ وہ جو بتی تیں میری ذات کے دشمن ہیں۔ ذات کی خاطر میں اجتماع کو آگ کے سمندر میں کیوں جھونک دوں۔ ایسا کر تیوں نہ کروں۔ اس کی خاطر اپنے انتقامی جذبولوں کو مار کر ایک حقیقی لیڈر ہونے کا ثبوت کیوں نہ دوں۔ یہ بہت ضروری ہے ایسا کرنا ہوگا اور تمہیں چاہیے کہ تم میرا حوصلہ بڑھاؤ۔"

"ڈس پوبیسٹ آف یور لگ شہیر۔" دل کی بات پھر گوہر کے دل میں ہی رہ گئی۔

☆☆☆☆☆☆

"بلال۔" گئے: سچے باپ کی ایک نسبتا کونے: الی میز پر مقناش کے حسن کی برق پاشیوں سے اپنا خرمن دل جلا کر دس کر کے بھی وہ فرحان و شاداں تھا۔

"آپ کے لیے تو جاں بھی ایک حقیر نذرانے کے طور پر حاضر ہے اور جاں سے بڑھ کے اس دنیا میں کوئی چیز قیمتی نہیں کس نوشا۔"

یہ کا فرمانہ ادا سے سکرانی۔ بالوں کو اپنی موئی انگلیوں سے سنوارا اور میری رخ کو زیر لب مسکراہٹ سمیت بغور دیکھنے لگی۔ پھر اچانک اس نے نظر میں اٹھائیں اور اس کے چہرے پر بھنا دیں۔

"آپ جانتے ہیں میرا تعلق۔"

"میں جانتا ہوں آپ بہ تعلق اس علاقے سے تھا جہاں دن اور رات میں کوئی خاص فرق نہیں۔ راتیں دنوں سے زیادہ روشن ہوتی ہیں اور کام آدھی۔"

"نہیں۔ میں راتوں تو ان کی مصنوعی روشنیوں کا عنت سمجھتی ہوں۔ میں نے چھٹکارا ہی تو چاہا تھا۔"

"آپ کو۔۔۔ آپ کو باقی اس ماحول سے نفرت ہے۔"

"جہاں رہ کر آدی کا دم کھٹا ہو۔ سانس بھٹکا آتی جاتی ہو وہاں سے آدی کو یقیناً نفرت ہی ہوتی ہوگی۔"

"بھلا ہم آپ کو اسکی جائیداد کھ سکتے ہیں کس نوشا جہاں آپ کا خدا نخواستہ دم گھٹ جائے اور سانس بھٹکا آئیں جائیں۔ ہمارا دل ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں آپ سہولت کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔"

"مجھے کسی دل میں رہنے کا ارمان نہیں ہے۔ مجھے تو زندگی کو آلودگیوں سے بچانا ہے۔"

"میں آپ کو معاف سخری زندگی کی گارنٹی دے سکتا ہوں۔ مجھے آپ سے آپ کی اسی بات کی وجہ سے ہی تیار ہے مگر ڈھی۔ یقین کر لیں میں آپ سے اسپرٹس ہوں۔ آپ میں حوصلہ ہے جرات ہے۔ آپ میں خانانہ کارٹہ بدلتے کی طاقت ہے۔ آپ روایات کی پابند نہیں ہیں۔ روایات بدلنے کا ڈھنگ جانتی ہیں۔ میں ایک مرد ہوں۔ آزاد معاشرے کا مرد۔ مجھے فکر ہوگی آپ کو ہمارا دے کر آپ کے عزائم کی تکمیل کے لیے آپ کا ساتھ دے کر میں تیار ہوں میرا ہاتھ تمام لیجیے۔ یہ ہاتھ آپ کو دے گا نہیں دے گا۔"



”نہیں۔ نہیں آپ ایک اچھے دوست ہو سکتے ہیں اور بس۔ میرے عزائم کچھ بھی ہوں انہیں میں اپنی قوت کے ساتھ پورا کروں گی مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔“  
 ”لیکن مجھے آپ کی ضرورت ہے مس نوشی۔“  
 ”زندگی میں ہر شخص کی ضرورت بن کر نہیں جیا سکتا۔ مگر ایسا منظور ہوتا تو وہ جگہ کیا بری تھی میرے لیے۔ یہ لبادہ اوڑھنے کی کیا ضرورت تھی مجھے۔“

”آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں آپ کا ہاتھ پوری عمر کے لیے تھامنا چاہتا ہوں“ آپ نے مجھے اجیل کیا ہے مس نوشی۔“

”ایسے الفاظ ہر دوسرے شخص کی زبانی سن کر اعتماد ہی باقی نہیں رہا۔“  
 ”آپ کو میرے بارے میں کسی نے بتایا نہیں شاید میں اپنے قول کا پکا انسان ہوں۔“  
 ”دیکھیں گے وقت آپ کو کیا ثابت کرتا ہے۔“  
 ”اوہ جینک یو..... جینک یو میری سچ۔ گویا آپ اس خاکسار کو آزمانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔“

”وہ تیس وی۔“  
 ”دھوکے کسی امید میں ہی کھائے جاتے ہیں۔ ناامیدی کے ساتھ نہیں۔“  
 ”بالکل درست کہا آپ نے۔ اور نیک امیدوں کے انعام نیک ہوا کرتے ہیں۔“  
 ”بے شک..... ویسے ایک بات پوچھوں۔“  
 ”جی ضرور پوچھیے۔“

”لڑکیاں آپ سے خوف کیوں کھاتی ہیں؟ جب کہ آپ بظاہر خوف کھائے جانے والی چیز نہیں ہیں۔“ وہ بے اختیار ہنسا۔  
 ”کو تو بوق ہیں دو ساری کی ساری۔ دراصل مس نوشی ان میں مجھے فالو کرنے کی حسرت نہیں آئی میں وہ مجھے سمجھ ہی نہیں سکتیں۔“  
 ”کیا مطلب؟“

”بھئی صاف ہی بات ہے میں کسی کی ذات میں اس حد تک انٹرنل نہیں ہوا کبھی کہ اسے جان کا رنگ بتالوں ساتھ گھومنے اچھی اچھی باتیں کرنے کھانے پینے اور ٹاٹے گاے خیر خیریت پوچھ لینے پر ان کو کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ میں نے اب لائف پرنٹ چن لیا ہے قیامت میری نہیں اسی کی ہوگی اور پھر ایک پتے کی بات آپ کو بتاؤں سرد کہ آسانی سے ہاتھ لگ جانے والی لڑکی بھی اپنی نہیں کرتی۔“  
 ”آپ لڑکی کی نفسیات میں سمجھ سکتے۔“

”لڑکی کی نفسیات۔ ہونہ لڑکی کی نفسیات یہی ہے کہ وہ شادی کے لیے کسی والوں کی دہ کو بھنسا لے۔ جو اسے حاشا معاشرتی اور نجی تحفظ دے سکے۔ اپنی دولت اس کی بے لگام نم ہشوں پر بے دریغ لٹا جا چلا جائے۔ اور اس والوں ہم کی خوشیاں اور ہم اس لڑکی کے اشارہ زبرو کے پہنچ ہو جائیں۔“  
 ”معاف کیجیے مس نوشی میں کسی ایسی لڑکی کی خواہشات کی تکمیل کے لیے قربانی کا کبر نہیں بن سکتا۔“  
 ”معاذ کیجیے پھر تو آپ یہ کسی بھی سب پر میرے بارے میں ایسے استاسات۔“  
 ”اوہ نوکس نوشی۔ آپ کو کیا خبر آپ کیا ہیں۔ آپ میرے دل میں اس وقت سے موجود ہیں جب میں نے

”بلی ہا آپ کو پوچھو شئی کے احاطے میں دیکھا۔ آپ کا حسن آپ کی حکمت آپ کا وقار آپ کے رویے۔ ان سب نے مجھے چونکا دیا۔ بخدا پوری جامعہ میں آپ جیسی طرح دار لڑکی اور کوئی نہیں باقی گاڈ آپ کو دیکھ کر کوئی سوچ ہی نہیں سکتا کہ آپ۔“ اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ نوشی اسی طرح اسے دیکھتی رہی۔  
 ”میں اپنے خاندان میں سب سے مختلف ہوں۔ اپنے ارادوں اور ہٹ کا پکا۔“

”کون سی ہٹ میں یا لک ہٹ بارانج ہٹ؟“  
 ”دونوں ہی۔“ وہ خوش دلی سے مسکرایا بلکہ ہنس رہا۔  
 ”میرے فیصلے کی اتنی دہانوں سے کلرا کر کوئی مرقو سکتا ہے مجھے بدل نہیں سکتا۔“  
 ”بہت خوب۔ مجھے بھی ایسے ہی لوگ اسیا کر کرتے ہیں۔ ایسے لوگ زندگی میں کچھ کر سکنے کے اہل ہوتے ہیں۔“ وہ پر خیال انداز میں مسکرا دیا۔

”واقعی۔ جیسے میں..... ایک طویل مدت بعد آپ کو پانے میں کامیاب ہو گیا۔“  
 ”آپ غلطی کر رہے ہیں یہ پاتا نہیں صرف مل لینا ہے۔ ابھی تو میں نے آپ سے صرف بات کی ہے آپ کے دل میں اتر کر نہیں دیکھا۔ آپ مجھ پر کھلے نہیں۔ میرا تعلق ہے شک تاریک دنیا سے۔ ہے جہاں روشنی کی کوئی کرن پہنچ بھی جائے تو اجالا بکھیرنے میں ناکام رہتی ہے۔ لیکن درون دل میں جب کچھ ہوں اسے صرف میں جانتی ہوں۔“  
 ”جی اچھے انسان کی طنز ہر اچھائی پر میرا دل خوش اور ہر برائی پر نچیدہ ہو جاتا ہے۔“  
 ”چلیے مجھے دیکھ کر مجھ سے مل کر آپ نے کیا محسوس کیا؟“

”آپ۔ آپ کو دیکھ کر..... خند نچیدہ ہوئی ہوں نہ خوش۔ کیونکہ مجھے خبر ہی نہیں کہ آپ اچھے ہیں یا برے۔“ وہ ہر ہنس دیا۔  
 ”آپ کی صاف گوئی بھی بہت اچھی لگی۔“  
 ”تھیکس۔“ اس نے اپنی رست و اوج کو بے مقصد میڈھا کیا۔

”کیا میں امید رکھوں کہ آپ مجھے آزمانے اور جاننے کی خاطر ہی سہی مجھ سے پھر ملیں گی ضرور۔“  
 ”جی ہاں ضرور اور یقین جانے صرف ساتھ گھومنے کھانے پینے اچھی اچھی باتیں کرنے اور پھر کبھی کبھار راہ دکھ کر خیر خیریت دریافت کرنے کے لیے۔ آپ کو پھانسنے کے لیے ہرگز نہیں۔“ اس نے چوت کی۔  
 ”اوہ مس نوشی! آپ کی بذلہ سچی بھی کہاں کی ہے۔ تعریف آپ کی ذہانت کا حق ہے۔“  
 ”تعریف کے لائق تو وہ ہے جس نے آپ کو مجھے ہماری ذہانتوں کو پیدا کیا۔ میں اور آپ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔“

”یہ صرف مسکرایا۔“  
 ”پھر کب مل رہی ہیں؟“  
 ”جب آپ ملنا چاہیں۔“  
 ”میں نہیں کہہ رہی۔ تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟“  
 ”میٹ دیگم۔“  
 ”اوکے۔ میرا خیال ہے کہ اب چلنا چاہیے۔“  
 ”جی ہاں کافی دیر ہوئی ہے۔“





ظن و تشنیح کی ذکیلی چھریوں نے دل میں اترا تر کر اس کا دل ریزہ ریزہ کر دیا۔ کئی وہ دعائیں مانگا کرتی تھی دن رات اپنے بابا جانی کے ساتھ رہنے کی۔ لیکن دعا سجاہ ہوئی تو عذاب بن گئی وہ بھی اپنے ندر ہے۔ کئی دنوں بعد سب کی آنکھ بچا کر وہ اس کے کمرے کی طرف نکل آتے۔ لفظ دو لفظ اس کے پاس نکلتے اور چلے جاتے۔ ماں کے لیے وہ کئی اولاد ہو گئی تھی۔ لیکن ماں کو اس گھر میں قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ بس حیدر بھی کبھار سے پل دوپل کو لے جاتے اور طوا کر واپس لے آتے۔ "طوائف" یہ نام ایک مخمر بن گیا۔ جو ہر طرف اٹھتا اور اس کے سینے میں پوسٹ ہو جاتا۔ حیدر کی محبت اتنے سارے زخموں کا مرہم و مداوا نہ بن سکی۔ گھناڑ جسے دیکھ کر پھول بھی شرمایا کرتے تھے۔ خرم رسید و برگ بن کر رہ گئی۔ ان دنوں میں سے ایک دن جب وہ ایک وجود کو جنم دینے لگی تھی۔ حیدر زماں اسے ڈاکٹر کو دکھا کر واپس لارہے تھے۔ ڈاکٹر نے حیدر زماں کو تنبیہ کی تھی۔

"آپ کیسے شوہر ہیں نوابزادہ۔ اپنی دانف کی صحت کا آپ کو خیال ہی نہیں انہیں محبت اور ہمدردی کی ضرورت ہے اچھی خوراک اور سیر و تفریح کی ضرورت ہے۔ ورنہ ہو سکتا ہے۔ کہ....."

اور پورے گھر سے کامطلب حیدر زماں کی سمجھ میں آ گیا۔

راستے میں اپنے قریب بیٹھی گھناڑ سے وہ مخاطب ہوئے۔

"گھل! تم نے اپنا آپ آئینے میں دیکھا۔"

وہ خاموش رہی۔

"تم نے بڈیوں کے ذہن سے پیار نہیں کیا تھا۔"

"مجھے اسی جیسی مسکراتی حسین ترین نکلن زکی ضرورت ہے۔" اس نے بغور نہیں دیکھا۔

"گھل! کیا میری محبت میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ کیا میرے بے کراں جذبے تمہارے سکون کے لیے ناکافی رہے ہیں۔"

اس نے حیدر کے شانے سے سر نکال دیا۔ کئی آنسو لڑکتے ہوئے ان کے لباس میں جگہ جگہ جذب ہو گئے۔ وہ کیا کہتی کیا عاتق۔ محبت دینے والا ایک تھا اور نفرت کے تیر جگر میں اتارنے والے سے بے شمار۔ اس میں ان سب کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ آج بھی خاموش رہی۔ اسی خاموشی میں ہی ایک کمزوری یعنی کوجنم دے کر وہ دنیا چھوڑ گئی۔ حیدر کی دنیا اندیر ہو گئی۔ انہوں نے سر دیواروں سے گرا دیا۔ اس دن نانو کھلی ہمارا اس محل میں آئیں۔ بیٹی کا آخری دیدار کرنے کے لیے انہوں نے تڑپتے سکتے حیدر کی پیشانی پر چوم لی انہیں سینے سے لگا لیا۔ جی بھر کے روئیں اور جاتے جاتے چند کاغذ ان کی مٹھی میں تھما دیے۔

قلم کی کھلی طویل رات جو انکاروں اور کانٹوں سے بچے بستر پر گزرنے والی تھی حیدر گھناڑ کا خط پڑھ کے حیران رہ گئے۔ اسے تو ان کے پیاروں نے مار دیا تھا۔ نفرتوں کے زہر دے کر۔ ظن و تشنیح کی بارشیں کر کر کے اس نے اپنے طویل خط میں ایک جگہ لکھا تھا۔

"بیاری امواجانی۔ اگر آپ سچ طوائف بھی تھیں نائب بھی میرا دل آپ کی غنڈت کو جھدے کرتا ہے۔ امواجانی یہ سب مل کر مجھے مار ڈالیں گے۔ ان کی نکاہوں میں اتنی حقارت ہوتی ہے میرا جی چاہتا ہے میں ان نظروں کا سامنا کرنے سے پہلے مر جاؤں۔ بابا جانی بے چارے کتنے مجبور ہیں۔ میری طرف آتے ہیں تو ہاتھ بندھ میں ہونے لگتی ہوں۔ یوں لگتا ہے یوں محسوس ہونے لگتا ہے گویا میں ان کی بیٹی نہیں ان کے سینے پر پڑ بھاری بوجھ

ہوں۔ میں کتنی بد نصیب ہوں امواجانی! حیدر کی محبت پر میرا دل شاد کام نہیں ہو سکتا۔ میں ان سے اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکتی۔"

امواجانی کسی ماحول میں اپنے آپ کو کمترین محسوس کرنے لگی تو ذرا صلے درمیان میں حائل ہو جاتے ہیں۔ حیدر میں اور گھل میں فاصلہ پیدا ہو گیا ہے جس کی خبر انہیں نہیں ہے۔ کاش یہ فاصلہ نہ ہوتا میں ان سے دل کی باتیں کہہ سکتی ان سے التجا کرتی کسایں سچائی کجا کو چھوڑ دینا جہاں لوگوں کے دل بھی پتھر کے ہیں اور کہیں ایک چھوٹا سا گھر بنا کے رہنے لگیں۔ لیکن میں ایسا نہیں کہہ سکتی۔ امواجانی کاش وہ میری زندگی میں نہ آئے ہوتے۔ میں اب بھی آپ کے پاس ہوتی۔ نماز قرآن اور ادبی کتابوں میں غم رہنے والی لڑکی۔ بابا جانی کو بے لے محبت نامے لکھنے والی لڑکی۔ امواجانیوں سے اچھے تو وہ پھول پودے تھے جو میرے راز و اہاں اور دوست تھے۔ میں مسکراتی تھی تو وہ میرا ساتھ دیتے تھے۔ میں بابا جانی کے لیے اداس ہوتی تھی تو وہ بھی سر ہمو ڈال لیتے تھے۔ اب نہ وہ میں ہوں نہ میرے ارد گرد و ماحول۔ میں مر گئی ہوں امواجانی صور پر مر گئی ہوں۔ شاید حیدر کی محبت بھی بہت دن میرے جسم کو سہارا نہ دے سکے۔ امواجانی تو حیدر سے یہ التجا بھی نہیں کر سکتی کہ میں مر جاؤں تو تم جیسا آنے والے میرے بد نصیب بچے کو وہ اس مسموم فضا سے بچالیں آپ کو دے دیں۔ امواجانی اب اتنا آپ کر نیچے گا۔ انسان کو جیتے کے لیے محبت کی ضرورت ہوتی ہے اور میں نہیں چاہتی کہ حیدر کے پیار کی نشانی بھی ان مسموم فضاؤں کی عذر ہو جائے۔"

وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ کھو جانے کا احساس بے حد ظالم تھا۔

تیسرے دن وہ اپنی نوزائیدہ بیٹی اس کی نانو کی جھولی میں ڈال آئے۔..... ذرا آٹھ دنوں بعد خود بھی اس گھر کی فضاؤں سے دامن بچا کے واپس انگھینڈ چلے گئے۔ تب سے اب تک نوشاہ اپنی نانو کے ساتھ تھی۔ حیدر کے کہنے پر نانو نے وہ خیر چھوڑ دینا۔ اور لاہور میں رہنے لگیں۔ نوشاہ اپنی ماں اور باپ کے حسن و وجاہت کا شکر کر پرتی تھی۔ چھٹیاں گزارنے ہر سال اپنے پاپا کے پاس جایا کرتی۔ جو ایک مشہور میسر مشر تھے اور تہا زندگی گزار رہے تھے۔ حیدر نے اپنی ساری محبت بیٹی کے لیے وقف کر دی تھی۔ نانو نے اسے ایک مختلف انداز میں پروان چڑھایا تھا۔ وہ اپنی ماں کی طرح خاموش شمع ذہنی و باطنی لڑکی نہیں تھی۔ نانو نے اپنی کہانی اور حیثیت اس پر واضح کی تھی۔ اس میں جذبات پیدا کی تھی کہ لڑکیوں اسے دیکھ کر یہ یاد دلانے کہ وہ ایک طوبہ و نف زادی کی بیٹی ہے تو وہ ہار سے صلہ سے کہ اپنی جان کے درپے نہ ہو جائے بلکہ زمانے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔ نوشاہ نے اس تربیت کا پھول زیادہ ہی اثر لیا۔

وہ حد سے زیادہ خود اعتماد تھی۔ خوش مزاجی اس کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ اپنی دوستوں میں وہ اونچے اونچے طبقے لگاتی۔ جیسی کشمیری لیکن جو بیٹی اس کا سامنا کسی مرد سے دیتا اس کے چہرے پر خاموشی ایک وقار سمیت سج جاتی۔ مردوں تن جاتی۔ آنکھیں دنیا سے اجنبیت کا مظاہرہ کرنے لگتیں۔ اس نے اپنے دادا بابا نانو کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ لیکن اسے دادا کی سنگدلی اور نانا کی بزدلی کے حوالے سے دنیا کے مردوں سے نفرت ہوئی تھی۔ اس کے پاپا بھی تو کم لہجہ انسان تھے اس کی ماں کو سمجھ ہی نہ سکے۔ اس پر سوچاں سے فدا ہوتے ہونے بھی اسے زندگی کی طرف نہ لاسکے۔ وہ ان سے محبت کرتی تھی مگر صرف اس لحاظ سے کہ انہیں نوشاہ سے بے پناہ محبت تھی۔ یا یہ کہ اس کی ماں سے جدا ہو کر وہ بھرتی دیا میں تہا زندگی گزار رہے تھے اور بس۔

حسین داستانوں کو جنم دیتا ہے۔ عشق کی بنا ڈالتا ہے۔ اس پر حسن بھی بنگامہ خیر تھا۔ ابھی وہ لاہور کا لڑکچہ ہی تھی



کہ اس کی خوبصورتی کے چہرے پر شہر میں پھیل گئے تھے۔ لڑکے اس کی ایک جھٹک دیکھنے کی خاطر پہرہ لگاتے۔ وہ باہر نکلتی اور بلوں پر قدم رکھتی انہیں سستی کھینچتی گاڑی میں بیٹھ کر یہ جاہد جا چکی جاتی۔ خد نے اسے بے تحاشا حسن کے ساتھ بے تحاشا ذہانت سے بھی نوازا تھا۔ ذہنی ہی میں اس کے حسن کے ہی نہیں ذہانت کے چہرے بھی تھے۔ یہ شہرت شہر میں ہوئی جب اس نے بی بی اے اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ اور یونیورسٹی آگئی۔ پاپا کی خواہش پر اس نے انٹرنش میں ایم اے کی ٹھکان لی۔ پاپا اے سی ایس پی افسر کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ نوشی کی نکاس میں امتیاز نہ بھی تھا۔ اپالو کے مجھے جیسا خوبصورت۔ لاکھوں میں کھیلنے والا۔ نئے ماڈل سے ہنڈا کار اور یونیورسٹی آتا۔ پیش قیمت لباس زیب تن کرتا۔ لاپارٹمنٹ کے سارے لڑکے اور لڑکیاں اس سے مرعوب تھے۔ لیکن نوشی اسے گھاس نہیں دانتی تھی۔

اس نے پہلی بار نوشی کو دیکھا تو دیکھا ہی رو گیا۔ سیاہ کاخار سا زخمی میں اس نے جسم کا سونا چمک رہا تھا۔ چیز چیدو خوبی کے چاند کی طرح ودف رہا تھا۔ اور سالانہ تقریب کے منظم اجتماع میں وہ اس سے آگے کی رو میں وہ ستوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ جیسا گروں پر سیاہ بالوں کا جوڑا امتیاز نہ نہ وہ یوانہ کر دیتے کے لیے کافی تھا۔ وہ رو نہ سکا۔ اٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔

”میں تو شاہ تازہ.....“

نوشی نے نظریں اٹھائیں۔ تھری جیسے سیاہ سوٹ میں خوبصورت امتیاز نہ نہ ہوں میں شوق کا جہاں لیے اے تک رہا۔ نوشی بھی اسے دیکھتی رہ گئی۔

”میں امتیاز نہ نہ ہوں۔ یقیناً آپ نے میرا نام..... سنا ہوگا۔“

”جیسے سنا تھا تو اب سب کی موجودگی میں سن لیا ہے۔ لہذا آئندہ کبھی نہ کہہ سکوں گی کہ یہ نام نہیں سنا۔“

”ہا..... ہا..... ہا۔“ ایک خوب صورت وقت امتیاز نہ نہ کے لبوں سے آزاد ہو کر نوشی ناز کے ارد گرد پھیل گیا۔

”جیسا سنا تھا ویسا بلکہ اس سے بڑھ کر پایا۔ اپنی بد نصیبی کا احساس ہو رہا ہے۔“

”پہنسیبی!“

”جی ہاں ایک طویل مسٹر میں نے آپ سے تعارف حاصل کیے ہوا گزار دیا۔“

”اچھا تھا وہ مسٹر جہاں سے ملے بنا گزار گیا۔ بد نصیبی تو اب شروع ہو رہی ہے۔“ نوشی کی دوست بولی۔

”کیا مطلب؟“ امتیاز نہ نہ واقعی حیران تھا۔

”جی ہاں! ملنے کے بعد آپ مجھے کام سے۔“

نوشی نے کڑے..... تیروں سے اپنی دوست کو گھورا۔

”کام سے جانا بھی کام کی بات ہے اور کچھ نہیں تو آئیے حسین تصور تو ہمارا ہو گا نا۔“

”اور حسین تصور کے سہارے زندگی کے سارے پل سہولت سے کاٹ لینا عاشقوں کا دل پسند مشغلہ ہے۔“

کسی نے ٹکرا لیا۔

”معاف کیجیے فریڈنز! میں ان بکھیڑوں سے بہت دور کسی اور ہی دنیا میں رہتی ہوں۔“ نوشی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”ذہانت وری تو پراہم۔ لوگ آپ کو ان بکھیڑوں میں لاسکتے ہیں۔ آپ کی اس خیالی دنیا سے نکال کر۔“

”آپ نے ہمیں پیچھے کو نہیں کہا۔“ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔  
 ”مکھائش ہوتی تو ضرور کہتے۔ میرا خیال ہے آپ لاپارٹمنٹ سنبھال لیں۔ کہیں ایسا نہ ہو.....“  
 ”ہاں نہ ہوسکے کہ بے زادہ کر رہے نہ یہاں جگہ ملے اور نہ ہاں جگہ ہے۔“  
 ”مکھند لوگ اپنے مقام پر رک کر خوش نہیں کا انتظار کرتے ہیں جیسے ہزاری نوشی بیگم۔“ لڑکیاں ایک پر دوسرا داری سے جلی جا رہی تھیں۔

”کیوں مس نو شاہ! ان کا خیال صحیح ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہیں! میں نے سنا ہی نہیں۔ میں تو اس فکر میں مبتلا ہوں کہ تقریب کا آغاز کب ہو گا۔“ اس نے امتیاز نہ نہ کو دیکھا اور دوسری نظر میں قابل توجہ سمجھا ہی نہیں۔ وہ تھوڑا سا شرمندہ ہو کر لیکن لقا ہر بڑی بیٹی کے ساتھ اپنے اپنی سیٹ پر آ گیا۔ لیکن اس کے تصور میں نوشی کا حسن نہ سراپا ہر ہر گوش کرتا رہا۔ پھر تو امتیاز نہ نہ نے نوشی کے گرد منڈلا مارنا اہم ترین فرض بنا لیا۔ وہ ایم اے فائنل کا طالب علم تھا۔ نوشی کو یونیورسٹی آئے صرف چند ماہ ہوئے تھے۔

پھر دونوں کا ڈیپارٹمنٹ بھی علیحدہ علیحدہ تھا۔ لہذا وہ اس کے بارے میں کچھ نہ نہ جاننے تھی نہ اس کی سہیلیاں وہ چلنے گیا۔ تقریب شروع ہو گئی۔ رنگ رنگ پروگراموں میں گم ہو کر سب باقی باتیں بھولی گئیں لیکن تقریب کے اختتام پر ساری لڑکیاں پھر امتیاز نہ نہ کے موضوع پر دلچسپ گفتگو کرنے لگیں۔

”نوشی..... وہ پوری دنیا کا ہونہ ہو یونیورسٹی کا خوبترین نوجوان ہے۔ وہ ہمارے سامنے آکھڑا ہوا تو خدا کی قسم مجھے گمان ہونے لگا کہ کوئی یونانی دیوتا میرے سامنے آکر ہوا ہے۔“

”آ..... ظالم کی کیا غضب کی پر سنائی ہے۔ پھر لباس کا انتخاب۔ دیکھنے کا اعزاز وہ سوٹ لگا چیں تھیں با اک تیر میرے سینے میں مارا کہہ بائے بائے۔“

”پیش وہ مجھے دیکھنے اس اشتیاق سے آیا ہوتا۔ اے کاش۔ لیکن کہاں۔ اپنی ایسی صورت کہاں۔“

”نوشی تیری اور اس کی جوڑی سچ آقا۔ دما جتا ب کی جوڑی ہوگی۔ یہ تو ایسے ہی اپنی نازک سچ میں ازاری ہے۔ نوشی وہ تیری طرف بڑھے تو اسے ٹھکرانا نہیں۔“

”پائل ہوئی ہوتی سب پارا مجھے نیا پڑی ہے اس کے آگے پیچھے پھرنے کی۔“

”تم نہیں آگے پیچھے تو وہ پھرے گا۔ تم بس تجوڑا سا مسکرا دینا۔ حوصلہ دے و بنا۔ یہ نہیں کہ اسے کانٹے کو دوڑ پڑو۔“

”دیکھی جائے گی فی الحال تم سب گیسٹ کی طرف تشریف لے چلو۔ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔“ اسے گھر جانے کی جلدی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

امتیاز نہ نہ نے اسے آنکھوں میں بسا لیا دل میں جگہ دے دی۔ اس کے جگر میں دنیا سے بے گمانہ ہو گیا۔ ہر موڑ پر وہ اس سے ٹکراتا کیفے میں مل جاتا۔ لائبریری میں سامنے آ جاتا۔ یہاں تک کہ کسی کام سے اپنے ہیڈ کے آفس تک جانے کا اتفاق ہوتا تو وہ ضرور نظر آتا۔ ایک دن وہ توجہ بخشی نائن میں بیٹھی کچھ نوٹس تیار کر رہی تھی کہ وہ آ گیا۔

”نوشی.....! وہ بے حد تک اس کے قریب کہ اس کے فرش پر بیٹھ گیا۔“



"نوٹی۔۔۔ آپ کب تک مجھ سے دامن چھاتی رہیں گی۔"

اس نے نظریں اٹھائیں۔ بکھرے بال بڑھا ہوا شیوہ۔ شب بیداری کی گواہ آگئیں۔

"ارے آپ امتیاز مند۔ وہ توڑ اسادورہٹ گئی۔"

"آپ کب تک مجھ سے امتحان لیتی رہیں گی آپ کی بے نیازی کسی کی جان لے لے گی۔"

"معاف کیجیے۔ مجھے کسی کی جان لینے کا کوئی شوق نہیں۔ ویسے آپ جیسے جامد زیب انسان نے اپنی کیا حال

بنا رکھی ہے۔ نصیب دشمنان یہ سارا جوگ کس سلسلے میں۔"

"آپ کے لیے؟ آپ کی خاطر۔"

"میرے لیے میری خاطر۔ مگر کیوں؟ کس لیے۔"

"یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا۔ آپ کی بے نیازی حد سے گزر رہی ہے اور میری بے قراری آپ۔ آپ۔

میری راتوں کی تیند اور دن کا چین چین لیا ہے۔ ایک حسین ہستی کو اس قدر سنگ دل ہونا زیب نہیں دیتا۔ نوٹی

آپ کے پاس نرم و نازک اور حساس دل نہیں ہے جو میرے جذبول کی آغچ محسوس کر سکے۔ کیا وجہ ہے نوٹی آ

کیا وجہ؟ کیا کسی سے مجھ میں۔"

"کی۔ کیا کسی ہوگی آپ میں کسی تو مجھ میں ہے سمجھ کی فہم کی جو آپ کی ایک خوبرو جوان کی۔ حالت نہ

بگھنے سے قاصر ہوں۔ مسز امتیاز زہرا! میں ان ایک سو کیس بے وقوف لڑکیوں سے تھوڑی سی مختلف ہوں جو

نوٹا آپ کی راتوں کی تیند اور دن کا چین چین چھینتی رہی ہیں میرے پاس دل ہے لیکن کسی ایسے انسان کے جذبات

کی آغچ محسوس کرنے کے لیے جو اپنی ذات میں سچا ہو۔ جس کے جذبے حقیقت کے رنگوں سے مزین ہوں آ۔

میں خلوص کی کمی ہے مسز امتیاز زہرا! خلوص کی کمی۔ لڑکیاں آپ کے خیال میں کالج کے کھلونے ہیں دل کش ا

خوب صورت کھلونے کھیلنا اور پھر انہیں توڑ دینا آپ کا دل پسند مشغلہ ہے اور میں نوشاہی نازان لڑکیوں میں۔

ایک ہرگز نہیں بن سکتی۔ آپ کا حسن و جاہت آپ کی دولت آپ کی جائیداد آپ کی پیش قیمت گاڑی۔

سب کے سب میرے لیے بے وقعت ہیں۔"

"مس نوشاہی ناز!" امتیاز زہرا کھڑکھڑا کر ہوا تو نوٹی نے بھی فائل بند کر دی اور وہ بھی کھڑی ہوئی۔

"جی اور کوئی شہم؟"

"آپ میرے خلوص کو بڑی غلط نظروں سے دیکھ اور پرکھ رہی ہیں۔"

"کیا چاہتا ہے آپ کا خلوص! شاید شکاروں کی تعداد میں ایک کا اضافہ۔"

"بلکہ کریں یہ کواں۔"

"حقیقت بے حد کڑوی ہے نا۔ میرے تجربے میں بے شک نہ ہوں لیکن میرے مشاہدے میں آپ چھ

میسوں لڑکے ہیں مسز امتیاز زہرا! اور میں کن کے لیے حسین یاد اور اپنے لیے سچ تجربہ نہیں بننا چاہتی۔ آپ یہاں

سے چلے جاتیے۔ فوراً بلکہ اس وقت میں آپ کو ایک لمحے کے لیے برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے نفرت ہے آپ

کے اس خوب صورت چہرے سے یہ چہرہ نہیں ایک فہیست روح کا خوب صورت ماسک ہے۔ اور فہیست روح

قابل نفرت ہوتی ہیں۔"

وہ تنکائی ہوئی آگے بڑھی۔ امتیاز زہرا کے ہوش و حواس اس کا ساتھ دینے سے انکاری ہو گئے۔ اس کا خون کھول

ٹھا۔ ایک لڑکی نے جیسے شاید اپنے بے پناہ حسن پر بہت زیادہ ناز تھا اس کے منہ پر الفاظ کے کیسے بھر پور علمائے

تھے۔ ان کی بازگشت اب نہیں اس کے کاہنوں میں آ رہی تھی۔ اس نے سخت نفرت کے انہماک کے طور پر

بین پر تھوک دیا اور آگے بڑھ گیا۔

کھانے کی میز پر اس نے ناز سے سناڑا حال بہرہ کیا۔

"ناؤ! لڑکے اپنے آپ کو آخر کیا سمجھتے ہیں۔ میں نے بھی وہ جھانڈا، وہ جھانڈا کر دیا، ایک مدت کسی لڑکی کو کھینچنے

نے جاں میں بچانے کی کوشش ہی نہیں کر سکتے۔"

"انہیں چند اتھرا خیال غلط ہے۔ بہانہ دہی اور ہمت وہی جگہ یوں کسی کے من نہیں لگتا چاہے۔ دشمنی کی بنیاد پڑ

ہاتی ہے۔ ایسے معاملوں کو سمجھو جو تہ سے بننا پاتا ہے۔"

"کیا سمجھ رہے ہیں۔ اس سے کیا حق پہنچتا ہے شخص آزادی میں غلط ڈالنے کا نواز، وہ تو یوں ہے: میں بے بدنام ترین شخص

ہوں۔ پیٹنگروں لڑکیوں کی زندگی برباد کر چکا ہے ان کا ایک ٹیک ہے مانو۔ وہ معصوم لڑکیوں کو محبت کے حسین

دہو کے میں ہتلا کر کے ان کی عزت کا دامن ہارتا رہتا ہے۔ اسے خدا نے اپنی مہربانی سے مسکین چہرہ عطا کیا

ہے۔ وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ ناول میں نے بکلی پاراست دیکھا تو مجھے بھی ایسا لگا میں نے بھی بکلی

تھوس کیا کہ اس جیسا خوب و جوان شاید پورے زمانے میں نہیں نہ ہو۔ میرا دل بھی..... عجیب و غریب انداز میں

بھرتا ہے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میں اس کے لیے اپنے دل میں ایسے جذبوں کو جگہ دے بیٹھتی لیکن خدا کا شکر کہ مجھے اس کی

اسمیت کا قبل از وقت خبر ہو گیا۔"

"بیٹے! تم سے جان چھیننے کے لیے طریقہ نہیں ہوتا۔ تم جانتی ہو نا اس گھر میں تم تباہ رہتی ہو میں ایک بیڑھی

عزت ہوں صرف خیالی سہارا ہوں۔"

"اور یہ تو کروں کی فوج ظفر مہیوت۔"

"یہ..... یہ سہارا نہیں ہیں۔ صرف نفرتی ہیں۔ تم خود کو تھانوا سچھا کر۔ سہارا تو باپ، ہوتا ہے بھائی ہوتا ہے

شوہر ہوتا ہے بھتیجہ ہوتا ہے فیہر سہارا نہیں ہوتے اور تم کو اور ملازم ملازم ہی ہوتے ہیں۔"

"اور نانو! میرے حسن سلوک نے تمہیں بے مہول خرید لیا ہے۔ میری خاطر یہ لوگ جان بھی دے سکتے ہیں۔

اور پھر مجھے کسی سے ایسا خطرہ ہے تمہیں نہیں میں صرف خدا سے ڈرتی ہوں اور کسی سے نہیں عہد خود مضبوط ہو کر کوئی

تھوکت نہیں کر سکتا اور اس امتیاز زندگی بھول ہی گیا وہ کچھ اہل گی میں اسے۔ زیادہ گڑبڑ کی توں بیہوشی سے ہی نکلوا دوں

گی۔ بڑھنے لگا اس کے خلاف ہے نفرت کہتے ہیں اس سے۔ نانو انقلاب آ رہا ہے، ماننے کی سوجھ میں۔ ہم

مروان کی دیواریں ڈھنسنے والی ہیں۔ خمیر چاٹنے والے ہیں، ذری بوڑھوئی میں بھی ایشیئن ہو رہے ہیں نانو ایک

لڑکا ہے۔ میرے شہبے کا نہیں ہے۔ لیکن نانو! خدا کی قسم اسے دیکھ کر اسے سن کر اسے محسوس کر کے میرا دل ہڈی

پاغ ہو گیا۔ ایمانداری خوش اخلاقی اور نافرمانی غیرت اور احترام آدھار دیت کر تباہ کر دیا جائے تو جو صورت ہے کی دو

شہیر حسرتی کی ہوگی۔"

"شہیر حسرتی۔" نانو منہ پوچھا۔

"ہاں نانو! عداوت کے ایک ایسا وار کا نام ہے۔ بہت، چھ لڑتا ہے۔ مجھے امید ہے کامیاب ہو جائے گا۔

نانو! شہیر ایک بے حد مختلف نوجوان ہے اس کی تھوڑی شخصیت کو دیکھ کر مجھے مانع کی ساری بیادہ شخصیات یاد

آئیں۔ وہ اس دور میں ہوتا تو اس کی تلوار نہیں اکھوں کے دن و بلادتی۔ وہ تو کی آواز ہے۔ اس نے چند ماہ

میں ہی داہوں کو خمیر کر لیا ہے۔ لڑکیاں اس کا احترام کرتی ہیں۔ لڑکے اس کے نقش و قدم پہ چلنا سیکھتے ہیں۔ میں

اعتیاز زندگی خواہش کی کہانی ہے جبکہ اسے ستاروں کی وہ ایک چمکاؤ جوان ہے۔ یونیورسٹی میں پڑھنے والا لڑکیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ان کی عزت کی حفاظت اپنا فرض خیال کرتا ہے۔ وہ ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا۔

لیکن تم نے اس کیسے بڑے بھانپنے کے بجائے پینے سے ہی بتانا چاہیے تھا۔ بڑوں کی بات اچھی تو نہیں لگتی لیکن تم نے اس کیسے بڑے بھانپنے کے بجائے پینے سے ہی بتانا چاہیے تھا۔ بڑوں کی بات اچھی تو نہیں لگتی۔

اس نے بے پردائی دکھانے کی کوشش کی اور کھانے میں مشغول ہو گئی۔ کافین دن بے متعین سے چپ چاپ سے گزار گئے۔ وہی روز کا معمول وہی طریقہ کار۔ درمیان میں ایکشن کے سبب تھوڑی سی ہنگامہ خیزی ہوئی۔ یونیورسٹی میں گزری چلی۔ نامعلوم افراد کے نام ایف آئی آر درج ہونے۔ پیس کا آتا جانا ہمارا اور بس حالات معمول پر آتے ہی کاسٹروٹ سے ہونے لگیں۔ امتیاز زندگی پھر بھی نظر نہیں آیا۔ شاید آسمان سے کرا کر شروع ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی چھوڑ گیا تھا۔ نوشی نے سگھ کی سانسوں۔ جس کم بہاں پاک اس سے نکلنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ وہ مطمئن اور کراہی میں لگ گئی۔

وہ دن بھی معمول کا ایک دن تھا۔ حسب عادت آف ہوتے ہی وہ گیت کی طرف بڑھی۔ ارا نیورٹوڈی سمیت گیت پر موجود تھا۔ اسے آواز کچھ کرانے لے تو کئی ہی محسوس سمیت کا اردہ ہانکھولا۔ اس کے بیچے جانے پر ادب سے سر جھکتے ہوئے دروازہ بند کیا اور اپنا سیٹ چا بیٹھا۔

شیر! آج تم کچھ زیادہ ہی سعادت مند نہیں ہو رہے۔

لی بی! آپ کو ایسا لگ رہا ہوگا۔ یہ خاندان تو ہر دم بوجھ میں ہوتا ہے۔

ٹھیک کہتے ہوئے میرا وہم ہوگا۔ میں بھی سوڈی نون میں نے شاید اس ادب و آداب کے مٹا ہے پر آج ہی غور کیا ہے۔ کل پاپا کا فون آیا تھا۔ انہیں وہاں ایک اندر شو فر کی ضرورت ہے۔ کیا خیال ہے تمہیں وہاں نہ بھیج دوں۔ ایک بیہ سزگی میں سے زیادہ بیہ سزگی کو پرہیزگاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ہنس دی۔

آپ کی مرضی ہے لی بی! تنخواہ وار ملازم تو فرض ادا کرتا ہے جہاں سے بھی تنخواہ لے۔ اسی کی وفا داری کرتا ہے۔

تمہیں شیر! پیسے کے علاوہ بھی کچھ تعلق ہوتے ہیں۔ تم سے پہلے جو ذرا بیچ رہا تھا۔ پورے بیس سال ہمارے پاس رہا۔ بڑی نسبت تھی اسے ہم سے۔ مجھے وہ بھی سمجھتا تھا۔ موت ہی ہمارے ارا اس کے درمیان حائل ہو گئی۔ ویسے تم پاپا کے پاس چلے جاؤ گے تو تمہاری تنخواہ میں خاطر خواہ اضافہ ہو جائے گا۔ باؤمین جاؤ گے۔ گٹ پت کرنے لگو گے۔ وہ آپ ہی آپ ہی ہنس رہی۔

کاؤنی سبک رہتاری سے آگے بند رہی تھی۔ وہ بہر کا وقت تھا۔ انکا دکا ٹریفک پاس سے زور بھی تھی۔ حد نظر تک خاموشی ہی خانہ دہی تھی۔ نوشی اپنے معمول سے متعلق ٹیٹے سے چہرہ دکھانے پاپا کا نظارہ کرتی تھی۔ دائیں طرف کی زرخشاں ارا خیال اب رہا تھی۔ تنہا میں جہاں نہیں۔ وہ سوچتی تھی۔ اسے پاپا سے کہہ کہ اپنے ذہنوں کی ایسے مشہور ہوں میں چلا تے ہیں۔ وہ مٹی چاہیے۔

شیر! اس نے ویسے بنا راجع رکھا تھا۔

لی بی بی!

اس دن تم گھر بنانے کا کبہ رہے تھے۔ میں آج ہی پاپا سے بات کروں گی زور ہجم ہم ادا کر دیں گے۔ قسطیں تم زور دیتے رہنا۔ انگلی ایف سی سے قرض لے لینا۔ گھر بنالینا۔ پاپا اور بھی ادا کر دیں گے۔

پھر خاموشی سے ارد گرد کا نظارہ کرنے لگی۔ شیر و بیس و پور سے اس کی ایک ایک حرکت دیکھ رہا تھا۔ اس نے گاڑی کے سامنے کے خانے سے سفید رومال نکالا اور پھرتی سے اپنا منہ صوبو ہاتھ اس کے منہ پر جما دیا۔ نوشی نے ہاتھ پیر مارے۔ اس کا آہنی پنجہ ہٹانے کی کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ بے دم ہوتی چلی گئی۔ اس کی عزت معطل ہوئی اور لڑکھرائی گاڑی میں سمجھل گئی۔ نوشی دنیا جہاں سے غائلے پھیلے سینے پر بے ہنگام انداز میں بے ہوش پڑی تھی اور شیر دتتہ رہتاری سے گاڑی بھگا رہا تھا۔ سرخ دیواروں اور سیاہ گیت والی ایک عمارت تک پہنچ کر اس نے زور دار انداز میں باؤن دیا۔ اسی لمحے گیت کھلا اور گاڑی اندر داخل ہو گئی۔

اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک اجنبی خواب گاہ کے جہاز کی سائز بیڈ پر بڑی خستہ حالت میں پڑی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے میں اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ بستر نشین آلود تھا۔ اس کا لباس اس کے سر ہانے پڑا تھا۔

اودہ گا! اس نے اٹھنا چاہا لیکن سر پکرا رہا تھا۔ وہ پھر گری گئی۔

اودہ میرے خدا یہ سب کیا ہے؟ میں تو گھر جا رہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھی تھی۔ یہ بیدارم۔ یہ میں۔ میرا حال نہیں۔ نہیں۔

اس نے اپنے خوب صورت بال اپنی مٹھیوں میں جکڑ کر جھکے تکلیف کی محسوس ہوئی۔ اٹھنا چاہا پھر گری لٹے لٹے اس نے اپنا حلیہ درست کرنے کی کوشش کی۔ اپنے تھکن آلود لباس کی سلوٹس دور ترسی تھی کہ وہ ہانڈ ایک جھٹکے سے کھلا۔

سامنے امتیاز زندگی تھا۔ اسے اسی خوب صورت چہرے کے ساتھ۔ ویسا ہی تروتازہ۔

نوشی کا دماغ محسوم گیا۔ وہ کچھ سوچنے کے قابل ہی نہ رہی۔

تمہیں تمہیں۔

امتیاز زندگی نے اس کے بال بے دردی سے اپنی مٹھی میں جکڑے اور اسے بیڈ سے اتار کر صوبے پر بیٹھا۔

ادب سے بات کرو۔ گستاخ لڑکی! اب تمہارے پاس خیر کرنے کے لیے ہائی کچھ بھی نہیں رہا۔ تم اب بھی میرے رحم و کرم پر ہو۔ میں چاہوں تو میرے پالتو کتے تمہاری ہڈیاں بھنجوڑ ڈالیں۔ ان لٹھوں میں مجھے تم سے محبت نہیں ٹھرت ہے۔ میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ نفرت کرتا ہوں۔

یہ تم نے کیا کیا ظہیر! انسان۔ یہ کیا کیا؟

اوی جو تم جیسی ایک نرکی کا انجام ہو سکتا تھا۔ بوج ہو جاؤ میری نظروں سے۔ نونے سٹوٹوں کو زیادہ دیر یہ اشت کرتا میرے بس سے باہر ہے۔

امتیاز!

تم! ادا اپنی گندنی زبان پر میرا نام۔ اپنے ان لٹھوں کی کوئی قیمت لینا چاہو تو دو۔ ویسے تمہارے ادا دار ملازم نے تمہاری قیمت وصول کر لی ہے۔ ایک لاکھ میں سودا مہیچا نہیں تھا۔

نوشی کو سب سمجھ پاد آئے لگا۔ اودہ وہ شیر! وہ کہیں انسان تمہارے ہاتھوں تک گیا۔ کہاں ہے اودہ؟ کہاں ہے مجھے بتاؤ۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ اپنے ہاتھوں سے جہنم رسید کروں گی۔

باتھ بارہا کانپے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

مخمر پہنچی تو شام کے سائے رات کے اندھیرے میں بدل رہے تھے۔ مانتوشیح ہاتھ میں لیے لان میں گھوم رہی تھیں۔ وہ گاڑی سے اتری تو لپک کر اس کی طرف آئیں۔

”ارے بیٹی! کہاں رہ گئی تھیں اور وہ شیرودہ کہاں ہے خیر تو ہے؟ اتنی دیر کہاں رہیں مجھے بریٹان کر کے رکھ دیا۔ تمہارا چہرہ تو مجھے تو بتایا ہوتا۔ ہر جگہ فون کیا ہے میں نے تم نہیں بھیجے تھے۔ کم از کم شیر کو بھیج دیا ہوتا۔“

”سرگین شیر! موت آگئی اسے۔“  
”ارے موت..... اس باتیں تو نہ کرو۔“

”ہاں مانو۔ وہ بھی مریا میں بھی مر گئی۔ آپ کی نوشی مر گئی تھی۔ ہمیشہ کے لیے۔“  
”نوشی! میری بیٹی! کیا ہوا؟ چلو اندر چلو۔“ وہ نالو کے پورے ہاتھوں کے سہارے اندر چلی۔

”کیا ہوا کیوں بریٹان ہو تمہارا چہرہ تمہارے بال یہ لہاں۔“  
”کاش یہ لہاں بھی میرے تن پر نہ ہوتا تو آج تو میں بے لباس بھی چلی آتی تو مجھے کوئی دکھ نہ ہوتا۔“

نالو کے ہاتھ کاٹب گئے۔ دل لرز گیا۔  
”خیر تو بے لاشہ! مجھے بتا۔ پورے تانو کو ابھن میں مت ڈال۔“

”تم نے سچ کہا تھا مانو! زندگی گزارنے کا یہ انداز نہیں ہوتا۔ لڑکی تو بڑی کمزوری شے کا نام ہے۔ وہ جتنی بھی بہادر اور عزت و محبت اس کے خلاف استعمال ہونے والا کارآمد ہتھیار ہے تانو اس درد سے نے بھی لوٹ لیا۔ آپ کی نوشی کو۔ جسے اپنے کردار کی پختگی اور بہادری پر بنا دیا تھا۔ جس نے کئی بے خلوص دل اس غرور میں توڑ دیے تھے کہ وہ سہارا بن کے بغیر زندہ رہنا چاہتی ہے۔ تانو اس ذلیل انسان نے مجھے کہیں کا نہ دکھا میں بے باک تھی۔ اب میرے پاس باقی کیا رہا ہے جس پر میں ناز کر سکوں۔ کچھ نہیں کچھ بھی نہیں۔“

وہ چپکے ہاتھوں سے گئی۔ بدبو پھیل گئی۔  
”تانو! یہ انتہی نے مجھے بھی نہیں چھوڑا۔ مجھ سے اچھی آپ تھیں۔ میری ماں تھیں۔ عزت کی زندگی آپ دونوں کا نصیب تھی۔ میں..... میں نہیں نہیں میں مر جاؤں گی۔ مجھے زندہ رہنے کا حق نہیں۔ میں اس دنیا کی بد قسمت ترین لڑکی ہوں۔ میں اب جی کر کیا کہوں گی۔ بے جان لاشے کو شاہراہ حیات پر تھپتھپ کر مجھے کیا ملے گا۔ تانو مجھے نہ ہر دے دیتے کتنی خیر میرے سینے میں اتار دیتے۔ میں لوٹ گئی ہوں! کھردھی ہوں ریزہ ریزہ ہو رہی ہوں۔ مجھے موت دے! بیٹیجیجیجی کاشی کا نقاب موت سے ڈیڑھ اذیت ڈک ہے۔“

”بیٹی! تانو! تھی اس کے ساتھ رونے نکلیں روتے روتے وہ تانو کی آغوش میں سر رکھتے ہی بے ہوش ہو گئی۔“

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اسے زندگی کی ضرب لوت کر آنے میں بڑی دیر لگی۔ ذہن وہ ہسٹری پر راز رہی۔ اس کے جسم سے زیادہ اس کی دماغی زندگی۔ ریح کا شائق دنیا کے حکیموں اور ڈاکٹروں کے پاس نہ تھا۔ خود کو سمجھاتے خود کو بلاست کرتے۔ کبھی اُدبے کبھی اچھرتے۔ کبھی موت کی طرف لپکتے کبھی زندگی کی طرف آتے کئی روز گزار گئے۔ کئی بدول ہو گئی تھی وہ سانسے کھلے در پہ سے باہر جھانکتی۔ تو سوچتی یہ دنیا کتنی بے وجہ ہے! مستعد ہے کیوں بنا ہے یہ سب کچھ۔ بے کار ہیں یہ زمین و آسمان اور ان میں موجود ہر شے! ناکارہ ہے خود اس کا وجود۔ کھلیوں کو خیر ہی نہ تھی کہ وہ اتنے

”اس بے چارے کا کیا قصور۔ جیسے ہی اتنی پکشتہ چیز۔ اسے ضرورت تھی اس کی اور مجھے ضرورت تمہاری تمہارے غرور کے آسپے کو چکنا چک۔ کر سٹے کے لیے تمہیں ریزہ ریزہ کرنے کے لیے کہ پھر کبھی تم اپنی خوبصورت گردن تان کر نہ چل سکو۔“

اس نے اپنی اتنی اس کی گردن پر بیست کر دی۔  
”مت ہاتھ لگاؤ مجھے! کیسے ذلیل؟“

”مجھے بھی کوئی شبہ نہیں۔ استعمال شدہ چیزیں میری توجہ کا مرکز نہیں رہتیں۔ ناگہایت آذیت فرام بھیج۔ یہ راز تمہاری گاڑی کی چابی۔ اس نے کی رگت اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔“

”گاڑی کی چابی۔ کہاں ہے بہری گاڑی؟“  
”لاکھ پیر کیم سے۔ تمہاری گاڑی اسے دے سکتا تھا۔ تم اپنی گاڑی میں یہاں تک آئی تھیں۔ اپنی ہی گاڑی میں جاؤ گی۔ بی بی بی بی بی بی بی بی۔ یہ سب کچھ نقدیر میں تھا۔ اس بجزی تقدیر کے بگاڑ میں میرا نہیں تمہارا ہاتھ ہے۔ اور آج تمہیں تو کئی تمہارے دل کی ملک تھیں۔ میرے گھر کی۔“

”آئی ہیست یو۔ اختیار نہ آئی ہیست یو۔ ایسے رکھا انسان کی بیوی بن جانے سے بہتر تھا کہ مجھے موت آ جاتی۔ یہ سب کچھ جو ہوا ہے۔ اس پر مجھے کوئی اندازہ نہیں کہ میں کس میں ایک فی صد بھی اتنا نہیں۔ یہ جرم صرف اور صرف تمہارا ہے۔ اس کی سزا بھی صرف اور صرف تمہیں ملے گی۔“

”یہ نہیں مرنا اور ہزار۔ سب ڈھکھولے ہیں ان لوگوں کے جنہیں اس دنیا میں کچھ نہیں مل پاتا۔ وہ سزا اور جزا کے فریب میں گم ہو کر اپنے محروم دل کو تسلیاں دیتے ہیں! جھوٹی تسلیاں۔“

”گفرت بگو۔ ذلیل انسان! خدا کے قانون کو مت چھوڑو۔ وہ سزا سننے کی کہ سارا راز مانتہ عبرت حاصل کرے گا۔ مثال بن جاؤ گے۔“ آنسو ضبط کے سارے ہند تو ذکر آنکھوں میں آ گئے۔

”تم نے رہت برا کیا ہے بہت برا۔ تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ تم زیادہ دن عزتوں، عسقلوں اور حساسات سے نہیں کھیل سکو گے۔“

”ہا..... ہا..... کیا پدق کیا پدن کا شور ہا۔ یہ وعظ و نصحت اور عبرت کے ڈراوے کسی پر کو دینا۔ میں ان جھکیوں میں آئے گا نہیں اور اب یہاں سے چاچھو۔ چاہو تو اپنا حلیہ درست کر لو۔ ورنہ ایزد لاکھ۔“

غصے نے اس میں پھر سے طاقت بھر دی۔ وہ اتنا کھڑی ہوئی۔  
”راستوں سے انجان ہو۔ ذرا پھر میری مہمان بھی ہو۔ چلو! خلاق کے قاتلے بھاتے ہوئے تمہیں گاڑی تک چھوڑ دوں۔“

نوشی کا تن بدن بے بسی ابراشقام کی ملی جلی کیفیات میں جلتے لگے۔ بارہا اس کا جی چاہا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی ماس کی گردن میں بیوست کر دے اور اس وقت تک نہ چھوڑے جب تک اس کی سانس کا رشتہ اس کے جسم سے منقطع نہ ہو جائے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ اس نے اپنے آنسو اپنے سینے میں بند کر دیے اور اختیار نہ دے کے پیچھے چلتی پوری تک آگئی۔ دروازہ کھولا۔ اور اراٹیک سیٹ منجیل لی۔ اتنی دروازہ بند کیا تھا کہ اختیار نہ دے اس پر اپنا ہاتھ رکھ لیا۔ اس طرف تدرے جھکتے ہوئے اس نے پھر پور سکر اہٹ سمیت اسے دیکھا۔

”ہاں بیست آف! اور لگ۔ غرور پر پائے تو اس خاکسار کو بھولے گا نہیں۔“

”اونہ! اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں نکلیں۔ شے لپکے اور گاڑی اسارت کرتے ہوئے اس کے

دل سے کیوں غیر حاضر ہے۔ کافی دن انتظار کرنے کے بعد دوڑی چلی آئی۔ اپنی دلچسپ باتوں سے ہلکی مذاق سے اسے زندگی کی طرف لانے میں کوشاں ہو گئیں۔

خانہ نے انہیں کچھ بھی نہ بتایا۔ بس یہ کہا کہ وہ باپ کی روٹی اور ماں کی جدائی پر افسردہ ہو جاتی ہے۔ ہسٹرنجیال لکٹی ہے۔ انہیں چاہیے کہ وہ اسے حسیٹ گھسانٹ کر ہسٹر سے اتاریں اور یونیورسٹی لے جائیں۔ وقت نے جس کا سسٹم بڑا خود کار قسم کا ہے اس کے ذمہوں پر مہم رکھ دیا۔ اس نے خود کو خود بھی سنبھالنے کی کوشش کی اور انتقام کی جو لاکھوں کی اپنے دل میں بسا کر پھر سے لیون پر مسکراہٹ سجائی۔ کتنے دنوں بعد اس نے بارگاہ ایزدی میں سر جھٹکایا۔ اور دل کھول کر آسو بھائے۔

”اے رب ایزد! انسانوں کو پیدا کرنا ان کی تقدیریں لکھنا تیرا ہی کام ہے۔ الٹی! تو میرے اعمال کا سب سے بڑا گواہ ہے۔ مجھے باہر سے ہی نہیں اندر تک جاننے کی قدرت رکھتا ہے جانتا ہے مجھے میرے ضمیر کو اس یو جھ سے آزاد کر دے۔ میری روح سسکتی رہتی ہے اپنے ناکردہ قدم سے۔ تو تیتوں کے احسان جانتا ہے میرے رب۔ میں زندگی کو تیرے بتائے راستے پر چل کر گزارنا چاہتا تھی۔ یہ ذلت میرا مقدر بن گئی۔ اب لم بزل میرے ہاتھوں کی ذاتی طاقت دے کہ میں اس جانور نما انسان کو اس کے انجام تک پہنچا سکوں۔“

اس نے گڑ گڑا کر دعا مانگی اور ہلکی ہلکی ہر گئی۔ جب اس کی ساری دنیا سے مایوس ہو جانے۔ تو خدا کی یکتا ذات کتنے قوی سہارے کے روپ میں سامنے آ جاتی ہے۔ سبکی قوت ہوتی ہے جو انسان کو مرنے نہیں دیتی زندگی رکھتی ہے۔ نوشی نے بھی رب کی ذات کے سہارے پھر سے دنیا کے جھیلوں اور مسمرہ فیتوں میں خود کو گم کرنے کی کوشش کی۔

اب وہ ایک نئی ڈش تھی۔ اشتیاقی جذباتوں سے مجبور اس کے چہرے پر تھی مصنوعی مسکراہٹ۔ ایک دن مامون واسطی کی ٹیٹو کو خیر کر گئی۔ نہیں مزیک کے سچ اس کی گاڑی کا ٹائر پھڑ پھڑا گیا۔ اسپرے ہیل اس نے سچ ہی مرمت کے لیے دیا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں خاصی پریشان تھی۔ جب مامون واسطی اپنے دوست کے ساتھ وہاں سے گزرا اور گاڑی اس کے پاس لاکر روک دی۔

”ابنی پاپلم۔“

”صاف نما ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”اوہ میرا خیال ہے کوئی ٹیگور وغیرہ کا پتھر ہے۔ تو پھر کیا خیال ہے۔“

”خیال ٹیک ہی ہے۔ ٹی چھڑی لٹت جا ہے۔ یعنی ہر کشاپ تک جانا۔ اسپرے ہیل اٹھانا۔ واہیل آ اور۔“

”بس انہی پچھو پچھم ماروٹن دل ماشاؤ۔ تشریف لایے۔“ مامون نے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔

”آپ کی تعریف؟“ وہ مسکرائی۔

”مامون! واشی آف سکندر پور۔ اور آپ؟“

”میں نوشی ہوں۔“

”صرف نوشی؟“

”بھانے اس کے کہ ایک وہ مذاقاتوں کے بعد آپ مجھے اس نام سے پکاریں۔ پہلے ہی دن سے کیوں نہ؟“

وہ ہنس دیا اس کا دوست بھی۔

”بڑی دلچسپ چیز ہیں آپ تو۔“

”دلچسپ ہو نا کوئی ہرائی تو نہیں؟“

”نہیں نہیں اس نے کہا۔ میں خود بھی۔ پھر تو خوب گزرے گی۔ دود یواتوں کھل بیٹھنے پر۔“

”آف کورس۔ آپ کہاں ہوتے ہیں؟“

”طالب علم ہوں۔“

”ختر مساکانی مشہور ہستی ہیں۔ تازہ تازہ زخم خورہ وہ بھی ہیں۔ ابھی چند دن پہلے شہیر مسکری کے ہاتھوں شکست لرائی سے مصروف تے۔“ اس کا دوست بولا۔

”شہیر مسکری۔ ارے آپ تو یونیورسٹی کے۔ میرا مطلب ہے میرے یونیورسٹی فیلو ہیں۔“

.....

”یہ بھی ایک حسین اتفاق ہے کہ دو یونیورسٹی فیلو: وہ اجنبیوں کی طرح ملے ہیں۔ کمال ہے آپ نے پچھلے دنوں میں ایک بار بھی مامون واسطی کا نام نہیں سنا۔ سے نہیں دیکھا۔“ اس کا دوست نوم چچو زیادہ لگ رہا تھا۔

”دراصل میں تمھوڑی طوین شخصیت پر تھی۔ ایکشن کے ہنگامے میری عدم موجودگی میں ہو پا۔ دوسرے اور تمام ہو گئے۔ نہ سنا نہ دیکھا۔“

”تب کوئی بات نہیں۔ اب آپ کا قصور نہیں۔“ مامون نے نیکہ دہچہ میر سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی پیشکش کی۔

”شکر یہ۔“ نوشی مسکرائی۔

”میں بات کا؟“

”مجھے بے قصور مان لینے کا۔“

”اس نوشی ایک بات پوچھوں۔ برامت مانے گا۔“

”جی ضرور پوچھیں۔“

”آپ اس قدر رتھائیوں ہیں۔ یعنی کہ..... میرا مطلب ہے وہ ران سنز بھی اکیلی۔“

”جو ممکن ہو تو آؤنی اپنے آپ پر نھر رہا کرتا بھی پھوڑو نے میں تنہا ہوں اس لیے کہ لوگوں پر سے میرا اعتبار و اتہوا خیر کیا ہے۔“

”چہ۔ چہ۔ چہ ایسا کیونکر ہوا..... زندگی تو اعتبار و اعتماد کے سہارے ہی گزرتی ہے۔“

”ہوتا ہوگا ایسا۔ مگر میرے ساتھ ایسا نہیں ہے۔“

”آپ نوزنگل میں کوئی ایسا انسان نہیں ملا ہوگا۔“

”کون ایسا ہے کون بنا؟ اس کا مناسب کون کرے؟ دیکھنے میں سب اچھے ہیں۔ آزمانے میں سب برے۔“ نوشی کے لہجے میں ساری نثریں سمٹ آتیں۔

”آپ تو بہت زیادہ خوفناک ہیں اور زیادہ داروں سے۔“ وہ خانہ نوشی رہی۔

”یہ بھی شاید ایک انداز ہوتا ہے۔“ اس کے دوست نے تقریباً اسی انداز میں پھوڑو تے ہوئے گردن موز کو نوشی کو دیکھا۔

”May be“ وہ بھی سمجھ گئی۔

مامون نے اس کی غلط مددنی۔ گاڑی کا ڈیسل تک فوڈ بن کے رہا اور وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ پھر تو وہ





لئے پڑھایا لکھایا ہے کہ جدید دور کے تقاضوں کے مطابق لوگوں کو مین ٹین کر سکیں۔ بے وقوف بنا کر ان سے دولت ہڈر سکیں۔ جناب دیجیے کیا آپ میرا ساتھ دینا پسند کریں گے؟ مجھے قبول کریں گے؟ جبکہ آپ کو یہ علم بھی ہو کہ میں آپ کی ذات سے تعلق نہیں ہوں۔“

”آپ کی عاف گوئی آپ کا اظہار ہے کس نوشی! آپ کی باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ آپ ایک بے حد اچھی نرکی ہیں۔“

”بالکل نہیں..... برائی سے برائی جنم لیتی ہے اچھائی نہیں۔ آپ اچھے ہیں یا برے مجھے اس سے کوئی فرق نہیں۔ بس آپ میری راہ کو دیکھنا نہیں تو بہتر ہے۔ میرے کچھ مسائل ہیں۔ جو میری جان کا روگ ہیں۔ مجھے ان سے پیٹ لینے دیں۔ پلیز مسٹر مامون۔“

”نوشی! میں نے آپ سے کہا تو بے مسئلہ جو بھی ہے شیئر کروں گا میں! آپ مجھے بتائیں تو سہی۔ مجھے خبر تو کریں۔“

”میرا مسئلہ شیئر کرنے والا نہیں ہے! صرف میری ذات کا بوجھ ہے اسے خود ہی اٹھانا ہے مجھے۔ آپ پلیز اتنا متکدر رہنا چھوڑ دیں۔“

دو وہاں سے چل دی۔ مامون واسطی کو اس کے خطبے ہونے کا جو گمان تھا۔ تھوڑا تھوڑا یقین میں بدل گیا۔

☆☆☆☆☆☆

کسی بہت بڑے اجتماع سے خطاب کرنے کا یہ پہلا موقع تو نہیں تھا پھر بھی شہر کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ یہ ٹھہرا ہٹ شاید اس ذمہ داری کے سبب تھی جس کا یو جی ایس کے کندھوں پر تھا۔ بڑے اعتماد کے ساتھ وہ بیچ و عمریش پنڈال کے ڈانس پر کھڑا اپنی تقریر کے لیے ابتدائی الفاظ سوچ رہا تھا۔ دائیں طرف یونیورسٹی کے تمام اساتذہ ہیڈ آف ڈپارٹمنٹس اور وی سی صاحب موجود تھے۔ سامنے طلباء و طالبات تھے ان میں سے ایک نو بہر شکر کی بھی تھی جس کا چہرہ انظار کے ساتھ تیار ہوا تھا۔ ایک نوشی بھی تھی جسے اس دنیا کے سارے نوجوانوں سے نفرت ہو گئی تھی اور ہر انسان اسے جھائی کے لہارے میں بیٹھی خبیث روح لگتا تھا۔ اتنی جگہ وہ سارے طلباء بھی موجود تھے جو موت و حیات کی خطرات کا شکار ہو کر بمشکل زندگی کی طرف لوٹ سکے تھے۔ یہیں پر مامون واسطی بھی تھا جسے شہر کی پراختیاد شکر اسٹ اور پرسکون چہرے سے از حد نفرت تھی۔

”قابل احترام وی سی صاحب! معزز اساتذہ کرام اور عزیز بہن بھائیو۔

السلام علیکم! آپ سب صاحبان کو اس مینگل میں شرکت کی دعوت دے کر تھوڑی سی تکلیف اس لیے وی کی کہ ہم سب ایک دوسرے سے دل کی باتیں دل کھول کر کر سکیں۔ آپ کے تعاون نے مجھے یونیورسٹی کے احاطے میں ایک نمایاں مقام بخشا جس کے لیے میں آپ سب کا مشکور ہوں۔ یہ مقام میرے لیے باعثِ فخر صرف اس وقت ہوگا جب میں اکثریت کی مسئلوں پر پورا اتریں گا۔ ان کے لیے اپنی حقیقی کوششوں کے سبب کچھ کر سکوں گا۔ اپنے پیش کردہ منشور کے مطابق مجھے یہ کبر کر خوشی ہوئی کہ میں صرف ان کے لیے ہی نہیں ہوں جنہوں نے اپنے ہوت سے نوازا کر مجھے کامیاب کرایا بلکہ ان کے لیے بھی ہوں جنہوں نے مجھ پر میرے متقابل ساتھ کی بونہی و بی۔ رائے کے اعتبار کی آزادی کا احترام نہیں مجبور کرتا ہے کہ ہم مخالفت یعنی اختلاف رائے کو برداشت کریں۔ میرے ساتھ بہن بھائیوں کے وہ مسائل جو میری اہمیت کے تعاون سے حل ہو سکتے ہوں میں سدا انہیں اپنے مسائل سمجھوں گا۔ میرے تعاون کے ثبوت کے طور پر میرے شب و روز کا برائی ان کی خاطر وقف ہوگا کہ یونیورسٹی میں

اکثر اس کی مراد میں آجاتا۔ چائے یا کافی کی آفر کرتا۔ یہ بندرشی ٹائم کے بعد ڈانگ ڈرائیو پر چلنے کی درخواست کرتا۔ نوشی کا فریاد ادا کرنا سمیت خوبصورتی سے اٹھا کر رہتی۔ اس کے دل میں کسی نوجوان کے لیے جگہ پیدا ہونا ناممکنات میں سے ہو گیا تھا اور وہ مامون کی بے وقوفیوں اور نادانیوں کا صرف مزہ لے رہی تھی۔ شاید وہ ریسرچ کر رہی تھی کہ بڑے حصوم نرکیوں کو کس طرح اپنے دام فریب میں الجھاتے ہیں۔ جبکہ مامون کا یقین تھا کہ ہمیشہ کی طرح اب بھی وہ ایک طرحدار خوبصورت لڑکی کو اپنے جالی میں پھنسا رہا ہے۔ چند دن خوبصورت بنانے کے لیے۔

نوشی درحقیقت بہت پراسرار سی ہو گئی تھی۔ دوسروں پر تو کیا وہ اپنی ذات پر بھی نہیں کھل پارہی تھی کہ وہ کیا کر رہی ہے کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ مجسم انتظام تھی اس کے ذہن پر امتیاز زندہ خوبصورت اور ہر نوجوان عموماً نفرت کا نشان بن کر چھایا ہوا تھا۔ اس کے دل میں رہ رہ کر ٹھونانہ بھٹتے تھے وہ بار بار پوچھتی تھی کہ کیا ہے اس کی عزت و محبت کی یوں بے دردی سے پامالی اس کے دل کا وہ زخم تھی جو مینے گزر جانے پر بھی دوا دوا کی طرح تازہ تھا اور جس میں سے اس کی آرزوؤں کا لہو اتار کے ساتھ بہ رہا تھا۔

وہ بہت وقت کوئی نہ کوئی مشروب پلاتی رہتی۔ کوئی نہ کوئی پلان تریب دیتے رہتی۔ امتیاز زندہ کوئی نہ کر دینے کا۔

اسے مار ڈالنے کا۔

اس کا مینہ چھلنی کر کے۔ اس کے پیچھے بڑے اڑانے کا۔

اسے کچا چھانے کا۔

ایک دن وہ ایسی ہی سوچوں میں گم نا بھری کی بیٹھیوں کے پاس کھڑی تھی۔ مامون وہیں آ گیا۔

”پلیز مس نوشی!“

نوشی کو یہ دخل اور معذرت سخت تا کو زگر کر رہی۔

”ارے بھئی۔ تمہاری تو واقعی آپ کا کرنا ہے۔ دیکھا ہے آپ نے موسم سرد نہ رہیں ہوا ہے۔ آئیے کہیں چلتے ہیں۔ ایک دو تھنڈے آپ کی خوب صورت رفاقت میں گزار جائیں۔ اس سے بڑی نعمت اور کوئی نہیں۔“

”مسٹر مامون واسطی۔ میں از حد پریشان ہوں۔“

”کمال ہے ہمارے ہوتے ہوئے نہیں۔“

”آپ کا ہونا یاد ہونا دلوں میرے لیے بے معنی ہیں۔“ دو اپنی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔

”کیا مطلب؟“

”وہی جو آپ نے سنا ہے اب میں آپ سے عرض کر رہی ہوں کہ میں دو نہیں ہوں جو آپ نے سمجھ رکھا ہے۔ میں اس شرافت کے لہارے میں سر اپا ایک خطا ہوں۔ میرا تعلق اس جگہ سے ہے جہاں آپ جیسے شرفاء عزت کھو جانے کے ڈر سے احتراز کرتے ہیں۔“ اس نے مامون کو زگر کرنے کی سعی کی۔

”یعنی..... کیا..... کیا؟“

”جی ہاں! عرف عام میں آپ مجھے طوائف بنا رہی تھی کہہ سکتے ہیں۔“ نوشی نے سچ لہجے میں کہا۔ تھوڑے سے سچ میں بہت سارا جھوٹ ملا دیا۔

”میرا تعلق بالا خانے سے ہے۔ بونے کیے کیا آپ میرا ساتھ دینا پسند کریں گے۔ میری ماں نے مجھے اس

یا ہو سکتی ہیں وہ جب چاہیں مجھے طلب کر سکتے ہیں۔ طلباء و طالبات کے معاشرتی اور اخلاقی مسائل جہاں تک ممکن ہوئے جہاں تک میری دسترس میں ہوئے حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ انشاء اللہ ہمارا یہ تعلیمی ادارہ اخیرت اور بھائی چارے کی ایک عمدہ مثال بن کر دنیا کے سامنے آ جائے گا۔ میں یہ اعلان کرتے ہوئے انتہائی خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے از میرے ساتھیوں نے جو فائزنگ کیس کے متاثرین ہیں ان لوگوں کو تہ دن سے معاف کر دیا ہے جن کے ہاتھ انسانی زندگیوں سے کھینچنے کے لیے اٹھے۔ یہ ایثار صرف اور صرف جامعہ کی قضا میں سکون اور خوشی بکھیرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ ہم میسر آنے والے نجات دہندگان اور حقیقت اپنے بہن بھائیوں کی فلاح و بہبود کی خاطر صرف کرنا چاہتے ہیں۔ ایشیاں بھانے میں برگزینیں۔ میری استدعا یہی ہے۔ صی صاحب نے یونیورسٹی کی حد کے لیے تو زمین میں تھوڑی سی اور ترقی کر دی ہے۔ جو پرنسپل صاحب کی بھلائی کا پیغام ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کے بھائی بہن ہیں۔ ہم سب کا نصب العین نظم کی تلقین اور تلاش ہے۔ ہمارا نارتھ عمدہ کتا ہیں ہیں۔ اسلحہ نہیں۔ اسلحہ کی ضرورت نہیں کا سامنا کرتے وقت ہوتی ہے۔ بھائیوں کے سامنے نہیں۔ ہم ہاتھوں میں اسلحہ اٹھا کر نہیں چلیں گے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے کے۔ تو ہون ترقی کی راہ ہے۔ ہم مل کر اس راہ پر چلیں گے اور ترقی کی منزل تک جاتی چلیں گے۔ یہ بہت کچھ کہنا رہا اپنا ماں الشیر بیان کرتا رہا۔

پھر وہ کچھ دیر کدکا۔ تھوڑا سا سٹریا۔

”آج میں بہت خوش ہوں۔ اس بڑی خوشی میں کئی چھوٹے چھوٹے عموال کام کر رہے ہیں۔ جن میں سے ایک میرے پاپا کے مزاج کی تہہ لٹی بھی ہے۔ یہ اپنی اپنی طرح کا شہوت ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میرے پاپا سیاست کے کھیڑاں سے نفرت کرتے ہیں اور طلباء جنسیوں کو سیاسی پارٹیوں کا پرہ گری حصہ سمجھتے ہیں۔ میرے انکیشن میں حصہ لینے پر وہ مجھ سے ناالاں تھے۔ بہت زیادہ خفا تھے جبکہ میرے پاپا نے مجھ کو فریب دیا ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کی لدا دن میں میرے پاپا مجھ سے ملنے آئے۔ فائزنگ کتے نے انہیں بالکل بدال کر دیا تھا۔ وہ مجھے مردوش کرتے آتے بلکہ یہ حکم اپنے آئے تھے کہ میں اس مارے پندرے سے نکل آؤں۔ میں نے اور میرے چاہیے سنہ انہیں قائل کر لیا۔ یہاں تک کہ جانتے جانتے وہ پچاس ہزار روپے جو زمین فنڈ کے لیے دے گئے۔ جو میں نے پندرے میں پانچ کا ڈنٹ کھلا کر جمع کر لیا ہے۔ میری ان بہن بھائیوں سے جو مالی لحاظ سے اسراں کے کام آنے کے قابل ہیں درخواست ہے کہ وہ سب تو شوق اس کا ڈنٹ کی رقم میں شاق کریں اور ان بہن بھائیوں سے جو واقعی مدد کے محتاج ہیں اللہ سے کہہ سکتے ہیں ہم سب کو اپنا آجھ کر اپنے مسائل ہم سے نہ ہمسائیں۔ منہ ہل علم کی راہ میں وہی ایسی رنڈاوت جو کسی نہ کسی طور ہم پر ہرگز نہ سکتے ہیں اور کہہ کے خوشی محسوس کریں گے۔ شہزادہ و معاشی ہر یا معاشرتی جھونک آنے کے لیے کسی لیے چوڑے پاسکن کی ضرورت نہیں آپ مجھے راہ چتے دے روک کر پھوٹی حق داری کے ساتھ مجھ سے طلب کر سکتے ہیں اور... اور... میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہم سب بہت سے سرائی ایسے بھی ہوں گے جو کئی کے آگے ہاتھ پھیلائے اپنی غیرت کی موت سمجھتے ہیں۔ ان سے اچھے نہ کہ ایشیا کو بلکہ اپنے سب ساتھیوں کو اپنے بھائی سمجھیں۔ اور بھائی سے بھائی کا پتہ لینا ہرگز قابل ملامت نہیں ہوتا۔ پھر شہزادہ کا یہ بھی وعدہ ہے کہ فرمان: سول کے مطابق دینے کی خبر اس ہاتھ سے اس ہاتھ تک بھی نہ پہنچائے۔“

انسانی آواز کا لین کی گونج میں ڈوب گئی۔

”کیا آج کے دن آپ سب مجھ سے یا اپنے اساتذہ کرام سے بھی نہیں صرف اپنے آپ سے عہد نہیں کر سکتے؟ ہر گھنٹہ برائی سے بچنے اور اچھائی کو اپنانے کا۔ خدا کی قسم اگر آپ سب یہ عہد صرف اپنے آپ سے خدا کو لواد کر کے کر لیں اور پھر اس عہد پر حق سے کار بند رہیں تو دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اس سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہ عہد آپ کا اپنا بھلا بھی ہے اور دوسروں کا بھی۔ یہ عہد فلاح کی راہ ہے۔ حق انسانیت کی ادائیگی ہے۔ فرض اولین سے انسان ہونے کے حوالے سے۔“

اس نے تقریر ختم کی چندال ایک بار پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔ پھر اساتذہ کرام اور وہی بن صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وہی ہی صاحب نے اپنی جیب سے ایک معقول رقم شہیر کو بونین فنڈ کے لیے دینے کا اعلان کیا۔ اساتذہ نے ہر ماہ اپنی ایک دن کی تنخواہ بونین کے نام کی اور یہی یہ تقریب اختتام کی ہو گئی۔

گوہر بھی خراج تحسین پیش کرنے والوں سے ایک تھی۔ شہیر کی جسورت روشی کا بلند مینار اس کے سامنے تھا بلکہ اس کا اپنا تھا۔ جہان کے سارے کھیڑوں سے الگ محبت کی ایک نئی مٹی دنیا کا شہزادہ بھی تھا۔ اور محبت کی وہ نئی مٹی دنیا شہیر کے کردار کی روشنی سے کئی روشن ہو گئی تھی اس کی خبر صرف گوہر کو تھی۔ اس نے کھیلے دنوں میں نازوں کے تال ”قیصر و کسری“ کے ہیر و عاصم کو پڑھ کر اس کو راز کو دل میں ہی بسا لیا تھا۔ اسے خبر نہ تھی کہ اس کا بونے و نلا شریک حیات شہیر دنیا کے اس پراگندہ احوال میں سب سے الگ تھلک خلوص و محبت کا پیا میرا اور امن و امانی کا متحرک مثال ہے۔

دوسری طرف لوٹا بیٹھی تھی۔ کئی بولے اس کے ذہن میں تازہ رہے تھے۔ ایسوں کے ہولے ایک ابن آدم کی وجدتی کی تصویر بھی وہی میں اچھرائی تھی۔ لیکن وہ پھر بھی ٹنگ کا شکار تھی دل میں تڑپ بھی نہیں مان رہا تھا۔ کیا پڑ کر شہیر عسکری جواتے بڑے بڑے دعوے کر رہا ہے۔ کیا یہ اپنے قول کو اپنے فعل سے جتنی ہاتھ کرتے گا۔

”بھئی! دنیا جیسے انسانوں سے اتنی بھی خالی نہیں۔ تم اپنے آپ کو سوچو۔ تم کیا بنو۔ کیا تم کوئی ایسا کام کر سکتی ہو جو انسانیت کے نام پر داغ ہو۔ یقیناً شہیر بھی ان ہی نیک روجوں میں سے ایک ہے۔ جو اچھائی سے برائی کا ناقہ کرنے کی قدرت تو نہیں رکھتے لیکن خواہش ضرور رکھتے ہیں اور خواہش کے احترام میں اچھائی پر عمل پیرا ہوتے چلے جاتے ہیں۔“

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

دوسرا سارا دن شہیر اور اعجاز احمد جو کہ خزانچی تھا۔ وہ تو م اور چیک وصول کرتے رہے جو کہ لڑکے لڑکیاں اس کی درخواست پر لائے تھے۔ حیرت کی بات تو یہ بھی کہ کسی نے بھی بطور سند کسی رسید کا مطالبہ نہیں کیا۔ بلکہ رسید دینے کی کوشش کی گئی اور اسوں کا اظہار کیا۔ کئی ایک نے کہا۔

”رسید کسٹی ایڈیشن تھا جو ہم نے ادا کیا۔ اب اس امانت کا بوجھ آپ پر ہے چاہیں تو خیانت کریں چاہیں تو حق دالوں تک پہنچا دیں۔ ہر چیز آپ کے نامہ اعمال میں لکھی جائے گی۔“

اعجاز سخت خیر آیا ہوا تھا۔

”شہیر! ان لوگوں نے نہیں بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے۔“

”کوئی بڑا امتحان نہیں۔ میرا اپنا تھا۔ صرف یہی فرض ہے کہ اسے اکاؤنٹ میں جمع کرادیں حتیٰ کہ گنتی کا کام بھی بینک والوں کو سونپ دیں۔ پھر یہ رقم تہذیب کی رہے گی نہ مگر ان لوگوں کو ہونے سستی میں بھائیوں کے لیے۔“

اعجاز نے حیران ہو کر شہیر کو دیکھا۔ ”دند رفل۔“ دند رفل شہیر عسکری میں جیسے الجھن سمجھ رہا تھا کس رساں سے

ملحھا دیا اسے تم نے۔ میں تو تھیرا رہا تھا کہ اسے گنوں گا کیسے..... منجالیوں کا کیسے؟

”مگر مند ضرور ہو مگر صرف اس بات پر کہ ایک پائی بھی ادھر ادھر نہ ہو جائے۔ بیٹے خزاہی صاحب! معاملہ ہم سب سے جھٹ کر آپ پر آن پڑا ہے۔ یہ رقم جس کے ہارے میں نہ آپ کو خیر ہے نہ مجھے کہ کتنی ہے۔ آپ کے ایمان کی آزمائش ہے۔ چاہیں تو پادری کی پوری بینک میں جمع کرا دیں جائیں تو.....“ شہیر نے مسکراتے ہوئے بات اجوری چھوڑ دی۔

”وہی سے دیا جلانے کی رسم بڑی خوبصورت ہوتی ہے شہر عسکری! اچھائی کا اشتہاں انشاء اللہ چھائی ہی کرے گی۔ اگر اجازت ہو تو میں ابھی اور اسی وقت چلا جاؤں۔“  
”ضرور۔“ شہیر نے سر ہلایا۔

”عجاز بینک چلا گیا۔ ہاؤس آیا تو اس کا چہرہ احساس مسرت سے دنگ رہا تھا۔ وہ سیدھا شہیر کی طرف آیا جو اپنی نشست پر تھا۔ ایک لیڈ بزنس میں روپے ٹھونس رہا تھا۔

”ارے..... یہ کیا؟“  
”دیکھو ہی رہے ہو۔ اخوت و محبت اور بھائی چارے کی نشاؤں میں یہ مظاہرہ حرمت کی بات نہیں۔ معاملہ تو حد سے زیادہ بڑھنے لگا۔ ہنگامی طور پر ہر شعبے اور ہر کھانسی میں ایک نمائندہ مقرر کرنا پڑا جو رقم وصول کر سکے اور تم تک پہنچا سکے۔“  
”مگر..... شہیر..... ہر شخص۔“

”ہاں ہاں تمہارا خیال ہے ہر شخص ایماندار نہیں جو سکتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے اعتماد کرنا چاہیے۔ بلکہ میں نے اعتماد کیا ہے۔ ان سے صاف کہہ دیا ہے کہ آپ یہ سوچیں کہ خدا آپ کی برحمت ہر عمل کا گواہ ہے اور میں یہ سوچوں گا کہ جو کا آپ نے مجھ سے یا کسی شخص سے نہیں خدا سے کیا ہے۔ عجاز ہمیں ہر معاملہ صدق دلی سے خدا کے سپرد کر دینا چاہیے خدا کسی انسان کی بینک امید کو نہیں نہیں پہنچاتا۔ اس کے ٹیک عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ وہ بہت بہت ہی بڑی طاقت ہے۔ جو بیزارے جاننے ارادوں کی مدد و معاون اور برے ارادوں کی راہ کی ن ختم ہونے والی دیوار بھی بن سکتا ہے۔“

عجاز اس کا منہ دیکھتا رہا گیا۔ اس شخص کے اعتقاد پر اس کی حرمت بنا بھی تھی اور تھوڑی سی بے جا بھی۔



ایک ماہ میں ہی شہیر نے خود کو ایک اعلیٰ منتظم ثابت کر دیا۔ کسی حاجت مند کو اس کے سامنے دست سوال ہوا کرتے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اس نے کئی ذمہ داریاں بھی کسی اعلان کے لڑکوں اور لڑکیوں میں سونپ دیں۔ ہر روز چند منٹ کے لیے ہی کسی وہ وی سی صاحب سے ملاقات ضرور کرتا تھا ہر تے دن کوئی چھوٹا سا مسئلہ یا بڑی سی کوئی بات وہ ان کے گوش گزار ضرور کرتا۔ فریب ظہا و ظالمت کے لیے جنہیں کونہیں کے مسائل نے پریشان کر رکھا تھا تنہا بیسوں کی خریداری شہیر کی بہت بڑی کامیابی بھی تھی۔ اور وہی ہی صاحب کا سب سے بڑا تعاون بھی۔ دو بیسوں صرف ظالمت کے لیے خصم ہی کرنے کی منظوری بھی۔ وہی ہی صاحب نے شہیر کی استدعا پر وہی بھی۔ حام بیسوں میں سوار لڑکیاں شہیر کی عزت نفس کا ایک امتحان تھیں۔ وہ تو بھری دنیا کے نظام کو بدل ڈالنے کا خواب تھا لیکن اس پر قادر نہ تھا۔ جتنی بھرا آگئی تھی اتنی طاقت فلاح معاشرہ کے لیے استہلا کر ڈالنا اس کے شہیر کا حکم تھا اور وہ شہیر کا غلام ہمیشہ رہا تھا اور ہمیشہ رہنا چاہتا تھا۔

شہیر کے چہرے شہیر کی شہرت۔ ماسون واسٹی کے بول پر بد پھیاں چلا رہی تھی۔ گوہرنے اسے ایک پارٹنر کی ہانچا راتھا۔ وہ اس کی کسی برہمنگی سے مرعوب نہیں ہوتی تھی۔ شہیر نے ماسون واسٹی کو درخشاہت ہی نہیں جانا تھا۔ اس نے شہیر کو وہ بڑی ناز سے پال رہا تھا اس نے شہیر کو اس نے چند الفاظ میں بے معنی قرار دے دیا تھا۔ اب کوئی راہ باقی نہیں رہی تھی۔ آئی جی احمد ابراہیم نے ٹرانسفر کی خاطر ان کے والد کو کہنے پانچ بیٹن بڑے تھے ہر دوسرے روز۔ اور انکو مست آنا جانا۔ کئی متعلقہ ذرا اور افسروں کی خوشامد۔ پیسے کا زیاں اور جانے کیا کچھ۔ لیکن شہیر نے وہ کامد ہی ختم کر دیا۔ پولیس اس کیس کی تفتیش کے لیے اسے سر دجانے میں ڈال دے وہ اس سے بھی بے نیاز ہو گیا تھا۔ بلکہ اس نے تو تجربوں کو معاف کر دینے کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ ماسون کے اپنے ساتھی جنہیں اس سے بددعا سننے کی شہرتی تعریف کرنے پر مجبور تھے۔ بلکہ ان کا وہی بھوکا اس کی طرف اہ چلا تھا۔

شہیر کی اعلیٰ کارکردگی روز روشن کی طرف عیاں تھی۔ ہر انسان کی نظر میں اس کی ساری خوبیاں تھیں ظاہری و باطنی۔ مگر اس کا خوب صورت باطن بھی ان کی نگاہ میں ہوتا تو وہ اسے انسان نہیں فرشتہ سمجھتے کتے۔ اس کی ثابت پوشیدگی کی حدود پار کر کے پورے شہر میں اور اخبارات کے ذریعے ملک میں پھیلنے لگی۔ عاصم حسنین کے ہاں اخبار کا قاعدہ سے آتا تھا۔ وہ روز کی نئی خبر جو شہیر سے متعلق ہوتی تھی وہ ہمیشہ بہت زیادہ بھولتے۔ شاہنواز عسکری ان شہروں میں اتنی محبوبیت سے مشہور تھے کہ وہ اخبار میں شہیر کا نام پڑنے کے یا اس سے متعلق خبر پڑنے کے۔ ف اس طور خوش ہو جاتے کہ یہ شہیر کی خوشی ہے۔

عاصم حسنین کی تیوری پر ہزاروں آجاتے۔ شازدہ ابراہیم اس بات کو چیکوں میں اڑا دیتے۔ شہیر اور شہیر دوستوں میں اس کے نام کے حوالے سے ڈھنگیں مارتے اپنی شان بڑھانے کی کوشش کرتے لیکن دل سے کبھی خوش نہ ہوتے۔

کرنی تعطیلات ہوتے ہی گوہرنے بچہ سفر ہاتھ تو عام سا فراہم عا کہ جو پھیاں پھاڑ کر گزارنے کے لیے ہی تھے۔ خند کر بیٹھے گوہر کے ساتھ جانے کی۔ چچی اماں کو بھی گوہر کے ہاں لے گئے۔ کافی عرصہ گزار گیا تھا۔ وہ نیا جانے کا سوچتے تھیں۔

شہیر کی تعلیم کا پچھلے دنوں کافی حزن ہوا تھا۔ وہ کیسوں سے پڑھنا چاہتا تھا۔ دنواڑ کا خیال تھا کہ ایسی کیسوں سے عباد اللہ پور میں بھرا سکتی ہے۔ شہر کے ہنگاموں سے دور یہ مکوں فضا میں۔ سو یہ سارا کا فائدہ عباس مگر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ چچی اماں اور گوہر سمیت بچے پارٹی اپنے شہیر ہنسی کے ساتھ طویل سفر کا نطف اٹھاتے ہوئے گھر سے دن عباس مگر چچی گئی۔ سفر نہیں ٹھنسا کر گیا پڑ رہا تھا۔ اس لیے ہر پچاس گھنٹے سفر طے ہونے پر سب کا ارادہ ہوتا رک جانے کا۔ کسی نولڈ سپاٹ سے بوتلیں پیتے اور آکس کریم کھانے کا۔ کھانے کے وقت کسی بھی شہر سے اکتھے ہوئے پر دھا بالی دیا جاتا ہے چارن چنگی اماں ساتھ ساتھ کھینچی پھرتے۔ نر کے خوب مزے اڑاتے۔ ماٹا ٹھونوں کی کوئی بھی دکان دیکھ کر بچل اٹھتی۔ چچی اماں کے ہاں کے لیے پورے شہر کا چکر لگانا پڑتا۔ یوں چھ ات تھنوں بچہ سفر چھتیس گھنٹوں میں نڈ کر کے وہ دوسرے دن منزل تک جا پہنچے۔ منیفہ بیگم ان سب کی اچانک آمد پر ہانسا ہاں ہوئیں۔ شہیر نے ملنا سے گزرتے ہوئے سب کو دریاے چناب کے کنارے آباد مقرر کر دیا بھی دیا تھا۔ اور وہیں سے انہوں نے بہترین قلمی آموں کی ایک بڑی چینی خرید کر گاڑنی کی چھت پر رکھے سامان نے ساتھ چھائی گئی۔ سامان اتار دے ہوئے شہیر چینی چھت کرا لیا۔

”بچے بچو پھو آیا آپ کے لیے۔“ اس نے چینی منیفہ بیگم کے قدموں میں لار کھی۔



"ہاں پھوپھو دکھاوے کو آپ کو اور کھانے کو ہماری۔ شیر بھائی کہہ رہے تھے۔ پھوپھو صرف سن کر خوش ہو جائیں گی۔ کھلائیں گی تو ہمیں ہی۔"

"ارے پھوپھو تو زبان وزن اٹھلانے کی ضرورت ہی کیا تھی یہاں پر کیا کم اچھے آم ملتے ہیں۔ ابھی منگوا لیتی۔ تمہارے پھوپھو آئیں گے تو باراش ہوں گے۔ کیا یہاں ہم نہ بیٹھے تھے۔"

"پھوپھو جان! آپ ساغر کی باتوں پر جارتی ہیں۔ واللہ یہ آم ہم آپ کے لیے ہی لائے ہیں۔ قسم لے لیں جو ایسا سوچا بھی ہو۔ یہ مظفر گڑھ کے مشہور زمانہ آم ہیں۔ دکاندار نے شرط یہ دے دی ہے۔ انہیں چوندہ آم کہتے ہیں۔ ایسے بیٹھے آم آپ نے یا ہم نے نہ دیکھے ہوں گے نہ کھائے ہوں گے۔"

شیر وضاحتیں کرنے لگا۔ گوہر گاڑی سے اترتے ہی منیہ بیگم سے کی اور کام میں لگ گئی لیکن جو ہر کوئی نہ کرنا نہیں بھولی۔ ابھی وہ نوک مل ملا کر حال احوال میں گلے تھے کہ وہاں میاں بیوی آن پہنچے۔ نیکل شیر سے گرم جوش سے ملے۔ جو ہر آپا گوہر کی طرف نہیں۔

"ارے تم آتے ہی خاصہ داری میں لگ گئیں۔"

"تو اور کیا کرتی۔ اماں! کہنی کیا کیا کرتی۔"

"ہو میں کروں گی سب کچھ۔"

"نہ جی اتنے بڑے بزنس مین کی بیگم سے کام کرائیں نامناسب بات ہے۔" گوہر نے پینا زحری نظرس۔

نئی سنوری جو ہر پر جھانسی۔

"لاہور جا کر بہت چٹنی لگی ہو۔ بدھوی لڑکی ہو کر تھی۔ اس چاہاک آدنی کا اثر تم پر بھی ہو گیا۔"

"کون چانا کہ آدنی؟"

"یہی تمہارا شیر عسکری صدر یونین و پنجاب یونیورسٹی۔ اخبار اس کی خوب صورت الفاظ سے سخی تقریروں سے پر ہوتے ہیں۔ ویسے گوری یہ اتنے الفاظ لانا کہاں سے ہے۔ شکل سے تو ایسا نہیں بگھتا۔ ایک دم بدھو سا لگتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے الفاظ تو نے ہی اس کے اندر اندلے ہیں۔"

گوری کی نظریں جھک گئیں۔ وہ مسکرانے لگی۔

"نہیں میں نے تو نہیں جو ہر آپا۔ بلکہ بہت کچھ میں نے اس سے پاپا ہے۔ وصول کیا ہے۔ آپا! آپ نے اسے چاہاک کہہ کر شاید میرے دل کو تکلیف دی ہے۔ کچھ نار اور چالاک میں بہت فرس ہوتا ہے۔ وہ چالاک ہرگز نہیں ہے۔"

"اے ہو..... ہو..... بڑا احساس ہو رہا ہے۔ نہ بھی جو جو آٹھ دن ہوئے آپ ان کی مخالفت میں اپنی جہتی کا زور دینا کر جی ہوتی تھیں۔ کیا رفاقت کوئی سحر ہے جو آپ پر چھا گیا ہے۔ کل تک جس میں چاروں شرعی عیب آپ کو نظر آتے تھے آج۔"

"ہاں جو ہر آپا۔ آج وہ مجھے سنا رہے انسانوں سے زیادہ اچھا بلکہ سب سے جدا نظر آتا ہے۔ میرے نسب میں اس کی رفاقت کبھی تھی اور نہ دعوت نے بھی نکلتی تو اس جیسا دوست کہیں نہ پھٹتی۔ رفاقت تو نہیں ہے۔ انسان جاوگر ہے..... اس کی بلند ظرفی اتنی کہ ہماری جاوہر ہیں۔ جو کچھ پچھا گئے ہیں۔ اس جاوہر کوئی تو نہ ہی نہیں۔ میں بہت خوش قسمت ہوں آپا۔ میرے دل میں آ رہا ہے وہاں ہزاروں دلوں میں بسا ہے۔ نیک نام ہے۔ ساتھ اچھی شہرت کے ساتھ..... وہ ایک غیر معمولی انسان ہے جو ہر آپا۔ ناولی قیصر کسری کے میرا عاصم کی

غریب۔ شریف اندر بے باک... سچا اور کھرا..... شکر ہے کہ میں نے استہ پچانے میں بہت زیادہ دیر نہیں کی اور نہ وقت آگے نکل جاتا۔ میں بہت پیچھے رہ جاتی۔ اور پچھتاہا میرا مقدر بن جاتا۔"

"گوری کیا! وہ اتنی بہت اچھا ہے؟"

"آپا! اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔"

"آپا..... شاید بر لڑکی کو اپنی ذات سے منسوب مرد میاں ہی لگتا ہوا تھائی اچھا۔ اتنا ہی اہم نہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کے بہت سے اچھے نوجوان مل کر بھی شیر نہیں بن سکتے۔ مجھ جیسی ایک لڑکی کی وہ اشد ترین ضرورت ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اسے دیکھ کر اسے محسوس کر کے۔ بے گناہی میرے قریب بھی نہیں چھٹی سدا میں لگا ہے کہ یہ میرا اپنا آپ ہے یوں لگا ہے جیسے میں کسی اور کے ہا سے نہیں آئی تھی۔ اور آئیے میں ہمیشہ اپنا آپ ہی نظر آتا ہے۔"

"گوری! تم تو حد سے لڑتی ہو۔ کوئی یوں کسی کو اپنا آپ نہیں کہا کرتی۔ کیا تمہیں واقعی اس سے محبت ہے۔ کیا تم اسے چاہنے ہی ہو؟"

"آپا! میں نہیں جانتی محبت کسے کہتے ہیں۔ چاہا کیسے جاتا ہے مگر صرف اتنا ضرور ہے کہ وہ مجھ سے ہے۔ میرے اندر رہتا ہے۔ خیالوں میں وہی۔ خوابوں میں وہی دل میں وہی کیوں پروہی۔ ہوؤں تو اس کے خواب۔ جاگوں تو اس کی صدا میں۔ دل کی دستار کئی پر خور کڑوں تو اس کا نام اور بات۔ وہ تو دل چاہے کہ اس کی بات کروں۔ اگر یہ محبت ہے تو واقعی میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ اسے چاہتی ہوں۔"

"اور..... وہ.....؟"

جو ہر نے جھٹ کہا۔ گوہر شرما کر مسکرانے لگی۔

"آپ یہ سوال اسی سے کیوں نہیں کرتی ہیں۔"

"بہتر جانتر ہے سوال سننے اور جواب دینے کے لیے۔" شیر کی آواز پر دونوں چونکیں۔

"آپ! گوہر بول آئی۔"

"تم۔" گوہر نے آنکھیں پھاڑیں۔

"آف کورس میں....."

"آپ کچن میں کیا کرنے آئیے؟"

"آہ آتا تو اتنے حسین اخبار سے مجھ پر ہر ہنا۔ تنک میں بستا رہتا۔ ان الفاظ پر آپ کا نہیں جو ہر آپا کا شکر یہ نہ دیتیں نہ آپ ایسے خوب صورت الفاظ میں اخبار لڑا تھیں۔"

گوہر پانی پانی ہوتی۔ اس کا رنگ نئی ہو گیا۔ ہاتھ کا پٹنہ گئے وہ تو فرط جذبات میں کہے گئی جو منہ میں آیا اور شہیر نے سب کچھ سن لیا۔

"شہیر۔! تم بہت بگ۔ آپ: ہوائی لڑکی تمہاری اس نہ رہو متا رہے۔ اسے تمہاری ذات سے کسی دہانے کے لئے پھینا رہے۔"

"آپ: دعا کرنا آپا یہ محبت سدا کا تم رہے۔ گوری کا بیٹا نہ میری چھوٹی سی دنیا کا قیمتی ترین اثاثہ ہے۔ میرا ادا ہے۔ زندگی کے سفر میں یہ ساتھ رہا تو میں کسی سے کہتی من نہیں ہتی۔ آسانی سے۔ بیٹے کر لوں گا۔ اس سے اس سے پہلے میں جو تھا سو تھا۔ اس سے ملنے کے بعد میری سدا ہتی بننا چاہتا ہوں ثابت ہونا چاہتا ہوں جو یہ

چاہتی ہے۔ آپ! میں گوری کے دل کی سادی پائیں اس کی آنکھوں میں جھانک کر پڑھ لیتا ہوں۔ اس کے دل کی آواز میرے دل کی آوازوں سے مختلف نہیں۔ گوری اس خاندان کا بیٹی ہے۔ لیکن آپ سب سے مختلف ہیں اس خاندان کا بیٹا ہوں لیکن سب سے جدا۔ غیور۔ میں ہم دونوں ایک ہیں۔ ایک جیسے ہیں ایک دوسرے کے لیے ندرت کا بہترین انعام ہیں۔"

"خدا اس جوڑی کو تاقیامت سلامت رکھے۔" جوہر کو دلی خوشی ہو رہی تھی۔

"ہاں گوری تنگ اس پر کہنے آیا تھا وہ جو اتنا عرصہ آئندہ چاچی کے ہاتھوں آپ کو خانہ داری کی ٹریٹمنٹ دلائی ہے۔ اسے ان دنوں کام میں لایے گا۔ ایک ایسی امتحان باقی رہ گیا ہے آپ کا۔ اس میں بھی حمدنی صد نمبر ہونے چاہئیں۔ آپ کو علم ہے آئندہ چاچی تمہارے اس دور میں بھی چاچو کے دل پر راج کر رہی ہیں۔ اور صرف ایک ماہر سلیٹر مندرخانہ ہونے کے سبب۔"

"اچھا۔ اچھا اب سمجھا۔ مگر یہی نکان کے باوجود گوری تنگ ہیں کیوں تھکی ہیں۔ تو بات یہ تھی۔ میاں! فکر مند مت ہو۔ تمہیں اس سلسلے میں بھی مایوسی نہیں ہوگی۔ عشق میں بڑی طاقت ہے ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ اور ہماری مگر ہر تنگ تو تم سے بڑا دماغی قسم کا عشق کرنے والی ہیں۔"

"خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔ محبتوں کا کھل ہوتا ہی چاہتا ہے۔ محبتیں چھپر پھاؤ کر لیں۔ اتنی زیادہ اتنی زیادہ کر۔۔۔ کہ۔۔۔"

شعبہ لنگاہوں میں شرارت خمرے گورہ کو لنگ رہا تھا جس کے گلابی عارضوں پر سیاہ رنگی ٹیکس بلیزر سے دھیرے لڑ رہی تھیں۔

"جلے جو چر اپنا۔ ہم سب ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ لوگ ہمارے ڈر سے چیزیں ہانڈ نہ بیٹھیں۔" جہر مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ چل رہی۔

☆☆☆☆

بڑے بڑے بعد مندر نے آنکھیں کھولی تھیں۔ پھر چلنے پھرنے کے قابل بھی ہو گئی اور ایک ہفتہ داری دوزخ پر ڈاکٹر ہنری نے پورے سے سٹارش کی کہ اب اسے گھر جانے کی اجازت دے دی جانی چاہیے۔ سو بیوں سدرہ گھر آ گئی۔ مگر ابھی وہ گھر اور بچوں کی دیکھ بھال اور کام کاج کے لائق نہ تھی۔ لہذا ان سب کی اپنی بھی ناممکن تھی۔ عدنی کو پراحتی کی فکر تھی۔ لیکن اس کا ہنس جانا کسی طبع ہوئی نہ رہا تھا۔ مندر بچوں کو سنبھالتی۔ عدنی باہر کے کام کرتا۔ مندر آ پانکا دیکھ بھال کرتی۔ ڈاکٹر ہنری ہر شام تواتر کے ساتھ آیا کرتے۔ کچھ ندر وہ آپانے انہیں عادی کیا تھا باقی مٹی نے کر دیا۔ شامی کباب پکڑے کچھ جڑا کھلا اور انکی کئی چیزیں ان کی پسند تھیں۔

سدرہ آپا کو گھر آئے ایک جنت ہو چلا تھا۔ جب ایک شام ڈاکٹر ہنری انہیں اپنے گھر آنے کی خصوصی دعوت دے گئے۔ سر شام ہی سب تیار ہو گئے۔ سدرہ آپا کو خدرا نے تیار کیا۔ آسانی رنگ کے شادواری سوٹ پہنایا اور ایک کونٹ میں وہ بہت بھلے لگے تھیں۔ نقاب اور چہرے کی زردی بھی ان کے حسن کا حصہ بن گئی تھی۔ عدنی نے خوب خوب تیار کی۔

"عدنی! ڈاکٹر ہنری کتھارے پوز سے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"بھئی! تم جو اس خصوصیت خوشی سے تیار ہو رہے ہو ان کے ہاں بیٹی تو کوئی نہیں۔"

"وہ جھینپ گیا۔" ڈاکٹر ہنری کے ہاں بیٹی نہ ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اپنی جامہ زہی فراموش کر دوں۔ بھئی ہو سکتا ہے ان کے پردوں میں کوئی خاندان آباد ہو۔ جن کی نرم و نازک اور ٹیکس سی بیٹی کو ڈاکٹر ہنری نے اپنی بیٹی بنا رکھا ہو۔ اور ایسا بھی نہ ہو تو یہ تو ہو سکتا ہے کہ آتے جاتے کوئی انگلش حسینہ ہم سے نکرا جائے اس قدرتی وجاہت پہ مرے۔"

وہ سینہ تان کر لولا۔ عذرا ہنستے ہنستے بے حال ہونے لگی۔

اختیار بھی آفس سے لوٹ چکے تھے۔ لباس بدل کے وہ بھی ساتھ چل رہے۔ گاڑی ڈاکٹر ہنری کے گیٹ پر رکی۔ تو وہ انہیں ان کے فکٹر لے۔

"سیلو۔ بی بی! یوٹو ایڈگر ٹریڈر سٹیکٹ اہل لیڈی۔" دو گرم جوش انداز میں گویا ہوئے۔

قریب آ کے عذرا کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"آج میں نے آپ کو ایک خاص موقع کی نسبت سے مدعو کیا ہے۔ اپنا جانتے ہوئے۔ ہمیشہ میں اس خوشی اور غم کو جو ایک ساتھ جھٹکتے ملتا ہے خود سے ہی شہر کرنا تھا لیکن اس بار دل چاہا ہے کہ اسے آپ لوگوں سے شہر کر دوں۔"

"یہ ہمارے لیے خوشی کی بات ہے ڈاکٹر۔ ویار غیر میں آپ ہی کا وجود تو ہے جو غریب الوطنی کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ آپ ہمارے لیے قدرت کا عظیم عطیہ ہیں۔ ایک شہر بزرگ۔ ایک ہمدرد دوست۔ بگد سب کچھ ہیں۔"

اختیار انہیں اپنے دل کی بات بتا رہے تھے۔

"اور آپ لوگ بھی میرے لیے خوشیوں کا سرچشمہ ہیں۔ محبتیں جھینوں رنگوں اور نسلوں کے امتیاز سے پاک ہوتی ہیں۔ یہ کسی سے کہیں بھی کسی بھی ماحول میں آپ ہی آپ جنم لے لگتی ہیں۔ میں بھی آپ سب سے محبت کرنے لگی ہوں۔ بے ٹوٹ، اہمٹ محبت۔ جانے کیوں آپ سب مجھے اپنے اپنے سے لگے ہوگی ملاقات میں لیتا۔"

"آدی اپنے مزاج کے لوگوں سے ہی محبت کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر آپ دونوں ذات جو کچھ ہیں شاید ہم بھی وہی ہیں۔" سدرہ آپانے عذرا کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر چلتے ہوئے کزور لہجے میں کہا۔

"سدرہ بیٹی! آج میری بیٹی کی سالگرہ ہے۔"

"آپ کی بیٹی کی سالگرہ آپ کی بیٹی۔ سر: آپ کی تو شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"شادی نہیں ہوئی۔ بیٹی تو تھی۔ اپنے بھائی کی اگلی بیٹی کو اپنی بیٹی کہتا جرم تو نہیں۔ کوئی بیٹی ہوتی تو بس اتنی ہی زہیر ہوتی جتنی وہ تھی۔"

"تھی سے کیا مراد ہے اب وہ کہاں ہیں۔ آپ کے پاس کیوں نہیں؟"

"وہ ہم سب کو میرا مطلب ہے اپنے ماں باپ کو اور مجھے چھوڑ گئی تھی۔"

"کہاں چلی گئی تھیں وہ؟"

"پاکستان۔"

"پاکستان؟ مگر کیوں؟" سدرہ آپانے چھٹ پوچھا۔

"اس نے ایک پاکستانی سے شادی کر لی تھی۔" ان کا سر جھک گیا۔

”اچھا۔“ غنڈر اور عدی دونوں ہی حیران تھے۔

”پھر اب کہاں ہیں وہ؟“

”اس کی کوئی خبر ہی نہیں۔“

”خبر ہی نہیں آپ بیٹی سے۔ بے خبر کیسے رہ گئے۔“

”جن دنوں اہل شادی بنا کے پاکستان گئی میں گھر پر نہیں تھا۔ اور میرے بھائی نے مجھے اس کے بارے میں بتایا ہی نہیں۔ میرے پاس اس کا یا اس کے شوہر کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ بھائی اسے معاف کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ تو اس کا ذکر نہ کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ دنوں بعد اس کی ایک سبکی کے حوالے سے مجھے اس فوٹو گرافر کو ایڈریس ملا جہاں سے ان تے اور اس کے شوہر نے عروسی تصویر بنوائی تھی۔ میں نے ان کی بہت بڑی تصویر بنوائی اپنی پچھریلری میں آریاں کر دی۔ نس یا ہوں کی ایک مین جسم صورت میرے پاس ہے اور کچھ نہیں۔ ایک دو یا رہیں پاکستان گیا لیکن ناکام لوٹ آیا۔ وہ مجھے کہیں ملے۔ ہر آنے والے پاکستان میں اس سے تلاش کرتا ہوں۔ عذرا اور عدی جیسے بچے مجھے اس کے بچے لگتے ہیں۔ اور ہر اجیڑ عمر ہر وہ میں شاہنواز کو کھوجتا ہوں۔ پردنیا کی اس گہما گہمی میں وہ سب لوگ مجھے کبھی نظر نہیں آئے۔ اس کی پیدائش اور پھر شادی کے حوالے سے دو تار نہیں ایسا ہیں جن پر میں اپنے سارے ارمان پورے کر لیتا ہوں۔“

”آپ نے کیا نام لیا تھا ابھی۔ شاہنواز۔ یہ کس کا نام ہے۔“

”شاہنواز اس لڑکے کا نام تھا جسے ہماری لاڈلی بیٹی نے ہزاروں لڑکیوں میں سے اپنا شریک حیات چنتے ہوئے اپنے ماں باپ کے احساسات کو کوئی پروا نہ کی۔ جس کی خاطر اس نے مذہب کی اور بگڑی ہوئی پورا پھلانگ لی۔ جس کی خاطر وہ اپنے والد کی لاکھوں پونڈ کی جائیداد پھوڑنی۔ حالانکہ وہ میرے بھائی کی اکلوتی بیٹی تھی۔“

باتیں کرتے کرتے سب ڈگ اندر آ گئے۔ ڈاکٹر ہنری کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم کی طویل میز لووازمات سے برگی۔ ایک تین منزلہ نیک خوب صورتی کے ساتھ درمیان میں سجا تھا۔ اور ساتھ ہی ایک خوب رو جوان لڑکی کی تصویر لگی تھی۔

”سنز جمال احمد۔ میں سخت پریشان ہوں۔ کئی بوجھ میرے دل و دماغ پر رکھے ہیں۔ میں اسے تلاش نہیں کر سکتا اسے پائیں سکتا یہ میری زندگی کا بہت بڑا المیہ ہے۔ آپ کو علم ہے۔ میرے نام جو وسیع و عریض فارم جیسا۔ جو خوب صورت گھر ہیں۔ جو بڑا کسا ہے یہ سب کس کا ہے۔ میرے بھائی کا۔ جس نے اپنی طویل مدت ملازمت میں جو بھی تنخواہ حاصل کی ہے۔ ابھر ادھر خرچ کر دی ہے۔ بنک بیلنس سے زیادہ عزیز و مستراہت رہی ہے جو کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری ہونے پر اس کے لیں پر آہستی ہے۔ یہ گھر۔ یہ گھر بھی میرا نہیں۔ میرے بھائی کا ہے۔ بھائی نے ساری جائیداد میرے نام کر دی۔ میں ایک بوڑھا آدمی اور کتنے دن جی سکتا ہوں کتنے دن جیوں گا۔ کاش وہ مجھے مل جاتی۔ میں یہ سب کچھ اس کے حوالے کر دیتا۔“

”آپ نے پاکستانی سفارت خانے سے رابطہ کیا ہوتا۔“

”میں کیسے رابطہ کرتا۔ میں اس شخص کے نام کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔ صرف نام کے سہارے کسی کو کھوج لینا کب آسان ہے۔ پاکستان میں لاکھوں جیس تو ہزاروں شاہنواز تو ضرور ہوں گے۔ مجھے تو یہ خبر بھی نہیں کہ اس کا خاندان کیا ہے۔ اور وہ پاکستان کے کون علاقے کا رہنے والا ہے۔“

”مئی.....مام۔“ عدی ایک دم چلایا۔

”مام شہیر کے والد کا نام بھی تو شاہنواز عسکری ہے اور اس کی بھی بھی انگریز لڑکی نہیں۔“

”شہیر۔ شاہنواز۔ انگریز لڑکی۔“ ہنری چونک اٹھے۔

”ڈاکٹر ہنری۔ آپ ہینے مجھے وہ تصویر دکھائیں گے میرا مطلب ہے آپ کی بیٹی اور شاہنواز کی عروسی تصویر۔“

”کیوں نہیں کیوں نہیں تشریف لے چلیے یہ! میں ہاتھ بکا دروازہ پکچر گیلری میں ہی اٹھتا ہے۔“ سب بے تابنا۔ اس خوف برائے۔

”کسی کی نظر میں شاہنواز عسکری کی تصویر بکا دروازہ ہی نہیں۔ ڈاکٹر ہنری انہیں اس تصویر کی جانب لے گئے۔ سب ان کے پیچھے پیچھے تھے۔

”ارے۔ یہ تو وہ تو ہی شہیر کے پاپا شاہنواز عسکری ہی ہیں۔ ڈاکٹر ہنری۔ یہ سچ کچھ ہی شہیر کے پاپا ہیں۔“

”شہیر۔ کون سا شہیر۔ وہی۔ جو آپ کا پتا ہے۔ رضاشاہی بیٹا۔ وہی جو ایک اچھا انسان ہے وہی جو حق کا تلاش ہے۔ آپ کیسے خبر کر رہے تھے۔ والد کی تصویر ہے۔“

”یقین کریں ڈاکٹر ہنری۔ میں نے انہیں جوانی میں بھی دیکھا تھا۔ یہ ہی ہیں مدنی مدنی۔“

”ہاں مئی! میں نے بھی شہیر کی المم میں ایسی تھی ہر میں دیکھی تھی۔“ مسرہ آپا نے تائیدی۔

”تو پھر بتائیے کیوں نہیں؟“

”ڈاکٹر ہنری نے اپنا یہ راز مجھے نہ بتا تھا۔ لکھا یا ہوتا تو میں اس پکچر گیلری میں پہلی بار آتی ہوں۔“

”سنز جمال! کیا سچ کچھ شہیر میری بیٹی کا پتا ہے۔ میرا دل اسے ہے۔ لیکن آپ نے بتایا تھا وہ میں ماں کا بچہ ہے۔ ان کے پاپا نے دوسری شادی کر رکھی ہے۔ اس کے پاپا اسے ناپسند کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ ایک بگڑے لڑکے ہیں جاگیر دار ہیں۔ جبکہ شہیر مسافات کا قائل ایک نوجوان جسے غریبوں کے دکھ درد کا گہرا احساس ہے۔ سنز جمال اس کا مطلب ہے۔ میں اپنی بیٹی سے کبھی نہیں مل سکتا۔ وہ ہمیں اس جہان فانی کو الوداع کر چکی ہے۔ وہ دیکھے اور میں اسے نہیں دیکھ سکتا۔“

وہ ایک دم سے رونے لگے۔ انہوں نے چلتے چلتے دیوار کا سہارا لیا۔ عدی تے بھاگ کے کرسی اٹھائی۔ عذرا نے انہیں تھما۔

”ڈاکٹر! آپ کبھی پر ہینہ جائیے۔“ وہ زور زور سے رونے لگے۔ چہنے ہنسانے والے ڈاکٹر اور ہے تھے۔ بارہ قطار آنکھوں پر زرنال رکھے۔ ان کا سفید رومال اس سفید لہو سے جوان کے دل سے لپک رہا تھا پورا بچھیک گیا۔

”اب میں اس کی سالگرہ کیسے منا سکتا ہوں۔ کیسے۔ میں تو ساری سالگما ہیں بے مقصد منا تا رہا۔ بے مقصد مانیں دیتا رہا۔ وہ موت کی سرد اندھیری رات میں تم ہو گئی میں اس کی روشن جموں کے خواب دیکھتا رہا۔“ وہ پھر رونے لگے۔ ماحول انتہائی سوگوار ہو گیا۔

”ڈاکٹر! آپ تو دوسروں کے دکھ بانٹ لینے والے شفیق انسان ہیں۔ ہم آپ کا دکھ کیسے باتیں۔“ عدی کو بھی سہمہ ہو رہا تھا۔

”کن الفاظ میں آپ کو تسلی دین۔“

”رہنے دور بگما ہوں تو ان کی ٹھنڈک دل میں اتری رہتی ہے۔ اب میرا اس دنیا میں باقی کیا رہ گیا۔“



"بھیا۔ ان بے چاری کو آپ نے باورچی خانے میں قید کر دیا ہے۔ کیا وہ یہاں آگ جھونکنے ہی آئی ہیں۔"  
 "بی بی! وہ ہمارے ساتھ رہے گی تو یہ سب تو ہو گا ہی۔"  
 "کیا مطلب؟ اے خدا نہ کرے۔ بھیا کیا شادی کے بعد بھی۔"

"ہاں ہاں شادی کے بعد تو یہ فرض اور بھی زیادہ ہو جائے گا۔ اپنے میاں کو خوش رکھنے کا۔"

"اسے خدا آپ کو سلامت رکھے پکانے ریحہ صحنے کے لیے آیت سے ایک اچھا خانہ ماں رکھ سکتے ہیں آپ۔"  
 "جی نہیں۔ ایک ہی تو بات ہے۔ ہمیں تو مسرور کی بیوی جیسی بیوی چاہیے ہوگی۔ ہر دم خیال رکھنے والی۔ اپنے ہاتھوں پکا کر کھانے والی۔ خود کپڑے دھونے اور پریس کرنے والی اور خود ہی بچے پالنے والی راتوں بی بی۔ میں نے مسرور کو کئی بار چولہے پر تمہارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے دیکھا ہے۔ ہمارا گھر جتنا بھی جدید ہے۔ سہولیات جتنی بھی زیادہ ہوں۔ کھانا میں کچن میں رکھیں پائیوں کی سیڑھی پر بیٹھ کر کھاؤں گا اپنا کچرا اپنا اصل مجھے بہت عزیز ہے کیونکہ اس میں تمہیں رچی بسی ہیں۔ کئی کئی کئی کے حوالے سے کسی کی ذات کی وجہ سے جو تھوڑے سے دکھ اٹھانے جاتے ہیں ان کا بھی اپنا مزہ ہے۔ دراصل یہ چھوٹے چھوٹے دکھ دکھ اٹھانے والے کو تو مزہ دیتے ہی ہیں۔ جس کی نظر اٹھانے جاتے ہیں۔ وہ بھی درد کی ان دکھیں زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے۔ ان کو یاد کرتا ہے۔ تو اس کے دل میں بھی درد کی تین تین ٹپٹپٹ نہریں طوفان النہادتی ہیں۔ درد کے اس رشتے کی زنجیریں فولادی زنجیروں سے زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔ کئی جدا نہیں ہونے دیتیں جگہ کے رکھ دیتی ہیں۔"

اندھرتی گویا بڑی بڑی یہ سب سن رہی تھی۔ یہ اس کے بھی دل کی آواز تھی۔ شہیر کی ذات کی نسبت سے جو خواب اس نے دیکھ رکھے تھے۔ ان میں ایک خواب یہ بھی تھا۔ بانڈی میں چھپے ہلاتے ہوئے وہ مسلسل سوچتی رہی۔ محبت تو نام ہی آیت سزا کا ہے۔ مزا تب ہے کہ سفر تمام نہ ہو زندگی تمام ہو جائے۔ شہی تم کچ کہتے ہو۔ محبت کی خاطر اٹھانے جانے والے چھوٹے چھوٹے دکھ بڑے سین سن ہوتے ہیں۔ اس قیامت کی گرمی میں میرا دل نہیں گھبرا رہا۔ پیش مجھے پریشان نہیں کر رہی۔ سینے سے گھبراہٹ نہیں ہو رہی کتنی بے نیاز ہوں میں اس سزا سے ماخول سے! صرف ایک ٹکا وہ میرا بان کی آس میں۔ صرف ایوں کی مسکان کی امید میں۔ کتن اور کتن ایک دوسرے کی خند ہیں۔ تمہاری رضا کی کتن مجھے تھکتے نہیں دے رہی۔ پکانے کا یہ سارا مرحلہ کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ ہر چیز پہ کتنی بھرپور توجہ ہے میری۔ صرف اتنی آرزو میں کہ میری یہ محبت اس حد تک ضرور پہنچے جو تمہیں چوٹا کئے جو تمہیں یہ احساس دے سکے کہ تمہاری گویا ہر تمہارے روحانی و جسمانی تقاضوں کو سمجھنے کی اہلیت رکھتی ہے۔"  
 وہ مستکراتی رہی۔ اس سے بے خبر کہ شہیر بڑا بڑا ہے جس کھڑا ہے۔ وہ انوں کو ایک دوسرے سے دل کی یہ بات کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

☆☆☆☆☆☆

"آپ! آج آپ بھی بے چاری کی کچھ مدد نہ کرنا چاہیے گا۔ باہر مردانے میں کچھ مہمان ہیں۔"  
 "مہمان۔"

"جی ہاں آپ! قرعہ معافی کے زمینداروں کا بیٹا ہے۔ مجھ سے ایک سال سنٹر ہے۔ امتحان دے کر ڈیڑھ چھپکا ہے۔ لیکن انکیشن کے دنوں میں اس نے میری بھرپور مدد کی۔ پناہ اور سوخ میرے لیے استعمال کیا۔"  
 "کون ہے وہ کیا میں اسے نہیں جانتی۔"

"شاید اس کا نام تیار زرد ہے۔ لاہور میں ایک بہت بڑی کوٹھی والد نے صرف اسی کی خاطر بنا کے دی ہے۔"

"ایسا نہ کہیں ڈاکٹر ہنری۔ شہیر آپ کی بیٹی کا بیٹا ہے آپ کا واحد رشتے دار ہے۔"

وہ روتے روتے مسکرایے۔

"آپ کو مزے کی بات بتاؤں۔" عذرا نے معصوم انداز میں کہا۔ ڈاکٹر نے اس کی طرف دیکھا۔

"اگر پہلے آپ کو مسکراتا ہوگا۔"

ایک دو دن تک مسکراہٹ ان کے لبوں پر آ رہی۔

"آج کا دن شہیر کا جنم دن ہے۔ یہ ایک ہم اس کی سالگرہ کے ایک کے طور پر بھی کاٹ سکتے ہیں۔"

"آج شہیر کا جنم دن ہے۔ اسے کیسا حسین اتفاق ہے۔ جس تاریخ کو وہ خود پیدا ہوئی تھیں کو بھی اسی روز جنم دیا۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہے تھے۔

"لیکن وہ مر کیوں گئی؟ سزا جہاں! وہ مر کیوں گئی؟" وہ پھر اندر رہے ہو گئے۔

"کیا آپ اسے جانتی تھیں۔ آپ نے اسے دیکھا تھا۔"

"اسے دیکھا نہیں جانتی تھی نہیں لیکن شہیر کو وہ یاد ہے۔ پانہ کر لگتا ہے۔ وہ بالکل ایسی ہی ہوں گی اپنے بیٹے کی طرح ڈاکٹر ہنری آپ شہیر کو دیکھ کر اس سے مل کر خود ہی اندازہ لگالیں گے کہ وہ کیسا بے کس پر گیا ہے۔"

"مئی! شہیر سے اس وقت بھی تو بات ہو سکتی ہے۔"

"بظرف۔ ڈاکٹر۔ آپ شہی سے بات کیوں نہیں کرتے۔ بھیا یہ سن کر کہ آپ اس کے نانا ہیں اور احد فوش ہوگا۔"

عدی جلدی سے ٹیلی فون اٹھا لیا اور پاکستان کا نمبر گھمانے لگا۔ لاہور کے نمبر پر آ کر منہ خاتون نے بتایا کہ وہ عباس مگر گیا ہوا ہے۔ عدی نے عباس مگر کے سارے نمبر جلدی سے ہاتھ کی بھٹائی پر لکھ لیے۔

مگر شہیر ان نمبروں میں سے ایک نمبر پر بھی نہیں سن سکا۔ شہیر کی مصروفیات سے بہت دور عبد اللہ پور میں وہ سب چین کے دن رات بسر کر رہے تھے۔ جو پل ان سب کے دم سے بارش ہو گئی تھی۔ نیل بزدانی بھی اپنے بڑوں کے ہندوں سے کچھ وقت چھڑا کر ان کے ساتھ چلے آئے تھے۔ دن بھر وہ سب مختلف قسم کی مصروفیات میں گم رہے۔ عاتکہ گھر کے ساتھ چکی رہتی۔ عامر ساغر سارا دن آوارہ گردی کرتے۔ جو پ میں پھرنے سے ان کے رنگ بھلس کر رہ گئے تھے۔ جوہر اور نیل صبح لمبی واک پر نکل جاتے درختوں کے سایوں میں مندی کے پانی سے دھو کر کے نماز ادا کرتے اور پھر سات آٹھ بجے جب سورج پوری کائنات میں اپنی روشنی اور تمازت بکھیر دیتا تو آتے۔ گوہر رانو کے ساتھ کچن کی مصروفیات میں گم رہتی۔ شہیر بیرونی برآمدے میں جہاں سچ کی شخصیت ہوا چہر چہر چل رہی ہوتی کورس کی کتابوں میں گم رہتا۔

"گوہر باجی! ابھی بھی آپ کچن سے فارغ ہوں گی بھی۔"

"کیا کروں گڑیا۔ ناشتے سے فارغ ہوتی ہوں تو دہا پہر کے کھانے کی مگر۔" نے نلتی ہے۔ دوپہر کا کھانا بن جاتا ہے تو رات کا خانیانہ پریشان کر دیتا ہے۔ جوہر آ پنا تو سیٹھانی ہیں کب کام کو ہاتھ لگانے لگیں۔ راتوں نہ ہوتی تو جانے میرا کیا ہوتا۔"

"بی بی! آپ خود ضد کرتی ہیں۔ ورنہ میں بھی پچھتوں ہوں۔ سب کچھ۔ شہیر بھی جب یہاں تھے ہمارے ہاتھ کا پکا اٹی کھایا کرتے تھے۔"

گوہر خاموش رہی راتوں شہیر کے سر پر جا بیٹھی۔

دہیں رہتا ہے۔ پکاسیایا بناندان ہے۔ نعلیم سے فارغ ہوتے ہی صلح کونسل کا ممبر چنا گیا۔ اس علاقے میں کسی کام سے آیا تھا۔ مجھ سے ملاقات ہوئی۔ ازراہ اخلاق اسے مدعو کرنا پڑا۔ رامون واپسٹی کے اور اس کے خاندان میں کسی وجہ سے تھوڑی ان بن گئی۔ میرے ساتھ تعاون کرنے پر ماسون واسطی بگڑ گیا اسے دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ گوہر چونک گئی۔ امتیاز زرد کو انکیشن کے دنوں میں کئی بار اس نے شبیر کے ساتھ دیکھا تھا۔ لڑکیاں اس کی امارت و وجاہت سے مرعوب ہوتے ہوئے بھی اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتی تھیں۔ اسے شبیر سے امتیاز کی ملاقاتیں پسند نہیں آئی تھیں۔ لیکن وہ اس وقت انکیشن کے سبب اور اب گھراٹے مہمان کی حیثیت سے اس کے بارے میں کچھ کہنے سے قاصر تھی۔

”میں نے انہیں روک لیا ہے۔ سرور کو شبیر بھیج دیا ہے تاکہ وہ اس کی جیب کی اسٹیٹی اور چوٹا وکیل ٹھیک کر لائے۔ رات وہ نہیں رہیں گے۔ صبح چلے جائیں گے۔ کھانے میں جو کچھ بنا تا ہو مجھے بتا دیں تاکہ کسی کو بھیج کر ضرورت کی اشیاء قبضے سے منگوا سکیں۔“

جوہر آ پانے پوچھ دیر بعد ایک لمبی لسٹ شبیر کے ہاتھ میں تھا وہی۔

”امتیاز زرد کے بہانے تھوڑا سا پیش ہم بھی کیوں نہ کریں۔“ انہوں نے شبیر کو پڑا کیا۔

”بصد شوق۔ بصد شوق۔ آپ کہیں تو میں اپنے مہمان کو بنا رہا ہوں۔ واپس بھیج دیتا ہوں۔ سب کچھ آپ ہی۔“

”اورہ تو کم از کم ایسے بھی خود غرض نہیں ہیں اپنے دود و دنگل شمن شمن رشتوں کا کوئی خاندان نہیں اٹھا کیں گے۔“

”تھیک۔ یو۔ خدایا تیرا احسان ہے کہ آج کی اس خود غرض دنیا میں ایسے بے غرض لوگ بھی موجود ہیں۔“ وہ مسکرایا اور لسٹ لے کر چل دیا۔

☆☆☆☆☆☆

آٹھ دن عبداللہ کے سبز کھیتوں میں گزار کر تازہ ہواؤں کا لطف اٹھا کر وہ سب حساس گمر لوٹ آئے۔ واپس آ کے گوہر نے دیکھا صیفہ بیگم اسے بہت پریشان سی نظر آئیں۔ وہ خود بھی پریشان ہوئی۔ دن تو سب میں گھر کر گزار گیا رات کو تھوڑی میسر آئی تو اس نے جھٹ پوچھ ڈالا۔

”اماں! آپ کا چہرہ بچھا بچھا سا ہے خیر تو ہے؟“

”کچھ نہیں۔ سب ٹھیک ہے تم نے ایسا محسوس کیا ہوگا۔ میں تو ویسی ہوں جیسی پہلے تھی۔“

”نہیں اماں! بات کچھ ہے ضرور۔“

”کوئی بات نہیں ہے۔ تم جانا جا کے سو رہو۔ جو ہر بتا رہی تھی عبداللہ پور میں کام کی ساری ذمہ داری تم پر تھی۔“

”تو کیا ہوا اماں! میں نے آٹھ دن کام کیا اور آپ جو ساری زندگی کرتی رہی ہیں اور کرتی ہیں کیا آپ نہیں چھٹکیں۔“

”میری بات اور ہے۔“

”انگرنہ کریں میری بات بھی وہی ہے جو آپ کی ہے۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ باہمت عورت ہی ہوں گی۔“

اماں آپ مجھے بات نہیں بتا میری۔“

”گوری تو بڑی باتیں مجھ سے چھپا سکتی ہے تو مجھے بھی حق سے تجھ سے باتیں چھپانے کا۔“

”میں نے اماں! میں نے آپ سے بات چھپائی ہے۔ خدا کی قسم میں۔ میں۔“

”مجھے بے حذر دکھ ہوا۔ بیٹی کی زندگی کی اتنی اہم بات اور ماں جانتی تک نہ ہو۔“

”نہیں بات اماں؟“

”گوری تو بڑا کٹر پارون کو جانتی ہے۔“

”جی تو کٹر پارون پارون واسطی۔ جی ہاں اماں میں انہیں جانتی ہوں۔“

”اراز سے پسند بھی کرتا ہے؟“

”جی۔ یہ کس نے کہا۔ ہرگز نہیں ایسا۔ میں انہیں میرا مطلب ہے اور جتنے بھی اچھے ہوں میں انہیں کیوں پسند کرتی ہوں۔“

”گوری! شبیر کے نام کی انگوٹھی چاہے تو نے میری مرضی پر پہنی تھی تجھے اس خیانت کا کوئی حق نہ تھا۔ تو نے مجھے بے حذر دکھ دیا ہے۔“

”آپ کیا کہہ رہی ہیں اماں۔ میں نے کوئی خیانت نہیں کی۔“

”گوری! تو دنیا کو بے وقوف بنا سکتی ہے ماں کو دھوکا نہیں دے سکتی اس بچے کو خرو میوں کے سوا ملا ہی کیا ہے۔ یہ باتی اس کا نصیب تھا۔ تیری طرف سے ملنا تھا۔“

”اماں! آپ صاف حائف بات کریں۔“

”کیا بتاؤں۔ یہ سب تیری خواہش پر ڈاکٹر پارون کے گھر والے تیرا رشتہ لائے ہیں۔“

”تیرا رشتہ۔ ڈاکٹر پارون کے گھر والے۔ اور نہیں اماں۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“

”اتنی جوشیال ہوا ہے وہ سبھی کی انگوٹھی تک ساتھ لائے تھے۔ میں بکا بکا رہ گئی۔“

”آپ نے ان سے کیا کہا؟ وہ کس سے ملے؟ کیا چچی اماں نے بھی انہیں دیکھا؟“

”میں تو ان کی بے عزتی کرنے کی تیار تھی۔ بس چچی اماں نے مجھے روک لیا کہ بیٹی والے گھر میں ہر شخص اس کے آس پاس آ سکتا ہے۔ وہ اس علاقے کے لوگ ہیں خبر ہوئی ہوگی کہ تمہاری بیٹی کنواری بیٹی ہے۔ چلے آئے ہتا کر مندرت کر لو۔ لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب لڑ کے کی بہن نے مجھے بتایا کہ تم اور ڈاکٹر پارون ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی خدا کا شکر ہے کہ چچی اماں اس وقت موجود نہ تھیں۔ میں تو روز میں گزرتی جاؤں۔“

وہ ہر سنے حیف ان ہتھ کے دل کو دیکھا۔

”تمہارے جانے کے دوسرے دن لندن سے ٹون آیا تھا۔ عدی کا۔ عدی شبیر کا دوست ہے نا۔ وہ بتا رہا تھا کہ کے تازہ زندہ ہیں۔ اسے ملنا چاہتے ہیں۔ جلد ہی پاکستان آئیں گے۔ کیا معلوم حالات کس رخ جارہے ہیں۔“

”شبیر کے نا۔ کہاں ہیں؟ کہاں رہتے ہیں؟ انہیں ہمارے گھر کی خبر کیسے ہوئی؟ وہ کب آرہے ہیں؟“

”نہیں اس سے کیا جب تمہیں شبیر سے ہی مطلب نہیں تو اس کے نا سے کیا واسطہ؟“

”اماں! آپ تو سنا مجھے غلط سمجھتی رہی ہیں۔ آپ کو کبھی مجھ پر اعتبار آئے گا ہی نہیں۔“

”سب بات چاہتا کر رہا۔ انہیں کیسے یہ جرات ہوئی اتنی بڑی بات کہنے کی تمہاری مرضی کے بغیر۔“

”راہ چتا کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے لگے کہ میں اسے پسند کرتی ہوں تو آپ تو وہ بھی مان لیں گی۔“

”اور اب جتنے عورت دار لوگ ہیں۔ اتنی بڑی بات ایسے نہیں کہہ سکتے۔ تمہاری رضا مندی کے بنا۔“





"گوری وہ لاکھ بڑے آدمی ہوں عزت دار ہوں۔ پر تو اتنا تو یاد رکھتی تیری تنہیال کے دشمن ہیں۔ مارے بھانڈے سے جتنا بھی بیگانہ ہو میں اسکا کم ظرف تو نہیں کہ اس کے دشمنوں سے رشتے جوڑتی پھروں۔ مجھے صاف صاف بتا دو۔ تیری خوشی کی خاطر تجھے ان کے حوالے کر کے میں تجھ سے ہرنا تا توڑ بھی سکتی ہوں۔ اچھا ہوا شہیر کے تنہیال کا پتلا گیا۔ یہاں کے لڑکے وہاں جا کر اپنا وطن بھول جاتے ہیں۔ شہیر کا تو گھر ہی وہاں پر ہوا بیچر میں جا کے بچتس پاس کے۔ کسی اچھی سی لڑکی کو بیوی بنا کے وہ سب دکھ بھول جائے گا۔"

"اماں! آپ کو کیا اور ہے۔ میری منہ بٹیر پتی کے بارے میں مجھے کہنے کا حق تو دوں۔ میری سنیں تو سہی۔"

"اب کچھ کہنے مننے کی ضرورت نہیں۔ اتار دو یہ انگوٹھی۔ جو تم نے مارے خوف کے سہارے ہی ہے ہاتھ میں۔ مگر کل بتی چچی اماں سے کہہ کر بات ختم کر دوں گی اور پر سوں ان لوگوں کو بلوا کر....."

"اماں! اماں! پلیز اماں!" وہ روہا ہی ہو گئی۔

"امت چلاؤ نفرت ہو گئی ہے مجھے تم سے۔ اسی لیے تو میں تمہاری اعلیٰ تعلیم کے خلاف تھی۔ اری کم بخت کیا کو تھی میرے ہیرے جیسے بچے میں؟ اور کیا خوبی ہے اس موئے ڈاکٹر پاروں واسطی میں جو تو نے اسے ٹھکرا کر....."

"اماں! خدا کے لیے آگے ایک لفظ بھی نہیں کہیے گا۔ ایک چھوٹی سی بات آپ سب سے چھپا کر میں نے؟ غلطی کی اس کا اعجاز آج ہو رہا ہے۔ کاش میں نے ماموں کو..... شہیر کو سب کچھ بتا دیا ہوتا آج یہ دن نہ دیکھ پڑتا آپ کی غلطی آپ کے دل کا آزار نہ ہتی۔"

اس نے ساری بات ماں کو بتا دی۔ یہاں تک کہ ماموں واسطی کی طرف سے ملنے والی پریشانیوں بھی۔ وہ سارے دکھ جو ہم دم و ہم راز سمجھتے ہوئے بھی وہ شہیر سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ کسی ننھی بچی کی طرح وہ صنفیہ تنظیم کا آغوش میں چھپی سکتی رہی۔

"اماں! شہیر سے میں بدگمان ضرور تھی مگر نہیں اور یہ سب کچھ ممانی سعیدہ بیگم کے ایما پر ان کی بیٹیوں نے آقا۔ اس کے فرضی معاشقوں کی کئی داستانیں انہوں نے میرے گوش گزار کی تھیں۔ میں نے شہیر کو کیا پایا میر۔ دل میں اس کی کتنی قدر ہے۔ اس سے صرف میں ہی آگاد ہوں۔"

"میں جان گئی ہوں جینی! ایک اتفاق کا سہارا لے کر ماموں واسطی شہیر کو آزار پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر نے ان سے صاف کہہ دیا تھا۔ گو ہر میرے بچنے کی نہین ہے اور میں یہ رشتہ مگر بھی نہیں توڑ سکتی۔ یہ بان تمہارے ابا تک بھی پہنچی ہے۔ امین واسطی نے اپنے کسی دوست کے ہاتھ پیغام بھجوایا ہے۔ انہوں نے مجھ صاف کہہ دیا ہے۔ کل ان لوگوں نے پٹرفون پر بات کی۔ وہ کہہ رہے تھے وہ کئی سال تک اس رشتے کا اقرار کئے ہیں۔ میں نے کہا شہیر کے تعلیم سے فارغ ہوتے ہی ہم شادی کر دیں گے۔"

"آپ نے ٹھیک کہا۔"

"مگر بھرا! مگر کوئی بات تھی تو تمہیں شہیر کو بتانا چاہیے تھی۔ مرد کا دل کسی نازک نفس آئینے سے کم نہیں ہوتا۔ اس میں ہال آ جائے تو ناکام رہتا ہے۔ شہیر تم سے محبت کرتا ہے گو کہ اس کی محبت عورت کا قیمتی اثاثہ ہے۔ اس محبت کے سہارے وہ زمانے نبر کے دکھ بے معنی جان کر زندگی بہت سے گزار سکتی ہے۔ محبت کے پودے پرورش اعتماد جیسے آب حیات سے ہی دیکھنی ہے۔"

"میں ڈرتی رہی اماں۔ میری بات ان دونوں کی ہنسی بڑھانے ہے۔ بس اسی سبب میں نے اسے کچھ نہ بتایا۔ اسی سبب اس نے مجھے کئی بار دھسکی آ میز ازم میں کہا کہ وہ مجھے اپنی بھانجی بنا کر ہی دم لے گا۔"

"گو ہر اتم اب لاہور نہ جاؤ۔ اس انکار سے برا بیچنے ہو کر دو کوئی اٹنی سیدھی حرکت نہ کر بیٹھے۔"

"اس کی کیا جرات ہے اماں۔ کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہوتا۔ شہیر ایک باہمت انسان کا نام ہے۔ اس کی پشت پر اس جیسے پتنگڑوں لڑکے ہیں۔ وہ مجھ پر ہی کیا یونہی لڑکی کی بر لڑکی پر اس کی عزت کی حفاظت کے لیے جانیں قربان کر سکتے ہیں۔ ماموں بھول کر بھی ایسا نہیں سوچ سکتا۔"

"تمہاری مرضی ہے در نہ میں تو یہی چاہوں گی ایم اے شہم۔ اے کو کوئی مارو اور گھر بیٹور ہو۔"

"اماں! میری اعلیٰ تعلیم میری ہی نہیں مٹی نونوں کی خوشی ہے اور ان میں سے ایک شہیر بھی ہے۔ اماں۔ شہیر کے تانا سے آپ کی بات بھی ہوئی۔ کیا کہا انہوں نے؟"

"نہیں بیٹے! میں نے بات نہیں کی۔ میں کیسے بات کر تی وہ انگریزی بولتے ہوں اسے۔ میری بات کیسے سمجھتے۔ آپ نے شہیر کو بتایا؟"

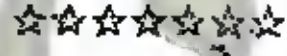
"نہیں۔"

"کیوں؟"

"خدی نے منع کیا تھا۔ یہاں آ کر وہ اسے سر پر اٹھو دینا گے۔"

"تم بھی اسے نہ بتانا۔ اور سنو اور بھی کوئی بات نہ بتانا۔ اس کا دل دکھ جائے گا۔"

"تو۔ کے ہانکی سویت مدر۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔"



نوشی اپنی گاڑی۔ پارکنگ لائٹ سے نکال رہی تھی۔ جب اس نے اعتبار زندگی گاڑی گیٹ پر رکھے دیکھی۔ گاڑی ریورس کر کے باہر لا کر رک گئی۔ گیٹ سے شہیر عسکری نکل رہا تھا۔ گرجوٹی سے اس کی طرف بڑھا۔

"ہنو اتیار۔"

"ہیو عسکری ڈیر بھی کیسے ہو؟"

"اللہ کے کرم سے خفیک ٹھاک آپ سنا گیا۔"

"میں۔ میرا کیا ہے۔ اس دن تم نے مدد کی ہوتی یا تو ابھی تک عبد اللہ پر کے پیشوں کی بھول بھلیوں میں مگ ہوتا۔"

"اوہ نو اتیار زندہ رہتی کے تے دیا تو تیرا فرض تھا۔ آپ میرے مہمان تھے۔"

"تمہاری مہمان نوازی اور رات کا کھانا بھلائے نہیں بھول سکتا۔ ویسے اس وقت تیرا کر رہے ہو؟"

"آف ہوں گھر جا رہا ہوں۔"

"یار۔ کچھ دیر کے لیے ہم غر بہوں کو بھی پوچھ لو۔"

شہیر ہنس دیا۔

"آپ غریب نہیں ہمارے محسن ہیں۔ اوہ شہیر اپنے محسنوں کو کبھی نہیں بھولتا۔ فرمائیے کیا حکم ہے؟"

"حکم نہیں اتجا۔ صاحب آپ بھی خاتمی اگیا جیہ ہیں۔ آپ پر کوئی کیسے قسم چلا سکتا ہے۔"

"چہر بھی۔"

"آج شام کا کھانا میر۔ ہ ساتھ۔ میرے کچھ غیر ملکی دوست آ رہے ہیں۔ شہیر عسکری جیسے دوست عزت افزائی کا سبب بن سکتے ہیں ان کے سامنے۔"



”اور۔ کسے نام؟“

”میری رات آٹھ بجے۔۔ پرل میں۔“

”ٹھیک ہے آ جاؤں گا اور کوئی حکم۔“ وہ مسکرایا۔

”اور جو بھی ہوگا پھر کبھی نہیں۔ اس وقت صرف اتنی سی بات ہے۔“

”ٹھیک ہے خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“

گاڑی آگے نکل گئی۔

”ہیلو مس ڈشٹی۔“

مامون گاڑی کی گھلی کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔

”بڑی بھڑکی ہیں کیا دیکھ رہی ہیں۔“

”ایک شخص کو دیکھ رہی تھی۔“

”کسے؟ شیر عسکری کو؟“

”نہیں۔“

”اتنی زبردست کو؟“

”آف کورس۔ پتو مجھے آج پانچنا۔ موصوف شیر عسکری کے دوست ہیں۔“

”دوستی کے لیے لوگ برابر کے لوگوں کو بلتے ہیں۔ ہم یہاں۔ ہم لوہا لوگوں کو تلاش کرتے ہیں۔“

چمن چمن۔ چمن۔ تکلیف دہ یادوں کے باب۔ چمن۔

”نوٹھی! آپ غصے میں ہیں۔“

”آپ نے سچ کہا۔“

”وجہ؟“

”اتنی زبردست کی وجہ ہے۔“

”اتنی زبرد۔“

”ہاں مامون واسطی۔ مجھے اسے قتل کرنا ہے۔ جان سے مارنا ہے ایک زیادتی کا حساب چکانا ہے۔ مجھے جانے

پڑا اس کا پیچھا کرنے دین۔“

”مس نوٹھی! میری بات سنیں۔“

”پھر سن لوں گی۔ فی الحال چارٹی ہوں۔ خدا حافظ۔“

نوٹھی اتنی زبرد اور شیر عسکری کو ایک ساتھ دیکھ کر حیران تھی۔ شیر اپنی سوزہ کی کالاک کھول رہا تھا۔ وہ گاڑی سے

تر کر اس کی طرف بڑھی۔ ہٹا سوچے سمجھے۔ اس سے مخاطب ہوئی۔

”.....“

”آپ شیر عسکری ہیں ناصدر یونین پنجاب یونیورسٹی۔“ چابی گھماتے شیر کے ہاتھ ایک دم رک گئے۔ اس

نے سڑک نوٹھی کی طرف دیکھا۔ ایک حسین ترین چہرہ شیر کے سامنے تھا۔

”جی..... جی ہاں۔ مگر آپ کی تعریف۔“

”مس نوشابہ ہوں۔“

”اود مس نوشابہ۔ یقیناً آپ میری یونیورسٹی فیلو ہیں کلاس میں تو میں نے کبھی آپ کو نہیں دیکھا۔“

”فرض کیا یونیورسٹی فیلو بھی نہ ہوں تب۔ تب کیا آپ پر میرا کوئی حق نہیں ہوگا۔ میرا مطلب ہے انسانیت کے

ناتے۔“

”نہیں۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں مومن و نیکم۔“

”مس شیر! میں کئی دنوں سے آپ کی تلاش میں تھی۔“ وہ اب بھی غصے میں تھی۔

”میری تلاش میں خیریت؟“

”آپ نے خود کیا ہے سنا بھی طلباء و طالبات کی خدمت کے لیے وقف کر دینے کا اعزاز کیا ہے نا۔“

”بے شک بے شک مگر آپ..... آپ کو خدا بخیر استہ۔ میرے خیال میں کوئی پرائیلم نہیں ہونا چاہیے۔“

”پرائیلم کئی طرح کے ہو سکتے ہیں مس شیر! صرف غریبی ہی نہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا تن پر عمدہ لباس ہو بیٹس

تیرت گاڑی کی چابی ہاتھ میں ہو۔ تو انسان کو کوئی پرائیلم نہیں ہوتا۔“

شیر نے جواب تک: سے ایک عام سی لڑکی سمجھ رہا تھا اس لہجے پر چونک کے اسے دیکھا۔

”مس نوشابہ! آپ مجھ سے ہر قسم کی بات بڑے اعتماد کے ساتھ کھل کر کر سکتی ہیں۔ آپ کی ابھی ابھی بات

نیچے پریشان کر رہی ہے۔“

اس نے اپنا رخ مکمل طور پر نوشابہ کی طرف موڑ دیا اور ہر تن گوش ہو گیا۔

”ابھی جس شخص سے آپ بات کر رہے تھے وہ آپ کا کیا ہے؟“

”ابھی۔ جس سے بات کر رہا تھا۔ آپ کا مطلب اتنی زبردست ہے۔ اتنی زبرد کو تو آپ بھی جانتی ہوں گی۔

تھ سے ایک سال سینئر تھا ابھی ان ہی دنوں اسٹڈی سے فارغ ہوا ہے۔ اس کا تعلق ہمارے آبائی علاقے سے

ہے۔ اور..... اور..... یہاں پر بھی میری اس سے اچھی پہلو ہائے ہے..... انکیشن کے دنوں میں میرے کبے بغیر

ان نے میری ممکن مدد کی اور اپنے اثر و رسوخ کو میری حمایت کے لیے استعمال کیا۔ سواں لحاظ سے میں کہہ سکتا

ہوں کہ یہی ازمانی فرینڈ۔“

”تو وہ آپ کا دوست ہے۔“ اس نے الفاظ جھا کے ادا کیے۔

”جی..... جی ہاں..... مگر..... مگر آپ۔ آپ اس انداز سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

”یہ بات مردانہ بتانے کی نہیں ہے۔“

”کون سی بات؟“ شیر اس کے تیوروں سے گھبرا گیا۔

”دیکھیے مس نوشابہ! اس سے قبل مجھ میں اور آپ میں کوئی عداوت نہیں ہے۔ ہم پہلی بار ایک دوسرے سے

ملے ہیں۔ میں آپ کو جانتا تک نہیں۔ آپ کا سسٹم کیا ہے یقیناً جانے بغیر مجھے خبر ہوگی بھی نہیں۔“

”میں بھی تو آپ کو بتانے کا ارادہ نہ کر آئی ہوں۔“

”ضرور بتائیے۔ مجھ سے جس حد تک ممکن ہو میں آپ کے کام آنے کی کوشش کروں گا۔“

”تو کیا آپ کے پاس اتنا وقت ہے۔ جو میری بات سن سکیں۔“

”وقت ہوتا کس نکالنا پڑتا ہے۔ خواہ کسی کام کے لیے کیوں نہ ہو۔ آپ ابھی اور اتنی وقت مجھ سے بات کر سکتی

"کیا مطلب؟ کیا ہمیں کھڑے کھڑے۔"

"اوہ آئی ایم سوری۔ جہاں بھی آپ چاہیں۔"

"آج رات آٹھ بجے آپ میرے گھر تشریف لے آئیے گا۔ یہ میرا کارڈ ہے۔" اس نے پرس سے چھوٹا سا وزیٹنگ کارڈ نکالا۔

"آج رات آٹھ بجے۔" وہ تھوڑا ہنچکچایا۔

"ارے آپ تو آٹھ بجے رات کے لیے مدعو ہیں۔ کیسے آسکیں گے اور وہ بھی ایک مظلوم کی طرف۔ آپ کو اپنے گھر سے دوست کے بلا دے پر جانا ہے۔ نہ جانے وہاں کیا پرگرام ہوگا۔ شباب و شراب کی کہیسی رنگین محفل ہوگی۔" وہ خفیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

"مس نوشابا آپ بہت ظلم الظالم استعمال کر رہی ہیں۔ امتیاز مند نے اپنے غیر ملکی دوستوں کو ڈنر پر بلایا ہے اور ایک دوست ہونے کے ناتے مجھے بھی انوائسٹ کر لیا ہے اور جو کچھ آپ کہہ رہی ہیں ایسی باتوں کا نر میرے خواہوں سے بھی کبھی نہیں ہوا۔ آپ کسی سنگین مسئلے سے دوچار ہیں تو میں اس سے معذرت کر سکتا ہوں۔ آپ کے کام آ کر مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔ بہ نسبت اس ڈنر میں شرکت کے۔ لیکن مس نوشابا آپ مظلوم ہیں اور امتیاز مند ایک گھبراہٹ سے بھرپور سٹیج ہے۔ آپ اپنی وضع قطع سے ایک خوشحال، محنت مند توانا..... اور مطمئن انسان نظر آ رہی ہیں اور امتیاز مند ایک تہذیب یافتہ بڑھن لکھا تو جوان ہے۔ جسے چند دن ہوئے صوبائی حکومت میں ایک اچھی جاب پر تعینات کیا گیا ہے۔ اس کا پتہ نہیں گراؤ گھر بھی چھوڑا ہے پھر وہ پیرا کیسے ہوگا؟"

"کیا آپ نے تو انا چہرہ کے پیچھے سسکیں پھاڑیں کبھی نہیں دیکھیں۔ کیا آپ کو خبر نہیں تہذیب کے لہجہ میں کتنی خبیثت رہیں چھپی ہوئی ہیں۔ میں ایک پتہ رورج ہوں اور امتیاز ایک خبیثت رورج۔ گھناؤنا انسان۔ اور زائد ہم دونوں کو دیکھ کر کوئی انداز نہیں پاسکتا۔"

شیران ان الفاظ میں کھنکھایا ہوا تھا۔ بات کچھ سمجھتا تھا۔ آئی تھی کچھ نہیں آئی تھی۔

"یون مت پلینز کیا آپ میرے ساتھ دو منٹ کہیں چلی کر بیٹھ سکتی ہیں۔ ہم تسلی سے باتیں کر سکیں گے۔"

"وائے نا۔"

اتنے میں گوہر گیت سے باہر آگئی تھی۔ چھلیاں ختم ہونے کے بعد یہ پہلا دن تھا۔ نوبر سٹی کا۔ وہ شہر سے جو خبر کے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ بلکہ آج از خود کہہ کر کچھ کہی ہوگی۔ میں لینے کو پروگرام بنانے چلی گئی۔ لیکن باہر نکل کر ایک لڑکی کے ساتھ اسے کھولتے دیکھ کر وہ سنجیدہ سی ہو گئی۔ رک کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ شاید کوئی ذہم مسئلہ تھا۔

"گوہر! تم عیسٰی سے گھر چلی جاؤ۔ مجھے ضروری کام ہے۔ فارغ از خود ہی آ جاؤں گا۔" اس نے گوہر پر کوزہ اتار دی تھی۔

"آپ اپنی گاڑی نہیں چھوڑ دیں۔" اس نے نوشابا کو مخاطب کیا۔

"میں مسز شہیر! آپ اپنی گاڑی میں چلیں! میں اپنی گاڑی میں آتی ہوں۔ آپ میرے پیچھے پیچھے چلیں۔" نوشابا ہنسنے لگی گوہر پر کوزہ کی توجہ نہ دے۔

گوہر ان کو متہ دیکھنے لگی بارنی بارنی۔ شہیر نے گاڑی کا لاک کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور اس نے بل گاڑی پہلی لڑکی کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ گوہر اس کی بے پروائی اور بے نیازی پر حیران و ششدر کھڑی ہوئی۔

"ہیلو مس گوہر!"

اس نے دائیں سمت دیکھا۔ اپنی گاڑی کے کھلے شیشے سے مامون واسطی اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ "آئیے! میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔ شہیر تو آج بے حد مصروف ہے۔ یونیورسٹی کی حسین ترین لڑکی کے ساتھ اپنا محنت کشی اس کی۔ آپ کو وہ کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے تو آپ کی طرف دیکھتا بھی گوارا نہ کیا۔" گوہر کے دل میں کانٹا تو پہلے ہی چبھا ہوا تھا مامون کی دُخس اعمازی پر وہ جل ہی گئی۔ "آپ کو جلتی پر تیل گرانے کا خوب ذہنک۔ آئیے مسز مامون واسطی! لیکن شہیر شہیر کی ساری لڑکیوں کے جلو میں دن رات بھی پھرتا رہے تب بھی مجھے آپ کی تحف کی ضرورت نہیں۔"

"مس گوہر! میں آپ کا دوست ہوں دشمن نہیں۔"

"کیسے دوست؟ آپ تو میری زندگی کے سکون کے درپے ہیں ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہیں۔ میرے گھر تک جا پہنچے ہیں۔ لیکن یاد رکھیے آپ کے کمروہ ارادے کبھی پاپ چینس تک نہ پہنچ سکیں گے۔" مسز ادیا اس کی مکروہ مسکراہٹ کو ہر کا دل دہلا گئی۔

"یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ فی الحال آپ تشریف لے آئیے تو میں آپ کو چھوڑ دوں۔"

گوہر بیچرٹی گرا آگے بڑھی اور سڑک پر جا کر ٹیکسی کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور اندر چڑھ گئی۔ شہیر کی سب سے نیازی مامون کی باتیں دونوں گہر کے دل میں شور مچانے لگیں۔

☆☆☆☆☆☆

"یو لپے جواب دیجیے کیا کہتا ہے آپ کا قانون انسانیت اس زیادتی کے بارے میں۔ کیا علی ہے اس ابھرن ڈا کون کی بات میری سنوئی ہوئی عصمت اور لٹا ہوا چینس واپس لے سکتی ہے۔" اس نے اپنی بات مکمل کر کے شہیر سے سوال کر ڈالا۔

"آپ نے اسی وقت رپورٹ روج کرائی ہوتی مس نوشابا یہ اسی وقت۔"

"آپ کا مطلب پولیس سے ہے؟"

"جی..... جی ہاں..... قانون میں ہر جرم کی سزا موجود ہے۔ وہ قانون کے ہاتھوں سے کڑی نہیں جاسکتا۔" "کیا آپ کا قانون اس کو پھانسی چڑھا کے اسے کھڑے کھڑے کر دیتا؟ کیا آپ کا قانون مجھے زمانے بھر میں زندہ سے بچا دیتا؟ کیا آپ کا قانون مجھے لوگوں کی تسخرانہ باتوں اور انتہائی انگلیوں سے بھالیتا؟ اس وقت اس بات کی اس حادثے کی مجھے میری گریڈ ما کو یا آپ کو خبر ہے تب سارے جہاں کو ہوتی۔ میں کسی کو مزہ دکھانے نہ ہاتھ تو اب بھی نہیں بچتی تب تو ایک بل نہ جی سکتی۔ میں جینا تو اب بھی نہیں چاہتی۔ اس نے میرے حسین اب میری معصوم آرزوئیں۔ میری خوب صورت انگلیں سب مٹا ڈالی ہیں۔ اس نے میری روح چل دی۔ میری عزت کو تاراج کر دیا ہے۔ وہ انسان نہیں شیطان ہے پولیس سے۔"

"بوسے کا ایک حل ہوتا ہے۔ مس۔ اور میں ہمیشہ مثبت حل کا قائل رہا ہوں۔ وہ میرا دوست ہے مگر اپنی بھی نہ اس کی خامیاں مجھے اچھا نہیں نظر آتیں۔ اگر وہ میرا بگرنی با رہی ہوتا تب بھی میرا دوست میری ہمدردی کے بجائے آپ کے ساتھ ہی ہوتی۔ اور میرا مشورہ ہوتا کہ آپ اس کے خلاف سنگین ترین جرم کا مقدمہ چلا لیں۔ تاکہ وہ اپنے کیسے کی سزا پاسکے۔"

شہیر نے اس کے چہرے پر ہنس کے ساتھ اخباروں کی سرخی بننے کا کوئی شوق نہیں لکھنا چاہتے ہیں



آپ۔ اس معاشرے کا کوئی فرد مجھے آکھ اٹھا کر عزت و احترام سے دیکھنا پسند نہ کرے۔ یہ خیر دور نہیں رہے۔  
 والے میرے پاپا تک بھی پہنچ جائے۔ اور..... اور..... اور زندگی بھر کوئی شریف انسان میرا ہاتھ تھامنے کو تیار نہ ہو  
 سکے۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہوا تو آپ کے ساتھ پیش آئے شہیر عسکری صاحب۔ آپ کو میرے پاپا ہونے کا شکر بھی  
 اندازہ نہیں۔ آپ کو میرے زخموں کی گہرائی کا احساس نہیں۔ میں اندر مر چکی ہوں۔ اور جو تھوڑی سی زندگی  
 ہوں۔ وہ صرف اور صرف اپنے اشرہ چلتی آگ کو بجھانے کے لیے۔"

"مس نو شاہ! آپ بہت زیادہ ڈپریشن میں ہیں! بہت ہی مایوس ہیں۔ زندگی اس سے بھی بڑے امتحان بنتی ہے۔  
 آدمی کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ بس آج اور ابھی امتیاز دہندے سے بات کرنا ہوں۔"

"کیسی بات؟"

"اس سانحے کی تلافی جس طرح بھی ممکن ہو وہ کرے۔"

"تلافی۔ ہونہہ! وہ طلبہ کے ساتھ سکرانی۔"

"ہر شے کی تلافی ممکن ہے شہیر عسکری۔ لیکن عصمت کا گویا ہر آبدار لٹ کی۔ ایس نہیں مل سکتا۔"

"مجھے سوچنے دیجیے۔"

"کیا سوچیں گے آپ۔"

"آپ کے سکون دل کی کوئی راہ۔"

"میرا سکون کبھی ٹوٹ کر نہیں آسکتا۔ مجھے زندگی میں کچھ عزیز تھا تو میں اپنا نسوانی وقار۔ اپنی عزت و عصمت  
 جس پر ہر شریف انفس لڑکی کو فخر ہوتا ہے۔ اب میرا سکون میری موت میں ہی ختم ہو گیا۔ بس اپنے ناکام  
 برنامہ پاپا کا قبضہ دھاڑتی۔ ان کے خواب میرے بارے میں بہت اونچے تھے۔ وہ کہتے تھے نوشی! میں تمہیں  
 ایک قابل رشک زندگی دینا چاہتا ہوں۔ جو کچھ میں نے باسکے کھو یا وہ عمر بھر تمہارا نصیب۔ دیکھنا چاہتا ہوں۔  
 شادی کے معاملے میں تم پر اپنی رائے مسلط نہیں کریں گا۔ لیکن اتنا ضرور چاہوں گا کہ تم شرافت اور شرم و حیا کی  
 عمدہ تفسیر بننا..... اور نسوانی وقار کے دائرے میں رہنے ہوئے اپنے لیے اچھا سا ساتھی چون لینا۔ مگر مسز شہیر اس کی  
 تو نوبت ہی نہ آئی۔ کوئی اچھا انسان پالنے سے قائل ہی نہیں ہوئے۔ سبھی کو لے کر تار پھانسی۔ مجھے جھوٹ اور جھوٹے  
 سے نفرت ہے۔ میں کسی ایسے انسان کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ کسی کو صرف اس نیت سے  
 دیکھ ہی لوں کہ زندگی کا ساتھی بنالوں۔ مسئلہ یہ ہے مسز شہیر عسکری کہ فرق قاتالی ہے۔ سبھی میں رہے ہیں پر  
 سکون نہ ہو پاؤں گی۔ ایک عورت اپنی ہی زندگی کی شروعات میں اپنے ساتھ ایک قیمتی تحفہ اپنی عزت و عصمت ہی  
 تو لے کر جاتی ہے..... میں..... میں..... میں....."

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ شہیر کو کسی نے جھجھوڑ کر رکھ دیا۔ نوشی کے سارے مسئلے اس کی سمجھ میں آنے لگے۔ "اگر  
 اس کی گویا کے ساتھ ایسا حادثہ پیش آ جائے تو۔"  
 وہ اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔

"مس نو شاہ! میں ابھی اور اسی وقت جا کر امتیاز سے بات کرتا ہوں۔"

"کیسی بات؟ میں نے آپ سے کہا تھا اس کی تلافی کی صورت ایک ہی صورت ہے۔"

"مس نو شاہ! میں وہ بہت ہی حیثیت سے نہیں بلکہ آپ کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اسے مجبور کروں گا کہ  
 وہ آپ سے شادی کرے۔"

"وہ مجھ سے شادی کرے۔" مسز شہیر نے قطعاً ناممکن لہجہ میں کہا۔ "میں اس کا قائل ہوں۔ میں اسے ایک پل کے  
 لیے ہر ذرا شرم نہیں کہہ سکتی۔ میرے خوابوں میں اس جیسے لوگوں کا گزرنے نہیں تھا شہیر عسکری میرے خواب بہت مخصوص  
 تھے۔ اور جو کچھ میں نے آپ کے بارے میں سنا ہے اُس وہ سچ ہے تو میرا آئیڈیل آپ تھے۔ آپ جیسا  
 جوان۔ بولے کیسے کیا میں اس قافلہ بھی..... کوئی نہیں کہتا اس بات کا حق! ختم کر دوں کہ میں..... میں آپ کو پسند  
 کرتی ہوں۔" شہیر نے ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس میں سے پانی پیا۔

"مس نو شاہ! میں انسانی جان کی اہمیت اور قدر و قیمت سے آگاہ ہوں انسانی قدروں کی پاسداری اپنا فرض  
 مانتا ہوں۔ آپ نے ایک ذمہ داری مجھ پر ڈال دی ہے۔ میں اسے بہت احسن طریقہ پورا کروں گا۔ جو کچھ  
 آپ نے مجھ بتایا ہے میں اس پر عمل کر دوں گا۔ اور..... آپ کے کام آنے کی کوشش کروں گا۔"

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"  
 "بس آپ کی ہر بات کا جواب ضرور دوں گا اب انشاء اللہ عسی صورت میں۔ اس وقت اجازت دیجیے۔ جلد  
 واپس آؤں گی۔"

وہ کمری سے اٹھ کھڑا ہوا۔ نوشی نے بھی ایسا چھوڑ دیا۔ دونوں کنبھیں سے باہر آ گئے۔  
 "میں بیٹا میں ہونا ہوں ہوش کے کون نمبر کا آپ کو علم ہوگا ایک نمبر میرے بچا کے نمبر کا ہے۔ وہ ہاں بھی  
 شہیر ہوں۔ آپ جس وقت جہاں چاہیں مجھ سے بات کر سکتی ہیں۔"

وہ ہیکل سے باہر آ گئے۔ کچھ دور کے۔ اس وقت نوشی نے دونوں کا یکساں نظر دیکھا اور گاڑی آگے بڑھانے لگا۔

شہیر ہیکل سے نکل کر ہوش کی طرف آ گیا۔ نوشی کی کہانی ہلکے اس کے قلبی بینک گراؤ نے شہیر کو ہلا کر رکھ دیا۔  
 ان دنوں پہر تک انہی اذیتوں کی بناء میں ایک خوبصورت خاتون نے شہیر کو ہلا کر رکھا۔ وہ ان لمحوں میں  
 اسے امتیاز کے کمرہ دو جوڑے کنبھیں آ رہی تھی۔

"زندگی میں ہم کتنے لوگوں سے ملتے ہیں۔ پہلی نظر میں ان کے بارے میں اتنی خوب صورت رائے قائم کر  
 لیتے ہیں اگر ان کے اصل کردار سے بے خبر رہتے ہیں اور کبھی کسی کی حقیقت سے آشنا ہو کر خود کتنے ٹوٹ پھوٹ  
 جاتے ہیں۔"

وہ اکثر دہرہ دہرہ کنبھیں کے ہاں ہی کھاتا تھا اور کبھی کبھی ان میں اجازت کھانے کے لیے اسے بلائے آیا۔  
 ان اس نے انکار کر دیا۔ اور بستر میں ہی پڑا رہا۔

اسے صرف تلافی کی فکر تھی۔ ایک لڑکی کے تقسیم نقصان کی تلافی کس صورت ممکن تھی۔ آخر کس صورت۔  
 یہی سوچ اسے پائل کر رہی تھی۔ کنبھیں کر رہی تھی۔ وہ گھبرا رہا تھا۔ بے چین ہو رہا تھا۔ اس کے ضمیر پر اس کے  
 دل و دماغ پر ایک بوجھ سا آن پڑا تھا۔ بس کی تھکوں میں گویا شہیر پھر رہی تھی۔ اس کے سامنے نو شاہ کا  
 ہاتھ تھا۔

دونوں ہی لڑکیاں تھیں۔

ایک پر اعتماد۔ پر سکون۔

دوسری ریزوریزہ کھری ٹوٹی۔

ایک متاع حیات۔ خوابوں کی ہم سفر۔

کی بات نہیں تو کم از کم اس سے دور ہو جانا تو بس میں ہے۔ میں یہ سب نہیں دیکھ سکتا۔ میں واپس گاؤں چلا جاؤں گا۔ صاحب آپ میرے صاحب سے کچھ نہ کہیے گا وہ مجھے جان سے مار دیں گے بہت ظالم ہیں وہ۔ ان کے سینے میں دلی کی جگہ پتھر رکھا ہے۔ میرے شریف مالک کو خدا جانے کن گناہوں کے بدلے ایسا رڈیل پینا دیا ہے۔

”اچھا..... خدا حافظ۔ تم بھی صاحب کو بہرا نہ مانتا۔“ شبیر نے فون رکھ دیا۔ نوشاپہ کی باتوں کی چٹائی مزید روشن ہو گئی۔ تو امتیاز رعد واقعی ایک خوبی بھینچا تھا۔ لوگوں کے ارمانوں کا قائل تھا۔ ایک بھیا تک مجرم تھا۔ خوب سورت لبا وہیں میں کبھی شخصیت روح ہی تھا۔

شبیر کی منہیاں بند ہو گئیں۔ جہزے بچھ گئے۔ امتیاز ابن لحات میں اس کے سامنے بیٹا تو وہ اس کا گلا گھونٹ دیتا۔

فون کی گھنٹی بجی۔ شبیر نے جو پاس ہی کھڑا تھا اٹھا ارادہ رسیور اٹھایا۔

”ہیلو.....“

”شبیر عسکری یہاں ہوں گے ان سے بات کرادیں۔“

کوہر کی بھاری بھاری آواز اس کے کانوں میں اتری۔

”بول رہا ہوں۔“

شبیر نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ اس وقت وہ کسی سے بات کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔ دوسری طرف خاموشی پھیل گئی۔

”گوہر..... گوہر ایلو نا کیا بات ہے؟“

”کیا بولوں؟ کیا کہوں؟ کہنے کو باقی رہ بھی کیا گیا ہے۔“

”ہاں گوہر! کہنے کو تو میرے پاس بھی کچھ نہیں رہ گیا۔ میرے سارے اصول رائگاں ہوئے ماری دینیں بے فائدگی۔ میں تو اب تھکے سفر میں ہی ہار گیا ہوں۔“

”ملاقات ہوئی؟“ گوہر نے دل کا غبار نکالا۔

”اور سب کچھ لٹ بھی گیا۔ اس نے اپنی لے میں کہا۔“

”پرانی عادت جو ہے لٹانے کی۔ فرق صرف یہ ہے کہ آج میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ داد دیتی ہوں۔“

”تو سب کچھ لٹ گیا؟“

”فکر نہ کریں۔ ایک ایک جگہ کی خبر رکھتے ہوئے بھی کوئی انتظامی کارروائی نہیں کروں گی میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس لیے..... اس لیے کہ میں نے تم سے محبت کی ہے شعی۔ حجاج کی محبت۔“

”ہر کی آواز بھرا آئی۔ شبیر کا دل کلنے لگا۔“

”اب جبکہ تمہیں ظلم ہوتی گیا ہے گوہر۔ تو میں تمہیں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”شبیر۔ شعی۔“ اس نے چیختے ہوئے اس کا نام لیا۔

”ہاں گوہر! تمہاری زندگی میں آنے کو بہت سے لوگ آجائیں گے۔ تمہیں سر آنکھوں پر ہٹائیں گے۔ مگر

دوسری بے سہارا ہتھے ریگزاروں کی تباہی سا فر۔

ایک گھنٹوں کے ساگر اس پر لٹا دینے والی۔

دوسری توجہ کی طلب گار۔

وہ عجب وہ رہا ہے پر تھا۔ منطقی طور پر اس سانحے کی کوئی ذمہ داری اس پر عاید نہ ہوتی تھی۔ لیکن جانے کیوں وہ خود کو مجرم سمجھنے لگا تھا۔ خود کو اس حادثے کا ذمہ دار سمجھنے لگا تھا۔

امتیاز بھی ایک نوجوان تھا اسی کی قبیل سے متعلق تھا۔ یہ نسبت اسے ذمہ دار ٹھہرائے جا رہی تھی۔

امتیاز تو واقعی تامل مردوں کی تھا۔ اس نے مرد ہونے کے زخم میں انتقام کے نام پر ایک لڑکی کو ناحق و تاراج کر دیا تھا۔

کیا تصویر تھی اس کا۔

صرف یہی کہا سے باعزت زندگی پسند تھی وہ شان اہر و تار سے جینا چاہتی تھی۔ وہ اپنے حسن و جوانی کو صرف اس مرد کے لیے وقف رکھنا چاہتی تھی جسے شوہر کی حیثیت سے اس کی زندگی میں آنا تھا۔ اس نے ایک دم اٹھ کر لاؤنج کا رخ کیا۔ چھوٹی سی ڈائری میں لکھا امتیاز کا نمبر وہ نہیں کیا اور ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

”ہیلو..... شبیر عسکری اسپیکنگ۔“

”ہیلو..... جناب میں ریکس بول رہا ہوں۔“

”کون ریکس..... یہ امتیاز زندگی کا نمبر ہے نا۔ بات کرنا میں ان سے۔“

”جی میں ان کا ملازم بول رہا ہوں۔ صاحب گھر نہیں ہیں۔“

”کیسے نہیں ہیں ابھی کچھ دیر قبل مجھے ملے تھے گھر کی طرف ہی جا رہے تھے۔“

”وہ جی..... صاحب اپنے کمرے میں ہیں۔“

”تو انہیں بتادو۔ میرا فون ہے۔“

”نہیں صاحب میں نہیں بتا سکتا۔“

”کیوں؟ مجھے ان سے ضرور ملنا کا ہے۔“

”سمجھیں نا صاحب! میں اس طرف نہیں جا سکتا۔“

”بھئی تم دروازہ ٹانگ کر رکھتے ہو۔ امتیاز کے کمرے میں بھی تو فون ہوگا۔“

”ہے۔ نہیں وہ اس کا سوچا آف کر دیتے ہیں اور..... اور نہیں کو۔ یہ در میں آنے کی اجازت بھی نہیں ہوتی۔“

”مسئلہ کیا ہے؟“

”صاحب جی..... آج بھی جب وہ آئے تھے ان کے ساتھ۔“

”کیا کیا تھا ان کے ساتھ۔“

”لڑکی صاحب؟“

”لڑکی..... کیسی لڑکی؟“

”بھئی تو کوئی لڑکی نہیں صاحب! منہ کیسے کھولیں یہاں ہر نئے دن نئی لڑکی آتی ہے۔“

”تمہیں انداز ہے تم کیا کہہ رہے ہو۔“

”جی صاحب۔ میں تو خود یہ نوکری چھوڑ کر جانے والا ہوں۔ گناہ کی دلدلی سے وہ جسے صاحب کو نکالنا ہے بس

نو شاہ کہہ مجھ جیسا انسان ہی عزت دے سے سکے گا۔" جانے کب اس نے رابلہ کا منہ دیا۔

شیر نے جھٹ نمبر ملا دیا۔ کسی نے ریسپونڈ کیا۔ اس نے نمبر ملا اور وہی بارہی ایسا ہوا۔

شیر نے گھڑی دیکھی۔ سہ پہر شام میں ڈھنڈے کوئی ساڑھے پانچ ہو چکے تھے اس نے امتیاز کا نمبر ملا دیا۔ گھنٹی بجتی رہی کسی نے فون ریسپونڈ نہیں کیا۔

وہ امتیاز کو بتانا چاہتا تھا کہ آج رات وہ اس کی دعوت پر ہونے نہ آسکے گا۔ پھر اس نے نو شاہ کے وزینٹک کارڈ پر لکھا اس کا نمبر دیکھا اور ڈائل کرنے لگا۔ فیبرل کیا۔ فون اٹھانے والی نو شاہ ہی تھی۔

"ہیلو میں نو شاہ۔ یہ میں ہوں شیر عسکری۔"

وہ ٹیلی فون کے ساتھ کھجی کر سہیوں میں ایک پر ٹک گیا۔ بارے ہوئے انسان کی طرح۔ "اودہ شیر صاحب آپ میں ابھی آپ کو رینگ کرنے والی تھی۔"

"نو شاہ! مجھے تھی آپ سے بہت سی ضرورتیں باقی کرنا ہیں۔"

نوٹی نے ایک طویل جھڈی سانس لی۔

"باتیں تو مجھے کرنا ہیں۔ شیر صاحب۔"

"آپ نے مجھ پر رحمہ سا کیا ہے اپنے راز کی نمانت داری کے قابل سمجھا ہے اپنے دکھ مجھ سے شیر کر کے ہیں آپ نے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے۔ میں نو شاہ میں نے دو تین گھنٹے کی مسلسل سوچا پھر کے بعد ایک فیصلہ کیا ہے۔"

"کیسا فیصلہ؟"

"آپ کو اپنانے کا۔ بڑی شان سے اپنی زندگی میں لانے کا۔ آپ اپنے والد صاحب کا ایڈریس اور فون نمبر مجھے دے دیں تاکہ میں اپنے پاپا سے کہہ کے بات آگے بڑھا سکوں۔ شادی ہو جانے کے دوسرے دن..... چاہے آپ اخبار کی سب سے بڑی سرخی بن جائیں۔ پوری دنیا آپ پر انگلیاں اٹھائے۔ مجھے کوئی گم نہیں ہوگا۔ میں خود مقدمے کا فریق ہوں بن کر امتیاز کا قانون کی عدالت میں شہیدوں گا۔"

"انصاف کی خاطر..... ہونہ..... شہید صاحب! آپ بہت بھولے اور مضمحل ہیں۔ قانون کہ سزا کے الفاظ بولنے کی خاطر شہوت چاہیے ہوتے ہیں گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے اور میرے پاس نہ شہوت ہے نہ گواہ۔ پھر کس برتے پر میں انصاف کی توقع رکھوں؟ مجھے پتا فیصلہ آپ کرنا ہوگا انصاف میں خود کرہوں کی اس سے بھی اور اپنی ذات سے بھی اور آپ..... آپ نے یہ فیصلہ کیوں کر لیا کہ آپ مجھ سے شادی کریں گے۔ میں جب سے گھر آئی ہوں۔ کئی لوگ فون پر مجھ سے بات کر چکے ہیں۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں اور لڑکے بھی۔ ہر ایک کا یہی کہنا تھا کہ..... میں آپ کا خیال پیچوز ہوں آپ کی زندگی میں کوئی رخصتہ نہ ڈالوں۔ ان سب کا خیال ہے کہ میں آپ پر

دورے ڈال رہی ہوں۔ شیر صاحب! وہ لڑکی آپ کی منگیتر ہے۔ جو آپ کی طرف آئی تھی۔ کیا اس کا نام گوہر ہے۔ بہت اچھی لگی وہ مجھے! میں اکثر اسے دیکھتی تھی لیکن جانتی تھی۔ کمال ہے اس کے ہوتے ہوئے آپ شہوت آفر کر رہے ہیں۔ اپنی زندگی بچھو! ان کر رہے ہیں۔ میں نے مان لیا شیر عسکری آپ واقعی ایک تقسیم انسان ہیں میں نے آج تک کسی سے محبت نہیں کی لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ محبت کرنے والے بدگمان بھی ہوتے ہیں۔ آپ کے ساتھ دیکھ کر جانے کیسے نیسے ہوسے اس کے دل میں آئے ہوں گے۔ آپ اسے بتا دیجیے۔ میں تو

ایک مجبور لڑکی ہوں۔ آپ کی شہرت مجھے آپ کے قریب لانا تھی۔ آپ لوگ دلوں کو جوڑتے کافر جانتے ہیں۔ پھر اگر آج تک اس نے آپ کو امتیاز کے ساتھ نہ دیکھا ہو تو شاید ایسا نہ تھی۔ میں شاید غصے میں آپ کی طرف لپٹی تھی۔ اور..... اور بعد میں آپ کو سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا اور اس خاطر کہ میں جو بھی ارادہ کر لیکن وہاں اس کی گہرائی اور حقیقت سے کوئی تعلق ہو۔ میری ہر بات کو وہ مٹا ہی کا کوڑا تو واقف حائل ہو۔

شیر عسکری۔ جب بھی ضرورت پڑے آپ میری کئی باتیں سن و سن پر نہیں کہتا سکتے ہیں۔ امتیاز کی زندگی کا پورا فلسفہ سنا سکتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں میں انہی مثال میں جاؤں کہ کوئی غنہ نہ۔ تہذیب کے لیاہارے میں لینا کوئی نئی کسی لڑکی کی عزت پامال کرنے سے قبل سوچے ضرور کہ اس کا انجام بھی امتیاز جیسا نہ ہو جائے میں نے پچھلے ہند ماہ میں ابراہارہ کو کسی کا سوچا وہ جیسا بھی کیا جس میں آپ کا اس کی خالی ہاتھ در پدہ ہو خوشی کا ہلکا سا سکہ بھی اس میں نہ ٹھہر سکے۔ میں سر جاتی اپنے ان دکھ سے نجات پا جاتی لیکن کیا مزا آتا۔ وہ خوشی بھی بڑے جانتے اور کتنی بہتروں کو کھل جاتا۔ کتنے ارمان تاریخ کر دیتا۔ میں اسے مار کے دفن کروں گی۔ یہ میرا عہد ہے میری زندگی کا مقصد ہے۔"

"نو شاہ! نو شاہ! آپ کو ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔"

"سوچنا تو بہت چھوٹی بات ہے شیر عسکری میں اس کا تہیہ کر رہی ہوں اور آپ میرے اس فیصلے کے گواہ ہوں گے۔ اپنی عصمت کے لٹ جانے پر میں اس کے سوا کوئی انتخاب نہ لے سکتی تھی یہ میرا پختہ ارادہ ہے جو کسی چٹان کے کسی پہاڑ کے سبب رک نہیں سکتا۔ بدل نہیں سکتا۔ شیر عسکری! اگر گوہر کا نمبر دے سکیں تو میں اس سے بات لڑاؤں۔"

"نہیں۔ نہیں آپ کسی سے کچھ نہیں کہیں گی۔ میں بھی فیصلہ کر چکا ہوں۔ میں آپ کو زندگی کی ساری خوشیاں دہیا کر کے آپ کے اس زخم پر مرہم رکھوں گا۔ اسے ٹھیک کروں گا۔ گوہر بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ آپ کی اور میری پیچوریوں کو بہت جلد سمجھ جائے گی۔"

نوٹی ہنس دی۔

"کتنے سادہ ہیں آپ ایک محروم تہنہ کو تہنی دے رہے ہیں۔ جس نے زندگی کے بھستان سے پناہ حاصل کر لیا ہے۔ اپنا پورا بائسٹر ہاتھ رکھا ہے۔ کیونکہ کا ارادہ رکھتا ہے شیر عسکری۔ میں نے آپ کو اپنا آئیڈیل کہتے ہوئے کوئی غلط بات نہیں سوچی تھی۔ بس اتنا سوچا تھا کہ ہمارے اسلامی معاشرے میں جیسے فوجوانوں کی ضرورت ہے۔ آپ ان کی ایک واضح تصویر ہیں۔ میں اتنی ظالم تو نہیں ہوں کہ دو محبت کرنے والوں کے درمیان دیوار بن جاؤں۔"

"محبت ایک بڑی قیمت بلکہ اصول احساس ہو جو ضرور ہوگا بلکہ ہے لیکن اخلاقی فرض اس سے کہیں گراں قدر ہے اگر میں ایمان ہوتی تو بات بھی تھی۔ سب کچھ جان کر زندگی کے تپتے صحرا میں آپ کو بھگنے کے لیے نہیں چھوڑتا۔ میں آپ کو کوئی زندگیوں کا مکمل اور پورا زندگی۔"

"آپ میری ہم جنس میری ہی ایک بہن کو پراگنا درفاقت میسر کریں گے۔ میری روح جھن پالے گی۔ شیر صاحب! میری تو بس اتنی التجا ہے کہ آپ میرے بارے میں میرے توسط سے آپ جو کچھ جان سکتے ہیں دو دن یا دو دن کو ضرور بتائیے گا۔ مرنے کے بعد مجھے اس کا تم نہیں ہوگا کہ کون مجھے اچھا جان رہا ہے اور کون برا۔"

"کس نو شاہ! میں ازناٹ فخر۔ آپ کسی کو کس بات نہیں کریں گی۔ پلیز۔ کسی بھی انسان کو دوسرے انسان کے



تک کی اجازت نہیں۔“

”اس کا جواب مجھے آپ کو یا کسی اور کو نہیں اپنے خدا کو دینا ہے اور میں خود ہی جواب دے دوں گی۔ آپ کو تیار ہونا ہے۔ ذر میں شرکت کے لیے۔ آپ تیار ہوں۔ دیر ہو جائے گی۔“ شہیرہ نے ذر کے ذکر پر جل سا گیا۔

”مجھے نہیں نکس جانا۔ میں بہت پریشان ہوں۔“

”مجھے افسوس ہے آپ کی پریشانی کا سبب میں ہوں۔“

”دیکھیں..... اس کی کوئی بات نہیں۔ میں پریشان ہوں! آپ کوئی غلط حرکت نہ کریں۔“

”میں نوشابہ میں اپنے معاملات کا انتہائی کسر اور سچا ہوں! میں۔ مجھ میں اتنی جرات ہے کہ میں امتیاز کا تمہیں بیان پکڑ سکوں اسے مجبور کر سکوں کہ وہ اپنا آپ قانون کے حوالے کر کے مقابلہ کرے۔ خود کو سزا کے لیے حاضر کر دے اور ایسا نہ کر سکا وہ تو وعدہ کرتا ہوں کہ اسے اپنے ہاتھوں ہی جان سے مار دوں گا۔ لیکن نوشابہ پلیز آپ اپنے پاپا کی واحد خوشی ہیں انہیں غم کے سمندر میں یوں ڈبکا مت دیجیے۔“

”شاید یہ ہم سب کا نصیب تھا شہیرہ عسکری۔ سب کا اور ہمیں اپنے اپنے نصیب کو ہر حال میں فیس کرنا ہوگا۔ ایک غیرت مند اپنے جسے کا بوجھ دوسروں پر ڈالنا بھی پسند نہیں کرتا۔ آپ پلیز مجھے ایسی کوئی راہ نہ دکھائیے جس پر چل کر میں اپنے ضمیر کے آگے سدا شرمندہ رہوں۔“

”آپ کو میری بات نہ مانا ہوگی۔ میں ابھی امتیاز کو نہیں کرتا ہوں۔ بات کرتا ہوں اس سے۔ آپ کو میرا انتظار کرنا ہوگا۔ آپ نے مجھے شریک راز کیا ہے تو میرا مان بھی رکھنا ہوگا آپ کو۔ کیا سمجھتی ہیں آپ کہ آپ کی یہ ایک غلط حرکت سدا میرے ضمیر کا بوجھ نہیں بنی رہے گی۔ میں خود کو آپ کا قاتل نہیں سمجھتا ہوں گا۔“

”اؤ کے شہیرہ عسکری اب اجازت دین مجھے بہت سے شہرہ رنی کام کرنا ہیں پھر بات ہوگی۔ خدا حافظ۔“

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ شہیرہ رابطہ جوڑے اس کی آواز کا سطر رہا لیکن اس نے دوبارہ ریسیور نہیں اٹھایا۔

شہیرہ نے چھینا کے رابطہ کا ۱۲ اور امتیاز کا بھر ملا۔ وہی ٹھنکی جانے کی آواز۔ وہی بے تیزی کی۔ کسی نے فون اٹینڈ کرنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ اس کے توڑنے کی کیا باتیں شہیرہ کے ذہن میں تجزی سے گردش کرنے لگیں۔ نفرت کے بگولے اخفا نون کی صورت اختیار کرنے لگے۔ امتیاز کا وجود اس طوفان میں گھر کر رہ گیا۔ شہیرہ جذباتی بھی تھا۔ جلد باز بھی۔ لیکن پھر بھی صاحب عقل و فہم ضرور تھا۔ وہ چاہتا تو امتیاز کو رات کے ڈر میں اس کے نیرنگی دوستوں کی موجودگی میں بے عزت کر سکتا تھا۔ اس کا کچا چٹھا کھول سکتا تھا۔ لیکن اس نے اپنی انسانیت کے نالے ایسا کرنا غیر مناسب جانا۔ پھر بھی جس کے طلوع ہونے کا انتظار کرنا اس کے لیے جان لیوا مرحلہ تھا۔ وہ لڑائی سے اپنے کمرے کی طرف آیا۔ گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

انسان کی زندگی بھی کیا غیب تماشا ہے۔ میں میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے اور کیسے ہو جاتا ہے۔ خود سے بھی خبر نہیں ہوتی۔ نکل ہی تو چینیوں کے ڈھیر سارے ہن گزار کے گوہر عیاشی نگر سے لڑا ہوا آئی تھی۔ وہ عہد اللہ پور میں پندرہ دن گزار کے لاہور واپس آ گیا تھا۔ کچھ ضرورتی کام پانے کے لیے یونین کے کئی اجلاسوں کو پایا۔ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اس کا میاں رہنا ضروری تھا اور ان ایام میں اس نے باقی بہت سارے ناگہی صدمہ جسمیں کام کر بھی ڈالے تھے۔

بچی آباؤ اجداد کے کہنوں کے کئی مسائل حل کروانے میں ان کی بھر پور مدد کی تھی۔ اپنی کلاس بلکہ پورٹی یونیورسٹی کے مشہور طلباء و طالبات کو اپنے ساتھ شامل کر کے۔ ان علاقوں میں چھٹیوں کے ایام غریبوں کے بچوں کو تعلیم

دینے میں گزار دیے تھے۔ پینے کے پانی کی فراہمی کے لیے بھاگ دوڑ کی تھی۔ بجلی کے کھبے لگوانے بجلی کی لائن پھیلوانی تھی۔ کئی بے روزگاروں کو مختلف سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں ان کی قابلیت و اہلیت کے مطابق نوکریاں دلا دی تھیں۔ کئی بے سہارا یتیم یا پندار لڑکیوں کی شادی کے لیے ان کے لواحقین کو حکومت سے جھینڈنے کے تحت امداد دلاوانے میں بھر پور ہنسائی کی تھی اور یہ سب کر کے اس نے بے حد سکون پایا تھا۔ گلیوں کے کٹڑوں پر کھڑے آوارہ منشی لڑکھانوں کو اپنی بیٹی اور تھنچ سے پاپاتوں سے کام پر لگایا تھا۔ یہ ساری سماجی خدمات انجام دے کر وہ بہت جگہ جھلکا ہو گیا تھا۔ ان مصروفیات میں دن تیزی سے گزر گئے تھے۔ یہاں تک کہ اکثر اسے گھر کو نون کرنے کی فرمت بھی نہیں ملتی تھی۔

اسے رات ہی گوبر کے آنے کی خبر ہو گئی تھی۔ وہ جان بوجھ کر اس سے ملنے نہیں گیا تھا۔ وہ اپنی بے تابی و بے قرارئی ان سب پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے رات ہی سوچ لیا تھا یونیورسٹی سے آف ہو کر وہ گوبر کا پتہ مانتھ لے جائے گا۔ ایک ساتھ کھانا کھاتے ہوئے سیر و سفر کرتے ہوئے وہ اپنے دل کی ساری باتیں سمونت سے اسے سنائے گا۔ وہ اسے بتا کر پہلے سے خبر دے کے خوات کے حسن میں کمی نہیں چاہتا تھا۔ چھٹی ہونے پر وہ ساری مصروفیات چھوڑ کر اپنے دوستوں سے معذرت کر کے باہر آ گیا تھا۔ جہاں آتے ہی پہلے اس کی ملاقات امتیاز سے ہوئی پھر نوشابہ سے۔ پیار تک کہ جب گوبر اسے نظر آئی تو نہ صرف وہ اسے نظر انداز کر کے نوشابہ کے ساتھ جانے پر مجبور تھا۔ بلکہ اس سے معذرت یا وضاحت کے دو لفظ بھی نہ کہہ سکا تھا۔ اسے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ ان دنوں نے ان دونوں کا چھٹا کیا تھا۔ اور ان کے ہونٹوں میں جانے کی ہنست نون کر کے گوبر کو بتا دینی تھی جس کے بعد گوبر کا خفا ہونا ایک فطری عمل تھا۔ پھر ماسوں و اشئی نے تو ہنسی کا غبار نکالنے کے لیے بلکہ رقابت کے احسان کے تحت یہ بات خاصی بڑھا چڑھا کر بیان کی تھی۔

گوبر اسے نوشابہ کے ساتھ خود لکھ چکی ہوتی تو وہ ایک میں گوبر مومن کی کسی بات پر اعتبار نہ کرتی۔ مگر اس نے نہ صرف دیکھا تھا بلکہ سنا بھی تھا اور یہ حقیقت تھی کہ وہ گوبر کو شہر نظر انداز کر کے نوشابہ کے ساتھ چلا گیا تھا۔ گوبر نے چین تو اسی وقت ہو گئی تھی۔ پورے ڈھائی ماہ بعد وہ لاہور آئی تھی۔ آتے ہی اس نے ہوشل کے نمبر پر رنگ کیا تھا۔ شہیرہ نے یہی جواب دیا تھا کہ وہ اس وقت مسروف ہے۔ یونیورسٹی میں ملاقات ہوگی وہ حسب معمول اتنے بیچ لینے بھی نہیں آیا تھا۔ پھر دن میں ایک بار بھی وہ اسے نہیں نظر نہیں آیا اور جب اس نے شہیرہ کو دیکھا تو وہ ایک فیبر لہری کے ساتھ گپ شپ میں نکلن ہو کر اس کے وجود سے انجان بنا ہوا تھا۔

وہ شہیرہ سے بات کرنے کے بعد اپنے کمرے میں بند ہوئی۔ شاید سب لوگ مسروف تھے۔ کسی نے اس کی عدم موجودگی کو محسوس ہی نہیں کیا۔ وہ جتنی بھی ذہین تھی کبھی کبھی بیادنی طور پر ایک عورت ہی تھی۔ جو چاہنے والے کی توجہ کی ہی بے اعتنائی ہی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر کسی اور کا ہو جائے اور پھر تم تو یہ تھا کہ شہیرہ نے اپنی بے وفائی کا اقرار کر لیا تھا۔ بلکہ اتنا تک بتا دیا تھا کہ نوشابہ کی محبت میں وہ اس قدر آگے بڑھ چکا ہے کہ نہ سے شہیرہ کی کافینلہ بھی کر چکا ہے۔

اپنی رہ بھی کیا گیا تھا۔ جس کی اصاحت وہ غلب کرتی اور بہتر نہ ہوا۔ جسے من گری اپنی تقدیر کا ماتم کرتی رہی ہے آواز دہنی رہی۔ اس نے باپ کی کوئی راہ باقی ہی نہ رہی تھی۔

”اؤ شہیرہ! چھ دن تم نے مکاری سے ہی کام لیا ہوتا مجھے دھوکا ہی دیتے رہتے۔ یوں ایک دم میرا مان تو نہ کرتے مجھے یہ دیکھنے کا نوسلہ تو کسی طور پر مل جاتا۔ نہیں شہیرہ نہیں تمہیں مجھ پر یوں ظلم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یوں



"کیا مطلب؟ کسی معقول بات ہے؟ اس کی کیا مجال ہے جو تمہارے ہوتے ہوئے وہ کسی اور کو منتخب کر لے۔"

"یہاں چکا سے ماموں جان!"

"پاپا سمیل۔ ابھی پوچھتا ہوں اس سے کہاں ہے وہ۔"

"ہوسٹل میں، دوکانہ اور نہیں۔" آمنہ خاتون نے فوراً کہا۔

"نامرالن میرے پاس اٹھلاؤ۔ میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔"

"ماموں! کیا آپ مجھے جھوٹا سمجھتے ہیں۔ شبیر نے خود ہی مجھے یہ بات بتائی ہے۔ میں نے اس لڑکی کو اپنی اتھوڑی سے شبیر کے ہمراہ رکھا ہے آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں انہوں نے آج دوپہر کے دو کھٹے اس کے ذمہ ہوں میں گزارے ہیں۔"

"ابھون والا۔" لولوا کا سر جھک گیا۔

"ہاسٹل سے آیا۔ انہوں نے ہوسٹل کا نمبر اٹل کیا۔ بڑی مشکل سے لائن ملی۔"

"یہ ان کے نے ان سے بات کی۔"

"شبیر سے بات کرنا سے بلاویں۔"

"میں ابھی زائد ہوں۔ شبیر تو کافی دیر سے اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ گاڑی لے کے گیا ہے۔ میرا خیال تھا گھر لے گیا ہوگا۔"

"اوہ ہوسٹل نہیں ہے۔ ابھی جس وقت بھی آئے اسے کہہ دینا فوراً ہماری طرف آئے۔"

"آل رائل سٹرا میں کہہ دوں گا۔"

"آمنہ! وہ اس وقت بھی ہوسٹل میں نہیں ہے۔ یہ وقت ہوسٹل سے باہر رہنے کا وقت نہیں۔"

"آپ خواہ مخواہ مگر منہ ہوئے جاتے ہیں۔ وہ لڑکی نہیں لڑکا ہے اور ہزاروں روگ اس نے اپنی جان کو لگا رکھے ہیں۔ کیا ہوگا کبھی کسی کام سے۔"

"آمنہ! جنہیں یوں اس کی طرف اشارہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ گورنمنٹ نہیں بول سکتی۔ اور یہ کیسی ہے تو میں اپنا۔" حانم بیگم نے کہا۔ وہیں گاہکوں کی جان کو کیسے مطمئن کروں گا۔ ساری دنیا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اس مشکل سے زیادہ صبر اور مجھے تھا۔ شبیر کے اچھا انسان ہونے کا سب سے زیادہ یقین مجھے تھا۔ میں ہی اس کا وکیل بننے سے ہی اس کی بڑھ چڑھ کے حمایت کی تھی۔ میں اس سے پوچھنے کا حق رکھتا ہوں مجھے اس سے پوچھنا ہے۔ مثال سے اس نے رشتے ناتوں کو مذاق سمجھ لیا ہے۔ اس نے اتنی بڑی بات گوہر سے کیسے کہہ دیا۔ کسی اور کو منتخب کر لینے کا حق اسے کس نے دیا ہے۔ مجھے اس سے پوچھنے دو۔ مگر گورنمنٹ کی انٹوشن مت اتارو۔ اس کی بات۔ اسے شادی کرنا ہوتی تم سے اور صرف تم سے۔ ہر حال میں۔"

"نہیں ماموں! آپ کو خبر ہی نہیں۔ وہ لڑکی ہے خراب صورت ہے۔ میں اس کے پاسک بھی نہیں۔"

"اوہ! یونان سنس! کیا سردی کی فرما ہے کہ برقی صورت کو دیکھ کر پرانی صورت قبول ہائے ہر اچھی چیز دیکھ کر بطور امنہ تم نے اسے اور تیری منزلوں کا راز افشاں ہو جائے۔ یہ طریقہ۔ اس نے شاید اپنے ذہن سے دیکھا ہے۔"

"میں سے وہ غربت کا اظہار کرتا ہے۔ جس کے طبع طریقوں کو ناپسند کرتا ہے۔ دراصل وہ ای کا پرتو نکالنا تو کتنے آسان ہے۔ لیکن چھپ رہے ہیں میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دین ہوگا۔"

نہیں کہ میں تو فریاد بھی نہ کر سکوں۔ تم جدا ہو تو تمہارے پیچھے بھاگ بھی نہ سکوں تم نے تو ایک دم اپنا فیصلہ منادیا۔ تم اسے ظالم تو بھی نہ تھے کبھی بھی نہیں۔ تمہیں تو دعویٰ ہے شبیر۔ ایک حساس دل کی ملکیت کا تم کسی کے معمولی سے دکھ پر تڑپ اٹھتے ہو۔ تم نے مجھ پر اتنا براستم کیوں ڈھا دیا۔"

کسی نے دروازہ بجا یا۔

"گورنمنٹ! آمنہ خاتون اسے پکار رہی تھیں۔"

"بھئی! کیا بات ہے دروازہ بند کر کے بستر پر پڑ گئی ہو۔ دوپہر کا کھانا بھی گول کر دیا تم نے۔ چلو آؤ۔ دل نواز میز پر بیٹھے ہیں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

"آمنہ! اس کی اجازت صورت دیکھ کر تیرا دل رو گیا۔"

"گورنمنٹ! تمہیں کیا ہوا خیر تو ہے۔ یہ کیا حالت ہو گئی ہے اپنی۔ صبح ایک دم ترنارہ اور فریٹس تھیں تم۔ یونیورسٹی سے آتے ہی یہ کیا ہو گیا۔"

"کچھ نہیں رانی! طبیعت خراب ہے۔"

"تو مجھے بتایا ہوتا۔ کوئی دوائی ہوتی۔ خیراب چلو کھانے میں تھوڑی سی تاخیر بھی تمہارے ماموں کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہے انہیں بتانا وہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔"

"آپ چلیں میں آ رہی ہوں۔" وہ ہاتھ ہم کی طرف پٹی گئی۔ آمنہ ڈاکٹر روم میں آ گئیں۔

سب نے باری باری گورنمنٹ سے اس کی افسردہ اور اضمحلال کا سبب پوچھا۔ وہ مناسب جواب دے کر کھانا بے شکل زہر مار کر تری رہی۔ سب آپس میں کہا باتیں کر رہے تھے اس کی خبر ہی نہ تھی۔ کھانا کھا لیا گیا۔

حسب معمول سب فی دلی لاؤنچ میں آ بیٹھے۔ گورنمنٹ کی اماں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ ایک دوسرے کو مسل رہے تھے۔ خطر اپنی انداز میں۔ لب کچھ کہنے کو بار بار ہوتے پھر بند ہو جاتے۔

"گورنمنٹ! خیریت پریشان لگ رہی ہو تم۔" لولوا نے کئی بار اسے بغور دیکھنے کے بعد پوچھنے شروع کیا۔

"کہہ دینی طبیعت خراب ہے۔" آمنہ نے فوراً بتایا۔

"سر میں درد ہے بخار ہے یا۔" آمنہ گورنمنٹ کی آنکھیں بھی سرخ ہو رہی ہیں۔ شبیر بچر چیک کرو اس کا بخار بھی ہو سکتا ہے۔"

"نہیں ماموں! مجھے بخار نہیں ہے۔" لولوا کہتے ہی اس کی آنکھیں ایک دم بھرا آئیں ایک دم اس نے آنکھیں پتھری کی آنکھ سے اتار کر ساتھ بیٹھی چلی اماں کی طرف بڑھاوی۔

"یہ کبھی چلی اماں؟"

"نہاں ہے؟"

"یہ آنکھیں آنکھوں کی ہیں اتار دینی گورنمنٹ! آمنہ خاتون نے صحت پوچھا۔"

"نہر کیا بات ہو گئی۔ جیسی جب تک شادی خاندان آبادی کا مرحلہ ختم ہوئی ہے نہیں ہوگا۔ آنکھوں کی شامت آتی رہے گی ہوگی ہوگی۔ وہاں کے ہرمیان پھر کوئی چیتلش۔ گورنمنٹ کی شامت مت اتارو۔ مجھے بات بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟"

"ماموں! یہ آنکھیں میرا نہیں اس لڑکی کا حق ہے جسے شبیر اپنے لیے منتخب کر چکے ہیں۔"



”آپ کو شیر سے بات کرنے سے پہلے اس کے بارے میں ایسی غلط رائے دینے کا کوئی حق نہیں۔“  
 ”ہاں بیٹے! پہلے اس سے تو پوچھو۔ کیا خبر اس نے ہنگی سے مذاق کیا ہو۔“ چچی اماں نے بھی ڈٹے لہجے میں اس کی حمایت کی۔

گوہر دل ہی دل میں رو دی۔

کاش یہ سب مذاق ہوتا لیکن یہ مذاق نہیں تھا۔

دلناز نے کئی بار ہوشل فون کیا اور ہر بار ہی وہ موجود نہ پایا گیا۔ رات کے بارہ بج گئے۔ گوہر کے لیے بستر کاتبوں کی بیچ بنا ہوا تھا۔ اس کا رواج روایاں بے چین و بے قرار تھا۔ شیر کے لیے اس کے دل میں نفرت تھی یا محبت اس کا اندازہ اسے خود بھی نہیں ہو رہا تھا۔

وہ محبت کے پھنکر جانے پر ماتم کناں تھی۔

یا ٹھکرائے جانے کے خم پر گر یہ وادری کر رہی تھی۔

اس کی بھی اسے خبر نہ تھی۔ بس روئے جاری تھی۔ بھی اٹھ کر بیٹھ جاتی کبھی لیٹ جاتی۔ کبھی دیوار سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو جاتی۔ لیکن کسی کل چھین نہ ملتا۔ لہجے کتنے طویل ہو گئے۔

وقت کتنا بوجھل ہو گیا تھا۔۔۔ وجود کے اندر باہر ایک آگ تپتی تھی اندر باہر کاٹنے آگ آئے تھے چھین میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دل واقعی ماتی ہے آپ کی مانند ترپ رہا تھا کسی کر وٹ چھین نہیں تھا۔ آنسو دل کا غبار ہلکا کرنے کا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں لیکن گوہر کے آنسو دل کی قتلین میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔

پوری رات وہ جاگتی رہی۔ صبح ہونے تک اس کی آنکھیں سرخ اٹکا رہی تھیں اور دماغ بوجھل آنکھوں کے پونے سوچ چکے تھے۔ کس نے اسے چگا یا نہیں یہاں تک کہ ساڑھے سات ہو گئے۔

باہر گاڑی کا ہارن بجانی مخصوص آواز نہیں۔

گوہر کے دل میں درد کی لہریں ہی اٹھیں۔ اس نے لپک کے کھڑکی کی طرف جانا چاہا۔ اس منکر کو دیکھنے کے لیے لیکن ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکی۔ وہاں بستر پر آگری۔

گوہر باقی۔ شیر بھائی کہہ رہے ہیں میرے جو جائے گی۔

عالمکے اس کے قرب کھڑکی تھی۔

”گڑیا! میں یونہی روٹی نہیں جا رہی۔ یہ شیر کو دے دو۔“

کافذ بات میں لے کر وہ بوڑھی چلا گئی۔

اس کا فذ بہ گوہر نے صرف ایک شعر لکھا تھا۔

سرف ایک شعر۔

شیر نے گاڑی واپس موڑتے ہوئے عالمکے کا دیا کافذ کھولا۔

برسوں میں تعلق بنتے ہیں لہجوں میں بھلا ڈونٹس کیسے

تو مجھ سے چھیننا چاہے تو دیوار امتداد میرے ہجرے

گوہر کی خوب صورت تحریر اس کے سامنے تھی۔ وہ ایک ہر دن تک مسکراہٹ لبوں پر سجا کر رہ گیا۔

اپنی متاع عزیز اس نے کتنی آسانی سے کھوئی تھی۔ جسے پانے میں ایک فڈ بل زمانہ لگا تھا۔ جس کا اختلاہ جیتنے کے لیے کتنی تکلیف و مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔ جس کی ہنگ ماں میں اتر جانے کا خواب ہی اس کے لیے بے حد

سہانا تھا۔ جس کے وجود کے گرد اس کی حیات کے سارے تانے پانے الجھ کر رہ گئے تھے۔ جس کے جنا سے سانس نے لینا بھی دشوار لگتا تھا۔ اسے ہل میں کھو دیا تھا اس نے۔

کتنا خوش تھا وہ اس کی محبت سراج کے ٹھیکیداروں کی نظر کرم سے محفوظ رہی تھی۔ کوئی دیوار ان دونوں کے اس حسین تعلق کے درمیان نہیں اٹھی تھی۔ کچھ اپنی ہی بے اعتنائیاں تھیں۔ کچھ اپنے ہی ناز و انداز تھے۔ کچھ اپنے ہی شلوے لگے تھے۔

ان سے خبر دانا ہونا مشکل نہ تھا۔ گوہر بہت جلد اس سے آشنا ہوئی پھر اس کے حراج سے آگاہ ہوئی۔ پھر اس کے اہلی کردار کی معترف اور ذمہ داروں پر مہربان ہوئی۔ ایک سے حراج ایک ہی طبیعت ایک سے مشغلے ایک

کی سوچ۔

دنیا میں اس کے سوا اور چاہیے بھی کیا تھا۔

شیر بھائیوں کا جیسا تھا۔ گوہر کے پاس اس کے لیے بھجوں کے ساگر تھے۔

شیر امین کا پیا بھر تھا۔ گوہر سیرا یا اس تھی۔ شیر سرتا یا ایشا تھا۔ گوہر ایشا پرست تھی۔ شیر ایک مشن تھا۔ گوہر اس کے ہمراہ تھی۔

وہ اس کے دکھاؤ رکھ کی ساتھی تھی۔

شیر کی خوشی اس کے نبیوں پر پھول کھلا دیتی۔

شیر کا دکھاؤ اسے افسردہ کر دیتا۔ وہ ہل میں مرتھا جاتی۔

وہ دونوں ایک سا سوچتے اور ایک سا عمل کرتے تھے۔

اسے آنسوؤں کو مولی جان کر چن کر اپنے دامن میں سما لینے کا فن آتا تھا۔ وہ مسکراہٹوں میں فریق مانی کا ساتھ دینے کا ڈھنگ جانتی تھی۔ جب سے وہ ایک دوسرے کے دل میں اترے تھے ایک لپک ڈنگل نہ سکے تھے۔

یہ کیسا ستم تھا۔ جو شیر نے اس پر کیا تھا۔ انجانے میں ہی اس پر وار کر دیا تھا۔

یہ کیسا ظلم تھا۔ جو اس نے گوہر پر ڈھا دیا تھا۔ لیکن وہ اور کتنا بھی کیا۔ انسانیت کا علم بلند رکھنے کے لیے اسے ایسا کرتا ہی تھا۔

وہ اب بھی اپنے نینیلے پر قائم تھا۔

اس نے ایک ہر پھر کا غم کے پرزے پر لکھے شعر کو پڑھا اور مسکرا دیا۔

”گوہر! تعلق نہ سنے کے لیے بھی نہیں بنتے۔ پھر بیاں درمیان میں آ جاتی ہیں۔ تمہیں تو بھولنے سے مجھے جانتے اور بھولنے کا۔ کیا تمہارے دل نے تمہیں نہیں بتایا کہ سنا بھوری نے شیر کی راہ رو کی ہوگی۔ ورنہ اس کے دل و جان

میں آباہ اس کی کائنات تم ہی تو ہو۔ جب تم میرے عظیم مقصد کو جان جاؤ گی۔ تو تم..... تم بھی قابل ہو جاؤ گی۔ میرے جذبہ ایثار کو سراہو گی میری قربانی کو اپنے پیار کا خراج تحسین دو گی۔ گوہر! میری زندگی! شیر کا مقصد

حیات انسانوں میں خوشیاں بانٹنا ہے۔ میں میں ہر امتحان میں پورا اترنا چاہتا ہوں۔ میں نوشاہی کے دل کے سارے بھروسے پر مہم رکھوں گا۔ نہتہ زندگی کی طرف نے آؤں گا۔ تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔ مجھے حوصلہ بخشنا

ہوگا۔ یونیورسٹی سے واپسی پر میں تم سے بات کروں گا۔ تمہاری غلامیوں کے سارے کائناتے چن لوں گا۔ احساس دفا سے تمہارا دامن بھر دوں گا۔ تم..... تم..... سب جان جاؤ گی۔ سب..... ابھی تو مجھے اس دیوانی لڑکی کو کسی انتہائی قدم سے روکنا ہے۔“ سوچوں سے نکلیں کے یونیورسٹی کے گیٹ پر اس نے گاڑی روکی۔ کسی نے اسے مخاطب کیا۔

"شیر عسکری" اپنی گاڑی کی ڈرائیو تک سین پر تیار نہ رہتا تھا۔

شیر کے دل و جان پر یہ مسکراہٹ بھگی بن کر گئی۔

اس نے گاڑی ڈاک کر کے سڑک پر کھڑی گاڑی کی طرف دیکھی وہ جواب میں کچھ کہہ بھی نہ پایا تھا کہ وہ دوبارہ گویا ہوا۔

"بھئی رات تم نے بہت انتظار کرایا۔ ہو سکتا ہے کہ تم نہیں ہو۔ ہم نے کھانا بہت لیٹ کھا لیا۔ ویسے بڑی عمر ہے تمہاری یاد۔ آئیں جا رہا تھا احتیاط اس طرف۔ آگیا شاید تم میں جاؤ۔ عسکری اہم تقرر دان دوست ہیں۔ تم جیسے سیریل کی قیمت سے بھی آگاہ ہیں۔"

شیر کی نظر یارکنگ ٹاٹ میں کھڑے ماسٹن واسٹی پر پڑی جو دونوں کو بخور دیکھ رہا تھا۔

"امتیاز ریل! مجھے تیسوٹ سے نفرت ہے۔ اور تم سرتا پائیک جھوٹ دو۔ اس نے نفرت انگیز لہجے میں اسے مطلع کیا۔

امتیاز جھٹ گاڑی سے نکل آیا۔

"کیا کہہ رہے ہو یاد؟"

"ہاں ہاں مجھے تم سے تمہارے کردار سے نفرت ہے تمہارا خوبصورت چہرہ اور انہی نقلیمی ڈگری ایک فریب کے سما کچھ نہیں۔ آگندہ مجھے قاطب کرنے کی کوشش مت کرنا۔ نہیں ہو تم میرے دوست ایسا گھٹیا انسان میرا دوست ہو سکتی نہیں سکتا۔"

"شیر عسکری!" وہ ہکا بکا کھڑا تھا۔ اچانک بڑبڑا کر رہ گیا۔ شیر کے پیچھے اس کے سینہ سامنے نو شاہ کھڑی تھی۔ شیر کی خبر نہ تھی۔

"اپنی ناپاک زبان پر شیر عسکری جیسے فرشتہ سیرت انسان کا نام لانے کے لیے تم زندہ ہی کب رہو گے امتیاز ریل۔ تمہیں موت ہی اس طرف منتقل لانی ہے۔"

شیر نے اس آواز پر مڑ کر دیکھا۔ اس میں اور نو شاہ ٹس نو ہنس فٹ کا فاصلہ تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں ریلو اور چمک رہا تھا۔

"نو شاہ! نو شاہ! پلیز نو شاہ۔"

"اسے زیادہ دن اس زمین پر چلنے کا حق نہیں تھا۔ اسے آج مرنا ہی ہے۔"

"ایک دہ تین چار۔"

پوری چار گولیاں اس نے کیے بعد ونگرے۔ امتیاز کے جوان جسم میں اتارہین۔ شیر پہلے امتیاز کی طرف پکا پھر نو شاہ کی طرف دوڑا نو شاہ کا ہاتھ اپنی پیشی کی طرف بڑھا۔

"نو شاہ! کیا کر رہی ہو۔ چھوڑو۔ یواہر۔" اس نے ریلو لہوا پہنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی۔

"نو شاہ! وہ زور سے چیخا۔

"تمہیں نہیں مت روکو مجھے۔ میری زندگی کا مقصد پورا ہو چکا اب جینا بے کار ہے۔ مجھے بھی مرنا ہے ابھی اور اسی وقت۔" شیر نے ہاتھ کی گرفت منسویط کرنا چاہی۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ریلو اور کارڈ دوسری جانب نہ کر سکا۔ نو شاہ کی انہی غرائز پر تھی۔ شیر کی قوت اس کے دفاع کے بجائے کوئی چلانے میں معاون بن گئی اور دونوں گولیاں اس کی پیشی چیرتی آگے نکل گئیں۔ گولی گلتے ہی اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ جڑ زمین ساخت

چمکدار قیمتی ریلو اور شیر کے ہاتھ میں آگیا اور نو شاہ نیچے زمین پر گر گئی۔ اس نے گھبرا کے امتیاز کی طرف دیکھا۔ وہ بھی زمین پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اور خون کے فوارے اس کے جسم سے ابل رہے تھے۔ فائر کی آواز پابروں طرف گونجی تھی۔

گیٹ پر موجود لوگ ان کی طرف بڑھ آئے۔ زمین و آسمان شیر کی نظروں میں گھومنے لگے۔ ایک طرف امتیاز تپ رہا تھا۔ دوسری طرف نو شاہ شیر کے لباس کو نو شاہ کا خون رنگین بنا چکا تھا۔ ریلو اور ہاتھ میں لیے وہ کا تپ رہا تھا۔

آنے والے لڑکے اور لڑکیاں دم بخور تھے۔ بھٹی بھٹی آنکھوں سے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔

پل فیر میں لوگوں کا ایک ہجوم ارہا روجع ہو گیا۔ شیر کی قوت گویائی کسی نے سلب کر دی تھی۔ قدم زمین نے جھک گئے تھے۔ وہ بولنے اور حرکت کرنے کے قابل ہی نہ رہا تھا۔

"قتل۔ قتل۔ قتل۔" چاروں طرف سے صدائیں آرہی تھیں۔ خوف زدہ آوازیں۔

"کس نے قتل کیا؟"

"کون سے اتنا سفاک در عہد۔"

"دوسرا سنے کھڑا ہے۔۔۔ یواہر ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہے۔"

"ادبہ۔ ارے گل ہونے والوں میں سے ایک لڑکی ہے۔ وہ دیکھو سامنے پڑی ہے۔" حیرت بھرے لہجے اس نے ارد گرد دیکھے۔

"یقیناً رات بہت کا کوئی چکر ہوگا۔ پیش میں آ کر دونوں کو مار ڈالا۔"

"ارے۔ یہ تو شیر ہے۔ شیر عسکری۔ کس کو قتل کر دیا اس نے؟"

"یہ ہماری یونیورسٹی کی یونین کا صدر ہے۔"

"شیر قتل کیسے کر سکتا ہے؟"

"یہ لڑکی کون ہے اور وہ لڑکا کون ہے؟"

"معاملہ کیا ہے؟"

بہانت بہانت کی بولیاں تھیں۔ مختلف آوازیں تھیں اور بے زبان شیر تھا۔

پولیس چشم زدن میں آ گئی۔ ہجوم کو چیرتی آگے بڑھی ریلو اور اپنے قریب رکھے۔ شیر نو شاہ کے پاس سر کاٹے بیٹھا تھا۔

"ارے۔ کھڑے ہو جاؤ۔"

انپلڑتے حشرات بھرے عمارت میں اسے پکڑا۔

ہاتھ کھڑا ہوا۔

"نگاہ دو پھکڑی۔ اس کے ہاتھ میں اور لے جاؤ وین کی طرف۔"

"سرا یہ قتل میں نے نہیں کیے۔" شیر کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ چہرے پر افسردگی بھری ستانت۔

"نارے قائل کی کہا کرتے ہیں۔ دن باڑ سے رواں وہاں سڑک پر دو دہرے قتل کے مرتکب ہو کر کہتے ہوتے ہیں نیا۔ چلو ہاتھ آگے کر دو۔"

شیر نے بے بسی کے ساتھ پولیس آفسر کو دیکھا۔

"آگے بڑھنا تم قائل ہو یا نہیں اس کا فیصلہ آگے جا کر ہوگا۔ ہمیں تو اپنا فرض پورا کرنا ہے۔"  
 اٹھکڑی رنگ کرا سیکڑنے سے آگے دھکیلا لوگ ہٹ گئے۔ لڑکے لڑکیاں مشتعل کھڑے تھے۔ فضا میں ہیبت  
 ناک سناٹا پھیل گیا تھا۔ سب خوف زدہ نظر آ رہے تھے۔ زبانیں گنگ ہو چکی تھیں۔  
 متعلقہ پولیس اسٹیشن چند منٹ کے فاصلے پر تھا۔ اسیکڑنے سے آتے ہی لاک اپ میں بند کر دیا۔

☆☆☆☆☆☆

نون کی کھنٹی تسلسل سے بھتی جا رہی تھی بچے اسکول جا چکے تھے۔ آمنہ بچن میں تھیں۔ گوہرا اپنے کمرے میں بیٹھی  
 اماں نے اسے آواز دی دس تو وہ بڑی مشکل سے پلٹی ہوئی کوریڈر میں آئی۔

"ہیلو۔"

"ہیلو میں۔ شبیر کا کلاس فیلو جا رہا ہوں۔ شبیر کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔"

"پولیس۔ شبیر کون مگر کیوں؟"

"اس نے قتل کر دیا ہے۔"

"کسے؟ کب؟"

"ایک لڑکی اور ایک لڑکے کو۔ یونیورسٹی کے گیٹ پر اس واقعے کو پورا آدھا گھنٹہ گزر چکا ہے۔ وہ اس وقت  
 حالات میں ہے۔ میں نے سوچا آپ لوگوں کو مطلع کر دوں۔"

"نہیں نہیں نہیں۔" ریسپونڈ کر نیل پر فون کر دیا۔ وہ یونیورسٹی کی طرف بھاگی۔ اس کی  
 چھین من کرا آمنہ خاتون باہر نکل آئیں۔

"گوہر۔ گوری کیا ہوا؟ خیر تو ہے۔"

"مامی..... مامی..... مامی۔"

وہ ان سے لپٹ کر اور زور سے چیخنے لگی۔

"مامی۔ شبیر نے قتل کر دیا۔ ایک لڑکے اور لڑکی کو مار ڈالا۔ وہ لاک اپ میں ہے۔"

"نگ۔ نگ کس نے بتایا تمہیں۔"

"بتائیں کس نے۔ ابھی ابھی کسی لڑکے نے فون کیا ہے۔"

"کہتا ہے وہ۔ شبیر ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ گوہر پانچ منٹ ہو۔ چیخو مت جو صلے سے کام لو۔  
 مجھے بتاؤ بات کیا ہے۔"

گوہر نے ساری بات بتادی۔

"میں یونیورسٹی فون کرتی ہوں ابھی پتا چل جائے گا۔ ہو سکتا ہے کسی نے مذاق میں ہی کہہ دیا ہو۔"

"نہیں مامی! اس شخص کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔"

"نہیں۔ نہیں۔ شبیر وہیں فون کرتی ہوں۔"

آمنہ خاتون کی انگلیاں نمبر نمبر ران تھیں لیکن ایک نمبر بھی صحیح نہ لگتا۔ ہاتھ جاتے جاتے کہاں رابطہ جا ملا۔ کئی بار  
 انہوں نے نمبر ہڈا کے کاٹا۔  
 "یونیورسٹی کا نمبر کیا ہے۔" وہ پوچھتی تھیں۔  
 گوہر نے نمبر بتایا۔ آمنہ خاتون نے پھر زور سے فون کیا۔

نمبر مصروف تھا۔ دل کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہاتھ خراب ہو رہی تھی۔  
 آمنہ خاتون نے جھٹ کسی سے پوچھا اور جواب پا کر وہ نیچے فرش پر پڑ پڑتی چلی گئیں۔ اس سے بے خبر کسان  
 کے ساتھ کھڑی گوہر بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی ہے۔ آمنہ خاتون کے لبوں سے آزاد ہونے والی چیخیں گھر کی  
 فضا میں ارتعاش پیدا کرتی چلی اماں کے کانوں تک بھی پہنچ گئیں۔

"اے بیو۔ کیا ہوا۔ کیا بات ہے۔ گوہر کہاں ہے کس کا ٹیلی فون تھا۔ اے خدا خیر کرنے یہ تم روز ہی ہو کیوں۔  
 آخر کیوں۔ اے یہ گوہر زمین پر کیوں پڑی ہے؟"

"چچی اماں۔ چچی اماں۔" آمنہ نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں ٹوٹی شاخوں کی مانند۔

"ہم لٹ گئے چچی اماں۔ شبیر نے دو انسانوں کا قتل کر دیا۔"

"قتل کس کا؟ کب؟ کیسے؟"

"ہاں چچی اس نے قتل کر دیا۔ یونیورسٹی کی ایک لڑکی اور لڑکے کو۔" چچی اماں بھی وہاں بیٹھ گئیں۔

"اوہ مہرے خدا۔ اس عمر میں بچھا ایسی خیر بھی سننا تھی۔ یہ جھوٹ ہوگا۔ شبیر کہاں ہے۔"

"پولیس اسے جائے دارعات سے پکڑ کے لے گئی ہے۔ میں نے خود یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے ابھی بات  
 کی ہے۔"

"آئے ہائے۔ ہمارے نصیب۔ دنواز کو خبر ہے۔ اے کوئی اسے تو بتاؤ۔ اسے تو خبر کرو۔ یہ کیا ہو گیا ہے۔ کیا  
 ہو رہا ہے۔" شور و غل سن کر گوہر بھی دوڑے چلے آئے۔

جائے گئیں نے دنواز کو خبر کی۔ چند لمحوں میں خبردار گرد بھی پھیل گئی۔ ساتھ کے گھروں کی خواتین جمع ہو گئیں۔ خبر  
 جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی۔ دنواز گھر آتے ہی کہیں پہنچے گئے۔

"اے بہو اس بچی کی خبر تو لو۔ پرانی امات ہے۔ جب سے بے ہوش پڑی ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو حیفہ کو کیا  
 جواب دیں گے۔ اے بچا کے نصیب ہی خراب تھے۔"

"چچی! میں کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"مجھے بتائیں سسر مسکری۔ کیا کہہ ہے۔ کون بے ہوش ہے۔"

"گوہر ذات سے پڑ گئی۔ یہ خبر سننے ہی بے ہوش ہو گئی۔ جانے کس نے اٹھا کے کمرے میں جا لایا ہے۔" چچی  
 اماں نے سسر عباسی کو بتایا۔

"میں دیکھتی ہوں۔ وہ اٹھ گئیں۔ وہ چار خواتین کی مدد سے اپنی گاڑی میں اسے ہاسپٹل لے گئیں۔ وہ ہنوز  
 بے ہوش تھی۔"

☆☆☆☆☆☆

"مہی..... مہی..... مام۔ کچھ سنا آپ نے۔ یہ دیکھیے۔ یہ دیکھیے شبیر بھائی۔ شبیر بھائی نے قتل کر دیا۔" شازبہ  
 اخبار ہاتھ میں لیے پھٹی پھٹی آنکھوں سمیت کہہ رہی تھی۔  
 "قتل کیسے؟"

"مہی! اخبار کی سب سے بڑی سرفی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی میں دوہرا قتل۔ پنجاب یونیورسٹی کی یونین کے صدر  
 شبیر شاہنواز مسکری نے دن و ہارے یونیورسٹی کی ایک لڑکی اور لڑکے کو قتل کر دیا۔"  
 سعید و تبسم نے اخبار شازبہ کے ہاتھ سے لے لیا۔

"شازی تمہارے پاپا کل کے ٹیکسٹری مئے ہیں اور اب تک نہیں لوئے۔"

"وہ یقیناً ہور گئے ہوں گے۔"

"ان کا کیا خیال تھا۔ یہ خبر ہم تک نہیں پہنچے گی۔ برے کڑوت کسی نہ بے انجام تک تو پہنچاتے ہی ہیں نا۔ اب جھٹلائیں تمہارے پاپا میری باتوں کو مجھے تو پہلے ہی خبر تھی۔ یہ لڑکا کسی روز ایسے ہی گل کھائے گا۔"

"ہی..... مکن..... اب کیا ہوگا۔" شازی کی آنکھوں میں خوف تھا۔ ارم بھی ان کے پاس آگئی۔

"کیا ہوا شازی۔ کیوں پریشان ہو؟"

شازی تے اخبار اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اوردانی گا؟۔ شیر بخائی نے دو ہراٹن کر دیا۔ اب کیا ہوگا ارم۔" شازیہ کے لہجے میں اندیشے سمٹے ہوئے

تھے۔ "وہ قتل کرنے والوں کو جو سزا ملتی ہے۔ وہی ملے گی اور کیا دیکھو۔" سعیدہ بیگم نے بے پروائی سے کہا۔

"نہیں نہیں مام۔ مام کیا بھائی کو پھانسی کی سزا ہو جائے گی۔ کیا وہ مر جائیں گے۔ نہیں نہیں ا خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔"

"وہ جہیں اتنی فکر کس بات کی ہے۔ جو جیسا کرتا ہے ویسا بھرتا ہے۔ اب دیکھوں گی کون اسے پھانسی چڑھنے سے بچاتا ہے۔" سعیدہ بیگم زخمی ناگن کی طرح لہرائیں۔

"مام..... مام....." شازیہ پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"مام.....؟ آپ ماں ہیں۔ آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ آخر بھائی ہمارے بھائی ہیں۔ ہمارے پاپا کے بیٹے ہیں۔ ان کی زندگی۔"

"شازی ڈونٹ بی سلی۔ می تے تو اتن نہیں کہا کہ وہ قتل جیسے جہا تک جرم کا ارتکاب کریں۔ نہ ہی مکن جج کی کرسی پہنچی ہیں جو شیر بھائی کا فیصلہ ان کے ہاتھ میں ہے۔ تم خواہ تو اہ ان کی وکالت نہ کرو۔ ٹی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ ان کے کچھن تو ہمیشہ سے ہی خراب تھے۔ اب گوری کو پتا چلا ہوگا لڑکی کی خاطر مرے۔ قتل جیسا جرم سرعام کر دیا۔ ہزاروں لڑکیوں کے پیچھے تو بھاگے ہیں۔ ایک نہ ایک دن تو کسی انجام تک پہنچنا ہی تھا۔" ارم بے حد شجیدہ تھی۔

"ارم پلیز یہ وقت ایسی باتیں کرنے کا نہیں ہے۔" شازی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کے دل میں درد کی کئی لہریں ایک ساتھ اتر گئی تھیں۔ کچھ بھی ہو شیر بھائی کی رگوں میں بھی وہی خون دہوز رہا تھا جو شازیہ کی رگوں میں تھا۔ اسے اپنی ماں اور بہن کی یہ سرد مہرنی بلکہ سنگدلی بہت مذیادہ برنی گئی تھی۔

"یہ جرم تم شیر بھائی یا شیر بھیا کر بیٹھے تو۔"

"ارے بھئی! بہت جتن لگی ہے تیری زبان۔ خدا تہ کرے میرے بیٹے ایسے کیوں کرنے لگے۔ وہ میرے بیٹے ہیں۔ ان کے جسم میں شریف اور خاندانی لیدر گزرتا ہے۔ شیر پر تو سارا اثہ ان کی ماں کا ہے۔ جانے نہیں عورت اٹھالایا تھا تمہارا باپ۔ جو ایسا بد بخت جینا نہیںوں میں نکھا گیا۔ جب بھی لایا باپ کے لیے کوئی مسیبت ہی لایا۔"

"بہر حال یہ وقت ایسا وقت نہیں ہے کہ ہم ان کی مددیں مانو کہ ان سے دور بیٹھد ہیں۔"

"کیجنت۔ جب ان کا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تو بہتر مطلب ہی کیا رہ گیا ہے ان سے۔" ارم نے پھر بڑکا۔

"تمہارے باپ کی غرض ہوگی تو جا کے فرمائیں گے۔ میں تو کہیں نہیں جانے کی۔" سعیدہ بیگم نے فیصلہ سنا لیا۔

شازیہ انسرود ہی ایک طرف جا بیٹھی۔ ارم خبر کی تحصیل پڑھنے لگی اور سعیدہ بیگم غلی فون پر جانے کس کو اطلاع دینے لگی۔

\*\*\*

"جو صلہ تمہیں میں مکن۔ خدا خدا کر کے سدرو آ پڑو بصحت ہوئی ہیں۔ آپ تے جو صلہ ہارا تو وہ پھر سے بیمار پڑ جائیں گے۔ وہ بارہ مجھ سے پوچھ چکی ہیں۔ میں نے انہیں آپ کے پاس آنے سے روکا ہوا ہے۔ ایک مصیبت اور ہے کہ پاکستان کے لیے میری نہیں مل پارہا۔ می آپ اپنے کمرے میں بند رہیں تو سب آجی کو زیادہ درد ہوگا۔ نہیں پاؤں کی۔ وہ آپ کے کمرے میں آ جائیں گی۔ آپ کی حالت دیکھ کر پریشان ہوں گی اور ہات جاتے ہی تن پڑے گی۔"

"عذرا۔ میری بیٹی۔ میری بیٹا رنی اجی۔ تم کیسے کہہ رہی ہو۔ میں ماں ہوں اجی۔ مجھے چین کسے آ سکتا ہے۔ ایک ماں ایسی تجرب کر کیسے بیٹو سکتی ہے۔ اس پر ہر مصیبت ہمارے یہاں آنے کی وجہ سے آئی ہے۔ عذرا۔ تم خود سوچو۔ خود..... یہ خبر ایسی ہے کہ میں پر سکون ہو کر بیٹھ جاؤں۔ نہیں نہیں مت روکو مجھے امت پابندی لگاؤ مجھ پر۔ مجھے رونے دو۔ مجھے اس نہ باونی پر ماتم کرتے ہو۔ سدرو اب ٹھیک ہے۔ میں یہاں ایک بیٹ نہیں رہوں گی۔ تمہارے بچے کے پان جانا چاہیے۔ مجھے جانا ہوگا۔ ہاں میرا ہر دست شیر۔ جانے کیسا ہوگا۔ کس حال میں ہوتا۔ اجی۔ میرا دل گواہی دیتا ہے۔ یہ کل اس نے نہیں کیے۔"

"مجھے آپ بہت جھوٹی ہیں۔ شیر نے یہ کل کھلے عام کیا ہے۔ بہت سے لوگوں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"اوہ میرے خدا۔ خدا جاتے ہو کیسے حالات۔ تمہے جہا سے اس منزل تک لے آئے۔ وہ ہڈ کا اور ہڈ کی کون تھے۔" اخبار نے تو بھئی لکھا ہے مکن رتا بہت کا معاملہ تھا۔"

"نہیں تمہیں میں نہیں دن سکتی۔ نہ باچا ایسا نہیں ہے نا۔"

"ہی۔ آپ گھر بیٹھے والی عورت ہیں آپ کو کیا ہر کے معاملوں کی کیا خبر۔"

"نندرا! ان کی عمر کا سارا نڈ سہن کافی حسد میرے ساتھ گزرتا ہے میں اس کی فطرت سے واقف ہوں وہ کسی ڈی۔ آ لو سوتی چھوٹے بیٹے کے حق میں بھی نہیں ہے۔"

"تو آپ کا کیا خیال ہے قتل صرف عالم لوٹ تن کرتے ہیں ہرگز نہیں۔ قتل چند لمحوں کا کھیل ہے۔ قصہ ہر ماں کے اندر موجود ہے۔ جذباتی لمحہ ہم سے کوئی سا جرم کرا سکتا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک قتل کر سکتا ہے۔ کسی نہ وقت کسی بھی لمحے۔ اور شیر کے جہم کے تو یہ جہاں گواہ ہوں گے کہ اس نے سرعام کل جیسا بھیانک عمل کیا۔"

نن: ارہ ققارہ نے نکلیں۔ نندرا نا موش بیٹھی ان کی کہ یہ زاری پرا پاؤں مسوتی رہی۔

"چاہے یہ کچا چنی ہو۔ قتل کا جرم اس نے کیا بھی: تو تو بھی ایک ماں کے دل سے اس کا پیار کیسے نکل سکتا ہے۔"

ہائے میرا شہیر۔ اجی۔ کیا وہ بھانسی چڑھ جائے گا۔ کیا اسے موت کی سزا ہو جائے گی۔ نہیں..... نہیں..... ایسا نہیں ہوگا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ شہیر۔ شہیر۔ شہیر میری جان میرے بچے تم کہاں ہو۔" وہ دیوانوں کی طرح شہیر کو آواز میں دے لگیں۔

عذرا نے آنکھیں تنہا م لیا۔

"مہی..... مہی..... خود کو سنبھالیں۔ آپ نے اپنی کیا حالت بنا لی ہے۔ آپ کو کچھ ہو گیا تو۔"

"مجھے ضرور کچھ ہو جانا چاہیے۔ نہیں جینا ہے مجھے۔ اتنا بڑا پہاڑ میں نہیں اٹھا سکتی۔ نہیں ہے مجھ میں اتنی طاقت اس خبر نے میرے دل کا سارا چین اور قرار چھین لیا ہے۔ جمال کہاں ہیں۔ ان سے کہو۔ مجھے ہر حال میں پاکستان جانا ہے۔ وہ نہیں کوشش کریں گے تو میں سفارت خانے والوں سے لٹا کروں گی۔ میں خود چلی جاؤں گی۔"

"نی..... ڈیڈی گئے تو ہیں۔ اسی کام سے ہی گئے ہیں۔"

"وہ کسی کو کوئی فکر نہیں ہے سب چین سے ہیں۔"

"مہی! آپ بہت زیادہ جذباتی ہو رہی ہیں۔ ڈیڈی کی پریشانی کا آپ کو اندازہ ہی نہیں۔ بس وہ خاموش رہتے ہیں مٹا نہیں کرتے اور آپ ہیں کہ ہمیں بھی بے حوصلہ کرنی ہیں۔"

"عذرا۔ کیا جاہتی ہو تم۔ آخر کیا۔ میں اس کا نام بھی نہ لوں۔ اسے یاد بھی نہ کروں۔ تمہیں کیا خبر۔ حوالات میں بند ہو کر چند لمحے گزارنا بھی مشکل ہوتا ہے اور وہ پورے دو دن سے حوالات میں ہے۔ خدا جانے کس حالی میں ہے۔ باپ اس کا تو ویسے بھی دشمن ہے اس کا۔ وہ تو اس کی ساری مصروفیات کے خلاف تھا۔ مجھے یقین ہے وہ اس کی معاونت کے لیے ہرگز نہیں آیا ہوگا۔ اور وہ بچھا۔ کیا شہرہ بھی..... وہ بھی اس کے ساتھ ہے یا نہیں۔"

عذرا خاموش ہو گئی۔

"عذرا۔ ڈاکٹر جہری کو بتایا تم نے؟"

"ڈیڈی نے بتایا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب اس طرف تو آئے ہی نہیں۔"

"عذرا کہاں ہے؟"

ڈیڈی کے ساتھ گیا ہے۔ وہ بھی بہت پریشان ہے۔ انکار بھائی الگ ٹکڑے میں ہیں۔ ڈیڈی صبح ان پر خفا ہو رہے تھے۔ فون نہیں مل رہا۔ تو اس میں انکار بھائی کا کیا قصور۔ آپ بھی ڈیڈی کی طرح خود بخود ہی ہم سے خفا ہو رہی ہیں۔ ایک دو دن میں آپ کے جانے کا بندوبست ہو جائے گا۔ میں اپنی فون کرتی ہوں ڈاکٹر صاحب کو لیکن ان کو بتانے سے کیا حاصل ہوگا۔ بے چارے پریشان ہوں گے ان کی زندگی میں پہلے بھی کوئی خرابی نہیں ہے۔"

"تو ان سے بات چھپا کر کیا ملے گا۔ آخر وہ ان کا تو اسما ہے۔ انہوں کے دکھ اٹھانے ہی پڑتے ہیں۔ بلکہ ان سے بات چھپا کر ہم زیادتی کریں گے۔ تم دیکھ لینا وہ کتنے خفا ہوں گے۔ وہ ایک بہادر انسان ہیں عذرا۔ ان بات کو بھی نہیں گھنیں گے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔ میں فون کر رہی ہوں۔" عذرا ان کے قریب سے اٹھ کر فون کی طرف بڑھی۔

جمال احمد اندر داخل ہوئے۔

"کیا ہوا؟ کچھ پتا چلا میرے شہیر کا۔"

وہ بے تابی سے آگے بڑھیں۔

"پتا واں مت ہو۔ بس پاکستان چلنے کی تیاری کرو۔ ہم سب لوگ ہی چل رہے ہیں۔ وہاں پہنچ کر ہی کچھ معلوم ہو سکے گا۔ انکار کو رہا تھا کل کی قلامیت سے ہم جا سکتے تھے۔"

"شکر سے خدایا۔ جمال! میں شہیر سے مل سکوں گی نا۔"

"میں خود بھی بے حد پریشان ہوں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس تمہارے مزید کسی سوال کا کوئی جواب نہیں۔ پلیز مجھے پریشان مت کرو۔" جمال احمد اٹھ اٹھے سے لگ رہے تھے۔ عذرا بھی کمرے میں آ پہنچا۔

"مہی آپ کی دعائیں پوری ہوتی ہیں۔ کل ہم لوگ چل رہے ہیں۔ عذرا۔ بھئی جلدی سے سامان کی پیکنگ شروع کر دو۔ مہی..... جب سے میں نے یہ خبر سنی ہے ایک پل کو بھی چین نہ پاسکا۔ یہ سب آخر کیا ہے میں سمجھ ہی نہیں پڑ رہا۔ خدا کرے یہ سب ایک الزام سے زیادہ کچھ نہ ہو۔ خدا کرے شہیر نے ایسے ہیسا تک جرم کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ خدا کرے۔" وہ صوفے پر ٹپک گیا۔

"مہی! ڈیڈی کہہ رہے تھے ہمیں یہ خبر ڈاکٹر جہری سے نہیں چھپانا چاہیے۔ خدا نخواستہ بات بڑھ گئی تو وہ ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔ آخر وہ اس کے نانا ہیں۔"

"عذرا! انہیں رنگ کر کے بتانے لگی ہے جاؤ تم بات کر لو۔"

"ٹھیک ہے۔ بلکہ میں ان کے ہاں چلا جاتا ہوں۔"

"عذرا۔ عذرا۔ اگر ہنر نہ مل سکا ہو تو فون رکھ دو۔ میں ان کے پاس خود جا رہا ہوں۔" عذرا نے زور سے آواز دی۔

"عذرا میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔ اس گھر کی خاموشی سے مجھے خوف آنے لگا ہے۔" عذرا نے سامنے آ کر اس کی بائیں ہاتھ تھام لی۔

"عذرا۔ یہ سب کیا ہے۔ کیا تم سوچ سکتے ہو شہیر نے سرعام دو انسانوں کو قتل کر دیا ہوگا۔"

"نہیں تو۔ کچھ بھی سوچنے سے قاصر ہوں۔ میں خود بھی بے حد پریشان ہوں۔ سخت بے چین ہوں۔ ان لمحوں میں وہ کہاں ہوگا۔ کیسا ہوگا۔ کیا سچا ہوگا۔ یہ ساری فکریں میرے اندر الجھل پچائے ہوئے ہیں۔ وہ مجھے کتنا عزیز ہے اس کی خبر مجھے آج ہوئی ہے۔"

"عذرا! ہم جن لوگوں سے صحبت کرتے ہیں۔ ان سے کسی طور نفرت نہیں کر سکتے۔ یہ سن کر بھی کہ وہ انسانی جانوں کا قائل ہے مجھے اس سے ذرا برابر نفرت نہیں ہوتی۔ اس کی زندگی ہم سب کے لیے کتنی ضروری ہے۔"

"ہاں عذرا..... تم سچ کہہ رہی ہو۔ نفرت تو میرے دل میں بھی پیدا نہیں ہوئی اور گی کو دیکھنا ہے تم نے۔ مجھے تو زرتکے لگا ہے۔ شہیر سے جہاں کا دکھ ہماری ہی کہ ہم..... چین ہی نہ لے۔"

"خدا نہ کرے۔ عذرا! تم پاکستان جاتے ہی اس سے ملو گے۔"

"ظاہر ہے۔ ملنا تو ناگزیر ہے۔"

"..... مگر..... میں..... میں کیسے ملوں گی اس سے۔ نہیں عذرا! مجھ میں اسے دیکھنے کی تاب نہیں۔"

"عذرا! کیا اسے پھانسی کی سزا ملے گی۔ عذرا! کیا وہ مر جائے گا۔ عذرا! کسی انسان کو اس احساس کے ساتھ دیکھنا کہ چند دنوں بعد اسے نہیں دیکھ سکیں گے۔ یہ کیا مشکل ترین کام ہے۔ میں اسے نہیں دیکھوں گی میں اس سے نہیں

نہیں گی۔ میرا دل پھٹ جائے گا۔"

"..... سارے فیصلے اس سب کے ہیں جو اس کائنات کا مالک ہے۔ وہی ہوگا جو اسے منظور ہوگا۔ انسان کو

ہمت اور جو جملے سے کام لےنا چاہیے۔

"غدنی! اس کے خواب کتنے حسین اور دلکش تھے۔ وہ تو انسانوں کو زندگیاں دینے کی بات کرتا تھا تو شگوبہ زندگیاں۔ اس نے کیسے کسی کو روایا۔ کیسے؟ آئی کاٹ بلیو۔ میں یقین نہیں کر سکتی۔"

"ہمارے سارے سوالوں کا جواب صرف اسی کے پاس ہے۔ وہ اسی ہمیں بتا سکتا ہے کہ یہ سب کیا ہے۔ ورنہ اخباروں نے تو کئی کہانیاں گھڑی ہیں۔" غدنی نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

"چچی اماں..... بہت ہو چکی۔ اب نہ ہوگی۔ آپ کی حمایت نے میری آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دی۔ میں محبت کی نینک لگا کر دیکھتا رہا۔ عیب تو مجھے کبھی نظر ہی نہ آئے۔ میں سخت شرمندہ ہوں۔ یہ آپ نے عام بھائی سے۔ میں ان دونوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ میرے پاس اپنے دفاع کے لیے کوئی ہتھیار نہیں ہے میں اس نالائق کی کوئی حمایت اب نہیں کر سکتا۔ عام بھائی کو اختیار ہے نئی کے بارے میں جو بھی فیصلہ کریں اس کی زندگی جس انداز سے سنواریں۔ میں اس کا ذمہ نہیں دیکھتی۔"

"ہم تو سدا شاہنواز کو قصور وار گردانتے آئے شاہنواز آخراپ ہیں بے سبب نفرت کیسے کر سکتے تھے۔ یہی لکھن اتوں پہلے نظر آتے ہوں گے۔ آخر کچھ عرصہ وہ ان کے پاس آئی تو رہا ہے۔" عام نے جھٹ کہا۔  
صغیر چپ چاپ بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔ انہوں نے کسی بات میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ یونے کو کچھ کہنے کو وہ ہی کیا گیا تھا جو وہ کہیں۔ شہیر نے تو ساری حدیں بھلا گئی تھیں۔

"عام بھائی۔ یہ تو چچی نے رات کو ہمیں بتایا۔ اگر وہ نہ بتاتی تو میں اب بھی یہی کہہ رہا ہوتا کہ شہیر بے گناہ ہے۔"

"کیا بتایا تھا اس نے؟" چچی نے پوچھا۔

"آپ نہیں سن رہی تھیں کیا۔ انٹوئی انار کو وہ آپ ہی کو تو دے رہی تھی۔" دلنواز ہنڑک اٹھے۔

"آم! تم نے نہیں سنا تھا۔"

آم نے بھی سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ دلنواز کے سخت نچوڑ چوک اٹھیں۔

"جی ہاں..... شہیر نے مہر کو بتایا تھا کہ وہ اس کے بجائے کسی اور لڑکی سے شادی کرے گا۔"

"کسی اور سے کیوں؟ اس لڑکی سے جس کو اس نے جان سے مار دیا۔" دلنواز تو کھول رہے تھے غصے سے۔

عام اور صغیر نے ایک دم انہیں دیکھا۔

"آپ کو تو خبر ہے عام بھائی اسی لڑکیاں کب کسی ایک کی ہوتی ہیں۔ حسن کا جال لے کر شہیر جیسے بے ہوشوں کو قدم قدم پر پھیلتی چرتی ہیں۔ اس نے کسی اور کے ساتھ دیکھا برواشت نہ کر سکا اور مار دیا۔"

"چھو بھی کرتا پھرے وہ۔ جس تم جہاں پاک خدا کا شکر ہے کہ ہماری بیٹی اس کے چنگل سے نکل آئی۔ ان شادی کے بعد یہ سب کچھ ہوتا تو۔" عام بہت دور کی سوچ رہے تھے۔ خدا کا شکر ادا کر رہے تھے۔

"ہاں جی۔ میں بھی خدا کا شکر گزار ہوں یہ مذہب داری تو مجھ پر ہی غاید ہوتی۔ میں آپ لوگوں کو منہ دکھانے سے قابل نہ رہتا۔ گوہر بہت عیاری پنکی ہے انلا کردار کی شریف انفس بیٹی ہے۔ اس کی بربادی مجھے چین نہ لیتا۔"

"دلنواز۔ میں نے فیصلہ کیا ہے گوہر کو اپنے ساتھ لے جانے کا۔ اس نے اس حادثے کا بہت زیادہ اثر لیا۔"

ہے۔ چپ چاپ بیٹھی خنداں میں گھورتی رہتی ہے۔"

"میں آپ کو روک نہیں سکا عام بھائی۔ میں تو اسے یہاں اعلیٰ تعلیم کی خاطر لایا تھا مجھے کیا خبر تھی وہ بے چاری میرے گھر سے اتنا بڑا تم لے کے جائے گی۔ آپ نے جالیے۔ میرا خیال ہے اس کی بہتری اسی میں ہے۔" دلنواز رونے لگے۔

"اے دلنواز بیٹے۔ شاہنواز نے کیا کہا ہے شہیر کے بارے میں۔" چچی اماں نے پراسید انداز میں پوچھا۔

"کیا کہتے وہ؟ جو کہا ٹھیک ہی کہا۔"

"کب آئے گا وہ۔"

"معاف کیجئے چچی اماں! ام از تم شہیر کے لیے تو ہرگز نہیں آئیں گے انہیں ضرورت بھی کیا ہے۔ ایسے ناخوار بننے کا پشت بنا ہی کرنے کی۔" آمنہ جھٹ اس کے دفاع میں بولیں پڑیں۔

"آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ کچھ بھی ہو۔ وہ ان کے وارث تو ہم لوگ ہی ہیں نا۔ اس دنیا میں یہ پہلا قتل نہیں ہوا ہزاروں لوگ ہزاروں لوگوں کو اس سے پہلے بھی قتل کر چکے ہیں۔ یہ ایک نلایا فصل ہے لیکن انسان ہی کیا کرتے ہیں۔ آج پانچ دن ہو گئے ہیں۔ آپ سنے ان کی خبر گیری تک نہیں کی۔ ایک بار ان کے پاس نہیں گئے۔ اس سے پوچھا تک نہیں۔"

"مجھے ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ بدنامی اور رسوائی جو مجھے اور میرے خاندان کو مل چکی ہے کافی ہے۔ ہزار خاندان قاتلوں کا خاندان نہیں ہے۔ تم ہمارے خاندان کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو۔ اس کی شجہ حرمت کسی نے کی ہو تو۔ تمہیں خبر ہے میں نے ان دونوں گھر سے قدم باہر نہیں رکھا۔ اخباری نمائندے شکاری کتوں کی طرح بوسہ تھتے پھر رہے ہیں۔ میں نے اسی خوف سے ٹیلی فون ریسو کرنا بند کر دیا ہے۔ میں کیوں جاؤں۔ کس لیے؟ لوگوں کی نظروں کے تیر کھانے۔ انجانوں کو بھی یہ بتانے کہ میں اس لعین قاتل کا بیچا ہوں ہرگز نہیں۔"

آم اتنا سخت جواب سن کر خاموش ہو گئیں۔

"بیٹا خطائیں انسان کرتا ہے۔ وہ بھی ایک انسان ہے غصے میں آدمی کو پتہ نہیں سوجھتا۔"

"آپ دکالت نہ کریں چچی اماں۔ اس نے میرے اظہار و اعمار کو نہیں پہنچائی ہے میرے یقین کو تو زلزلہ ہے۔ میں اسے معاف نہیں کر سکتا۔ میں اس سے محبت کرتا تھا۔ بے تحاشا محبت۔ اسے بہت اچھا چاہن کر۔ یہ سوچ کر کہ اس سے کوئی محبت نہیں کرتا۔ یہ وہ اس قاتل نہ تھا۔ اسے اس بے لوث محبت کی ضرورت نہ تھی۔ وہ سایوں کے پیچھے بھائے ہوئے مجھے۔ میری خواہشوں کو بھول گیا تھا اس نے مجھے ہی نہیں ایک اور معصوم کو بھی دھوکا دیا ہے اور میں اس کا یہ بزم کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ اس کی طرف نہیں جا سکتا۔ بھائی جان نے بھی کہہ دیا ہے۔ ان کا شہیر کے قول افضل سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ دون پہلے کے اخبار میں ان کا بیان چھپ چکا ہے۔ انہوں نے اپنی لاپتعلق کا اعلان کر دیا ہے۔ آج کے بعد اس گھر میں شہیر کے حواسے سے کوئی بات نہیں ہوگی۔ وہ جیسے یا مرے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔"

دلنواز نے حتمی فیصلہ منادیا۔

"عام بھائی۔ گوہر کو آپ جا کر لے آئیں۔ ڈاکٹر نے صبح کہا تھا۔ گیارہ بجے تک اسے ڈسپارچ کر دیں گے۔ عام اور ماغز بھی وہیں ہیں۔ آمنہ بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلی جائے گی۔"

آمنہ پائی نشست پہلو بدل کر رہ گئیں۔ بے رہی کے ساتھ دلنواز کو دیکھا۔ وہ سدا کے انتہا پسند تھے۔



ٹوٹ کر چاہنے والے۔ آمنہ نے تصویر کا دوسرا رخ آج پہلی بار دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر جو کچھ رقم تھا۔ اس کا مفہوم شدید ترین نفرت ہی تھا۔ وہ انہیں بغور دیکھتی رہیں۔

ان کے دل میں شبیر کی اسیبت کا نرم اور نازک سا پودا انہوں نے ہی لگایا تھا اور آج نفرت کی تند تیز آندھی بن کر وہ محبت کے تناور درخت کو ان کے دل کی دھرتی سے اکھاڑ پھینکنے پر تھے۔

کیا محبتیں یوں نفرتوں میں بھی بدل جایا کرتی ہیں؟ آمنہ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

کتنا روٹی تھیں وہ۔ کتنا تڑپی تھیں۔ شبیر کو ایک نظر دیکھ لینے کے لیے۔ اس کے پاس جانے کے لیے۔ کسی نے ایک نہ سنی تھی۔ خاندان کا خاندان اس سے لاشعق ہو رہا تھا۔ گوہر تو اتنی روز سے ہاسپتال میں تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کا علاج خواب آور انکیشن تجویز کیا تھا۔ تمن دن مسلسل عالم بے ہوشی میں رکھا گیا تھا اسے۔ عامر نے صبح بتایا تھا کہ آج وہ ہوش میں ہے لیکن اجنبائی خاموش اور سوتوار۔ کسی سے بات تک نہیں کرتی۔ کیسی قیامت ٹوٹ

پڑی تھی اس گھر پر اس گھر کے باسیوں پر۔ عامر آئے تو آمنہ کی ڈھانسی بندھی کہ وہ دلنواز کے دل میں شبیر کے لیے کوئی نرم گوشہ پیدا کر سکیں گے۔ لیکن وہ تو سب سے زیادہ بھرے ہوئے تھے۔ اس کا نام سننا بھی انہیں گوارا نہ

تھا۔ صغیرہ خاموش بھی تھیں اور شرمندہ بھی۔ جیسے یہ جرم شبیر نے نہیں انہوں نے کیا ہو۔ شاہنواز نے وہیں بیٹھے پیچھے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ مرے یا جیسے انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ کاظم عمامہ کے بھائی تھے۔ وہ بھی ان ہی

کی زبان میں بات کر رہے تھے۔ دلنواز نے خود فون اٹھا رہے تھے نہ کسی دوسرے کو اس کی اجازت تھی۔ گھر کا مین گیٹ بند کیے پورا پورا دن اندر پڑے رہتے۔ کئی اخباری نمائندے آ کر چلے گئے تھے۔ وہ شبیر کے متعلق ایک

لفظ کہنے یا سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ چچی انہیں بے چارگی کی کوئی سزا نہ تھا۔ آمنہ سے کہہ سن کے دل کا بوجھ ہلکا کر

لتی تھیں۔ ایک بات نے سب کو لا جواب کر رکھا تھا اور وہی بات تھی گوہر کی بتائی ہوئی کہ شبیر نوشی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اسی نے اپنی زبان سے اقرار کیا تھا۔ گوہر کو خود بتایا تھا۔ آمنہ تیرہ بن تھیں۔ ان کی چشم بیٹانے تو یہی

دیکھا تھا کہ وہ گوہر کو بدل و جان چاہتا ہے۔ اسے پسند کرتا ہے۔ کتنا خوش تھا وہ۔ جب سے گوہر اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی اپنے دل کی ہر بات وہ سہولت کے ساتھ آمنہ کو بتایا کرتا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ شبیر

ایک عام سوچ کا مالک عام سا نوجوان ہے۔

پھر اس کا یہ کہنا کہ وہ کسی اور لڑکی سے شادی کر رہا ہے ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ جانے کب عامر اور دلنواز اٹھ کر چلے گئے۔ صغیرہ بیگم ان کے قریب آئیں۔

آیا..... آیا..... آپ بھی یہی خیال کرتی ہیں۔ آپ بھی شبیر کو برا سمجھتی ہیں۔

”میں تو سمجھتی نہیں کہہ سکتی نہ اچھا نہ برا۔ میری تو عمر ہی طے سننے میں کٹ گئی۔ پہلے بھائی کے نام کا طعنہ تھا اب شبیر کے نام کا ہے۔ چچی! آپ اس کام کی ابتدا ہی نہ کریں۔ دلنواز اسے اپنے گھر ہی نہ لاتے۔ جیسے گھر با

تھا۔ اور اہر پھر تار جتا۔ جیسی گزار رہا تھا گزارتا رہتا۔ بن ماں باپ کے بچے تو جھاڑیوں کی مثال ہیں۔ خود را بیلوں کی طرح ہیں۔ جدھر رخ ہوا بڑھتی گئیں۔ نہ کائنات چھانٹ نہ رہگ رکاوٹ۔ میں نے تو اسے اس لیے کیلے سے لگایا تھا کہ پھوٹتی ہوئی۔ ماں بن جاؤں گی۔ جو پیارا سے اس دنیا میں نہیں ملا۔ بے دوش کی۔ بیٹی دینے سے

ہی رشتہ منسب ہو سکتا تھا۔ مگر۔ اس نے تو کسی کا بھی لحاظ نہیں کیا۔

”بیٹی میں نے تو یہ چونڈا جو پ میں سنیہ نہیں کیا۔ ایک عمر گئی ہے اس عمل میں۔ میں نے دنیا میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ اچھا بھی برا بھی۔ اچھائی کے لہوے میں چھپے برے انسان بھی میری نظروں سے گزرے۔

مستوب انسان بھی۔ جنہیں زمانہ کھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ میرا دعویٰ ہے کہ شبیر ہرگز برا نہیں ہے۔ اس میں اوباش اور گھٹیا انسانوں والی کوئی بات میں نے ایک ٹپ کو نہیں دیکھی۔ یہ تو اس نے کیا؟ کیوں کیا؟ کیسے کیا؟ یہ

بھی کوئی راز ہے۔ دیکھ لیتا تم۔ اس کی تہہ میں ضرور کوئی بات ہوگی۔ تم اس کے پاس جاؤ تو سہی۔ اس کی سنو تو سہی۔ وہ کیا کہتا ہے کیا بتاتا ہے۔ لیکن تم سب نے تو اسے..... بڑی عجیب سزا دی ہے۔ اسے تنہا کر دیا ہے۔ یہ

کیسا انتقام ہے۔ یہ کیسا بدلہ ہے اور کس بات کا۔ سوچو تو سہی۔ اس کی ماں زندہ ہوئی تو اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتی۔ اسے بول بے یار و مددگار چھوڑ دیتی۔ اسے میرے بچے کو ان لمحوں میں اپنوں کی اپنے پیاروں کی کتنی ضرورت ہوگی۔ کیا سوچتا ہوگا وہ۔ زخمی انگلی بھلا کس نے کاٹ دی تھی وہ برا ہے یا اچھا ہے تو ہمارا ہی۔ ام

ایک برائی کے سبب اس کی ساری اچھائیوں کو نظر اعمار نہیں کر سکتے۔“

تینوں رونے لگیں۔ با آواز بلند۔

”کس کا سوگ منار ہی ہیں آپ۔ کس کا ماتم کرنے لگی ہیں کون مر گیا ہے۔“ دلنواز جانے کہاں سے دوزخے چلے آئے۔

”رونا ہے تو کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈ لے آپ سب میرے گھر میں یہ گریہ وزاری نہیں ہو سکتی۔ میں ایسے ونا ناشائسوں کے مر جانے پر بھی رونے کا قائل نہیں ہوں۔ آئندہ میں ایسی صورت حال نہ دیکھوں۔ مجھے جینا ہے انہا لوں کی طرح خوشحالی کے ساتھ۔ سکون کے ساتھ۔ میرا اس نے کوئی ناتا نہیں ہے اپنے کیے کی یہی سزا مجھے

کانی ہے۔“ وہ دہناتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

تینوں دم سادہ کر رہ گئیں۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھتی بھی نہ سکیں۔

”دلنواز کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ ایسا تو نہ تھا۔ کیا چاہتا ہے یہ..... اس تم کو سینے میں دبا لوں۔ مر جاؤں اس نے یہ سب کچھ اس نے کہا ہے نا کہ یہ گھر اس کا ہے۔ نہیں اور دلوں کی۔“ چچی اماں پھر رونے لگیں۔

”نہیں چچی۔ آپ ایسا سوچیں بھی نہ۔ انہیں تو شبیر کے کیے کا صلہ ہے۔ بہت پریشان اور اہم سیٹ ہیں وہ۔ آپ تو ہماری ماں ہیں بزرگ ہیں اس گھر کی مالک ہیں۔“

”نہیں نہیں میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں ماں ہوتی بزرگ ہوتی اس گھر کی مالک ہوتی تو وہ میرا حکم ماننا اور مجھے شبیر..... کے پاس لے جاتا۔“

”خدا کے لیے چچی اماں! آپ..... آپ..... اس کا نام نہ لیں۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔“

”تم لوگ مجھے نہیں روک سکتے۔ اسے یاد رکھنے سے اس کے لیے رونے سے۔ ارے ملنے پر پابندی لگاؤ۔ دل کی بھڑاس نکالنے سے تو نہ روکو۔ تم سب کے دل اس کے لیے پتھر ہو گئے ہیں۔ میں تو دوق ہوں۔ آخر اس کی دادی ہوں۔ دادی بھی ماں ہوتی ہے۔ اس کے سینے میں بھی اپنے بچوں کی محبت سے بھر ادل ہوتا ہے۔ میں تم سب کی طرح سخت دل نہیں ہوں۔ میں روؤں گی فریاد کروں گی۔ اسے یاد کروں گی۔ اور تم سب مجھے اس سے نہیں روک سکتے۔“

چچی اماں اب رز دہر سے رونے لگیں۔

”آپ..... آپ بھل رہی ہیں گوہر کے پاس۔“

”نہیں آمنہ تم جا کے لے آؤ۔ مجھے میں تو اسے دیکھنے کا حوصلہ بھی نہیں۔ میں..... میں نہیں جاؤں گی۔“ عقیہ اپنی آنکھیں صاف کرتی کمرہ چھوڑ گئیں۔

"نہیں شہیرہ نہیں۔ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتی کہ تم ایسے بے وفا تھے۔ ایسے ہرجائی تھے۔ جانے کن جنموں کا اشارہ تم نے چکایا ہے۔ کس جرم کا بدلہ لیا ہے مجھ سے۔ کاش میں نے تمہاری زبانی یہ نہ مانا ہوتا کہ تم مجھے بھول کر نسی اور کے ہو گئے ہو۔ کاش یہ آٹا ٹاٹا نہیں کایا چلی یہ اچانک کیا ہو گیا۔ کاش میں نے اپنا تم اپنے آپ تک ہی نہ رو رکھا ہوتا۔ گھر میں کسی کو نہ بتایا ہوتا۔ یہ سب تم سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ میں اور میری کبھی دینی بات ہے۔ کاش یہ سب نہ علم ہوتے۔"

ہردازہ دکھلا۔ عاصم اور آمنہ اندر داخل ہوئے۔

"بابا..... بابا....." تو ہر کسی چھوٹی سی بچی کی طرح بلک اٹھی۔ ان کی کھلی ہانہوں میں ساگنی۔

"میری بچی۔ میری گوہر۔ میری جان۔" عاصم حسنین نے اس کی پیشانی چوم لی۔ اس کا چہرہ اپنے مہربان ہاتھوں میں تقام لیا۔

"میں تمہیں سینے آیا ہوں۔"

"مجھے..... کہاں؟ کہاں لے جائیں گے۔"

اپنے گھر اور کہاں..... بہت عرصہ تم نے رکھوں میں گھر کر گزار لیا۔ اب کوئی ستم نہیں ہونے دوں گا۔ یہ تو مجھے اب بتانا ہے صفیہ نے تم کو اس وقت بھی انکاری تھیں۔ صفیہ نے تم پر زبردستی کی تھی۔ باپ سے تو بچی ہی دور رہے گی۔ اس لیے اپنے باپ کو معاف کر دینا گوہر۔ میں نے تو فرض کر لیا تھا کہ وہ ایک اچھا انسان ہے۔ مجھے کیا خبر تھی۔" تو ہردازہ وقار رد نے لگی۔ عاصم اپنی آنکھوں کی نم اس سے چھاتے اس کے اشک پونچھنے لگے۔

شخص سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا۔ وہ کچھلی نشست پر آمنہ اور عاصم کے درمیان کسی معمول کی طرح چٹھی تھی۔ اپنی شہر کی سڑکوں پر بھاگ رہی تھی اور گوہر کو وہ جیتے دن یاد آ رہے تھے۔ جب جب وہ شہیرہ کے سنگ ان لوگوں پر سے گزری تھی۔ کتنے خوش ہوا کرتے تھے وہ دونوں شاداں و فرحان۔ شہیرہ کو اونچی آواز میں جتے شوخ لہے چٹتی گاڑی میں بے حد بھلے لگتے تھے۔ وہ آواز آہستہ کرتی شہیرہ کے ہاتھ پھر آگے بڑھاتے۔

"گوہر..... چلنے اور زندگی کی روانی کا احساس ہوتا ہے۔ جب تم ساتھ ہوتی ہو تو تم چاہتا ہے لمحوں کا سارا دن اور خوشی کشی کر لوں۔"

آج گاڑی میں کتنی خاموشی تھی۔ عاصم اور ساغر کے ہوتے ہوئے بھی۔ بابا اور امی کے ہوتے ہوئے بھی ان سے ہر ایک دوسرے سے بات کرنے کو جھولتی اپنے اندر نہیں پاتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

انہوں نے خدا کا قلم کہتے گھر کے گیت تک آئے۔ گوہر ان کے سینے سے لگتے ہوئے سسک اٹھی۔

"نہیں..... میں شرمندہ ہوں گوہر..... مجھے معاف کر دینا۔ میں نے سوچا۔ میں تمہارے دامن میں خوشیوں بھول بھریوں گا۔ میں شاید بھول گیا تھا۔ خوشیاں تو سب دیتا ہے۔ بندے کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ کسی کو یہ نہ لے۔ آئی میری گوہر۔ میری دینیر سے جاتے ہوئے تمہارے دامن میں انکارے ہی انکارے۔ یہ کھس تا عمر نہیں بھولوں گا۔ چنانچہ..... اللہ کی امان میں۔" وہ بھی رو رہے۔

اپنی خالی خانیا گوہر خاموشی کے ساتھ اپنے ماں باپ کے ساتھ ایئر بیورٹ کی طرف آگئی۔

اسنے کیسے ترسے اسے خبر ہی نہ ہوئی۔ محرزہ کی وہ جہاز سے اتری اور بابا کے پیچھے چل دی۔ نیل انہیں لینے

صفیہ چچی اداں کے پاس جاتے تھیں اور ان کے گلے میں اپنی ہانہیں ڈال کر وہ بھی بے بسی سے رو رہے تھیں..... کائنات کی ساری رنگینیاں دنیا کی ساری رنگیں اسی وقت ہم توڑ گئی تھیں جب اس کے کانوں نے یہ روح فرسا خبر سنی تھی۔ خوشی کا کوئی احساس ان کے دل نہ لگے آپ اس باقی نہیں رہ گیا تھا۔ کتنی خالی خالی ہوئی تھی وہ..... یہ خبر سننے کے بعد یوں لگا تھا اک کوہ سراں بلکہ سا لوہی آہن اس پر پانکف آگے اور وہ ان کے بوجھتے دب کر ریزہ ریزہ ہو گئی ہے۔ پس گئی ہے۔ پھر وہ ہوش کی دنیا سے ہی وہ رنگٹا گئی۔ جانے کتنے دن بیت گئے۔ ہوش میں آئی تو سلسلہ وہیں سے جڑ گیا۔ جہاں سے نونا تھا۔

"خدا یا یہ جو میں نے سنا ہے یہ سب جھوٹ ہو۔ بالکل جھوٹ۔ ایک بھیانک مذاق ہے۔ صرف میری آزمائش ہو۔"

"عاصم..... عاصم۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کرسی پر بیٹھے عاصم کو پکارا۔

"میں کہاں ہوں۔ تم کیوں یہاں بیٹھے ہو۔ شش۔ شہیرہ کہاں ہے۔"

"آئی آپ ہاتھل میں ہیں..... میں آپ کے پاس بیٹھا ہوں۔"

نامر کا سر جھک گیا۔

"وہ جیل میں ہیں۔"

"جیل میں؟"

"ہاں انہوں نے وہ لٹل کر دیے ہیں۔"

"وہ میرے خدا..... عاصم کہہ دو۔ کہہ دو کہ یہ جھوٹ ہے۔"

"نہیں آئی! یہ جھوٹ نہیں ہے۔ آپ شہیرہ بھائی کا نام نہ لیں۔ پاپا تخت خانا ہوں گے۔"

"کیوں؟ کیوں خانا ہوں گے وہ؟"

"وہ نہیں چاہتے کہ کوئی ان کا نام بھی لے۔ وہ آپ کے پاس آئے تھے۔ اخبار والوں نے جانے کیسے پیمان لیا وڑے چلے آئے۔ ان سے سوال کرنے لگے۔ انہوں نے سب کو جھاڑ دیا۔ کہا کہ آپ کچھ دس میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں اپنے قول و فعل کا وہ خود مالک ہے۔ آئی۔ کیا انہوں نے آپ سے کہا تھا کہ وہ نوشاہی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔" وہ بڑے بڑھوں کی طرح باتیں کر رہا تھا۔

وہ خاموش رہی۔ اسے اس رات کی ساری باتیں تو اتر کے ساتھ یاد آنے لگیں۔

شہیرہ نے کسی ہوشیاری سے نوشاہی سے ملاقات کا اقرار کیا تھا اور اسے یہ نوید بھی سانی تھی کہ وہ اس سے شادی کرنے والا ہے۔

گوہر اس سے زیادہ کچھ نہ سوچ سکی۔ ساری صورت حال اس پر واضح ہو گئی۔ نوشاہی ایک حسین ہرجائی لڑکی تھی۔ اس نے شہیرہ کو اپنے فریب کے دام میں الجھالیا۔ وہ اس کے لیے سنجیدہ ہو گیا۔ اس سوچ نے گوہر کا دل کاٹ دیا اور اچانک اسے کسی اور کے ساتھ دیکھ کر ششعل ہو گیا۔ یہ تو ہر مرد کی فطرت کا خاصہ ہے۔ اپنے سے منسوب ذات کو وہ ہر حال میں خوب تک محروم دیکھنا چاہتا ہے۔ اور خود آزا ہنساؤں کے پیچھے کی طرح اونچی اداں کو ہرگز معیوب نہیں سمجھتا۔

اس کا سر پکڑنے لگا۔ دماغ گھومنے لگا۔





آئے ہوئے تھے۔ وہ انہیں سلام کر کے گاڑی کی کچلی نشست پر ماں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ نیل نے بابا سے کچھ نہیں پوچھا۔

”وہ اسری نہیں آئے۔“ غمگن گویا ہوئے۔  
 ”نہیں..... انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کو لے آؤں۔ جو ہر بھی ادھر ہی ہیں۔“ نیل پھر خاموش ہو گئے۔  
 ”میں گوہر کو ہمیشہ کے لیے لے آیا ہوں۔ پڑھنا ضروری بھی ہے تو پرائیویٹ امتحان دے دے گی۔“ انہوں نے خود ہی نیل کو بتایا۔

”اچھا کیا آپ نے شبیر کی کوئی خبر۔“  
 ”کیا خبر ہو..... پورے خاندان نے اس سے ناتا توڑ لیا ہے۔ وہ جانے اور اس کا کام.....“ انہوں نے بے زاری کا اظہار کیا۔  
 ”نیل ان کے کڑے تیروں سے بارمان کر پھر چپ ہو گئے۔ گھر آ گیا..... جو ہر دروازے میں ہی کھڑی تھیں۔ گوہر کو سہارا دینے کے لیے بھاگ کے آئیں۔ گوہر بھی اپنے کمرے تک آئے تک ہی صبر کر سکی۔ بہن سے گلے ل کے وہ بے تحاشا رونے لگی۔“

”آپا..... میرنی آپا..... یہ کیا ہو گیا؟“  
 ”یہ سب کیا ہے..... میں کیا کروں۔“  
 ”صبر..... صبر گوری..... صبر سے کام لو۔ یہ سب خدا کو منظور تھا۔“ اسری اندر آ گئے..... انہوں نے گوہر کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”مت روؤ گوہر..... میرا دل دکھتا ہے..... میں اسی لیے تولا ہو رہی نہیں آنا بلکہ اسی سبب تمہیں لینے ایئر پورٹ نہیں آیا تھا..... کہ تمہارا دکھ میری برداشت سے باہر تھا۔ بلکہ یہ ساری بات میری سمجھ سے باہر ہے..... وہ ایسا تو تمہیں تھا..... اس نے ایسا کیوں کیا..... کیسے کیا؟ ایک روز نیل ہی ان کے بیان سے گہرا اخبار پڑھا تھا میں نے..... دوسروں کے لیے راہ کا چراغ بنتے بنتے وہ اندھیروں میں کیسے ڈوب گیا۔ اسے تو کشت و خون سے نفرت تھی۔ وہ تو امن و سلامتی کا پیاسا مہر تھا۔ اپنے کانچ میں کتنے نخرے سے بتایا کرتا تھا کہ وہ میرا فرسٹ کزن ہے بلکہ میرا ہونے والا بہنوئی ہے۔ میرنی پیاری بہن کا قیاسی ہے۔ اب میں لوگوں کے سہالوں کا جواب کیوں کر دوں گا۔“

اسری بھی بچوں کی طرح رونے لگے۔ گوہر کے اندر بھی طوفان جمع کھڑے تھے..... ان صوفالوں کو باہر آنے کا راستہ مل گیا۔ کوئی بڑا اس طرف نہیں آیا۔ خینوں۔ لیکن بھائی بل کر روتے رہے۔  
 ”گوری..... بابا کا فیصلہ ہے کہ وہ یہ رشتہ سدا کے لیے ختم کر دیں گے۔ کیا تم اس فیصلے سے خوش ہو؟“  
 ”رشتہ تو بابا سے پہلے شبیر نے توڑ دیا ہے اسری بھائی..... بابا کا اس میں کوئی قصور نہیں۔“ دو زبان سے کچھ نہ کہہ سکی۔

”بابا نے جو فیصلہ کر دیا ہے وہ درست ہے۔ آخر ماں باپ ہی اپنی اولاد کے اچھے برے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔“ جوہر آپا نے جھٹ کہا۔ ”سرنی چپ ہو گئے۔“  
 نیل اندر آئے۔  
 ”بابا کہہ رہے ہیں گوہر کو آرام کرنے دیا جائے۔ آپ لوگ ابھر آ جائیں۔ گوہر بی بی..... آپ لیٹ جائیں۔ ڈاکٹر کی تاکید ہے کہ آپ خاموشی سے لیٹی رہیں۔ ابھی ابھی ایک طویل سفر کر کے آئی ہیں آپ.....“

رواں دروازہ کھینچا۔

”ماں ہم چلتے ہیں..... چلیں آئی!“  
 ”آئی..... تم رک جاؤ نا.....“ گوہر نے التجا کی۔  
 ”آپ جائیں۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔“

جوہر اس کے پاس بیٹھ گئیں..... ”آئی..... کیا یہ بھی ضروری ہے کہ میں دل کی بات بھی کسی سے نہ ہوں۔ کھٹ گھٹ کر مر جاؤں۔“  
 ”نہیں میری جان! تم ہر بات مجھ سے کہہ سکتی ہو۔ لیکن ابھی ڈاکٹر کی رائے زیادہ اہم ہے..... میں تم سے ڈھیر ساری باتیں کروں گی۔ مگر کچھ دیر صبر کرنا رہنا سنا ہے تم روؤ گی نہیں۔“

”مت رو کو آئی..... رونا تو اب میرا مقدر ہے۔ میرا نصیب ہے..... میں کبھی نہ روتی..... مگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ وہ میرا ہے۔ صرف میرا..... مجھے اس سانچے کا نہیں شبیر کی صورت بے وفائی کا دکھ ہے آئی۔ اپنے ماں ٹوٹ جانے کا صدمہ ہے..... اس نے مجھے ٹھکرا دیا۔ ایک پلن میں۔ کسی غیر لڑکی کی خاطر..... یہ بات کوئی چھوٹی سی بات نہیں ہے آئی۔ مگر..... مگر اس کے باوجود..... اس کے باوجود..... میں اسے اپنے دل سے نہیں نکال سکی۔ وہ میرے اندر اسی شان سے بنا جانا ہے۔ اسی شان سے آباد ہے۔ یہ جان کر بھی کہ اس نے کسی اور کے لیے قتل جیسا خوفناک جرم اپنے حساب میں کھنوا لیا ہے..... میں اس سے نفرت نہیں کر سکی آئی..... مجھے اپنی اس بے بسی کا دکھ بھی ہے۔ میں اپنی ذات کی بے باوری پر راز ہی ہوں۔ مجھے کچھ بھائی نہیں دے رہا۔ کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔ میری کیا خطا تھی آئی۔ مجھ پر زندگی کے سارے دروازے یوں بند ہو گئے۔ یہ اندھیرا میرے چاروں طرف کیوں ہے۔ خوشیاں اور بہاریں روکھ کر کہاں بھاگ گئی ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟“

”گوری! جان۔ آرام کرو پیٹیز۔ میرا خیال ہے میں تمہیں خواب آور دوا دے دوں۔“  
 ”نہیں نہیں آئی! میں سوتا نہیں چاہتی..... میں سوچتا چاہتی ہوں..... اپنے بارے میں۔ اس دنیا کے مشکل لوگوں کے بارے میں۔ میرے ذہن پر بوجھ ہے..... میرے دماغ میں الجھنیں ہیں..... میں بھٹک رہی ہوں..... مجھے راستہ نظر آنا چاہیے۔ آپ چلی جائیں..... مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ میں پھر آپ سے باتیں کروں گی۔“

جوہر دروازہ کھینچ کر باہر چلی گئیں۔  
 ”شبیر! تمہیں یہ سب کرنا ہی تھا تو کم از کم مجھے تو اس احساس سے دوچار نہ کرتے۔ میرے سینے میں یہ نخر تو نہ اتارنے اپنی بے وفائی کا نخر۔ مجھے یوں تو نہ ٹھکرانے۔ میں کیا کروں شبیر۔ میں کہاں جاؤں..... مجھ میں تو اتنی حالت بھی نہیں کہ چل کر تمہارے پاس آ جاؤں۔ تم سے کم از کم بے وفائی کا حساب ہی پوچھ لوں..... میں کتنی خود غرض ہو رہی ہوں۔ مجھے تمہاری زندگی یا موت کی نہیں صرف اپنے ہی دماغ ہو جانے کی فکر ہے..... صرف اپنے لٹ جانے کا غم ہے۔ یہ حایہ بڑے عجیب انداز میں ہوا ہے۔ اس نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ میں تمہاری حمایت میں ایک لفظ کہنے کی حیثیت میں نہیں ہوں..... میں نے خود ہی سب کو بتایا تھا..... کہ تم نے مجھ سے باتا توڑ کر کسی غیر کو اپنا بنایا ہے۔“

شبیر! تم پرانے ہونے لگے۔ ہو جاتے۔ اپنی زندگی کے ساتھ یہ ظلم تو نہ کرتے..... ایک رات میں یہ کیا کیسے پلٹ گئی۔ جس کی خاطر تم نے برسوں کا ایک ناتا توڑا وہ چند لمحوں میں اتنی بری کیسے ہو گئی کہ تم نے اسے مار ڈالا۔

برعام دو سالوں کو قس کر دیا۔ شبیر..... مجھے تو سب سے زیادہ اپنے بھرم کے ٹوٹ جانے کا دکھ ہے۔ میں نے تمہیں آسان سمجھا تھا۔ بہت اونچا چاہتا تھا۔ ہم شکر تم....."

وہ پھر رونے لگی۔ دل میں عجیب کھد بگھنی تھی۔ دماغ ان جذباتوں کی فنی کرتا تھا۔ دل کچھ بڑا درد کراتا تھا۔  
 "بعض لوگوں کے لیے عزت نفس ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ تم بھی میرا مان تھے شبیر.....! تمہارا وجود میری توجیہ کا باعث تھا۔ آدی جسے چاہتا ہے اسے ساری دنیا سے برتر اور سب میں ممتاز دیکھنا چاہتا ہے۔ تم وہ نہیں رہے شبیر..... جیسے ایک دن بڑے اعتماد کے ساتھ میں نے اپنے دل میں بسا لیا تھا۔ تم وہ نہیں رہے بلکہ تم وہ ثابت نہیں ہوئے۔ تم نہیں میں دنیا والوں کی نظروں میں گر گئی ہوں تمہاری ذات کے نوانے سے۔ میں کیا کروں۔ کیا کروں۔"

وہ پھر رونے لگی۔ اس کی سوچ کے بحارے شبیر کی ذات کے کناروں تک پہنچتے جاتے اور لوٹ آتے۔  
 چھٹیوں کے ایام میں وہ اکثر اس سے ٹیلی فون پر بات کرتا۔ مصروفیت میں سے چند لمحے نکال کر اکثر دنیا کی باتیں کرتا۔ کبھی دل کا احوال بھی سناتا۔ ایک ماہ پہلے ہی تو اس نے بذریعہ ڈاک ایک کیسٹ بھیجی تھی جس میں صرف ایک گیت ہی ریکارڈ تھا۔ وہ کیسٹ اب بھی اس کی الماری میں پڑی تھی۔

"گوری! رات کے پرندوں لخت میں جب نٹھائیں چار سو خاموش چھٹی ہو چا تھی رات میں اپنے سفید بستر پر نیلے کی کلیاں بچھا کر..... چاند کو ہرا زینا کر یہ گیت ضرور سننا..... میں تجھے ایسا لگے گا کہ میں بھی تمہارے ہمراہ ہوں..... میں نے اس گیت کو یوٹیوب کی حد تک سنا ہے۔ بس سڑکوں پر بے مقصد ڈرائیونگ کرتے ہوئے۔ تمہیں تصور میں اپنے پاس بلا کر۔"

گوہر پلنگ سے اتری۔ الماری کی طرف گئی۔ کیسٹ اب بھی اپنی جگہ پر موجود تھی۔ اس نے مغربی دیواری طرف دیکھا اس کے لہسے کی میز پر اس کا نیپ ریکارڈ بھی موجود تھا۔ وہ کیسٹ اٹھانے کی ریکارڈ آن کیا اور خوب سمورت آواز اس کے ہل کے درد میں اضافہ کرنے کے لیے پورے کمرے میں پھیل گئی۔ اس نے پوری آواز کھول دی۔

رم جھم برستا ساون ہوگا  
 جھلمل ستاروں کا آنگن ہوگا  
 پریم کی گلی میں اک چھوٹا سا گھر بنا نہیں گے  
 کلیاں نہ ملیں نہ سہی کا تنوں سے اسے سجا نہیں گے  
 گیا سے سندروو بن ہوگا  
 رم جھم برستا ساون ہوگا  
 پھر تو مست ہواؤں کے ہم جھوٹے بنا جائیں گے  
 نیناں سندرو پینوں کے جھرو کے بنا جائیں گے  
 سن آشاؤں کا درد پہن ہوگا  
 رم جھم برستا ساون ہوگا

نیل والیوم نے کمرے کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔  
 "گوری..... گوری.....!" جوہری آواز اس آواز میں کہیں دب گئی تھی۔  
 "روئے جا رہی تھی۔ بار بار پوچھا کر کے سن رہی تھی اور دل کی بجز اس نکال رہی تھی۔"  
 "گوری اور واژو کھولو....."  
 "ہراوی آواز میں کہہ رہی تھی۔ وہ روتے روتے دروازے تک آئی۔  
 "گوری ہوش سے کام لو..... دالان میں پایا اسری نیل سب ہی بیٹھے ہیں۔ کیا کر رہی ہو تم..... اتنی اونچی آواز میں بھی چلاتے ہیں ریکارڈر۔ سب کیا کہیں گے۔"  
 "بس اس سے بھی اونچی آوازوں کے شہر میں اپنے دل کی آواز گم کر دینا چاہتی ہوں آپ۔ مجھے مت روکو....."  
 "وگو یہ شور مجھے سکون دے رہا ہے۔ پلیز آپ۔"

اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔  
 "بہرے مشکوک انداز میں اسے دیکھا۔  
 "یاد دیکھ رہی ہوں میں اپنے حواسوں میں ہوں۔ بس لٹ جانے کا ماتم کرنا چاہتی ہوں۔ پلیز آپ۔ جو کرتی ان دنوں دو۔ چلی جاؤ۔"  
 اس نے پھر گیت لگا دیا۔ اب کے آواز کچھ آہستہ تھی۔ لیکن وہ میز پر سر رکھے تسلسل کے ساتھ روئے چلی جا رہی تھی۔  
 "میں بھی نہیں خواب بھی ٹوٹ گئے تھے۔ تصور بھی نہیں ہوئے تھے۔ آرزو میں بھی لبہ لہان تھیں۔ نہ مرنے کی تمنا بنی آرزو۔ جانے کون سا مہر تھا زندگی کا۔"

☆☆☆☆☆☆  
 "لوہری حالت دیکھی ہے آپ نے؟"  
 "نہرہا ہوں بیڑی اچھی طرح سے..... اور سوچ رہا ہوں کہ اسے یہ سزا تمہاری طرف سے ملتی ہے۔"  
 "نہری طرف سے..... میں اسے سزا دوں گی؟"  
 "تمہاری چلی تھی تانوسے رشتے جوڑنے..... تمہیں میں کیا بھائی تھی..... وہ بھی تو بھتیجا تھا تمہارا۔"

جھلمل ستاروں کا آنگن ہوگا  
 رم جھم برستا ساون ہوگا  
 جھلمل ستاروں کا آنگن ہوگا  
 رم جھم برستا ساون ہوگا  
 ایسا سندرو پینا پنا جیون ہوگا  
 تیری آنکھوں سارا سنسار میں دیکھوں گی  
 دیکھوں گی اس پار یا اس پار میں دیکھوں گی  
 نینوں کو تیرا حق و رشن ہوگا

رم جھم برستا ساون ہوگا  
 روئیں گی یہ آنکھیں پھر بھی میں تو مسکرائیں گی  
 دکھ کے بلوغاتوں سے بھی میں نہ گھبرائوں گی  
 جب ساتھ میرے میرا سا جن ہوگا

”میں نے تو کچھ اور سوچا تھا۔“

”چلو اب تو خوش ہو۔ اس ناخوار نے وہ زخم لگایا جسے بھرنے کے لیے برسوں چاہئیں۔ میری بیٹی تہ زندوں میں

ہے نہ مردوں میں۔“

”پھر اب کیا ہوگا؟“

”کیا ہونا ہے؟ دوسروں کی خاطر ہم اپنی زندگیوں میں زہر نہیں گھول سکتے۔“

”کیا مطلب؟“

گوہر کی زندگی کے لیے خوشیوں کی جتنی اب ضرورت ہے پہلے کبھی نہ تھی۔ جانتی ہو ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟“

”خیر ہے مجھے۔“

”ڈاکٹر ہارون واسطی کے بارے میں میں نے سچا نہیں کرائی ہے۔“

”جی..... کیوں؟ کس لیے؟“

”کیا تمہیں خبر نہیں وہ کس لیے یہاں آئے تھے؟“

”جانتی ہوں۔“

”تو میں نے بھی اسی سبب پوچھا ہے لوگوں سے۔ ڈاکٹر ہارون ایک بہت اچھا نوجوان ہے۔ اس کے کردار کا

ہر شخص معترف ہے۔ حالانکہ اس شہر میں آئے اسے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ امین واسطی اپنے علاقے کے خاصے با

اثر زمیندار ہیں۔ دوسرا بیٹا یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے وہ بھی شریف النفس ہے۔ ایک بیٹی اور دو بیٹے۔ چھوٹی سی

جھیلی..... اور اچھے لوگ۔ میں نے امین واسطی صاحب کے پاس پیغام بھیجا دیا ہے۔ وہ جب چاہیں آ کر.....

بات سنی کر لیں۔“

”عامم.....!“ صفیہ نے حیران ہو کر نہیں دیکھا۔

”ہوں۔“

”گوہر اب بھی شیر کی منسوب ہے..... اس سنگی کے ٹوٹنے کا کوئی اعلان نہیں کیا کسی نے۔ وہ میرا بھتیجا ہے۔ قتل

کے کیس میں جیل میں بند ہے..... اسے کسی بھی ہفت پچاس کی سزا سنائی جا سکتی ہے۔ اور آپ..... آپ.....

آپ.....“

”میری خوشیاں اور میرے غم میرے اپنے ہیں۔ کسی کی خوشیوں اور غموں سے بندھے ہوئے نہیں۔ مجھے اپنی

بیٹی کی زندگی اور اپنی عزت نفس دونوں ہی عزیز ہیں۔ اس نے میری بیٹی کو ٹھکرا کر ایک آوارہ لڑکی کا دامن تھا

تھا..... تو میری بیٹی کسی شریف آدمی کے سنگ کیوں نہیں بیاہی جا سکتی۔ میں اس کام میں کوئی تاخیر نہیں کروں گا۔

اس کے مقدمے کا فیصلہ جلد از جلد ہو جائے گا۔ میں چاہتا ہوں پھانسی چڑھ جائے۔ سے اس نے وہ یہ نوید بھی سننا

جائے۔ جسے اس نے ایک عام سے لڑکے نے ٹھکرا دیا اسے ڈاکٹر ہارون جیسے انسان نے اپنی بیوی بنا کر فخر محسوس

کیا۔“

”عامم..... میں..... میں..... بہت پریشان ہوں۔“

”تم عمر کے ہر دور میں پریشان رہی ہو اور میں اپنی زندگی کا لاٹھل محل محض تمہاری پریشانیوں سے ڈر کر تہل نہیں

کر سکتا۔ آج کل میں ان کی طرف سے پیش رفت ہوئی..... وہ جب آئیں تو انہیں یہ احساس نہ ہو کہ تمہیں ذرہ

خبر بھی کوئی پریشانی ہے۔“ عامم حسین نے کڑے الفاظ میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

☆☆☆☆☆☆

بڑے دنوں بعد وہ اپنے کمرے سے صبح تک آئی تھی۔ صفیہ نے امین واسطی کی آمد کی خبر کو اس سے چھپا کے رکھا

تھا اور آج جب اس نے میز پر رکھا روزنامہ اٹھایا تو زندگی کے معمولات میں سے ایک طرف لوٹ آنے پر انہیں

خوش ہوئی۔ وہ جلدی سے گاؤں گیا اٹھالائیں۔

”لیٹ جاؤ۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے تھک جاؤ گی۔“ انہوں نے تاکید پرانہ برکھ دیا۔

”نہیں اماں میں لیٹے لیٹے تھک گئی ہوں۔“ اس نے اخبار کے پہلے صفحے پر نگاہ کی.....

”امتیاز نوشا..... کیس کے طوم شہیر عسکری کی حمایت میں

یونیورسٹی کے طلبہ کا احتجاجی جلوس.....“

اس کی اس خبر پر توجہ کا سبب شہیر عسکری کی تصویر تھی۔ نئی دیر اس کی نظریں اس تصویر پر جمی رہیں۔

مشغول طلباء نے پولیس کے خلاف نعرہ بازی کی..... کئی سرکاری اور نجی املاک کو نقصان پہنچایا۔ ایک پیٹرول

پمپ کو آگ لگا دی۔ انہوں نے بڑے بڑے کتبے اٹھا رکھے تھے جن پر مختلف مطالبات درج تھے جن میں سے

نمایاں مطالبہ شہیر عسکری کی رہائی کا تھا۔

ایک اور خبر.....

شہیر عسکری نے وکالت نامے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

گوہر نے جلدی خبر پر جی جس کا خلاصہ تھا..... طلباء یونین کے عہدیداروں نے اپنی طرف سے شہیر

عسکری کو ضمانت پر رہا کرنے کا انتظام کیا۔ کیونکہ شہیر کے ورنہ اس نے مکمل لاپتہ کی کا اعلان کر دیا ہے.....

اور کوئی بھی اس سے ملنے تک نہیں آیا..... ہائی کورٹ کے وکیل مسز انور عباسی وکالت نامے پر دستخط کرانے کے لئے

مذموم نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی پراسرار خاموشی نے پولیس اور جیل حکام دونوں کو حیران کر رکھا ہے۔

وہ نہ جرم سے انکار کرتا ہے نہ اقرار کرتا ہے۔“

گوہر کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ کر مسل کچل ڈالا۔ اس نے اخبار دور پھینک دیا۔

”کیا ہوا گوری..... کہا تھا ٹالیٹ جاؤ۔ ابھی تمہاری طبیعت صحیح نہیں ہے۔“

وہ اٹھ کر اندر چل دی..... جلدی سے جوہر کا نمبر ملایا۔

”آپی..... آپی..... میرا دم گھٹ رہا ہے..... میں مر رہی ہوں.....“

”گوری..... احوال سے کالمو..... سب کو جینا ہی ہوتا ہے جب تک موت نہ آئے۔“

”نہیں آپی..... ایہ جینا جینا نہیں۔ موت اس سے آسان ہوگی..... آپی! میں تمہارے پاس آنا چاہتی

ہوں۔“

”عقل سے کالمو..... یہاں گھر میں سب لوگ ہیں۔ میں آ رہی ہوں ابھی چند لمحوں میں۔“ اس نے ریسیور

رکھ دیا۔ چند منٹوں میں ہی وہ گوہر کے روبرو تھیں۔

اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

”آپی..... بس نے ہار مان لی ہے..... اپنے جذبوں سے اپنے دل سے..... کوئی امید نہیں کوئی آس نہیں.....

زندگی کی خبر بھی ہے کہ بے رحم ہے..... بے وفا ہے..... پھر میں اسے نہیں بھلا سکی۔ اسے اپنے دل سے نہیں نکال

سکتی..... آئی..... میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ وہ آج بھی میرے اندر باہر میرے ساتھ

...جیو ہے۔ آپنی ہر روز ہر شب وہ مجھے خواب میں نظر آتا ہے۔ خاموش سا چپ چاپ سا۔ کبھی آپنی بھرتا۔ کبھی  
 تباہی بہاتا۔ آپنی..... سب نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں ہے۔ جو اس نے کیا وہ اس کا  
 بے نش تھا۔ میری محبت کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ میں..... میں کبھی اسے حالات کی نذر کر دوں..... آپ..... میں اس  
 سے باہر جاننا چاہتی ہوں۔ پلیز آپ..... ایک بار اس سے کچھ پوچھنے..... کچھ کہنے۔“

”میری بابا کو خبر ہوگئی تو ہم سب کی جان نکال دیں گے۔“  
 ”کیا آپ میرا ساتھ نہیں دیں گی؟ آپ میری بہن نہیں ہیں۔ کیا میری پریشانیوں میں آپ کا کوئی حصہ نہیں۔  
 آپ نہ لگیں تو میں اکیلے جلی جاؤں گی۔ چاہے وہ اسی کا کوئی راستہ باقی رہے یا نہ رہے۔“  
 ”یہ ممکن نہیں ہے جانتی ہوکل تمہاری سسرالی سے کچھ لوگ آ رہے ہیں۔“

”میری سسرالی والے۔“  
 ”ہاں ڈاکٹر ہارون کی گھر والے۔ تمہیں اٹھوٹی پہنانے اور شادی کی تاریخ لینے۔“  
 ”نہیں..... نہیں.....“  
 ”یہ بابا کا فیصلہ ہے۔“  
 ”وہ بھی تو سب کا فیصلہ تھا۔“

”تم بابا کا حصہ جانتی ہو۔“ گوہر کا سر جھک کر رہ گیا۔  
 ”آپنی تم نے انہیں نہیں روکا..... ابھی تو میرے کاغذ سے میری اپنی لاش اٹھانے سے بھی قاصر ہیں۔ شادی؟  
 بہت بھاری بوجھ ہے مجھے شادی نہیں کرنا ہے۔“

”تو کیا کرو گی.....؟“  
 ”انتظار کروں گی..... موت کا ہی سہی انتظار تو ہوگا۔“  
 ”شیر تو اپنے کیے کی سزا بھگتے گا اور تم.....“

”میں محبت کرنے کی سزا..... ہو سکتا ہے اس کے مر جانے پر زندہ میں بھی نہ رہوں۔ آپنی..... زندگی میں محبت  
 ایک باری کی جاتی ہے۔ کسی کو شریک سزا ایک باری جانا جاتا ہے..... بابا کس شراکت کی ذمہ داری مجھے سونپنا  
 چاہتے ہیں شیر سے پھڑک کر میں زندہ ہی کب ہوں۔ تعلق داریاں رشتے ناتے تو زندہ لوگ نبھایا کرتے ہیں۔ گوہر  
 تو ایک لاش ہے..... اور میری اور تشنہ انگلیوں کی لاش..... جس کی آخری آرزو ایک بار شیر سے مل لینا ہی ہے۔ وہ  
 ہر روز مجھے بلاتا ہے صفائیں دیتا ہے۔ میرے تعاقب میں وہ ڈاگلا آتا ہے۔ میں اس کی طرف لپکتی ہوں تو آگ  
 نکل جاتی ہے۔“ اس کے لہجے میں بڑا درد تھا۔ حسرتیں تھیں شکستگی تھی۔

”میں شادی نہیں کروں گی..... کبھی بھی نہیں۔“  
 ”بابا انہیں زبان دے چکے ہیں۔“

”میں بھی کسی سے عہد کر چکی ہوں۔ وہ مکر گیا تھا۔ میں تو نہیں بھولی..... مجھے اپنا عہد یاد ہے وہ سمجھتا تھا اسے  
 میری ضرورت نہ تھی..... لیکن میں سمجھتی ہوں اسے میری ضرورت ہے۔ مجھے اس کے پاس جانا ہے۔ آپ کو میرا  
 ساتھ دینا ہوگا۔“

”میں ایسا عہد نہیں کر سکتی۔ میں تو نہیں سے بھی نہیں کہہ سکتی۔ وہ کیا سوچیں گے۔ کیا خیال کریں گے۔  
 تمہیں اپنے بابا کی عزت کا کوئی پاس نہیں۔ تم اس سے ملنے کے لیے بھنڈ ہو۔ جس نے تمہیں ٹھکرادیا۔“

”آپنی ٹھیک کہہ رہی ہیں گوہر۔ ہم بابا کے انکار کو نہیں نبھاسکتے۔ بھول جاؤ سب باتیں۔ اب وہی ہوگا جو  
 بابا چاہیں گے۔“ اسری جانتے لہجے سے آئے۔ وہ انہوں بہنوں کا رنگ لٹک رہا تھا۔

اسری نے گوہر کے سر پر ہاتھ بھاری ہاتھ رکھ دیا۔  
 ”ہم سب نے اسے سمجھنے میں ناطی کی۔ اور تم جیسی لڑکی کے کاٹھنہ تھا۔ اسے ان کے کیے ہوئے کی سزا بھگتتے  
 ہو۔ دوسروں کی خاطر اپنی زندگی تباہ کرنا ہاتھ بندھی نہیں۔ زندگی بہت طویل ہے۔ لیکن بکھوں کے بوجھ بھی بہت  
 زیادہ بھاری ہوتے ہیں۔ اس سے ملنے کی خواہش ایک نادانی ہے مگر مناسب مہیا تو میں خود تمہیں لے جاتا۔“  
 اسری شاید اس کی ساری گفتگو سن چکے تھے۔ اس کا سر مزید جھک گیا۔ وہ باہر چلے گئے۔

”کس نے کہا تھا۔ یہاں کمرے ہو گئے تقریر کرنے کو۔“ جوہر کو سخت ملال تھا۔ اسری نے اس کی باتیں سن لی  
 تھیں۔  
 ”گلا گھونٹ دین آپ میرا؟“  
 گوہر نے بے چارگی کے ساتھ کہا۔

”اسری بابا سے کہہ دیں گے اور نہیں بے حد انہوں ہوگا۔“  
 وہ چپ ہوئی جوہر کی بات درست تھی۔  
 ”آپنی..... کیا بابا مجھے چھوڑنے کی مہلت بھی نہیں دے سکتے۔“

”میری چندا۔ میں ان سے کہہ چکی ہوں وہ ایک ٹپا کی تاخیر پر بھی تیار نہیں ہیں۔ کم از کم ایک شام ہر قسم کی مشغلی  
 کا انتظام تو مکمل ہو ہی چکا ہے۔“  
 گوہر بے بس ہی ہو کر رہ گئی۔

دوسری شام وسیع و عریض سخن میں قدرے اونچے بے اسٹیج پر گوہر آتشی گلہابی کا انداز سوٹ میں دلہن بنی بیٹھی  
 تھی۔ تیز رہشٹیوں کی جگہ گھاسٹ میں اس کے چہرے کی زردیاں میک اپ میں چھپ کر رہ گئی تھیں۔ ارم اور شازیہ  
 اس کے ساتھ تھیں۔ ان کی انکلیتی تند ذاکتر باروں کی ولا رتی۔ لیکن بھی اس کے پاس تھی۔ دنیا کے سارے سرد گرم  
 سے بے خبر۔ بھائی کی مشغلی پر چندہ رچہ خوش بار بار اس کے چہرے کا دیدار کرتی اسے اپنے دل میں سمور رہی تھی۔  
 ”نہ ہوئے بھائی جان.....“

”کیوں کہاں گئے ہیں آپ کے بھائی جان؟“ ارم نے پوچھا۔  
 ”اچانک ہی انہیں امریکا جانا پڑا۔ ہوتے تو ضد کر بیٹھتے کہ وہ ان کو ابھی رخصت کرا کے لیے چلتے ہیں۔“  
 ”اچھا ہوا۔ ورنہ جتنی اچانک مشغلی کی خبر ملی اتنی اچانک ان کے نکل پر آیا ہو جائے گا دکھ سہنا پڑتا۔ لیکن میں تو  
 سمجھ رہی تھی..... برآمدے میں آپ کے ساتھ کھڑے وہ خود پر تو جوان ڈاکٹر بارون ہی ہیں۔“ ارم نے حسب  
 مارت اسے کر دیا۔

”ارے نہیں وہ تو میرے چھوٹے بھائی ہیں۔ اسٹیج ہیں۔ سچ پوچھیے تو اس ناتے پر وہ بارون بھائی سے کم خوش  
 نہیں ہیں..... جیسے مشغلی بھائی جان کی نہ بلکہ ان کی ہو..... بھائی کا رت روشن دیکھنے کو بے تاب تھے میں بمشکل  
 سمجھا بھنکا کے آئی ہوں کرا بھی ان کا ملنا۔ لیکن ہے۔ بھائی انہیں جانتی ہیں..... وہ ان کے یونیورسٹی فیلو بھی تو  
 ہیں۔“

گوہر اپنی جگہ چپ بیٹھی تھی۔ واقعی کسی سرد لاش کی طرح۔

ہوری تھیں۔ اس نے زہرات لباس اور پھول نونچ کر دوڑ بھینک دیے۔ سوئی سادہ سے لباس میں منہ ہاتھ دھو کر میز کی طرف آئی۔ انگوٹھی اس کے ہاتھ کی انگلی میں اب بھی موجود تھی۔

اس کی سانسیں بند ہوتے لگیں۔ شبیر کے نام کی انگوٹھی لیکن وہ بہت دنوں تک پریشان رہی تھی۔ اور..... اب بھی..... اب بھی وہ پریشان ہے۔

کیا گزرتے دن اسے چھین بخش دیں گے۔ وہ نئی صورت حال سے متعلق ہو جائے گی۔ اس جہد پائی کو جان لے گی۔ کتنی خالی اللہ ہمیں ہوری تھی وہ.....

”ہم لڑکیاں آخر کیا ہیں؟ ماں باپ کے لیے محض ایک ٹارگٹ..... ایک نشانہ جسے سامنے رکھ کر وہ ستم کی مشق کیا کرتے ہیں۔ باہا کو..... اماں کو..... جوہر آ پ..... تو اسری بھائی کو کسی کو بھی اس کے احساسات کی کوئی پرواہ نہیں..... سب خوش ہیں ایک اونچے خاندان سے نانا جوڑ کر..... یہ وہی بابا ہیں جنہوں نے سدا سر عبد اللہ کی جاگیر اردو بہت کثرت کی نگاہ سے دیکھا..... کیا وہ مجھے ایک جاگیر دار کی بہو بنا کر صرف اور صرف شبیر سے انتقام لے رہے ہیں۔ جس کا زندگی اور اس کی باقی ماندہ احمقیاں جات پر کوئی استحقاق باقی نہیں رہا۔ انتقام کے لیے وقت کتنا غیر مناسب اور طریقہ کتنا گھٹیا ہے..... کاش بابا کاش آپ نے سوچا ہوتا۔“ وہ ایک بار پھر رو دی۔

کہاں رو گیا..... اس کا جھلمل ستاروں سے سجا آگن جہاں رم جہم برقی سادوں کی پھوار نے اپنا حسن بکھیر رکھا تھا اس نے پلے کے جن کو آپ ہی آپ دیا۔

جھلمل ستاروں کا آئینہ ہوگا  
رم جہم برستا سادوں ہوگا

سنتے سنتے شب سحر میں بدل گئی اور سارے ٹھہرے کے ماروں کی طرح وہ بھی بے سادہ ہو کر وقت سحر میں تھی۔

☆☆☆☆☆☆

اس دن کے حوالے سے کتنے پیارے پیارے خوش رنگ لمحوں کے دلچسپ خواب انہوں نے دیکھ ڈالے تھے۔

وقت طمن کی گھڑیوں کا سارا حسن دن کی آنکھوں میں محفوظ تھا۔

وہ سوچتے..... جانے کیسے اپنا تعارف کرائیں گے..... کیا کہہ کے اسے مخاطب کریں گے۔

کیسے سر پر اتار دیں گے..... وہ انہیں دیکھ کر کتنا خوش ہوگا۔ ان کے نرم گالوں پر بار بار یوسے دے گا۔ انہیں لگے لگائے گا۔ بلکہ مضبوط ہانپوں میں بھر کر چکر دے ڈالے گا۔ وہ چلا تے رہ جائیں گے..... فریاد کرتے رہیں گے۔ لیکن وہ ایک نہیں مانے گا۔

ان سے سو سو سوال کرے گا۔ اپنا اور ان کا رشتہ پوچھے گا۔ پھر جب رات ہوگی تو ان کے بوزھے لیکن طاقتور بازوؤں میں چھپ کر ان کے سینے سے لگ کر سو جائے گا۔ وہ ان سے بگڑا کرے گا۔

”آپ اتنی مدت کہاں رہے نا جان اکہ میں آپ کی محبت کے لیے ترستار ہا۔“ وہ ان سے جھوٹ مہٹ روٹھ جائے گا اور وہ منانے کے لیے اس کے پیچھے دوڑتے پھریں گے۔ لہجہ کریں گے بلکہ ہاتھ جوڑیں گے۔

نہیں آو۔

پہ وقت آپ بے رحم لہے۔

جو کسی کی خوشیوں کی پروا نہیں کرتے۔

منگنی کی رسم ادا ہوگی۔ بیگم واسطی نے گوہر کے ہاتھ میں ہشت پہلو ہیرے کی انگوٹھی پہنا دی۔ سعیدہ بیگم خوش خوش ان کے ساتھ ان کے پہلو میں جا بیٹھیں۔ خاندانی اختلافات کو ٹکس بھلا کر..... انہیں تو اس وقت بس ایک ہی خوشی تھی شبیر سے اس کا گوہر مراد چمن گیا تھا۔ زندگی سے موت کی طرف جاتے جاتے وہ اپنی آخری متاع سے بھی نہالی ہو گیا تھا۔ بیگم واسطی اپنے بیٹے کی تعریفوں میں لگی تھیں۔ جو واقعی تعریف کے قابل ہی تھا۔

سیاہ سوٹ میں ملیوں ماموں واسطی عین اس کے سامنے براجمان تھا۔

”یہ تیار شدہ مبارک ہو بھابھی جی.....! چند دنوں بعد ان باتوں میں میرے بھیا کے نام کی مہندی ہوگی۔“

اس نے اپنی جیت کا احساس دلایا۔ گوہر کا دل کھلنے لگا۔ کتنی بے بس تھی وہ۔ رسوں رہا جوں کی بخاری زنجیروں نے اسے جکڑ رکھا تھا۔

”اس انگوٹھی کا حسن بڑھ گیا ہے۔ آپ کی انگلی کی زینت بن کر۔ اور آپ بھیا کے نام سے منسوب ہو کر کچھ زیادہ اچھی لگنے لگی ہیں..... ہر شے اپنے مناسب مقام پر اچھی لگتی ہے۔ اور جلد یا بدیر اپنے ٹھکانے تک پہنچ ہی جاتی ہے۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا.....“

وہ بخوبی سمجھ رہی تھی..... اس کا اشارہ کس طرف تھا۔

”ارے ہم آپ کے دیور بھیا ہیں۔ ہمیں اک نظر دیکھ لینا جرم تو نہیں۔ کب سے منتظر تھے اس دن کے ان مبارک گھڑیوں کے۔ ہم تو اپنے جذبوں کی ساری شدتیں آپ کے نام کرنا چاہتے ہیں۔ اتنی محبت دیں گے آپ کو کہ گزرے دنوں کی یاد بھی آپ کے قریب سے نہیں گزرے گی۔ اور ہمارے بھیا..... وہ تو جناب آپ کے دیوانے ہیں۔ آپ کو کیا خبر وہ کتنے خوش ہیں۔ بس مارے مجھوڑی کے امریکا میں ہیں۔ روحانی طور پر آپ کے آس پاس موجود ہوں گے۔ آئی اے مجھے انہیں۔ ہم تو ڈرتے ہیں انہیں اور ان کی بے پناہ محبت کو پا کر آپ ہم

غریبوں کو بھولی ہی نہ جائیں۔ یاد رہے کہ ہم اس کہانی کا مرکزی کردار ہیں۔ ہم نہ ہوتے تو یہ دن بھی نہ ہوتا۔“

وہ ہنس رہی تھی..... بلکہ ہنس ہنس کے وہ ہری ہوری تھی۔ اس کی ٹٹوں میں بھائی کے لیے پیار تھی پارتھا۔

”آپ کو اپنی وکالت خود کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے بھابھی سے سب کہہ دیا ہے۔ ہم تو سمجھے تھے اس بارانی بیج ایک آسانی جو رہنے سے زمین پر اتر کر ہمارے گھر آئے ہیں۔ ماموں بھیا ہی تھے جنہوں نے یہ

مسئلہ حل کیا کہ آپ آسانی نہیں از رضی حور ہیں۔ اسی دنیا کی باسی ہیں۔“

ماموں آنکھوں میں شوخ چمک لیے مسکراتا رہا۔ جو ہر بھی وہیں آگئیں۔

ان کے چہرے پر خوشی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ایک مصنوعی مسکراہٹ لبوں پر سجائی وہ مہمانوں کا استقبال کر چکی تھیں اور اب ان کی خاطر تو مٹنے کر رہی تھیں۔

”آئیے جوہر آ پ.....! آپ بھی بیٹھے ہمارے ساتھ..... ماموں بھیا تو آپ کے زبردست مداح ہیں..... بتا رہے تھے آپ ایک آئیڈیل خاتون خانہ ہیں۔“ وہ چمکی..... اور جوہر کا ہاتھ تھام لیا۔

”آپ ہماری بھائی کی ہی نہیں ہماری بھی بیوی بہن ہیں۔ ہم سدا آپ کا احترام کریں گے۔“

وہ سعادت مندی سے کہہ رہا تھا۔ اور گوہر اندازہ لگا چکی تھی کہ اس خاندان نے اس کے اہل خانہ کو اپنی خوش اخلاقی کا سیر کر لیا تھا۔ اس نے ایک کسلی نگاہ ماموں پر ڈالی جو مسکراتے ہوئے جوہر آ پ سے مخاطب تھا۔

تقریب ختم ہو گئی مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ گوہر اپنے کمرے میں آئی۔ وہ مہتمم کی ایک نیم سر ریز تھی۔ کمرے میں خوشگوار منظر دکھائی۔ جتنی دور بیچے سے آجی رات کے چائے کی کرسیوں سے اس کا



وہ سسکتے لگا۔ بالکل معصوم بچہ لگ رہا تھا۔ ڈاکٹر ہنری پر امید انداز میں مسکرا رہے تھے۔

”آج جب تمہارے پاس آنے کے لیے اس شہر کی سڑکوں سے گزر رہے تھے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء نے عظیم الشان جلوس نکال رکھا تھا۔ وہ تمہارے لیے احتجاج کر رہے تھے۔ جلوس میں طالبات آگے آگے تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں تمہاری تصاویر تھیں۔ احتجاجی نعروں کی آوازیں دور دور تک گونج رہی تھیں۔ ٹریک بلاک ہونے کی وجہ سے ہم تین گھنٹے وہیں پھنسے رہے۔ شبیر اتم نے دکالت نامے پر دستخط کیوں نہیں کیے۔ ہمیں دن سے بے مقصد جیل کی سلاخوں میں بند ہونا۔ تم از کم ان ساتھیوں کا خیال کر لیا ہوتا جو تمہارے لیے اتنی دوزخ جلیب کر رہے ہیں۔“

”نہیں، نانا! مجھے اب زندگی کی تسنائی نہیں رہی۔“

”ناباں لڑکے زندگی اتنی ارزاں شے نہیں جسے ایک ہی آزمائش سے گھبرا کر ہار دیا جائے۔ زندگی میں تو اس سے بھی مشکل مقام اور اس سے بھی کڑی آزمائش آتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کا سامان کرتے ہیں۔ جمال مجھے میرا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ابھی وہ آ رہے ہیں۔ تم دکالت نامے پر دستخط کر دینا۔ یہ میرا حکم ہے۔ ایک بوڑھے آدمی کا۔ جسے تمہیں خوشیاں دینے کا ارمان ہے جسے تمہارے لاپرواہانے کی حسرت ہے۔ جو تمہارا بھونا بھونا رشتہ دار ہے۔ شبیر امیر! گھر اور اس کے باہر دور کب سے منتظر ہیں۔ پر کوئی اپنا دوا یا آ یا ہی نہیں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میرا بس چلتا تو میں تمہیں اڑا کے لے جاتا۔ اس زمانے کی ساری سختیوں سے بچا کے چھپا کے۔ مگر ہم سب مجبور ہیں۔ قانون اس دنیا میں ہر شے سے بالاتر ہے اور تمہیں قانون کی ساری ہار کیوں سے دوچار ہونا ہے۔ میں کیا کوئی بھی اس میں کسی قسم کی ناجائز مداخلت کرنے کا روادار نہیں۔ سب سے بڑا نانا بیٹے۔ اگر تم بے گناہ ہو تو پھانسی کا تختہ تمہارا نصیب ہرگز نہیں ہوگا اگر تم یہ جرم کر بیٹھے ہو تو میں بد نصیب خداوند سے تمہاری مغفرت کی دعا کرنے کے لیے باقی رہ جاؤں گا۔ مگر خدا نہ کرے کہ اس کی نوبت آئے۔ شبیر! تمہارا نام کتنا خراب صورت ہے۔ یہ نام عزم و ہمت بہا رہی، جوان مروتی، صبر و استقلال کے پیکر ایک بے مثال ہستی کا لقب ہے جس نے فرات کے میدان میں انسانیت کے لیے مظلوموں کے فخر کے لیے اور ظالموں کی خیرت کے لیے ایک راستان چھوڑی جو پوری بھائی انسانیت کا قابل فخر سرمایہ ہے۔ تاریخ اوقات میں نے تاریخ اسلام کا بھیر پور مطالعہ کیا ہے۔ اس دین کے بانیوں کی یہ خوبیاں سنی ایک انسان کا درجہ نہیں ہیں۔ اس کا ہستی پر عمل کر کے ہر شخص دنیا و آخرت میں فلاح پاسکتا ہے۔ مظلوم ہونا اچھا ہے۔ بہ نسبت ظالم ہونے کے لیکن ظلم کا مقابلہ کرنے کے لیے اسے گلست دینا بھی ہمارا فرض ہے۔ تمہاری پر اسرار خاموشی تمہارا اپنے آپ پر ظلم ہے اور ظلم کوئی بھی اچھا نہیں ہوتا۔ خواہ وہ دوسروں پر ظلم کرے خواہ اپنے آپ پر۔ خود اذیتا تمہارے مذہب میں بذات خود ایک گناہ ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی تم خود کو مسرت کی تار کی تار میں دھکیلیے جا رہے ہو۔“

شبیر سر جھکائے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس آپ ہی آپ آنسو اس کی آنکھوں میں اڑتے چلے آئے۔ اس نے منہ پھیر کر انیس ڈاکٹر ہنری سے چھپا لیا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

”نئی..... نئی..... نئی.....“ وہ اب بھی بچوں کی طرح رورہا تھا۔ منی کے منظر پر اور کانچے ہاتھوں کے راستے اندر داخل ہو کر اس کا چہرہ تھام چکے تھے۔

”شعی! میرے بچے..... میری جان! یہ سب کیا ہو گیا؟ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میرا شعی! زندگی کی باتیں کرنے والا شعی اور قاتل ناممکن ہے۔ بالکل ناممکن۔ ماں کی شکل اس جھوٹ کو بچ بننے سے قاصر ہے۔ کہہ دے شعی تو نے قتل نہیں کیے۔ یہ ایک الزام اور بہتان ہے۔ تیری کردار کشی ہے۔ تجھے گرانے کی سمروہ اکسیم ہے۔ میں جانتی ہوں۔ اچھے لوگوں کے دشمن بہت زیادہ ہوتے ہیں ترقی سے چلنے والے اچھی شہرت سے خار کھانے والے یہ کسی کی سازش ہے۔ تم اکثر میرے خواب میں آتے تھے شعی۔ بالکل اسی حالت میں اور مجھ سے کہتے تھے می! میں نے تو کسی کو اپنے دل کا حال نہیں بتایا۔ کوئی اپنا ہے ہی نہیں۔ تم آؤ گی تو اپنے شعی کے دشمنوں پر مرہم رکھو گی۔ اس کا دکھ درد سنو گی۔“ شبیر نے سر اٹھا کر می کو دیکھا۔

”بچ می!“

”بابا جان۔“

”خدا کی قسم می! میں ہر رات سستی دیر جاگ جاگ کر تھوڑے میں آپ سے باتیں کرتا تھا۔ آپ کو پکارتا تھا۔ بچ ہی تو ہے اور میرا تھا بھی کون جو میرے دل کی بات سنتا۔ میں نے بھی تو زبان بند کر رکھی تھی۔ کون سننا کون بچ اور جھوٹ کی تمیز کرتا۔ کون میرے ہاتھوں میں جھانک کر دیکھتا۔“

وہ اپنے ہاتھ اس کے بڑھے شہو والے سے سے چہرے پر پھیر رہی تھیں۔

”کیسی حالت بنالی ہے اتنی..... کچھ تو اسکی پھپھانے بھی نہیں جا رہے۔ کھانا بھی کھاتے ہو یا قافہ کرتے رہے۔“

”کھانا تھا..... کھانا..... می..... کسی کو کسی کے بل میں لگے دشمنوں کی کیا پروا۔ وہ سب مجھے جھوٹے سمجھے۔ جو کل میرے اپنے تھے۔ ان سب نے بے یقینی کر لیا کہ میں اتنا برا تھا۔ جتنا چند لوگوں نے مجھے بنا دیا۔ می ان بچوں ہوں میں ایک بھی فرد میرے پاس نہیں آیا۔ وہ بھی جنہیں مجھ سے محبت کے بلندہ باگ ہوئے تھے۔“

”ان باتوں کو چھوڑو۔ ابھی تو بس اتنا سا کام کرو۔ اس کا فخر پر دستخط کر دو بیٹے مایوی اور نانا امیدی گھر ہے۔“

جمال کہہ رہے تھے۔ ”تمہارا کیس ایسا بھی الجھا ہوا نہیں ہے۔ بیسیوں لوگ جو جائے حادثہ پر موجود تھے۔ اس بات کی گواہی دینے کو تیار ہیں کہ تم کو گولی چلاتے انہوں نے نہیں دیکھا۔ پولیس اسٹیشن جائے حادثہ سے ایک دو فٹ کے فاصلے پر ہے۔ کسی نے فون کیا اور تیسرے منٹ سے نجی قبل انسپکٹر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ابتدائی رپورٹ میں کہا لکھا ہے کہ جب وہ وہاں پہنچا تو تمہارے ہاتھ میں ریولور تھا اور اس لڑکی کا بے جان وجود تمہارے زانو پر تھا۔ چار فٹ پر انہی زرنہ کی لاش پڑی تھی۔ پولیس نے بطور گواہ ناموں واسطی اور اس کے دوستوں کے نام لکھ رکھے ہیں۔ جمال گل سے آئے ہیں تو ایک بل کو بے فکر نہیں بیٹھے۔ جانے کہاں کہاں بھاگے پھرے ہیں ہمارے تھے۔ ماسوں بہن اور تم میں برائی عداوت تھی۔ اسٹیشن میں بھی وہ تمہارے مقابل تھا ہری طرح بار..... اور وہ لڑکی..... سنا ہے اس کا کوئی تعلق ماسوں سے تھا۔ تم بچ میں آ گئے۔ شبیر! کیا یہ سچ ہے تم نونشاہ میں دلچسپی لینے لگے تھے؟ شادی کرنا چاہتے تھے اس سے؟“

”جی ہاں۔“ اس نے متانت کے ساتھ جواب دیا۔

”مگر..... مگر..... شبیر! تم تو..... تم ہی نے تو مجھے بتایا تھا..... تم اپنی بھوی بھی کی جی گوہر سے.....“

”ہاں می! مگر یہ مجبور کی تھی۔ میں نے محبت کو انسانیت پر قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں اسے چھانا چاہتا تھا۔ میں جو خود کو انسانیت کی حفاظت کا علمبردار کہتا تھا۔ میں اپنے قول و فعل میں یکسانیت پیدا کرنا چاہتا تھا۔ میں نے گوہر کو بھی بتا دیا تھا۔ مگر نونشاہ نے مجھے آزما دیا ہی نہیں۔ میری پیش کش کو قبول ہی نہیں کیا۔ اس نے وہی کیا

جس کا فیصلہ وہ کر چکی تھی۔

”کیا..... کیا فیصلہ.....؟“

”جبر اور ظلم کی اس کہانی کو دہرانے کا حوصلہ مجھ میں نہیں۔ میں آپ کو ایڈریس بنانا ہوں۔ آپ نوشاہی کی گریڈ 1م سے اس بات کی تصدیق اور وضاحت لے سکتی ہیں۔ میں نے کسی کو تو نہیں کہا ہی اسنو نوشاہی کی خاطر بہت بڑا فیصلہ کر چکا تھا۔ میں امتیاز روبرو کو قانون کی گرنٹ میں دے کر انصاف کی آرزو رکھتا تھا۔ میں خود اس قانون کے شکنجے میں جکڑا گیا۔ میں پچھنسی چڑھنسی جاؤں تو مجھے اپنی مظلومیت پر بھی غور رہے گا۔ یہ قربانی میں نے کسی کی ذات کی خاطر دی ہے۔ میرا خدا میرا گواہ ہے۔ یہ گناہی اس کی عدالت میں بے وزن ثابت نہیں ہوتی۔ تو وہ مجھ سے آرمائش سے ضرور نجات دے گا۔“

ایک سپاہی مئی کے قریب آ کر رک گیا۔ اس کے ہاتھ میں چند لٹائے تھے۔ اس نے دو تین لٹائے شیر کی طرف بڑھا دیے۔

”ڈاک ہے آج کی.....“

شیر نے لٹائے لے لیے۔

”کہاں سے آئے ہیں یہ خط؟“

”روزانہ ہی آتے رہتے ہیں مختلف شہروں سے۔ یونیورسٹی کے صدر جنرل میگزینز اور غیرہ لکھتے ہیں۔ مئی.....! نیل کی سلاخوں کے پیچھے آ کر میں نے زندگی کے مارے میں اور بھی گہرائی سے سوچا ہے۔ زندگی کا جھٹکوں سے اور بھی روشناس ہوا ہوں۔ دنیا سے کٹ کر جینا بھی بہت ہری سزا ہے۔ جس نے بھی اسے سمجھا لیا خوب کیا۔ مجھے چلتی پھرتی دنیا میں جو باتیں سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا وہ میں نے یہاں سوچتی ہیں۔ رشتوں کے انوکھے روپ میرے سامنے آئے ہیں۔ ولدیت کے خانے میں میں کسی طور پر شاہناز مل کر کوئی اور نام نہیں لکھ سکتا۔ اس حقیقت سے آنکھیں نہیں چرا سکتا کہ ایک ان دیکھیں عورت میری ماں تھی۔ اس نے مجھے جنم دیا تھا لیکن میں اپنے سارے جذبے آپ کے اور ڈیڈی کے نام سٹوں تو کر سکتا ہوں۔ میرے سب کچھ آپ ہیں۔ خدی اور عذرا بھی بے لوث محبتوں کی خوب صورت شکلیں ہیں۔ زندگی نے میرے جسے میں چہرہ آتش رکھی ہے تو وہ میں آپ لوگوں کے ساتھ ٹل کر ہی دیکھوں اور پاؤں گا مئی! آدمی کے خواب اتنے نا پائیدار اور بے وزن کیوں ہوتے ہیں۔ فضاؤں میں تحلیل کیوں ہو جاتے ہیں۔ مئی! کبھی آپ پر بھی ایسا وقت گزرا جب آپ نے خود کو عدم محسوس کیا ہو۔ جب آپ نے یہ سوچا ہو کہ بھری دنیا میں کوئی ایک خوشی بھی آپ کی نہیں۔“

”سب کچھ تمہارا ہے شیر! ہم ہمارے جذبے اور ہماری خوشیاں..... جو تمہیں نہیں کچھ سکے۔ جو تمہارے قریب نہ آ سکے۔ وہ نادان ہیں اور تمہیں کھو دینے والے بد نصیب..... کل تمہاری ضمانت کی درخواست دی ہے تمہارے ڈیڈی۔ انشاء اللہ ایک ہون میں تم ہمارے ساتھ رہو گے۔ گنہگاروں کی ساری تکلیفیں مل بیٹھنے کی خوشی میں دور ہو جائیں گی۔“

انہوں نے پھر اس کے کال چھتھپائے۔ آنکھوں ہی آنکھوں سے پیار کیا۔ اس کی بلا میں لیں اور چلا گئیں۔

☆☆☆☆☆☆

شیر نے تینوں لٹائے بے دلی سے ایک طرف ڈال دیے۔ اتنے دنوں سے اس کے دل و دماغ پر غارنی جمود ٹوٹنے لگا تھا۔ کچھ جبرے زندگی کا ہنستا سگستا تاج پیغام ہوتے ہیں۔ تم سرنے سے اس لیے بھی ڈرتے ہیں کہ ہمارا

سرنہ بہت سول کو درد و الم اور غم سے دوچار کر دے گا۔ اپنی سموت کبھی کبھی ہمیں اس لیے بھی رنجیدہ کر دیتی ہے کہ ہمیں نہ پتا کہ ہمارے پیارے کتنے رنجیدہ ہو جائیں گے۔ مئی کو وہ کتنا عزیز تھا۔ ان کی آنکھیں کتنی دیر بلکہ سارا وقت کتنی ہی رسی تھیں۔ ان کے آنسو شبیر کے چلتے دل پر گر کر اسے سکون پہنچا گئے تھے۔ کوئی تو تھا اس کے لیے رونے والا۔ اس کی فکر کرنے والا۔ اس کے لیے بے چین رہنے والا۔ مئی سے پہلے خدی آیا تھا۔

”مگر نہ کرتا یا! بھائی بھائی بھائیوں کا بازو ہوتے ہیں۔ میں جو ہوں تمہارا۔“ اس نے سینہ تان کر کہا تھا۔ ”میں تمہارے دشمنوں کا بھرپور مقابلہ کر دوں گا۔ دیکھنا تم..... میری آخر تک میں اور بھی جان ڈال دے گی۔ آج میں یونیورسٹی گیا تھا۔ لڑکے بڑے پر جوش تھے۔ تمہارے حق میں گواہیاں دینے کو تیار۔ تم نے ان بے چاروں کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ ضمانت ہو جاتی تو کیس اپنے اصل رخ پر آچکا ہوتا۔ تمہاری خاموشی تمہارے جرم کا ثبوت بنتی جا رہی ہے۔“

”خدی ارشتوں ناتوں اور محبتوں کے بغیر ایک پلی نہیں جیا جاتا تم لوگ آگے ہو۔ میری خواہشیں پھر سے جاگ اٹھی ہیں۔ میں خود کو قیمتی لگنے لگا ہوں..... میں جیوں گا۔ حالات کا مقابلہ کروں گا۔ ڈیڈی اور مان جان شام کو آئیں گے تو دستخط کر دوں گا۔“

اور اب دستخط کرنے کے بعد زندگی کی طرف لوٹ آنے کی خواہش پیدا ہو جانے کے بعد سارے پھڑے ہونے پھرتے یا داتے لگے تھے۔

”کوہر..... اونٹیا اور جھری ادھر ہو جاتی۔ تمہیں تو اپنے شیر کے پاس آنا چاہیے تھا اور کچھ نہیں تو مگر جان پکڑ کے باز پرس کرنے ہی۔ کیا تمہارے دعوے اور وعدے سب بھولنے تھے۔ تمہیں مجھ سے محبت نہیں تھی۔ کیا تمہارے دل نے بھی میری بے گناہی کی گواہی نہیں دی؟ کیا تم نے بھی مجھے مجرم جان لیا۔ اس صبح جب میں تمہیں لینے آیا تھا۔ کاش تم میرے ساتھ آ جاتیں۔ کم از کم میری بے گناہی کی چشم دید گواہ تو ہوتی۔ کم از کم تم تو مجھے مجرم خیال نہ کرتیں۔“

اسے وہ شعر یاد آئے لگا جو عاتق کے لائے کاغذ کے پرزے پر لکھا تھا۔

ہوں میں تعلق بنتے ہیں لکھوں میں بھلا نہیں کیسے

تو مجھ سے بھگڑنا چاہے تو دیوار اٹھا ہیرے ہیرے

تم نے بے گناہی اور انیسیت کی اتنی ساری دیواریں ایک ساتھ کیسے اتھادیں گوہر؟ تم مجھ سے بے خبر کیسے بیٹھی ہو گوری! کیسے؟ کیا ایک لمحہ تھا ہماری تمنا کہ ہمیں اس کے وزن سے دب کر ہم توڑ گئیں؟ غماہوں میں آئی ہو۔ رہتی ہوئی۔ بگڑتی ہوئی۔ ایک بار ہی آ جاتیں۔ میرا حوصلہ بڑھ جاتا۔ مجھے تسلی ہوتی۔ یقیناً تم اسی بات پر مجھ سے خفا ہوئی تھیں۔ وضاحت کے کسی لمحے کی نوبت ہی نہ آئی۔ میں تو مجبور تھا گوہر تم مجھ سے جواب طلب کرنے ہی آ جاتیں۔ نہیں تم..... تم بھی تو ان ہی میں سے ہو۔ جنہوں نے میرے پاس لاشعری کے پیام بھیجے ہوئے مجھ پر درہم بھرتہ میں نہیں کھایا رشتوں کی نزاکت کو بل بھر کو محسوس نہیں کیا۔

آمنہ چاہی۔

دنواؤں چاہا۔

پگھا جان۔

یہ سارے پیارے پیارے لوگ میرے جہم کی تصدیق کے بغیر مجھ سے خفا ہو گئے۔ جیل تم سے قرونوں کے





فاصلے پر تو نہ تھی کہ تم آؤ نہیں۔ اچھا کیا تم نے شاید۔ نہ آئیں۔ نزل میں قید ہونے والے تو برے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک اچھی لڑکی اسی بری جگہ آ کر کرتی بھی کیا۔"

اس نے ویار سے سر کا لیا۔ نئی صبح کے انتظار میں جو اپنے جلو میں حیات نو کی امید لیے آنے والی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

گھر میں چاروں طرف مسرتوں بھرا ہوا تھا۔ نیلمہ نے چند روزوں میں اپنی قریبی سہیلیوں اور کزنز کو بلوا لیا تھا۔ گھر کا گوشہ گوشہ کونا کونا خوشی کے اظہار میں بنتا دکھلا دکھلا نظر آ رہا تھا۔ حویلی کے دروازوں سے بند پڑے بے شمار ہانسی کمرے صاف کر کے آراستہ کیے گئے۔ لڑکیاں دن بھر شادی کی تیاریوں میں لگی رہیں اور رات کو دیر تک ڈھولک پر شادی بیاہ کے گیت گائے جاتے۔ یہ شادی اس گھر کی پہلی خوشی تھی۔ ایک عرصے سے اپنے بیٹے روم تک محدود رہنے والی نیلمہ واسطی بھی ہمہ وقت لڑکیوں کی سرگرمیاں دیکھنے کے لیے ان کے کمروں میں پانی جاتیں۔ ڈاکٹر بارہان کا غیر ملکی دورہ کچھ نواں لگتا تھا۔ نیلمہ خاصا پریشان تھی۔ پھر چائیک وہ مستند پور آئے تو لڑکیوں کی فوج نے انہیں اپنے گھرے میں لے لیا۔

"کیوں بھئی یہ لشکر کشی کس سلسلے میں؟" ان کے کورس میں کیے گئے سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے۔ کس سلسلے میں۔" نیلمہ اٹھلائی۔

"میں غم خیم کا ہر ہول نہ غیب کا حال جانتا ہوں۔" وہ مسکراتے۔

"پھر بھی سزا ذرا بہن پر زور تو دیجیے۔"

"بھئی جہاں تک میں جانتا ہوں میرے اسپتال کا افتتاح ابھی ممکن نہیں ابھی کچھ فی معاملات باقی ہیں۔ اور جب بھی ایسی کوئی بات ہوتی ہے تو خود ہی آپ کو بلا لیتا۔ ان کے علاوہ کیا ہوتا ہے۔" وہ سوچ میں پڑ گئے۔

"جناب ڈاکٹر بارہان واسطی صاحب یہ یہ تقریب ہے جس کا افتتاح ہم سب کو مل جل کر کرنا ہے۔ ہم کو بھی ترتیب دینا ہے اور ہم کو ہی افتتاح تک پہنچانا ہے۔" نیلمہ کی تاکید میں وہ سب کی سب ہنس دیں۔

"کیا بیٹا سے سسر؟"

"یہ جیس تو ہم بھی جانیں۔" کسی نے ٹکڑا لگا لیا۔

"میں ہار گیا صاحب۔۔۔۔۔ آپ ہی بتا دیجیے۔"

"بارہ سلیم کی ہے تو تیرا ماں بھی ادا کرنا ہوگا۔ سزا بھی بھگتانی ہے گی۔" کئی ایک نے بیار بھری شرط عاید کر دی۔

"یہ کیسی خبر ہے جو جرمانے اور سزائے بغیر ہم تک نہیں پہنچ سکتی۔"

"بہت تھی بیاری خبر ہے۔ سبس گے تو۔۔۔۔۔" رافقہ نے فخر اچھورا چھوڑ دیا۔

"کہیں اس چیز میں نے ہم سے بالابال کوئی امتحان تو پاس نہیں کیا اور اس خوشی میں آپ کو نہ ہو کر لیا۔" وہ بہن کو دیکھ رہے تھے۔

"امتحان۔" وہ ساری ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑیں۔

"امتحان تو آپ کا ہونے والا ہے۔ ہم سب آپ کے مددگار ہیں۔ اتنے دنوں کی دغا نہیں تب کہ یہاں گے جب ہمارے منہ میاں گرم ہوں گی۔ ہمارے دل خوش ہوں گے ہم جو کہیں گے آپ اس گے۔"

"نیلمہ! چترا اب بس بھی کرو۔ زیادہ سسپنس بھی اچھا نہیں ہوتا۔" نیلمہ نے اشارہ کیا آنکھوں سے وہ سمجھ گئی۔

سب نے تالیاں بجاتا شروع کر دیں۔

ڈھولک بجا کے سہیلیاں بلا کے ہرے کے گیت میں گاؤں گی

میں اپنے بھیا کو دولہا بناؤں گی بھیا پیارے پیارے سے بھیا

بھولے بھالے بھیا۔۔۔ پیارے پیارے بھیا

شونہ سے گائے ہوئے نیلمہ نے ان کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔ کچھ دیر بعد تالیاں موقوف کر دی گئیں۔

"اوہ آئی سی۔ تو یہ بات ہے۔" ان کے چہرے پر حیا آمیز مسکراہٹ آ گئی۔ چہرہ سرخ ہو گیا؟ کھیں پلہ کو جھک گئیں۔

"سازشی لڑکی! میرے جاتے ہی اپنا کام دکھا دیا۔"

"نہیں سر! اللہ کے کرم سے۔" نیلمہ نے سعادت مندی سے سر جھکایا۔

"کون ہے وہ بے چاری لڑکی جسے ہمارے بچے باندھا جا رہا ہے۔"

"آپ کا سوال غلط ہے وہ بے چاری ہرگز نہیں ہے۔ وہ تو خوش نصیب ہے۔ آپ جیسے انسان مقدر والوں کو ملا کرتے ہیں۔" رانی نے انہیں دیکھا۔

"بس بس زیادہ بنانے کی ضرورت نہیں۔ ہم جان گئے ہیں تم سب کا دکھا۔ یہ خوش بیانیاں صرف اسی خاطر ہیں کہ ہم تمہاری منہ مانگی فرمائشیں پورا کرنے میں تاخیر یا ٹک سے کام نہ لیں۔ سو جناب کھن لگانے کی بالکل ضرورت نہیں یہ بندہ کچھ دیر آرام کے بعد آپ کو ہر جگہ لے جائے اور اپنی سزا اٹھانے کے لیے تیار ہوگا۔ ماں جی کہاں ہیں؟ میں ان سے تول لوں۔"

"وہ آپ کو یہاں نہیں لیں گی۔ ماں جی بابا جی اور ماسون بھائی باڑا گئے ہوئے ہیں۔ واپسی میں لاہور رکھیں گے۔ اور جناب ٹھیک بارہ دن بعد آپ جناب دولہا بیٹے۔ ہزاروں خوشیوں کے چھوٹوں میں گھرے۔ گوری جی کو بہاری بھائی بنانے جا رہے ہوں گے۔"

"گوری جی۔۔۔۔۔" ہارون نے حیرت کے ساتھ دہرایا۔

"جی ہاں وہی گوہر نایاب جو چشم فلک کے مہربان روپے نے ادھر بھیج دیا تھا۔ جسے دیکھنے کے بعد آپ کسی کو دیکھنے کے قابل نہ رہے یا جسے دیکھنے سے پہلے آپ نے کسی کو دیکھا نہ تھا۔" عارفین نے بڑی اداسے کہا۔ وہ نیلمہ کی خاص الخاص سہیلی تھی۔ شاید نیلمہ نے اسے بلکہ سب کو پسندیدگی کی یہ چھوٹی سی داستان سنا رکھی تھی۔

"شریر لڑکی! تم نے اپنے بھائی کے نام پیکرے ان لڑکیوں کو بھی بتا دیے۔"

"بھائی کیا ہے بتانے میں۔ کیا خبر یہ بھی ہارون میں گھر سے نکل کر کسی دیران راستے پر بے ہوش ہو جانے کا ورامہ ہے۔ آپ جیسے کسی جویر ڈھنڈھو کو پالیں۔ بیٹوں کا بھلا کیا ہے میں نے یہ سب کچھ بتا کر۔" وہ پھر مسکرایا۔

"ہارون بھائی! کیا وہ واقعی بہت زیادہ خوبصورت ہے۔" ایک کزن نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"مجھ سے نہیں نیلمہ سے پوچھیے۔ اسے خبر ہوئی۔ میں تو اس واقعے کو بھی بھول چکا۔" انہوں نے بے نیازی بنانے کی کوشش کی۔

"گپ گپ ساری گپ۔ بھیا جانی اپنے چہرے کو اپنی زبان کا ساتھ دینے کی تہیہ کیجیے ورنہ جھوٹ سے پرہیز کیجیے جھوٹ آپ کے چہرے پر لکھا ہے۔" نیلمہ نے بیار بھری ٹک سے لڑکا۔

ہارون نے اعتراف کے طور پر سر جھکا لیا۔ ان سے نپٹ کر وہ اندر کمرے میں آئے تو ان کے بیٹے کے سر ہانے



سائیز لہیل پر خوبصورت سا اہم جراتھا۔ وہ چونگے۔ یہ اہم تو انہوں نے خریدنا تھا۔ پہلے کبھی دیکھا تھا۔ بڈ پر بیٹھے ہوئے انہوں نے اہم اٹھائے۔ پہلا صفحہ کھولا۔ چھوٹی چھوٹی خوش رنگ۔ چنگیزوں سے مبارک نکلتا تھا۔ پہلی تصویر میں وہ دلہن تھا پہلی تھی۔ وہ جوان کے خوبصورت دل کا پہلا اور بہن بن گئی تھی۔ جسے پا کر انہوں نے خود کو خود دیا تھا۔ انہوں نے ورق پلٹا۔ اس تصویر میں ان کی والدہ اس کے ہاتھ میں اگلی پہن رہی تھیں اور اس کے پہلو میں بیٹی نیلا شریار انداز میں مسکراتے۔ اسے گویا اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ دودھ پلٹتے گئے۔ ایک سے بڑھ کر ایک..... عمدہ فوٹو گرافس ان کے سامنے آئی تھیں۔ درمیان میں انہیں ایک لٹاؤ رکھا تھا۔ نیلے رنگ کا لٹاؤ۔ انہوں نے اسے اٹھا لیا۔ کہہ لیا تو اس میں ان کے نام کا خط تھا۔

بھیا جانی!

آداب.....! آپ واپس آئیں گے تو ہم لوگ کچھ ضروری خریداری کے لیے سٹور پورے سے باہر جا چکے ہوں گے۔ یہ پیار سا لٹاؤ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ مگر تہن اقدار ہے عز و شرف پیارے بھیا! آپ سکندر پوری کو لائی کا سب سے بڑا مان ہیں۔ آپ کی خواہش جان دے کر بھی پوری کرنا پڑتی تو گزرتا۔ اس موقع پر میں خوش بھی ہوں اور نازاں بھی۔ اس خاندان سے ہماری برسوں پرانی عداوت تھی۔ یہ رشتہ اس عداوت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا۔ جنگامی بنیادوں پر مفکری کرنے پر معذرت خواہ ہوں۔ ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ میں نے یہ فتح بڑی محنت اور جہد کے بعد حاصل کی تھی۔ اور اسے ناکامی میں بدلنا نہیں دیکھنا چاہتا تھا (بہن یہ الفاظ بڑھ کر حیران تھے) آپ کی کسی محسوس ہوئی لیکن پھر دل کو یہ کہہ کے تسلی دے دی کہ ابھی تو بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

بھیا جانی! بہن کی سہیلیاں اور کزنز مجھے دیکھ کر غلط چہلی میں مبتلا ہو گئیں۔ ان کے درمیان ہونے والی سرگوشیوں نے مجھ کو ڈاکٹر ہارون سمجھ کر کہہ رہی تھیں گو کہ مجھے خوش چہلی میں مبتلا کر دیا لیکن میں نے انہیں ضرور آگاہ کیا کہ میں ڈاکٹر ہارون نہیں ہوں۔ وہ جب آئیں گے آپ لوگ انہیں دیکھیں گی تو زنانہ مسخری طرح اپنی انگلیاں کاٹ بیٹھیں گی۔ بھیا یوسف ڈانی ہی تو ہیں۔ یہ تصویر میں نے بطور خاص آپ کے لیے بنائی ہیں۔ اور آپ کو نہ صرف مسکرائی بلکہ اس انتخاب کا جواب کی مبارک باد بھی دے رہا ہوں۔ ماں جی کی خواہش تھی پوری کی سچھیل کے لیے ان کے اور بانی کے ساتھ جا رہے ہوں۔ مزید بھی یہ بتا دیں گے۔ واپس پر آپ سے ملاقات ہوگی۔ آپ شہر جا کر نیل بڑوانی اور عاصم صاحب سے رابطہ کر کے انہیں اپنا آمد کی اطلاع ضرور دینی ہے۔ ان کے اہل خانہ آپ کو دیکھنے کے خواہش مند ہیں اور ہوسکتا ہے کہ وہاں جا کر آپ کو ان کا رخ روشن بھی دیدار کوشش جائے ان کے فون نمبر بچے درج ہیں۔

والسلام

آپ کا

مامون واسطی

"بہت بے وقوف لڑکے اپنے بھائی کی پسند کو کتنا سیریس لے لیا۔" ہارون واسطی خط پڑھ کر زور بلب مسکرا دیے۔ ان کی نظریں سامنے موجود تصویر پر جم گئیں انہیں مامون پر چار آنے لگا۔ بس لڑکے نے تو دن رات ایک کر دیے اور اس کا اتنا چٹھا کاندہ کاندہ تمدان سب معلوم کر کے ہی دم لیا۔ کتنا خوش ہے مامون۔ خوشی اس کے قلم سے نکلے الفاظ سے چمک رہی ہے۔ نیلا تو یہ بانی ہو رہی ہے۔ شاید انہوں کی خوشی ہی طرف ہی خوشی دیتی ہے۔ یہ رشتے ہی تو ہمیں جذبات کو بچان چھتے ہیں۔" اہم الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے وہ خوش رنگ اور دلچسپ خوابوں

میں کھو کر نیند کی وادی میں جا ترے۔

☆☆☆☆☆☆

"آخر حیلے میں حرج ہی کیا ہے۔ کل نہیں تو پر سوں یہ سادی چیزیں تمہارے استعمال میں آئیں گی۔ شادی میں دن ہی کتنے روگئے ہیں۔ رات بھی ابالون پرائین واسطی صاحب سے بات کر رہے تھے۔"

"کرتے رہیں! میں نہیں جاؤں گی۔ نہیں بے صبرے دل میں کوئی تمنا آرزو۔ آپ جو ہیں جانے والے! نے آئے گا سب کچھ۔"

"کیا کھد رہی ہو تم۔ تمہیں پتا ہے اب نے مجھے اسی لیے تو بلوایا ہے۔ نیل نے جس میں بھی بک کرالی ہیں۔ اجنبائی ضروری کاموں کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ صرف تمہاری خاطر۔"

"میری خاطر! ماں ساتھ چلی جاؤں! سرنی بھائی کو بتا جائے۔ مجھے کچھ نہیں کرنا کہیں نہیں جانا مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا ہے۔"

"گوری! حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ شہیر تمہیں ٹھکرا چکا تھا۔ پھر تو قسمت نے ہی اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اس نے تمہیں صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ تمہاری جگہ کسی اور کو دے چکا ہے۔"

"جو ہر آ پائے! گوہر کی آنکھیں پھٹ گئیں۔"

"جو ہر آ پائے۔ آپ کتنے عام سے انداز میں اس کا ذکر کر رہی ہیں۔ کس سبوت سے مجھے ہاؤ کر رہی ہیں کہ وہ میری جگہ کسی اور کو دے چکا تھا اور میں بھی اسے بھول کر ایک نئی دنیا آباد کر لوں۔ آ پائے تمہاریاں صرف اس لیے نہیں ہوتیں کہ اپنے اچھے برے اثرات چھوڑ کر دفن ہو جائیں! کچھ بتیوں تو زعمہ زہتی ہیں دلوں میں روجوں میں۔"

"لعنت سے تم پر۔ شرم آئی جا ہے تمہیں! جس نے تمہیں ٹھکرا دیا تم اسے دل میں ہسائے ہوئے ہو۔ تمہیں خبر ہے اب تم شہیر کی محبوبہ نہیں ڈاکٹر ہارون کی ہو۔ نے والی ہوئی ہو تمہاری شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ شہیر کا خیال بھی دل میں لانا تمہارے لیے گناہ ہے۔" جو ہر بگڑ گئیں۔ گوہر نے انہیں غصے سے دیکھا۔

"شہیر کا نہیں ہارون واسطی کا خیال دل میں لانا میرے لیے جرم ہے! گناہ ہے۔" اس نے جتلیا۔ جو ہر نے چونک کر اسے دیکھا۔

"گوری! کیا کھد رہی ہو تم؟"

"وہی جو آپ کی اس معاشرے کی سمجھ سے بالاتر ہے۔"

"کیا؟"

"آپ نے کسی سے محبت کی؟ کسی کو سن میں بسایا؟ ہرگز نہیں۔ آپ کو کبھی محبت کی ضرورت پیش ہی نہیں آئی۔ آپ کے خوابوں میں کوئی انسان کم کم اور دلالت جاہ و حشمت زیادہ تھے۔ نیل بڑوانی آپ کو بل گئے۔ آپ اب بھی ان سے کم اور ان کی حیثیت سے زیادہ بجا کرتی ہیں۔ آپ نے ہمیشہ سے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ آپ اسے اپنی زندگی کا ساتھی مانیں گے جو آپ کے خوابوں کی قیمت ادا کر سکے گا۔ مل بیٹھنے پر تو جانور اور انسان بھی ایک ہرے سے محبت کرتے ہیں۔ آپ میری بات سمجھ ہی نہیں سکتیں یہ محبت کیا ہوتی ہے۔ عہد وفا کسے کہتے ہیں۔ توایت کس شے کا نام ہے۔ میں آج کل کی لڑکیوں کے اس فلسفے کو نہیں مانتی۔ اس طریقہ کار کو سخت ترین جرم سمجھتی ہوں۔ آج کل ایک کے بعد دوسرے کے بعد تیسرے انسان کی سمت جھٹکا! شاید فیشن میں شامل ہو گیا ہے! سن نے شہیر کو بھی بطور قبول کیا تھا تو اس لیے نہیں کہ چند ماہ یا چند سال بعد میرا اس کا ساتھ چھوٹ جائے گا۔ میں



نے اسے عمر بھر کے لیے اپنا سانس ہی مانا تھا۔ قبولیت اسی احساس ہی کا نام ہے جس کا خدا کی خوشنودی کے ساتھ اور اس کے احکام کے مطابق مجمع میں مقدس آیات کے سامنے میں خدا کا ہم نے کراہان کیا جاتا ہے۔ تاکہ دونوں کو مل کر نبی زندگی گزارنے کا جو شرعی اختیار مل رہا ہے اس سے زیادہ ہی آگیا ہو جائے۔ ان کی نئی معاشرتی حیثیت قبول کرنے۔ کچھ لوگ اس نئے ساتھ کے گواہ بھی ہیں بلکہ اس بات کے گواہ بھی ہوں کہ ہر وہ ساتھی اسلامی تو ہیں کے مطابق ایک دوسرے کے پابند ہیں۔ انہوں نے زندگی کی اسلامی حدود و حدود کا خیال رکھنا ان دونوں کا فرض ہے۔ میں نے شبیر کو اپنا مانا تھا اپنا آپ اس کے نام کیا تھا۔ اس نئی کے احکام کے حادثے کے بعد میں نے اپنے آپ کو سمجھنے کی قید میں دینے کی فکر پر کوشش کی ہے۔ لیکن میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ ایک شبیر نام کی شے جو میرے اندر ہے وہ مجھے پریشان کیے ہوئے ہے۔ اس نے میری ہاں سرد کی ہوئی ہیں۔ یہ میرا دل جو ہے۔ اندر ہی اندر ماتم کمان رہتا ہے۔ رہتا رہتا ہے۔ میں سخت بے سکون ہیں۔ مجھے ہاروں واسطی جتنے شادی سے ساز و سامان سے کسی بھی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مگر میں وہی پرانی روایتی قصے کہانیوں والی لڑکی ہوں مسلمان لڑکی جو دنیا کے کسی بھی خطے میں ہو شرم و حیا ایثار و قربانی اس کا مظہر ہوتے ہیں اس کے کردار کا حصہ ہوتے ہیں۔ والدین کی عزت کی خاطر وہ اپنا آپ عمر بھر کے لیے عذاب میں ڈال کر بھی فریاد نہیں کرتی۔ آپ میری مجبور یوں کو اس قدر مجبور نہ کیجیے۔ بے شک میں ایک بے جان کھلونا ہوں۔ نہ میری کوئی مرضی ہے نہ مانے۔ پھر بھی میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ اتنا فیصلہ کرنے کا حق ضرور ہے مجھے میرے ارمانوں کی لاش آپ خود ہی دہن کرتی رہے۔

”مگر ہر تمہارے تو بہن کو اپنا دشمن ہی خیال کر لیا ہے۔ تم نے تو یہ جان لیا ہے کہ مجھے شبیر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں کبھی خوش ہوں کبھی مچھن سے ہوں۔ تم مجھ سے رشتوں کے درہ کا اور آگ تو نہ چھینو مجھے تو غصہ ہے شبیر پر اس نے تمہیں کیوں ٹھکرایا۔ اگر بد واقفہ پیش نہ آیا ہوتا تو اباجان شبیر سے یوں متنفر نہ ہوتے۔ وہ جتنی بڑی مصیبت کا بھی شکار ہوتا وہ اس کے ساتھ ساتھ نہ ہوتے۔ لیکن ان نئے رشتوں کے درہ ان سے خود بخود بند کر دیے۔ پھر تم نے بھی غلطی کی۔ وقتاً فوقتاً ماسوں کو بتا کر نہیں اس کے خلاف کرو یا اگر وہ تمہیں اتنا ہی بڑی بڑی تو خود ہی اس سے ہنسی پھرتیں بات بزرگوں تک تو نہ پہنچائیں۔ یہ آگ تمہارے خود لگتی ہے۔ اب جو کچھ چلے اسے قبول کرو۔ برہداشت کرو۔ تماشا نہ بھجو۔ دوسروں کے دل تو تہ جلاؤ۔“

”میرے خیال میں یہ سب تو نہ تھا کہ یہ سب بھی ہو جائے گا۔ میں نے تو۔ میں نے تو غصے میں آ کر انہیں بتا دیا تھا۔“ گویا ہر رونے لگا۔

”رہمت..... اور چٹنی چلو۔ تمہیں خبر ہے میں نے کیا سوچ رکھا ہے۔“

”کیا؟“ ان نے جو ہر کے فیصلہ کن انداز پر ان کی طرف دیکھا۔

”میں تمہیں شبیر کے پاس لے چلوں گی۔ مل لینا اس سے۔“

”جی آئی۔“ وہ بے چین سے ہوئی۔

”ہاں۔ مگر اگر تم تمہیں سے پوچھو تو کہیں کہ اس نے تم سے بے وفائی اور بد فکرانہ جیسے عقین جرم کیسے کیے تمہارا سے دن میں تو اس کی صحبت بھی ہی میں بھی اس کی قدر کرتی تھی۔ کچھ تو مجھے بھی ہوا ہے اس نے کبھی دینے کا۔ گوری میں نے نہیں سے کبھی بات کی ہے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں ان سے چوری کوئی کام کرتی تو میرا شبیر مجھ پر ملامت کرتا۔ ہم دونوں ہی ہمارے ساتھ چلیں گے۔“

”اچھی آئی آپ کی بے حد مہربانی۔ میں چلوں گی ضرور چلوں گی۔ آخری ہارسٹی میں اس سے مل تو لوں گی۔ اپنے دل کی باتیں اسے بتا تو سکوں گی۔ اس کی بے وفائی کا شکوہ تو کر سکوں گی۔“

گویا خوش ہوئی۔ روتی آنکھوں میں لگی دوپٹا لگی رہی تھی۔ اس نے اپنا سر جو ہر کے کندھے پر تکا دیا۔ جو ہر نے اسے گلے لگا لیا۔ اس کی پیشانی چوم لی۔ ان کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

☆☆☆☆☆☆

بچپن و عدالتی کارروائیوں سے گزر کے جمال احمد نے شبیر کی عنایت پر رہائی کا عدالتی حکم حاصل کر لیا۔ انور عباسی نے شبیر کا دفاع بڑی قانونی مہارت کے ساتھ کیا۔ دو ہرے قتل کے ٹیس منظر کی کہانی کے سارے کرداروں کے ساتھ رابطہ کیا تھا۔

امتیاز رند کے والد اپنے علاقے کے خاصے با اثر زمیندار تھے۔ اپنے بیٹے کے قتل کی خبر پر بھاگے چلے آئے۔ بیٹے کی میت لے کر اپنے گھر گئے تو امتیاز کے ساتھ موجود ملازم بھی ان کے ہمراہ تھے۔ آٹھ دنوں تو شدید مدد سے میں ہی نکل گئے۔ لوگوں کا آنا جانا۔ قاتل درود تعویذ، دس دن بعد ریاض خان اکیلے ہوئے تو امتیاز کی خدمت پر بلا ملازم رہیں نے انہیں حقائق سے آگاہ کر دیا۔ وہ انتہائی نرم مزاج، انصاف پسند، سنجیدہ اور خدا ترس انسان تھے۔ اور ملازم نہیں ان کے لیے قابل اعتبار انسان تھا۔ اور امتیاز کے والد اپنے بیٹے کے قتل سے کچھ نہ کچھ واقف بھی تھے۔ پھر امتیاز کے مرنے سے ایک رات قتل شاہ کو اسی نے نو شاہ کا فون بھی اٹینڈ کیا تھا۔ امتیاز کو تہہ پا کر اس نے رہیں کو بتا دیا تھا کہ آج نہیں تو قتل وہاں کے ہاتھوں ہارا جائے گا۔ یہ وہی ملازم تھا جس نے نو شاہ کی عصمت ورثی کا بھیا تک کھیل خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رکھا تھا۔

ان وجودت کی بنا پر انہوں نے کیس کی بیرونی نہیں کی۔ وہ صرف اس بات سے ڈرتے تھے کہ عدالت میں ان کے بیٹے کا کردار بھی زیر بحث آئے گا۔ رہیں کی آنکھوں نے ساری کہانیاں جو اپنی بصارتوں میں محفوظ کر رکھی تھیں ریاض خان صاحب کے گوش گزار کر دی تھیں۔ طلبہ کی تحریک نے جو پورے صوبے میں جوش و خروش کے ساتھ چلنے پڑی تھی۔ پولیس کو چنگا دیا تھا۔ ایک سوئی رقم کی خاطر ایک بے گناہ کو تختہ دار کی طرف لے جانے کی کوشش میں انہیں ناکامی بھی نظر آنے لگی تھی۔ استغاثہ ابتدائی رپورٹ سمیت کمزور تھا۔ ہیکل منافی نے جنت کے دوران ملازم کی بے گناہی کے بارے میں جی شہت پیش کیے تھے۔

یونیورسٹی کے سینئیر طالب علم شبیر کی بے گناہی کی گواہی دینے کو تیار تھے۔ وہ اسے ہر حال میں بچانا چاہتے تھے۔ لڑکوں نے ہائی کورٹ کے قاضی اور ماہر ترین وکلاء کا تعاون حاصل کر لیا تھا۔ وہ عدلیہ کے دائرہ کار پر اثر انداز نہیں ہونا چاہتے تھے۔ بلکہ انصاف سے طلبہ کا رشتہ۔ ابتدائی ابام میں تو وہ ایتھ آئی آر کی نقل لینے میں بھی ناکام رہے۔ لیکن جب نقل منانے آئی تو اس میں ناموں واسطی اور اس کے دو دوستوں کا نام مہر کے گواہوں کے طور پر موجود تھا۔ لڑکوں نے قتل کے اس الزام کو سیاسی انتقام ثابت کرنے کے لیے بھر پور قوت صرف کر دی۔ شبیر کے حامی طلباء رقم ٹھیک کر میدان میں آ گئے۔ جلیوس اور جنسیوں میں شبیر کے کردار کی وضاحت کرنے کے ساتھ دو ناموں واسطی کے اوصاف بیان کرنا نہ بھولتے پہلے دو چار دن ناشی اور استہزاء کا ٹیس ایک معرہ بنا رہا۔ شبیر نے اپنا زبان بند کر رکھی تھی۔ وہ نہ کسی کے خلاف بولا نہ اپنے حق میں کوئی بات کی۔

لڑکوں نے اس سلسلے میں امتیاز رند کے ملازمین اور نو شاہ ہاؤس کے قابل خاصہ سے رابطہ کیا تو ساری کہانی منظر عام

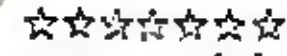
شیر کے دفاع میں لڑکوں نے اپنی تمام تر قربت استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ شیر عظیم کا شکار ہو جائے یہ شیر کی نہیں ایک ذات کی نہیں اچھائی کی شکست تھی اور وہ سب جو امن اور خیر کے طلب گار تھے۔ بدلتی فضاؤں اور بدلتے رنگ ڈھنگ کے لیے شیر جیسے باعمل اور بہادر نوجوان کی موجودگی ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ انتہا بات میں مامون نے اپنی شکست سے لگنے والے زخموں کو پہلے شیر بھل کر انے کی بجائے سائز کے ذریعے مندرج کرنا چاہا۔ جب اس میں ناکام ہوا تو اسے ایک غیر متعلقہ شخص جو اتفاق سے یونیورسٹی کے ہیٹ پر اس کی موجودگی میں ہوا اور جس میں شیر زبانی ہمدردی کے تحت ایک انسان ڈنڈو کشی سے روکنے کی غیر احتیاطی و اختیاری حرکت کے تحت ملوث ہو گیا۔ قتل کا اصرار اس کے سر پر ڈال کر اسے پھانسی کے تختے تک پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اپنی بیٹی کی موت کی خبر حیدرزمان تک بھی پہنچی تھی۔ کئی دن وہ لندن میں ہی خدیوہ سے دو چار ہا اسپتال کے ایک کمرے میں زیر علاج رہے۔ پندرہ روز بعد پاکستان آئے۔ وہ خود بھی ایک لائق اور ہونہار قانون دان تھے۔

نوشی نے مرنے سے ایک دن قبل ایک ریسٹریوٹیشن میں اپنی برادری اور اپنے عزیزوں اور اپنی مساعی کی ماری داستان نہیں نکھ دیا تھی۔ اور مرنے سے قبل کی رات اس نے فون پر انتہائی دلگیر لہجے میں بائیس باخبر کیا تھا کہ وہ اتنا تازہ دم کو قتل کر کے اور خود کو اپنے ہاتھوں مار کر ہی اپنی ذہنی اور روحانی اذیت سے نجات حاصل کر سکے گی۔

حیدرزمان نے پاکستان آئے کے شیر سے قبل میں مذاقات کی مجال احمد کی ان سے ملنے نوشی کی باتوں اس کے ایک ایک پل سے واقف تھیں۔ لڑکوں نے ان سے نوشی کے بارے میں ایک ایک بات پوچھی۔ لڑکے کسی منظم سرکاری یا غیر سرکاری سراغ رساں ایجنسی سے بھی زیادہ بہتر کام کر رہے تھے۔ ان کے خیال میں نوشی کا ڈراما ہمد شیر وہ اس فن کے متحرک دانش کا بہتر نمونہ تھا۔ آٹھ دن کی مسلسل بھاگ دوڑ کے بعد وہ شیر کو زیر نیش لانے میں کامیاب ہو گئے۔ جس نے پولیس کے سامنے یہ اعتراف کر لیا کہ وہ اتنا تازہ دم کی طرف سے معقول رقم کی فراہمی پر نوشی کو اس کی رہائش گاہ پر بے ہوشی کے عالم میں چھوڑ آیا تھا۔

کیس کی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھنے لگیں۔ شیر حمانت پر رہا ہو گیا۔ ایک نئے بعد کیس کی سماعت کے لیے تاریخ جی دے دی گئی۔



پورے چوبیس دن بعد گوہر گھر سے نکلی تھی۔ شیر کو کھودینے کے بعد یہ جہان اس کے لیے تھا عجیب ہو گیا تھا۔ کتنا خالی خالی وہ دوران سفر شیر کو سوچتی رہی۔ یونیورسٹی میں گزرنے کے بعد اللہ پور میں ایک ساتھ گزارے ہوئے دن رات۔ شیر کی بے تاب محبتیں بلند و بالا الفاظ اس کی سنجیدگی اور کے ٹھوس عزم۔ اس کا وقار اس کا مضبوط کردار۔ دنوں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ وہ دنوں ہی تھی رہے تھے۔ ایک دوسرے سے جدا ہو سکے۔ وہ سمجھتی تھی شیر ایک دن کے لیے جدا ہو جائے وہ مر جائے گی۔ شیر کا خیال تھا گوہر کو دیکھ بٹا کوئی صبح صبح ہی نہیں ہوگی۔ لیکن وہ جدا ہوا تو گوہر کی کو موت نہیں آئی۔ شیر نے اسے نہیں دیکھا تو بھی صبح اتنی شان سے رات کو مات دے کے آئی تھی۔

غلطی کس کی تھی؟ بدلا کون تھا؟  
وہ یا شیر۔

شاہد وہ بھی بے حوصلہ تھی۔ آئینہ یا ت نہ سہا سکا۔  
شاہد محبت اتنی ہی بے حوصلہ ہوتی ہے۔ محبت کے دامن میں تو محبت کی جگہ ہی ہوتی ہے نفرت کا ایک خار بھی اس میں نہیں ہا سکتا۔

شاہد بات کرنے کا ڈھنگ نہ تھا۔ وہ اس سے بدلہ ہی گیا تھا تو اسے کسی سلیقے اور طریقے سے ہی مطلع کرتا۔ دیکھ دن اس سے یہ واردات چھپا ہی لیتا۔ اسے جھوٹ سے بہلا رہتا۔ پر اس نے تو جھوٹ سے ایک بام بوم اس پر گر دیا۔ محبت کی جگہ میں کھینچے پھیلوں میں آگ لگا دی۔

دوسرے کچھ بھول گیا اپنے وعدے بھی۔ عہد بھی۔ ساتھ گزرے دن بھی۔ خواہوں میں بسر ہوئی راتیں بھی اپنے قاب بھی۔ خواہوں کے تانے بانے بھی۔ معاملات محبت میں کھو کر شیر اور اس کی ہر بات کو معتبر جان کر وہ ہمہ دم ان سے بہت دور یقین کی سرحدیں پار کر کے اعتبار و اعتماد کی پر سکون فضا میں آ کھنچی تھی۔ شیر کی سنگدلی نے اس کا وجود ہی ریزوریزو کر دیا تھا۔ حالات کیسے اچانک بدل گئے وہ ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہونے سے قبل سوہ کرنے کی غرض سے ہی سہی اس سے ٹس بھی نہ تھی۔ جدا ہونے کے لیے نقصان کا باعث ہی بنی۔ گوہر نے تو تازہ اعتماد ہی کھویا مگر شیر سے تو زمانہ تو روٹھ گیا۔ جاننا ہی تھا ہو گئے۔ تقدیر نے اسے مجرموں کی صف میں لگا دیا۔ محبت میں گناہ معاف کر دینے کی خاصیت بھی ہے۔ ذوں بعد گوہر... کے دل نے اس کے دفاع کی مادی تاویلوں کو شکست دے دی۔ گھر والوں کے واضح فیصلے کے باوجود ایک آرزو نے اس کے شب و روز کا تین تین لیا۔ شیر کو دیکھ لینے کی آرزو۔ اس سے پوچھ لینے کی آرزو کہ جس کی خاطر تم نے گوہر کو بھلا دیا۔ اسے موت کے حوالے کیوں کیا؟

ان آرزو کے پورا ہونے کے نتیجے میں وہ نیل اور جوہر کے ساتھ چلی آئی۔  
انہیں لینے کے لیے مامون واسطی ایئر پورٹ پر موجود تھا۔  
نئے دیکھ کر گوہر کے چہرے پر غیر محسوس ہی ناگواری آ گئی۔  
نیل بھائی مسکرتے ہوئے اس کی طرف بڑھے تو وہ ان سے لپٹ گیا۔

"آئیے آئیے جوہر آپا! مال جی کو تو بڑی فکر تھی۔ وقت سے پہلے ہی بھیج دیا مجھے۔ آداب گوہر جی۔ کسی ہیں ان آپ نے تو ہمارا پاتا ہی کاٹ دیا۔ اس جی کے لیوں پر بس ایک ہی نام ہے۔ ہمیں تو بھول ہی گئی ہیں۔"  
ان دن نے نیل بھائی کے ہاتھ سے بریف کیس لے لیا۔

ہر خاموش رہی۔ جیسے کوئی بے کس لٹ جانے پر حیب چاہ کھڑا رہ جائے۔ ایئر پورٹ پر خاصا رش تھا۔  
تین تین بازاریوں میں بھی خود کو تھما محسوس کرنے لگی تھی اور گروہ سے بے خبر ہی رقی۔  
"رش کیسا ہے؟" نیل نے ادھر ادھر دیکھا۔

"نیل تو ہمیشہ ہی دوتا ہے کسی نہ کسی وجہ سے۔ دزیروں مشیروں اعلیٰ عہدیداروں کا آنا جانا ہر وقت لگا جو رہتا ہے۔ آپ جیسے ناگہری اس طرف روٹی بے میں نے۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے قاتر نیل اور جوہر کو اشارے کا موقع دیا۔ اور خود اس کے ساتھ ہو لیا۔

"تازہ وقت کے ساتھ حالات کتنے بدل جاتے ہیں۔ جو ناممکن لگتا ہے وہ ممکن ہو جاتا ہے۔ دیکھ لیجئے مثالاً اور پنہرا آپ کے ساتھ چلنا۔"

"جی ہاں۔" گوہر کا ہمہ بس کے حلق میں اٹکا ہوا تھا۔ آنکھیں برس پڑنے کو تیار تھیں۔

متعجب ثابت ہوتا پتا آپ کتنا بے وزن لگنے لگا ہے۔ کتنا غیر اہم۔  
"گوری؟" جو ہر آ پانے سے ہلایا۔

وہ سیدھی ہو چکی تھی۔ انہوں نے ماموں سے نظر بچا کے اسے نظروں ہی نظروں میں تنبیہ کی۔ محتاط رہنے کی خوش نظر آنے کی۔

ایئر پورٹ پر اسے سی آف کرنے والوں کا ایک گھوم تھا۔ نوشی کی مائو بھی اپنے داماد حیدر زماں کے ساتھ آئی تھیں۔ یونیورسٹی کے اکثر طلباء بلکہ انجینئرنگ یونیورسٹی اور دوسرے کالجوں کے لڑکے اور لڑکیاں بھی وہاں موجود تھیں۔ وہی آئی پی لاؤنج کی طرف آتے ہوئے ڈاکٹر ہنری عدی بن جمال کی اور عذرا اس کے ساتھ تھے۔ جمال احمدان سے پہلے امداد چکے تھے۔ اختیاری فرما کر اس کے آگے پیچھے تھے۔ اس کے خیالات جانتے کو بے چین اس کے ایک لفظ کے خطر۔ وہ کتنا مشکل اور اداس تھا۔ کتنا چپ چاپ۔ عدی اس بات کو محسوس کر رہا تھا۔ مئی شاید کسی شناسا خاتون سے ملنے کے سبب پیچھے رہ گئی تھیں۔ عدی اور شیر رک کر انتظار کرنے لگے۔ اچانک شیر کی نظریں اٹھیں۔ وہ گوہر کی ذات اس کے وجود اور اس کے چہرے سے کتنا آشنا تھا۔ وہ تو اسے پرووں میں سے بھی شناخت کر لینے کا وعدہ کیا تھا۔ سامنے جاتی گوہر کو کیسے پہچانتا۔ وہ ایک نظر اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے مائو نیل بھائی تھے۔ جو ہر آ پانے اور حیران کن بات یہ تھی کہ اس کے ساتھ اس کا دیرینہ بدخواہ اس کا دشمن ماموں واسطی بھی تھا۔ جس نس کر جانے کیا کہتا جا رہا تھا۔

"گوہر۔ گوری؟" الفاظ اس کے لبوں میں دب کر رہ گئے۔

"شہی۔ شہی۔ مئی بلاری چین۔ وہ خاتون تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ عدی تم سے بھی؛ وہ لوں میرے ساتھ آؤ۔ ڈاکٹر ہنری ڈیڈی کے پاس چلے جائیں گے۔"

"کس سے ملانا چاہ رہی ہیں مئی۔ ایک تو ان خواتین کی ہر قدم پر کوئی شناسا خاتون نکل آتی ہیں۔" عدی بڑایا۔

"خبر سے مت۔ دکھاؤ۔ اپنے دوستوں سے اپنی اولاد کو متعارف کرانا ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے۔" عذرا تنبیہ کی سے ہوئی۔

"مئی کو جانے کیا ہے اور یہ شیر اس وقت کسی سے ملنے کی پوزیشن میں ہے بھی کہ ایسے ہی۔" عدی نے سخت لہجے میں کہا۔

"مجھے نہیں معلوم میں جا کے کہہ دیتی ہوں۔" عذرا نے آنکھیں دکھائیں۔

"آؤ بار اچھے چلتے ہیں۔" شیر نے قدم اٹھایا تو عدی بھی چل دی۔ وہ کیسے مئی کی حکم عدوی کر سکتا تھا۔

"کیا ضرورت تھی یہاں رکنے کی۔ میں خواتین کی اس منساری سے بھی ادرجک ہوں۔" عدی کو اس کی سعادت ملنی ایک آنکھ نہ بھائی۔

"ایسا نہیں کہتے۔ اور وہ بھی ماں کے ہارے میں۔" شیر نے نرم دلی سے اسے فوگا۔ ایک بار بھرنے نے سامنے دیکھا وہ اب بھی ماموں واسطی کے سٹگ چلی جا رہی تھی۔

"یہ..... یہ گوہر اور ماموں واسطی کے ساتھ؛ ہر ساتھ میں نیل بھائی اور جو ہر آ پانے بھی۔" وہ اندر ہی اندر حیران تھی کی دوست کو آداب کہتے ہوئے اس نے اپنے تازہ ترین تاثرات چھپانے کی بھر پور کوشش کی۔ مئی بچہ گفتگو میں کبھی نہیں۔

"گوری! ہم قدم سے قدم ملا کر افق کے اس پار تک ایک ساتھ چلتے جائیں گے۔ ہم دونوں کے درمیان کبھی کوئی دیوار نہ ہوگی۔ کتنے خوش نصیب ہیں ہم دونوں۔ وقت نے کیونگر ہمارا ساتھ دیا ہے۔ حالات کیسے ہمارے ہمراہ معاون بن کر چل پڑے ہیں۔ گزرتے وقت کے ساتھ حالات کتنے بدل جاتے ہیں۔ جو ممکن لگتا ہے وہ ممکن ہو جاتا ہے بلکہ جو تصور میں بھی نہیں ہوتا وہ اچانک مل جاتا ہے۔ پہلی بار میں نے تمہاری روٹی بسورتی شکل دیکھی تھی۔ جب پھوپھو کے گھر آیا تھا۔ کسی کو کیا خود مجھے معلوم نہ تھا کہ ایک دن یہ لڑکی میری زندگی کا حاصل بن جائے گی کبھی مجھ سے بات ہے۔"

شیر کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

"بعض لوگوں کے اقدام غیر محسوس طریق پر بعض لوگوں کے لیے سود مند ثابت ہو جاتے ہیں۔ جیسے شیر کا جرم ہمارے لیے خوشیاں نے آیا۔ آپ پر اس کی اصلیت نہ نکلتی تو آپ آج میرے گھر کی فریبی میرے ساتھ نہ چل رہی ہوتیں۔"

گوہر نے اس کی طرف دیکھا۔

"شیر کو مجھ سے خدا واسطے کا ہر تھا۔ لیکن دیکھئے کیسا حسین اتفاق ہے۔" وہ اس کے سامنے شکوہ کناں تھا ساتھ ہی خوش بھی۔

"کیسا اتفاق؟"

"میرا ایک بیان اسے سبوت کی تاریخ وار یوں میں اتار دیتے تو کافی ہے۔" وہ اترار ہا تھا۔

"کیا مطلب؟" گوہر کو یہ بات کتنی بری لگی تھی۔

"میں اس نقل کا معنی گواہ ہوں اور میرے ساتھ میرے دو دوست بھی۔ ہم اتفاق سے جانے حادثہ پر موجود تھے۔ ہم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ شیر نکل کرنے میں حق بجانب تھا۔ جسے سب قبولیت دے دی جائے وہ عزت میں جاتی ہے۔ امتیاز مند نے نوشتا ہے سے راہ رسم پیدا کر کے شیر کی غیرت کو ننگا رکھا۔ ماموں نے دونوں کو قتل کر دیا۔ آپ میری نہیں میرے بھائی کی منسوب ہیں کوئی آپ کو شیر ہی نگاہ سے دیکھے میں اسے سیکھا زمین میں گاڑ سکتا ہوں۔"

گوہر کے دل پر گئے بے وفائی کے زخم پھر سے تازہ ہونے لگے۔ اس نے تیز تیز قدم اٹھائے۔ وہ تو شاید اس دنیا سے ماموں واسطی سے سب سے دور نکل جانا چاہتی تھی۔ لیکن اسے ماموں واسطی کی طرف جانا پڑا سیٹ نہ بیختے ہی اس نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

جلگلی ستاروں کا آنگن ہوگا

ہم جنہم یرستا ساون ہوگا

ماموں نے گاڑی اشارت کی تھی کہ سبوزک بیٹھ لگ۔ وہ تڑپ اٹھی۔

"شیر۔ شیر۔ ادبے وقت شیر۔ تم نے تو وفا کی مر نام تو جین کی ہے۔ مجھے تماشہ بنا دیا ہے۔ ماموں کیا جتنا با رہا تھا مجھے سب خبر ہے۔ شیر۔ میں نے نہیں اپنے دل کے ساتویں آسان پہ جھک دی تھی۔ بہت اونچا مقام ا تھا۔ تم میری نظروں سے گر گئے ہو شیر۔ تم میرے دل کی اونچی مندر سے گر گئے ہو شیر۔ تم وہ کس تھے شیر۔ وہ میں نے تمہیں بنا دیا تھا۔ اور یہ تم نہیں گرے۔ میں اپنی نظروں سے آپ گر گئی ہوں۔ تمہاری اس مذموم حرکت پر میں سے سوال کرنے نے ضرور آؤں گی۔ میں تمہارا گریبان خراب تھا ماموں کی۔ ہائے شیر۔ تمہیں بکھر جائیں۔ محبوب؛

”میرا بیٹا نقل کے چھوٹے مقدسے میں الجھا دیا گیا ہے۔ لیکن مجھے خدا کے انصاف کا پورا یقین اور اس کی رحمت پر بھروسہ ہے۔“ وہ خاتون یقیناً اس سانحے سے بھی آگاہ تھیں۔ خاتون نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔  
 ”میں سجاد رحمانی کی ماں ہوں جینا۔“ خاتون نے اسے مخاطب کیا تو اس نے تیراں ہوس کے انہیں دیکھا۔

”سجاد نے مجھے بتایا تھا تم منامت پر رہا ہو گے، اپنے گھر جا رہے ہو۔ میں تمہیں دیکھنے کی خواہش پر قابو نہ پاسکی۔ سجاد اپنے خاندان کا اور میرا واحد سہارا ہے۔ تم نے اسے فاقی و مائی آسرا نہ دیا ہوتا تو آج وہ ترقی کی راہ پر چلتے ہوئے ترقی کا امیدوار نہ ہوتا۔ تمہارا اچھا گروہار تمہارا اور دمنند دل و نیا کے لیے ایک مثال ہے۔ مجھ جیسی جانے کتنی بے یار مددگار ماؤں کی وعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہیں کچھ نہیں ہونا بیٹے۔ اس آزمائش سے تم سرخرو نکلو گے۔“ خاتون نے اس کی پیشانی چوم لی۔

و وہ خالی الذہن ہوتا تو اس اظہار محبت پر جانے کتنا خوش ہوتا۔ شکرے کے طور پر جانے کتنے الفاظ کہتا۔ گھر اس بوقت تو اس کے دل و ذہن پر ایک ہی بو چھ تھا ایک ہی بو باہ تھا۔



نیپل بھائی اور جوہر آ پنا خواہز مسکری کے ہاں لٹنے کے لیے بیٹھے تھے۔ جوہر کے لاکھ کہنے پر وہ ان کے ساتھ نہ جا سکی تھی۔ وہ گھر جو یادوں کا مسکن تھا۔ وہ گھر جہاں دن شبیر کی آمد کے انتظار گھر اس کی قربت میں اور راتیں اس کے حسین تصور سے بھری گزرتی تھیں۔ وہ گھر جس کی دیواروں سے اس نے بار بار شبیر کی باتیں کی تھیں۔ وہ گھر جہاں اس نے شبیر سے اقرار محبت کے حسین لمحوں کو بار بار سوجا اور وہ گھر جہاں شبیر کے بارے میں اچھی خبر نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے پھول بار بار مچائے تھے۔ وہ گھر جہاں شبیر نے کسی دوسری لڑکی کو منتخب کر لینے کی خبر سے اس سے محبت کا اختار چھین لیا تھا۔ وہ گھر جہاں شبیر کے قاتل ہونے کی خبر پا کے وہ ہوش سے بے گانہ ہوئی تھی۔ وہ گھر ایک خوفناک ایولائن کہ اس کے دل و نظر کے سامنے لہرا رہا تھا۔ وہ اس گھر سے دور رہنا چاہتی تھی۔ وہیں تو اس کے والد نے اس کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تھا۔ اسے بیٹھ کے لیے شبیر کی دنیا سے دور کر دیا تھا۔ وہ اس گھر میں کیسے جاتی۔ جن ماہوں نے ہزار خواہش کے باوجود اسے جلا رکھا تھا۔ وہ ماہوں میں اس گھر میں جا کر تو کسی پاگل وحشی کی طرح اسے چھوڑ ڈالتیں۔ وہ پہلے ہی بے حس و ہر کم ہمت ہو رہی تھی۔ شام جان تھی۔ وحشی ماہوں سے مار ڈالتیں۔ وہ نہیں گئی۔

اشن واسٹی اور بیگم واسٹی اپنے کمرے میں بیٹھے۔ فون پر انہوں نے اسے اپنے کمرے میں آنے کو کہا تھا۔ سانچہ کے دو کمروں میں شاید ان ہی کی رہائش تھی۔ جوہر آ پا کو گھنے کافی دیر ہوئی تھی۔ یادوں کے پتھر سے نکل کر اس نے جلدی سے منہ ہاتھ دھویا۔ بال سنوارے اور ان کی طرف چل دی۔ دروازہ کھولا۔ سامنے بیڈ پر اشن واسٹی بیٹھے تھے۔ بیڈ کے ساتھ بڑی ایڈی جیمز پر ماموں براجمان تھا۔ وہوں کا رخ اس طرف سے تھا کہ دروازے پر مدتی گوبرائشیں دیکھ رہی تھی لیکن وہ اس کی موجودگی سے بے خبر تھے۔ آپس میں بات کر رہے تھے۔ وہ رک گئی اور چونک اٹھی۔ ذکا شبیر کے کیس کا تھا۔

”اخبار کی شہر کا متن یہ ظاہر کرتا ہے کہ شبیر کے خلاف کیس کی نوعیت کمزور ہونی جارہی ہے۔ لڑکوں نے انتقامیہ کاڈنگ میں دم کر رکھا ہے۔ شہر میں کچھ بھی اسی سلسلے میں مظاہرہ کیا گیا تھا۔ پونہر کی جنگامی سبوت حال کے پیش نظر بند ہے۔ کالج بند ہیں۔ سمجھو سارا نظام تعلیم برہم برہم ہے ماموں! زندگی میں لڑائی جھگڑے ہونے لگے لگاد

ہوتے رہتے ہیں۔ یہ جوانوں کا ہی کام ہوتا ہے۔ لیکن اتنے بڑے معاملے میں۔۔۔ اتنا سفید جھوٹ بول کر کسی کو پھانسی کے پھندے تک پہنچا دینا۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میرا دل اسے قبول نہیں کرتا۔ جب سے میں جج کی سعادت حاصل کر کے روڈ پر رسول اللہ کی جالیوں سے لپٹ کے خانہ کعبہ کی دیواروں کو گلے لگا کے روٹرز گزرتا کر فضا سے معافی مانگ کے آیا ہوں۔ میں نے کچھ بھی مانگا تو کاموں سے توپ کرنا ہے۔ یہ تم نے شبیر کے ساتھ دشمنی بڑے اور مجھے انداز میں نبھائی ہے۔ تم بھی بچے ہو وہ بچہ ہے۔ تمہارا سناقتناظ اسے صحت کی طرف لے جانے میں کوئی تاخیر نہ ہونے دیں گے۔ لیکن جانتے ہو اس جمبوت کا انجام۔۔۔ میرے گھر کی رہنمائی تو وہ بنائی ہی ہو۔ تیلما کا کیا ہے وہ پرانی امانت ہے۔ میں خدا کی سب آواز لاؤں گی سے ڈرتا ہوں۔ اس کی سب لکھا ہی ہمیں بھی لے دوں گی تم اپنے باپ کو تو کچھ بتا دو جو تم جانتے ہو جو تم نے دیکھا ہے۔“

”دیکھنے سے کیا ہوتا ہے بابا جان۔۔۔۔۔ اہمیت صرف اس بیان کی ہوتی ہے جو آپ عدالت کے سامنے دیں۔“ کتنا کہینہ تھا وہ۔۔۔۔۔

”پھر جی۔“ باپ کے کہنے پر ماموں نے سر جھکا لیا۔

”حقیقت تو یہی ہے کہ امتیاز زندگیوں سے بچھل کر کے اس نے رونا لودا پئی کھینچی سے لگا دیا۔ شبیر نے اسے بچانے کی کوشش کی رونا لودا اس سے لپٹا چاہا نہیں اس نے پھر پور قوت لگا کر خود کو گولی مار لی۔ میرے ایک دوست نے اسی وقت قریبی پولیس اسٹیشن فون کر دیا۔ شبیر ابھی اس اچانک حادثے سے کھیل ہی نہ پایا تھا۔ نو شاہر کو سنبھالتے ہوئے اس کے ہاتھ سے رونا لودا اپنے ہاتھ میں لیا۔ وہ زمین پر لڑیوں بیٹھا تھا۔ چلا چلا کر اسے پکار رہا تھا کہ پولیس وہاں کتنی تھی۔ ظاہر ہے زمین جائے واردات پر تلاش بھی ہو بھرم بھی اور آگہ لکل بھی تو آپ خود سوچے۔ پولیس کی کارروائی کیا ہو سکتی ہے۔ پھر مجھے تو شبیر سے کسی حساب چکانا تھے بابا۔۔۔۔۔ آپ کو یاد ہے شبیر نے اس لڑکیوں والے کیس میں کیسے آپ کی توہین کرائی تھی لڑی آئی جی سے۔ مجھے وہ الفاظ اب تک یاد تھے۔ اور بابا جان۔ عام خانات میں وہ کچھ نہ ہوتا۔ گوبر باروں بھیا کی پسند تھی۔ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا میرا فرس تھا۔“

”بہر حال تم نے اچھا نہیں کیا۔ دشمنی کو اس حد تک آگے نہیں لے جانا چاہیے کہ آہی ضمیر کی ملامت سے ہی بے موت مرتا رہے۔ اس کے خلاف جھوٹی گواہی بے کمر سے صحت کے منہ میں دے کر تم بھی چین سے نہیں رہ سکو گے۔ تمہارے باپ نے چھوڑ دیاں کرنے والوں کی رسد گہنی کی ہے۔ زمینوں کے لیے جنگ لڑی ہے۔ پانوں کی تقسیم پر جھگڑے کیے ہیں۔ لڑکیوں کی شادیوں اور انہوں کے کیس پھلتے ہیں۔ لیکن جھوٹ بولی کر کسی بے گناہ کو تختہ دار نہیں بھڑا کیا۔“

”ہم لوگوں نے کئی دکھ سے بات کی ہے۔ ہمارے صرف نام درج ہیں۔ ہم نے کسی عدالت میں گواہی کے طور پر ایک طرف نہیں کہا۔۔۔۔۔ چینیے آپ یہ شادیوں ہو لینے دیکھیے۔ گوبر ہمارے عمر آ جائے۔ پھر مجھے اس کے چینیے یا مرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔۔۔۔۔ بابا جان اگر آپ اسے نہ یاد دہانتے ہیں تو میں شبیر کے خلاف کوئی بیان نہیں دہاں گا۔ سراسر لاشی کا اظہار کر دہاں گا۔ مانا ہے اس کے حق میں بیان دینے کے لیے کافی لوگ موجود ہیں۔ جن کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے نو شاہر کو اپنی آنکھوں سے امتیاز نہ نہ کھل کرتے اور خود ہی گولی چاڑھے دیکھا ہے۔ ہماری طرف سے اظہار لاشی اور ان کی طرف سے یہ شہادت۔۔۔۔۔ کیس کو کمزور کر دے گی۔ اور آپ کی خواہش کے مطابق شبیر برقی ہو جائے۔ بابا گوبر اس کی مگھتے۔۔۔۔۔ وہ اسے پسند کرتا تھا۔ میرا خیال ہے زندگی بھر کے



”آپ ابھی تک اپنے کمرے میں ہیں..... بابا جان چائے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“  
وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

”یہ آپ ایک گھنٹہ دیکھے جا رہی ہیں۔ میرا خیال ہے آپ تیار ہیں آئیے نا گوہر جی اماں جی رات سے ہی آپ کو مس کر رہی ہیں۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ اصل میں ہم سب کو ابھی جیولر کی ہاں بھی جانا ہے نا۔“  
”کیا ضرورت ہے اس سب کی؟“ اس کے لہجے میں پراسرار مردہ مہری تھی۔ آنکھوں میں سراسر اجسیت۔  
”میا کبہ رہی ہیں آپ؟“

”وہ ہی جو مجھے کہنا چاہیے۔“ اس نے کڑے تیوروں سے اسے دیکھا۔  
”یعنی.....“ مامون نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔

”آپ کتنے گھٹیا انسان ہیں..... اس کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔ مجھے افسوس ہے آپ اس رشتے کی بنیادیں جو آپ نے دھاندلی سے میرے ساتھ جوڑ لیا ہے کسی بے گناہ کے خونِ ناحق سے اٹھانا چاہتے ہیں۔ ویری سوری مامون واسطی..... ویری ویری سوری..... ایسا انسان سے اتنا اہم رشتہ جوڑنا تو کجا میں اسے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ میں جا رہی ہوں۔ ابھی اور اسی وقت..... میں..... میں سب کو چتا دوں گی..... سب کو۔ شہیر کی بے گناہی اور تمہاری خباثت.....“

اس نے دروازے سے باہر نکلنا چاہا۔ مامون نے اس کی راہ روک لی۔

”ہمت جاؤ میرے راستے سے۔ جانے دو مجھے..... اب مجھ میں حالات کو فیس کرنے کا حوصلہ ہے۔“  
مامون غور سے اسے دیکھا رہا۔ پھر ایک دم سے سب بچھ گیا۔

”ہمت جاتا ہوں راستے سے۔“ اب اس کے سر پر لہجے میں نہ احترام تھا نہ محبت۔ صرف ایک دھمکی تھی۔

”جانے رہتا ہوں تمہیں..... لیکن سوچ لو غور کر لو..... شہیر کی تقدیر کا فیصلہ اب بھی میرے ہاتھ میں ہے۔ اس کی تقدیر اب بھی میری ہتھی میں بند ہے..... چلی جاؤ جہاں بھی جانا چاہ رہی ہو..... لیکن یہ طے کرنے کے بعد کہ تمہیں کیا چاہیے۔ شہیر کی زندگی یا اس کی موت۔“  
گوہر گردن قدرے اونچی کیسے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

مامون کی نگاہیں اس کے وجود میں شتر کی طرح چھب رہی تھیں اور چہرے کی ہتھی اس کے دل میں خوف کی ٹھنڈک اتار رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا پھر رک گئی۔ پچاسی بچھتا اس کی نظروں کے سامنے لہرا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

”دیکھو محبت کا تقاضا تو یہی ہے کہ تم اسے زندگی گزارنے کا موقع دو..... اپنی زبان بند نہ کرو..... ورنہ..... بات تو وہی رہے گی بلکہ اس سے بھی خطرناک ہو جائے گی۔ نا ہانس رہے گا نہ ہانسری بیچے گی۔ وہ ہی نہ ہوگا تو تم تمہیں کے سہارے کس کی خاطر چوگی..... ہم سب کی ہمنائی اسی میں سے کہ اپنی اپنی جگہ حالات سے بھجوتا کریں۔“  
”نقرت ہے مجھے سمجھو توں خبری زندگی سے۔ میں سو بار اٹکار کرئی ہوں۔ تم سے بھیک میں مانگی زندگی چینی! اے شہیر سے بے گناہی مسیت تحتہ دار یہ چھو جانے والا شہیر مجھے زیادہ عزیز ہوگا۔ تم محبت کے اعلیٰ ترین چیلوں کی گہرائی سے آگاہ نہیں۔ کسی بہت ہی عزیز شخص کے صدم ہو جانے پر زندگی خرابوں کے یادوں کے سہارے تباہ گزار دینے کا حوصلہ بہت سے یادوں میں ہوتا ہے۔ میں جی لوں گی۔ تم از کم کوئی بڑھو جو میرے دل پر نہیں ہوگا۔“

لیے یہ رنگ اسے کافی رہے گا۔ انتقام کی بہترین صورت تو یہی ہے۔ لیکن آپ یہ بھی مانیں بابا جان اگر وہ قتل کے اس مقدمے میں نہ لکھتا تو ہم یعنی میں اپنے مشن میں ناکام رہتا۔“

”ناہان جو ہو..... بس مجھے عزیز ہو میری کمزوری ہو..... اس لیے فائدہ اٹھاتے رہتے ہو۔ ایسا پھٹا ڈالنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ہارون جیسے بچے کے لیے رشتوں کی کیا کی تھی۔ دیکھ لینا یہ رشتہ عمر بھر.....“

”آپ سمجھیں نا بابا جان..... وہ گوہر کو پسند کرتے ہیں۔“

”بہر حال جو ہونا تھا سو ہو گیا..... کسی کے خونِ ناحق سے تمہارا دامن داغ داغ ہونے لگا۔ مجھے کسی ماہر کا خونِ دان کے پاس لے چلو۔ میں خود بات کر دوں گا۔“

مامون مسکرا دیا۔

گوہر کے قدم زمین پر جم کر رہ گئے۔ وہ ہنس بھی نہ سکی۔ اب اس کے کان سننے سے قاصر ہو چلے تھے۔ وہ باپ بیٹا کیا کہہ رہے تھے۔ اس سے وہ بالکل بے نیاز ہو گئی۔

”قتل شہیر نے نہیں کیے..... قتل اس نے نہیں کیے..... وہ قاتل نہیں۔ وہ عالم نہیں ہے۔“ گوہر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کے ہاتھ پیروں میں لگی سی ماری ہونے لگی۔ یہ انکشاف کتنا حیات بخش تھا کہ قتل اس نے نہیں کیے تھے۔ وہ اگلے قدموں اپنے کمرے میں آئی۔ دوڑتی ہوئی بھاگتی ہوئی۔ چند قدموں میں ہی بے دم ہو گئی۔

لاکھ دروازہ کھول کر اندر آئی اور بیڈ پر دم سے گر پڑی۔ اب وہ رو رہی تھی..... بے تحاشا بے اختیار۔

”شہیر..... شہیر..... تم کہاں ہو شہیر..... میں نے کیسی خبر سنی ہے؟ کیسا انکشاف ہوا ہے مجھ پر؟ تم نے..... تم نے کسی کو نہیں مارا..... تم اسے قتل اور خودکشی سے باز رکھنے کے جرم میں پکڑے گئے ہو۔“ وہ بستر سے اٹھی سامنے رکھی ڈریسنگ ٹیبل کی طرف آئی۔ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ مسکراتے لبِ زبانی آنکھیں انک کے پتھر پتھر اتارنے نکتے کا پتے ہاتھ..... اس نے اپنے ہی ہاتھوں میں اپنا چہرہ ختم لیا۔ اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔ غور کرنے لگی۔

”یہ جو کچھ میں نے سنا ہے یہ سچ ہے نا..... میری سماعت نے میری بصارت نے کوئی تہ کو تو نہیں کھانی نا..... مجھے غلط فہمی تو نہیں ہوئی نا..... میرا شہیر بے گناہ ہے نا..... گوہر! جو یہ جھانسنے انوں سے تیرے دل پہ تھا۔ جس شرمندگی نے تیرا سراپے سامنے ہی جھکا دیا تھا وہ یو جھ بے بنیاد تھا۔ وہ شرمندگی بے جا تھی۔ تیرا سن میت اتنے گھٹیا ذہن کا نہ تھا۔ اتنا بے حوصلہ نہ تھا۔ اتنا شقی القلب نہ تھا۔ وہ تو سچ سچ زندگی گزار دینے کی بات کرتا تھا۔ لینے کی نہیں..... وہ تو امتیاز رنما اور نوشا پرکھی بیٹا بنا چاہتا تھا۔ وہ تو مسیحا تھا قاتل نہیں۔“

اس نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنے آنسو بچھ ڈالے۔

”اب اگر وہ بچا نہیں چڑھ بھی جائے۔ قانون کی آنکھیں سچ دیکھنے سے قاصر ہی رہیں تو اسے کوئی دکھ نہ ہوگا۔ جانے کتنے بے گناہ مامون جیسے درندہ صفت تجھ نے گواہوں کی شہادت کی بنا پر سلیب پر لٹک چکے ہوں گے۔ جانے کتنی زندگیاں کس بے درد انسان کی ستم ظریفی نے تباہ کر دی ہوں گی۔ ابھی یہ میرا جہاں کیسا ہے؟ تو جو سب کچھ دیکھ رہا ہے تو ایسے ظالم لوگوں کو سخت ترین سزایں دینا نہیں دیتا۔ جو اپنے آپ کو طاقتور سمجھتے ہوئے شریف انسانوں کی بے ضرورت لوگوں کی زندگیاں بے باکرہ بیچتے ہیں۔ کبھی طاقت سے اور کبھی صرف الفاظ سے۔“

درہ از سے پندہ سبک ہو رہی تھی۔ وہ ہٹتی۔ جلدوں سے اپنی تم آنکھیں دوپٹے کے آنچلے سے پونچتیں۔

”اندرا آسکتا ہوں؟“ مامون واسطی کی آواز پر اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔



"گوہر.....!" مامون کے لہجے میں پھر زری آگئی۔

"گوہر..... آپ سچے کی کوشش کریں۔"

"میں نے سب سمجھ لیا ہے۔ گھنٹیا پن کی اس سے بڑی مثال اس دنیا میں اور کہیں نہیں ہوگی۔ تم اپنی ذلیل انسان ہو..... اس دنیا میں رہنے کے قابل بھی نہیں ہو۔ تم نے ایک بے گنہگار کو جس طرح غرموں کی فہرست میں شامل کر دیا ہے۔ خدا اس کا حساب لے لے پونہم سے۔"

گوہر کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں۔ مامون پل نہیں گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہا تھا۔ نرم لہجے میں بات کرتے کرتے وہ پھر پھراٹھا۔

"حساب کتاب تو جب ہوگا۔۔۔۔۔۔ لیکن کان کھول کر سن لو۔ مامون نے بھی ارادے بدلنا نہیں سیکھا۔ کیا دو تم ایک عام سی لڑکی..... ایسی ہزار لڑکیاں میری ایک شہرہ میں میرے ارد گرد نظر آسکتی ہیں۔ کسی زخم میں نہ رہنا..... تم ہمیں سے شادی سے انکار کر کے تو دیکھو زعمی حرام نہ کروں تمہاری تو کہتا۔ ساتھ کا سر کھلنے میں میں کیوں دیر کرنے لگا۔ شہیرہ کا نصیب پتائی کا پتہ نہ ہی ہوگا۔ میرے الفاظ اس کی تقدیر بن چکے ہیں۔ یہ ہونا ہے اور ہو کر رہے گا۔"

"مامون..... انسان ہی رہو..... خدا بننے کی کوشش مت کرو۔"

"تم بھی..... سیدھی بات کر۔۔۔۔۔۔ راہ پر آ جاؤ..... یعنی کہ ایک مرد ہم سے وعدہ کر رہا ہے۔ قول دے رہا ہے۔ میں اس سے لاتعلق ہو جاؤں گی۔ اپنی زبان بند رکھوں گا۔ شیر بری ہو جائے گا۔ اس مقدمے کی پیل ساریج کی سماعت ساتویں دن ہے۔ یعنی شادی ہو جانے کے دو ہفتے دن جب بھی گواہ طلب ہے مجھے میں عدالت کے سامنے ہر دوں گا کہ میں نے کچھ نہیں دیکھا سو چلو ڈر کر لو۔ یہ سوا مہینہ نہیں۔"

گوہر خالی دماغ خالی دل اسے جکتی روٹی۔ وہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

"بھئی بھو احد کر دی تم نے مامون! تم بھی نہیں کے ہو گئے۔ تمہارے بابا جان انظار کر رہے ہیں۔ دوسری بار چائے منگوائی ہے۔ چلو بیٹی.....! چائے پی لیں۔ پھر باہر بھی جانا ہے۔" گوہر نے ہلکا سا جھنجھکاؤ سے کہا۔

"پلیس نا بھائی وی کریت..... ماں جی اصل میں ہم ایک دم گھٹکے کرنے لگے تھے چائے بھول گئے۔" گوہر بادل ناخواستہ ان دونوں کے ساتھ چل وی۔ کتنا ادا کا رسم کا شخص تھا۔ مامون واسطی۔ ہنہنک کچھ پل میں کچھ۔

تینوں اندر داخل ہوئے۔ امین واسطی اسے دیکھ کر مسکرائے لگے۔

"بڑی دیر کر دی بیٹی!"

"بابا جان! آپ تو جانتے ہی ہیں خواتین کی تیاری میں اتنا ہی مسئلہ ہے۔ کسی بھی خطبے کے مرد سے پوچھ لیں۔ ماں! ہمیں بھوپوں اور بیٹیوں سے یہ شکوہ ہوتا ہر حال دیکھا۔"

امین واسطی ہنسنے لگے۔ وہ صوفے پر ٹنگ گئی۔ انتہائی پریشانی کے اس عالم میں ان اونٹوں کے درمیان بیٹھنا چائے پینا اور ان سے باتیں کرنا کسی پیرا لڑکی جوئی سر کرنے سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ وہ وہاں موجود ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں تھی۔

کسی بات کا صحیح جواب نہیں دے پارتی تھی۔

"کس سوچ میں تم ہو بیٹی؟" امین واسطی بھی گوہر کو پتا بننے لگے تھے۔ شاید اس کی بہت سی وجوہات تھیں۔

"بیٹی..... تم..... کچھ نہیں۔"

"تو پھر چائے پینا۔ خود بخود ہی ہو رہی ہے۔" امینوں نے زری سے کہا۔

"جی..... ہاں..... لے رہی ہوں۔" اس نے کب باتھ میں پکڑا۔ مامون کی نظریں اس پر جمی تھیں۔

"رہتے تاتے آمان والا ہی جوڑتا ہے۔ کسے خبر تھی اتنی چارنی پگی ایک دن ہمارے گھرانے میں ایک بیوی تھیں سے شامل ہو جائے گی۔ میں کتنی خوش نصیب ہوں۔ تمہیں پا کر کتنی خوش ہوں۔ ہارون میرا کتنا پیارا بیٹا ہے۔ بہت ہی ٹیک اور سعادت مند۔"

"اور میں ماں جی؟" مامون جھٹ مسکراتے ہوئے ماں سے پوچھنے لگا۔

"بیٹے! تم کسی سے کم ہو کیا؟ اور پھر بہاوا خاندان ہے بھی کتنا۔ دو بیٹے..... ایک بیٹی۔ خیر سے ہارون کا لکھ آؤ اور وہاں رہتے گی۔"

"بھئی بیگم.....! ہزارا! کڑ پینا تو میرا خیال ہے شادی کے دو ہفتے دن ہی اپنی ماں کو لے کے چلا بیٹے گا۔"

ماری جو بیٹی تو مامون کے بیٹے آباد کریں گے۔"

مامون نے مسکراتے ہوئے سر جھٹک لیا۔

"خوردار! بھائی کی پسند کی خبر تو ہو گی تم کو۔ کچھ اپنی پسند کا بھی بتاؤ..... خیر ہم کیوں ہنگام ہوں۔ کیوں پوچھیں۔ گوہر بڑی بھانجھی ہوگی۔ دن سنیا جاتی پھرے گی اپنے انگوٹے پیور بھیج کو..... شادی وادی سب اسی کے آئے ہوتی۔ کیوں پتھر؟"

"اور نہیں تو کیا؟" زعمی واسطی نظروں ہی نظروں میں گوہر پر بڑا زور ہو رہی تھیں۔

ماں جی اب اتنی تو زندگی کا اہم حصہ ہیں ہوئی رہیں گی۔ فی الحال جلدی کیجیے بازار جانا ہے۔ ڈر پر مسجد کے باہر بھی بیٹھنا بہاؤ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔"

گوہر کسی بے زبان جاندار کی طرح ان کے ساتھ ہوئی۔ کتنے طوفان اندر ترقی اندر چھتے رہے۔ اٹھتے رہے۔

ایک نئے پتہ پر پہنچی۔ دوسری کے بعد تیسری جانے کتنی دکانوں پر پھرتے رہے۔ انہوں نے کیا کیا خریدا اس کی

لوہر کو خبر ہی نہ تھی۔ بیٹس قیمت ساڑھیوں! بھاری جڑاؤ زیورات! نفس جو تیاں..... ہر سوٹ کے ساتھ نیل

لہائی۔ پھر ہر کام کے سونے سے مطابقت رکھنے کی ٹیلم باقوت! پتھر ان اور زمرہ کے سیٹ..... اور جانے کیا

نیا ٹیلم! آٹھ بجے وہ ہول بولٹ کے آئے۔ تو تین اور جو ہر وہاں آچکے تھے۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں آئی۔

دیوار، ٹیبل ٹیبل کے سامنے کھڑی سو رہی تھیں۔

"میلہ سے تیار ہو جاؤ۔"

"کہاں جانا ہے؟"

"بھئی مامون کے راست مسجد نے سب کو بتی ہو گیا ہے۔ نیل تیار ہو گئے ہیں۔ ادھر کمرے میں ان کے چند

..... آگئے تھے۔ میں ادھر چلی آئی۔"

"تین نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں؟"

"ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں آ پ..... بس مجھے نیند آنے لگی ہے۔ میں سونا چاہتی ہوں۔ آپ پلیز

..... وغیرہ سے کہہ دیجیے گا۔"

"..... تم..... اپنا اتنی بہت پر قائم ہو۔ باوجود میرے سمجھانے کے۔ چلو ٹھیک ہے۔ میں کہہ دوں گی۔ لیکن

پتہ بھانے مزید چو مناسبت دن چل جائیں گے۔ اس کے بعد کیا کرو گی۔ آخر تمہیں ہارون کے ساتھ زندگی



گزارنا ہے اور زندگی کا سفر بہت لمبا ہے۔ بہت ہی طویل۔ سز کرتے رہنا ہی شرط ہے۔“

”میں سمجھتی ہوں۔“ اس نے سینڈل اتار کے الماری میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

”کل نیل جیل جائیں گے۔ تمہاری خاطر ہم تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ میں نے بھی سوچا ہے کہ تم اس سے آخری بار ضرور مل لو۔ ویسے بھی جھوٹے گواہ کی منزل تک پہنچانا ضروری ہے۔“

”کون جھوٹا..... لگتا ہے آپ آپ اخبار نہیں پڑھتیں۔ شیر بے گناہ ہے۔ یہ سارے الزام اس کو گرانے کے لیے اسے تہی دامن کر دینے کے لیے اس پر لگائے گئے ہیں۔“

وہ دوا ڈا ہستہ سے بچا۔

”آجائے۔“ جوہر نے ساڑھی کا پلو برابر کیا۔

”جوہر آپ کو بھائی صاحب بلا رہے ہیں۔“ کاموں نے کہا۔

”اوہ.....! مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ وہ کچھ کاغذات کا کبڑا ہے تھے۔“ وہ جلدی سے باہر نکلی۔

”کیا جانا چاہ رہی تھیں آپ اپنی بہن کو.....؟“

”وہی جو ہے۔“

”غلط۔ سچ وہ ہے جو میں عدالت میں جا کے کہوں گا۔ میرے دوست کہیں گے۔ آپ نے اپنی زبان بند نہ کی

تو تکی کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔“

”میں دیکھ لوں گی آپ کو..... دھمکیاں دے کر آپ شیر کا کچھ نہیں بچا سکتے۔“

”کیا بیگڑے گا اور کیا نہیں۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔ ایک بار پھر وائزین کر رہا ہوں۔ اپنی زبان بند رکھیے۔ یہ

شادی ہر حال میں ہوگی۔ اور شیر کا مرجانا ہم سب کی زندگی ہے۔ سب کے لیے ضروری ہے۔“

”کیا کریں گے آپ؟“

”یہ آپ کسی ماہر وکیل سے پوچھیے گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔“ وہ تیزی سے چلتا ہوا کمرہ چھوڑ گیا۔

گوہر جو امید و ناامیدی کے طوفان میں گھری اجرا جہر بھاگ دوڑ رہی تھی ایک بار پھر پریشان ہوئی۔

☆☆☆☆☆☆

صبح بیڈنی کے ساتھ ہی دن کا معروف اخبار بھیجی کرے میں موجود تھا۔ اس نے اخبار کھولا۔ پہلے صفحے پر اہم

خبروں کے ساتھ ساتھ معمولی کے مطابق یونیورسٹی یونین اور شیر سے متعلق کئی چھوٹی چھوٹی خبریں موجود تھیں۔

”نوشاہ ناز کیس کے ملزم شیر عسکری کی ضمانت پر رہائی۔“ (اوہ میرے خدا..... یعنی وہ جیل میں نہیں ہے۔)

”کیس کا مارو عمار استغاش کے گواہوں کے بیان پر ہے۔“

ایک خبر تھی۔

”نوشاہ ناز کے والد کی آمد پر کیس کی نوعیت تبدیل ہو گئی۔ کچھ دستاویزات شیر کو بے گناہ ثابت کرنے میں مدد

دے سکتی ہیں۔ لیکن ماہرین قانون کے خیال میں یہ ایک مشرفہ ہے۔ کیس کا فیصلہ بہت جلد ہو جائے گا۔“

وہ بہت دیر انتظار نہ کر سکی۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔ شیر جاسٹے کہاں تھا..... اس سے ملاقات ہو جائے یعنی ظہر پر نا

مکن تھا۔ اس نے کسی ماہر قانون دان سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

سب ادگ! پتے اپنے کروں میں تھے۔ اس نے ٹیلی فون اٹھا کر آج بیٹر سے کہا کہ: اس کا رابطہ کسی ماہر وکیل

سے کراوے۔

آپر بیٹر نے اپنے خیال میں جسے ماہر سمجھا اس کا نمبر اسے دے دیا۔

☆☆☆☆☆☆

یہ بات ابھی تک اس کے ذہن و دل سے نہیں اترتی تھی۔

تمہارا نام کسی اجنبی کے لب پر تھا

ذرا سی بات تھی مگر دل کو لگی ہے بہت

”ششی..... ششی..... اے ششی.....“

وہ جانے کہہ نہ سکا۔ پکارے جا رہی تھی۔ دودھ کا گلاس اس نے سائیکل پر رکھ دیا تھا۔

”آں..... ہاں..... کیا بات ہے عذرا؟ خیریت تو ہے نا اتنی پریشان کیوں ہو؟“

”میں پریشان ہوں..... میں..... حیرت ہے۔ پریشان تو تم ہو۔ جب سے آئے ہو اسی طرح گیانی بنے بیٹھے

ہو..... کیا یوریت ہے ڈیز برادر..... تم ایسے تو نہ تھے۔ کیا ہو گیا تمہیں۔ نسو۔ بولو..... کچھ کہو..... تم اتنے سلجیدہ ہو

کہ درود پوار تم سے ڈرنے لگے ہیں۔ لان میں کھلے پھولوں نے سکرانا چھوڑ دیا ہے۔ ششی..... میرے بھائی پلیز

ایسے نہ رہا کرو۔ خدا بہتر ہی کرے گا کیا تمہیں رب کے منصف ہونے کا یقین نہیں۔ وہ ہرگز بے انصافی نہیں

کرے گا۔ ہرگز نہیں۔ تم فکر نہ کیا کرو ششی..... تمہیں! کچھ! کچھ کر رہی تھی پریشان ہیں کچھ خبر ہے..... ڈیڈی کی

راتوں کی نیند کھو گئی ہے۔ عدی اداس! اداس رہتا ہے اور میں..... ششی! میری خوشی تو تم اور عدی ہو۔ خدا کرے تم

ہزار سال جیو..... اس گھر میں تم دونوں کا وجود بہا رہیں لے آئے..... ششی..... تمہیں پتا ہے ڈیڈی نے فیصلہ کر لیا

ہے۔ تم سدا ہمارے رہو گے۔ لیکن وہ ڈاکٹر ہنری تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ کیا تم ہمارے جنا ہاں

رہ لو گے۔“ اس نے منہ مٹایا۔

”میری بھوئی بہنا.....! جیل کے دروازے سے باہر نکل کر میں ہر الزام سے بری تو نہیں ہو گیا۔ دو انسانوں

کے خون کا الزام ابھی مجھ سے جدا نہیں ہوا۔ تمہارے یا ڈاکٹر ہنری کے خوابوں کا کیا ہے۔ خواب زندگی کے حقائق

کے شے سے نکرا کر پیش پاش ہو جاتے ہیں۔ کیا خیر میں اب کے تم سے جو رخصت ہو کر جاؤں تو پھر لوٹ کر

آسکوں..... عذرا..... تم میری بہت ہی پیاری سی بہت ہی عزیز بہن ہو..... تمہیں ہیبت سے کام لینا ہوگا۔

میں..... میں لوگوں کی بددیانتی کا شکار ہو بھی جاؤں تو کیا ہے۔ اچھائی پھر بھی نہیں مرے گی۔ کسی نہ کسی طور زندہ

رہے گی۔ تمہیں بہادر بنانا ہوگا۔ کئی گاندھی کا سردار آپا کو سب کو تسلی دینا ہوگی۔ ایک بات تمہیں بتاؤں عذرا خون

ناحق جن کی گردن پر ہے یا ہوگا وہ بھی چین نہ پاسیں گے تم یہ یقین رکھتے کہ تمہارا بھائی بالکل بے قصور ہے۔“

”ششی! کاش تم مجھ سے یہ بات نہ کہتے..... یہ بات میں ویسے بھی جانتی ہوں۔ میرا دل اس کی گواہی دیتا ہے۔

میں نے نوشاہ ناز کی ڈاکٹری پڑھی تھی۔ اس کی مائیں نے بھی مجھے سب کچھ بتایا تھا بلکہ نوشی سے والدین کو بھی ساری

بات کی خبر ہے۔ ششی! یہ سوائس واسٹی کو آخر عمر سے اتنی برعاش کیا تھی۔ کیوں اس نے ایسا کیا؟“

”تمہیں یا نہیں عذرا.....“ اس نے پرانی بات اسے منظر آجاتی۔

”اوہ ششی.....! میں نے ابھی ابھی تمہارا سامان کھولا ہے۔ چیزیں ترتیب دی ہیں۔ خطوط کا ایک پلندہ ہے۔

میں نے تمہاری دراز میں ڈال دیا ہے۔ ان میں اکثر خط بند ہیں۔ شاید تم نے پڑھا ہی نہیں ان کو۔“

”تھینک یو عذرا.....! بہت اچھا کیا تم نے۔ کیا خبر ان میں کوئی خطوط بہت زیادہ اہم بھی ہوں۔ میں سوتے

وقت انہیں دیکھ لوں گا۔“

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)

اڑکے..... میں چلتی ہوں..... دو دھبی کے آرام سے سو جانا..... اس نے ماؤں کا سانچہ اختیار کیا۔  
 لیکن غلط دیکھنے کے بعد۔ "یہ دو چیرے سے مسکرایا۔ غذا نے جب تک کراس کی پیمانی نہ ملے۔  
 "دش یو ملڈ لکھی شہی" اس نے اپنی آنکھوں کی نمی مسکراہٹ میں چھپائی اور تیزی سے اندازے کی طرف  
 بڑھی۔

شعبیر نے دروازہ کھولی۔ واقعی خطوط کا ایک ڈیر تھا۔ اس نے مارے خطوط باہر نکال لیے۔ ایک بڑا سفید لفافہ ان  
 سب کے نیچے پڑا تھا۔ دو سگورا پاپا۔ غذا کو ترتیب سے کتنا ڈگڑا تھا۔ روز نگہ کے ہر معاملے میں ترتیب کی قائل  
 تھی۔ غیر ارادی طور پر اس نے وہی اضافی نیچے سے کھینچا۔  
 اس کا نام ابرجیل کا ایڈریس بی بی پتلا اور خوب صورت تحریر میں لکھا تھا۔ اس تحریر سے وہ آشنا تھا۔ وہ تو شاید  
 ہر آنے والے خطوط کی تحریر سے ناواقف تھا۔ خط لکھنے والے جانے کون کون اور کہاں کہاں سے ہوتے تھے۔  
 لیکن..... یہ خط نہیں کوئی کارڈ تھا۔ اس نے لفافہ چاک کیا۔ بند ہی خوب سعادت سفید ڈوڈ پر سنور میں وہ  
 نام چمک رہے تھے۔

"گوہر..... ہارون۔"  
 "گوہر..... گوہر..... گوہر....."

اس کے خیال میں دنیا میں ایک لڑکی کا نام گوہر تھا۔ جو اس کی تھی سر پاپا اس کی اپنی اور..... گوہر کے ساتھ کسی کا  
 نام اس طرح سے آئے یہ کب ممکن تھا۔ اس نے کارڈ کھولا۔  
 "ہماری پیاری بیٹی گوہر عسکری کی شادی ہارون احمد واسطی سے طے پائی ہے۔ آپ کی شرکت۔ آگے وہ سچ  
 نہ بڑھ سکے۔ نیچے مدعو کرنے والے کا نام لکھا تھا۔

یہ حکم و عاہد حسین عسکری۔ دوسری طرف شاہد نواز بٹنواز اور کاظم حسین کے نام۔

اس کا سر گھوم گیا۔ وہ پانچوں کی طرف بار بار بڑا کاٹھنوں پڑھنے لگا۔ اس نے اٹھ کر کمرے کی سامنے بتیاں  
 روشن کر دیں۔ کارڈ اور بھی چیکنے لگا۔ "گوہر عسکری کی شادی ہارون احمد واسطی سے..... ہارون واسطی۔ ہارون  
 واسطی امین واسطی۔"

الفاظ اس کے دماغ میں گروہش کرنے لگے۔

گوہر اور ماموں کا ایک ساتھ ایئر پورٹ پر موجود ہونا۔ سارے شہر کے ہمارے اہام دور بہانے گیا۔

لفافے میں سے جھانکتے ایک سفید کاغذ نے اسے بھر چھوٹا دیا۔ وہ کاغذ پر جھٹ پڑا۔ یہ ایک خط تھا۔ اسی کے  
 نام۔ کسی نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"شعبیر بھائی۔"

اس نے سمجھت خط کے آخر نام کی طرف دیکھا۔ لکھا تھا۔

"آپ کی بہن شازیہ۔"

اس نے جلدی سے عبارت پر نگاہ کی۔

شعبیر بھائی!

السلام علیکم۔ آپ کیسے ہیں۔ میں آپ کے نیچے بے حد پریشان ہوں۔ لیکن  
 سخت مجبور بھی ہوں کیا آپ کے پاس آج بھی نہیں ملتی۔ شعبیر بھائی... نہ جانے

کیوں سب لوگوں کو آپ سے نفرت ہو گئی ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ آپ کو قاتل  
 سمجھتے ہیں۔ لیکن خدا مصطوب میرے دل کو کیوں یہ یقین ہے کہ آپ قاتل نہیں  
 ہیں۔ پیار سے بھائی مجھ میں اور آپ میں سو تلے پن کنا اوپنگ دیوار حائل ہے جو  
 اجنبیت پیدا کیے ہوئے ہے لیکن یقین کیجئے شعبیر بھائی۔ میرے دل میں آپ کی  
 محبت خود میری بھی مرہون نہیں ہے۔ شاید کبھی آپ ہی آپ پیدا ہوتی ہیں  
 اور پھر کبھی نہیں مرتیں۔

یہ کارڈ جس کے ساتھ میرا خط آپ کو ملے گا یہ میں نے نہیں پھوپھا جان لے  
 بھجوا لیا ہے۔ انٹرنیٹ پر ڈاک ٹکٹ چسپاں کر کے بند کر کے بھیجا میرا ذمہ تھا۔ میں  
 اکیلے تھی۔ سو چا شعبیر بھائی کو چند دل کی باتیں ہی بتا دوں۔ میں جانتی ہوں آپ  
 گوہر سے حد درجہ محبت کرتے ہیں۔ انہیں بھی آپ سے محبت رہی ہوگی۔ لیکن  
 شعبیر بھائی میں اسے محبت نہیں مانتی..... جو کچھ انہوں نے کیا۔ شعبیر بھائی آپ  
 گوہر کی شادی کے تم کو بدل سے منگ لےجئے گا۔ میں نے تو جب سے یہ بات سنی ہے  
 مجھے ایک مل کو تر اور نہیں۔ اس شادی کی داستان بڑی عجیب ہے۔

ڈاکٹر ہارون واسطی ماموں واسطی کے بڑے بھائی ہیں۔ جنت قبل متقی کی  
 تقریب ہوئی تھی۔ انہی گوہر کو جو ایک دن شرم سے جھکی لگائی آپ کے نام کی  
 انٹرویو لین رہی تھیں ہارون واسطی کے نام سے چپ چاپ منسوب ہونا دیکھ کر  
 میرا خون کھل اٹھا۔ لیکن میں کیا کرتی۔ ہارون واسطی کی انٹرویو بہن نیلمانی جو  
 گوہر پر بنا ہوئی جاری تھی میرے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے مجھے بتایا کہ یہ شادی  
 خالص پسند کی شادی ہے۔ ہارون واسطی ایک نظر میں گوہر کو دل دے بیٹھے  
 اور..... گوہر ایک یارانی دن صبح سے لے کر دوپہر تک ان کے گھر میں رہتی تھی۔  
 جہاں ہارون نے ڈاکٹر ہارون کے ذمے انہیں طس ادا دی کیونکہ ڈاکٹر پور  
 والی سڑک پر انہیں بے ہوش پڑی ملی تھیں۔ پھر وہ انہیں واپس عبداللہ پور بھیجی  
 چھوڑنے آئے تھے اور ڈاکٹر ہارون کو لایا ہوا سوٹ جو انہوں نے گوہر کو گفٹ کیا  
 تھا پہن کر ان وہ عبداللہ پور آئیں۔ دو دنوں ایک ہی ملاقات میں ایک دوسرے  
 کے گرویدہ ہو گئے۔ اس ناتمے کو اپنی ساتھ میں بدلنے کے لیے ہارون واسطی کا  
 پراپوزل بھیجا گیا۔ ماموں نے بیوری میں گوہر کے ساتھ نئی پڑھتا ہے۔ ماہیں اس  
 نے ہموار نہیں۔ اور یوں متقی ہوئی۔

شعبیر بھائی مجھے یہ سن کر کتنا دکھ ہوا اس کا اندازہ شاید آپ کو نہ ہو۔ لیکن اتنی  
 مکار اور چال باز ہوتی ہیں۔ سب اٹت آپ پر اثر لگاتے ہیں کہ آپ نے گوہر کو  
 چھوڑ کر کسی اور لڑکی سے شادی کرنے کی بائی بھرتی۔ خردان کا کردار کہاں تک  
 درست ہے۔ انہیں کیا حق تھا آپ کے نام سے منسوب ہو کر ڈاکٹر ہارون سے  
 رابطہ بڑھانے کا۔ سب لوگ اپنا اپنا جگہ ڈھنسا ہیں۔ اس کا ڈوڈ کیہ نمرا آپ بھی



اسے معمولی حادثہ سمجھ کر بھلا دیتے تھے۔ خدا نے آپ کو اپنی امان میں رکھا تو اس دنیا میں لڑکیوں کی کمی نہ ہوگی لیکن گوہر جیسی لڑکی سے آپ کی جان چھوٹ گئی۔ یہ بہت اچھا ہوا۔

شیر بھائی! اس شادی میں ہم سب شریک ہیں۔ باپا اور ماما بھی ہوں گے اور بھائی بھی..... ارم نے تو مستقل رہائش ہی چھوڑنے کے کمر میں اختیار کر رکھی ہے۔ ان سب کو آپ کے مصائب سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں ایک کم ٹولڑکی ہوں۔ مجھے خوشامد کرنا اور باتیں بنانا نہیں آتا۔ لیکن میرا دل خوشی کے ان ہنگاموں میں بھی آپ کے لیے پریشان رہتا ہے۔ اور میری سوچوں میں آپ کا وجود شامل رہتا ہے۔

پرسوں نیبل بھائی جو ہر آپا اور گوہر سارہ سامان کی خریداری کے لیے گئے ہیں۔ دن رات ٹیلی فون پر بارون صاحب کے گھر والوں سے خصوصاً ماموں واسطی سے رابطہ رہتا ہے اب بھی وہ لاہور ایئر پورٹ پر ان کا منتظر ہوگا۔ بارون کے والدین بھی وہیں موجود ہیں۔ شیر بھائی یہ کیسی دنیا ہے۔ لوگوں کی سوچ کو کیا ہو گیا ہے۔ کسی کو آپ کا ذرہ بھر خیال نہیں ہے۔ ایک دستور زباں بندی لڑکی کو ہے۔ مجھ پر بھی۔ سر محفل مجھے بھی ہنستا پڑتا ہے۔ لیکن یقیناً ماموں اور میرا دل روتا رہتا ہے۔ ایک بہن آپ کی چھوٹی بہن آپ سے الٹا کرتی ہے کہ آپ اسے ہرگز دل پر نہ لے لیجیے گا۔ پھر بچا جان اور پھر پھر آپ کی آرزوؤں کا خون کر کے آپ کے دشمنوں کو جو خوشیاں دے رہے ہیں وہ کسی بھی راس نہیں آئیں گی۔ خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے۔

آپ کی بہن

شازیہ

خط پڑھ کر شیر کے ہوش و حواس اس کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ کاغذ اب بھی اس کے ہاتھ میں لرز رہا تھا۔ اللہ! اس کی نظروں کے آگے دھند نے پڑ گئے تھے۔ اس نے اپنی ساری توہینیں سمجھ کر کے ایک بار پھر خط کو پڑھنے کی کوشش کی۔ دوسری بار پڑھنے سے ساری صورت حال اس پر واضح ہونے لگی۔

ایئر پورٹ پر اس نے اپنی آنکھوں سے ماموں اور گوہر کو ہمدردی سے دیکھا تھا۔ اس نے یہی خیال کیا تھا کہ یہ اس کی نظر کا دھوکا بھی ہو سکتا ہے یا نیبل گوہر اور جوہر اپنے کسی کام سے جا رہے ہوں گے ماموں بھی سہیل گیا ہوگا۔

عمر.....

اب آپ تو ہر چیز اس کے سامنے واضح تھی۔

گوہر نے اس کے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا تھا۔ اس پر ایسی کڑی معیبت نازل ہوتے ہی اس نے ڈاکٹر بارون کو اپنے لیے منتخب کر لیا تھا۔

”اے میرے خدا! اس نے سرزدوں باقیوں میں تمام لیا۔“ یہ میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ کیا دیکھا ہے میں نے۔

نیا سوچ رہا ہوں۔“

”گوہر..... گوہر ایسی لڑکی ہو سکتی ہے۔“

”لیکن یقیناً نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی ہو..... یہ شادی کا راز اس کی بے وفائی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ ماموں نے سبک چلنا اس جرم پر مہر تقدیر ہی ہے۔“

”گوہر..... گوہر..... گوہر.....“ وہ بکا رہا تھا۔

”یہ کیا کیا تم نے گوہر..... کوئی یوں بھی سمجھو کہ تاراج کرتا ہے..... یوں بھی ساتھ چھوڑتا ہے۔ تمہارا پل پل نبھ سے بڑھا تھا..... تم..... تم نے کتنا حسین دھوکا دیا مجھے۔ کیا مجھ سے محبت کر لینے کے بعد تمہارے پاس ایسی نگاہیں رہ گئی تھی۔ شیر کے پاس تو کچھ بھی باقی نہیں رہا جو وہ کسی اور کو دے سکے۔ کتنا پاگل ہوں میں۔ اپنے دل کا بتاؤ کہ تمہیں بنا بیٹھا..... زندگی کی ایک ایک گھڑی تمہارے نام کر دی۔ تم لڑکیاں کسی سوچ کی مالک ہوتی ہو۔ ایک کے بعد دوسرے کو دل میں بسا لینا تمہارے لیے نہ عجیب ہوتا ہے نہ ناممکن مجھے مشکل میں گھرا پا کر تمہارے دل میں میرے لیے کوئی جذبہ نہ رہا۔ گوہر! تم نے تو حد کر دی۔ رفاقت کے لیے چتا بھی تو میرے جانی دشمن کے ہاتھ کو..... اوہ میرے خدا! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ کیا دیکھ رہا ہوں۔ یہ کیسے کانٹے سے آگ آئے ہیں میرے اندر باہر یہ کیسی جبین سی محسوس ہو رہی ہے اس میں..... یہ کیسے نشتر میری دگ جاں میں اترنے لگے ہیں۔“ اس نے خط ایک بار پھر پڑھا۔

آخر یہ گوہر کب عبد اللہ پور گئی تھی۔ کب سکندر پور گئی تھی۔ اس کے علم میں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ بھر سوچنے لگا۔ اپنے تئیں وہ یہی خیال کرتا تھا بلکہ گوہر نے بھی کئی بار یہ بتایا تھا کہ اپنی زندگی کا سب اچھا برا وہ شیر کو ضرور بتاتی ہے۔ اس بات کا اس نے اشارہ کیا تھا۔ نہ ہی کسی ماموں سے کسی ملاقات کے بارے میں بتایا۔

اس نے ایک دم بہتر چھوڑا اور روزانہ کھول کر پھر آ گیا۔ لاؤنج میں رکھے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور گوہر کے نمبر کا نمبر گھمایا۔ رات کے تقریباً دس بجے تھے۔ عام حالات میں بھی اتنے وقت تک جاگتے رہنا معمولی بات نہیں۔ پھر وہ تو شادی والا گھر تھا۔ گھنٹی بج رہی تھی۔ کسی نے فون اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ شیر نے رابطہ کاٹ کر وہ بارہ نمبر لکھ لکھ کر کسی نے جواب میں پہلو کہا۔

”ہیلو..... گوہر سے بات کرادیں۔“

”کون بولی رہے ہیں آپ؟“ آواز بیکرا جیسی تھی۔

”میں..... آپ کون بولی رہی ہیں پہلے کہی یہ آواز نہیں سنی۔ آپ یقیناً گوہر کی دوست ہوں گی۔“

”نورے نہیں صاحب! ویسے اب اپنا تعارف کرنا نہیں چاہتا ہوں گی کہ میں کون ہوں۔“

”میں اس کا فلاں ٹیلو ہوں..... اس سے بات کرنا چاہتی۔“

”اے آئی سی..... میں تیلما ہوں۔ نیلما! اشٹی۔ گوہر جی کی اکلوتی دلاری نند۔ اصل میں میں اپنے بھیا جی کے

ابتدائی تھی۔ سب لوگ ذرا تنگ روم میں ہیں۔ میں یہاں سے گزرتی تو ازراہ اتفاق آپ کا فون سن لیا۔“

”نیر کے دل پر کسی نے چھری چلا دی۔“

”آپ کے بھیا جی.....“

”نہاں۔ ڈاکٹر بارون احمد واسطی۔“

"اوہ.....! یاد آ یا..... آپ ماسون واسطی کی بہن ہیں؟"

"جی ہاں۔ آپ انہیں جانتے ہیں؟"

"بہت اچھی طرح سے۔ بلکہ اس شادی کے لیے دونوں کی طرف سے مدعو بھی ہوں۔"

"دویری گڈ۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہوئی۔

"مس نیلما اصل میں میرا مطلب ہے ہم سب لڑکے اور لڑکیاں..... گوہر سے اس اچانک تبدیلی کے بارے

میں پوچھنا چاہتے تھے۔ یونیورسٹی میں کسی کو اس بات کی ہوا بھی نہ لگنے دی اس نے۔"

وہ جس دی۔

"ساحب دل کے معاملوں کی ہمارے دوسروں کو کون لگنے دیتا ہے۔ یہ بڑی ہی حسین عقین طلسماتی داستان ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہاں ہاں..... آپ سب! مگر گوہر جی کا ناظرہ اس بات پر بند کر دیں تو مجھے از حد خوشی ہوگی۔"

"کس بات پر؟"

"بھئی آپ بہت بھولے ہیں۔ جس بات کی گوہر جی نے آپ کو بولیں کہ ہوا بھی نہ لگنے دی یہ بات میں آپ کو

بتائے دیتی ہوں۔ یہ شادی خالصتاً لومیرج ہے۔"

"جی....."

"جی ہاں آئی سوئیر۔ آپ جانتے ہوں گے گوہر سر عبداللہ عسکری کی نواسی ہیں۔"

"جی ہاں۔ جانتا ہوں۔"

"اس نائدادن سے برسوں پرانی دشمنی اس مبارک رشتے نے دوستی میں بدل دی ہے۔" وہ سیدلت سے ہر بات

کہے جا رہی تھی۔

"آپ لومیرج کا ذکر کر رہی تھیں؟"

"ارے میں بھی اتنی پانچ ہوں۔ کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ سال ڈیڑھ سال قبل کی بات ہے۔ گوہر جی اپنے

تھیانی گاؤں میں آئی ہوئی تھیں۔ بارانی موسم میں سچ ہی سچ سیر کرنے نکل پڑیں۔ بجلی کا چمک اور بادلوں کی گرج

نے انہیں بے ہوش کر دیا۔ بھیا شہر سے آرہے تھے۔ اگر وہ جیب کی ہیڈ لاس میں آئیں دیکھ نہ پاتے تو سڑک پر

پڑی یہ بجلی جاتیں۔ بھیا نے برستی بارش میں گاڑی روک کر انہیں اٹھایا اور جیب میں لٹا دیا۔ گھر لے آئے۔

وہ پہرنگ یہ ہمارے ہاں ہی رہیں۔ مجھے تو ہمیشہ ان پر کسی حور یا پری کا گمان رہا تھا۔ بھیا بھی ان کے حسن سے

مرعوب ہو گئے۔ جتنی دیر یہ ہمارے ہاں رہیں..... اتنی دیر ڈاکٹر بارہن احمد واسطی کے ہوش ختم پڑا کہ ڈالنے

کے لیے کافی رہیں بلکہ انہوں نے ہم سب کو دل میں گھر کر لیا۔ اور پھر..... پھر کیا ہوا تھا۔ بس یہی کہہ تو بہت یہاں

تک آئی۔ ہمارے خاندان ہمدانی کی اپنی جنین ناز اس بہت طنز کے آگے جو کاوی۔ بھیا کسی کیوں کے سلسلے

میں فارن نہ گئے ہوتے تو یہ شادی چوبائیس ہی ہو چکی ہوتی۔"

شہیر میں کتر سے رہنے کا حوصلہ ہی پانی نہ پڑا تھا۔

"ارے میں آپ سے اب بھی نیکی یاد رہی ہوں۔ گھر والوں کو بتایا ہی نہیں۔ آپ کسی اور سے بات کرنا چاہیں

تو... کیونکہ گوہر تو ناں جی پاپا جان اور ماسون بھائی کے ساتھ لاہور میں ہیں۔ شاید کل تک ہاتھی سو جائے.....

ہم ایک ایک چیز میں ان کی پسند کا لحاظ رکھ رہے ہیں۔ جب پہننا ہوتا ہے انہوں نے ہے تو پسند بھی ان کی بیٹی

چاہیے۔ کیوں سچ کہا ہے نام میں نے۔"

"یہ لہجے ارم آ رہی ہیں۔ ارم ان کی خاص الخاص نون ہیں۔ آپ بات کر لیں ان سے۔ ارم..... گوہر کے کوئی

کذاں تھا تو ہیں ان کا پوچھ رہے ہیں۔ آپ بات کر لیں۔"

شاید ارم نے ریسپر اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ شہیر نے انکی کریڈن پر دیکھ دی۔ رابطہ کٹ گیا۔

یہ رابطہ..... ٹیلی فون کا نہیں شہیر کے دل کا کتا تھا۔ گوہر کے دل سے جزارا بیلہ۔ اب اس میں دو قدم چلنے کی

ہمت بھی باقی نہ رہی۔ وہ وہاں نیچے دیوار سے ٹک لگا کر بیٹھ گیا۔ چکر اتے سر کو ہاتھوں سے تھماتا۔ آنسو نکلنے چلے

آئے۔ دل..... جو تازہ ہونے میں شکست و ریخت نہ دیتا تھا گوہر کی بے وفائی نے اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔ وہ

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ باواز بلند..... اس نے سر دیوار سے ٹکرا دیا۔ وحشت کے ساتھ..... وہ بار بار دل کو

دونوں ہاتھوں سے تھامے جا رہا تھا۔

"گوہر! اوہ! فاکوہر..... اوہر جاتی گوہر..... انہوں نے میرے دل کو کھلیا تو سمجھ کر کھیل کھیا اور چلی گئیں۔ مجھے

چھوڑ گئیں۔"

"تو یہ بھی تمہارے نہ آنے کی وجہ..... تمہاری بے پروائی کا سبب تمہیں..... ایک ہر جاتی لڑکی کو شہیر کے ہاتھوں

سے واسطہ بھی پیسے ہوتا..... تم اپنی ہی محبت میں گم ہو گئیں۔ مزہ کر دیکھنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔"

وہ تو اب باقاعدہ دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ وہ زندگی میں بھی اتنے جھگڑے نہ ہوا تھا۔ اس نے بڑی بڑی

باتیں آسانی سے سمجھ لی تھیں۔ لیکن یہ جاہل بہت بڑا تھا۔ اس کے حوصلوں اور برداشت سے بڑا۔

گوہر پلور میں کسی کے قدموں کی آواز آئی۔

"کون ہے؟ کون رو رہا ہے؟"

ڈاکٹر ہنری کی مہربان آواز اس کے کانوں میں آئی۔ انہوں نے مرکزی ہلب آن کر دیا۔

"انہوں نے شہیر..... تم..... تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ کیوں رو رہے ہو؟ کیا ہوا؟" وہ اس پر جھک گئے۔ شہیر اور بھی

زیادہ جذباتی ہو گیا۔

"میرے بیٹے امیری جان.....! کیا ہوا؟ کیا پاگل پن ہے؟"

انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اسے اوپر اٹھایا۔

"آؤ..... اندر آؤ میرے کمرے میں۔ سب لوگ کیا کہیں گے۔ بہادر شہیر بڑوں ہو گیا ہے۔ اور یہ تم ابھی تک

سوئے کیوں نہیں۔ یہاں کیا کرنے آئے۔ تم چلو آؤ۔"

وہ اسے تھپتھپتے ہوئے اس کمرے تک لے آئے جو آج کل ان کا تھا۔ اسے اپنے ہنڈ پر بیٹھا دیا۔

"شہیر.....! مر رہی ہو یا کترتے ہیں بھلا..... اور بیٹے اب تو میرا خیال ہے پریشانی کی کوئی بات ہی نہیں رہی۔

انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب اچھا ہو جائے گا۔"

انہوں نے شہیر سے اس کی آنکھیں صاف کیں اور خود ساتھ بیٹھ گئے۔

"سب ٹھیک ہو جائے تو بھی لیا ہے۔ اب کچھ بھی بہتر ہے..... کچھ بھی ہو جائے..... شہیر کو زندگی کی آرزو

نہیں رہی۔"

"کیا ہوا؟ بتانے کیوں نہیں؟"

"نانا! زندگی سے ناتوں سے ایمان اٹھ گیا ہے۔ اور جب ایسا ہو جائے تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔ زندگی خوب



ہوں۔

"آپ..... میرا مطلب ہے سر! آپ شہیر کے لیے....."

"لو! یہ شہیر کے لیے نہیں..... بلکہ شہیر کے خلاف یہ مقدمہ ٹر رہا ہوں۔ ان طلبہ نے پڑھائی کی آڑ میں ہندو گردی کا جو بازار گرم کر رکھا ہے..... ایک دو کو جو ہر تاک مزائل جائے تو سب درست ہو سکتے ہیں۔ ماں باپ بے چارے بچے بچوں کی اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں میں ایسے انسان بنانے کے لیے بھیجتے ہیں اور یہ بتا جاتے ہیں بے رحم جلاور..... آپ نے پڑھا اور سنا ہوگا کوئی دن خالی نہیں جب ان طلباء نے کھلم کھلا کوئی ہنگامہ کھڑا نہ کیا ہو۔ میں شہیر کو عبرت ناک مثال بنانا چاہتا ہوں تاکہ آئندہ برسیوں کسی کو ایسا کرنے کی جرأت نہ ہو۔ میں اپنی ساری مہارت اس کیس پر صرف کروں گا۔"

گوہر عبدالرب چوہدری کے تیروں اور ارادوں سے گھبرا گئی۔

"اگر وہ مجرم نہ ہوتا تو بھی آپ کی مہارت اسے پچاسی کے تختے تک پہنچا کر رہے گی۔"

"سنا مطلب؟"

"سر! مجھے خبر نہ تھی کہ آپ اس کیس کے وکیل ہیں۔ ہونٹ کے آپریٹرز نے آپ کا نمبر ملا دیا۔ میں نے آپ سے وقت لے لیا۔ میں تو آپ سے شہیر کے بارے میں بات کرنے آئی تھی۔ جسے سزا دلوانے کے لیے آپ اس قدر جذباتی ہو رہے ہیں وہ ہرگز اس سزا کا حقدار نہیں ہے۔ یہ ایک سازش ہے! سرگرمی سازش۔"

"کیا کبڑا چاہ رہی ہیں آپ.....؟"

"وہی جو حق ہے..... جو حقیقت ہے۔"

"آپ..... میرا مطلب ہے آپ شہیر کی کیا لگتی ہیں؟"

"کیونکہ رشتہ نہ ہوتا پھر بھی حق کی خاطر آواز بلند کرنا میرا فرض ہوتا۔ وہ میرا مومن زواہ ہے۔ میرا سنگتیر بھی تھا اور..... اور..... وہ بھی جس پر ایک ٹرک ٹھکر کر سکتی ہو۔"

"اور آئی تی۔ انہوں نے نظریں جھٹکائیں۔"

"آپ کے اس کیس کا اہم گواہ مامون واسطی ہے۔ اس نے پرانی دشمنی کا بدلہ چکانے اور مجھے گین کرنے کے لیے شہیر کو اس کیس میں الجھانایا۔"

"آپ مجھے پوری بات بتائیے۔ وکیل کو صرف قانون کی کتابوں کی ہی نہیں انسانوں کے دلوں میں بند رازوں سے آگاہی کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ جوچ ہے آپ مجھے بتادیں۔"

گوہر نے جو تھے دنوں میں کسی سے کچھ بھی نہ کہہ سکی تھی سب کچھ ان سے کہہ ڈالا۔ ایک ایک حرف جو وہ جانتی تھی۔

"چوہدری صاحب! یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ آپ اس ظلم میں شریک ہوئے تو روتے قیامت آپ بھی اس سزا سے بچ سکیں گے جو خدا نے ایسے ایسے لوگوں کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ میں بھی غلط تھی کا شکار تھی۔ شہیر سے نفرت کرنے لگی تھی لیکن اس خط نے جوٹل سے ایک روز قبل لکھا گیا اور مجھے رات ملا ہے میری آنکھیں کھول دیتا۔ یہ نوشاہہ کا خط ہے جو سرنے سے ایک دن قبل اس نے مجھے لکھا..... پونیورسٹی کے ایڈریس پر..... اور جو پھرتا پھرتا میرے ماموں کے گھر چلا پہنچا۔"

"یہ خط نہیں ایک نمبر پورے کہانی تھی۔ چوہدری صاحب نے ایک ایک حرف بغور پڑھا۔ آخر میں نوشاہہ نے اپنا

ادارہ بھی ظاہر کیا تھا اور شہیر جیسے انسان کے عزم و ہمت کی تعریف بھی کی تھی۔ شہیر کی طرف سے شادی کی پیشکش لی وہ پر بھی تبصرہ کیا تھا اور گوہر کو مبارکباد بھی دی تھی کہ اس کا سنگتیر ایک مثالی انسان ہے۔

"چوہدری صاحب! ایک لڑکی کو جس نے اپنی زندگی اپنی کھوئی ہوئی عزت کے ظلم میں ختم کر دیے کا فیصلہ کرنا تو جھوٹا یونٹ ہے کیا ضرورت تھی۔ شہیر نے نوشاہہ سے شادی کا فیصلہ کر کے مجھے بھی آگاہ کیا تھا۔ میں صرف نینے سے آگاہ ہوئی تھی۔ اس کے سبب سے نہیں۔ اگر یہ سب کچھ مجھے اس وقت معلوم ہوتا تو میں نوشاہہ کو مرنے دیتی۔ اپنا محبوب اپنا سنگتیر جو خوشی اس کے دامن میں ڈال کر شہیر کے ایثار کو پایہ تکمیل تک پہنچاتی۔ ایک انسانی بان بچا لینے کی خوشی جلدانی کے غم پر بھاری رہتی..... مامون ایک خود غرض اور بے رحم لڑکا ہے۔ اس نے شہیر کے خلاف میرے کان بھرے۔ اس سانچے کا نمبر پور فائدہ اٹھایا۔ حسن حد تک ممکن ہوا حالات کی ستم کاریوں سے وہ بتا فیض اٹھا سکتا تھا۔ اٹھا لیا۔ اس نے کل بھی مجھے دھمکی دی ہے۔ وہ شہیر کی جان کے ورپے ہے۔"

"ہی! چوہدری صاحب! خالص متاثر ہوئے تھے۔"

"میں اتنا کرسٹ ہوں کہ پچاسی کے ایسا مرضی سے اس مقدمے سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ مگر میری جگہ جو بھی اس مقدمے کو نبھائے گا مامون کی گواہی تیرا ہدف ثابت ہوگی۔ یہاں نہ مسئلہ شہیر کا ہے نہ قابل کی نشاندہی کا۔ نہ ہی آلہ قتل کی بازیابی نہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کا۔ ہر شے اپنی جگہ واضح ہے۔ اس کیس میں موثر ترین حیثیت ان ہی گواہوں کی ہے اور فیصلہ سازی پر ہوتا ہے۔ ایک شخص اتنی ذہنیاتی پر اثر آیا ہے کہ دیکھو وہ انستہ بیٹرا م شہیر کے ساتھ چنا چاہتا ہے تو پھر کیا ہو سکتا ہے۔ کیا یہاں حلفاً خدا کو حاضر و ناظر جان کر دینی جاتی ہیں۔ جس شخص کو اپنے بست پر خدا کا ڈر بھی نہیں ہے اسے اور کیا چیز ڈرا سکتی ہے۔ میں اس کیس کی اچھی طرح سمجھ گیا ہوں لیکن افسوس ہے کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میری سوری گوہر بیٹی..... میں شہیر کی بدقسمتی پر اٹھنا رافسوس کے سوا کچھ بھی تو نہیں کر سکتا۔ لیکن اتنا دھم ضرور ہے کہ میں آج ہی اس کیس سے دستبردار ہو جاتا ہوں۔"

"شکر ہے سر! آپ کے اس حد تک تعاون کو میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

وہ بلوٹ آئی۔ کتنی ہمت دکھائی تھی اس نے! ایسی عداوت تک پہنچی آئی تھی۔ وہ ایسے ہونٹ پہنچی تو کورڈور میں اس کا سامنا مامون سے ہو گیا۔ وہ شاید ہی اس کے انتظار میں تھا۔

"کبڑا لگتی تھیں؟"

وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

"کیس بھی جاسکتی ہوں۔"

"تم اب شہیر کی محبوبہ دنواؤں نہیں ڈاکٹر بارون کی ہوئے والی بیوی ہو اور ہمارے خاندان میں لڑکیوں کا یوں مارا مارا پھرتا بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ بابا جان کو خبر ہوگی تو خفا ہوں گے۔"

"مامون..... اتنے سنگدل نہ ہو۔" وہ ایک دم رو دی۔

"کیسی سنگدل! سنگدل ہونا تو ہمیشہ کے جذباتوں کی قدر کرنا؟ تمہیں اپنانے کو اسے پاؤں پھینکا؟" وہ مسکرایا۔

"نہیں مامون! ایک بے گناہ کی جان لے کر تم اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہے۔ یہ خون تمہارے سر پہنچا۔"

"تم عبدالرب چوہدری سے مل کر آ رہی ہو نا۔ اس شہر میں وکیلوں کی کمی نہیں۔ وہ کیا چیز ہے۔ اب تو انتہائی نبرداری ہو گیا ہے شہیر کا مرنا واقعی ہم سب کی زندگی ہے۔ جب تک وہ زندہ رہے گا ہم سب کے اعصاب پر سوار ہے گا اور تمہارے دل میں موجوں رہے گا۔ میں اس کے خلاف گواہی ضرور دوں گا۔"





ہاسپٹل کے ساتھ ہی ڈاکٹر ہارون کی رہائش گاہ تھی جس کے طویل و عریض لان میں بے حد رونق تھی۔ مرکزی بلبل، ٹیوب ڈائٹوں اور رنگ برنگے برقی قہقہوں نے عجیب سی بہار بکھیر رکھی تھی۔  
کل شادی کا دن تھا۔ گیٹ پر انتہائی خوب صورت استقبالیہ الفاظ رنگ برنگے پھولوں سے لکھے گئے تھے۔ وہ ڈری آئی ہاسپٹل کے گیٹ پر نصب یورڈ پڑھنے لگی اور پھر اپنا آپ چادر میں بیٹھتے ہوئے گیٹ کی راہ اندر چلی آئی۔

”ڈاکٹر ہارون کس طرف ہوں گے؟“ طویل برآمدے میں آکے اس نے ایک کمرے سے نکلتی نرس سے پوچھا تو اس نے حیران ہو کر گوبر کو دکھا۔ شاید اس کا حلیہ اس کی حیثیت کا تعین کر رہا تھا۔ یا اسے یاد نہیں رہا تھا کہ اس کے ہاتھ پر مہندی سے بچے ہیں اور ہر عام ہی جنرل سے جھانک کر سارا راز فاش کر رہے تھے۔  
”جی ہوا ہے آفس میں ہیں۔ دور ہارون کا آفس۔“

”تھینک یو۔“ وہ آگے بڑھ گئی۔  
گوہران کے آفس کی طرف چلی۔ بڑے حوصلے سے گھر سے نکلی تھی۔ یہاں آ کر گھبرا گئی۔ یہ کیا کر دیا تھا اس نے۔ کل اس کی شادی تھی۔ ابھی کچھ بریک اس کے ہاتھ پاؤں مہندی سے رنگے گئے تھے۔ اور وقت تھا اپنے ہونے والے شوہر سے ملنے چلی آئی تھی۔ وہ آفس کے دروازے کے قریب رک گئی۔  
”گھر میں یقیناً میری غیر موجودگی کی خبر سب کو ہو چکی ہوگی۔ وہ لوگ کیا خیال کریں گے۔ اب انہیں پتا چل گیا ہوگا۔ اسری اور نیل بھائی کو بھی۔ انہوں نے مجھے نہ پا کر ہوش کھو بیٹھیں گی۔ یہ کیا کیا میں نے۔ کیوں چلی آئی یہاں۔“

اس کے قدم وہاں رک گئے۔ آگے بڑھے یا پیچھے..... فیصلے کی قوت ہی اس سے چھین گئی۔ برآمدے میں رکے بیچ پر دو تین خواتین بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھ کر ایک دوسرے سے اشاروں میں بات کر رہی تھیں۔ لیکن اپنی ہی نگہوں میں گم گوہران سے لگی بے خبر تھی۔

”خیریت ہے لہجہ! کس سے ملنا ہے آپ کو؟“ چڑا سی ڈاکٹر ہارون کے کمرے سے باہر نکلا۔  
”جی..... وہ..... مجھے ڈاکٹر ہارون سے ملنا تھا۔“ اس نے کہہ ہی ڈالا۔ اس کی بات مکمل ہوئی تھی وہ عین اس کے سامنے آ کر بڑھے ہوئے۔

سفید براق شرٹ سیاہ پینٹ آنکھوں پر سیاہ گانگنز..... کہیں باہر سے آ رہے تھے۔  
”آئی ایم سوری بھترہ..... میں.....“  
اس کے چہرے پر لگاؤ پڑتا ہی ان کے الفاظ جوں کے توں ان کے اندر ہی رہ گئے۔

”گوہر..... آپ..... اس وقت یہاں میرے ہاسپٹل میں.....“ انہوں نے سر ہاپا سے دیکھا۔  
”اللہ داد..... نی الجائی میں کسی مریض کو اینڈ نہیں کروں گا۔ اندر کوئی نہ آئے۔ آپ چلیے اندر۔“  
وہ سرسبز قدموں سے دروازہ پار کر کے اندر آ گئی۔ ہارون اس کے ساتھ ہی اندر داخل ہوئے۔  
”آپ یہاں کیوں آئی ہیں آپ کو بہرہی ہیں نا گوہر عسکری؟“ انہوں نے اپنا شک و دور کرنا چاہا۔  
”تھا ہاں.....“ وہ رک گئی تھی اور اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ آنکھیں برس رہی تھیں۔ لب کانپ رہے تھے۔  
”سب خیریت ہے نا! مگر گناہے خیریت نہیں ہے۔ یہ آپ کا یوں آنا۔“  
وہ اسے نیٹھے کا کہہ سکے نہ خود بیٹھے۔

”کیا گھر والوں کو خبر ہے کہ.....“  
”گھر والوں کو تو کسی بات کی خبر نہیں ڈاکٹر ہارون واسطی نہ مجھ پر ہونے والے ظلم کی۔ نہ کسی کی بے گناہی کی۔ نہ آپ کی لاعلمی کی۔ نہ ماموں کی سفاکی کی..... نہ زمانے کی بے رحمی کی۔“  
”جی کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ میں کچھ نہیں سمجھ رہا۔ بخدا نہیں سمجھ رہا۔ ڈاکٹری کی مشکل ترین اصطلاحوں میں کھو کر۔ شاید ہائی چیزیں سے انجان رہ گیا ہوں۔“

دو سماوی سے کہہ رہے تھے۔  
”آپ جو کہنا چاہتی ہیں کھل کر کہیے۔“  
”ڈاکٹر ہارون۔ کیا آپ وہ سب سن میں گے جو میں کہنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ وہ فیصلہ کر سکتیں گے جو ایک اچھے انسان کو کرنا چاہیے۔ اور کیا آپ میں سچ سننے اور سچ کا ساتھ دینے کی جرأت ہے؟“  
”آف کورس..... میں نے زندگی کے ہر موڑ پر خود کو اپنا ہی پایا ہے اور آپ کا جو بھی مسئلہ ہے آپ کو جس قسم کا تعاون دے گا وہ اس کے لیے آپ مجھے ایک انسان ہی پائیں گی۔ انسانیت سے آئینا انسان۔“  
”سچ؟ سچ؟.....؟“ اس نے ان کے چہرے پر نظر میں بھاڑیں۔  
”جی ہاں۔“

”میں نے بہت سوچا پھر کے بعد کوئی راہ نہ پا کر تقدیر کے ستم سہہ لینے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اچانک آپ میرے خیال میں آئے۔ میں نے سوچا ایک بے یار و مددگار مصیبت زدہ لڑکی کو اٹھا کر اپنے گھر لے جانے والا اور پھر بھلائی سے اسے واپس اپنے گھر چھوڑ آنے والا..... کوئی اچھا انسان ہی ہو سکتا ہے۔ سو میں چلی آئی۔ آپ سے اپنا دند کہہ کر آپ کا فیصلہ سننے۔ کیا آپ کے پاس مجھے دینے کے لیے وقت ہے؟ کیا آپ میری بات سن سکتیں گے؟“

”ضرور..... بہ حال میں.....“  
ڈاکٹر ہارون کو غیر معمولی صورت حال کا احساس ہو گیا تھا۔ تھی وہ از حد سنجیدہ بلکہ ٹگر مند ہو گئے۔  
”گھر آ کر بیٹھو تو جانیے۔“  
انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ خود اس کے سامنے اپنی سیٹ پر جا بیٹھے۔  
”اب کہیے۔“  
گوہر کہنے کے لیے مناسبت الفاظ ڈھونڈتی رہی اور وہ اس کا چہرہ دیکھتے رہے۔

”آپ چپ ہیں۔ میں پریشان ہوا چاہ رہا ہوں۔ کہیے نا۔ بولے نا۔“  
”ڈاکٹر صاحب! اگر آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ کے سامنے بیٹھی یہ لڑکی آپ کی دنیا میں آپ کی بیوی بن کر آتے ہوئے اپنے ساتھ آپ کے اور آپ کے ساتھ کے خاندان کے لیے سوائے نفرت کے اور کوئی جذبہ لے کر نہیں آسکتی تو آپ کا رد عمل کیا ہوگا؟“  
”نفرت..... مجھ..... نے میرے خاندان سے۔ نہیں نہیں گوہر..... محبتوں کا بدلہ محبتوں سے دیا جاتا ہے نفرت سے نہیں۔ میں..... میرے اہل خانہ آپ کو پسند کرتے ہیں۔ آپ سے محبت کرتے ہیں۔ آپ کیسے ہم سب سے نفرت کر سکتی ہیں۔ نفرت تو بہت برا جذبہ ہے۔“  
”مگر مجھے آپ کو گون ستا زحہ نفرت ہے۔“





رہیں گے۔ پریشان ہوں گے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں خوش ہوں گوہر..... آپ..... آپ پر مجھے فخر ہے۔ شبیر کو میں نے دیکھا نہیں۔ میں اسے جانتا نہیں لیکن اس کی جو تصویر آپ نے مجھے دکھائی ہے وہ بہت خوب صورت اور دلکش ہے۔ میں اس نوجوان کی عظمت کو سلام کرتا ہوں اور آپ کا قائل ہو گیا ہوں۔ آپ نے وہاں کا پرچم بلند رکھا ہے، محبت کی لاج بھائی ہے۔ میں نے دلا کے متعلق سنا تھا، دیکھا نہیں تھا۔ آج دیکھ لیا ہے۔ مجھے ایک لڑکی کی بہت بہادری اور صاف گوئی پسند آئی ہے۔ حقیقت کا یہ کڑواہٹا ہمارے لیے موت نہیں حیات ہوگا۔ میں نے تو آپ کو صرف پسند کیا تھا۔ وہ آپ کو زندگی سمھتا رہے۔ میں کسی کی زندگی نہیں لینے کا بھی نیک جرم کیوں کروں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو انسان کو کمزوریوں کی بنا پر اسے بلیک میل کرتے ہیں۔ وہ اپنی کرسی چھوڑ کر اس کی طرف آئے۔ اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"گوہر! آپ کو پریشان نہیں رہنا چاہیے..... انشاء اللہ اس مسئلے کا بہترین حل نکل آئے گا۔ آپ بے فکر رہیے۔ کوئی سیاہ رات آپ کی زندگی میں نہیں آئے گی۔ میں ہر قدم پر آپ کا ساتھ دوں گا۔ سچائی صرف ہواؤں اور آلات حرب کے ساتھ ہی نہیں کی جاتی۔ انسانی زندگی کے کام آنے کے اور بھی طریقے ہیں۔ مجھ پر اعتبار کیجیے..... میں..... مجھ میں اتنی قوت ہے کہ میں زمانے سے اپنا سبق منوا سکوں۔ میں جانتا ہوں کہ میری زندگی کسی کے کہنے پر ہاں میں نہیں بدل سکتی۔ اس کا فیصلہ اچھی ہو جائے گا۔ آپ پسند کریں تو میں آپ کو چھوڑ آؤں۔ چلیے....."

گوہر کھڑی ہوئی..... ہارون کے پیچھے چلتی کمرے سے باہر نکل آئی۔ طویل برآمدے طے کر کے وہ پورج میں آئے۔ گوہر نے بھٹی نشست پر اپنے آپ کو گرا دیا۔ ہارون واسطی مسکرا رہے تھے۔ لیکن یہ مسکراہٹ بڑی عجیب تھی جس کا کوئی سبب گوہر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ہنس دیے۔ ہلکی سی ہنسی گاڑی کے مختصر اچالے میں پھینک گئی۔

"ایک بار آپ کو چھوڑنے گیا تھا۔ پھر ملنے کی امید کے ساتھ..... آج چھوڑنے جا رہا ہوں ہمیشہ کے لیے۔ دیکھ سکنے کے یقین کے ساتھ۔ کتنا فرق ہے آج کے دن اور اس دن میں۔ بعض اہم واقعات آدمی کے لیے کتنے غیر اہم اور بے سبب ہو جاتے ہیں۔ شاید اس کا نام زندگی ہے۔ ویسے گوہر! کیا اس امید رکھوں کہ آپ خوشیاں کے ان لحاظ میں ایک شخص دوست کو یاد رکھیں گی۔ تاکہ میں آؤں اور شبیر کو مبارکباد دے سکوں کہ ایک بے مثال لڑکی اس کا نصیب ہے۔"

گوہر خاموش ہی رہی۔ اسے تو ابھی تک اس بات کا یقین نہیں آیا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی ہے۔ جلد بازی کے تحت کیے فیصلے کے سبب گھر سے نکل کر اس نے سچ سچ اپنا آپ محفوظ کر لیا ہے اور ہارون احمد واسطی جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ ضرور کر دکھائیں گے۔

اس نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے ہاتھ کی پستلی پر رکھے ہارون کے نام کو دھورتی رہتی۔

"ہر واقعہ جو ہماری زندگی میں رونما ہوتا ہے اس کی کوئی وجہ کوئی سبب ہوتا ہے اور ہر واقعہ اپنا ایک اثر چھوڑتا ہے جانے اس واقعے کا کیا منقہ اور کیا نتیجہ ہے۔" وہ گویا خود سے مخاطب تھے۔

"ڈاکٹر ہارون!" گوہر نے انہیں پکارا تو وہ بیک پیوہر میں اسے دیکھنے لگے۔ وہ شرمندہ شرمندہ ہی لگ رہی تھی کہنے لگی۔

"آپ کی اچھی سی لڑکی سے جلد از جلد شادی کر لیجئے گا۔"

"اچھی لڑکی....." وہ ہنس رہے۔

"جی ہاں جو آپ جیسے عظیم انسان کے قائل ہوں۔"

"ذہنوں نے میں ایک زمانہ نگاہ جائے گا۔ کیا خبر ملے بھی کہ نہ ملے۔ جانے کب میں یہ فیصلہ کر پاؤں۔ کب ذہنوں چھوڑے ان باتوں کو..... آپ خوش رہیں۔ یہ بات مجھے خوشی دے گی۔ پھر اس کے بعد میں کچھ سوچوں گا۔"

گھر آ گیا..... وہ اپنا آپ چادر میں چھپا کر گاڑی سے اتر آئی۔ گھر سے نکلنے کو اس نے جس بغلی دروازے کا انتخاب کیا تھا وہ اب بھی ویسے ہی بند تھا جیسے گوہر چھوڑ آئی تھی۔ ہارون گاڑی نکال کر چلے گئے۔ وہ اندر داخل ہوئی۔ کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر آئی۔ کوریڈور میں کھلنے والا دروازہ اسی طرح اندر سے بند تھا۔ اس نے چادر اتار کر الماری میں رکھی اور دم سے پلنگ پر گر پڑی۔

"بہادر بننا گوہر..... جس رات پر تم نے قدم رکھ دیے ہیں اس رات پر حوصلہ کام آئے گا۔ رونا بھونکا نہیں۔ تمہیں اب بہت کچھ دیکھنا کہنا اور سننا ہے۔ بہادر ہو گی تو جی سکو گی..... جی بریو۔" اس نے خود کو سنبھالا دیا۔ دروازہ دھڑ دھڑ بج رہا تھا۔

اس نے اٹھ کر بے اختیار دروازہ کھول دیا۔

"کیا پوریت ہے بار..... کوئی ایسے بھی گھوڑے بیچ کر سونا ہے۔ ددھنے ہو گئے۔ کئی بار تک کہہ چکی ہوں۔ ایسی بھی کیا نیند۔" ادم دروازے پر تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"پہچھونے شور مچا رکھا ہے۔ رات سر پر ہے۔ مہندی کے تھان تک اندر تھے اور ہم سب کے کپڑے الماری میں تھے۔ ظہیر بھائی دروازے توڑنے والے تھے۔ کیسی فحشا حرکت ہے۔ دروازہ کھلا چھوڑ کر سو جاتیں۔ ہم ساہاں اٹھا لیتے۔"

گوہر جواب میں خاموش رہی۔ جوہر آیا۔ آمنہ ماما اور باقی لڑکیاں بھی وہیں آ گئیں۔

"الوہ گوہر! شکر ہے تمہاری آنکھ تو کھلی۔ بھئی یہ بھی سونے کا وقت تھا۔ بھلا ہم چلے جاتے تو کردہ ہو کر کے سوئی رہتیں۔ پریشان کر کے رکھ دینا۔ سلی کے فون پر فون آ رہے ہیں۔ وہ لوگ ہمارے انتظار میں ہیں۔ میں تو ڈر گئی۔ کہیں تم نے کچھ پھاٹک تو نہیں لیا۔ ماما نسلی نہ دیتیں تو میں ظہیر وغیرہ سے کہہ کے دروازہ توڑا ہی دیتی۔"

جوہر کی جان میں جان آ گئی تھی اسے دیکھ کر۔ پھر ماما ناراضی کا اظہار کر رہی تھیں۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آمنہ بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔ چہرے پر نیند سے بیداری کا شائبہ تک نہ تھا۔ اور تمہیں گھننے قتل کی پڑ مر گئی بھی نایاب تھی۔ لڑکیاں اپنے اپنے لباس کی فکر میں لگ گئیں۔ جوہر مہندی کی بھی چوائی تھا لیاں اٹھوا کر باہر کھانے گئیں۔ آمنہ اس کے پاس آئیں۔ گوہر نظر میں چرائے بیٹھی رہی۔

"کیا بات تھی گوہر۔ تم نے تو مجھے مار دیا۔ سو طرح کے وہم آ رہے تھے۔ پریشان ہو کے لڑنیاں حاصم بھائی اور آپ کی طرف جاری تھیں۔ میں نے ریک ابابا۔ وہ تو شکر ہے سب مر اپنے اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ ارنہ بات بھٹس جاتی۔ تم نے جان بوجھ کر دروازہ نہیں کھولا نہ۔ سچ بتاؤ بات کیا ہے؟"

وہ آٹھ کا چہرہ بغیر دیکھنے لگی۔ اس کا دل جا پا کہ وہ سچ سچ بتا دے۔ لیکن پھر خاموش ہو گئی۔

"خود کو ماضی کی بھولی بھیلیوں سے نکال لو گوہر! یہ احتجاج کا طریقہ نہیں ہے۔ لوگوں کو باتیں بتانے کا موقع

”آپ کو ان کے آگے اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پہلے شاہنواز بھائی اور دلنواز سے بات کیجئے۔ کاظم کو بتائے۔ سچیل سے ذکر کیجئے اور اس کے بعد جو بھی ہو ٹھیک ہوگا۔“

چند گھنٹوں میں سب لوگ وہیں جمع تھے۔ فیصلہ ہوا کہ سب مل کر ہی بڑے والوں کی طرف جائیں گے۔ جہاں گھر بھر سہم کر رہ گیا تھا وہاں چچی جان کے چہرے پر پل میں اطمینان آ رہا۔

”پڑاگنی ناہن ہاں کے بچے کی آد..... اور ظلم کریں۔ مجھے یقین تھا یہ شادی نہیں ہوگی۔ یہ کہیں لکھا ہی نہیں ہے کہ گوری میرے شہرے کے سوا کسی کی وہن بنے۔ خدا نے میری کن لیا۔ وہ بڑا رحیم ہے۔“ وہ شکر بجا لارہی تھی۔

”اڑو چچی جان..... عاصم بھائی نے سن لیا تو..... آپ خاموش ہی رہے۔“ آسنے نے انہیں ٹوکا۔

”اے اب تک چپ رہی ہوں۔ اب نہیں رہوں گی۔ خدا سب کی سننے والا ہے۔ وہ حق اور ناحق کو دیکھ رہا ہے کسی پر ظلم نہیں کر سکتا۔ غضب خدا کا لڑنے کو جان کے لالے پڑے ہیں اور انہیں سب بھی ہے شادیوں کی۔ بہت تیا اچھا ہوا۔ اب تو مزایا ہے کہ ان سب کو دھکے دے کر گھر سے نکالیں وہ لوگ تب انہیں عقل آئے گی۔“

چچی اپنی کہے تھیں۔ صغیرہ بیگم آفسو بہا رہی تھیں۔ آسنے لنگ۔ جینھی تھیں۔ سعیدہ بیگم دوڑی ہوئی آئیں۔

”کیا یہ سب سچ ہے جو تم نے سنا۔“

”اور تمہیں تو کیا؟“

”اوہو..... بہت برا ہوا۔ کیا خبر تھی۔ وہ دل میں پرانی دشمنی کا غبار لیے ہوئے یہاں آئے تھے۔ انہوں نے تو کسی طور یہ احساس ہی نہیں ہونے دیا تھا۔ کتنی چاؤ دکھا رہے تھے۔ اے سنا ہے لڑکے نے خدا نکار کر دیا ہے۔ یہ بھی سنا ہے کہ اسے معلوم ہو گیا تھا.....“

”کیا معلوم ہو گیا تھا.....؟“ آسنے نے ان کی بات کاٹ دی۔

”ارے بچی گوہر اور شہیرہ والا قصہ۔ خیر دفع کردہ ان کو۔ عاصم بھائی کہاں ہیں۔ میں ان سے بات کرنے آئی ہوں۔ نعمت بھئی ان سب پر..... میرا بیٹا ان کا بیٹا ہے۔ گھر کی بات ہے۔ ہم دل و جان سے حاضر ہیں۔ کل ہی ہی مقررہ وقت پر شہیرہ سے شادی کرنے پر تیار ہوں میں۔ آؤں داری کا بہن تو ادا ہے۔ رشتے وار ایک دوسرے کے عیب ثواب سے کھنٹن فہر پر آگاہ ہوتے ہیں۔ گوہر اور شہیرہ میں صرف منگنی کا بندھن ہی تو تھا۔ خدا نخواستہ کوئی اور بات نہ تھی۔ پھر یہ تو میری برسوں پرانی خواہش ہے۔ کہاں ہیں سب اڈب۔ ابھی ابھی بات ہو جائے۔ آ یا..... آپ.....“

”بھابھی بیگم.....! بوش میں رہ کر بات کیجئے۔ گوہر کا رشتہ ہارون سے طے کرانے میں آپ کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ یہی تعریفیں کی تھیں عاصم کے سامنے آپ نے واسطی خاندان کی۔ گوہر تیری بیٹی ہے۔ یذا ہم گھر میں رکھی کوئی بے جان شے نہیں کہ جو چاہے اس کی بونی لگا دے۔ بھانڈ میں جائیں سب..... تمہیں گوروں کی میں اپنی بیٹی کی شادی۔ جو قیامت آئی ہے آئے دیجیے۔ جو باتیں بنتا ہیں بنتی رہیں۔ مجھے بیٹی بھاری نہیں۔ یہ ظلم تھا جو میں کٹی تھمیں کر رہی تھی۔ خدا کا شکر ہے میں اس زمانہ سے بچ گئی۔ چند دن کا دکھ عمر گھر کے دکھ سے بہتر ہے۔ بیٹنے ماری عمر ہی بیٹھی رہے میری دلہن پر..... اب کوئی ظلم نہیں کرہاں گی اترا پر۔“

صغیرہ بیگم میں جاسنے کہاں سے اتنی ہمت آئی تھی۔

سعیدہ بیگم کے پاس کہنے کو کچھ نہ رہا۔

”لداق کی کوئی حد ہوتی ہے سعیدہ! شہیرہ کا رشتہ طے کرانے والے لوگوں میں تم بھی تو شامل تھیں اور اس وقت تم

381

کیوں دیتی ہو..... تم شاہین کر کیا ملے گا جو پچکا سے قبول کرنے میں حق عافیت ہے۔“

شاید اس کے دل کی کیفیت اس کے چہرے پر رقم ہو کر اسے پراسرار بنا رہی تھی۔ سچی آسنے کو یہ کہنے کی ضرورت پیش آ رہی تھی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ وہ آسنے کو بھی شریک راز نہیں بنانا چاہتی تھی۔ سو کوئی جواب نہ دیا۔

☆☆☆☆☆☆

”کیا کہا؟ پھوپھا جان نے جانے سے منع کر دیا ہے..... مگر کیوں؟“

”ہاں۔ میں سچا کہہ رہی ہوں۔ پھوپھا سخت غصے میں تھے۔ پھوپھا جان حیران ہو کر انہیں دیکھ رہی تھیں۔ جاسنے کہا کیا کہے جا رہے تھے۔ تم یقین کرو میرا خدا کی قسم مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہوں نے خود شہ سے کہا ہے کہ لڑکیوں کو منع کر دو۔ مہندی کے لیے نہ جائیں۔“

”کیا ہوا؟ کیا بات ہوئی۔ کل شادی ہے مہندی کے لیے پھر کب جایا جائے گا..... نہیں نہیں شادی تم بکواس کرتی ہو..... انہوں نے کوئی اور بات کہی ہوگی۔“

ارم تیزی سے عاصم حسین کے کمرے کی طرف بڑھی۔ آوازوں نے اس سے قدم روک دیے۔

”زیادہ شور مچانے کی ضرورت نہیں۔ یہ رشتہ میں نے نہیں آپ نے قبول کیا تھا۔ خود ہی ان سے پوچھیے کہ ہر خدایا انہوں نے کیوں کیا۔ انہیں ایک بار انکار ہے تو ہمیں سوا بار انکار۔ یہی کوئی بوجھ نہیں ہے۔ وہ تو آپ کوئی کبھی آفت آئی تھی۔ شہیرہ سے رشتہ توڑا تھا۔ مگر یہاں نے کی جلدی کیا تھی۔ گھر بیٹھ کے وہ کھا تو نہ جاتی تھیں۔ اب تو خوش ہیں تا جگ ہنسائی کر کے۔ خود ہی جواب دیجئے رہے گا برا ایک کو۔“ صغیرہ بیگم رہا نئے لہجے میں کہے جا رہی تھیں۔

”جیسے کیا خبر تھی صنو.....؟ وہ ایسے سچ نکلیں گے۔ اتنے کم طرف ہوں گے۔ خود لڑکے نے مجھ سے فون پر با..... کی ہے اور رشتہ ختم کرنے کو کہہ دیا ہے۔ میں نے لاکھ پوچھا کہ میں اس کی کوئی وجہ۔ بس سو رہی کہہ کر فون نہ لیا۔ پہلے میں نے سوچا شاید کسی نے دشمنی میں ایسا کہہ دیا ہو۔ کیونکہ میں نے اس سے پہلے ہارون کی آواز فون پر سنی تھی۔ پھر میں نے خود ان کو نمبر ملایا۔ تب بھی اسی نے فون اٹھایا اور میرے پوچھنے پر ایک بار پھر با..... بات دہرائی۔ نہیں صغیرہ جیسے۔ اس سنہ بہتر ہے میں زندہ زمین میں گڑ جاؤں۔ میں دنیا کو منہ نہیں دکھانا سوجھ تو سنی پوری برادری اور سب احباب سب میرے گھر پر جمع ہیں جو نہیں آئے وہ انھی یا سچ آ جا میرا۔ نکالتا کے لیے پورے شہر کو مدعو کر رکھا ہے میں نے۔ وہ سب..... نہیں نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ میں واسطی صاحب سے بات کرتا ہوں۔“

انہوں نے فون کرنے کے لیے ریسور اٹھایا اور نمبر ملائے۔ تھکی جیتی رہی۔ فون بگنی نے اٹھایا ہی نہیں۔

”میں..... میں خود جا رہا ہوں۔“

”آپ بیٹی کے باپ ہیں۔ آپ ہاں۔“

”ہاں ہاں اپنی عزت کے بہت کونو نے سے بچانے کے لیے۔ بیٹی کا باپ ہوں..... مجھے یہ کہنا ہی نہ.....“

لوگ میری عزت سے یوں نہیں کھیل سکتے۔ انہیں یہ حق نہیں ہے۔ یہ کسی انتقام کا کوئی انداز نہیں ہے۔ انہیں آکھیں تم نہیں۔

”میں جاؤں گا بات نہ رہے گا۔ بی ڈانہا مہندی کے لیے تم لوگوں میں سے کوئی ہاں نہ جائے۔ رسم.....“

پورنی رات پڑی ہے۔ میں بات تو کروں۔“

شیر کی بات بھی کر سکتی تھی۔ یہ رشتہ جو میری نگاہ میں ٹوٹا ہی نہیں پھر سے بھی جڑ سکتا ہے۔ تمہیں شیر کا ذکر کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ صرف جمل ہی گیا ہے۔ نصیب دشمنان دنیا تو نہیں چھوڑ گیا کہ اس کا نام تک سب نے سنا دیا ہے۔" چچی کہنے سے باز نہ رہیں۔

سجیدہ کا جوش و خروش و نولہ تمام ہو گیا۔

"چچی! میں تو اپنی زندگی اٹک شادی کر رہی تھی۔ شیر کا نام کیسے لیتی..... ظلمیر ہی میرے سامنے تھا میں نے برا تو نہیں کیا۔ اور پھر سب کو خبر ہے۔ شیر کی زندگی کا کیا بھروسہ۔ کیا خبر عدالت کا فیصلہ کیا ہو۔ منیہ آجاتی نادان تو نہیں ہیں۔ اپنی بچی کے ارمان نہیں عزیز ہیں۔ میں کوئی بھی بات کر کے ان کا دل نہیں دکھانا چاہتی۔ میں اپنی یہ تجربہ بھی دانت لیتی ہوں۔ آپا کا جودل چاہے نہ کریں۔ گوہر ان کی ہی نہیں ہماری بیٹی ہے۔"

ابھی کسی نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا تھا کہ سارے مرد ایک ایک کر کے بان کر رہے میں داخل ہوئے۔

عاصم ان میں نہیں ٹٹے۔

"گوہر کہاں ہے....." دنواز نے پریشانی کے ساتھ منیہ سے پوچھا۔

"کیوں؟ خیر تو ہے نا۔"

"عاصم بھائی میرا خیال ہے اس کے کمرے کی طرف لگے ہیں۔"

"کیوں؟ کس لیے؟"

"آپا..... یہ تو وہاں جا کر خبر ہوئی بات تو کچھ اور ہے۔"

"کیا؟"

"گوہر ہارون کے پاس گئی تھی۔"

"گوہر..... ہارون کے پاس۔ کب؟ کیسے؟ کیوں؟" سب نے ہاری ہاری پوچھا۔

"یہ تو مجھے خبر نہیں۔ عاصم بھائی کو بتا رہا تھا۔ سونے۔ ابھی کچھ دیر قبل ہارون ہی گوہر کو چھوڑ کر گیا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ تو اپنے کمرے میں ہے۔ کس کے ساتھ گئی؟ نہیں نہیں۔ وہ کہیں جاتی تو ہم سب کو خبر ہوتی۔"

"آپا! ایسا ہو چکا ہے۔ اس نے خود ہارون سے کہا ہے کہ وہ شادی سے انکار کر دے۔ کیونکہ وہ خود کو آج بھی شیر کی انسانیت سمجھتی ہے۔ عاصم بھائی آگ بولہ ہو رہے ہیں۔"

"چلو دنواز..... اس کے کمرے کی طرف۔" چچی جان نے کہا۔ سب لوگ بھاگے بھاگے اس کے کمرے میں پہنچے۔

گوہر سر جھکائے کھڑی تھی۔ عاصم اس پر برس رہے تھے۔

"یہ عمل ہے ہماری محبتوں کا..... اپنے باپ کی عزت بلام کر کے کیا ملا تمہیں گوہر! اس سے اچھا تو تمام کہیں

ذوب مرتیں۔ پیدا ہوتے ہی مر گئی ہوتیں۔ یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔"

"میں نے کچھ بھی خلاف شرط نہیں کیا۔ باپا جان..... میری مرضی نہیں تھی۔ میں نے بہت دن یہ کوشش کی کہ

آپ سب کی رضا کو اپنی رضا بنا لیں..... مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔ میں منافقت نہ کر سکی اس لیے میں نے

ہارون کو صاف صاف بتا دیا۔ تو اس میں جرم کی بات کون سی ہے۔" اس نے ہنکے مر کے ساتھ جواب دیا۔

"جرم سے سچی زیادہ ہے۔ ہم دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ کس کس کا منہ بند کریں گے۔ کس

کس کو جواب دیں گے..... یہ تم نے کیا کیا گوہر....." جوہر آپا روئے لگیں۔ منیہ گوہر کی طرف بڑھیں۔ عاصم پھر گرے۔

"یہ سب تمہاری تربیت کا نتیجہ ہے۔ ایسی ناخلف اولاد سے فاسلہ پڑا ہے اس حرازادے کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔"

"آپا سے الزام مت دیجیے۔ اس کی بربادی کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ نہ میں ہوتی تودہ یہ دن دیکھتا۔" گوہر نے تڑپ کر کہا۔

"زبان کاٹ دوں گا اگر اس کا نام بھی لیا۔ چاہے میری عزت دو کوڑی کی بھی نہ رہے۔ میں تمہیں اس کے نوالے نہیں کروں گا۔ خواب میں بھی یہ نہ سوچنا کہ اس کی راہیں صاف کر دی ہیں۔ تمہارے اس تکلیف پہ عمل نے۔" عاصم حسنین نے غصے سے کانچی آواز میں کہا۔

"میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھے۔ نہ کسی آسن میں انکار کیا ہے۔ میں بھی شیر کی جبین سے نجات پانا چاہتی تھی۔! حساس جرم مجھے مار ڈالتا۔ میں نے خود بھی اپنے سارے جرائم کی سزا انتہائی ہی تجویز کی ہے۔"

"چنو..... اب تو بچ گئی ہو عذاب سے۔ جین سے بچو۔ یہ سوچنا تو ہمارا کام ہے کہ دنیا کے منہ کس طرح بند کیے جائیں اپنی زندگی کس طرح وی جائے۔ تم مزے سے رہو..... باپ کی عزت کا جنازہ لگانے سے بہتر تھا اس کے سینے میں کھجور ایا۔ یہیں اس نامراد کے پاس چلی جاتیں۔ یہ تمہاری دی ہوئی آزادی ہے منیہ۔ جس نے یہ دن دنیا یا کیا کیا بھی اڑنے؟ آواز نہ؟ میں نے تو گوہر کو ان کے پاس انیس اپنا بھروسہ رکھنے کے بھیجا تھا۔ اس بد بخت نے ہماری بیٹی کو اپنے ششے میں اتار لیا اور تمہیں خبر ہی نہ ہوئی۔ میں بھی اپنے نام کا ایک ہوں۔ مر جائوں گا مگر گوہر کی شادی اس رذیل سے نہیں کروں گا۔"

"عاصم بھائی! آپ ہم پر یوں الزام تو نہ لگائیں۔ آواز کو بے حد برا لگا۔ عاصم حسنین کا انداز۔" کس نے کہا ہے کہ آپ گوہر کو اس کے سنگ رخصت کر دیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو عاصم! کچھ خبر بھی ہے۔ دنواز اور آواز کے بارے میں ایسا خیال۔ وہ کوئی دشمن تھے تمہارے اور اس بچے کے چہرے نے کیا کیا ہے۔ وہ بے چارہ تو نہ کر دہ ترسوں کی سزا اٹھت رہا ہے۔"

"اسے تو اس سانچے کی خبر بھی نہ ہوگی۔ اس کا نام خواہ مخواہ سچ میں مت لاد۔ خدا کا خوف کھاؤ۔ جو کچھ بھی کیا ہے گوہر نے اپنی مرضی سے کیا ہے۔ خدا گواہ ہے کہ ہم میں سے کسی ایک کو بھی کسی بات کی خبر نہیں ہے۔" چچی نے سے کانپ رہی تھیں۔ شازبہ سے چپ نہ رہا گیا۔

"گوہر بھائی..... سب لوگ انہیں مطمئن کر رہے ہیں اور آپ فاسوش ہیں۔ آپ بتاتی کیوں نہیں کہ مامون اور شیر کی آپس میں دشمنی کا سبب آپ ہیں۔ آپ نے شیر بھائی سے کہا کیا ہے۔ آپ نے ان کو ڈانچ دیا ہے۔ آپ ڈاکٹر ہارون کی وجہ سے اور دولت سے مرعوب ہو گئی تھیں۔ جب ان کے گھر گئی تھیں سکندر پور آپ نے وہاں آتے ہی اپنا فیصلہ بدل دیا۔ شیر بھائی سے جان چھڑانے کی خاطر ان پر الزام لگا دیا کہ وہ کسی دوسری

ان سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور یہاں تک کہ مامون سے کہہ کر آپ نے انہیں قتل بھیجے جرم میں پھنسا دیا۔

اپ نے شادی سے انکار کیا ہے۔ اس کی وجہ کوئی اور ہوگی ہوتی رہے مگر چچو پھا جان! آپ اس معاملے میں شیر

مانی کا نام نہیں لے سکتے۔ وہ میرے سوتیلے بھائی کی لیکن انسانیت میں سارے رشتے جگے ہوتے ہیں۔ اور

ان کی انسان سے زیادتی ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ یہ نا انصافی ہے اعظم ہے۔ جس کا سب کچھ جین مینا ہوا الزام بھی

اسی کو دیا جائے۔"

شازیہ بولی تو سب خاموش ہو گئے۔ گوہر نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تم چپ رہو۔ بڑوں میں بولنے کی تمہیں کیا ضرورت ہے۔" سعیدہ بیگم نے اسے پیچھے ہٹلے دیا۔

"دھنسل و دانش صرف بڑوں کی میراث نہیں ہے گی..... سوچ ہم چھوٹوں میں بھی ہونی ہے اور آج کی نسل تو ویسے بھی ڈیفینس سے نفرت کرتی ہے جو آپ بڑوں میں بدبجہتم پائی جاتی ہے۔ ہمیں نفرت کو اعراض کے پردوں میں لپیٹ کر نبت کا رنگ دینے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ اور مجھے تو ڈھنسلوں سے ویسے بھی چڑ ہے نفرت ہے۔ اپنے ذہن کے سامنے اشتہار نفرت اور دست سے ہزاروں کے نتیجے میں اظہار محبت میں پورے جوصلے کے ساتھ کر سکتی ہوں۔ ہمدردوں کی ہلکست پر خواہ مخواہ خوشی محسوس کرنا جب کہ اس شکست میں میرا کوئی حصہ نہ ہوتا۔ میں دل زہر لگتا ہے مجھے۔ جیسے آپ شبیر بھائی کے جیل جانے پر بے مقصد خوش ہیں۔"

"شازیہ....." سعیدہ بیگم ہنسی۔

"بند رو اپنی بیکواس۔ تم سے کس نے کہا ہے ٹانگ اڑانے کو۔ بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تم نے۔ یہاں ذکر شبیر کا نہیں بلکہ بدنامی کے اس طوفان کا ہے جو بے چارے عاصم بھائی کا نصیب بننے والا ہے۔"

"یہ تو بدنامی ہے تو چاہیے تھا۔ دوسروں کی خوشیاں خاک میں ملانے والے خود بھی خوش نہیں ہو سکتے۔ بچی نے جو کچھ کہا ہے سچ ہی ہے۔ اسے زندگی کے مسائل سے فرصت ملی نہیں جو وہ ان دور پر دوبارہ مہینوں اور ناتوں کی الجھن کا تجربہ نہیں آئے گا۔"

چچی اماں نے بھی شازیہ کی حمایت کی۔ شبیر کے نام پر وہیں میں جہ بانی ہو جاتی تھیں۔ عاصم حسین ان کے آگے کچھ بول نہ سکتے۔

"پاپا جان! آپ میرے اس انکار کو حقانیت کی روشنی میں دیکھیے۔ یہ مجھے بلیک مل کر رہا تھا۔ شبیر کی زندگی کی شرم میرے اقرار و انکار سے کئی گنی۔ میری وجہ سے ہی شبیر کوئی کے جبو لے ہتھوڑے میں لوٹ کر دیا گیا۔ میری وجہ سے اس پر اتنے ظلم ہوئے۔ اس پر حیثیت کی راجس بھگ کرنے کی بھر پور کوشش کی گئی۔ میں کیسے اس تعلق کو چھپ چاہ قبول کر لیتی جس کی بنیاد ہی نفرت پر تھی۔ میں نے خود آپ کے فیصلے کا پابند بنانے کی بھر پور کوشش کی۔ اپنے آپ کو تیار کیا۔ لیکن میرے جوصلے جو اب اسے ملے۔ زندگی، چاروں کے کسی نسانے کا نام نہیں۔ ال منسٹن نہ ہوئی تو بل بھی صدیوں جتنا بھاری ہو جاتا ہے۔ میں گت گت کے ہم تو ڈر دیتی یا منافقت کو شعاع بنا لیتی؟ یہ مجھ سے نہ ہو سکتا۔ مجھے دکھائے کوئی ایسا مذہبی اور اخلاقی ضابطہ جس میں کسی کو اس کی مرضی کے بغیر کتنا باندھ دیتے کا حکم ہو۔ یہ چند لمحوں چند دنوں کی تکلیف ساری عمر کے غم اور خلش سے بہتر ہے۔ آپ میرے ان پر اس کا نام بھی آتا نہ دیکھیں گے۔ میں بھی آپ سے کوئی التجا نہیں کروں گی۔ لیکن ازم مجھے بوجھ سے آزاد زندگی تو گزارنے دیجیے۔ یہ تو میرا حق ہے۔ ابھی تو مجھے تعلیم حاصل کرنا تھی۔ ابھی تو مجھے معاشرے میں اپنا مقام متعین کرنا تھا۔ ابھی تو کچھ ادارہ مدداریاں بھی مجھ پر تھیں۔ میں اپنے ان ہی امور سے عزائم کی تکمیل کروانی مجھے شادی وادنی کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے اس میں میری بلکہ ہم سب کی بھلائی تھی۔"

اس نے اپنی ٹھیں لہجے میں جواب دیا۔ عاصم حسین نے ان سے اس کا منہ دیکھتے رو گئے۔  
"آپ کو کیا خبر عاصم بھائی! کہ حقیقت کیا ہے۔ بے معنی اب بے مقصد نفرت کا شکار ہونے والا شبیر بالکل بے ہوش ہے۔ اگر گوہر جلد بازی سے کام نہ لیتی تو شاید حالات یہ نہ ہوتے۔ گوہر سے سمجھتی نہ سکی بلکہ ہم سب ہی ا۔"

مجھنے سے قاصر ہے۔ ہم سب نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ ہم سب ہی اس کی اس تباہی کے ذمہ دار ہیں۔ گو میں گوہر کے اس فیصلے سے خوش نہیں ہوں۔ یہ ایک ناوقت فیصلہ ہے لیکن ہے برحق..... آپ ہی کو سوچ سمجھ کے اگلا قدم اٹھانا چاہیے تھا۔ زندگی گوہر کی تھی۔ فیصلہ اس کی مرضی پر ہونا چاہیے تھا۔ ہمیں اس کو مطمئن کرنے کا حق نہیں ہے۔ ہم میں کسی نے اس کی تہ سنی تو اس نے ڈاکٹر بارون سے بات کر لی۔ ہم سے اچھے تو وہ ہیں جنہوں نے اس کی بات سنی اس کے موقف کو تسلیم کیا اور شادی سے انکار کر دیا۔"

"ہم دنیا کو کیا جواب دیں گے مای! کس کس کا منہ بند کریں گے۔ لوگ ہمارا جینا دو بھر کریں گے۔" امیری نے باپ کی طرف داری کی۔

"دنیا نے تو اس وقت بھی ہاتھ بٹائی تھیں جب آپ لوگوں نے شبیر سے رشتہ توڑا تھا۔ برے وقت میں اس سے دور ہٹ گئے تھے۔ اس وقت تو کسی خوشیاں نہیں آیا تھا۔ اصل میں ہم لوگ دنیا والوں کا بھانہ بنا کر اپنے ارادوں کی تکمیل سے ڈرتے ہیں۔ اپنی آرزوؤں کو پھینکا جاتا ہے۔ جب دل کی خند ہو تو ہم بڑے سے بڑا قدم اٹھانے آگے بند کر کے اٹھالیتے ہیں۔ جب اپنی تکمیل نہیں نظر ہوتی تو دوسروں کو دنیا سے ڈرا کر خاموش کر دیتے ہیں۔ دنیا کو اتنی فرصت نہیں ہے کہ وہ صرف اسی ایک سانچے کے بارے میں سوچتی رہے اور ہم لوگ جو آپ کے اپنے ہیں ہم اس واقعے سے ہی نہیں بلکہ اس کے اسباب سے بھی اچھی طرح آگاہ ہیں۔ آپ کو اجازت نہیں دینا گے کہ آپ بچی کی دل آزاری کریں۔"

آمنہ بیگم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ چچی جان نے بھی ان کی تائیدی کی۔  
عاصم حسین خاموش ہو گئے امیری جنہوں نے لب کھولے ہی تھے انہیں بھی خاموش ہو جانا پڑا۔ نیل باری ہاری سب کے تاثرات پڑھ رہے تھے۔

"گوہار سے معاشرے میں اس جرات کو بغاوت اور بے باکی تصور کیا جاتا ہے لیکن میں گوہر بی بی کے اس اقدام کی حمایت کرتا ہوں۔ اس نے اچھا کیا۔ اپنا او حق استعمال کیا جو خدا اور رسول نے عورت کو دیا ہے۔ نئے گھر کی بنیادوں میں محبت، اعتماد اور اپنا پن نہ ہو تو زندگی کے لمحے واقعی بوجھل ہو جاتے ہیں۔ ہم سب کو چاہیے کہ زمانے کی باتوں کا مناسب جواب دہ ہوں۔ منہ نہ چھپاتے پھریں۔"

سب کی رائے گواہی اپنی تھی لیکن ہر رائے کی تان وہی پر ہوتی تھی کہ جہ ہوا درست ہوا۔ شادی کے بنگلے چھ نگوں میں گھیرا وہی اور خاموشی میں بدل گئے۔ امیری کی فون پر ٹوکوں کو اس نئی سعادت حال کی خبر دے کر معذرت کر رہے تھے۔ گھر میں موجود احباب میں سے کچھ نے واپسی کا سامان ہانڈ لیا تھا۔ کچھ گھر والوں کی دلجوئی میں مل گئے تھے۔ عاصم گوہر کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں بند ہوئے تھے۔ ابھی کچھ دیر قبل تک شبیر کا نام لینا اس گھر میں جرم تھا۔ لیکن اب ہر زبان پر اسی کا نام تھا۔ اندرونی کہانیاں جن کی خبر عام لوگوں کو نہ تھی ہر زبان رو عام تھیں۔ اکثریت کی رائے میں یہ سارا ظلم تھا۔ کچھ کے خیال میں گوہر کی یہ جرات نا جائز تھی۔ یہ ایسے لوگ تھے جن کا عقیدہ تھا کہ یہ بے حیائی اور خود سری کا حصہ ہے۔ غرض جتنے منہ تھے اتنی باتیں۔ انگ انگ ٹولیاں تھیں اچھا جدا آرائشیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں تھے جنہوں نے سب کے سامنے گوہر کے اس اقدام کو سراہا تھا۔ لیکن تہاں میں اسے برا کہہ رہے تھے۔ پورے شہر میں یہ بات پھیل گئی تھی اور تھیلوں پر گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔

"ہیلو سنا ہے شادی رک گئی۔"

"ہیلو سنا ہے! بلکہ نے انکار کر دیا ہے۔"

اور ماموں بھانپ لیتے ہیں۔ سکر زبان سے اظہار نہیں کرتا لیکن وہ جان جانتے ہیں کہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ اس تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں تک ساری بات نہیں آتا، انہوں نے تھیں جس اور درست ہے۔ لیکن اس کے بعد جب ماموں کو خبر ہوتی ہے کہ یہ کسی کی منگیت کسی کی جاہت ہے تو بجائے اس کے وہ مجھے حقیقت سے آگاہ کرے۔ شیر کو اپنا دشمن یا کر خواہ تو وہ کی ضد اور دشمنی میں گوہر کے حصول کو جان کاروبار اور زندگی کا مقصد بنا لینا ہے۔ یہ انسانیت کا تقاضا نہیں ہے۔ اس دنیا کے چلتے کا جانے میں سیکھ لوں اور کیاں مجھے یا مجھ جیسے نوجوانوں کو ایک نظر میں پسند آ جاتی ہیں۔ ہر اچھی چیز کو پسند کرنا اور مزاجتا انسانی سرشت میں داخل ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے کہ اگر ماموں کو ان ساری معمولی وارہاتوں کی خبر ہو جائے تو وہ میری خاطر ہر لڑکی کے ہاتھ جو کر پیچھے پڑ جائے گا۔ صرف ایک جرنے والا رشتہ ہی نہیں جڑ سکتا۔ اور تو کچھ نہیں ہونا۔ شہ میرا دل ٹوٹا، اند میرے خواب ٹوٹ گئے۔ بعدے بعد۔ وہ سارے حقوق جو اپنی زندگی میں داخل ہونے والی کسی بھی لڑکی کے لیے میں نے رکھے ہوئے ہیں وہ آج بھی محفوظ ہیں۔ اس لڑکی کی امانت ہے جو میری بیوی بنے گی۔ میں خوش ہوں، راضی ہوں۔ ماموں کس بات پر بنا فر دختہ ہے۔ اسے میرا نہیں اپنی امانت کا رکھنا ہے۔ اسے اپنی بدترتی کے ذائقے ہو جانے کا دکھ ہے۔ یہ زمانہ جاہلیت کے انساٹوں جیسا ہے۔ شیر سے دشمنی کا اظہار کھائے بیٹھا ہے۔ اسے اس کی ذات سے جڑ ہے۔ ہر برائی کو اچھائی سے پڑ ہوتی ہے۔ اس نے وہاں دنیا و توبہ اور طاقت سے دلوں میں اپنا خوف پیدا کیا۔ اس نے ہمدردی، اکتساری، محبت اور درویشی سے دوسروں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی۔ اسے غمناک، گروہی پر شہرت ملی۔ اسے شرافت اور خلوص کے سبب چاہا گیا۔ اس نے محبت سے جگہ بنائی اس نے ٹیکے سے مارے تھیں۔ اس نے پونہ دشمنی، ایکشن میں اس سے باہر کر کے اپنے بدترین انتقام کا نشانہ بنایا اور زندگی کی خوشیوں بند زندگی سے ہی جھوٹ کے بل بوتے پر ناک آؤٹ کرنے کا سوچا۔ اسے گم ہر میری خوشی کے طور پر نہیں اپنی فتح کے سبب کے طور پر مطلوب تھی۔ اگر اس کے ذہن میں یہ بات نہ ہوتی کہ گوہر میری پسند ہے تو یہ خود اس کا غلبہ کار ہوتا بلکہ اسے غلط طور پر حاصل کرنے سے بھی باز آتا اس سے کہہ دیجئے یا جان اس کے گناہوں کا کفار ادا کرنا بہت مشکل ہے لیکن اگر یہ شیر کے معاملے میں خاموش ہو جائے تو کم از کم یہ اپنے شیر کی دی سزا سے توجیح جائے گا۔ وہ پچھائی چیز گم کیا تو اس کے اندر کا انسان ساری عمر اسے سوئی پر لٹکائے رکھے گا۔ اسے اپنے لیے کی ہر بڑی سزا ملے گی۔

”جینے اہلکارے سمجھانے پر بھی اگر بات اس کی سمجھ میں نہ آئے تو ہم کیا کریں۔ اس کی اپنی زندگی ہے۔ اپنی ذرا ذرا انسا سوال و جواب کرنے دو یہ جو کچھ بھی کرتا ہے تم نے یہ لیتا۔ کر کے میرا سر ہمیشہ کے لیے بلند کر دیا ہے۔ تم واقعی مسیحا ہو ڈاکٹر بارون۔ میرے بیٹے..... میں ہر ایک کو فخر سے بتا سکتا ہوں کہ میرے بیٹے نے ایک فتنہ و مظلوم ہستی کو نئی زندگی دے دی ہے۔ اسے پچھائی ہے۔ یہ سب کچھ نہیں اسلامی و اخلاقی تقاضوں کے مطابق ہے جو تم نے کیا۔“

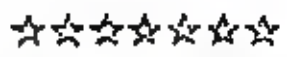
”ایک ماں کو اپنے حق پرست بیٹے سے اسی فیصلے کی توقع تھی۔ اس دنیا میں اچھی لڑکیوں کی ہرگز کمی نہ ہوگی۔ اس دنیا کو لوں گی میرے بیٹے کی زندگی میں اس کی لڑکی آئے جو اسے سمجھ سکے۔ جان سکے اس پر نثار ہو سکے۔ اس کی قدر کر سکے۔ اس لڑکی کے لیے اگر مجھے چند برس انتظار بھی کرنا پڑ جائے تو ہر کیا ہے۔“

ماموں نے بیٹے ایک دم غامض ہو گیا۔ امین واسطی نے اوجہ اوجہ دیکھا اور ڈاکٹر بارون سے مخاطب ہوئے۔

”بارون بیٹے۔ کچھ بھی ہو ماموں تمہارا بھائی ہے۔ اسے پیار سے سمجھا بھائی اس راستے پر چلنے سے روکنا ہے

”ہیو! سنا ہے لڑکی لڑکے پاس مٹی تھی۔“  
”ہیو! سنا ہے وہ کبھی اور شادی کرنے کی خواہاں تھی۔“  
”ہیو! سنا ہے لڑکا کبھی اپنا سر شہ نہ تھا۔“

اسی ٹیلی فون کا لڑکے سے ٹک آ کر اسری نے تاریکی کاٹ کر رکھ دیا۔ ان میں لوگوں کے ایسے تھمرے سنتے اور انہیں جواب دینے کا عہد نہ تھا۔



نیما واسطی اپنے کمرے میں بند تھی۔ بابا جان کے کمرے میں طوفان برپا تھا۔ ماموں واسطی اور بارون واسطی کے درمیان بحث و تکرار کا طوفان امین واسطی اور شکم واسطی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس بیٹے کا ساتھ دیں اور کس کو بھٹلائیں۔

بابر طوفانوں نے لگھیر میں چند روز سے مستم رشتہ داروں نے آنے والے مہمانوں کو خضالی رکھا تھا۔ شادی ملتوی ہو جانے کی حیرت انگیز خبر انہیں پہنچا رہے تھے۔ ان کی خاطر مدانات حسب دل خواہ کر رہے تھے اور انہیں مناسب انداز میں مطمئن کرنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔

”آپ میں ذرا سی بھی غیرت ہوتی تو آپ اس حق سے یوں دستبردار نہ ہوتے۔ نہ میں آتی تو ایک ماسٹرو اور بھی تھا کچھ عرصہ بعد طلاق دے دیتے..... آپ نے نہیں معاشرے میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں چھوڑا۔“

”کیا کہہ رہے ہو ماموں! کیا کہہ رہے ہو۔ تم شادی اور طلاق کو کھیل سمجھتے ہو۔ کتنی آسانی سے تم نے یہ کہہ دیا۔ یعنی میں اپنی نام نہاد عزت کے بت کو قائم رکھنے کے لیے ایک لڑکی کو زندگی کا تماشا بنا دیتا۔ نو اسپا سٹیل پر بیٹھ سے کتنی نہیں ہو سکتا۔ اس نے بہت اچھا کیا آ کے سب کچھ مجھے بتا دیا۔ یہ ظلم لاعلمی میں ہو جاتا تو میں خود کو کسی معاف نہ کرتا۔ دوسرے کے گلشن میں گئے پھولوں سے اپنا دامن بھر لینے کا ذہنگ شاید مجھے بھی نہیں آئے گا۔ وہ جس کی امانت تھی اس کی رہے گی اور میں تمہیں بارن کرنا ہوں تم شیر کے خلاف گواہی نہیں دے گے..... اس ضد کا انجام بہت برا ہوگا۔“

”میں جو کچھ بھی کروں گا اپنے دل کی مرضی سے کروں گا۔ اس واقعے کے بعد تو یوں بھرا میری اور آپ کی رائیں جدا ہیں۔ میں آپ کا کسی شیر پر پابند نہیں ہوں۔ ہاں گوہر میری بات مان لیتی تو اس سے میرا عہد تھا۔ تب میں اپنا عہد ضرور نبھاتا۔ کیا چاہتے ہیں آپ۔ شیر بری ہو جائے۔ گوہر کے ساتھ شادی کر لے اور نر بھر میری غیرت کو لگا کر مارے؟“

”کیسی غیرت! گوہر تمہاری ماں ابھی یا بہن نہیں ہے۔ امین واسطی نے گرت کر کہا۔  
”وہ میرے بھائی کی ہونے والی بیوی تو تھی۔“

”غلط۔ بالکل غلط۔ یہ ایک زبردستی کا رشتہ تھا۔ وہ آج بھی شیر کی منگ ہے۔ رشتے تاتے محبتیں جوڑتی ہیں بیکری وانا نہیں۔“ امینوں نے پھر اسے لہکا۔

”بابا جان۔ آپ سوچئے۔ خود ہی سوچئے۔ ایک لڑکی کو مہربانی اثر کے تحت لاچار ہو کر مزاک کے کنارے پڑی مل جاتی ہے۔ میں اسے انسانی ہمدردی کے تحت اٹھا کر اپنے گھر لے آتا ہوں۔ ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے اس کی طبیعت ادا کرتا ہوں اور انسان ہونے کی حیثیت سے اسے بوجہ طاقت اس کی منزل تک چھوڑ آتا ہوں۔ فطرتی تقاضوں کے عین مطابق ہمیں جہاں جس جہاں کھسکے ہوئے اس سے متاثر ہو جاتا ہوں۔ اس احساس کو تیلدا



استراحت پر عدالت کے احاطے میں اسے قابو کیا جائے۔  
سو وہ ڈاکٹر ہارون کے ساتھ لاہور چلے گئے۔

☆☆☆☆☆☆

"نانا! آپ میرے ساتھ نہ ہوتے۔ مجھے زندگی گزارنے کا یہ نیا دھنگ نہ سکھاتے یہ حوصلہ نہ دیتے تو جانے بہرا گیا ہوتا۔ اب جو بھی ہو سب کچھ ہمت کے ساتھ فیس کروں گا۔ بہا اور بن کے ہی رہوں گا۔ زندگی تو وہی رہتی جو حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گزاری جائے۔ بس جتنے بھی بیٹیں ان سے فیض نہ اٹھانا بھی سزا بن گئی ہے۔ میں نے آپ کی بات کو بدل بوجان تسلیم کر لیا ہے۔ میں نے اس غم کو غم سمجھا ہی نہیں۔ ایک مہینے کی بات سمجھ کر کمر فراموش کر دیا ہے۔ میں نے اسے ہی اپنی محبت کے جہان سے نکال دیا ہے۔ اب وہ جی میرے ان ہی بدخواہوں میں سے ایک ہے جنہیں میں کلی طور پر چھوڑ آیا ہوں۔ میں نے بھول کر بھی نہیں دیا کہ وہ کسی ہوگی۔ کہاں ہوگی۔ میں نے خود کو بھرا دیا ہے کہ لا حاصل چیزوں کے بارے میں سوچنا خود کو سناج کرنا ہے۔ اس کی شادی کی شام میں نے خود کو دنیا کے رنگارنگ میلے کی رونقوں میں مدغم کر دیا۔ عدوی اور نذرا کے ساتھ پورا دن قفر تفریح میں گزارا۔ شام کے دو بجتے ایک زبردست ایکشن مووی میں غم رہا اور رات کو مزے کی نیند سو گیا۔ نانا! آپ کہتے ہیں کہ دل کی حکمرانی آدمی کو خراب کرتی ہے۔ دماغ کو دل پر حاوی رکھنے میں ہی عافیت ہے۔ میں نے اس پر پورا پورا عمل کیا۔ پھر میرا دل عام لوگوں کے دلوں جیسا نہیں۔ میرا دل دماغ سے جٹ کر کچھ سوچتا ہی نہیں محسوس ہی نہیں کرتا۔ میرے دماغ کی "نہیں" میرے دل کا اصول بن جاتی ہے۔ اب دیکھ نیچے میرے دل کا کمان اس نے ایک بار بھی اسے صدا نہیں دی اسے نہیں پکارا۔ یاد تو وہ نہیں رہتی جانی ہیں۔ جفا بھی کوئی یاد رکھنے کی چیز ہے وہ زندگی کو اس کی یورنی حرارتوں کے ساتھ محسوس کرے۔ نونشیوں سے اپنا حصہ وصول کر کے اور میں اس کی یاد میں آجیں بھرتا رہوں نا ممکن ہے۔ اس نے تو جفا جوئی کی سہ کر دی۔ مجھ سے فریب و فدا کرتے ہوئے ڈاکٹر ہارون کو اپنا ساتھی چن لیا۔ یہ جو کچھ میرے ساتھ ہوا صرف اسی کی وجہ سے تو ہوا۔ کیا خبر..... کیا خبر..... اس میں اس کی مرضی ہوا اس کی رضا ہو۔"

کورٹ کے سبزہ زار پر ٹہلتے ہوئے شبیر جانے کیا کیا سوچے جا رہا تھا۔ آج وہ بڑے اعتماد اور سکون کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ اندر ہی اندر جانے لیسا زمینیاں سا اترتا تھا جس نے اس کے سارے دکھ اور پریشانیوں کو ہٹا دیا تھا۔ شاید یہ حوصلہ ڈاکٹر ہنری کی باتوں نے بخشتا تھا۔ بے شک وہ ایک پیشہ ور ڈاکٹر تھے مگر ان کی باتوں میں بھی زندگی تھی وہ مریض کا آدھا علاج اپنی ان ہی حیات پرور باتوں سے ہی کرتے تھے۔ پھر شبیر کا دکھ تو تھا نا روحانی اور روح کے گھاؤ محبت بھر سکتی ہے کوئی دوا نہیں۔ انہوں نے آٹھ دس روز میں اسے ذہنی طور پر ہر طرح کے حالات کے لیے تیار کر لیا تھا۔ اس میں اتنی ہمت پیدا کر دی تھی کہ وہ تختہ دار تک بھی پہنچ سکتا اور وہاں سے فاصلے پر ڈاکٹر ہنری کے ساتھ معروف مکتبہ تھے۔

چاروں طرف خاصا رش تھا۔ بھاگ دوڑ کرتے انسان تھے۔ ان میں سے ہر ایک ملزم یا مدعی ہی تھا یا ان کے بہنوں کے لواحقین۔ دور و کار کے آفس تھے۔ ابھی انہی اس نے اپنے مخالف وکیل کو یہاں سے گزرتے دیکھا۔ کچھ دیر کے بعد اس کے سزا سے سانس اس تک آ پہنچے۔ وہ پارٹی باری سب سے ملا۔ وہ سب بھی اس کے شناسا ہوا تھا۔ چہرے کو دیکھ کر حیران تھے اور خوش بھی۔ شبیر انہیں ڈاکٹر ہنری کے پاس لے آیا۔ انہی سلام دعا کا

معنی و شتمنیاں بے مقصد رہا ہمیں کچھ بھی نہیں رہتی۔ سوائے بربادی کے تم جیسا بیٹا تمہاری ماں کی فتح ہے مجھ اور ماموں..... میرے ماضی کی خوشیاں کتھویر کی طرح میرے سامنے ہے۔ میں ماضی سے خوف زدہ ہوں۔ اس سے بھول جانا چاہتا ہوں کاش میں نے اس وقت شرافت سادگی اور سچائی کو مانا ہوتا۔ ہارون اگر شبیر کو سزا ہوگی میں اپنے آپ کو مخالف نہیں کر سکوں گا۔ فارگا ڈمیک۔ بیٹے تم اس کا خیال رکھو۔"

"اس کی ایک ہی ترکیب ہے باپا جان۔ اور وہی آ زمانا پڑے گی۔"

"کیا مطلب؟ کیسی ترکیب؟"

"ہم اسے عدالت تک جانے ہی نہیں دیں۔ کچھ دن کے لیے اس ماحول سے دور کہیں لے جائیں۔"

"ایسا کیوں نہ کریں کہ ہم سب ہی تھوڑے عرصے کے لیے اس ملک سے باہر چلے جائیں۔ آپ وہاں تہہ بڑ ہوگی دلوں کے خرابا اور ملال بھل جائیں گے اور سیر و تفریح بھی ہو جائے گی۔"

"وائے ناٹ میں کل ہی ٹرائی کرتا ہوں۔ مان جی آپ اپنا پایا اور نیلما کا پاسپورٹ میرے حوالے کر دیں جہاں بھی جانا چاہیں میں دنوں میں انتظام کیے دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔"

ماموں کمرے کے باہر کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے دل میں اپنی شکست کا لاوا اب تک پک رہا تھا اس نے "نت چہ اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔"

☆☆☆☆☆☆

پراپر عزیز!

کل انہی کو آپ مجھے میرے ارادوں سے جدا کر کے دور کہیں لے جائیں۔ میں یہ گھر چھوڑتا ہوں۔ میں سکون دل کی آخری کوشش کو برنگز بے کار نہ جانے دوں گا۔ میرا قراری میں ہے۔ میرا انتظار نہ کیجئے گا۔ شاید یہی وہ موڑ ہے جہاں سے مجھے ہمیشہ کے لیے آپ سب سے جدا ہونا ہے۔ اس گھر میں میری ضرورت کسی کو نہیں رہی میں نے آپ کی الماری سے کچھ رقم انٹھائی ہے اسے آخری خطا سمجھئے گا۔"

خدا حافظ

وہ سری مٹا جانے کی بیانی کے ساتھ ملازم یہ رقعہ بھی لے آیا تو ڈاکٹر ہارون پریشان ہو گئے۔ جلدی سے اس کے کمرے کی طرف بڑھے۔ بابا کو مطلع کیا۔ سب ہی خاموش ہو کر رہ گئے۔ اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔

"قدرت کو جانے کیا منگوا ہے جو ابھی ہوا بہتر ہی ہو۔ ستا نادان ہے ہارا جیسا ہے ہارا افسانہ نہیں۔ جس کی بنا میں اپنے نکلنے پر مست نہیں جیسا تاشدی اور ڈاکٹر ہے۔" امین واسطی کے لہجے میں بے بسی تھی۔

تیم واسطی رونے لگیں۔

"دواہر کہاں جانے گا ہارون! یہیں کہیں رہے گا اسے تلاش کرو۔ اسے سمجھاؤ۔"

"بہتر مان جی!"

ہارون پھر اپنے کمرے میں آ گئے۔

مظاہرہ پتھیاں پر تلاش بسیار کے باوجود بھی اس کا نشان تک نہ مل سکا۔ نوائین واسطی نے آخری ترکیب...





وہ زندگی میں پہلی بار سکندر پور آیا تھا اس کے دل میں غمزہ باپ کے لیے ڈھیروں محبت بھرے احساسات تھے۔ تیسری شام جب امین واسطی نے اسے اپنے پاس بٹھایا۔ ان ہی لمحوں میں شبیر نے پہلی بار ڈاکٹر بارون کو دیکھا جنہیں امین واسطی جانتا رہے تھے۔

”بیٹا! یہ شبیر ہے شبیر۔“ آنکھوں میں نم کے ساتھ حیرت بھرے بارون واسطی اسے دیکھتے رہ گئے۔ اس کی عظمت کا احساس انہیں زیر بار کر گیا۔ وہ اس نوجوان کو ہر قدم پر اپنے ساتھ ساتھ پاتے رہے تھے اور خیال کرتے رہے تھے کہ یہ مامون کا کوئی بہت ہی گہرا دوست ہے۔ اب وہ حیران تھے ایک تک اسے دیکھ رہے تھے۔

کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس نوجوان سے یہ ضرور کہنے کوئی نہ کہنے پر ایک ٹوٹی مٹی کی بنی ہوئی روایات توڑ ڈالیں۔ حالات کا حوصلے سے مقابلہ کیا خود کو تہہ پستی کا خطرہ محسوس نہ کیا۔ جذبات کو زبردستی دبی۔ تو اس میں اس کا کوئی کمال نہ تھا۔ تم تھے ہی اس قائل۔ مامون تمہارا بدترین دشمن تھا۔ تم نے اس کے لیے یہ سب کچھ کیا۔ گوہر تو تمہاری دوست ہے۔ اس کے لیے۔

”شبیر! تم میرے بیٹے کو دل سے معاف کر دینا بیٹا! اسے اپنی نادانیوں کی سزا مل چکی ہے۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں بیٹا! اس حادثے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے۔“

سوچوں میں غم بارون کے ساتھ شبیر بھی چمک کر ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جو بنور ڈاکٹر بارون کو دیکھ رہا تھا۔ کسی اور حوالے کے ساتھ۔ اور سوچ رہا تھا بلکہ تراس رہا تھا کہ وہ ایک خوب صورت دل اور نرم خوی انسان تھے۔ وہ تصور میں ان سے کہہ رہا تھا۔

”خدا کرے آپ گوہر کو سدا خوش و خرم رکھیں۔ ڈاکٹر بارون! شاید یہ حادثہ صرف اس لیے پیش آیا تھا کہ گوہر آپ کی ہو جائے۔ اس نے مجھے چھوڑ کر آپ کو پانے کی سعی کی۔ آپ واقعی اس کے قائل ہیں۔ بہت اچھے ہیں مامون واسطی سے بالکل مختلف۔“

”میں نے اسے معاف کر دیا واسطی صاحب! واقعی بہ دل و جان۔“ اس نے صمدتی دل سے کہا۔ کچھ دیر بعد وہ اجازت طلب کر رہا تھا۔

”شبیر! آپ کچھ دن ہزارے ساتھ رہ لیتے۔ بابا جان آپ کی معیت میں خود کو بہتر محسوس کرتے۔ آپ میرے لیے بھائی جیسے ہی ہیں۔“

”نہیں ڈاکٹر بارون! آئی انہم سیدی۔ مجھے ذرا اب اس ملک حق میں نہیں رہنا۔ نانا میرے انتظار میں ہوں گے۔ سنو چار دن میں یہاں سے جانے والا ہوں۔“

اس نے معذرت کر لی۔ ایک ہجرت یہ بھی اور وہ سہی ہو جائے۔ اس نے بھی بڑی اور اہم تھی۔ وہ اس گھر میں رہ کر گوہر کو کیا اپنے کسی رشتہ دار سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ان سب سے ہمیشہ کے لیے اپنا ناتا توڑ لیا تھا۔ وہ وہ نہیں سوچنا چاہتا تھا نہ دیکھنا۔ وہ خود پر ضبط کے جتنے بھی پہرے لگا دیتا اپنے ماضی کو لاکھوں سال سے نکال دیتا یہ احساس تو پھر بھی نکلیں وہ تھا کہ ان لفظوں میں ایک سب سے وفا لڑکی اس سے دامن چھڑا کے کسی اور کی خاکہ میں آیا کہہ کے سانس لے رہی ہے۔

”اس کا مطلب ہے ذرا آپ سے دوبارہ ملاقات ناممکن ہے میرا مطلب ہے پھر عرصے کے لیے۔“

”شاید میں کبھی پاکستان نہ آسکوں۔ اس ملک میں میرے لیے اب ہے حق کہا؟ میں نے یہاں رہ کر ہونا کہہ دیا۔“

بدلے جفا جی کے بدلے جھوٹ ایمان داری کے بدلے بے ایمانی۔ غلوں کے بدلے دھوکا اور فریب ہی پایا ہے۔ میں بچھون اور یہاں رہا تو میرا ہم گھٹ جائے گا۔“ اس نے دکھ سے سوچا۔ پھر کہنے لگا۔

”جی ہاں۔۔۔۔۔ پھر پاکستان آنا ہوا تو۔۔۔۔۔ شاید ممکن ہو جائے آپ سے ملنا۔“

”بارون! امین واسطی نے ڈاکٹر بارون کو پکارا۔“

”میں تمہاری والدہ شبیر بیٹی سے ملنا چاہ رہی تھی۔ انہیں دکھ ہوگا اگر شبیر چلا گیا۔۔۔۔۔ اور وہ پہلے ہی تم سے غمگین ہیں۔ کاش اس غم کا مداوا ہوتا میرے پاس۔ خدایا انہیں صبر دے۔“ شبیر کا انسان دوست دل تڑپ اٹھا۔ ایک ماں کے غم کا اندازہ کرے۔

”میں امداد کے ماں جی کو بتاتا ہوں۔ بہت ہی خواتین اندر ہیں نا۔ میں انہیں آپ ہی کے کمرے میں لے آتا ہوں۔ تھیک ہے نا بابا جان!“

”ہاں ہاں نے آؤ۔۔۔۔۔“

شبیر کی آنکھیں درد وازے کی طرف گئی تھیں۔ پانچ چھ منٹ بعد بارون واسطی ایک غم زدہ اجڑی اجڑی اور اس آنکھوں والی خاتون کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے تو شبیر اٹھ کھڑا ہوا۔ دو چار قدم آگے بڑھ کے وہ رک گیا۔ اس کا سر تھکا تھا اور کہنے کو ایک لفظ بھی اس کے پاس نہ تھا۔

”ماں جی۔۔۔۔۔ یہ شبیر ہیں۔“

وہ اپنی ویران آنکھیں شبیر پر جمائے اپنی جگہ پر ساکت کھڑی تھیں شبیر نے ان کی طرف دیکھا۔ اس ناگہانی موت کی ساری داستان ان کی آنکھوں میں رقم تھی۔

”ہمیں معاف کر دینا بیٹا!“ ان کے لہجے میں کتنی زخمی آہیں کتنی شکستہ آرزوئیں تھیں۔ شبیر کا دل تڑپ کر رہ گیا۔

”آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ سارے جھگڑے تو زندگی تک ہی ہوتے ہیں۔ وہ بات تو ختم ہوگئی ماں جی! مجھے افسوس ہے نہ میں ہوتا نہ وہ نہیں جھگڑا کھڑا ہوتا۔“ وہ رو پڑا۔

انہوں نے بے اختیار آگے بڑھ کے اسے اپنے ناتواں بازوؤں کی پناہ میں چھپا لیا۔ بعض تعلق بعض رشتے کیسے بے نام سے ہوتے ہیں۔ ایک خوشبوئی آہی اور شبیر کے من میں ساقی۔ ممتا کی خوشبو ایک تڑپ نے اسے بلا دیا۔ شاید محبت کی تڑپ نے۔

”میں تمہارا شکر یہ کس طرح ادا کروں؟ تم ہمارا غم ہانٹنے پر ماں چلے آئے۔ تم کیسے انسان ہو۔ جہنم تو اپنے دشمنوں سے بھی نفرت نہیں۔ تم انسان نہیں فرشتے ہو۔ قبول کرنا میں آجانے والے کتنی بد نصیب عورت ہوں میں! تم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ جو ہوا اسے قبول جاؤ۔ یہ کہنا تمہارے زخموں پر نمک چھڑکنا ہے۔ میں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی۔“

”ماں جی۔۔۔۔۔! آپ ایک معمولی بات کہ بہت زیادہ اہمیت دے رہی ہیں میں نے کہا ہے نا میں سب کچھ قبول گیا ہوں۔ مامون کی موت سب سے بڑا نقصان ہے۔ بڑے نقصان کے غم میں چھوٹی موتی باتیں زیادہ ہی نہیں رہ چکی ہیں۔ مجھے افسوس اور پچھتاوا ہے تو صرف انہی بات کا کہ کاش وہ مجھے کچھ سنا دیتے پچھتاوا نہ ہوتا۔“ وہ آواز نہ رہتی اسے جب رہی تھیں۔

”مجھیں اس سے ہم سے کسی سے بھی نفرت نہیں؟“



"میں ہاتھی کسی سے نفرت نہیں کر سکتا مان جی میں اس اتنا کرتا ہوں۔ جس سے مجھے کوئی دکھ نہ ملے میں اسے اپنے ذہن و دل کی دنیا سے نکال کر یکسر فراموش کر دیتا ہوں اسے بھول جاتا ہوں۔ میں خود کو اس بات کا یقین دلا دیتا ہوں کہ وہ میرے لیے ہے ہی نہیں۔ دشمنی رکھنا۔ نفرت کرنا، اقتحام لینا۔ یہ انسانوں کی نہیں حیوانوں کی جبلت ہوتی ہے۔ انسانوں کی نادانی اور کم عقلی پر ان پر ترس نہ دکھایا جا سکتا ہے نفرت نہیں کی جا سکتی۔ اور پھر دنیا چھوڑ کے جانے والوں سے تو کوئی جھگڑا باقی نہیں رہ جاتا۔ میں جب یہاں آیا تھا تو اختلاف کے سارے واسطے وجود کے ہی آیا تھا اسے اپنا بھائی جان کر..... آپ میری ماں تھیں ہیں۔ میں ایک ماں کے دکھ کوئی گہرائی کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ لفظ تو میرے پاس نہیں جن سے آپ کا دکھ ہانٹ سکوں، آپ کا بوجھ کم کر سکوں، میں خدا کے حضور صرف التجا ہی کر سکتا ہوں اور کرتا رہوں گا کہ وہ آپ کو پیاز جتنا جوصلہ عطا کر دے اور آپ ماموں سے جدائی کے غم کو برداشت کر لیں۔"

بیگم واسطی نے اپنے ہاتھوں میں تھا اس کا چہرہ نیچے جھکا کر اس کی بیٹھائی پر اپنے چہرہ نہ لب رکھ دیے۔ آنسوؤں کی ایک قطاری ان کا گریبان بھگوئی جی اٹھی۔

"کتلی اچھی باتیں کرتے ہو تم۔ کتنے پیارے بچے ہو۔ باروں بتا رہا تھا تم جا رہے ہو۔ پھر کب آؤ گے۔ مجھ سے ملنے آ جایا کرنے بیٹے! تم سے مل کر شاید میں اپنا غم بھول جاؤں۔" شبیر کے نیوں پر نچیدہ مسکراہٹ آگئی۔

"جب بھی واپس آیا آپ سے ملنے ضرور آؤں گا جی! میں تو اب لندن جا رہا ہوں۔ یہاں نہ آنا ہونا ہوتا تو شاید اب تک میں وہیں ہوتا۔"

"جاؤ بیٹا خدا کی امان ہو تم پر۔ میری دعا نہیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔"

"شعی..... شبیر۔ کس جہان میں تم ہو۔ کچھ ہوش بھی ہے۔ یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ ہر اہل کدوے کھوئے رہتے ہو۔ کھانے پر سب لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" عذرا نے اپنے ہاتھ اس کے آگے ہلائے۔ تو وہ چونک گیا۔

"آں..... ہاں..... ہاں۔ میں آ رہا ہوں تم چلو۔ نا نا جان کہاں ہیں؟"

"ظاہر ہے وہ بھی ڈانٹنگ روم میں ہی تشریف فرما ہیں اور منتظر ہیں تمہارے۔"

"چلو۔ وہ ڈنڈھ کھڑا ہوا۔"

"کیا بات ہے میرے بچے؟ تمہیں تو کھانے پینے کے اوقات ہی یاد نہیں رہتے۔" ڈاکٹر بھری نے فکر مند لہجے میں کہا۔ "اس بحرانی کیفیت سے نکل آؤ شبیر۔ فکر اور اندیشے عمر کے مادہ ہائل ہی کم نہیں کرتے۔ صحت مند ہی اور توانائی بھی چھین لیتے ہیں۔ جہاں وہ چکا اب اسے بھول جاؤ۔ میں ایک خوش و خرم جس تکہ دوست کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں جو میری عمر بھر کی بی داماں ہستی کا بہترین سہارا ہو اور مایہ جو۔ جسے محسوس کر کے میں ساری عمر میاں بھول جاؤں۔"

شبیر سر جھکا کر ان کے ساتھ ہالی کرتی پر بیٹھ گیا۔

"ڈاکٹر صاحب جی کہہ رہے ہیں۔ مدت ہوئی وہ شبیر میں نے دیکھا ہی نہیں۔ ہنسا مسکراتا۔ عذرا کو جھٹ کرتا۔ عدی سے گلے تیش کرتا۔ شوخی میں شرارت میں نیگا گت والٹ میں پھیر پھار میں زندگی چھپی ہوتی ہے بچہ۔ ہم سب کو اس سب ترین حادثے کو بھول جانا چاہیے۔ یہ سب بھونٹنا سو ہو گیا۔ شبیر میری ایک بات یا!

رکھنا۔ حادثات و مشکلات..... انسان کو ملانے کے لیے نہیں اسے ہمت، جرات، قوت اور بلند حوصلگی عطا کرنے کو آیا کرتی ہیں۔ طوفانوں کے ساتھ ڈرے بہہ جاتے ہیں چڑنا میں اپنی جگہ زینت اور رہتی ہیں۔ انسان کو جوصلے کے لحاظ سے چنان ہونا چاہیے۔ خدا نے تمہیں آئی نئی زندگی عطا کی ہے۔ چند مٹے جدا ہو گئے ہیں جو برو سے خالی تھے۔ جن کی محبت و مہم زدہ ہو گئی تھی۔ خدا نے تمہیں تمہارے نانا کی شکل میں ایک اعلا ترین انعام دے دیا ہے۔ تم جاؤ بیٹا..... ان کے ساتھ مددگارو۔ اعلا تعلیم حاصل کرو۔ زندگی کے حسین لمحات کا بہتر استعمال کرو۔ ہم تم سے ملتے رہیں گے۔ آتے رہیں گے تمہارے پاس۔ دعا کرتے رہیں گے تمہارے لیے۔"

"میں رنجیدہ تو نہیں ہوں ڈیڈی! میں تو خود ایک پٹا یہاں رکھنے کو تیار نہیں۔ اس سر زمین نے میرا بہت کچھ چھین لیا ہے۔ ایک ایک جگہ سے میری زندگی کی تختیاں وابستہ ہیں۔ یونیورسٹی میں تو ایک پل بھی میرا جی نہیں نکلتا۔ میں یہاں رہ کر شاید ایک حرف بھی نہ پڑھ سکوں۔ میں آپ سب کی خاطر۔ آپ کی خوشی کے لیے خود کو بھر پور طریقے سے زندہ بھی رکھنا چاہتا ہوں۔ ترقی بھی کرنا چاہتا ہوں۔ سو آپ لوگوں سے دوری اٹھیں امیدوں کے ساتھ برداشت کر لوں گا۔ وہاں سدرہ آ پائیں انکار بھائی ہیں۔ منشی مٹی ماورا ہے اور نانا جان تو ایک ہستی نہیں ایک جہاں ہیں۔ ان کی ہر اسی میں انسان سارے دکھ بھول جاتا ہے۔ ان کی باتوں میں حیات پر در پیغام ہوتا ہے۔ کیوں نانا جان۔ میں ٹھیک کبر رہا ہوں نا!"

وہ مسکرا دیے۔ اتنے عرصے میں وہ اردو سمجھنے کے قابل ہو گئے تھے لیکن جناب انگریزی میں ہی دیا کرتے تھے۔ عدی اور عذرا کی کوششیں اس حد تک کامیاب ہو گئی تھیں کہ جب وہ سب لوگ آپس میں بات کر رہے ہوتے تو ڈاکٹر بھری ان کی باتوں کے مفہوم سے کھن آگاہ ہوتے تھے۔

"یہ ہنر آپ بھی سیکھتے جا رہے ہیں مددگار! مگر صرف زندگیاں سنار نے میں ہی عافیت نہیں اپنی زندگی کا خیال رکھنے اور اس کی حفاظت کرنے کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔" شبیر نے جمال احمد کی نصیحت پر مسکرا کر سر جھکا لیا۔

☆☆☆☆☆☆

لحوں کے سفر سے زندگی کی کہانیاں بنتی ہیں۔ لحوں کا گزر جانا ہی زندگی کہلاتا ہے۔ لحوں کی رنگینی اور سفاکی سے مل کر ہی زندگیوں کی ذوق منجھ کا تصور واضح ہوتا ہے۔ چند لمحوں کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ اور چند لمحوں کے لیے کافی رہتے ہیں۔ لحوں کے اسی کھیل میں کبھی کبھار سب کچھ مل جاتا ہے اور کبھی کبھار سب کچھ لٹ جاتا ہے۔ چند لمحے ہی تو تھے بہار کے اس کی زندگی میں آئے خوشبو میں بکھیر کر بے اردی سے گزر گئے۔ انھی تو وہ سنبھل ہی نہ پائی تھی۔ بہار کو اپنے دامن میں سمیٹ بھی نہ سکتی تھی کہ دامن خوشبو سے رتوں سے نیکر خالی ہو گیا اور پھر وہ خون دل میں اپنی انگلیاں ڈبو کر نہیں ان بہار لحوں کو اپنی گرفت میں نہ لے سکی۔ بقدر شناسی کے ایک بل سنے اس سے سب کچھ چھین لیا۔

پھر وہ جس دن تو ایک عجیب سی قوت طبیعت 'خوف ناک سکوت اور اداسی کی تدر ہو گئے۔ ماموں واسطی کی جاہلیاتی ہمت اور اس کے عالم نرسا میں دیے بیان نے ساری کہانی ہر ایک پر واضح کر دی تھی۔ مقدمے کا فیصلہ اسی روز ہو گیا تھا۔ گھر میں جہاں ہر ایک دوسرے سے من چھپائے پھر رہا تھا اس خبر نے حالات کا رخ ہی بدلی دیا۔ ابھی سب لوگ یہیں موجود تھے۔ گو دلوازا اپنی ایوبی کے سبب چلے گئے تھے اور پوٹم کی جھپٹیاں بھی ختم ہو گئی



کافی ہے۔ اس کے لیے تم جاؤ عامم۔ شیر کے پاس۔ تم سب جاؤ۔ مجھے یقین ہے وہ تمہاری سبب استغاثیں بھول کر دیر اچلا جائے گا وہ ایسا نہیں ہے۔ کھلے دل اور ذہن کا ہے لوگوں کی زبانتیاں معاف کر دینے کا حوصلہ ہے اس کے پاس۔۔۔۔۔

انہیں چچی اماں۔ وہاں کوئی نہیں جائے گا۔ کوئی بھی نہیں۔ دیکھ کے انہوں میں ساتھ نہ دے سکتے والوں کا حق نہیں ہے خوشی کے لحاظ میں جھوٹی خوشی کے اظہار کا۔ ہمارا اور شیر کی زندگی میں بہت سا فاصلہ پیدا ہو گیا ہے۔ جسے طے کرنا اب ممکن نہیں رہا۔

نہیں باتیں کر رہی ہو؟ زندگی میں بہت کچھ ہو جاتا ہے وہ اپنی کی راہیں تو کہیں بھی مسدود نہیں ہوتیں ماسوا موت کی راہ کے۔ خطائیں بڑے بڑوں سے ہو جاتی ہیں۔ وہ ہمارا بیٹا ہے۔ ہم سب اس کے بزرگ ہیں۔ اس کے اپنے ہیں حتیٰ رکھتے ہیں اس پر۔۔۔۔۔

یہ آپ کا اپنا مسئلہ ہے۔ مجھے تو رائے دینے کا بھی حق نہیں ہے۔ جوئی میں آئے کرتے رہے۔ مجھے تو بس اتنی اجازت دیجیے کہ میں لاہور جا کر منتقلی مسئلہ تعلیم پھر سے جوڑ کر اپنی زندگی کے شب و روز کو بے کاوری میں پیشہ سے بچا لوں۔

وہ تمہیں روکا کس نے ہے بیٹی؟ جب جی چاہے چلی جاؤ۔۔۔۔۔ یہاں فارغ رہ کر کیا کرو گی۔

عامم حسین نے آماوگی ظاہر کی۔

تم نے بھی کمال کر دکھایا عامم۔ بچوں سے بھی کئی گز دی سوچ نکلی تمہاری۔ اچھی بھلی پڑھتی بیٹی کو نکال لے آئے۔ پڑھائی کا حرج کرایا اور پکڑ کے یہ مصیبت بھی ڈال دی۔

مائی! اب ہر بات بھول جائیں۔ گوری میری نہیں آپ کی بیٹی ہے لے جائیں آپ اسے۔ جوئی میں آئے کرتی رہیں۔ میں کبھی کبھو تو پھر شکوہ کیجیے گا۔

تیسرے روز وہ سب لوگ لاہور چلے آئے۔ دس گھنٹے کے ٹرین کے سفر میں گوہر مسلسل اپنی زندگی کے بارے میں سوچتی رہی۔

آمت اس کے ساتھ والی سیٹ پر تھیں۔ عامر اسٹرا اور مائیکہ مائیکہ کی سیٹ پر تھے۔ چچی اماں آمد کے قریب لیٹ ہوئی تھیں۔

گوہر! کیا سوچ رہی ہو؟

کچھ نہیں مائی۔

پھر بھی۔ کئی دیر سے میں تمہیں گم صدم جیٹھا دیکھ رہی ہوں۔

اس نے آمت کی طرف دیکھا آنکھوں میں فکر اور پچھتاہے کے ساتھ ساتھ آنسو بھی موجود تھے۔

تم پھر رو رہی ہو کتنی پارٹنر کیا ہے۔

مائی! مجھ جیسا کم نصیب کوئی اور بھی ہوگا۔

گوئی تم نصیبی کی بات نہیں۔ دنیا میں اس سے بھی بڑے حادثے ہو جاتے ہیں۔

ایوں مل کے چمخر جانا بہت بڑا سنا ہے مائی۔ وہ میرا کچھ نہیں رہا۔ یہ سوچ ہی میرے دل کو کھا جاتی ہے۔

! تمہارا کچھ نہیں رہا تم وہی گوہر ہوا وہ وہی شیر۔ کس کی تم یوٹیوٹی جاؤ گی۔ اس سے طلاق تانی

دلوں کا خبار آپس کی بات چیت دعوے کی اور تم پھر سے ایک دوسرے کے لیے اسی طرح اہم انا گزرتا ہا

مے۔

انہیں مائی انولنے دھاگے جرائی جائیں تو یہ احساس باقی رہ جاتا ہے۔ کہ یہ ٹوٹ کر جڑے ہیں۔ دل میں آئی مگر تو۔۔۔۔۔ دھاگوں کی گرد سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ بہت ہی بد صورت اور بد صورتی ہر جگہ تانائیں برداشت ہوتی ہے۔ خصوصاً جذبوں میں احساسات میں مائی! میں تو اس کا سامنا کرنے کی بہت نہیں پاتی خود میں۔

مگوری! کبھی بے وقوفی کی باتیں کرتی ہو۔ کیا تصور کیا ہے تم نے! بھرم تو وہ بھی ہے! قصور تو اس کا بھی ہے کیا پانی تھی اسے خود کو کسی کے معاملے میں اتنا انوفو کرنے کی۔ اس نے تو اپنی ایثار پسندی کی سزا پائی ہے! حق پرستی کے بدلے عذاب جھیلنا ہے۔ تم نے تو اس کی خاطر قربانی دی ہے۔ یہ تو آج حالات کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں آج سے چندوں میں جب اس کے زندہ رہنے کی بجائے اس کی امید بھی نہ تھی۔ تم نے بھرتی برادری میں شادی سے انکار

نہیں کی خاطر کیا تھا۔

گوہر بھی غور کرنے لگی۔

مائی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ قصور ہے تو پھر ہم دونوں کا ہی ہے۔ یہ تمہاری کم تو نہ تھی جو میں نے وی والدین کی عزت نامہ میں کی تھی۔

مائی! یاد رکھو! تمہیں اپنے کی خاطر ہی تو تھی۔

ناتے تو نے ہی کب ہیں وہ تو اتنی ساری باتیں۔ تم کی قسم کی قسم۔ اور نہ۔ میں شہید کبھی سمجھتی ہوں اس سے کسی زیادتی کی امید ہی نہیں رہتی۔ آئیے یہ باتیں نہ کرو۔ یہ سچا باقی کرنا۔ تمہارے ہونے کی زندگی کی سہاگہی ہو۔ وہ تمہیں ہرگز نہیں بھول سکتا۔ تمہیں اپنے آپ سے جدا نہیں رہنے سکتا۔

گوہر بھی پر امید ہو کر حسین خواب دیکھنے لگی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

لیکن خواب خواب ہی رہا۔ دنیا کے صلے میں پچھڑے وہ پھر نہ مل سکے۔

شہید یونیورسٹی تو کیا ملک کے کسی کوئے گھنٹے میں بھی نہ پایا جا سکتا۔

نہی نے اس کے بارے میں کوئی خبر اسے نہ دی۔

وہ جیل سے رہا ہوئے کس طرف گیا۔ کوئی اسے نہ بتا سکا۔

دونوں حلاش نے اسے بے چین رکھا۔

ان مہینوں میں اور سینے سالوں میں بدلتے چلے گئے جوہر نے خود کو ہر سب سے بچائے رکھا۔۔۔۔۔ ایم نے ایلا ہور سے واپس اپنے شہر آگئی۔ اس کا پتا نہیں نہ ملا۔

پتا اور شہر بار اپنے اپنے گورنر جنرل کے دفتر میں آگئے ان کی شادیاں جو گئیں۔ دونوں سعید و بیگم نے اپنے اپنے ظہیر کی خاطر اس کی آس لگا کر رکھی۔ پتا ظہیر ظہیر عمر رنگ کو سدھا رہ گئے۔ عامم حسین نے بیٹوں کے اندلی کو قبول کرتے ہوئے اپنا پانا گھر چھوڑ دیا۔ شہر کے خوبصورت رہائشی علاقے میں بخت اور شہر کے اٹے ہوئے گھر میں بچوٹی اٹھ آئے۔ پھر اس کی شادی بھی ہو گئی۔

یہ یاد ہونے والی تقریب میں کسی نہ کسی نے گوہر کو ضرور اپنے بیٹے یا بیٹائی کے لیے پسند کیا رشتہ نے کے سے چلا آئے۔ لیکن گوہر کی ایک نہیں نے ماری ہاتھ پلٹ دیں۔ اس کی زندگی میں شہید کے پتہ نہ تھا تو بس کتابیں۔ شعر شاعر کی ادب کی تاریخ کی ادب کی چند تصویریں ہتھیں چند خطوط۔ کھولی ہوئی



اس کا ساتھ تھا۔ جو ہر آپا کی ترستی ہمتا کی تسکین اس کے الفاظ ہی تھے۔ ابا جان کو گھر سے بات کیے بنا چین نہیں تھا۔ مسائل خواہ خانہ دانی ہوں خواہ گھریلو خواہ سیاسی ہوں خواہ اقتصادی۔ گوہر کے الفاظ کو وہ حرف آخر سمجھتے تھے۔

گوہر دوسروں کے خیال میں خود اذیت پسند تھی لیکن وہ جانتی تھی۔ شہیر کی جدائی سے بڑی کوئی تکلیف تھی ہی نہیں اور بڑا دکھ سدا بہار ہو جائے تو چھوٹی موٹی تکلیفیں یوں ہی عام سی لگتی ہیں۔ بالکل معیوبی اور غیر اہم۔

دل میں ایک مدت بعد بڑے زور کا درد اٹھا تھا۔ درو چدائی تو جو تھا سو تھا اسے پھر بھی مل جانے کی آس نے سنبھلا دیا۔ یہ عمر بھر کے لیے کسی کو کبھی بیٹھنے کا احساس صرف احساس نہیں دوہارہی بلکہ ہر تھا۔ جس نے اس کے جسم و جاں کو تیزی سے کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ جانے کتنا وقت بہت گیا تھا وہ اب بھی کالج کے عقی لان میں اسی رنگ پر براجمان تھی۔ اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آنکھیں رگڑ ڈالیں اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا سر چکراتا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا اچھالنے لگا تھا۔ وہ پھر بیٹھ گئی۔ ہزار وقت اس نے اپنے حواس پر قابو پایا اور چلنے کے لیے قدم آگے بڑھا دیے آفس میں آئی تو وہاں کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ تھا۔ بلکہ کالج ہی خالی ہو چکا تھا۔ جامن کے پیڑ تلے چوکیدار شاہد تھک ہار کے سستار ہاتھ۔ وہ اپنی چادر اور بیگ لے کر گیت کی طرف آئی۔

”گوہر نی بی آپ۔ آپ کدھر تھانی بی؟ کالج تو خالی ہو گیا۔“  
 ”بس مسروف تھی ذرا۔ بابا باہر دیکھیں کوئی رکشہ وغیرہ مل جائے گا۔“  
 ”ابھی آئی بی بی! وہ اٹھ کر باہر چلا۔“

گوہر میں ایک لمب مزید یہاں رک جانے کی ہمت نہ تھی۔ وہ گیت پارکر کے پہر آ گئی۔ کسی سہارے کے بنا کھڑے رہتا اس کے لیے محال ہو رہا تھا۔ اس نے سڑک کے کنارے ایک درخت کے موٹے تنے کا سہارا لے لیا۔

☆☆☆☆☆☆  
 مزید بندر ہمنٹ سفر میں کٹ گئے۔ اس نے گھر کا گیت عبور کیا تو بے فکری سے قہقہے لگاتے گھر والوں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔  
 ”ہیلو گوہر! ابھی آج بہت دیر لگا رہی تم نے۔“  
 چائے کا کپ ہاتھ میں تھامے اس نے دور سے ہی اسے پکارا وہ شکستہ قدموں سے چلتے چلتے ان سب کے قریب آ گئی۔... صنفی ٹیکہ لگتی وہاں سو تو دیکھیں۔  
 ”گوہر بیٹے کیا ہوا تمہیں؟ اتنی زور کیوں ہو رہی ہو؟“  
 وہ جواب دے بنا کرتی پر بیٹھ گئی بیگ اس کی گود میں تھا اور چادر اس کے وجود کے ارد گرد۔ اس نے بے بسی اور نقابیت کے تئیب سے احساس کے ساتھ سرگرمی کی پشت پر نکال دیا۔  
 لیکن مرنکا نہ رہا۔ گروں ایک طرف کولر خک گئی۔  
 ”گوہر.....“ صنفی پیچھنے نے گھبرا کے اسے پکارا۔  
 سب نے ایک ساتھ چائے کی پیالیاں میز پر بچھیں اور اس کی طرف بڑھے۔

دنیا کی یاویں اور معاشرتی بہبود و فلاح کے کچھ کام اور ہیں۔ اور بی دنیا میں دو گزشتہ چار پانچ سال سے شہیر عسکری کے نام سے شامل تھی۔ مضامین انسانے غلامی کہانیاں کسی اخبار میں کوئی تقریر انگیز کام انسانی حقوق سے متعلق کسی بحث میں شمولیت۔ ان سب میں نام شہیر کا اور قلم گوہر کا چلتا تھا۔ ایسا کر کے وہ کس جذبے کی تسکین چاہتی تھی۔ یہ اسے خود بھی معلوم نہ تھا اسے تو بس ایک آس تھی۔

نام معلوم ہی ہے وجود ہی۔ سوہوم ہی۔ اس سے پھرنا لینے کی آس۔ اس کو پھر دیکھ لینے کی آس۔ اس کو پھر پالنے کی آس۔ اس نے جوانی کے بے حساب دن اور رات شہیر کے تصویر میں گزار دیے تھے۔ خواہ اتسانی کے مرحلے سے گزارنے گزارتے وہ بہت ہی سزا نہیں بھگت چکی تھی۔ بہت سے بے درد لمحے گزار چکی تھی۔

دوسروں کی خوشیوں اور غموں میں گمن رہ کر اپنی ذات کو یکسر بھلا کر حیات کی راہوں پر چلے رہا کوئی اٹنا آسان مرحلہ بھی نہیں تھا۔ ایک ایسے شخص کے نام زندگی لگا دینا جس کے جینے یا مر جانے کی خبر ہی نہ ہو..... جس کا وہ دور وہ تک کہیں ذکر ہی نہ ہو.....

خاصا گھٹن مرحلہ تھا۔ لیکن وہ اپنے ارادوں میں کتنی ثابت قدم تھی۔ کوئی حادثہ حالات کی کوئی تضحی اسے اس راہ سے ہٹانہ سکتی تھی۔

تیسرا کے استے ماہ دو سال گزارنے کے بعد..... جوانی کے پتے جھلنے صحراؤں میں آبلہ پا کائناتوں پر چل نل کے پور پور زخم بنانے کے بعد اس کا سراخ ملا بھی تو کس طرح؟ دو ماہ سے آیا بھی تو کس طرح؟ کہ وہ جسے سر نہ پاپا پنے کتنی تھی۔ وہ اسے یکسر فراموش کر کے اپنے بہت ہی پرانے خوابوں کو حقیقت کا رنگ دے کے ان میں سے اور کو آباہر چکا تھا۔ کیا دیا ان کنارہ کشی نے؟ کیا دیا اس تپیانے؟ کیا دیا ایک سوہوم آس نے؟ کیا دیا اس تر بانی نے؟

اس نے تو اپنے دکھوں میں کسی کو حصہ دار نہیں بننے دیا تھا۔ روانے کے لیے دل کا بوجھ ہلکا کرنے اور لہجہ نے کسی کا سنبھال نہیں چنا تھا۔ تھا اس کی ذات تھی اور زندگی کا سفر اس نے ماٹوں کی تھالیوں سے تباہیوں میں اپنے دل کی ساری باتیں شہیر کی تصویر بنکا اس کے تصویر سے ہی کی تھیں۔ پھر لڑائی تو..... ہے..... اپنا بوجھ آپ اٹھانے والے سے غائل ہو جاتے ہیں۔ اسے بھی بہت زیادہ حوصلہ پانے..... کی پروا چھوڑ دی تھی بلکہ وہ خود گوہر کے سہارے کے نتائج تھے۔ شہیر کی بخت اور اس کی بچوں کی.....

"گوبر... گوبری... کیا ہوا؟"

"اف میرے خدا میری بیٹی کو کیا ہوا۔" صغیہ بیگم بدحواس ہو گئیں۔

"گوبر... گوبر...! اسری اسے پکار رہے تھے۔"

ان کا ہاتھ گوبر کی کلائی پر تھا۔ وہ پریشانی میں اس کی نبض ٹٹول رہے تھے۔

"بہتر راہ دیکھنے کوئی ہے۔" شہری پریشان ہو کر اسے سنبھالنے لگے۔

"بائے کوئی بیوی کو اندر تو لے چلو۔ کیا ہو گیا بھلی چٹکی تو کھانچ گئی تھی۔"

شہری نے اسے بازوؤں میں اٹھایا بخت نے سہارا دیا۔ اسری نے نیچے گرا ایک سنبھال لیا۔ بھائیوں اور بچے

پریشان ہو کر ان کے ساتھ چلنے پڑے۔ صغیہ بیگم کے کہنے پر اسے ان کے کمرے میں لٹایا گیا۔

"اسری! میری بیٹی کو کیا ہو گیا؟ اسے اسپتال لے چلو۔"

"ہاں آپ فرزند کریں۔ اتنی سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

انہوں نے بیوی کو سیدھا سین باکس لائے کو کہا۔

گوبر من کے بنگلشن نے گوبر کی آنکھیں کھول دیں۔ کتنی دیر وہ اور گوبر موجود لوگوں کو دیکھتی رہی پھر آنکھیں

موند لیں اس نے۔

"کیا ہوا گوبر؟ کیا ہوا میری جان؟" صغیہ بیگم نے اس کا سراپاٹی آنکھوں میں رکھ لیا۔

بے اختیار آسراں کی آنکھوں سے نکلے اور صغیہ بیگم کے لباس میں جذب ہوتے چلے گئے۔

"تم بتائیں رہیں؟"

"کچھ نہیں اہل ذریعے ہی چکر سا آ گیا تھا۔"

"تو تو کوئی دوا کوئی لینے آ جاتا۔ اتنی ظالم نہ بنا کر بچی! ہر ٹکلیف اپنے آپ ہی اٹھانا شیری عادت سی من گنی

ہے۔ تو لا ہار نہ لیں ہے خیر سے تم جان غار کرنے والے بھائی ہیں اور ابھی تو باپ زندہ ہے۔ ماں ہے بہن

ہے۔"

"نہیں اماں ایسی تو کوئی بات نہیں تھی اور اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کیوں اسری بھائی؟"

وہ زبردستی سگڑاں اتوڑتے دیکھے۔

"تم بھی اپنے نام کی ایک ہوا ہم سب کے چکے چھڑا دیے اور اب تیرے ہی ہو کہ بالکل ٹھیک ہو۔"

"اور نہیں تو کیا۔ بس آرام کی ضرورت ہے آج کل سزا میں بہت دیر گزرا رہا پڑا۔ بس یہی وجہ تھی۔"

"چلو تھیو بہت کھانی کے سو جاؤ۔"

"نہیں بھوک نہیں نہیں سونا چاہتی ہوں۔"

"بیک میرے کمرے میں ہی بیٹی رہو۔ ہم سب جا رہے ہیں۔" صغیہ بیگم نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

اور اسے کلب اور حاکم وہ سب کمرے سے نکل گئیں۔

☆☆☆☆☆☆

شام رات میں بدل گئی۔ وہ ابھی تک اماں کے بستر پر ہی تھی۔ سوئی کہیں تھی۔ بس اپنی نامراد زندگی۔

بارے میں لینے کر کے انہیں مستر دکرتی رہی تھی اور ہزار رفت ایک نیچے تک پہنچ گئی تھی۔

تھی اس نے جو ہر آپا سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سو اس نے چپکے سے ان کا نمبر ملا یا اور اپنے سارے

حوصلے جمع کر کے بات کہنے کو مناسب الفاظ کا مجموعہ لے۔

"جو ہر آپا۔ یہ میں ہوں آپ کی گوبر۔"

اس کا لہجہ بے حد عجیب تھا۔ جو ہر کو حیرانی ہوئی۔

"گوبری کیو۔ کیا بات ہے؟"

"آپا وہ عیلام حسن۔" دررک مٹی۔

"کیا ہوا عیلام حسن کو؟"

"کچھ نہیں آپ عیلام حسن کے ٹھہر والوں کو اماں ابا کے پاس بھیج دیجیے گا۔" اس کی سانس سینے میں بار بار اٹکی

مگر اس نے کہہ ہی دیا۔

"گوبری... یہ تم کہہ رہی ہو؟"

"ہاں آپا یہ میں ہی ہوں گوبر عسکری۔ ہوشن دحواس کے ساتھ عیلام حسن کی زندگی میں شامل ہونے کی

خواہاں ہوں۔"

"تم ٹھیک ہونا گوبری؟"

"ہاں ہاں آپ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اپنی مرضی اور خوشی سے یہ سب کہہ رہی ہوں۔ مجھے احساس ہونے لگا

ہے اپنی زیادتی کا میں اماں اور ابا کو مزید دیکھ نہیں دے سکتی۔ میں جانتی ہوں وہ میرے سبب پریشان ہیں۔"

"گوبری! مجھے ایسا لگ رہا ہے تم میرے ساتھ کوئی حسین مذاق کر رہی ہو۔ ابھی ابھی میں نے فون پر اس بے

چارے کو صاف صاف انکار کیا ہے۔"

"آپ کہہ دیجیے گا آپ نے مذاق کیا تھا۔"

"یہ سب کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں سوائے ایک فیصلے کے بلکہ ایک درست فیصلے کے آپا۔ مجھے تو۔ مجھے تو۔ مجھے چاہیے تو یہ تھا کہ

ڈاکٹر بارون سے شادی کر کے امن و چین کی زندگی گزار رہی ہوتی۔"

"گوبری! جو ہر نے احتجاج کیا۔"

"ہاں آپا لڑکی کے خوابوں میں ساہن کی رقم جسم بھواروں میں بھیگا پیار کی خوشبو میں ہوا ایک ستاروں بھرا

آنگن ہی تو ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ تو ہر اس جہل جاتا ہے جہاں پیار ہو۔ پھر لڑکی کا لہکا نہ گھر نہیں دل ہوتا ہے۔

میں جانتی ہوں عیلام حسن کے پاس ایک پیار بھرا دل موجود ہے اور میں تمام عمر سکون کے ساتھ وہاں رہ سکتی

ہوں۔"

"پلیز گوبر! مجھے پاگل مت کرو۔ میرے ہوش نہ چھینو مجھے لگ رہا ہے یہ تم نہیں کوئی اور بول رہا ہے۔"

"یہ میں ہی ہوں آپا میں۔ دیوانی سوہانی گوبر۔ قیمتی لمحوں کو بے مقصد ادا ہے معنی انتظار میں گزارنے والی

بے وقوف۔ گوبر... محبت کے نام پر ہزار زخم لیں پر کھائیں والی گوبر۔ مگر آج میری زندگی میں کوئی بے معنی

انتظار باقی نہیں رہا اور نہ میرے خیال کو کسی آہٹ کی آس ہے۔ آج میں تنہا ہوں آپا۔ مجھے سہارا چاہیے۔ مجھے

پیار چاہیے مجھے توجہ چاہیے۔ مہربانی چاہیے۔ میں زخم زخم ہوں تپتے مہراؤں میں نکلے سر لگے پاؤں چلتے چلتے

چھرا کر گئی ہوں۔ میرے وجود کو آسرا اور میرے زخموں کو مرہم چاہیے آپا۔ تم ابا سے کہہ دو۔ اماں کو بتا دو۔ رقم

درواج کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر وہ کل ہی میرا ہاتھ عملاً حسن کے ہاتھ میں دے دیں اب میں تمہا نہیں چھوڑوں گی۔ بے سہارا نہیں رہوں گی۔ بے امان اور اس زندگی نہیں گزاروں گی۔ میں ان حسین خوابوں کے حصار سے نکل آئی ہوں میں نے حقیقت کو مان لیا ہے۔ پلیز آ یا کا سٹڈی ہیلپ می پلیز.....“

اس نے ریسور رکھ دیا اور چٹکوں میں اگلے آنسو بے دردی سے پونچھ ڈالے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

گاڑی ایک سو بیس کھو بیٹرنی گھنٹہ کی رفتار سے کولتار کی سیاہ چمک دار سڑک پر اڑی جا رہی تھی اور داغ اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ماضی اور حال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

گزرے ماہ و سال کی لکھنوں کی اذیت ناک کو اب بھی وہ بھول ہی نہ پایا تھا کہ کچھ نئے درد بھر اس کا مقدر ہو گئے۔ اس نے فیصلہ دے دیا کہ اس کی قسمت میں کسی بھرے پرے گھر کا تصور ہے ہی نہیں۔ اس کے سہرے کے بھول کھل ہی نہیں سکتے۔

وہ شاد کام ہو ہی نہیں سکتا۔  
شہداداری اس کے کام آئی۔  
شہداداری اسے اس آئی۔

ایک بار دل کی دنیازوی آرزوؤں کے ساتھ بسائی تھی۔ زمانے نے اسے اجاڑنے میں دیر نہ کی۔ اب کی بار وہ کتنی مشکلوں سے آمادہ ہوا تھا، خود کو تیار کر رہا تھا۔

ایک لڑکی کو اپنی شریک حیات قبول کرنے میں اسے کتنی دیر لگی تھی۔ دراصل وہ منصف مزاج تھا۔ ہر ایک سے انصاف کرنا چاہتا تھا۔ اپنے تھی داداں رو جانے کی سزا کسی اور کو نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو خلیص اور سچائی کے ساتھ یہ احساس دلایا تھا کہ اسے ایک اور لڑکی کو جو ہرگز ہرگز اس کے دل میں آباؤ ہونا والی لڑکی گوہر نہیں ایک مقام دینا ہے۔ وہ اس کی زندگی میں بہت سی امیدیں لے کر آئے گی۔ محبت کی امید، ہزار ہا کی امید، ظلموں کی امید، اپنائیت کی امید اور اسے یہ ساری امیدیں پوری کرنا ہیں۔

وہ بیچے سالوں میں کبھی دل سے اس نہ سکا تھا۔

کسی خوشی کو بھرپور جذبوں کے ساتھ محسوس نہ کر سکا تھا۔ لیکن اب.....

اس نے خود کو باور کرایا تھا۔

کہ خوش رہنا اس کا حق ہے۔ خواہ وہ سروں کی خاطر رہی۔

دنیا کے رنگ رنگ میلے میں امن و چین سے حصہ لینا اس کی فطری ضرورت ہے، کیونکہ وہ دنیا سے کٹ نہیں سکتا۔

اور بے مقصد احساسات کے لیے زندگی کی سرسبز قربان کر دینا یا نشتر نہی نہیں۔

بے نام راستوں پر چلتے چلتے جان دے دینا حماقت ہے۔ کہ زندگی اتنی بے کار شے نہیں ہے۔

ڈاکٹر ہنری کی باتیں اسے اب بھی یاد تھیں۔ اس کی بھلائی قبیلو نیریا کو وہ بہت پسند کرتے تھے۔ جو اکٹروں سے ملنے کی خاطر گھر آ کر چمکتی تھی۔ اس سے اپنی محبت کا اظہار بے باک انداز میں کرتی تھی۔ نیریا کی آنکھوں سے اسے سامنے پا کر عجیب انداز میں چمک اٹھتی تھی۔

نیریا اچھی لڑکی ہے شہی! ایذا خیز رکھتی ہے تمہارا۔ بے شک اس کا تعلق کسی پستی امیر خاندان سے نہیں۔

ہے لیکن وہ فطرتاً بہت عمدہ مزاج اور خیالات کی مالک ہے۔ اس کے والد کا علم و ادب کی دنیا میں بڑا نام ہے۔ ادیب لوگ دنیا کی حساس ترین مخلوق ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کی زندگی کی اچھائیاں اور برائیاں ہی کہانوں کی صورت نہیں لکھتے خود کو اچھائیتوں کے قالب میں ڈھال کر برائیوں سے محفوظ کر لینا بھی جانتے ہیں نیریا میں ایک مثالی شریک حیات ہونے کی تمام خوبیاں ہیں۔ تم مناسب سمجھو تو میں اس کے والد سے بات کروں۔ میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ تمہاری مزاج آشنا ہے تمہیں سمجھتی ہے اور یہی باتیں انڈرا سینڈ ٹیک پیدا کرتی ہیں۔“

وہ چپ رہا..... مسکرا کر نہیں دیکھنے گیا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“

”کچھ بھی نہیں۔ نیریا واقعی ایک بہت اچھی لڑکی ہے لیکن نانا میں..... ہرگز اچھا ثابت نہیں ہوں گا اس کے لیے لڑکیاں اس قدر قربانی نہیں دے سکتیں اور نہ ہی انہیں دینا چاہیے۔ جتنی قربانی میری زندگی میں آ کر کسی بھی لڑکی کو دینا پڑے گی۔ انہی تو میں یہ سوچ لینے کے قابل بھی نہیں ہوں کہ مجھے شادی کرنا ہے۔ میں جسمانی رابطوں اور بدحوالیوں کو بند نہیں مان سکتا نانا! کہیں نہیں نہا سکتا۔ انہی تو میں دل کو یہ یقین نہیں دلا سکا کہ ایک لڑکی نے مجھ سے صریح بے وفائی کرتے ہوئے کسی اور کا ہامن تمام لیا ہے۔ میں یہ تسلیم کرنے میں کوئی حجت نہیں کروں گا کہ میں اب تک اس کی شخصیت کے بحر میں گرفتار ہوں۔ میں اپنے آس پاس آج بھی اسی کی خوشبو پاتا ہوں۔ میں کسی کی زندگی پر یاد نہیں کر سکتا۔ نیریا کو مجھ سے کہیں اچھا لڑکا مل سکتا ہے۔ میں اس کی خوشیوں کی راہ کی دیوار نہیں بننا چاہتا۔“ نانا نے اپنے دل کی ہر بات وہ آسانی سے کہہ سکتا تھا۔ سواں نے کہہ دیا۔

”کسی کو بھلا دینا بے شک آسان نہ ہو۔ لیکن بھول جانے میں عافیت ہوتی ہے۔ میرے پیارے بیٹے..... اور بے وفائی تو یاد رکھنے کی چیز ہے بھی نہیں۔“

”پھر یہ اپنے اپنے طرف کی بات ہوگی نانا..... میں تو اکثر اپنی وفا کے بدلے ملنے والی بے وفائی کو سوچا کرتا ہوں اور اب تو یہ سوچنا بھی مجھے دلچسپ مرحلہ لگتا ہے جب میں کسی نکتے تک نہیں پہنچ پاتا۔ الجھنوں کے اندر میں غوطہ زن میری سوچ چھینچھا جاتی ہے۔ تو یہ اعتراض کہ میں اب بھی اس سے نفرت نہیں کرتا مجھے باور کراتا ہے کہ میں کسی سے نفرت کر بھی نہیں سکتا۔ نانا! میں واقعی کسی سے نفرت نہیں کر سکتا۔ نہ اپنے پاپا سے نہ سعیدہ بیگم سے نہ ماموں واسطی سے اور گوہر..... دیکھیے نانا نانا.....“

”ہاں! میں جانتا ہوں تم جو گئے۔ میں تو ان سے نفرت نہیں کر سکا جنہوں نے مجھ سے بہت کچھ چھینا۔ گوہر سے ایسے نفرت کروں..... کہ بقول تمہارے اس کی محبت اور چاہت نے تمہیں خبر پورا اعتماد بخشا۔ تمہاری شخصیت اور کردار کو نکھارا..... لیکن بیٹے ایک بات یاد رکھنا..... تمہاری یہ تھوڑی دینا اور ان کے اصولی تمہیں اور بھی تہی کر دیں گے۔ پھر تم پچھتاؤ گے سب کچھ بخود بیٹے کا احساس تمہاری روح پر فسر دگی کی چادر تان اسے گا۔ لبوں سے مسکراہٹ اور روح سے مسرت کا احساس پھینک جائے تو شب و روز بہت طویل ہو جاتے ہیں اور دکھوں کا بوجھ انسان کی برداشت سے بھاری ہو جاتا ہے۔ یہ زخمی ہے شہی۔ بہت ہی بانی باتوں کو بھلا کر بہت سی ہی باتوں کو اپنا اتنی مثر ہے۔ نکل آؤ اس فریب سے امت کو منگول ابھوں سے چھینیں۔ ان کو تیرنی بات۔ میں اس گھر کو آ کر دکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے وجود سے تمہاری پیوی کی مسکراہٹوں سے تمہارے بچوں



کی معصوم نہیں ہے اے بے ضرر شرارتوں سے۔“

”آپ کے یہ خواب بہت حسین ہیں نانا! میں وعدہ کرتا ہوں یہ خواب پودے کرنے کا، گھر پلیز نانا مجھے کچھ وقت دیں۔ کچھ خواب جو میں نے سچے تھے ان خوابوں کا جال بہت مضبوط ہے۔ میں اس جال میں قید ہوں۔ میرے ہاں تفریقوں کے تیز دھار تیشے ہوتے تو میں کب کا آزاد ہو گیا ہوتا۔ محبتیں تو کندھیاں نہیں ہوتیں پھر بھی میں خوشش کروں گا اس جال سے نکلنے کی پھر بھی مجھے صرف پڑھنا ہے۔ یہ کتابیں ہی میری ایسی ساتھی ہیں جن میں کھو کر میں کچھ دیر کو سب کچھ بھول جاتا ہوں۔“

”اوکے۔“ نانا نے جلد ہتھیار ڈال دیے۔

پھر جلد ہی نیریسا کو احساس ہو گیا کہ وہ بے نام راستوں کی مسافر ہے۔ اس نے یہ سفر چھوڑ دیا۔ ”شاید ساری لڑکیاں آسان راستوں پر چلنے کے لیے ہی پیدا ہوئی ہیں۔ اس لیے ان کی صنف کو ”نارک“ کا نام دیا گیا ہے۔“ شہیر نے فیصلہ دے دیا۔

ایک نیریسا ہی کیا بے شمار لڑکیاں اسے اور اس زندگی کے مختلف لمحوں میں منتی رہیں! اس کی طرف نہیں۔ اپنے حسن و ادا کے تیروں سے اسے نشانہ بنایا لیکن اپنے سارے نشانے خطا ہو جانے پر اس سے دور بھی ہوئی رہیں۔

دراصل شہیر کی پیدائش جس ملک میں ہوئی تھی بلکہ جہاں وہ پیدا ہوا تھا وہاں کے ماحول کے تقاضوں میں بہت سی جو باتیں شامل تھیں ان میں سے ایک بات بھی یہاں نہ تھی۔ یہاں رفاقت کا مفہوم کچھ اور تھا اور وہ کسی اور بات کا متلاشی تھا۔ شاید ایسا ہوتا کہ اگر وہ پاکستان میں ہی رہ جاتا اور گورنمنٹ جیسی کوئی لڑکی اس کے درو کا درماں بنا چاہتی۔ اس کے ذہم کا مرہم بننے کی آرزو مند ہوتی..... تو شاید وہ سہارے کی طلب میں اسے تسلیم کر بھی لیتا۔ لیکن یہاں تو زندگیوں کا درباری انداز میں نفع و نقصان کے کھاتوں میں ورج تھیں۔ اور بات نفع و نقصان کی ہی ہوتی تھی چاہنا انسانی جنت میں شامل ہے۔ مراد خواہ کسی بھی علاقے کسی بھی خطے کا جو اسے دینے سے زیادہ لینے کی طلب ہوتی ہے اس لیے میں خواہ محبت، خلوص، ایثار، سچائی ہی شامل ہو اور پھر وہ اپنا دل۔ اپنی متاع جان اپنی کائنات صرف اسے ہی دینا پسند کرتا ہے جو اس کی ساری روحانی مائیں پوری کرے اور شہیر کی روحانی ضرورتیں تو بس گورنمنٹ جیسی تھی۔

شہیر تو ایک خالص مشرقی مرد تھا۔ آزاد ماحول کی رنگین تخیلوں سے دل بہلانے اس کا مقصد ہوتی نہ تھا۔ تبھی تو عمر کے کتنے قیمتی سال اپنی تباہیوں میں گم گزارے جلا گیا۔

یہاں تک کہ ڈاکٹر جہری اپنی بہت سی آرزوؤں کی تکلیفی سمیت اس دنیا سے رخصت ہو گئے وہ ان کا وارث ہونے کی حیثیت سے ان کی جائیداد کا مالک بن گیا اور اچھا بھائی کے مشورے پر جمال احمد کی خواہش پر... مٹی کن بے تابیوں سے بے تاب ہو کر پاکستان آ گیا۔

اب وہ بے شکا نہ بے مایہ شہیر نہ تھا۔ ایک ناکام تھنٹا نوجوان نہ تھا۔ اس کے پاس ڈاکٹر جہری کی چھوڑی ہوئی بے شمار دولت تھی۔ دنیا کی اعلیٰ ترین درس گاہ کی عطا کردہ تعلیمی و قانونی ڈگریاں تھیں۔ اپنی پھر پورا مٹی پوری ظاہری شخصیت تھی۔ وہ پاکستان آیا تو شروع کے دن اس نے سب کے لیے حد اصرار کے باوجود ایک ہوٹل کے کمرے میں گزار دیے۔

آپا نے ڈیوٹا تو اس نے کہا۔

”میرا تینا ہے آپا! تباہ بندہ ہوں۔ اتنا کمائی لوں گا کہ عمر بھر کسی اچھے ہوٹل کے شاندار کمرے میں آرام و زندگی گزار سکوں اور وہ وقت کی روٹی اچھی کھا سکوں۔“

”جیہتیوں کی بات مت کرو شہی..... مجھے علم ہے تم اپنا وقت بہت اچھی طرح گزار سکتے ہو باقی بچے ہائے بھیر ہی۔ بات صرف، سننے کی ہو تو ڈیڈی کا وسیع و عریض گھر بھی کم نہیں۔ میرے فریب خانے میں بھی تمہارے لیے بہت سی جگہ ہے۔ لیکن شہی..... (وہ رو باقی ہو گئیں) میں تو تمہیں ایک خبر پر زندگی گزارتا دیکھنا چاہتی ہوں۔ اپنے گھر آ آرام ہی کچھ اور ہے۔ انکار مٹا رہے تھے سامنے کا خالی پلاٹ برائے فروخت ہے تم نہیں گھر بنا لو۔“

”آپا! گھر بھی نصیب والوں کے ہوتے ہیں! کیسے آئی کو گھر کی احتیاج کہاں۔“

”شہی! تم! کیسے نہیں ہو خود کو اتنا خیر اہم سمجھنا چھوڑو! اہم۔ سب کی اہم ترین خوشیوں میں سے ایک اہم خوشی تم بھی دینے میں..... میں عہدی سے زیادہ تمہارا مان کرتی ہوں شہی۔ کیا کن کا مان تو زود دے گا۔“

اب تو وہ باقاعدہ روئے گئیں۔ شہیر آتسوؤں سے ڈرنا تھا۔ جھٹ اقرار کرتے ہی بن پڑی۔ اس نے آپا کے آنسو پونجھ دیے۔

”آپ جو بھی کرتی رہے آپ کو اختیار ہے۔ بس روئیے مت۔“ وہ مسکرائیں۔

آتسو اور شہی میں شہیر کی اک نان اور ہاں کا فاصلہ تھا۔ دونوں میں پلاٹ خرید لیا گیا۔ نقشہ بنے لگا۔ انکار بھائی نے ایک روز ایک کارڈ اسے تمہا دیا۔

”شہی! رضوان احمد بہت اچھے آرکیٹیکٹ ہیں۔ میں نے ان سے رابطہ کیا ہے، کل وہ آئے تھے پلاٹ دیکھنے! اچھا نقشہ بنا میں کے لیکن تم چلے جانا..... گھر تمہارا ہے۔ تم سے بہتر رائے کون دے سکے گا۔“

شام دوپہر رضوان احمد کے ہاں جا رہا تھا۔ ڈرائیو کرتے ہوئے وہ ماٹوں پہلے کی ایک خوشگوار شام کی بھول بھلیوں میں کھنڈ گیا۔ جب عاتک کے لائے، دئے خرد کو دیکھ کر اس نے اور گورنمنٹ کی بحث و مکرار کے بعد اپنے گھر کا ایک مشفقہ نقشہ پاس کیا تھا۔ وہ آواز میں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اور جب رضوان احمد نے اپنی تجاویز اس کے سامنے رکھی تو اس میں ساری درد بدل اس نے گورنمنٹ کی خواہش کو مد نظر رکھ کر ہی کی۔

”بہشت شہیر شاہنواز مسکری! تمہارا یہ زلمہ کتنا بوجھنا لگا کہ تم اپنے ماضی کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل چکے ہو۔ تم تو ابھی تک وہیں کے وہیں ہو جہاں گورنمنٹ نے تمہیں چھوڑا تھا۔ تم اب تک ان ہی کائناتوں بھری ماہوں پر بھگ رہے ہو جہاں سے ان نے رخ بدل لیا تھا۔ کائناتوں سے دامن چھڑا کر پھولوں کی طرف بڑھ گئی تھی۔“

اقبال بالو کی آواز نے اسے اور تڑپا دیا۔

داروغہ ہم کو یاد آنے لگے اس نے نکٹ سے اسٹاپ کا ٹین دبا دیا۔ اپنا ہراسیٹر تک ڈھکل سے گھراتے ہوئے اس نے یہ بات تسلیم کر لی کہ وہ جو گورنمنٹ کا بوجھ دار تھا اب تک اس کی محبت سے ہی دستبردار رہا۔ اس کا تھا۔

گھرتن گیا لان تیار ہو گیا۔ دروازے کے دروغ اور لان کے پودے..... ان دونوں کے انتخاب کے وقت قدم قدم پر صدائیں اس کی رہنمائی کرنے لگیں۔

گھر اور لان کی آرائش بڑی پائش مکمل ہوئی تو گویا وہ سارے خواب پورے ہو گئے۔ دوسری شام اس نے آپا

کے حکم پر اپنے سارے دوستوں کو مدعو کر لیا۔ ہر ایک کی زبان پر تعریفی کلمات تھے۔

”اس گھر میں بس ایک ہی کمی ہے۔“ ایک نے با آواز بلند کہا۔

”ہاں صرف ایک کی.....“ دوسرے نے تائید کی۔

”سب پوری کر رہے ہو دو کی؟“ تیسرے نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے بے اختیار افتخار بھائی کی

طرف دیکھا مدد کی خاطر۔

”اب تو صرف یہی مسئلہ باقی رہ جائے گا اور آپ لوگ جلد ہی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے برپا کی جانے

والی تقریب میں مدعو کیے جائیں گے۔“ افتخار بھائی نے اسے سہارا دیا۔

”بہت خوب۔ ہم منتظر ہیں گے۔“ سب نے ایک ساتھ کہا۔

☆☆☆☆☆☆

اس کا جی چاہتا وہ ڈاکٹر پارون کے نمبر پر رینگ کر کے ایک بار گھر کی آواز سن لے۔ ڈاکٹر پارون کا نام اس شہر کا معتبر نام تھا پانچ سات سالوں میں ان کے ہاسپٹل نے نمایاں ترقی کی تھی۔ وہ تو ویسے بھی خوش نصیب تھے۔ ان کے پاس گھر تھی۔ شبیر کی متاع جاں۔ ان کے ممتاز ہونے کے لیے تو یہ بات ہی کافی تھی۔ وہ چاہتا تھا ایک بار اس سے بات کرے۔ صرف ایک بار۔ اس نے کئی بار ان کی رہائش گاہ کا نمبر ملایا..... کبھی بھیجی رہی کسی نے فون اٹھایا ہی نہیں۔

”نگنا ہے۔ تم بہت مصروف ہو گھر اپنی زندگی کی خوشیوں میں مگن۔“ اس کا دل دکھ گیا۔

پھر جمال احمد کے حکم پر اس نے قوی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا تو شب و روز بے حد مصروف ہو گئے۔ کمی آئیں تو گھر میں ایکشن کے ہنگاموں کے ساتھ ساتھ ان کی خواہشوں کے ہنگامے بھی جاگ اٹھے۔ لڑکی بھی منتخب کر لی تھی۔

شبیر نے زندگی سے سمجھوتا کرنے کی خاطر اپنے پیاروں کو خوش کرنے کے لیے بڑی ایمانداری کے ساتھ فلسطین سے شادی کی باجی بھری۔

فلسطین بہت اچھی لڑکی تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ علم و ادب سے آراستہ۔ خوش مزاج اور شریف طبع۔ جب شادی کرنا طے ہی تھا تو اکثر کئے لیے جواز ہی کیا تھا۔ وہ دو سالوں میں کئی بار فلسطین سے ملتا تھا۔ تہائی میں بھی اور محفلوں میں بھی۔ پچھلے کئی ماہ سے وہ اسے روزانہ کالج چھوڑ آیا کرتا تھا۔ ان کے درمیان کبھی ایسی کوئی بات ہوئی ہی نہ تھی۔ ماسدا عام و نیاوی باتوں کے اور جب سے یہ تیار رشتہ جوڑنے کی بات ہوئی تھی تب سے وہ حد سے زیادہ مصروف تھا۔ وہ ایک بار اس سے مل گیا کہ اس پر چند باتیں واضح کرو دینا چاہتا تھا۔ ایسی ساری باتیں جن کا بے وقت انکشاف اس کی آئندہ زندگی پر اثر انداز ہوگا۔ اپنے ماتحتی کا اعتراف کرنا چاہتا تھا۔ اور مستقبل کی کارٹی دینا چاہتا تھا۔

اسے ہر معاملے میں صاف گوئی ہی پونہ تھی۔

اسی غرض سے ایک روز کون سے پھٹی کے وقت کون کی طرف بٹل دیا۔ اس کا خیال تھا چند منٹوں کے سفر کو لہنا راز سے اختیار کر کے تھوڑا سا طویل کرتے۔ فلسطین سے ساری باتیں کہہ دے گا۔ لیکن جب وہ گیٹ پر پہنچا تو اس نے فلسطین کو ایک طویل چمپانی مہینے کا زری میں بیٹھے دیکھا وہ مسکراتی ہوئی اگلی نشست پر بیٹھ رہی تھی شبیر کی آنکھیں میر پور کا زری پتلی رہ گئیں۔ ذرا ٹھونگ سین پے جانے کون تھا اس نے کازی کی رفتار آہستہ کر دی۔ و

کسی کی ذاتی زندگی میں مداخلت کو پسند نہیں کرتا تھا۔  
لیکن.....

فسطیہ اس کی ہونے والی بیوی تھی۔

وہ بڑکی جیسے اپنے دل میں بھر پور جگہ دینے کے لیے اسے بڑی کٹھن راہوں پر چلنا پڑا تھا۔ خود احتسابی لڑکی تو اس نے اس کی روح پر مٹی گھاڑ لگانے تھے۔

میرون گاڑی چلی تو وہ اس کے پیچھے ہولیا۔ یہ دیکھ کر اسے اور بھی حیرت ہوئی کہ گاڑی فسطیہ کے گھر کا کرنے کے بجائے مضافات کی طرف جارہی تھی۔ وہ پیچھے پیچھے چلتا ہی رہا۔ باغ قاطعہ کے گیٹ پر پارکنگ میں گاڑی رکھی تو شیر بھی رک گیا۔

اس کے اعصاب کو زبردست جھٹکا لگا جب اس نے گاڑی میں سے ڈاکٹر ہارون کو رما مدہ ہوتے دیکھا۔

فسطیہ بھی باہر نکلی۔ ڈاکٹر ہارون نے گاڑی ٹاک کی اور وہ دونوں سکر اتے ہوئے اندر بڑھ گئے۔ گیٹ پر شیر کی نظروں کے سامنے تھا جہاں سے ایک لمبی روش دور تک پڑھتی چلی گئی تھی۔ وہ ایک ساتھ قدم اٹھا کر چلے جا رہے تھے۔ چلتے چلتے فسطیہ کا پاؤں رپٹ گیا تھا شاید۔ ڈاکٹر ہارون نے اسے تھام لیا۔ اب وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالنے چلے جا رہے تھے۔

یہ مظاہرہ کئی باتیں سمجھا دینے کے لیے کافی تھا لیکن یہ تخیل بہت عجیب تھا۔

ڈاکٹر ہارون ایک بیوی کے شوہر اور یقیناً کچھ بچوں کے باپ تھے۔ یہ کیسی انہیں زیب نہیں دیتا تھا۔

وہ حیران تھا ڈاکٹر ہارون کا یہ رویہ دیکھ کر۔

وہ حیران تھا فسطیہ کی زندگی کا یہ رخ دیکھ کر۔

بظاہر بے ضرر اور لاپرواہ نظر آنے والی لڑکی اصل میں یہ تھی۔ دوسروں کے حقوق پر ڈاکا ڈالنے والی۔ اور ڈاکٹر ہارون!

وہ تو لقب زنی کے عادی تھے وہ نام کے مسیحا تھے دوسروں کی خوشیاں لہٹ لینا ان کا اصل پیشہ تھا۔ اپنے میں ایک لڑکی کو بیوی بنا کر آباد کرنے کے بعد بھی وہ دوسروں کو دھوکا دیتے بھر رہے تھے۔

اور یہ بات تو کامل کی تھی کہ وہ دوسری بار بھی اس کی ہی خوشیاں لوٹنے میں کوشاں تھے۔

کیا وہ بھی ایک ٹاگٹ تھا؟ وہ ہی ایک نشانہ تھا؟ مشق ستم کے لیے.....

اسے اتر حد دکھ ہوا۔

اسے ڈاکٹر ہارون اور ان کے اہل خانہ سے ملاقات کا دن یاد آیا۔ وہ ان سے متاثر ہوا تھا۔ لیکن آج اس احساس کو تازہ یاد لگا۔ نوگ کتنے پردوں کے پیچھے رہتے ہیں۔

دبیز پردوں کے پیچھے ان کا اصل کسی کو نظر ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ اسے گھٹاؤنے کر کے مالک ہوں گے۔

بڑی دیر سڑک پر گاڑی روکے وہ ان دونوں کو آگے بڑھتے دیکھتا رہا۔ پھر گاڑی ریورس کر کے واپس چلا آیا۔ بارے دکھ کے اس کے اعصاب جھنجھٹا اٹھے۔ اسے فسطیہ پر غصہ نہیں آیا۔ لیکن ڈاکٹر ہارون کا تصور آتے اس کا خون کھول اٹھا۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو حسب معمول سب وہیں موجود تھے۔

.....

مٹی لانا بیچ میں تھیں۔ فون پر کسی سے محو گفتگو تھیں، مندر وہ آ جا جو صوفے پر بیٹھ ہوا نہیں۔ اس کے قدموں کی آبیٹ پا کر اٹھ بیٹھیں۔

”آؤ شعی! میں تمہارا انتظار کر رہی تھی! ابھی پچھون یہ کوہٹ کی مصروفیات تو ترک کر دو! تھوڑا وقت گھر میں بھی دیا کرو۔“

اس نے اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

”جی آپا! آ گیا ہوں۔ فرمائیے۔ مگر یہ مٹی کسے ڈانٹ ڈپٹ کر رہی ہیں۔“ اس نے سب کچھ بھلانے کی سعی میں بہ شکل بات کی۔

”اجی کی بیٹی کو اور کسے۔ شادی سر پر ہے اور وہ وہیں تھی بیٹھی ہے ایسی بھی کیا شوہر پرستی کہ میکہ بھلا دیا جائے۔ اس کی کسی سب کو محسوس ہو رہی ہے۔“

شیر مسکرا بھی نہ سکا۔

”لو۔ شعی آ گیا ہے خود ہی بات کر لو۔“

مٹی نے شاید عذرا سے کہا تھا۔ وہ کسی سے بات کرنے کے موڈ میں نہ تھا لیکن اسے فون کی طرف جانا پڑا۔

”ہیلوشی! کیسے ہو؟ بیوے بے عورت بھائی ہو..... کتنی ماں لیا کہ شادی طے ہو گئی ہے۔ لیکن انجی سے بہنوں کو بھلا دینا کتنا انصاف ہے۔ تم لینے آؤ گے تو میں آؤں گی ورنہ ہرگز نہیں۔ شعی سسرالی میں اس لڑکی کی عزت ہوتی ہے جسے ماں باپ، بہن بھائی اہمیت دیتے ہیں۔ ایسے ہر وقت طعنے دیتے ہیں۔ شوہر جتنا بھی اچھا ہو جتنا بھی مہربان ہو۔ بیوی کے رشتہ داروں کی نا انصافیوں کا ذکر کرنا اسے نہیں بھولتا۔ اتنی بھی کیا مصروفیت۔

پشاور تک ہو آئے۔ میرا شوہر راستے میں بنی تھا اور۔ سجر یوسف بخاری کا گھر ڈیڑھ بج گیا تھا۔ مشکل نہ تھا۔“

”آئی ایم سوری عذرا! میرا صاحب سے معذرت کر لینا میں جلد آؤں گا۔ بچوں کو میری طرف سے پیار کرنا۔“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ان نے فون مٹی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”شعی! بہت تھکے تھکے لگ رہے ہو کھانا لگاؤں؟“

”نہیں آپا!“

”کیا بات ہے لگتا ہے کچھ چھپا رہے ہو مجھ سے۔“

”کچھ بھی نہیں۔ بس ذرا اپنے کمرے میں جا رہا ہوں کھانا ابیر میں کھاؤں گا۔ آپ سب کھا لیجئے۔“ سردہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

وہ خواب گاہ میں آ گیا۔ سر ہاتھوں میں تھا بے بیڈ پر آ بیٹھا۔ سرائیڈ ٹیبل پر رکھے ٹیلی فون کا چونکا اٹھایا۔ ڈاکٹر ہارون کا نمبر ملا۔

”ہیلو..... ہیلو۔“ خالیا کسی ملازم کی آواز تھی۔

وہ گویا نام کیسے لیتا اس سے اپنے نام کو کیا نام دیتا وہ اس سے کیا کہتا فوراً رابطہ کاٹ دیا۔ لباس تبدیل کیے بغیر وہ بیڈ پر دراز ہو گیا سوچتا رہا۔

آنکھیں بند کیے خیالوں کے کھنور میں ڈوب ڈوب کر اٹھتا رہا۔ آخر اس نے فیصلہ کر لیا دو ٹوک بات کرنے کا۔ آنکھیں کھول کر کھلاک کی طرف دیکھا۔

شام کے چھ بج چکے تھے۔ بیڈ سے اٹھا۔ لباس کی جگہیں درست کیں۔ بالوں میں انگلیاں پھیریں اور باہر

Scanned By Waqar Azeem

عبداللہ پور کے نام کے ساتھ ہی کئی نام اور چہرے ذہن میں آ گئے۔  
کئی کھوئی ہوئی محبتیں حوصلہ بڑھانے لگیں۔

غفور بابا۔ مسرور۔ رانو۔ یہ سارے اس کے اپنے تھے۔

ہاں..... ہاں..... محبتیں دینے والے اپنے ہی تو ہوتے ہیں۔ سنگ دل تو وہ خود تھا۔ واپس آ کر بھی ان فریبوں سے رابطہ نہ کیا تھا۔ ایک بے مہر نے اس کی دنیا درہم برہم کر دی تھی نا آسودہ جسم و جاں اور کھولتے مانع پر یہ نام اب رہیما ان بن کر رہے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا عبداللہ پور جانے والی سڑک پیچھے رہ گئی تھی وہ گاڑی سبڑ کر اسی طرف چل پڑا۔

ایک گھنٹے سے بھی پہلے وہ عبداللہ پور پہنچ چکا تھا۔ لیکن وہاں پہنچ کے بھی عجیب الجھن کا شکار تھا۔ وہ گاڑی اس کے سامنے تھا ہی نہیں۔ پختہ سڑکیں صاف ستھری گلیاں اور دکانوں کی جگہ گھٹا ہوا۔ اور گرد و ہوا کا شور پر رونق اُٹار۔ ایک جگہ گاڑی روک کر اس نے بارن دیا۔ ہوش کے باہر بیٹھے بے فکرے نو جوانوں میں سے ایک اٹھ کر اس کے قریب آیا۔

”یہ عبداللہ پور ہے نا؟“

”جی ہاں۔ تم..... کون؟“

”ہاں میں یہاں سات برس بعد آیا ہوں۔“

”جناب! سات برس ایک لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ آپ کو کس سے ملنا ہے۔“

”غفور بابا سے۔“

”کون غفور بابا۔ وہی جو شہر میں.....“

”ہاں ہاں مسروران کا پوتا ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔ مگر آپ تو ان کے گھر کو پہچان ہی نہیں پائیں گے۔ آپ چاہیں تو میں آپ کے ساتھ چلا جاؤں۔“

”میں سنہ آ رہا ہوں۔ وہ غفور شہر کو پتہ نہیں۔“

”مگر مسرور مجھے پہچان لے گا۔“

”میں مسرور کا بہنوئی ہوں اس کی چھوٹی بہن کا شوہر۔“

”ارے..... تم..... صغریٰ کے میاں ہو۔“

”جی ہاں..... وہ شرمایا گیا۔“

”چند دن پہلے ہماری شادی ہوئی۔ صغریٰ میری پھوپھی زاد ہے۔“

”ایسا کرتا ہے صغریٰ؟“

”عبداللہ پور کے اسکول میں استانی ہے۔“

”ارے واہ! وہ اتنی ہی صغریٰ اور تم..... کیا نام ہے تمہارا؟“

”سلطان علی تھی مگر آپ کون ہیں جو ان سب کو جانتے ہیں۔“

”سلطان علی! تم..... تم کیا کرتے ہو؟“

”میں..... میں بھی ٹیچر ہوں جی ادھر عبداللہ پور میں ہی۔ آپ نے بتایا ہی نہیں آپ کون ہیں؟“

نکلا۔ کورڈور میں کوئی بھی نہ تھا۔ وہ باہر آ گیا۔ ابھی اس نے بیرونی گیٹ کا رخ کیا ہی تھا کہ روش پر فسطیہ نظر آ گئی وہ ایک دم وہیں رک گیا۔

”آپ! فسطیہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔“

”جی میں..... مجھے آپ سے کچھ کام تھا آپ ہی کی طرف آ رہا تھا میں۔“

”ارے واہ..... میں خود بھی آپ سے ملنے آئی ہوں۔ کیا آپ کے پاس میرے لیے کچھ وقت ہے شبیر عسکری۔“

”وہ بے حد شوخ ہو رہی تھی۔“

”شبیر اسے دیکھتا رہ گیا۔“

”فرمائیے۔“

”وہ اصل میں وہ بات سر راہ کرنے کی نہیں ہے۔“

”یہ راد گزرتی نہیں میرا گھر ہے مس فسطیہ..... آپ ہر بات سہولت سے کر سکتی ہیں۔“ وہ خاصا تلخ ہو رہا تھا۔

”فسطیہ نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا پھر بولی۔“

”مجھے آپ سے کہنا تھا۔“ اس نے تمہید باندھی۔“

”ہاں ہاں آپ کو مجھ سے کہنا تھا کہ..... آپ مجھ سے شادی نہیں کر سکتیں..... کہ آپ مجھ سے بہتر ایک انسان کے ساتھ زندگی بنانے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔ آپ کو مکمل حق ہے مس فسطیہ مکمل حق۔ لیکن آپ کو کسی کی زندگی اجاڑ کر اپنا جشن آباد کرنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ اتنی اچھی ہے اتنی اچھی کہ آپ کا تصور بھی اس اچھائی تک نہیں پہنچ سکتا۔ جب وہ اسے راضی نہیں رکھ سکتی تو آپ کیا چیز ہیں۔ آخر کیا؟ میں تے سوچا ہی نہ تھا کہ آپ ایسی عاقبت نا اعلیٰ ہوں گی۔ مجھے اس کا تم نہیں کہ آپ مجھے ٹھکرا رہی ہیں۔ مجھے اس کا دکھ ہے کہ آپ ہاتھ بے حد غلط ہے۔“

”شبیر! فسطیہ کا چہرہ تپ گیا۔“

”آپ کو کسی کے بارے میں ایسا رائے دینے کا کوئی حق نہیں۔“

”اوہ آئی! اب مسوری میں واقعی حق نہیں رکھتا کیونکہ مجھ میں اور آپ میں کوئی ناتائیں۔ کوئی اعلق نہیں۔“

”شوق سے گوبرتی زندگی سے ہٹنے اس کا شوہراں سے چھین لیجیے۔“

”گوہر..... گوہر..... واٹ ڈیوٹین؟“

”جو بھی مطلب ہے وہ اچھی طرح سمجھ میں آ جائے گا جس بات سے آپ انکار ہی ہیں مجھے اس سے۔“

”انکار ہے۔ شبیر کے مقدر میں سکون لکھا ہی نہ ہو تو اس میں کسی کا کیا قصور۔ آپ جو پہلے ہی آزاد نہیں، یہ طرف سے مکمل آزاد ہیں۔ میرا انکار سب تک پہنچا دیجیے گا۔“ وہ ایک دم پورچ کی طرف ہڑا۔

گاڑی کا لاک کھولا اور ڈرائیونگ سٹ پر بیٹھے ہی یہ جاہ جا..... وہ شاہراہ کی طرف آ نکلا۔ گھر سے نکل تو آیا تھا۔ واپس جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ بس آگے ہی بڑھے چلا جا رہا تھا۔ لیکن با کجاں تھا یہ خبر ہی نہ تھی۔

بڑی دیر بعد گاڑی کی رفتار آہستہ کرنے کے بعد یہ منزل کا تعین کرنے لگا۔

ذہن کے افق پر یاد کے ذمیروں جگنو چمک کر راد دکھانے لگے۔

یہ راستہ عبداللہ پور کی طرف تھی تو جاتا تھا۔



نے کہہ دیا۔  
 بل مگر شہیر کا چہرہ تاریک سا ہو گیا۔ اس ذکر کو بھلانے کے لیے اس ذکر سے فرار حاصل کرنے وہ عبد اللہ پور  
 آیا تھا۔ راتوں نے یہ سوال کر کے اسے پھر مضطرب کر دیا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ مبادا راتوں اس کے احساسات  
 جان لے۔

”آپ چپ کیوں ہو گئے؟ بی بی کے ذمے ابھی کچھ اور سزا بھگتنا باقی ہے کیا؟“  
 ”کس کے ذمے؟ کون سزا بھگت رہا ہے؟“

”ارے آپ بھی کیسے بھولے ہیں۔ مجھے بتا ہے آپ جان بوجھ کر ستارے ہیں حالانکہ سب چاہے آپ کو  
 سب جانتے ہیں آپ.....“

”راتوں بی بی اس پر گز نہیں سمجھا تمہاری بات۔“

”بھیا! چھ سات برس کا انگٹار کچھ کم نہیں ہوتا۔ ایک تہا لڑکی کا سارے زمانے سے لڑکے اپنا آپ کسی کی  
 خاطر وقف رکھنا پیاری شہین جلائے رکھنا بہت بڑا کارنامہ ہے بھیا! شہیر اب بھی نہ سمجھ سکا تھا۔“

”بھیا میں نہیں سمجھ پایا آخر تم کس کا ذکر کر رہی ہو راتوں بی بی! وہ اب بھی انجان تھا۔“

”شہیر بھیا! شاید سارے لوگ سچ ہی کہتے ہیں۔ آپ نے جب انہیں بھلا دیا تو ہم کیا چیز تیرا واہ بھیا! واہ  
 اچھا صلہ دے رہے ہیں آپ ان کو۔“

”کس کو؟ کیسا صلہ؟ یہ سب کیا ہے؟“

”وہ لکھ بھیر شہیر کو دکھائی دے گی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ سچ سچ رونے لگی۔“

”آپ کو یاد ہے وہ رات جب میں اپنے حالات سے گھبرا کر خودکشی کرنے چلی تھی۔“

”ہاں نہیں مجھے اپنی زندگی کی ہر بات یاد ہے۔“

”آپ کو یاد ہے آپ نے میرے یا با کا ایک خطیر رقم دے کر مجھے پتہ لایا تھا۔“

”مگر ان باتوں کا اس وقت کیا ذکر۔“

”آپ کو وہ سرون کے جذبے کا اس قدر خیال تھا لیکن اپنی زندگی کی کوئی پروا نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”ایک لڑکی کو حالات کی گردش میں تنہا چھوڑ کر آپ ملک ترقی چھوڑ گئے۔“ کچھ دیر وہ خاموش رہا۔

”میں نے کس کو حالات کی گردش میں تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ تنہا تو میں ہو گیا تھا اور اب تک ہوں۔ میں جان گیا  
 ہوں تم کو جو نکا ذکر کر رہی ہو جانتی ہو اس نے کیا کیا ہے۔ وفا کے نام پر کتنا بڑا داغ لگایا۔“

”جی ہاں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ انہوں نے کیا کیا؟“ راتوں کے لہجے میں طنز تھا۔

”پھر شکوہ بھی مجھ سے۔“

”بات ہے بھی تو شکوہ کرنے والی۔ انہیں کس بات کی سزا دی آپ نے؟ خود سے محبت کرنے کی بھری دنیا  
 میں اس کا اقرار کرنے کی شادنی سے انکار کر لینے کی آپ سے وفا بھانے کی۔“

”کس کا مطلب؟ کیا اقرار کیا انکار؟ تمہیں کیا خبر راتوں بی بی وہ تو ڈاکٹر ہون کے ساتھ شادی کر کے  
 جین کی زندگی گزار رہی ہے۔ کئی بچوں کی ماں ہو گئی۔ کاش میں اتنا خوش ہوتا کہ کوئی میری خاطر یہ سب کچھ کرتا  
 جو تم کہہ رہی ہو۔ بعض لوگوں کے مقدر میں ایسی کوئی بات لکھی ہی نہیں ہوتی۔ وہ اتنے خوش قسمت ہوتے ہی

”آپ کے بغیر بے حد ادا اور رنجیدہ۔“ سرور نے زور دے کر کہا۔  
 ”مگر غفور ہا یا! وہ مجھ سے ہر مانا توڑنے کا اعلان کر چکے ہیں۔“ اس کی آواز بوجھل ہو گئی۔  
 ”انہیں آپ کی بچان ہی نہیں ہوتی تھی بی بی! کسی شے کو کھو دینے کے بعد اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔“

”ان سب نے ہی آپ کو غلط سمجھا تھا۔“ غفور بابا کی آواز میں کھٹک آگئی تھی۔  
 سب باتیں کرتے رہے۔ سب کا موضوع ایک ہی تھا یعنی باپ اور بیٹے کے ملاپ کی آرزو اور کوشش رات  
 خاصی بیت گئی تھی۔ سب نے اجازت لے کر کمرہ خالی کر دیا۔ سامنے میز پر چنے کھانے نے برسوں پہلے کی  
 یادیں تازہ کر دیں۔

”سرور یوں کی رات میں تند و گرم کرنا خاصا مسئلہ تھا لیکن بھر جائی آپ کی پسند بھونٹا نہیں بھائی صاحب۔“  
 صغریٰ مسکراتی تھی میز پر گرم روٹیوں کی چٹھیر رکھتے ہوئے۔ وہ صبح سے بھوکے تھا۔ گھر سے چائے کی ایک پیالی  
 مچلت کے ساتھ پیتے ہوئے نکل آیا تھا۔ سواں نے جی شہر کے کھانا کھایا۔  
 ”راتوں بی بی! صرف زمانے اور ماحول نے ہی نہیں تمہارے سلیتے نے بھی ترقی کی ہے۔ کھانا بے حد مزے دار  
 تھا پہلے سے بھی زیادہ۔“

شہیر کے لہجے میں خوشگوار تبدیلی آئی تھی۔ جس پر وہ خود حیران تھا اور ان لمحوں میں اس صورت حال کو بھول گیا۔  
 تھا جواب سے چند گھنٹے پہلے اس کے اعصاب کو پتھار رہی تھی۔  
 ”ایک بات پوچھوں آپ سے؟“

راتوں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ یہ کہنے کے بعد تھوڑی سی گھبرائی ہوئی تھی۔ شہیر تو لیجے سے ہاتھ ساف  
 کرتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”راتوں بی بی! جب تک تم اپنے دل کو یہ نہ سمجھاؤ گی کہ میں وہی شہیر ہوں اس سال پہلے والا..... میں کوئی ا  
 نہیں بتاؤں گا۔ مجھے اجنبیت کی دیواروں کے اس پار مت دیکھیلو۔“

وہ حیران اور پھر خوش ہو کے اسے دیکھنے لگی۔ تو وہ مسکرا دیا۔  
 ”شہیر بھیا! قدرت نے آپ کو جو اتنی عزت بخشی ہے وہ اسی سادہ دلی کا صلہ ہے اسی مہربان رو  
 انعام۔“

”ہاں راتوں بی بی! ہزار شکستیں بھی مقدر ہو جائیں، محبتوں کی آرزوئی نہیں ہے۔ ہزار لوگ بھی دھوکا  
 جائیں دل پھر بھی پرامید رہتا ہے۔ آپ سب تو میرے بے ضرر اور مخلص سے دوست تھے آپ کی بھنڈی  
 مجھے سدا اسی دم سنبھالا دیا ہے جب میں ساری دنیا سے مایوس ہو گیا ہوں انسان ایسی محبت کا احسان اتار  
 قابل بھی نہیں ہوتا۔ مگر اس احسان کے بوجھ تلے دیا آدنی بھی راحت محسوس کرتا رہتا ہے۔ ہاں راتوں بی  
 ایک بات پوچھ رہی تھی مجھ سے پوچھو نا۔“ اس نے یاد دلایا۔

”ہاں بھیا! وہ بات پوچھنے کے لیے تو میں آپ کی طرف آ رہی تھی شہیر۔ ان سبہا نے مجھے روک دیا  
 ڈرا دیا تھا مجھے کہ شہیر بھیا بہت بڑے آدمی ہو گئے ہیں۔ تمہیں پہچانیں گے کبھی نہیں۔ دھتکار دیں گے۔“  
 ”لا حول و لا کمال کرتے ہیں کہنے والے بھی شہیر اتنا شوٹا چشم اور بے وفا نہیں کہ انہوں کو یوں  
 جائے۔“

”آپ شادی کب کر رہے ہیں؟ آپ کی شادی کا ارمان ایک مدت سے ہم سب کے دل میں۔“

"کوئی بات نہیں برا تو بولی لڑا، اسے خبری جس تو صدیاں بیت جاتی ہیں باخبر ہو کر ایک پنی صدی جتنا ہو جاتا ہے۔  
 مجھے ان سے بہت سی باتیں پوچھتا ہوں بہت سی باتیں۔"  
 "آپ کیسے جانتے ہیں۔ آپ کون کون سے نغمے پورا کرتے ہیں نہیں سمجھ آئے گا۔"  
 "پھر کون جانے گا میرے ساتھ؟ کیا سرور جاگ رہا ہوگا۔"  
 "کیوں نہیں۔ سرور اور میں دونوں ہی چلے نہیں گئے۔ آپ تیار ہوں، سرور کو بتاتی ہوں۔"  
 وہ کمرے سے نکل گیا۔ وہاں اس کے ساتھ ڈاکٹر بارون کے گھر کو جانے والی سیدھی سڑک تک آئے۔ اور  
 پھر وہاں چلے گئے۔ آدھ گھنٹے بعد وہ اسٹین واسٹی کی سولٹی کے ڈرائنگ روم میں تھا جہاں ڈاکٹر بارون پہلے  
 سے موجود تھے۔ اس کا سختی ہی ڈائنگ ٹیبل سے اٹھ کر بھاگے چلے آئے تھے۔ اور اس سے سن کر بے تحاشا  
 خوش تھے۔  
 "میں کچھ دیر پہلے یہاں پہنچا ہوں۔ شاید نہ بھی آتا۔ لگتا ہے اس لیے آیا ہوں کہ ایک نیک دل مہمان کا  
 استقبال خود کر سکوں۔ ہاں جی آپ سے سن کر بہت خوش ہوں، شہیر۔ مجھے یاد ہے آپ نے ان سے وعدہ کیا  
 تھا پھر ملنے کا۔ دراصل بابا جی کی وفات نے انہیں بہت زیادہ افسردہ کر دیا ہے۔"  
 "کیا وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے؟"  
 "ہاں شہیر عسکری، اولاد چاہے بری بھی ہو ذرا باپ کے لیے ابدی جدائی کا درد بہت اذیت ناک امتحان ہوتا  
 ہے۔ بابا جان شاید ان سے از حد پیار کرتے تھے، ابھی تو اسی راز کے مسافر ہو گئے۔"  
 "اور انی گاؤ۔ کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟ اس وقت ان کے آرام میں غلطی تو نہیں آئے گا۔"  
 "کیوں نہیں اور اپنے کمرے میں ہی ہیں، دراصل میں بھی ان سے ایک بہت ہی اہم بات کہنے آیا تھا۔ ایک  
 مشورہ لینے آیا تھا۔ اس مشورے کا تعلق آپ کی ذات سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔"  
 "میری ذات سے تعلق؟" شہیر کی ٹٹا ہون میں وہ پھر کا منظر آ گیا۔  
 "ہاں شہیر عسکری، بعض حالات بھی بعض واقعات بھی بخیر کی صورت ہوتے ہیں۔ ہم سب زندگی کا سفر طے  
 کرتے تو رہے ہیں لیکن الجھنوں کے صورت میں الجھ کر ہی باہر نکل کر نہیں۔"  
 اب شہیر کو بات کافی حد تک سمجھ میں آ رہی تھی۔  
 "کیا تسلیم آپ سے نہیں کیا۔ اس نے آپ کو کچھ نہیں بتایا۔"  
 "ہاں نہیں، وہ مجھ سے بہنا چاہتی تھی، کچھ لیکن نہیں من ہی نہ۔ گا۔"  
 "یہ مشورہ میں نے اسے دیا تھا۔ بہت سال پہلے کے ایک تجربے کی روشنی میں، حالات کے اچھے دھاگوں کو  
 اس طرح ہی سلجھایا جاسکتا ہے۔ یہ کیسا عجیب اتفاق ہے شہیر عسکری کہ ہمارے علم میں ہی نہیں ہوتا اور ہم دونوں  
 میں ایک تازہ سا کھڑا ہو جاتا ہے۔ انجانے میں ہی، ہر دونوں، تیب لڑکی کے طلب گار ہوتے ہیں۔ لاطمی میں تو  
 بہت کچھ ہو جاتا ہے، سب جان کر کچھ بھی نہیں۔"  
 "آپ نے اب تک شادی نہیں کی؟ میرا مطلب ہے گوہر کے علاوہ کسی لڑکی سے۔" اس نے پوچھ لیا۔  
 "وہ حادثہ اتنا عجیب تھا کہ مدتوں تک اس بارے میں سوچ ہی نہ سکا۔ گوہر ایک اچھی بلکہ بہت اچھی لڑکی تھی۔  
 اچھی چیزیں ہر انسان کو متاثر کرتی ہیں۔ اس سنجیدگی کے حوالے سے ہم سب نے ایک طرف فیصلہ کر لیا۔ جب  
 مجھے صورت حال کی خبر ہوئی تو میں نے ساری دنیا داری اور مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر شادی سے انکار کر

"نہیں۔"  
 "اگے میرے خدا۔ آپ تو شاید ہر بات سے انجان ہیں، آپ کو کوئی خبر ہی نہیں۔"  
 "کس بات سے؟ کس خبر نہیں ہے مجھے۔"  
 "آپ بیٹھے تو سہی۔ آرام سے میری بات تو سنیے۔"  
 "انتار ہوں گا۔ پہلے تم مجھے ایک بات بتاؤ، امین واسٹی کی جوڑی میں اب کون کون رہتا ہے۔ اگر عجم امین  
 وہ بھی وہاں رہتی ہیں تو کھانے سے ملتا ہے۔"  
 "بھیا آپ۔ آپ۔ آپ کچھ رہے ہیں کہ ڈاکٹر بارون صاحب اور گوہر بی بی کی شادی ہو گئی تھی۔ ایسا نہیں  
 ہو تھا۔ میاں صاحب نے خود غفور بابا کو بتایا ہے۔ بلکہ یہ بات تو پوری دنیا جانتی ہے۔ گوہر بی بی نے شادی  
 سے ایک دن پہلے خود ڈاکٹر بارون کے اسپتالی جا کر شادی سے انکار کر دیا تھا، سب کچھ بتا دیا تھا انہیں۔"  
 "کیا؟" شہیر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔  
 "ہاں ہاں۔ ڈاکٹر بارون نے فوراً شادی کو واپس لے لیا، اس بات پر دونوں بھائیوں میں رجسٹر ہو گئی۔ ماموں گھر  
 چھوڑ گیا اور گاڑی کے حادثے میں مر گیا۔"  
 "اوہ۔ نہیں۔ نہیں۔ رائی لیا۔"  
 "ہاں بھیا، اب ان پر وہ حاملہ دیہاتی لڑکی ایک عام سے انسان سرور کی خاطر جان دے سکتی ہے،  
 ایک پریمی لکھی، سب جو وہ والی لڑکی آپ جیسے عظیم مرد کی خاطر شادی سے انکار نہیں کر سکتی، بسا۔ دلوں میں بس  
 رہنے کی آرزو بڑی خالم ہوتی ہے، یہ بہت کچھ کرسکتی ہے۔ پھر آپ کی خاطر تو جوڑ کیا گیا وہ تم ہے۔" وہ فلسفی  
 نظر آنے لگی تھی۔  
 "راؤ! تم سچ کہہ رہی ہو۔ واقعی اس نے شادی سے انکار کر دیا تھا، تمہیں خبر ہے وہ اب کہاں ہے اور وہ ڈاکٹر  
 بارون۔ کیا وہ اتنے اچھے ہیں کہ....."  
 "آپ مان کیوں نہیں رہے امین واسٹی کی جوڑی یہاں سے اتنی بھی دور نہیں، آپ جا کر ان سے تصدیق کر  
 سکتے ہیں۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں، بیگم صاحبہ نے آپ کے بھائی کے لیے بڑی کوشش کی اور بھائی  
 رشتے آئے۔ لیکن گوہر بی بی نے تو آج تک اپنی ناک کو ہاں میں نہیں بدلا۔ میاں صاحب بتا رہے تھے۔ شہیر  
 کے کانچ میں پڑ جاتی ہیں۔ بڑی کانچ ہیں، صغریٰ کہہ رہی تھیں دو دو ایم اے کر لے کوئی آسان بات نہیں آپ کو  
 کھو کر وہ اور کرتیں بھی کیا۔"  
 شہیر تو کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں ماضی گھوم رہا تھا۔ ایک ایک لمحے کی تفصیل کے ساتھ در  
 اذیت کے سارے لمحے ناکامی کے سارے کانٹے مانتے تھے جوڑی میں آج تک اتر رہے تھے۔ اور اب لگ  
 رہا تھا کسی کے ترم و مہربان ہاتھوں نے وہ کانٹے بڑی سہولت سے کھینچ نکالے ہیں۔ ہمارے سدا بہار زم آئینہ  
 پلما میں اچھے ہو گئے۔  
 "آپ فخرت کرنے والوں کو جدائی کی سزا دیتے پیار کرنے والوں کو تو نہیں۔ خوشیوں سے منہ موڑ کر ہونا  
 جانے والوں کا انتظار کرنا بہت مشکل ہے، بھیا۔"  
 "م۔ میں..... ابھی ان کے ہاں جا رہا ہوں ابھی۔ راستہ تو وہی ہو گا۔"  
 "ہاں ہاں۔ مگر..... اب تو رات خاصی ہو چکی ہے۔"



دیا۔ کیونکہ میں ہر معاملے میں سچائی اور ایمانداری کا قائل ہوں۔ دونوں ضمیر کی ملامت کی زد میں رہا۔ بلکہ سالوں اس سامنے کا دکھ مجھے گھیرے رہا۔ پھر مایوں کی موت نے بھی ہم سب سے سارے اچھے احساس چھین لے لیے تھے۔ آج سے تین سال قبل فسطیہ بخاری سے میری ملاقات ہوئی۔ ایک بار کی ملاقات نے بار بار ملنے پر اکسایا۔ گوہر کو صرف پسند کیا تھا میں نے مگر فسطیہ سے مجھے گہری نگاہوں سے جذبے و ذوق کی طرف ایک جیسے ہیں ایک سال قبل ہی یہ شادی ہو چکی ہوئی۔ اگر بابا جان کی وفات کا سامنا پیش نہ آتا۔ ماں جی کی طبیعت اب کچھ سنبھال رہی ہے۔ میں چاہتا تھا کسی مناسب وقت ان سے ذکر کر کے انہیں فسطیہ کے ہاں لے جاؤں۔ کہ سچ میں آپ کی بات آگئی۔ میں اس بار بھی آپ کی راہ سے بہت جاؤں یا حقیقت آپ تک پہنچاؤں، یہی پوچھنے ماں جی کے پاس آیا تھا۔

فسطیہ کا فیصلہ یہی ہے کہ آپ کو ہر بات بتا دی جائے۔ شاید ساری لڑکیاں اتنی ہی صاف گوہر ہوتی ہوں گی یا یہی دو لڑکیاں جو کسی نہ کسی طور ہم دونوں سے متعلق ہیں ایسی سچی اور کھری ہیں۔ میں شاید آپ کی راہ سے بہت جانے کا فیصلہ کر بھی چکا ہوتا اپنے خاندان کی گردن پر لہرے نہ یاد تھیں کہ جو جہان مارنے کی خاطر اگر میں نے آج گوہر کو نہ دیکھا ہوتا۔ وہ فسطیہ کی کوئی ایک ہے۔ میں تمہیں جانتا تھا کہ آپ کہاں ہیں میں نے تو قرض کر لیا تھا کہ روایتی کہانیوں کی طرح آپ کی کہانی بھی ملاپ کے نقطے پر پہنچ چکی ہوگی۔ لیکن فسطیہ نے بتایا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے جب اس نے آپ کے بارے میں مجھے بتایا تو میں حیران رہ گیا۔ شبیر عسکری انہیں اس لڑکی کی عظمتوں کے آگے جھک گیا ہوں۔ وہ بہت عقیم ہے مگر آپ بتائیے آپ نے اسے کس جرم کی سزا دی؟ اور اسے چھوڑ کر وہ میری لڑکی کو کیوں منتخب کر لیا۔ بخدا یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ فسطیہ میری ذات سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر ہارون کو زندگی میں کسی کو کچھ دے کے لطف آیا ہے چھین کے نہیں۔ آپ اب بھی چاہیں تو میں اپنی زندگی کی اس آخری خوشی سے دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔ میں نے اب تک فسطیہ کو بھی یہ نہیں بتایا کہ آپ میں اور گوہر میں کیا رشتہ ہے۔ مگر... شبیر عسکری کسی کے انتظار کا اتنا لالچ حاصل نہیں ہونا چاہیے۔ کاش آپ میرے تصور میں در آنے کی طاقت رکھتے ہوتے۔ میری آنکھوں میں مخلوط وہ منظر دیکھ سکتے جب وہ میرے سامنے آپ کی محبت کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کی ہزاروں خوبیوں کا ذکر کر رہی تھی۔ آپ نے اسے کیوں بھلا دیا شبیر آخر کیوں؟ اگر آپ اس خضر کی خوش دہہ مجھے سمجھا سکیں تو میں اس بات کے لیے بکوش تیار ہو جاؤں گا کہ آپ اسے چھوڑ کر فسطیہ سے اپنا گھر آ جا کر رہیں۔“

”بس کریں ڈاکٹر ہارون! میں تم احساس دلائیں مجھے۔ میرے ارد گرد ہاتھ تڑاؤ اور لوگ ہیں کہ میں ہونا لگنے لگا ہوں خود کو کسی۔ لیکن مائی ڈیئر گریٹ ڈاکٹر ہارون! اس میں تصور میرا نہیں۔ حالات کے اتنی بھنور کا ہے۔ ہم سب اپنے حالات کے گرد اب میں پھنسے رہے۔ وقت تو اب بھی ہم سے کھیل کھیلتا جا رہا تھا۔ ہم سب تڑپتے رہتے اور وقت تماش بین بنا رہتا۔ میں آج عبد اللہ پور نہ آتا تو کل آپ کے ہاسپٹل آپ... بھگڑا کرنے آپ کو بھنچھوڑنے ضرور آتا۔ کل تک میں گوہر کو آپ کی بیوی سمجھتا رہا مجھے تو سخت غصہ اور دکھ تھا کہ گھر میں بیوی کے ہوتے ہوئے آپ فسطیہ کو بے وقوف بنا رہے تھے۔“

”لا حول ولا... ڈاکٹر ہارون ایک دم ہنسے۔  
”کل ہی مسز نیل پر دانی کا ٹھکانا آیا تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں انہیں وہ گوہر کی بیوی لیکن ہیں۔ سخت پریشان تھیں۔ گوہر کی طرف سے کہا چنانچہ ہی وہ شادی کے لیے تیار ہو گئی ہے۔ جبکہ انہیں یقین تھا کہ وہ آپ...“

غلا وہ کسی کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتی۔“

”کس کے ساتھ شادی کے لیے؟“ شبیر نے بے اختیار پوچھا۔

”معلم نہیں۔ لیکن میں اتنا ضرور جان گیا ہوں کہ چونکہ فسطیہ اور وہ ایک ہی کالج میں ہیں۔ پچھلے دنوں فسطیہ نے اپنی برتھ ڈے پارٹی میں سب کو بلایا تھا... وہاں آپ کے گھر والے بھی تھے۔ یقیناً انہوں نے آپ کی فسطیہ سے بھجوزہ شادی کا ذکر کیا ہوگا اور گوہر مارے رنج اور صدمے کے انتہا اس بات کے لیے تیار ہو گئی ہوں گی۔“

”آف کورس! یہ ساری بات یقیناً اسی طرح ہی ہو گئی لیکن اب کیا ہوگا۔ کہیں پھر کوئی شادی تو طے نہیں ہو گی...“

”کیا خبر؟ کل کی بات تو ہے۔ بات اتنی جلدی تو نہیں طے ہو سکتی۔“

”ڈاکٹر ہارون! اگر میں آپ سے سن لیا تو جانے کن کن باتوں سے لاعلم رہتا۔ ایک دن آپ نے مجھے مایوں کی جگہ وی بھی آج میں آپ کو بڑا بھائی کہہ رہا ہوں، ہم لڑکیوں کی کہانیوں کو دفن کر کے محبتوں کی دنیا آباد کر رہا ہوں ڈاکٹر ہارون ارشٹوں کی مالٹوں جھانے تو انسان کھر جاتے ہیں۔ شبیر ابھی چند دن کا تھا کہ اپنی ماں سے چھڑ گیا۔ رشتوں سے چھڑتے بندہ بے اعتبار سا ہو جاتا ہے۔ بہت سی محبتیں مل کے بھی مجھے نہ سنبھال سکیں۔ شاید یہ ساری زبانی میری سے شاید میں ہی نا سمجھ ہوں۔ ہم سب لوگ جو ساوہ ول بھی ہوتے ہیں اور انسان دوست بھی شاید اس لیے کام ہو جاتے ہیں کہ ہمیں زندگی سے نباہ کرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ ہم اپنے آپ کو کچھ خود ظاہر نہیں کر پاتے۔ آپ بھی میرے پاپا سے ملے ہیں۔“

”ڈاکٹر ملتا ہوں جگہ اب بھی آتے ہوئے مل کر آیا ہوں۔ آپ کو خبر نہیں کتنی تفریقوں کے داغ محبتوں نے دھو دیے ہیں۔ بابا جان کے مرنے پر ہماری بھونگی کے لیے آپ کے پاپا سب سے آگے آگے تھے۔ وہ میرے مہربان اور شفقت بزرگ ہیں۔“

”ہاں شبیر! یہ ان قربانیوں کا صلہ ہے جو آپ نے: میں اچھائی کا پھل ملتا ہے مگر میرا بعد۔ یہ علاقہ آپ کو ترقی یافتہ لگا ہے۔ یہ آپ کے پاپا کی محنت سے۔ سن نے ان سے اتنا ہون کیا ہے۔ اب یہاں کے لوگوں کو تعلیم بخاری اور دوسری اہم ترقی ضرورتوں کے لیے شہر نہیں جانا پڑتا۔ صنعتی ترقی نے لوگوں کو روزگار فراہم کر دیا ہے۔ یوں پختہ پکسٹائل ملز، اسٹیل اور عسکری ٹیمپل کے اتحاد و محبت کا نشان ہے۔ آپ کے پاپا ایک ایک بات میں آپ کا ذکر کرتے ہیں انہوں نے ہی مجھے بتایا کہ ابھی آپ انتہائی نوسرتھے جب مزدوروں کے حقوق کے لیے پاپا سے اٹھ گئے تھے ہم نے اپنی بڑائی پالیسی بناتے ہوئے آپ کی خواہشوں کو مد نظر رکھا کل آپ مل میں داخل ہوں گے تو جان جائیں گے کہ آجروا جبر: ذوں ایسی ذوقی زندگی بسر کر رہے ہیں۔“ ڈاکٹر ہارون شہنشاہ لہجے میں بولے۔

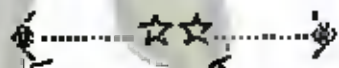
”ڈاکٹر صاحب!...  
”کیونکہ شبیر! بہت مدت لیا تکلف۔ تم خود ذوقی بن لے مایوں سمجھتے ہو اور پھر بھی مجھے ڈاکٹر ہارون ڈاکٹر صاحب کہتے ہو اور مجھے دیکھو تمہیں چھوڑ بھائی مجھ کو۔ ابھی آپ جناب کے جا رہا ہوں بے وقوف کہیں گا۔“  
دائیں ایک ساتھ ہنس رہے اور بے اختیار ایک دوسرے سے لپٹ گئے دھڑکنوں نے دھڑکنوں کو بہت کچھ سمجھا



وہ اسے شب بخیر نہ کہ اپنے بیروم کی طرف چلے گئے۔  
اندھیرے تو خوفناک ہوتے ہی ہیں ابھی کبھار روشنیاں بھی کچھ کم جان لیوا نہیں ہوا کرتیں۔ ہارون احمد چلے گئے لیکن وہ سب سو سکا۔ راتیں تو شاید آج ہی جوش میں آئی تھیں۔ وہ پورے کا پورا بھیگا ہوا تھا صحبتوں کی پھاڑوں پرستی ہارٹ میں امر شاد تھا اس لئے سن۔

یہ چاہا گیا تھا۔ چاہت کی آخری حدوں تک کسی کے لیے اہم ترین اہلیان تھا کسی کی زندگی کی بنیاد تھا کتنا معتد تھا انتہا ہم۔۔۔۔۔ کسی کے دل میں جدائی کے ایام میں بھی آ پورا رہتا۔ یہ باتیں کوئی معمولی تو نہ تھیں۔  
اب وہ از کر پہنچنا چاہ رہا تھا۔ اپنی کائنات اپنی گوہر کے پاس۔ لیکن مجبور ہی تھی۔ یہ مجبور ہی حسین تھی۔ ہارون احمد نے بذریعہ پاریسی پابندی لگا دی تھی۔ نہ دیکھتے اور نہ سننے کی۔ وہ ادا کرتا کرتا۔ وہ اس کے ہاتھ ہو کر خدا کے حضور مر رہے دہر گیا۔ اشکوں کے دریا بہانے لگا۔

”اب خدا۔۔۔ خدا۔ تو اتنا مہربان بھی ہے اتنا رحم بھی ہے۔ یہ کیا کیا دے دیا ہے تو نے۔ میرا لگ دامن جسے سینے سے قاصر ہے۔ میں تو یہ یقین کر لینے سے بھی قاصر ہوں کہ چند روز بعد میرے لیے خواب پارینہ بن جانے والی گوہر میرے ہمراہ ہوگی اسے خدا بخیرے یقین دے دے۔ اپنے مستحرم ہونے کا احساس ہی پیچھے کر دے۔“



اس بے خوابی کا۔۔۔ اس جہد ریزی کا۔۔۔ اس انگلیاری کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ کتنا تازہ دم تھا وہ۔۔۔۔۔ کہ رات جینے کا احساس تک پاس نہ تھا۔ کیسے آنسو تھے تھے یہ۔ گویا حیات پرور موتی جو پیش قیمت بلکہ نایاب ہوتے ہیں۔ آنکھوں میں چہن چہن نہ ملن۔ کیسا طویل جہد تھا یہ۔

اب دل میں درد نہیں بس شکر گزاری کے حسین احساس سے تھے۔ ناز دم کیسے نہ بہتا۔ منزل پانینے پر سفر کی صبر نہیں یوں بھول جاتی ہیں گویا کوئی تکلیف اٹھائی ہی نہیں۔ پر خار راہوں پر چلنے کے پاؤں نگار ہوئے ہی نہیں۔ خون ہل آنسوؤں میں بہا ہی نہیں اور اب تو ویسے بھی اسے یوں لگ رہا تھا کہ جد کا تک نظر آنے والی بھول جواس کی زندگی کو بے رونق کیے ہوئے تھی۔ ان آنسوؤں سے دھن رسی تھی۔ محبت کے شجر کی جو خزاں کے بعد نئے برگ و ثمر سے بار آور ہونے چلا تھا۔ آبیاری ہو رہی تھی۔

چائے سوچتے اپنے بٹے رات بیت گئی۔ سب کا اجالا ہوا۔ ملازم شہیر کے لیے بیڈٹی ملے آیا۔  
”صاحب کیاں ہیں؟“ وہ پوچھے بنا نہ رو سکا۔  
”سو نہ ہے ہیں جناب۔ آپ کس تو۔۔۔“

”نہیں نہیں! نہیں سب جتنا جب بیدار ہوں تو بتا دینا۔ میں ان کا انتظار کر رہا ہوں۔“  
”ٹھیک ہے جناب۔“

چائے پی کر وہ باہر نکل آیا۔ طلوع ہوتے سے وہ صبح اور چمکنا نہ کرنوں نے خوشدلی کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ پانچیم ہارٹ میں آ کر اس نے گہری گہری سانسوں میں ماحول کی ساری خوشگوار باس اپنے اندر اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے اس جہان کو ایک نئی نگاہ سے دیکھا۔

یہ دنیا تو اتنی بے حد خوبصورت جگہ کا نام تھا۔ وہ مسکرایا۔ سوچوں کے افق پر سفر کرتا وہ مسلسل بھلا ہی رہا۔ اسے کیا کرنا ہے؟ کہاں سے شروع کرنا ہے؟ کیسے کرنا ہے؟ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ جانا چاہتا تھا اپنے

”کیا خیال ہے اب ماں جی سے مشورہ لینے کی ضرورت ہے۔“ ہارون احمد نے پوچھا۔  
”نہیں صرف انہیں یہ بتانے کی کہ انہیں شہر چلنا ہے۔ دو بیٹوں کی خوشی سلیپر یٹ کرنے کے لیے اور یہ بات صبح بھی کہی جاسکتی ہے۔“  
”دعوتِ نقل۔“ وہ پھر بیٹھے۔

وہ کتنی دیر ایک دوسرے سے حال دن کہتے اور سنتے رہے۔

”ہارون بھائی! یہ جو ایک گھنٹے سے آپ مجھ سے افسانہ فایح و بہبود پر باتیں کیے جا رہے ہیں۔ یہ میرے لیے بے مقصد ہیں۔ اس وقت آپ کو صرف ایک انسان کی فلاح کی بات کرنی چاہیے جس کا نام شہیر مسکری ہے اور جو بے چارے اتنے طویل سالوں سے اپنی ذات کی بھول بھلیوں میں غرق حقیقی خوشیوں سے بہت دور ہے۔“

”ظاہر ہے تمہاری بات ہوگی تو ہمارا ذکر بھی چلے گا جو تمہارے گھن کی طرح خراب تھا وہ ہی ساتھ ساتھ پس رہے ہیں۔“ شہیر پھر ہنس دیا۔ وہ دونوں سوئے ہی نہیں۔ کتنے گھننے ماضی حال اور مستقبل میں تاک جھانک کرتے رہے۔

”ہارون بھائی! ہر بات اپنی جگہ۔ گوہر کا غصہ کیسے دور ہوگا۔ کیا وہ راضی ہو جائے گی؟“

”مزہ اسی میں ہے کہ وہ کتنا ہی رہے۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے احمقانہ طریقے سے کہا۔

”بلکہ بے خبر ہی رہے۔“

”یعنی؟“ اب وہ خاصا۔۔۔۔۔ بوٹکا لگ رہا تھا۔

”جی ہاں اس بات سے کہ اس کی شادی تم سے ہو رہی ہے۔“

”مگر یہ کیسے ممکن ہے؟“

”یہ میں جانتا ہوں۔“ وہ قفاخر سے مسکرائے۔

”لیکن۔۔۔۔۔“

”لیکن لیکن کیا۔ اس کے علاوہ ہر شخص کو اس کی خبر ہوگی۔ ہم سیکر سی کا خیال رکھیں گے۔ مرکل کو مضبوط رکھیں گے۔ خیر اس تک پہنچ ہی نہ پائے گی۔ بار بار کچھ تو ایڈوٹر ہونا چاہیے کچھ تو نطف ہونا چاہیے اور ابھی تمہارے ذمے بہت سے کام ہیں۔ تو تم اپنی انکسٹن کمپن میں ہی مصروف رہو تو بہتر ہے۔ یہ بڑا بھائی کس لیے ہے سب طے کرے گا۔ تم صرف اتنا کرو سچ مجھے جمال احمد صاحب اور گی سے ملا دو۔ حدی اور انکھا۔ صاحب سے متعارف کروادو خدا نے ہم سب کو رشتوں کے عجیب و غریب بندھن میں پاندہ پایا ہے تاکہ یہ سارے لوگ جو ایک دوسرے سے نا آشنا اور دور ہیں ایک ہو جائیں۔“

”جانتا ہوں آپ ان سب سے نہیں گے تاکہ۔“

”تاکہ اپنی شادی کی بات طے کر لوں۔ ہرگز نہیں یا۔ ہمارا پہلا کام یہ ہوگا کہ ہم انکل شاہنواز اور جمال احمد صاحب کو ایک کریں۔ میں جانتا ہوں یہ وہاں تمہارے لیے ناکریم ہیں یہ دو کا نیاں ہیں یہ پہلے ہی ایک ہو جاتیں تو تم اس منزل پر نہ ہوتے۔ ان کا جدار بنانا ہی آزمائش نے آیا۔ میرا خیال ہے رات آدھو سے زیادہ بیٹھی ہے۔ اب سو جاتے ہیں صبح ہوتے ہی انکس کی طرف چلیں گے۔“





نسی ٹھنڈی چھانوں کے بغیر حوادث کی جلتی بھوپ میں گزار دی تھی۔ سو اس دار کو بھی سہانیا۔ مگر پایا.....  
 "میں بھٹکا دیا گیا تھا شہی۔ بڑا دیا گیا تھا۔ میرے بیٹے دراصل میں ایک بڑول انسان تھا۔ میں نے زندگی میں کوئی فیصلہ اپنی ذات کے سہارے نہیں کیا۔ سوائے تہناری ماں کے ساتھ شادی کے فیصلے کے جس جو پایا حضور نے کہا جو والدہ صاحبہ نے کہا۔ جو دنیا والوں نے تجویز کیا۔ وہ سب میں ماننا رہا۔ جہاں نہیں بھی تجویز اس فیصلہ خود سے کیا تجویز سے غر سے میں اسے منسوخ کر دیا۔ تمہیں خبر نہیں میں نے تم سے چھڑ کر کتنے دکھ پائے کتنی تکلیفیں اٹھائیں۔ وہ گھر میرے لیے قید خانہ بنا کر رکھ گیا ہے۔ وہاں جا تا ہوں تو گھبرانے لگتا ہوں۔ وہاں ایک خطرناک عورت مجھے کسی بے رحم جلا جیسی نظر آتی ہے۔ میری خوشیوں کی قاتل..... یہ سب کیا دعوا اسی کا تھا۔ بیٹے ہیں یا بیٹیاں اپنی ماں کی طرح مجھے ایک مشین سمجھتے لگے ہیں۔ پیسہ بنانے کی مشین۔ ان کا اور میرا تعلق اسی بنیاد پر ہے۔ تمہا یہاں ہونا چند دنوں میں دو چار دن کے لیے دفاتر میں کام کرنے کے سلسلے میں شہر جانا ہوں تو وہاں رہ لیتا ہوں۔ مگر یوں جیسے کسی غیر کے گھر میں کوئی غیر قیام پذیر ہوتا ہے۔ وہاں رشتے نہیں رکھیں بھڑک رہی ہیں۔ سعیدہ نے ساری عمر فیصلے خود کیے ہیں۔ وہ اب بھی ایسا ہی کرتی ہے۔ تمہاری زندگی بہر سے بیاہ کرنے کی وہ پوری نہ ہوئی تو وہ ملک چھوڑ گیا۔ سنا ہے اس نے کسی بڑی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ منہ نے تعلیم بھی مکمل نہیں کی۔ دن رات سڑکوں پر گاڑی بھگائے پھرنا آوارہ دوستوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کانا میں دہشت گرد گروپ کی لیڈری کرنا اور تعلق لڑکیوں کے ہمراہ عیش و نشاط کی زندگی بسر کرنا اس کے مشغول ہیں۔ بیٹیاں خود بخار ہیں۔

ارم نے ایک لڑکے کو پسند کر لیا۔ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے شادی کا فیصلہ کرنے کے بعد ہمیں مطلع کر دیا۔ شہزادہ بھی اس لڑکے کا نام ہے۔ بچا چلا ہے کہ تا جائزہ ذرا رخ سے آئی ہوئی دولت نے ان لوگوں کا اندازہ زندگی بدل دیا ہے۔ گود شہر کے امیر ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن اس لڑکے کا کہنا انتہائی خراب ہے۔ شاید وہ ہر وقت کا بہت بڑا تنگ ہے۔ حکومت کوئی کیسوں میں مطلوب ہے۔ اسی سبب ملک سے باہر رہتا ہے۔ بس ایک شازہ یہ ہے۔ برسوں پہلے تعلیم کے سلسلے میں گھر چھوڑا تو اب تک باہر تکیب ایئر فورس میں ایروڈیٹل انجینئر ہے۔ آج کل سرگودھا میں ہے۔ گھر میں ماں اور بیٹی اور ایک آوارہ منس بنا رہتے ہیں۔ اور ان تینوں کی بھی آپس میں نہیں ملتی۔ میں یہاں ہوں۔ ان غریب لوگوں کے رحم ہاں کر رہے جنہیں میں نے بھی بھی اتنا اہم نہیں جانتا تھا۔ میرے کھانے پینے کا آرام کا میرے لباس کا میرے دیکھ لکھ وہی سب خیال رکھتے ہیں۔ راتوں اور صغریٰ میرے لیے بیٹیوں سے بڑھ کر ہیں۔ میں دن کے سارے دن میں گزار دیتا ہوں۔ شام کو آ کر جوڑی کے سناٹوں کا سا بھی بن جاتا ہوں۔ فی وی پروگراموں میں نماز پڑھنے میں وقت کٹ جاتا ہے۔ صبح ہوتی ہے شام ہو جاتی ہے اور دن سوکھے پتوں کی طرح زندگی کے شجر سے چلے جاتے ہیں۔

"اب آپ تمہا نہیں رہیں گے پاپا اب میرے ساتھ رہیں گے میرے گھر میں۔" شہزادہ کا دل کٹ گیا۔  
 اپنے پاپا کے دکھوں پر۔  
 "یہ گھر بھی تو تمہارا ہے بیٹے۔ یاد ہے تمہیں۔"  
 "جی ہاں یاد ہے مجھے..... یہ گھر آپ نے میری ضد پر میری ضرورت کی خاطر بنایا تھا۔ مجھے..... یاد ہے پاپا محبت کے دو سارے پل جو آپ نے مجھے دیے۔ آپ تو وہ بھی نہ دیتے تب بھی میں اپنے ذرا شہزادہ

فاخر شہزادہ ہسکتا تھا۔ کچھ نہیں نہ..... ان آپ میرے باپ تو ہیں نا..... میرے اپنے....."  
 شہزادہ نے ایک بار پھر اسے سینے میں چھپانے کی سعی کی۔

"بیٹے..... باروں بیٹے نے مجھ سے کچھ پتہ نہ لیا ہے۔ عاصم حسنین کے آگے جھولی پھیلا کر گورہ کو مانگنے کے لیے میں خود جاؤں گا۔ جمال احمد میرے ساتھ ہوں گے۔ اس خاندان کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ وہ نہ ہونے تو میرا معمول ہے۔ جیسا بیٹا دنیا کی تم کاریوں کا شکار ہو جاتا۔ مجھے ابھی ان کے پاس لے چلے باروں بیٹے تم اپنی والدہ سے کوئی تارنی نہیں۔ ایک اور نیک کام بھی سر انجام دینا ہے ہمیں۔ جمال احمد سے ملاقات ایک پتھہ دوکان والے سلسلے میں دینی۔ لوگ احسانوں کے بدلے میں کچھ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم ان سے اور بھی کچھ مانگ لیں گے۔" وہ محسوسیت کے ساتھ ہنس دیا۔

دو تین گاڑیاں ایک ماتھے شہیر کے گھر کے پورچ میں کھڑی تھیں اور وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں خوشی اور مسرت کے قلعے بیگم و اسٹیٹ شہزادہ عسکری اور باروں احمد کی آمد کے ساتھ پڑاؤ ڈال چکے تھے۔ وہاں زبردست محفل چل رہی تھی۔ مکی لایڈی فسطیہ کی والدہ سدرہ پاپا انکار بھائی سب ایک ساتھ براجمان تھے۔ برسوں میں جو کہنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ سب ایک دوسرے سے کہا جا رہا تھا۔ کچن میں ایک ہنگامہ سا کھڑا ہو رہا تھا۔ مکی ابھی زبردست لہجے کا کچھ کہتی تھیں۔ ماورا اور فسطیہ نے خاندان کے سر پر کھڑے ہو کر کھانا بنانے کی شان کر اس کا ناظرہ بنا کر رکھا تھا۔ اب بھی وہیں موجود تھیں۔

شہیر نے جو صبح جاسنے کی ایک بیانی ہی سکا تھا۔ تمہارے بہت ناشتے کی غرض سے کچن پورخ کیا۔ دروازے میں فسطیہ کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر شہیر کو اپنی کل والی منگوا دیا۔ آئی۔ وہ مسکرا دیا۔  
 "پولو..... آپ کوکل مجھ سے کچھ کہنا تھا۔ آئی ایم سوری فسطیہ میں....." وہ تمہارا نام بھی تھا اپنی بدتمیزی پڑا ہٹ مکمل نہ کر سکا۔

"نیو ماہیڈ شہیر عسکری..... میں..... میں جو کہنا چاہتی تھی وہ آپ نے میرے بغیر کہے جان لیا۔ مبارک ہو آپ کو اپنا اور اپنے پاپا کا کہنا۔"  
 "اور آپ کو ذرا بار بار ان کی اس گھر میں آئیں..... فسطیہ بھنڈا میں....."  
 "میں نے کہا نا شہیر..... کتنی ضرورت نہیں۔ آپ نے جو کیا آپ اس میں حق بجانب تھے۔ ویسے آپ نے زیادتی کی۔ ان دو سالوں میں میں اور کوہر عسکری ساتھ ساتھ رہے۔ مجھے خبر ہوتی تو یہ سب دو سال قبل ہی آ جاتے۔"

"آپ اس کی کوئی جگہ دوست تھیں۔ کیا وہ آپ کو اپنے دل کی اتنی ہی بات بھی نہ بتا سکی۔" اس نے فسطیہ کو اجازت دیا۔  
 "نہیں شہیر وہ بہت گہری لڑکی ہے۔ از حد تجید اور لڑکی نل۔ جب وہ سوری ساتھی پچھوڑنے ماورا وغیرہ سے تن لیا کہ میں میرا مطلب ہے میری آپ سے شادی نہ کرنے والی ہے تو انہوں نے آفس میں بیٹھ کر چیخوڑا۔ مجال ہے جو گورہ کے چہرے پر کوئی رنگ آیا نہ۔ کس سے بھی کچھوڑا ہر ہوا ہو۔ دوسرے دن خان بابا نے ہارے کالج کا چہ کیدار ہے مجھے بتانا کہ میں اب کتنی ہی کے بعد بھی کچھ کالج میں رہی تھیں۔ اسے یقیناً شہیر نے صدمہ پہنچایا تھا۔ آئی ایم سوری شہیر میں نے بھی آپ کو بتایا نہیں۔ میں نے اس گھر کی تصویر میں اکر آپ کے خاندان کے سارے لوگوں کو بلوائی نہیں۔ ہم آپ کا سامن سیٹ کر رہے تھے۔ نوٹ بک دیکھ





# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)

"میں آپ سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں، صرف کچھ نہیں۔" وہ ہنس دیا۔

"بلکہ آپ کے آپ سے یہ درخواست میں نہیں جمال بھائی کریں گے۔"

"کیوں نہیں؟ کیوں نہیں بلکہ عام صاحب میں تو آپ سے بھیک بھی مانگنے کو تیار ہوں۔ مگر گڑا کر۔" وہ ہنس کر بیٹھے۔

"مگر انکل! اسے بھی کم خیال کریں تو ہم سب کورس میں یہ لہجہ کرنے کو تیار ہیں کہ وہ ہمارے بھائی کو اپنی قرز دہی میں قبول فرمائیں۔" عدوی نے شہابی بھرے لہجے میں کہا۔ پاس بیٹھے بارون احمد مسکرایا۔

"وائے ناٹ۔" عاصم حسنین مسکراتے رہے پھر یہ لے۔

"میرا غریب خانہ اتنی بھی بری جگہ نہیں ہے کہ آپ سب حضرات وہاں قدم رنجیدہ فرمائیں۔ ویسے شاہنواز میاں۔ رسموں کے تقاضوں کی ضرورت ہے نہ سناؤں..... میں اتنا بھی ناگوار نہیں ہوں کہ بار بار اپنے بچوں کی خوشیوں کی راہ میں دیوار بن کر محال ہوتا ہوں۔ یہ بات میں نے مدت ہوئی تسلیم کر لی تھی کہ یہ رشتہ انوث ہے۔ میں تو آپ کے احتیاط کو ایک نہت سے مان چکا ہوں۔ لیکن تجویز تعلق کے لیے آپ کا میرے گھر آنا لازمی ہے۔ بارون میاں کی شادی مقرر ہو چکی ہے۔ گوہر آپ کی امانت ہے جمال صاحب! آپ جب سنی چاہیں آ سکتے ہیں اپنی امانت دہا نہیں لینے کا تقاضا کر سکتے ہیں تاریخ لے سکتے ہیں۔"

"لیکن ایک پرائیم ہے انکل....." عدوی نے پھر دل دیا۔

"کیسا پرائیم؟ میرا گھر! شہر کے ایک حصے میں ہے بیٹا۔ کوئی مشکل نہیں ہوگی آنے میں۔" وہ ہنسے۔

"نہیں نہیں! یہ بات نہیں..... آپ کے گھر میں وہ بھی تو بہن گی۔"

"کیوں؟"

"وہی..... یعنی میری ہونے والی بھانجی۔"

"ہاں ہاں لازمی ہی بات ہے اس کا گھر جو ہوا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر..... مگر....."

"کیا مگر مگر نگار کبھی سے صاف صاف بات کر دو۔" جمال احمد نے حیار..... بھرے سخت لہجے میں کہا۔

"ڈیڈی..... یہ میری نہیں، بارون بھائی کی جوہر ہے۔"

"کیسی جوہر بارون میاں؟" عاصم حسنین نے پوچھا۔

"میں جانتا ہوں....." شاہنواز خوشدلی سے گویا ہوئے تو سب نے ان کی طرف دیکھا۔

"بچے چاہتے ہیں گوہر بیٹی کو چاند چلنے پائے۔"

"کیا مطلب بھائی جان! شادی ہو اور گوہر کو خیر نہ ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے؟" شاہنواز نے پوچھا۔

"بھئی وہ چاہتے ہیں گوہر کو یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ شادی شہر کے ساتھ ہو رہی ہے۔"

"او آئی سی....." کئی ایک نے ایک ساتھ کہا۔

نیل بر وائی نے تھپتاپے سسر کے ساتھ سر جوڑا۔

"گھر میں شہر عیلاہ والی بات چل رہی تھی..... ہم کہہ سکتے ہیں کہ....."

"نہیں بھئی نہیں۔ میری بیٹی کسی شرارت کی تحمل نہیں ہو سکے گی۔" عاصم حسنین نے زنجیرا کر کہا۔ یہاں تو.....

ہی شرارت پر آمادہ تھے۔

"ٹھیک اسٹریٹی یا باہا جان! زندگی میں خوشگوار پہلے خوشیاں ملن لاتے ہیں۔" سخت شہری اسرن تینوں نے عدوی اور بارون کی تائیدی۔

"گوہر کو یاتم سب لوگ میری بیٹی کے خلاف بھڑک رہے ہو۔"

"جی ہاں..... منضبوط منصوبہ بندی کے تحت۔" عدوی مسکرایا۔

"گھر ان لوگوں کی گھر میں آد....."

"باہا جان..... شادی میں بہرے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ گوہر کی کیا خبر ہوگی۔ ویسے بھی ہمارے ہاں کے رواج کے مطابق تو وہاں میرا خیالی ہے ایک کمرے تک ہی محدود ہوتی ہے اب عدوی لوگوں کے علاوہ سب کو ویسے بھی اس کی شادی میں شریک ہونا ہی ہے۔ چاہے وہ کسی سے بھی ہو اور وہ ہے دلہا صاحب تو ظاہر ہے وہ سب سے آڑ میں ہوں گے۔"

"نہیں انہیں سمجھا دیں گا۔ آپ کی تجویز پائیں گی جاتی ہے بارون احمد صاحب۔" نیل نے داماد ہونے کا فائدہ اٹھایا۔ عاصم چپ رہ گئے۔ وہ بائیں جانب گئے تاکہ شہر کو اپنے مہمانوں کا حسب دل خواہ استقبال کر سکیں۔ دلنواز اور شاہنواز وہاں وہیں رہ گئے۔

ایچانک ہی لوگ جوق در جوق مندر میں جمع ہونے لگے تو ہم ہر چونک اٹھا۔ ہر شخص کے چہرے پر سرتوں کے پھول کھلنے لگے تھے۔ اس دن گہرے جوہر سے ہات کرنے کے بعد کسی قسم کا احتیاط نہ کیا تھا لیکن غیر معمولی انتظامات اور چیل چیل نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بڑی حیران ہوئی۔ جب اس نے قسطیہ اور جوہر کو ایک ساتھ آتے دیکھا۔ قسطیہ کو دیکھ کر اس کے حیرے کا رنگ بدلا لیکن پھر اس نے خود پر قابو پایا اور مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھی۔ اس نے تو زندگی میں اس سے بھی بڑے حادثوں کا سامنا کیا تھا، مہر و ضابطہ کے ساتھ۔

"ہیلو گوہر....." قسطیہ نے ہاتھ ملانے کے بجائے اسے گلے لگا لیا تو وہ پھر حیران ہوئی۔ ان میں ایسے تعلقات تو کبھی مندھے تھے۔

"بیٹھے۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ قسطیہ بیٹھ گئی۔ جوہر آ پاؤر رنگ بھل کے سامنے کھڑی لہنا سیک اپ درست کر رہی تھیں۔ اوڈریشٹ روم کی طرف بڑھی۔

"آپا..... یہ سب تیاری آؤ، کس سلاطین ہیں؟" اس نے قریب جا کر سرگوشی کی۔

"خون بھی آفر کی اور اب پونجی، وہ کس سلاطین ہیں۔ اپنی وہ لوگ پیام لے کر آئے تھے ہات پکی کر گئے۔ آج شادی کی تاریخ مقرر کرنا ہے۔ سب ہیں تیار رہیں۔ دل لے لوگ۔"

گوہر چپ سی رہ گئی۔ جوہر نے کبھی سنی والی سب پتہ نہ دیا تھا۔

"اور یہ قسطیہ؟"

"میں نے بلایا ہے اسے۔"

"کیوں..... میرے خیال میں آپ یہ نہ....."

"تو یہ بھی کوئی بات ہے بھئی! وہ تیار رہیں، انہیں....." وہ بات ہے۔ یہ خوشی کا موقع ہے تم نے جو گمانہ چولا اتار بیچا ہے۔ انسان بنی ہو۔ شادی پر آمادہ ہونا۔ انہیں لے قسطیہ کو بلا لیا ہے۔ ابھی دلہا صاحب کی ہمیں آرائی ہیں گوہر۔ جب تم نے فیصلہ کیا تھا..... پر خوشی بھی سمجھا۔ ورنہ وہ لوگ سوچیں گے کہ تم سے



زبردستی ہو رہی ہے اور جاؤ فلسطینہ آئی ہے اس سے باتیں کرو۔ میں تو مہمانوں کو دیکھ کر گھبرانے لگی تھی۔

وہ حیران کی جو ہر کونک رہی تھی۔  
 ”کیا دیکھ رہی ہو؟“

”آپ کو..... آپ کی خوشی کو..... اس جلد بازی کو۔“

”غلط..... یہ تمہارا حکم تھا۔ میں نے تو صرف تعمیل کی ہے۔ وہی صاحب تک تمہارا پیام پہنچایا ہے۔ اس حقیقت سے آگاہ ہو کر وہ بے چارہ کھینچا چلا آیا ہے۔ اس کی خدانے من لیا ہے۔“ وہ باہر نکل گئی گوہر فلسطینہ کے پاس آگئی۔

”بڑی ہمتی ہیں..... آپ مس گوہر کالج میں اشاریہ بھی ذکر نہیں کیا۔ ایک ہم ہیں ہماری شادی کی اپنی سیدھی انواہ بھی اڑ جائے تو دن بھر کھینچ کر رہے کہ چلو وہ ہسٹوں کاجی اس میں خوش ہو رہا ہے تو ہونے دیا۔“

گوہر نے بڑی گہری نظروں پر ڈالی اور غصے سے احساس سمیت پاس بیٹھی۔

”یہ اچانک آپ کی شادی کھینچ آئی۔ ویسے بائی واو نے کون ہیں یہ صاحب؟“ گوہر کا سر جھک گیا۔  
 ”آپ آپ سے پوچھ لیجیے گا۔“

”سنائے بہت پرانی محبت کا کوئی معاملہ ہے آپ کی بھانجی کسی کو بتا رہی تھیں۔“ گوہر نے تڑپ کر ٹٹاہ اٹھائی۔

”میں نے تو یہ بھی سنایا ہے کہ عرصہ پہلے میں شادی کے دن آپ نے اٹھا کر دیا تھا۔ اسی محبت کی خاطر آپ نے ایک بہت اچھے انسان کو نکھرا دیا تھا۔ میں بھی جانتی ہوں، اکثر ہارون کو۔ بہت قاضی ڈاکٹر ہیں۔ میرا کہیں ان ہی کے پاس ہے ہارٹ کا۔“ فلسطینہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہارٹ کا کہیں..... خدا تو است آپ کے دل کو کیا ہے فلسطینہ؟“ گوہر گھبرا گئی۔

”کچھ نہیں..... بس خوشی کی کوئی کھلی خبر یا کچھ ہاتھوں سے نکلے لگتا ہے۔ یقین ماننے میں اپنی شادی کی خبر ہی لے لیجیے۔ جیسے ہی جوہر آپ نے فون کیا میں بے حال ہو گئی مارے خوشی کے۔ ارے میں تو پوچھ رہی تھی آپ تے شادی سے انکار کر دینا تھا کیوں؟ دیکھیے براست ماننے گا۔ شادی کے دن میں ان ذات شریف کو دیکھ تو لوں گی۔ لیکن آپ کی زبانی سن کر لطف آئے گا۔“

”جو آپ سمجھ رہی ہوں مس فلسطینہ یہ وہ بات نہیں ہے اور جو بات ہے وہ میری زندگی کی فاس غلطی تھی۔ یہ دیکھا اور اس کے ہاں ان ایثاروں کے قائل نہیں ہیں۔ یہاں ہر شخص اپنی خوشی کی خاطر جیتتا ہے۔ آپ پلیز اس ذکر کو ختم کر دیجیے۔ میرا عیلام حسن نام ہے ان کا یہ رشتہ آپ نے اور نیل بھائی نے تجویز کیا تھا۔ میں نے سوچا تبھی کہاں کر دی اور بس.....“

فلسطینہ مسکرائی۔

”بالکل میری طرح..... نا اور نامی نے تجویز دی اور میں نے ہاں کر دی۔ شبیر عسکری کے لیے۔“

گوہر کے چہرے کے رنگ بدلتے چلے گئے۔ وہ ایک۔ یہی بات تو یاد رکھنا چاہتی تھی اور وہی بات سامنے آگئی تھی۔ فلسطینہ کی صورت۔ فلسطینہ نے بھی بات کہنے کے لطف اٹھایا اور تیر خود ہی بات بدل دی۔

”سنائے وہ کوئی کزن تھے آپ کے..... جن سے آپ اپنی ٹیٹا..... پھر خاندانی اختلاف کے سبب بات ختم ہو گئی۔ گوہر وہ ڈاکٹر ہارون خاں سے بھلے بندے ہیں۔ ماری ناخانی تھی ان سے کیوں نہیں کی؟“

فلسطینہ تاک تاک کے نشانے لگا رہی تھی۔  
 ”شاید عمر کا وہ دور جذبات کا دور تھا۔ شعور کا دور اب آیا ہے۔“

”اور میرا عیلام کے بھانگ جاگ گئے ہیں۔ ویسے میں آپ کو بتاؤں میں بڑی نڈر لڑکی ہوں۔ کہاں ہوتا ہے وہ مکار شخص۔ خود خوشیوں میں گھرا ہوگا اور آپ..... آپ مجھے بتاویں تو سن اتے۔“

گوہر پھر اسے دیکھتی رہ گئی۔  
 ”میں نے تمہیں بتا دیا فلسطینہ کہ وہ کون ہے تو تمہارے چہرے پر اتنی یہ بہار نغزوں میں بدل جائے گی۔ میرے حوصلے کو اتنا مت آزماؤ۔ اس ذکر کو رہنے دو۔ تم میری دوست ہو، میں خدا سے دعا کروں گی کہ اس بے وقافتگی سے تم خوشیاں پاسکو۔ وہ تمہیں وہ سب دے سکے جو تمہارا حق بن جائے گا۔“

گوہر نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ ڈھیر سا رے قدموں کی آہٹ پر دونوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔  
 لڑکیاں جوتی در جوتی ان کی طرف چلی آ رہی تھیں۔ جن کی رہنمائی ماورا کز رہی تھی۔ یہ ساری اس کی سہیلیاں تھیں فلسطینہ نے حیران ہو کے ماورا کو دیکھا۔  
 ”تم کیسے آئیں؟“ وہ گھبرا گئی۔

”جیسے آپ آئی ہیں۔ ظاہر ہے کسی گاڑی میں بیٹھ کر..... کسی گاڑی میں بھی کیوں اپنے شبیر بھائی کے ساتھ۔“

”کہاں ہیں وہ؟“ فلسطینہ نے بے اختیار پوچھا۔

”آپ فکر نہ کریں، وہ چلے گئے ہیں۔ کام تھا انہیں۔ میں نے منت کی تھی کہ مجھے اور میری سہیلیوں کو چھوڑ دیں اور تھکا کہ میں اپنی.....“

فلسطینہ نے گوہر کی طرف دیکھا، وہ سر جھکا کر جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اس نے ماورا کو گھبرا اور نظروں سے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ اور بھی اگڑ گئی۔ اٹھلانے لگی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا.....؟ کیا مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ غلط نہیں ہیں نہ رہیں۔ وہ خوشی ہی کیا جس میں ماورا نہ ہو۔ انہوں نے خود ہی مجھ سے کہا تھا کہ میں۔“ فلسطینہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ اٹھی اور اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی نگرے سے باہر لے گئی۔

”کیا مصیبت ہے ماورا؟“

”آپ میرا بازو تو چھوڑیے..... قسم سے شبیر بھائی نے خود کہا ہے کہ میں گوہر ماری کو دیکھ آؤں اور انہیں ایک ایک بات بتاؤں۔“

”کیسی بات؟“

”یہی کہ وہ کافی ہیں یا گہری توٹی ہیں یا مہربانی۔ خوش ہیں یا ناخوش؟“

”مجھے خبر ہے تم سب کچھ بک ہو گئی اور اسے خبر ہو جائے گی۔“

”پلیز می فلسطینہ باجی مجھے ہارون بھائی نے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ میں جانتی ہوں کیا کہتا ہے اور کیا نہیں۔ آپ اطمینان رکھیے۔“







غفور بابا اپنی لاشی اور عینک سنبھالنے باہر آ گئے۔

”چلو میاں..... بس نکل ہی نہ جائے۔ میں چاہتا ہوں میاں صاحب کے شہر جانے سے قبل ہی میں کچھ جاؤں۔“

”واہ..... ایسی کون سی خفیہ میننگ ہے آپ کی؟ جس کی خبر میاں صاحب کو بھی نہیں ہونے دے رہے۔“

”ہے ایک ایسی بات..... برسوں اس خاندان کا تمک کھا پا ہے۔ حق ادا کرنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے تو تمہیں نہیں پڑ رہا کسی نکل۔ جندی کرو۔ باہر نکالو اپنی موٹر سائیکل میں نکل رہا ہوں باہر۔“ وہ جھالوں کی طرح تیز قدم اٹھاتے گئے۔ سلطان علی مسکراتا ہوا موٹر سائیکل تھمپتے لگا۔

اس نے انہیں بڑی احتیاط کے ساتھ بس اسٹینڈ تک پہنچایا اور بس میں ڈرائیور کے ساتھ وائی سیٹ پر بیٹھا کہ ڈرائیور کو انہیں ان کی مطلبہ جگہ اتارنے کا کہہ کر خود بس سے اتر کر اپنے اسکول کی طرف جانے کے لیے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔ گزرے سالوں نے سڑکوں کی صورت حال ہی بدل دی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف آبادی ہی آبادی نظر آ رہی تھی۔ کہیں کہیں کالونیاں کہیں بازار کہیں سرکاری دفاتر..... بس ایک گھنٹے میں شہر پہنچ سکی۔

”بابا..... تمہاری خاطر میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا ہے۔ اتر جاؤ شاہنواز صاحب کا گھر یہاں سے تھوڑے سے قاصدے پر ہے۔“ ڈرائیور نے سٹریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے غفور بابا کو مطلع کیا۔

”مہربانی بیٹا میں تو رخصتے کھانا بھرتا۔ مجھے راستہ بھی بتا دو۔ میں تو جانے کتنے برسوں سے شہر نہیں آیا اور شہر کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔“

ڈرائیور نے سمجھا دیا اور کئی کئی گھنٹوں کی کہ وہ بوزھے غفور بابا کو احتیاط کے ساتھ اتار دے۔

فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر غفور بابا نے ایک گہری سانس لی۔ ادھر ادھر دیکھا اور تھل پڑے۔

سورج کی چند دروشتی نے پرستے کو اپنے ہالے میں لے کر رکھا تھا۔ سڑک پر ٹریک رہاں وہاں تھی۔ سامنے چڑا ہے پر انہیں سڑک پار کرنا تھی۔ بائیں طرف اگلے مہذب پر پھر مڑنا تھا انہیں۔ بڑی دیر سے وہ خطرہ کھڑے تھے۔ کب دس کم جاو وہ سڑک پار کر سکیں۔ لیکن ایسا تب ممکن تھا۔ بریک اپنے مہول کے مطابق تھل رہی تھی اور اس دس کے عادی کسی نہ کسی طور سڑک پار کرنے کے اپنی منزل کی طرف جا رہے تھے کہ ایک گاڑی غفور بابا کے پاس آ کر رکھی۔ کسی نے جھٹ سے ہر اذہ کھولا۔

”ارے غفور بابا آپ..... الف مائی گا انہیں کوئی اور تہہ چلی آ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ..... یہ وہ تھی آپ ہیں یا آپ کا روپ، چارے کوئی اور.....“

شوخ آواز پر غفور بابا نے غور سے دیکھا انہیں پوچھا نہ پائے۔

”مجھے پہچانتا نہیں آپ نے؟ میں دارم اور..... بابا۔ ام شاہنواز۔“

”ارے بیٹا..... آپ؟“

”آپ کہاں پھر رہے ہیں؟ کیسے آئے؟“

”آپ اسی کے پاس آیا ہوں۔ بیٹم سا بے پائے۔ کب سے یہاں کھڑا ہوں سڑک پار کرنے کے لیے۔“

”آئیے..... آئیے بیٹھے گاڑی میں۔ یہاں تو شام تک پونہی کھڑے رہتے۔ پاپا کہاں ہیں؟ کیا آپ ان

میں دیکھ لوں گی میں چند دنوں کی بات ہے۔ پھر آئے اور وال کا بھاد پوچھوں گی تم سے۔ زیادہ ہی پھیل رہے ہو کچھ۔“

دونوں ہنس دینے عدی لاجواب ہو کر اور شہی آنے والے دنوں کا تصور لے کر۔

”فکر نہ کرو ڈریسٹر..... ہم عدی نہیں ہیں، جھک جانے والے۔ ہم تو جھکانے والوں میں سے ہیں۔ ہم کیا بھانپیں گے۔ ہم تو خود بھانگتوں کو قید کرنے والے ہیں عمر بھر کے لیے..... اور لطف یہ ہے کہ ڈریکے لاجھی نہیں ہیں نہ شکلا نہ عملا..... ہماری قید میں رہنے والے بھی ہم سے خوش رہتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو ابھی فون کر کے پوچھ لیجئے ان سے جو ہماری قید سے رہا ہو جانے کے تم میں آج کل آدھے ہو رہے ہیں۔“ شبیر نے بات کی تان و پیر توڑی اسی ذکر پر جو شاید اس کا پسندیدہ ترین موضوع تھا۔

”نصیب نصیب کی بات ہے جب خدا ہی کسی نا اہل کو سب کچھ عنایت کر دے تو پھر جھٹلے کڑھنے سے دوسروں کو کیا مل سکتا ہے۔ آپ جناب شبیر عسکری صاحب کہیے کہیے آپ سب کہہ سکتے ہیں۔ قدرت آپ پر مہربان جو ہے۔ پھر پھانڈ کے دے رہی ہے آج کل۔“

”ٹوڈاؤٹ.... ٹوڈاؤٹ۔“ شبیر نے ادب سے سر جھکا دیا۔

”چلو بچو..... تم لوگ اپنے بیڈروم میں محفل بھاؤ۔ ہمیں یہاں بیٹھ کر کچھ کام کرنا ہے۔ پھر کھانا بھی تیار ہونے والا ہے۔ عدی جاؤ دیکھو انہیں میں تمہارے ڈیڈی کے ساتھ کتنے لوگ ہیں۔ میں کھانا بھجواؤں۔ داپنا کام کروں۔“

”آپ کا کام ختم امی..... آپ بس مہمانوں کو دیکھ لیجیے۔ ان سے کپ شپ لیجیے۔ اور بس۔“ شبیر نے ان کے ہاتھ تمام لیے۔

”زندگی ہے تو کام ختم نہیں ہو سکتا۔ مرجائیں گے تو کسی کے کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ کسی پاتیں کرتے ہو۔ یہ خوب صورت ذمہ داری چھوڑنے کے لائق ہے بھلا۔ مائیں اسی دن کے انتظار میں تو بوڑھی نہیں ہوتیں اور تم مجھے منج کر رہے ہو۔ نہیں بھتی نہیں۔ جس کا کام اسی کو سناجیے۔ یہ مشورے تم کسی اور کو دینا۔ مجھ پر مہربانی کر۔ کرنے دو مجھے اپنے کام۔“

وہ خفا نظر آنے کی کوشش میں مسکراہٹ رکھے لگیں۔ شبیر نے ہاتھ جوڑ دیے۔ پھر انوار اور زینو کا تعارف کرایا ان سے اور خود عدی کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

☆☆☆☆☆☆

سلطان اسکول جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ صحتی تیار تھی۔ چادر ہاتھ میں لیے دروازے میں کھڑی تھی۔ ”صحتی..... یہ واہا کو کیا پڑی ہے شہر جاتے کی۔ کل انٹیشن کا دن ہے۔ آج ہر کوئی اپنے اپنے گھر پہنچنے کی فکر میں ہوگا۔ بسوں اور دیکھیں میں رش ہی رش ہوگا۔ میں نے کہا تو جھٹ خفا ہو گئے کہ میاں تم مجھے بس اسٹینڈ تک چھوڑنے سے گھبراتے ہو۔ نہ چلو میرے ساتھ خود ہی چلا جاؤں گا۔ آخر واہا کو جانا کہاں ہے؟ کون سے کام رکے ہوئے ہیں؟ شبیر میاں کی شادی میں تو ابھی کافی دن بڑے ہیں۔“

”میں نے تمہی پوچھا تھا بتاتے نہیں ہیں۔ میں خود ہی چلا جاؤں گی۔ تم انہیں چھوڑ آؤ۔ میں نے دشتابنا یا ہے ان کا کھا چکے ہوں گے۔“

سلطان شہی نے ٹخن میں کھڑی موٹر سائیکل کو کپڑا مار کر چکایا اور غفور بابا کو آواز دی۔

وہ ایسے لوگ ہیں جرم کیا کسی نے اور کھاتے میں کسی کے ڈال دیا گیا۔ وہ لڑکے بھیا سے ان کی گاڑی مانگ کے لے گئے تھے اور اس گاڑی میں بیٹھ کر وہ قتل اور ڈاکے کی واردات کرنے چلے گئے۔" نرم رونے لگی۔

"بیٹا..... میاں صاحب نے مجھے بتایا ہے سب کچھ ہی..... میں نے انہیں بھدمنت سمجھایا ہے، میری میاں کی بے سناسی کا نتیجہ دلانے کی کوشش کیا ہے۔ پردہ بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ پرچہ نٹ چکا ہے۔ جس میں میری میاں کی گاڑی کا نام شامل ہے تو میری عدالت اور پولیس کو مطلوب تو ہوں گے ہی۔ اب میری میاں کی بے گناہی عدالت میں ہی ثابت کی جاسکتی ہے۔ کسی اچھے وکیل کی مدد سے۔"

"آپ کے شہر کا شمار بھی تو شہر کے اچھے وکیلوں میں ہوتا ہے۔ سنا ہے انہوں نے وہ چار مقدمے جیت کر ہی اپنی قابلیت کا لوہا منڈایا ہے۔ مگر وہ تو شاید مستوں کا مقدمہ لڑ کے میری بھیا کو اس میں الجھا کر پھانسی کے تختے تک پہنچانے میں قانون کا ساتھ دینے لگے۔" نرم نے عجیب انداز میں کہا۔

"بیٹا..... آپ شہر میاں کے بارے میں بہت غلط سوچتی ہیں اور پھر میری میاں تو نہیں صرف ان کی گاڑی میں....."

وہ بڑے درد کے ساتھ مسکرا دی۔

"اکثر یہ گناہ ہی پکڑے جاتے ہیں آپ دیکھ لیجیے گا ایسا ہی ہوگا۔ وہ..... وہ....."

"نہیں نہیں نرم بیٹا..... ایسا ممکن نہیں۔ ویسے آپ نے کبھی شہر میاں کو جاننے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ایسے ہر گز نہیں۔"

گھر کا ٹیک آ گیا تھا۔ نرم نے گاڑی پورچ میں لا روٹی۔ اب وہ خاموش تھی۔

"آئیے بابا....." غفور بابا دروازہ کھول کر باہر آئے۔ مسعیدہ بیگم لان میں کبھی کبھی سے ایک پر سر بونے آتھیں بند کیے بیٹھی جانے لگی تھیں۔

"مما! ابھی ہیں آپ چلیے۔ میں آ رہی ہوں۔"

حیرت سے حیرت سے چلتے وہ مسعیدہ بیگم کے قریب آئے۔

"مسلم بیگم صاحب۔"

"غفور بابا تم....."

مسعیدہ بیگم نے گردن ادا پر اٹھائی اور غفور بابا کو دیکھتی رہ گئیں۔

"پالی بیگم صاحب میں۔"

"کو کیسے آتا ہوا۔ تمہارے میاں صاحب تو یہاں نہیں ہیں۔ تمہیں ان سے ہی کوئی کام ہوگا۔ و تو آج کل اپنے چہیتے بننے کے پاس ہوتے ہیں وہیں گئے ہوئے تم۔" مسعیدہ بیگم نے نہ بیٹھنے کو کہا نہ حالی پوچھا۔

"میں آپ کے پاس آیا تھا۔ آپ سے ملنے ہی۔"

"مجھ سے....." انہوں نے ابرو چڑھا کر اسے دیکھا۔

"تقی ہاں..... بات بڑی ہے منہ چھوٹا ہے لیکن پھر کبھی بیگم صاحب۔ میں نے تو اس گھر کو سدا اپنا سمجھا ہے۔ اس گھر کے مکے کھدنا مجھے اپنے ہی محسوس ہوئے ہیں۔"

"ارے آپ انجی ٹانگ کھڑے ہیں۔ بیٹھیے تو۔"

نرم بھی آگئی تھی! وہ ساتھ پڑنی کوئی نہ بنا۔ گئے۔

کے ساتھ نہیں آئے؟"

"نہیں۔ بلکہ ان سے چھپ کر آیا ہوں۔"

"کیوں..... کیا وہ منع کرتے؟"

"نہیں..... مگر میں نہیں چاہتا کہ انہیں میرے آنے کی خبر ہو۔" غفور بابا نرم کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

"انہیں خبر ہوئی بھی نہیں..... دو آج کل اپنی ہی دنیا میں گم ہیں۔"

"نئی دنیا؟ میں سمجھا نہیں پتی۔"

"موتوں سے گھڑا بیٹا جوئی گیا ہے انہیں۔ وہ تو گھر میں آتے ہی نہیں ہیں۔ اسی کے ہاں رہتے ہیں شہر آ کر اور آج تو بہت زیادہ معروف ہوں گے۔ کل ووٹ پڑیں گے نا۔"

"یہ خوشی کی بات ہے بیٹا۔ وہ صرف ان کا بیٹا ہی نہیں آپ کا بھائی بھی ہے۔"

"آپ کہہ رہے ہیں تا پاپا ایسا نہیں سمجھتے۔"

"کیسے نہیں سمجھتے؟"

"اگر ایسا سمجھتے تو..... تو....." وہ کچھ کہتے سے رک گئی۔

"چھوڑیے بابا..... یہ بتائیے آپ کیسے ہیں؟"

"اللہ کے کرم سے ٹھیک ہوں مگر بڑھا پاپا ہے نا..... ظاہر ہے وہ طاقت نہیں رہی۔ بس چلن پھر لیتا ہوں کھانا پیتا ہوں اور بچوں کی خوشیوں میں خوش رہتا ہوں اور آپ بیٹا؟"

"تمہارا کیا ہے غفور بابا..... بس جی رہے ہیں کہ جیتا ہی ہے۔ ورنہ گھر کسی قبرستان سے کم نہیں۔ کبھی کبھی تو گمان ہوتا ہے جیسے ہم سب مر گئے ہیں۔ ہماری خواجگاہیں ہمارا مدفن ہیں اور جسم ناشے۔"

"خدا نہ کرے بیٹا۔"

"اور کسی ہوتی ہیں لاشیں غفور بابا..... میری بیٹا کی بڑا ہادی اور ظہیر بھائی کی دوزی نے میری ماں کو نیم پاگل کر دیا ہے۔ سوچوں میں م..... آنکھوں میں دہرائی لیے وہ دن بھر اپنے کمرے میں بند رہتی ہیں۔ میں اس ماحول سے گھبرا کر کبھی کسی سبکی کے ہاں چلی جاتی ہوں اور دوسروں کی خوشیوں میں گم ہو کر وہی طور پر ہنس بول کر دل پر چھائی ادا سی دور کرنے کی ناکام کوشش کے بعد ٹوٹ آتی ہوں اور پھر سے گھر کی ویرانیوں کا حصہ بن جاتی ہوں۔ ویرانیاں تو اب بھی بڑھتی ہیں۔ جب سے کار چوری اور قتل کے شہین الزام کے تحت میری بیٹا کے دوستوں کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے ہیں۔ اب تو وہ گھر کا رخ بھی نہیں کر سکتے کہ ہمارے گھر کے ارد گرد۔"

پولیس موجود رہتی ہے کہ بھیا گھر کی طرف آئیں اور وہ انہیں لے جائیں۔ پاپا کی وجہ سے بھیا کا نام اخباروں میں..... نہیں آیا۔ اور یہ بات لوگوں کے نوٹس میں نہیں۔ شاید ایسا انہوں نے صرف شہر کی خاطر کیا ہے۔ کچھ بھی ہو وہ اب میری دہلیوں ان کے سینے ہیں اور ایک بھائی کے کردار کا اثر دوسرے پر بھی پڑ سکتا ہے۔ ورنہ پولیس سے تو انہوں نے کبر دیا ہے کہ ہر جرم کو اس سے جرم کی سزا ملنی چاہیے۔ میری جب بھی ان کے ہاتھ لگاؤ وہ خود اسے پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ ویسے غفور بابا آپ یقین کریں، میری بھیا آزاد نہیں ہیں بے پروا ہیں۔"

چہرے پر قاتل نہیں ہو سکے۔ باقی گاڑی اس کا مجھے یقین ہے ان سے دھوکا ہوا ہے۔"

"بس کبھی کبھی گویا گویا..... سرخدا اللہ کا خون ایسا بر نہیں ہو سکتا۔"

"بھیا میری صحبت کا فیازہ بگھرتا رہے ہیں۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا جن لوگوں میں تھا وہ خود بھی نہیں جانتے تھے کہ"

”تم کیا کر سکتے ہو غفور بابا۔ کچھ بھی نہیں۔ تم تو تم..... ذہین بڑے بھی اس لائق نہیں رہی کہ تمہارے کام آسکوں۔“

”آپ نے خود کو ایسا بنا لیا ہے ورنہ۔“

”نہیں غفور بابا! جو ماں اپنی اولاد کے لیے کچھ نہ کر سکے وہ۔ وہ اور کیا کر سکتی ہے کسی کے لیے۔“

”بیگم صاحب! میں..... نہ لینے آیا ہوں نہ کچھ دے سکتا ہوں۔ میں پڑھا لکھا ہوں۔ نہ غسل و دوش میں آپ لوگوں جیسا، لیکن پھر بھی میں کچھ کہنے آیا تھا آپ سے جی نہ آکر آپ مناسب سمجھیں تو عرض کروں۔“

سعدیہ بیگم نے غفور بابا کو کچھ کہتا ہے تو پاپا سے کہیں۔ جنہیں اپنے فرائض بھول گئے ہیں۔ ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ”ارم نے جی سے کہا۔“

”بیٹا..... دھیرج..... دھیرج..... آپ قسلی سے میری بات تو سنیں! میں بوڑھا ہوں۔ عمر میں آپ کے والد سے کہیں بڑا! میں نے میاں کو بھی اپنے ہاتھوں اٹھا کر کھلا پاب ہے۔ پالا ہے اور وہ صرف اتنی بات پر میری عزت کرتے ہیں۔ میرا حق سمجھتے ہیں۔ اپنی ذات پر۔“

”جی تو آپ اپنے حق کا استعمال بڑے اچھے طریقے سے کر رہے ہیں۔ آپ ہی نے تو انہیں اس گھر سے بدعنوان کر کے پہلے عید اللہ پور کا امیر بنایا اور اب شہیر کے گھر کی راہ دکھا دی۔“ سعدیہ بیگم نے دل کا غبار نکالا۔

”بیگم صاحب! صرف انہیں ہی کیا میں تو آپ کو بھی وہی راہ دکھانا چاہتا ہوں ان کا آپ سے نہ نوتے والا رشتہ ہے وہ آپ کے بیٹے ہیں! بیٹا کے بڑے بھائی ہیں۔ وہ کل بھی اچھے انسان تھے اور آج بھی ہیں۔“

”مجھے اس سے کیا لینا دینا۔“

”نہیں بیگم صاحب! گو ارنک و ہار کتنی بھی تیز کیوں نہ ہو رشتوں کی زنجیر نہیں کاٹ سکتی۔ ان کا آپ سے اٹوٹ رشتہ ہے۔ بیگم صاحب پچھترے ہوؤں کے ایک ہونے کا اس سے اچھا وقت اور کوئی نہیں آئے گا۔“

”غفور بابا! شاہنواز نے حالات کے اس سبب پر ہمیں تباہ چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں تباہی رہتے ہیں آپ۔“

”نہیں بیگم صاحب نہیں۔ میں جانتا ہوں وہ اس بات پر کتنے پریشان رہتے ہیں۔ وہ یہ بات نہ شہیر میاں سے کہہ سکتے ہیں نہ آپ سے لیکن خاندان کا یہ بکھرا ہوا شیرازہ انہیں چین نہیں بخش سکتا۔ جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں اور نہیں کہہ سکتے وہ میں آپ سے کہنے آیا ہوں۔ اپنی حدوں سے بہت سا آگے بڑھ کر۔ کیونکہ مجھے اس کم

کی خیریتوں سے پیار ہے۔“

غفور بابا کی آنکھیں نم ہوئیں! انہوں نے اپنے بڑے سارے رومان کے پلو سے آنکھیں پونچھیں! سعدیہ بیگم

الٹی جی گئیں۔ ایک طویل ٹھنڈی آہ ان کے لبوں پر آگئی۔

”میں نے شہیر میاں سے بھی بات کی تھی۔“

سعدیہ بیگم کے چہرے پر کئی رنگ آ کے گزر گئے۔

”کیسی بات؟“

”آپ کو خبر نہیں کیا؟ ان کی شادی مقرر ہو چکی ہے نا۔“

”کس کے ساتھ؟“

”اپنی گورنیا کے ساتھ۔“

”اچھا..... کب؟“

”کچھ دن ہوئے شادی اگلے ہفتے ہوگی۔“

”ہوں۔“

ارم نے دکھ کے ساتھ سوچا۔

”اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں۔ گو ہر نے اشارتا بھی ذکر نہیں کیا۔ اسے ضرورت بھی کیا تھی مجھے بتاتے کی۔“

”بیگم صاحب! کیا آپ پرانی باتوں کو بھلا کر یہ نہیں چاہیں گی کہ یہ شادی اس گھر میں ہر پاب ہو۔ ذہن کی ڈولی اس گھر میں اترے۔ بیگم صاحب! وہ اس گھر کے بڑے بیٹے ہیں۔ اور یہاں ایک مدت سے کوئی خوشی دیکھنے میں نہیں آئی۔“

”غفور بابا! میرا بیٹا کتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہے۔“

”شہیر بھی آپ کے بیٹے ہیں اور خوشی اور غم کی شراکت تو بہت پرانی ہے۔ بیگم صاحب! آپ نے تو دیکھا تھا آپ کو تو یاد ہوگا۔ شہیر میاں جیل میں تھے اور پورا خاندان شادی کی خوشیوں میں گم تھا۔“

غفور بابا نے طرک کوچ میں نہیں آنے دیا۔ وہ کھڑکنا بھی نہیں چاہ رہے تھے صرف مولا ذکر رہے تھے۔

”اسے جیل سے چھڑالانے والے بہت سے تھے میرا بیٹا تو اکیلا ہے اور کل کے واقعہ میں اس کی گاڑی کا پاپا جانا..... خطرناک بات ہے۔“

”مصیبتوں سے نجات دینے والی ذات صرف خدا کی ہے۔ وہی شہیر میاں کی حفاظت کرنے والا ہے۔ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ جب اس کی رحمت جوش میں آتی ہے تو انسان کی بے گناہی خود بخود ثبوت بنا جاتی ہے۔ میاں صاحب نے شہیر میاں کو کچھ نہیں بتایا لیکن میں ابھی جا کے انہیں بتاؤں گا وہ آپ کو پریشانی میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔“

”نہیں نہیں! نہیں غفور بابا کسی سے بھیک مانگنے کی مجھے ضرورت نہیں۔“

”آپ بھی حد کرتی ہیں بیگم صاحب! وہ غیر نہیں شہیر میاں کے بڑے بھائی ہیں۔ اس دکھ اور پریشانی کو محسوس کر سکتے ہیں اور بھائی کی مدد کرنا وہ اپنا سہا فرض سمجھیں گے۔ آپ دیکھ لیجئے گا۔ مجھے یقین ہے مجھے اعتبار ہے ان پر وہ حل نکالیں گے۔“ وہ روئے نہیں۔

”غفور بابا آپ نہیں سمجھ سکتے۔ ہم میں اور شہیر میں سوتیلے پن کی ایک دیوار ہے جو ہمیشہ فشرتوں سے تعمیر ہوتی ہے اور بڑی مضبوط ہوتی ہے۔“

”یہ آپ کا خیال ہوگا۔ شہیر میاں ایسا نہیں سوچتے آپ نے انہیں سمجھا ہی نہیں۔ آپ نے ان خراب صورت چہلوں کو جانا ہی نہیں بیگم صاحب! جو فشرتوں کی مضبوط ترین دیواروں کی پل میں توڑ دینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ آپ نے انہیں بیٹا جان کر اپنے بول میں جگہ دے کر تو دیکھا ہوتا۔ دوری اور بیگانگی تو سبکے رشتوں میں بھی قہقہے پیدا کر دیتی ہے۔“

انہوں نے سر جھکا لیا۔

”میں بہت پریشان ہوں غفور بابا۔“

”صاف کیجیے بیگم صاحب۔ یہ پریشانی صرف بچتا دے کی ہے اور کسی بات کی نہیں لیکن آپ کے پاس

راد بدلنے کو ابھی کافی وقت ہے۔ لوٹ جائیے سی راد پر۔ جو پچھڑے ہو جائیں کہلا دے قافلے منادے! خیریاں

تکبیر دے سارے مسکے حل کر دے۔“

”غفور بابا..... میں کیا کروں۔“

”آپ کیا چاہتے ہیں غفور بابا۔ میری ماں شہیر بھائی کے آگے جھکیں ان سے معافی مانگیں۔ یہ نہیں ہوگا جب پاپا کو ہم لوگوں کی ضرورت نہیں تو ہمیں بھی نہیں دے دوںگے خوشیوں میں ملن رہیں ہم اپنے گھر کی ادا بیوں میں ہی ٹھیک ہیں اور زیادتی کی بھی تو پاپا نے ممانے نہیں۔“

”بیٹا خیر نہیں کریں آپ! میں بیٹوں سے معافی نہیں مانگا کرتی۔ بیٹے آکر تے ہیں چل کے۔ میں آپ کا خادمہ ہی سہی۔ اونٹی تو کبھی سنی پر شہیر میاں میرا بڑا مان رکھتے ہیں۔ میں انہیں لے آؤں گا۔ وہ چل کے آئیں گے۔ اپنی ماں کے پاس۔“

”یہ آپ کی خام خیالی ہے غفور بابا۔ یہ نہیں ہوگا آپ دیکھ لیجیے گا۔ آپ کو بات کہہ کے اپنا بھرم نہیں کھوٹا چاہیے۔ آپ یہ دیکھیے کہ پاپا نے منہ موڑا ہے تو سب ہی چھوڑ گئے ہیں۔ پھوپھو بھی اور چچا بھی۔ کسی نے اس شادی کی ہوا ہی نہیں گنتے دی۔“

”سب ٹھیک ہو جانے کا بیٹا! آپ مجھ غریب پر غمزدہ کریں۔ میں ابھی جانا ہوں شہیر میاں کو لے کر ہی لوٹوں گا۔ انشاء اللہ۔“

”جو آپ کی مرضی غفور بابا۔ ارم! بابا سے چائے ناشتہ وغیرہ بھی نہیں پوچھا تم نے۔“

”کوئی بات نہیں بیگم صاحب۔ ناشتہ میں گھر سے کر کے آیا تھا۔ کھانا میاں صاحب اور شہیر میاں کو لانے کے بعد کھاؤں گا۔ مگر بیٹا بوزھا آدی ہوں دال دلیے کے سا کچھ نہیں کھانا۔ اتنا خیال رہے۔“ وہ مسکرائے تو ارم بھی مسکرائی۔

”بابا! چلیے میں آپ کو چھوڑ دوں گی جہاں آپ کہیں گے۔“ غفور بابا نے شہیر کا کارڈ جب سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

”ارے..... یہ..... یہ ایڈریس شہیر بھائی کے گھر کا ہے۔ واہ۔ چنیے۔ چلیے چھوڑ آتی ہوں آپ کو۔ مگر اتنا نہیں جاؤں گی۔“ اسے اس گھر کی خبر پہلے سے ہی تھی۔

”ٹھیک ہے بیٹا..... آپ یہیں رہ کر ان لوگوں کی آمد کا انتظار کرتی رہیے گا۔“ غفور مسکرا دیا۔

☆☆☆☆☆☆

ان دنوں میں اس کی ذات کتنی غیر اہم ہو کر رہ گئی تھی۔ بھرے پڑے گھر میں کسی کو ایک پل اس کے پاس بیٹھنے کی فرصت ہی نہ تھی۔

کتنی کھانا تو اسے ایسا لگتا جیسے سب اس سے جان بوجھ کر گنی کترا رہے ہوں۔ اس کے کمرے میں کوئی کسی کام سے آتا وہ بیکار رہتی تو یوں چمکتا جیسے کوئی بہت ہی غلط بات ہو گئی ہو اور وہ جو ہر آج بوجھنے لگی دونوں سے نیچے میں قیام پزیر تھیں وہ بھی بات نہیں سمجھتی تھیں۔

بس کبھی اندر داخل ہوتے ہی اس سے نظریں پٹائے پڑنے لگتا تھا وہ کورتیں۔

”گورنی! اپنی تازہ ترین سلی ہونی چھس دینا۔ کوئی کنینٹی مشین مقصود ہو تو لکھ کر دے دینا۔ دو لہا والوں نے تاپ منگوا لیا ہے۔ بہتر دیکھا کہ شلو اور کتنی ساتھ دو۔“

کتنی کمرے میں داخل ہوتے ہی فرما لیں۔

”ایک جوڑی سینڈل اور کورٹ شوز دو۔ ابھی فون آیا ہے تمہارے لیے شاپنگ کرنے جا رہے ہیں وہ لہا والے۔“

کتنی وروازے میں کھڑی ہو کے پکارتیں۔

”انگوٹھیاں اور پیڑاں آئی رکھی ہیں لیکن کے دیکھ لینا کوئی فرق نہ ہو گیا ہو کچھ دن باقی ہیں ابھی ٹھیک ہو سکتے ہیں پھر شادی کے دن مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔“

”آپ! آپ کو بس یہی کام رہ گئے ہیں! میرے پاس تو بیٹھے۔“

”اسکا ایمر جنسی میں شادی کا حکم دے کے فرمائی ہو کہ تمہارے پاس بیٹھوں۔ اتنا کام ہے کہ سانس بھی لے لینے کی مہنت نہیں۔ تم تو بس اپنے دو ہا میاں سے ہی دل کی باتیں کہنا سننا۔“ وہ بے پروائی سے کہہ کے چلی جاتیں۔

بھاریاں اسے یوں دیکھتیں گویا وہ کوئی اچھوت ہو آتے۔ مایہ نگیں دن بھر چائے نہ کھائیں غائب رہتیں اور تو اور وہ سنا سے اس سے چوکی رہنے والی عاقلہ بھی نظر نہ آتی۔ کتنی کھانا رات تو تھوڑی دیر کے نیچے عام ساغرا جانتے تو بھی ایسے جیسے کسی فضا بیلے کے پابند ہیں کھل کر بات کرنے کی اجازت ہی نہیں۔ اس کے اور گھر والوں کے درمیان فاصلے پیدا ہو گئے تھے۔

”آپ لوگ تو ابھی سے اجنبی بننے لگے ہیں آپ! اگر ایسی بات تھی تو مجھے بتاتیں میں۔ میں آپ سے یہ کہتی ہی ناں۔ یہ فاصلے کھینچ دے ہیں۔“

”کیا حماقت ہے گوری! تمہیں خبر ہے ہم سب تمہارے لیے ہی مصروف ہیں۔“ وہ سختی سے بولیں۔

”نہیں آپ! میں محسوس کر رہی ہوں جیسے یہ شادی نہیں میرے خلاف ایک سازش ہے۔ جس کی اجازت بد قسمتی سے میں نے خود آپ کو دی ہے میں بہت تباہ ہو گئی ہوں۔ میں پہلے بھی پریشان ہوں آپ! مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کوئی غلط فیصلہ کیا ہے۔“

”میرے پاس تمہاری لائسنس ہاتھ میں کی فرصت نہیں فیصلہ ختم ہے یا درست اب اسے بدلنے کی گنجائش نہیں۔ دنیا پہلے بھی ہم پر بہت ہنس چکی ہے۔ خدا را اب میں شادی کے دن کوئی نیا گل نہ کھلا دینا۔“

جبر نے سخت لہجے میں کہا۔ گوہران کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

”آپ! وہ بھٹکل کہہ سکتی۔“

”ہاں ہاں میں نے غلط تو نہیں کہا۔ معافی کی انگوٹھی چپ چاپ ہاتھوں میں تجا کر شادی کے دن انکا تم نے ہی کیا تھا۔ ڈر تو لگے گا تم سے۔“

”آپ کو خبر ہے سارن بات کی پھر بھی۔“

”جین بات تو یہ ہے کہ مجھے تو تم سے ڈر لگتا ہے ہر لمحہ ہی اب بھی وہ شہیر کا بیٹا اور مکار کتوں سے آ کر کہہ دے کہ اسے آج بھی تم سے محبت ہے تو تم آج گئی ہمارے ساتھ ویسا سلوک کرنے سے نہیں چڑھو گی۔“

”آپ! آپ کو خبر ہے نا ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کی شادی ہو ہی ہے وہ مجھے بھول چکا ہے میں بہت تباہ ہو گئی ہوں آپ! مجھے ہمارے کی ضرورت ہے۔ مجھ پڑھو نہیں کریں آپ! محبت اور قربانی میں کسی نے کچھ نہیں پایا۔“

”لیکن پاپا کی خواہش میں جانتیں سب کہتے رہتے ہیں۔“

”میں نے اپنے دل کو سمجھالیا ہے میں آپ کو کوئی سزا نہیں دوں گی اب۔ آپ کو خبر ہے یہ فیصلہ میں نے آپ سب کے لیے کیا ہے۔ آپ سب کے لیے۔“ دورد نے لگی۔

”خبردار جی ایک بھی آنسو بہایا۔ خوش رہو۔ جب وہ اپنی دنیا میں ٹمن ہے تو تم کیوں آنسو بہاؤ؟ صحت خراب ہوگی تا تو لوگ باتیں بنائیں گے۔ چہرے پر صحت کی مسرت نہ ہو تو میک اپ اور مصنوعی پن روپ نہیں لاسکتے۔ بڑا ارمان ہے گوری میرے دل میں۔ تمہیں دلہن بنا دیکھنے کا اور وہ بھی خوبصورت ترین دلہن۔ فسطیہ تیری سہیلی ہے تا۔ اس کے ذریعے شہیر تک تیری تصویریں پہنچائی جائیں گی۔ دیکھ کر جلتے گا تو سہی اور اگر تو اس نظر آئی تو خواجواہ اترائے گا کہ میری خاطر اب بھی پریشان ہے۔ بے چاری۔ جو ہرنے بڑی ادا سے کہا۔

گوہر کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

یہ سچ تو تھا۔ سچ ہی تو تھا۔ وہ دل سے نکلا ہی کب تھا۔ جدا ہوا ہی کب تھا۔ اپنی اس بے وفائی کے باوجود۔

”ٹھیک ہے آپ۔ میں کوشش کروں گی۔ بلکہ میں سسران کی خوش رہوں گی آنسوؤں کی۔ یہ وعدہ ہے۔“ اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔

☆☆☆☆☆☆

ایکشن کی صبح طلوع ہوئی۔ سارے ہنگامے شہیر کے گھر سے شاہنواز عسکری کے گھر کی طرف منتقل ہو چکے تھے یہاں تک کہ جمال بھی لگی۔

بعض لوگ کتنے سیدھے سادے صاف ستھرے اور ظہر ہوتے ہیں، بلوں میں جنھن بھراوت کے روگ پالنا ان کے بس میں ہی نہیں ہوتا۔ وہ دشمنوں سے دشمنی نہ اپنے کے لاکھ نہیں ہوتے۔ انسان دوست ہوتے ہیں انسانیت کی پرورش کرنے والے نیک جذبوں کا پروان چڑھانے والے محبت و غلوں پر جان دینے والے دشمنوں کو بھی دوست سمجھنے والے وہ ہر ایک سے نیک امیدیں رکھتے ہیں شاہد ان کے دل کے آئینے میں بدی کا رنگ نظر ہی نہیں آسکتا۔ ایسا ہی حال جمال بھی لگی کا بھی تھا۔ شہیر ان کا پیارا تھا اور اپنے پیارے کی خاطر وہ کانٹوں سے بھی نباہ کرنے کو تیار تھے۔ سعیدہ شہیر تو ایک انسان تھیں جنھوں نے اپنی تین ذات کی خوش فہمیوں کی اسیر۔ سب نے انہیں کم فہم جانا دشمن نہیں۔ شہیر تو غفور بابا کی بات سننے ہی جمال احمد کے پاس چلا آیا کسی مشورہ کیا۔

”سچ پوچھو تو شہی اس خوشی میں یہ کئی شدت سے محسوس اور ترقی تھی بڑوں کے آگے جھک کر چھوٹے عزت پاتے ہیں۔ بہر حال وہ تمہاری ماں ہیں دیکھیں میں گھر لگی ہیں۔ انہیں جہاں چھوڑ دینا مناسب نہیں۔“

”میں بہت دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ شاہنواز بہت بچہ کہنا چاہتے ہیں تم سے لیکن کہہ نہیں سکتے۔ شاید ان کا یہی مدعا تھا۔ جس کے اظہار کی جرات نہ تھی ان میں۔“

”ڈیڑی انا سے نفرتوں سے بڑھتے ہیں۔“

”ڈیڑی بیٹے۔ کتنی سعیدیوں کی مسافت منٹوں میں طے کر لیتی ہیں بڑی تیز رفتار اور زور اثر ہوتی ہیں محبتیں۔ راج کے غموں کی بہترین معالج ہوتی ہیں۔ سارے دکھ دور کرنے کی طاقت رکھتی ہیں۔ مگر ایک بات ہے محبتیں جھک جانے کا درس بھی دیتا ہیں۔“

”تو آپ کے شہی کو جھک جانے میں کیا عار محسوس ہو ملتا ہے۔ بچے اپنے ماں باپ کے آگے جھک کر خدائی خوشبو ہونی ہی حاصل کرتے ہیں اور میرا خیال ہے کہیں یہ نہیں لکھا کہ جن پر احسان کیا جائے وہ ماں باپ اس نام

کے ہوں اور اس قسم کے نہیں۔ بس یہ لکھا ہے کہ واپار اولاد میں احسانا ہ

”شاہا شہی۔ شاہا ش۔ مجھے خبر ہو رہا ہے میرے دسب محبت و شفقت سے مستفید ہونے والا بیٹا ایک اچھا انسان ہے۔ دوستوں سے محبت کرنے والا اور بدخواہوں کو معاف کرنے والا۔ بڑا خوش نصیب ہے وہ شخص جس کی ذات و شمئیاں کم کرنے والی ہو۔“

”ہم سب تمہارے ساتھ ہیں وہ گھر بھی تمہارا ہے ہم بھی تمہارے ساتھ وہاں جاسکتے ہیں بہتر ہوگا کہ کل رات تمہاری کامیابی کی تو یہ ہمیں اتنی گھر میں ہوتے ہوئے ملے۔“

تہ کسی نے یہ کچھ کہا نہ کسی نے سنا، بعض باتیں دل کرتے ہیں، دل سننے ہیں آنکھیں پیغام رسائی کرتی ہیں۔ سعیدہ شہیر نے بائیس پھیلا میں ندامت کے ساتھ شہیر ان بانہوں میں سا گیا۔ شہر کے ساتھ اور بات قسم ہو گئی۔ طویل و عریض گھر کے سارے کمرے شام تک آدھ ہونچکے تھے۔ جگہ گھر سے تھے اور پر کی منزل بھی اچالوں میں گھری تھی، خواتین گھر پر تھیں، مردائیکشن کے نتائج کے لیے بے تاب تھے، کچھ گھر پر اور کچھ پانگ اسٹیشنوں کے ارد گرد۔

ایک ہونے کا احساس برتر ہو جائے تو زندگی کتنی آسان ہو جاتی ہے اس گھر میں اکثر ایسے وجود تھے جو آج سے قبل ایک دوسرے کو جانتے نہ تھے۔

لیکن اب ایک دکھائی دے رہے تھے ان کو بچا کر کے ایک دوسرے سے باندھ دینے والی ذات شہیر کی تھی۔ ان لکھوں میں ہر دل میں اہم مقام پر محکم تھا شہیر۔ اس دن کے لیے ساری قربانیاں اسی کی ذات نے دی تھیں۔ یہ سہانا دن اسی کے ایثار گھرے جذبوں کا مرہون منت تھا۔ اور ان لکھوں میں وہ خود ہر شے سے بے نیاز اپنی تقدیر کا وہ فیصلہ سننے کا منتظر تھی۔ جو عوام نے اس کے حق میں یا اس کے خلاف دینا تھا۔

اس وقت وہ بارہوی ایٹشن کے دفتر میں اپنے ساتھی اگلا کے گھرے میں قید تھا۔

”بڑے مطمئن ہو یا عسکری۔ لگتا ہے کامیابی کی پوری امید ہے۔“ ظفر نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں یاد! اطمینان کے لیے یہ بات ضروری نہیں جو بھی ہونا ہے ہو کر ہی رہے گا آج کا دن بھی جانچ کا دن تھا، آوی زندگی بھر استحسان و تیار بتا ہے اخلاقیات کے شعبے میں کردار کے قلم سے سوال حل کرتا ہے جانچ کرنے والے متحتم عوام ہوتے ہیں نمبر لگا دیتے ہیں تو بس اسی بات پر مطمئن ہوں عوام اچھے متحتم ہوتے ہیں نمبر دینے میں کبھی جمل سے کام نہیں لیتے۔ ایک پلڑے میں میری ذات ہے اور دوسرے میں ان کی رائے فیصلہ ہو ہی جائے گا بار بار جیت کا۔“

سب اس ویسے دوسرے نے جھٹ کہا۔

”ویسے بارہم نے تمہیں اس لیے یہاں بٹھا رکھا ہے کہ.....“

”کہ جیت کی خوشی ہو یا ہار کا غم دونوں کو نارمل بنا سکتا ہے تا۔ میں دونوں کے لیے یہی طریقہ پر تیار ہوں۔“ شہیر نے اس کی بات عمل کر دی۔

”ہم ہارے بھائی۔ تم انسان نہیں کوئی دوسری شے ہو۔ تم آدم ہاری سمجھ سے باہر۔“ ظفر نے پھر کہا بلکہ ہاتھ جوڑ کر کہا شہیر نے قہقہہ لگایا۔

ذہن کی تھکنی کب سے رنج رتی تھی سب گھر والے سوچتے تھے بس وہ ہی جاگ، ہی تھی جانے کیوں غنڈ آنکھوں سے روٹھتی تھی۔ اسے انتظار تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی خواہ کچھ بھی تھا۔ بے شک وہ اس سے دور تھا

بے گناہ تھا، غیر بدین چکا تھا۔ لیکن ایسے کسی دن کا خواب تو، دونوں نے مل کر دیکھا تھا۔ کئی بار وہ مختلف ایکشن آکشن میں فون کر چکی تھی، لیکن کچھ پتا نہ چل سکا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے کن آفس میں بیٹھے رہنے سے اسے سمجھایا تھا۔

”بی بی! حلقہ انتخاب میں دیہی علاقہ زیادہ ہے، شہر کی نسبت اور آپ جیسے تاج آگ آنے میں کچھ تو دیر لگے گی، ویسے اب تک کے رزلٹ کے مطابق شبیر شکر کی لیڈ کر رہے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی لمحہ آخر آئے تک صورت حالی بدل بھی جاتی ہے۔“

اس کے دل میں دھڑک پڑ ہونے لگی تھی اور اب فون کی بھی تھنٹی پر اس نے اس لیے فون نہیں اٹھایا تھا کہ وہ جلد از جلد خود فون کرنا چاہتی تھی۔ جو تھی تھنٹی رکی اس نے ریسیوڈ اٹھا لیا۔

مگر..... یہ کیا؟ اسے پتا ہی نہ چل سکا تھا، فون کی کٹنٹی رکنے کا سبب تھا لیڈن اباجان نے اٹھایا تھا۔

”پھو پھو جان! آپ کو مبارک ہو۔ میں یہ سیٹ جیت چکا ہوں۔ آپ سب کی دعاؤں کے سبب۔“

یہ... یہ آواز... یہ آواز تو...“

”سچ بیٹا! میں بھی اسی انتظار میں جاگ رہا تھا، تمہیں بھی مبارک ہو خوشی کی یہ انمول گزریاں۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔ کہاں ہو تم؟ کہاں سے بول رہے ہو؟“

”میں تو اپنے آفس میں ہوں، ابھی گھر جاؤں گا، لیکن آپ میرے گھر نہیں پاپا کے گھر آئیے گا۔“

”پاپا کے گھر یعنی شاہ شاہ نواز کے پاس کیا مطلب؟“

”کیوں پھو پھو جان! نیا وہ میرا گھر نہیں؟“

”ہاں بیٹا، وہ بھی تمہارا گھر ہے مگر۔“

”پھو پھو جان! وہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا کہ آپ سے کہہ رہی نہ سکا۔ میں جانتا ہوں آپ اسے ایک اچھا قدم قرار دینے لگے، آپ آئیے، میں بھی نکل رہا ہوں، خدا حافظ۔“ اس نے فون رکھ دیا۔

ایک طویل مدت بعد ان نے یہ آواز سنی تھی، چکرا کر رہ گئی، فون رکھا، ان کی آواز نے دل کے تاروں پر ارتعاش برپا کیا تھا۔ وہ خود کو سنہال نہ پا رہی تھی۔ اس کی جیت نے خوشی ہی تھی وہ مسکرا رہی تھی اس کی ذات سب نے تسلیم کر لیا تھا۔ اسے اطمینان ملا تھا مگر وہ اور شبیر سدا کے لیے پیچھے گئے تھے وہ کسی اور کا ہو گیا تھا، گویا کسی اور کے آنگن میں آ پاؤ ہوئے جارہی تھی۔

یہ بات ان سب باتوں پر بھاری تھی، جس نے ٹپ ٹپ کی آسوں کی قطار اس کے حامن میں اتارا، تھی۔

”کوئی محبتوں کے جواب میں بے نیازی اور سبے پروائی بھی دیتا ہے، شبیر۔ یہ بے گناہ اور دوری نہیں، یہ لیے ہی تھی، صرف میرے لیے سب کچھ سنبھال گیا۔ اس میرا نصیب ہی بگڑا رہ گیا۔ میں... میں... کیا میں اس سے ہی کم نصیب تھی؟ کہ اپنی بے ممان قربانی کے بعد بھی تمہیں نہ پاسکی۔“

”گوہر... گوری بیٹی۔“ عاصم حسنین ناگ کوٹ پہنچے منظر گلے میں ڈالے جانے کو تیار کھڑے تھے:

خوش و خرم۔ اس کے کمرے میں رہتے ہی دیکھ کر اہل گھر گئے تھے۔

”بیٹی! میری بند کرو، شاید میں واہس نہ آؤں، شبیر کا فون آیا تھا نا، ابھی وہ جیت گیا ہے، اسے یہ تمہارا رتی ہو۔“

وہ ایک دم چونک کر اسے بغور دیکھنے لگے، ان کا کہنا تھا کہ وہ ایک دم ان سے لپٹ گئی۔ زار و قطار روئے گی۔

”کیا ہوا جینے خیر تو ہے۔“

”وہ دنوں میں نے بھی ہنسیو کیا تھا بابا۔“

”بڑی عقل والی ہو، خوشی کی بات پر دھواں دھار رہ رہی ہو۔“

”بات خوشی کی ہے بابا، لیکن۔“ اس کی بات سنی میں ڈوب گئی۔

”تھیں کیا؟“

”یہ وہ خوشیاں ہیں جو میں کھو چکی ہوں، جو مجھ سے چھین چکی ہیں۔ جن پر میرا کوئی حق نہیں رہا۔ یہ خوشیاں مجھے صرف ملاکتی ہیں، ابھی نہیں بخش سکتیں، یہ پرانی خوشیاں ہیں بابا۔“

”غلط۔ غلط۔ ایک دم غلط۔ یہ آسو پونجیہ لو۔“

عاصم حسنین بچوں کی طرح چپکے چپکے گوہر نے آسو بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ وہ اس کے آسوں پر مسکرا رہے تھے وہ حیران تھی۔

”آئیے دیکھ، کرو۔“ وہ گویا ہوئے۔

”جی کیسا وعدہ۔“ اس نے ان کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا۔

”تم کسی دیکھی کچھ نہیں بتاؤ گی۔“

”کیا مطلب بابا؟“

”اگر کسی کو خبر ہوئی کہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے تو مجھ پر خیانت کا الزام آ جائے گا اور بیٹی کیا تم یہ گوارا کرو گی کہ اس عمر میں تمہارے باپ پر خائن ہونے کا الزام آ جائے۔“

”ایسی کیا بات ہے بابا۔ میں وعدہ کرتی ہوں کسی کو کچھ خبر نہ ہوگی۔“ اس نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

عاصم حسنین نے اپنے ہاتھوں میں اس کا چہرہ ختم لیا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگے، وہ گھبرا گئی۔

”ان سب کو میری بیٹی پر تو نہیں آیا۔ مگر باپ کے دل میں ان سارے لمحوں کا پورا پورا حساب موجود ہے۔ جو تم نے دکھوں اور آزمائشوں میں گھر کر گزار دیے۔ میں تمہیں اس خوشی سے محروم نہیں کر سکتا۔ جو تمہارا حق ہے۔ یہ خوشی جو میرے قدم زمین پر نہیں آئے وہ ہے۔ یہ خوشی سب سے زیادہ تمہاری خوشی ہے، میری جان گوہر۔“

”جی۔ جی۔ آپ۔ کیا... کیا کہہ رہے ہیں، کچھ نہیں سمجھ رہی۔“ وہ ان کا منہ تک رہی تھی۔

عاصم حسنین نے اس کے رخساروں پر ہتھے آسوا پونجی تھیل سے صاف کیے اور اس کی پیشانی چوم لی۔

”میرنی پیاری بیٹی۔ سب نے شرارتنا یہ بیان بنایا تھا کہ تمہیں خبر نہ ہو۔“

”کس بات کی خبر بابا؟“

وہ بھی جھسکا ہوا ہو کے سب کچھ بھول گئی۔

”اس بات کی کہ تمہاری شادی۔ مگر عیلام سے نہیں شبیر سے ہو رہی ہے۔“

عاصم حسنین نے جلدی سے اپنی بات مکمل کی اور اسے حیران و پریشان چھوڑ کر آگے بڑھ گئے، کتنی دیر اس کے قدم زمین پر تھے، وہ اور وہ عاصم حسنین کے الفاظ پر غور کرتی رہی، جہاں کی سمجھ میں آ کر بھی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

کند پڑور میں ان کے قدموں کی آواز مسلسل دور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سوچنے کے قابل ہوئی تو ان کے

”بابا..... بابا..... بابا۔“

وہ باپ رہی تھی۔ کانپ رہی تھی پھر اسے لگا کہ اس کی ساری طاقتیں زائل ہو گئی ہیں سارے حوصلے حجاب دے گئے ہیں، ساتھیوں نے گارہ ہو گئی ہیں ابھار میں بے نور ہو گئی ہیں، گویا کی سلب ہو گئی ہو خوشی ہو یا غم دونوں کا یوں اچانک حملہ آور ہوا ہے۔ ان کے پیچھے دوڑتی وہ پورے تک آگئی تھی وہ رک گئی۔

”بابا۔“ وہ بچوں کی طرح ان سے پوچھتی تھی۔ اس کی مائیں رکنے لگی تھیں۔

”یہ خوشیاں تمہیں مبارک بنوں، نبی خدا کرے شہیر اور اس کی کامیابیاں سدا تمہاری رہیں۔ ان لمحوں میں ایک باپ کے دل کی وجہ اس کے سوا کیا ہوگی؟“

وہ کتنی دیر اپنے ساتھ لگائے اپنے آپ میں چھپائے کھڑے رہے پھر آہستگی سے اسے خود سے جدا کیا اور گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

”شہیر تمہارا ہے۔“

یہ ہلکس گیت گائی ہواؤں کی منحنجک ایک دم حرارت بخش حیات میں بدل گئی۔ ہوائیں، فضا میں زمین و آسمان، چاند اور ستارے لان میں کھترے خوش رنگ پھول، پھولوں کی مدھر خوشبو۔ سب اس سے کہہ رہے تھے۔ سرگوشیوں میں.....

”شہیر اور اس کی کامیابیاں تمہیں مبارک ہوں۔“ وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ساری صدائیں سن رہی تھی، کبھی مسکراتی، کبھی اپنے آنسو پوچھتی۔ ”نبی اپنی آہوں کو دبا لے۔ کبھی کسی کو روکتی۔“

”یہ کیا ہے اے رب! نم یزل۔ اے رحمن! اے رحیم! یہ سب کیا ہے۔ کیا ایک حقیر بندی پر جنتوں کی بارش۔ یہ بل میں کیسے دیا بدل گئی ہے میری۔“ وہ بھاگ کے اندر آئی اس کی وارڈ روم کے اوپر کے خانے میں قرآن پاک کا لٹو سجا تھا۔ وہ وارڈ روم کا پٹ کھلی کر قرآن پاک والے خانے کو دونوں ہاتھوں سے تقادم کر روٹ گئی۔

”یہ کیا ہے دیا ہے اے خالق دو جہاں۔ یہ کسی کا پلٹ دی۔ میرا دامن تو بہت تنگ ہے یہ نعام مجھ۔ سمٹ ہی نہیں پار ہے ہیں۔ کھترے چار ہے ہیں میرے ارد گرد بڑی دیر، وہ روٹی رہی۔ دل کا سارا بوجھ بنا ہو گیا۔ اب..... لیوں پر ایک جاندار مسکرا بیٹ اور آنکھوں میں پالنے کا اطمینان پورے اعتماد سے بس چکا تھا۔“

”اچھا تو میرے سارے اپنے مجھے تہا چھوڑ چکے تھے صرف اس راز کی پاسداری میں۔“ اس نے بڑے شہ کے ساتھ سوچا۔ ”جو یاہانے مجھے تہا دیا ہے یہ جانہ آرائی میرے خلاف تھی، ٹھک ہے سب ٹھیک ہے تہ بابا ہزاروں سال جیو۔ آپ نے مجھے زندگی دے دی۔ ان سب کو سزا تو میں چکھا ہوں گی۔ اس شہیر کے بچے کو بھی کوئی اور نہیں تو وہ تہی ترس کھا لیتا مجھ پر۔“

اس نے دانت کچکچائے رات جو تھوڑی سی باقی تھی کٹ گئی، نئی صبح کے اجالوں نے زندگی کا رنگ ڈھنگ، بدل! الا تھا۔ اس نے وقت گزرنے کا انتظار بڑی بہتالی سے کیا تھا۔ نوبے کی طرف بڑھتی۔

☆ ☆ ☆

فون کی چھٹی بج رہی تھی۔ رات بھر کی جگہ کے باعث نماز فجر کے بعد سب سو گئے تھے۔ ایک شخص ایسا تھا،

نہ سکا تھا اور تازگی کے احساس کے ساتھ جاگ رہا تھا۔ خوشیوں کی ایچنگ کی بارش اور مسرتوں کی پلخار بھی تو غنڈیں چھین رہی ہے کبھی کبھی۔

اس کے ساتھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ کتنی بار دل نے اکسایا تھا گوہر کو فون کرنے پر بلکہ دل نے تو سارا حال کبڑے کی ہنڈ بھی کی تھی۔

مگر وہ ہارون احمد واسطی کو دے عہد کی زنجیروں میں جکڑا اس سے کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور سیکے پر سر رکھے سمیچ سوچ کر مسکرائے جا رہا تھا۔

کیا چاہتے ہیں یہ لوگ وہ اب بھی..... ہمز! کتنی رہے۔ یہ نا انصافی ہے شہیر۔ اسے فون کرو اور بتا دو سب کچھ سب ہی کچھ کیا یہ بہتر نہ ہو؟ کہ تم دونوں میں کران سب کو بے وقوف بنا ڈالو۔ اٹھو دیر نہ کرو۔ بہت دکھ سہہ لیے تم دونوں نے دوریوں کا عذاب بھگت لیا بہت دن۔ یہ خوشی اس سے شہیر کر کے ہی خوشیوں کا اصل رنگ دیکھ سکو گے۔ کیا اوتھو! اوتھو! لگتا ہے یہ سب کچھ اس کے ہا۔

وہ سوچے گا تھی پھر ج رہی تھی۔ اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”ہیلو۔ شہیر عسکری۔“

”گوہر بول رہی ہوں۔“ وہ ایک دم اچھلا سیدھا ہو بیٹھا۔ کتنی غیر متوقع صورت حال اسے درپیش تھی۔

”تم..... تم..... تم کیا ہم آج بھی ایک سا سوچتے ہیں ایک ہی وقت میں سوچتے ہیں۔ میری اپنی گوری۔“ وہ یہ کہہ نہ سکا اس کے جواس اس کا ساتھ چھوڑنے لگے تھے مگر اس نے خود پر قابو پایا۔

”نبی فرمائیے۔ کس سے بات کر رہے؟“

اس نے اجنبی بنا جانے کی پوری سعی کی۔

”آپ ہی سے شہیر شاہنواز عسکری بار ایٹ لاء سے..... جواس وقت غیر سرکاری نتائج کے مطابق ممبر بھی ہیں اس ملک کی نیشنل اسمبلی کے۔“

ادھر بھی لہجہ کچھ کم اجنبی نہ تھا۔ اس نے زور سے مکا مارا تھیے پر۔ وہ تو جھوٹ موٹ اجنبی بنا رہا تھا اور گوہر جی کی بے گناہ اور پرانی لگ رہتی تھی۔

”نبی..... نبی فرمائیے۔“ اب کے اس کا لہجہ آپ ہی آپ بدل گیا۔

”کسی اجنبی کے ساتھ سفر کے دوپل مل کر کاٹ لیے جائیں تو وہ بھی ذہن کی تحقیق پر موجود رہتا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ ہم نے زندگی کا بہت سا سفر ایک ساتھ کاٹا ہے۔ اخلاق کے کچھ ضابطوں نے مجبور کیا کہ..... کہ..... اتنی رفاقت کے پاس میں دو حرف مبارک ہاؤ کے ہی کہہ دوں۔ مبارک جو شہیر شاہنواز عسکری یہ کامیابی۔“

”تھینک یو..... اور کچھ.....؟“ اب وہ پھر سے اجنبی لگ رہا تھا۔ اہر بڑے نجیب لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

”نبی نہیں اور کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔“ گوہر کے لہجے میں واقعی کچھ نہیں تھا۔ یا شہیر کو اندازہ نہ ہو سکا تھا۔

”اس باؤ ہری کا شکر یہ۔“ اس نے لہجے میں طرہ بھرا۔

”خدا حافظ۔“ رابطہ کٹ چکا تھا۔ جھنجھلا کر شہیر نے فوراً ہارون واسطی کا نمبر ملا یا۔

”ہیلو۔“ شمار بھری آواز یقیناً آواز ہارون کی ہی تھی اجنبی کچھ دیر پہلے ہی تو وہ اپنی رہائش گاہ کی طرف گئے





تو وہ کھانے کی بھری ماں اور بہن کے ساتھ موجود تھا۔ یہ سنتے ہی کہ اس کی گاڑی نقل اور ڈاکے کی واردات میں موقعہ واردات پر پولیس کے قبضے میں آگئی ہے اس کے چکے چھوٹ گئے۔

سعیدہ بیگم کو خبر ہی نہ تھی کہ گاڑی اس کے دوستوں کے پاس ہے۔ انہوں نے یوگلا کر ایس ایچ او سے کہا کہ میرا بھی گھر تھا اب باہر گیا ہے اور جس وقت آئے گا انہیں اطلاع کر دی جائے گی۔

میر نے بتایا کہ اس کے دوست کسی دوست سے ملنے کے بہانے اس سے گاڑی مانگ کر لے گئے تھے۔ اسے کیا خبر تھی کہ وہ گاڑی اتنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کریں گے۔

حواس باختہ سعیدہ بیگم نے اس وقت میر سے گھر چھوڑ کر جانے کی التجا کی اور اسے گھر سے دور بھیج دیا۔ میر کی روپوشی نے پولیس کے شک کو مزمان کے بیان کی روشنی میں یقین میں بدل دیا۔ شاہنواز عسکری کو خبر ہوئی تو وہ خود پولیس اسٹیشن گئے اور کہہ دیا کہ پولیس اپنی چھان بین اور تفتیش کے بعد ان کے بیٹے کو مجرم پائے تو اس کو حسب جرم سزا دلوانے کے لیے ضرور عدالت کے درمیان پیش کرے اور اس کی بازیابی کے لیے وہ ہر ممکن تعاون کے لیے تیار رہیں گے۔ میر کا نام ایف۔ آئی۔ آر میں درج نہیں تھا۔ لیکن وہ اس دن کا گیا لوٹ کر گھر نہیں آیا تھا۔ جبکہ پولیس سادہ کپڑوں میں ہمدون تھا اس کے گھر کے بارگرو موجود رہتی تھی۔

شیر نے ان سارے واقعات کی روشنی میں کوئی زود اثر اور مناسب حل ڈھونڈنے میں اپنی ساری قابلیت صرف کر دی اور میر کو ہر ممکن جگہ تلاش کرنے کی ذمہ داری کئی لوگوں کے سر ڈال دی۔ جو وہ ملزم پولیس کی کسٹڈی میں تھے اور جن میں سے ایک کو گولی چلاتے خود پولیس انسپکٹر نے دیکھا تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ میر بھی ان کے ساتھ تھا۔ جبکہ پولیس جیب کے ڈرائیور کا کہنا تھا کہ اس نے دور سے سب مزمان کو دیکھا تھا اور وہ ہر چھ مزمان کو سامنے آنے پر شناخت کر سکتا تھا۔ چار مفروضہ ملزم مل جاتے یا صرف میر فیصلہ ان میں سے کسی ایک بات پر ہو سکتا تھا۔

اس شب جب شادی میں صرف دو تین کا وقت باقی تھا اور تیل اور مایوں کی رسم کے لیے خواتین دہن کے ہاں جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ شیر میر کی تلاش میں خارزاروں کی خاک جھانٹتا پھر ہاتھا۔

اسے ایک ماں کے اندر کے احساسات کی خبر تھی۔ وہ جانتا تھا سعیدہ بیگم کے لیے ان حالات میں خوش اور مطمئن رہنا ناممکن تھا۔ شازبہ پاپا کے فون کرنے پر چھٹی لے کر آگئی تھی اور ہم بھی شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں خاصی مصروف تھی۔ دونوں نہیں اس سے ہنس بول لیتی تھیں۔ ہنسی مذاق کرتیں۔ سعیدہ بیگم مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف رہیں۔ شاہنواز کے ساتھ روز بازاروں کے چکر لگاتیں لیکن وہ جانتا تھا کہ بے شک ان کی آنکھیں نم نہیں۔ لب جسم ہیں لیکن دل رو رہا ہے۔ اس دن جب شیر نے انہیں ساری صورت حال بتائی تو خوشی کی کرن چہرے پر اترتے ہی مہرہم ہو گئی۔

”بیٹے! اگر پولیس کی گاڑی کے ڈرائیور نے میر کو دیکھ کر یہ کہہ دیا کہ یہ بھی ان لوگوں میں شامل تھا تو؟ بیٹے تم میر کو چھپا ہی رہے ہو۔ مجھ پر اتنا بار کسکو تو بچ بھی ہے کہ اس شام وہ گھر میں ہی تھا۔ نہیں نہیں شیر اسے پولیس کے سامنے مت لے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بے گناہ ہے۔“

سعیدہ بیگم کچھ کہتے کہتے رک تھیں۔ شیر کو اپنے ماضی کے تلخ لہام یاد آ گئے۔ یاد تو سعیدہ بیگم کو بھی بہت کچھ آیا۔ اور اس سب کو یاد کر کے ان کا سر جھک گیا۔ انہوں نے سرٹھا با تو شیر انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

”مجھے معاف کرنا بیٹے! انسان سے بھول ہو جانا کرتی ہے۔ میں تمہیں سمجھ ہی نہ سکی تھی۔ واقعی جان ہی نہ سکی

تھی۔“ وہ آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”مما! آپ نگر نہ کریں ماضی کو تو ویسے ہی بھلا دیں کہ اس میں ہم سب کے لیے بہت زیادہ اچھی یادیں نہیں ہیں اور یقین رکھیں۔ ایک دو دن میں ہی یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ظہیر تو ہم سے دور ہے لیکن میر ساری خوشیوں میں ہمارا شریک ضرور آنے لے گا۔“

انہوں نے شیر کے مضبوط کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ شیر نے انہیں اپنے بازوؤں میں چھپالیا۔

”جس ماں کا تم جیسا بیٹا ہو اسے واقعی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“

شیر گھر سے دوڑتا لیکن اس کے حوالے سے گھر میں ہر آنے والی خوشیوں کا افتتاح ہو چکا تھا۔ خواتین گاڑیوں میں بھر کے دہن کی طرف جانے کو تیار نہیں جب شیر کی گاڑی گھر کے باہر کی۔ اور وہ اور شیر ایک ساتھ اترے سعیدہ بیگم گیٹ پر کھڑی تھیں۔ شیر بھاگ کر ان کی طرف گیا اور ان کے سینے میں سا گیا۔

”مما! میں آ گیا ہوں۔ شیر بھائی نہ ہوتے تو۔“

”سعیدہ۔۔۔ سعیدہ بیگم۔“

میر کی بات کھنسنے ہوئی تھی کہ شاہنواز کی بھاری بھکم آواز سب کے کانوں میں آئی۔

”سعیدہ خدا کا شکر ادا کرو۔ آئی۔ جی۔ صاحب کی خصوصی توجہ سے ملزم پکڑے گئے پولیس ڈرائیور نے انہیں شناخت بھی کر لیا۔ یہ سب شیر کے دم سے ہوا۔ آئی۔ جی۔ صاحب شیر کے پرانے دشمن ہیں۔ شیر نے پرسوں ہی ان سے بات کی تھی۔ ایس۔ ایچ۔ اے نے مجھے بتایا ہے اب اس کیس میں میر کی ضرورت صرف اس حد تک ہے کہ جب بھی عدالت اس کے بیان کی ضرورت محسوس کرے اسے یہ کہنا پڑے گا کہ..... گاڑی واقعی اس کی ہے اور مزمان عاریتا اس سے لے گئے تھے۔“ وہ بڑے جوش سے کہتے خوش و خرم آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

”پاپا! شیر بھائی میر بھیا کو بھی لے آئے ہیں۔ وہ دیکھیے وہ دونوں ماما کے ساتھ کھڑے ہیں۔“

شازبہ نے چلا کر کہا تو شاہنواز ان کی طرف دوڑے چلے گئے۔ جب میر اپنی ماں کی اور شیر پاپا کی ہانہوں میں تھا۔ ماورا نے ان جذباتی اور تازگیوں کو قید کر لیا۔ میر کی قلم میں۔

”چلو بیٹا! ہم لوگ اندر چلو۔ خواتین تو بڑی مدت بعد موٹی ملا ہے ایک دوسرے پر رعب حسن جمانے کا نہیں جانے دو..... اندر جمال احمد، تیل، بارون افندہ، عدنی اور میجر یوسف بخاری تمہارے منتظر ہیں۔“

”تو یوسف بھائی بھی آگئے ہیں۔“ شیر نے خوشی کا اظہار کیا۔

”ہاں۔ بتا رہے تھے آٹھ دن کی رخصت پر آئے ہیں۔ بڑی مشکل سے ملی ہے چھٹی۔“

”چلو۔ شکر ہے تو دیکھئے۔“ اسے یوسف بخاری سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا کہ ازراہ اتفاق وہ اب تک ان سے نہیں سکا تھا۔ ایسے عذرا کی شاذی کی سووی اور تھوڑیوں کے حواس نے سے وہ انہیں پہچانتا ضرور تھا۔ کل شام تک اس گھر کا نشاؤں میں خوشیوں کی خوشبو بارشٹنک کبھی کبھی اندیشے کی محسوس اور جس میں بھی بدل جاتی تھی۔ لیکن اب جیسے سب لوگ ہلکے پھلکے ہو گئے۔ دو اندر داخل ہوا تو دونوں نے اسے پار سے گلے لگا لیا۔

”مبارک ہو جگ بین۔ تم میں واقعی چنگی بجاتے مسئلے حل کرنے کی سوجھ بوجھ ہے۔ تم سچے عوام کے ہر اہل و عیال لیڈر بنو گے۔“ شیر ہنس دیا۔

”عوام کے متوقع ہر اہل و عیال لیڈر سے پہلے ہمیں مشرف بہ ہم کلام ہونے دیجیے سر!“ یوسف بخاری اس کی

بڑھ کے معادن اور کون ہوتا۔ یہ میں نے اپنی بھانجی اور بھتیجے کے لیے خریدے ہیں۔" اس نے گاڑی بڑھا دی۔

☆☆☆☆☆☆

ایئر پورٹ پر ظہیر بے تابی کے ساتھ ان کا منتظر تھا اس کی ہانپوں میں ایک سرخ و سنید صحت مند ہنستا مسکراتا بچہ تھا اور پہلو میں اس کی بیوی کھڑی تھی۔ جس کا گلابی چہرہ آہنی شلوار سوٹ اور دوپٹے میں بے حد معصوم اور خوبصورت نگ رہا تھا۔ ظہیر نے بچے کی طرف توجہ دے بغیر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور اپنا تعارف آپ کو دیا۔ ظہیر پاپا سے مل کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"ظہیر بھائی! وہ اس سے گلے ملا تو دھڑکنوں نے دھڑکنوں کو سارے پیام منتقل کر دیے۔

بچہ شاہنواز نے پاس تھا۔ ایک انچائی کشش نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔ شاید وہ سدا سے چھوٹے بچوں سے محبت کرتا تھا یا تھا یا یہ کہ یہ بچہ اس کے بھائی کا بچہ تھا اس کا خون تھا۔

"پاپا! یہ فضلہ ہے مہری بیوی۔"

"پاپا کو بہت پہلے سے اس کا پتا ہے۔ تم ہمیں اس گلاب کا نام بتاؤ۔ جس کی خوشبو بھی منفرد ہے اور روپ بھی۔"

ظہیر نے اس کے گال چوم لیے۔ وہ گردن تھوڑی خم کر کے ظہیر کو غور سے دیکھ رہا تھا اور مسکرا بھی رہا تھا۔

"یہ ابھی صرف baby boy ہے ہم دونوں اس کا نام تجویز ہی نہیں کر سکتے۔ کبھی کبھار کے پکارتے ہیں کبھی پھندہ دراصل ہم دونوں کسی ایک نام پر متفق ہی نہیں ہو سکتے اب تک۔" ظہیر مسکراتے ہوئے بتا رہا تھا۔

"نو پر اہم۔ پاپا اور ماما جو ہیں۔ ہم جو ہیں اور بچے کی دو عدد پھونسیاں، آخر اور کس کام آئیں گی۔ دیکھا گیا ہے کہ لڑکیاں نت سے نام ہاتھوں اور کہانیوں میں سے جن جن کرائیے ہوں گے لیے چھپا کے رکھا کرتی ہیں۔ یہوں پاپا۔"

"ہاں بیٹے! اگر ایسا ہے تو اچھا ہی ہوگا اب تو نئے ناموں کی ضرورت اکثر و بیشتر پڑتی ہی رہے گی۔ چلو بیٹی۔"

ظہیر کو جواب دے کے شاہنواز نے فضلہ کو مخاطب کیا۔ ظہیر پاپا کی بات پر مسکرانے لگا۔ بہت سے شوخ و شریر لہجے اس کے تصور میں در آئے اور وہ اس سے سے پیار سے سے بھتیجے کو لے کر گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

شاہنواز فضلہ کے ساتھ پیچھے بیٹھے تھے۔ گاڑی میں پھولوں کی بھینٹی بھینٹی خوشبو پھیلی تھی۔ ظہیر نے پھولوں کا حسین گلہ ستا اپنی آغوش میں بیٹھے بچے کے ہاتھ میں پکڑا دیا تھا اور فضلہ کے گلے میں ڈھیر سارے ہار مسکرا رہے تھے۔

"ظہیر بھائی؟" ظہیر سر جھکائے پھولوں کی پتیوں کو ہونے ہوئے بھجور ہاتھ۔ ظہیر نے رخ مبد کر اسے دیکھا۔

"ظہیر بھائی! کیا ان سادہ زبادتوں کی خلائی ممکن ہے جو۔ جو ہو گئیں۔ آپ کے ساتھ۔ کیا آپ ہمیں یعنی ہم سب کو معاف کر سکیں گے؟"

ظہیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسٹیم بگ پر بھجے ہاتھوں میں بگنی ہی لڑش آئی۔ لب کپپائے لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

طرف آئے تو ظہیر نے ان سے گلے ملنے کے لیے ہاتھیں داکر دیں۔

"شہی! یہ بندہ اس دنیا کا ایک خوش قسمت انسان ہے کہ ہم بھی ہستیاں اس کے برابر زان لاء ہیں۔" ندی بھی قریب آئے۔

"بندے کو خود اس بات کا اقرار ہے۔" یوسف بخاری نے ادب سے سر جھکایا۔ پھر وہ چاروں سب کے ساتھ آ بیٹھے۔ میزبان منگلو منیر کا مسئلہ ہی تھا۔ شاہنواز ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو ظہیر نے جھٹ پوچھا۔

"میر کہاں ہے بابا؟"

"نہ پنے کرے کی طرف گیا ہے تھا ہوا تھا۔ لباس بھی شراب تھا اس کا۔ میں نے کہا تھوڑی دیر ریٹ کر کے نہائے پھر ابھرا کے سب سے ملے۔ جتنا تم بھی کچھ دیر آرام کر لو۔"

فون..... فون..... فون.....

ابھی وہ بات کر رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی ہر گھڑی ہر پل کسی مہمان کی آمد متوقع ہوتی تھی جو ظہیر اور شاہنواز دونوں کے دوستوں پر مشتیں تھے۔

"ایک منٹ بیٹے! میں فون اینڈ کر لوں۔" ظہیر وہیں رک گئے۔

"ہیلو شاہنواز اسپیکنگ۔"

"ہیلو..... تم..... یعنی ظہیر بیٹے۔" ظہیر بھی چونک گیا۔

"کہاں ہو؟ ایئر پورٹ؟"

"اپنے شہر کے ایئر پورٹ پر۔ مذاق مت کرو۔ مائی سن۔ ریٹلی تمہاری واکف ہی تمہارے ساتھ ہے۔ اچھا انتظار کرو۔ ہم آ رہے ہیں تمہیں لینے۔ اوکے ہائے۔"

"کون ہے پاپا؟"

"بیٹے! ظہیر بھی آ گیا ہے۔ تمہاری شادی کی تاریخ مقرر ہوتے ہی میں نے اسے فون کیا تھا گھر آنے کو کہا تھا۔ اس وقت اس نے کوئی خاص جواب نہیں دیا تھا چاک ہی آ گیا ہے اس کی بیوی اور بھائی سا بیٹا بھی اس کے ساتھ ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا اس نے! ہیں شادی کرنی تھی۔" وہ بے حد خوش تھے۔

"میں۔ ذرا نیور کے ساتھ ایئر پورٹ جا رہا ہوں تم..... تم....."

"نہیں پاپا! آپ ذرا نیور کے ساتھ نہیں میرے ساتھ جائیں گے۔ آپ کو اپنی بہن اور بھتیجے اپنی بھانجی کو ویکم کر رہے۔"

شاہنواز اس کا چہرہ کھتے گئے۔ دونوں کسی کو بتائے بغیر باہر آ گئے۔ تنگن کے باوجود ظہیر اب بھی خود گاڑی چلا رہا تھا اور شاہنواز اس کے ساتھ بیٹھے تھے۔

اس نے گاڑی رواں دواں سڑک پر ایک دکان کے آگے روکی۔ شاہنواز نہ سمجھ سکے۔ وہ گاڑی سے اتر کے دکان کی سمت بڑھا دو پھولوں کی دکان تھی۔ جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں چنبلی کے تازہ پھولوں سے بنے ڈھیر سارے ہار تھے اور ایک پیارا سا گلہ ست۔

اس نے دروازہ کھول کر پھول ان کے ہاتھ میں چھوڑ دیے۔

"یہ کیا ہے؟"

"پاپا! یہ ہوں گھر میں آتی ہیں تو ان کو پیار کے ساتھ ویکم کیا جاتا ہے اور پیار کے اظہار کے لیے پھولوں سے

"میں نہیں جانتا تھا کہ آپ دونوں ایک دوسرے میں اس قدر اٹو لوتھے۔ درنہ میں کبھی یہ کہنے کی جرأت نہ کرتا۔" وہ اپنا مدعا بیان کرنے میں ناکام رہا تھا لیکن شہیر کی سمجھ میں ساری بات آگئی تھی۔

"ظہیر! میرے ذہن میں موجود ساری تھکنیاں ہمارے گلے ٹھکونے، تمہاری مسکراہٹ نے مٹا دیے مجھے پرطلوں، چہروں اور جی مسکراہٹوں کی بڑی پہچان ہے۔ اور ایک بات غور سے سن لو۔ میں اس بات کو خود پرطاری کر کے باقی ساری باتیں بھلا چکا ہوں اور وہ بات جو مجھ پرطاری ہے مجھ پر عادی ہوگئی ہے، یہ ہے کہ ہم سب ایک ہیں۔"

آوی جب اس بات کو مان لے تو باقی کس بات کی گنجائش رہ جاتی ہے۔ میں ماضی کی بھول چکا ہوں۔ تم بھی بھلا دو تمہیں بھی خبر ہوگی۔ میرے بھی ذہن میں ہے۔ بڑا عرصہ گزرا ہمارے پانچ بھی ایک لڑکی کو محبت کی ڈور میں باندھ کر غیر ملک سے اس ملک میں لے آئے تھے۔ نہ میں نے دیکھا انہیں نہ تم نے لیکن فضلہ کو دیکھ کر ہم دونوں ان کو تصور میں لاسکتے ہیں۔ فضلہ ہمارے گھر کی آبرو ہے ہماری عزت ہے۔ وہ ہمارے گھر کی فروین کر آ رہی ہے۔ اسے ہم سب کی محبت کی ضرورت ہے کہ یہاں اس کا سب کچھ ہم ہی ہیں۔ رشتے گہری سوچ بچار کے بعد جوڑے جائیں اور پھر انہیں عمر بھر قائم رکھا جائے۔ ورنہ ایسے بھول سے بچے اپنے اصل سے جدا ہو جاتے ہیں اور ظہیر۔ شاید ہر بچہ شہیر سا نہیں ہوتا۔ یعنی شہیر جیسا خوش نصیب کہ ماں بچھڑ جائے تو می میسر ہوں پاپا چھوڑ دیں تو ڈیڈی کی شفقت مل جائے اور بڑے بچے کے پاس ڈاکٹر ہجرت جیسے ماما بھی نہیں ہوتے جو مصیبتوں سے چھڑا کر اپنے دامن کی پناہ بخش دیں۔ اس بچے کو عمر کے ہر پل تمہاری توجہ کی اور اس کی ماں کو ہر گھڑی تمہارے پیار اور محبت کی ضرورت ہوگی۔ تمہیں اس ہر دم کی یاد رکھنا چاہیے۔"

شہیر کا لہجہ ٹھیک تھا اور آنکھیں تھوڑی تھوڑی نم۔

☆☆☆☆☆☆

رات مچھے لڑکیوں نے اس کی گلو خلاصی کی تھی۔ زرد سوٹ میں کا مدار کرن گلے دوپٹے کے ساتھ مناسب میک اپ میں وہ حد درجہ حسین لگ رہی تھی۔ وہ مچھے مسلسل سر جھکا کر سب کے درمیان بیٹھے رہنا کوئی چھوٹا سا مسئلہ نہ تھا۔ پھر اندر کمرے میں آ کر بھی لڑکیوں نے اسے نہ بخشا تھا۔ ڈسٹو لگ بنا کر بے غم گیت گانگا کر اس کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ بڑی دیر بعد کمرہ خالی ہوا تو اس نے دوپٹہ اتار کے ایک طرف رکھا۔ یہ پہلا رشتہ جوڑا جو اسے کچھ دیر پہلے پہتا یا گیا تھا اور آج کے مطابق اگلے دو تین روز اسے پہنہ رکھنا تھا۔ کچھلے تین دنوں سے اسے اس بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ ورنہ اخبار بنی اس کی سب سے بڑی عادت تھی۔ ان دنوں وہ اس اخبار بنی سے ہی گزارا کر رہی تھی بہت سی باتوں سے یہ نیاز تھی۔ اس کے قدم زمین پر ٹک ہی نہیں رہے تھے۔ وہ کسی آزاد چھٹی کی طرف نھاؤن میں پرواز کرنا چاہتی تھی۔ وہ اڑ کر شہیر تک پہنچنا چاہتی تھی۔ ایک پل میں اسے دیکھنا چاہتی تھی لیکن ابھی کچھ انتظار کچھ بے چینی کچھ اضطراب اس کا مقدر تھا۔

وہ باہر بیٹھے ہوئے اپنی ہنسی مسکراہٹ سب پر ضبط کیے رہی تھی۔ راز داری کی ایسی پابندی ایسا نظم اس نے کہیں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اپنے مچھے سر کے ہاؤ جو اس نے سب کی نظر بچا کر سب کو بچی دیکھ لیا تھا۔ اور اندازہاں سے مسز جمال احمد کو بھی پہچان لیا تھا جو سعیدہ بیگم کے ساتھ صوفے پر بیٹھی تھیں۔ ان کے ساتھ ہی مسز امین واسطی تھیں۔ دوسرے صوفے پر سردو آبا عذرا، تیلما واسطی اور ان کے ساتھ ارم اور شازہ تھیں۔ ان سب کے چہرے پھولوں کی طرح کھلے کھلے اور تڑپتا تڑپتا نظر آ رہے تھے۔ وہ سب آپس میں باتیں کر رہی تھیں کبھی

سرگوشیوں میں اور کبھی با آواز بلند۔ زموں کی ادا تگی کے لیے ان میں سے کوئی اس لحاظ سے اس کے پاس نہیں بچکا کہ وہ اس کا سسرالی عزیز ہے۔ اس کے کان کا اٹاف، قسطیے اور دور پرے کی رشتہ دار لڑکیاں اس کی بڑھ بھیاں، ماورا اور عائشہ یا ان کی سہیلیاں اس کے ارد گرد رہیں۔ اس کے گلے میں پھولوں کے ہار اور سر پر کا مدار و پش پٹی اماں نے پہنایا۔ لڑکیوں نے اس کا ہاتھ پھولوں میں گندھے خوشبو دارا ہنسنے سے بھر دیا اور ابھی وہ وہیں بیٹھی تھی کہ وہ سب ایک دوسرے کو جھگ کرنے تلخ اور چچی اماں اس کے پاس بیٹھی رہ گئیں۔

اس کی نظریں برابر ان سب کو دیکھتی رہیں جو اب بھی خیروں کی طرح صوفوں پر براجمان تھیں۔ جب اسے اندر لے جایا جانے لگا تو سعیدہ بیگم مسز امین واسطی اور مسز جمال اپنی اپنی بیٹیوں کے ساتھ اس کے پاس آئیں۔ مسز جمال نے اس کی چھتھی پیشانی لڑپ لڑپا سے مظلوم ہو کر چوم لی۔ سردو آبا نے اس کا چہرہ اونچا کر کے جی بھر کے اسے دیکھا۔

"چشم بدوہر۔"

"خدا بچی کو اپنی امان میں رکھے۔ دیکھیے سعیدہ بھابھی کتنا روپ چڑھا ہے۔ کتنی اچھی لگ رہی ہے۔"

"صاف آپ کی بیٹی ہے ہی اتنی پیاری اور اچھی۔" سعیدہ بیگم مسکرائیں۔

"اللہ جوڑی سلامت رکھے۔" مسز واسطی نے دعا دی۔

مگر مسز امین واسطی اور تیلما کو دیکھ کر بے حد حیران تھی۔ اور ان کے چہروں کی رونق نے اندر سے پھوٹی مسرتوں نے تو اسے پریشان کر دیا تھا۔

"ماں لیا گو ہر بیگم! کہ یہ شادی ہی ذوالقح شہیر شہناز عسکری ولد شہناز عسکری سے ہو رہی ہے لیکن یہاں واسطی فیملی کا کیا کام۔"

اس کا ذہن الجھ سا گیا۔

جو ہر آپا کمرے میں آئیں۔

"تو بے آبا! آپ تو یوں بدحواس ہو جاتا جیسا گویا ہر کام کی ذمہ داری آپ پر ہو۔ دو گھنٹہ میرے پاس نہیں بیٹھ سکتیں کیا؟"

"کیا کریں گوہر۔ واقعی ہر ذمہ داری مجھ پر ہی ناید ہے بھائیوں کو تو ان کے بچے فارغ ہی نہیں ہونے دے رہے۔ پھر ان کے میکے کے لوگ بھی آج آگے ہیں۔ انہاں نے کہہ دیا ہے وہ اپنے اپنے میکے والوں کا خیال اپنی رکھ لیں تو کافی ہے۔"

"آپ بھی پلیز صرف میرا خیال رکھ لیں تو بہت ہے کام سنبھالنے والے اور بھی بہتر سے ہیں۔ بیٹھے تو سہی میرے پاس۔ کیا آخر پھر یہ وقت ہمسرہ ہو یا نہ ہو۔"

"کیوں؟ کیسے؟ میرے ہونے کا وقت؟"

"بھئی صاف ہی بات ہے موصوف فوجی آدمی ہیں اس شہر میں ٹک کر تو نہیں بیٹھ سکتے نا اور نہ مجھے یہاں چھوڑ کر خود دوسری جگہ چلے جائیں گے۔ آبا..... ایک بات تو بتاؤ۔" اس نے شوقی سے کہا۔

"ہاں کیا بات؟"

"یہ ذات شریف کیا تہا ان تھا اس دنیا میں آئے تھے؟"

"کیا مطلب؟"



”بھئی میں سمجھ رہا تھا کہ بات کر رہی ہوں۔“

”کیا ہوا نہیں؟“

”تقریباً ہوتی سب لوگ آئے۔ لیکن۔ زمان کی والدہ نظر آئیں نہ کوئی بہن۔“

”وہ..... وہ سب ملک سے یاہر ہیں۔“

”کب سے؟“

”کافی دنوں سے۔ وہ لہا میاں نے تو بہت کہا لیکن یہ تمہاری ضد تھی کہ شادی جلد از جلد ہو۔ اس لیے وہ نہیں آسکیں۔“

”اور آئی..... وہ سزا میں واسطی۔ وہ اور ان کی بیٹی۔“

”جو ہر کوئی جواب نہ سوچتا۔“

”تم تو بال کی کھال نکالنے لگی ہو بھئی تمہیں خبر نہیں ڈاکٹر بارہن اسی شہر میں ایک معروف اسپتال چلا رہے ہیں اور ٹیکل میں اور ان میں دوتی ہے۔ بلا لیا ہوگا انہوں نے۔“

”اور سزا جمال احمد اور ان کی بیٹیاں۔ وہ اس لیے تشریف لائیں کہ میں ان کی ہونے والی بہو کی سہیلی ہوں۔ واہ۔ واہ۔ بہت خوب۔ اچھے جواب ہیں۔“

”جو ہرنے لڑ بڑا کر اسے دیکھا تو وہ جھٹ محسوم بن گئی۔ جو ہرنے آنکھیں دکھائیں خود پر قابو پا کر۔“

”اور کوئی پوچھتا چہ کرنی ہو تو بستی حاضر ہے۔“

”ہاں پوچھنا تو ہے۔“ اس نے بڑی ادا سے کہا۔

”پوچھو پوچھو پوچھو تا بل کیسا۔“

”سنا ہے آپ کے ایک پرانے شناسا آپ کے کزن شیر عسکری بھی نہیں ہوتے ہیں۔ وہ بھی خاصے مشہور معروف ہیں۔ اب تو ایم۔ این۔ اے بھی پنے گئے ہیں آپ کے عزت مآب شوہر تادار یقیناً ان کے بھی دوست ہوں گے اور انہیں بھی بتایا ہوگا انہوں نے۔“ اس نے بات چہا چہا کر کی اور جو ہر کے چہرے کے بدلنے

رنگوں سے خاصا حلا اٹھایا۔

”اسے کیوں بلاتے؟ کیا تعلق باقی رہ گیا ہے اب؟“

”ایسے ہی کی سی رہ گئی ہے آپا! ایک بات بتائیے۔ آپ میرے دشمنوں کے کمر بڑا ہانڈا کر آ کر کیا چاہتی ہیں۔ کیا

بچی کہ ایک بار پھر میں شادی کے دن میں شادی سے انکار کر دوں۔ آپ نے ساری پرانی یادیں بڑی خوبصورتی کے ساتھ میرے ارد گرد جمع کر دی ہیں۔“ اس نے لہجے میں زمانے بھر کی محرومی، فسر دی اور ناکامی بھرنے کی

کوشش کی۔

”گوہرا کیوں بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو خدا نہ کرے جو تم کوئی ایسی غلط بات کہو۔ خدا تمہیں زمانے بھر کی خوشیاں نصیب کرے۔ بی ایزی مائی کسز تم کہو تو میں ان سب کو جمع کر دوں گی۔ بے شک ہم لوگوں کو سب لوگ غیر محبت اور بد اخلاق ہی کیوں نہ گردانتے رہیں۔“

وہ چپ رہی۔ پوری بات سن کر بولی۔

”جو آپ کی مرضی ایہ بات پہلے سوچنے کی تھی۔ ویسے بھی اور کون سی بات ہے جو میری مرضی سے ہوتی ہو۔ دیکھا کہ دستور بن چکا ہے۔ شادی کے لباس میں جوتوں میں جیولری میں دہن کی پسند کا خیال رکھا جاتا ہے۔ لیکن

یہاں ہر بات بالائی بالا خود طے کر لی جاتی ہے۔ سامان آ جاتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میں لڑکی نہیں کوئی قیدی ہوں اور کسی سنگین جرم کے تحت اس کمرے نما جیل میں بند ہوں۔ سب لوگ مجھ دیکھتے ہی اچھے بھٹنے پاتے۔ کرتے کرتے..... چپ ہو جاتے ہیں بھاگ جاتے ہیں۔ اچھی خاصی مٹی جمانی محفل برخواست کر دیتے ہیں۔ آ کر یہ سب کیا ہے۔ کیوں ہے؟ ابھی فون کرتی ہوں کیا تیر ہے۔ سحر عیلام کا پوچھتی ہوں ان سے: شادی مجھ سے کر رہے ہیں یا.....“

”نہن..... تمہیں گوہرا بری بات ہے۔ تم انہیں فون نہ کرنا کچھ نہ کہنا۔ کیا سہ چلیں گے وہ۔“ جو ہر کے اوسان خطا ہو گئے۔

”کچھ نہیں کہتے وہ..... آپ لوگ جو سینڈل اپنے ناپ کے لے آئے ہیں وہ مجھے صحیح بھی نہیں آ رہے اور ڈیزائن اور کٹر بھی ناپسند ہیں مجھے میں خود ہی ان کے ساتھ چلی جاؤں گی اور اپنی پسند سے.....“

”گوہر.....! گوہر..... تمہیں کیا ہو گیا ہے۔“

”کچھ نہیں ہوا۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔“

”تم ان کے ساتھ جاؤ گی۔“

”تو اس میں برائی کیا ہے۔“

”ہمارا خاندان انہی اٹنا فائر ڈنکس ہوا۔“

”اس میں فارو، ڈینس کی بات ہی کیا ہے۔ آج نہیں تو کل مجھے ان کے ساتھ ہر جگہ آنا جانا ہو گا۔“

”گوہرنی پلیز یہ تو سوچو۔ گوری ابھی دو تین دن قبل تمہیں یاد ہے کیا کہا تھا تم نے..... کہ تمہیں کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں جو ہم سب چاہیں لیتے رہیں کرتے رہیں اور آج۔“

گوہر نے اپنے سارے توجہ اپنے اندر بہتکل رو کے جوہر کی جان پر مبنی ہوئی تھی اسے سمجھانا ان کے لیے بہتار ثابت ہو رہا تھا۔

”اس وقت میں پاگل تھی۔ فسطیہ نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے اپنی ساری محرومی خریداری اپنے دولہا کے ساتھ یعنی اس شہر کے بچے کے ساتھ مل کر کی ہے۔ وہ میرے بچے کی اور لڑکی کو پہلو میں بٹھا کر محرومی خریداری کے لیے لے جا سکتا ہے تو میں کیوں نہیں جا سکتی۔ کس بات کی سزا پاؤں میں؟ میں بھی جاؤں گی۔ آپ پلیز نمبر ملائے میں بات کریں گی۔“ اس نے جوش دکھایا جو نہ بتایا اور اس کی روکی۔

”گوہر..... ہوش میں آؤ۔ شہر کچھ بھی کرنا پھرے یہ اس کا فیصل ہے۔ میں تمہیں ایسی بے شرمی کی اجازت نہ دوں گی۔ کیا سوچیں گے وہ کہ جو لڑکی بہتکل دو تین بار ان سے ملی ہے وقت سے پہلے اتنی فریگ ہو رہی ہے۔“

”نہیں سوچیں گے وہ ایسا ہنڈ خوش ہوں گے۔“

”خود ہی کرتی رہو ایسا میں تو جا رہی ہوں سمجھتی ہوں ہاں کو۔ وہی کر سمجھائیں گی تمہیں۔“

وہ غصے میں کم اور پریشان زیادہ تھیں۔ پابہ نہیں تو گوہر کی ہنسی بے قابو ہو کر لبوں تک آ گئی اس نے دروازہ بولت کیا اور اپنے ہنڈ پر آ گئی بہتکل ہنسی روکی سبیل پر دکھا اخبار اٹھایا۔ پہلے صفحے پر ٹکاؤ کی اور اٹھ بٹھی اس کی نظریں

اخبار پر جمی کی جمی رہ گئیں۔

ایک طویل مدت کے بے سنی انتظار نے مایوسی کے بعد اسے کیا دیا تھا اس کا اندازہ تو آج کل نہیں لہا اسے ہو

نی رہا تھا۔ مگر اس کے سامنے جو تصویر بھی تھی۔ اس تصویر نے اسے سرتوں کی انتہائی بلند یوں پر لاکڑا کیا۔

فطینہ نے اس سے یہ کیوں کہا کہ تم اسے عروسی خریداری کے لیے ساتھ لے گئے تھے۔  
 ”گیا ہے تو یہ سچ تو ہے۔ بھئی، ہمیں بھائیوں کے ساتھ ان کی عروسی خریداری کے لیے کیوں نہیں جاسکتی۔ کیا یہ آپ کو گوارا کرنے کا ہے۔“ وہ مزے لے رہا تھا۔  
 ”ہاں اور کس نے؟ کہہ رہی تھی۔ شہیر کی اور کے ساتھ مل کر خریداریاں کر سکتا ہے تو وہ کیوں نہیں؟“  
 ”ہرا..... حالات بتاتے ہیں کہ اسے کسی بات کی خبر ہی نہیں۔ پیاری آپ چند دن کی بات ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔“  
 ”نہیں شہیر۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔“

”کس بات کا؟“  
 ”مجھے لگتا ہے وہ تم سے اذ حد خفا ہے۔ اگرچہ ایک اسے خبر ہوئی کہ شادی تم سے ہو رہی ہے یا ہو چکی ہے تو وہ جذباتی لڑکی کچھ اور نہ کر بیٹھے۔“

”اوہ تو آپ..... آپ ہانگل پریشان نہ ہوں۔ شہیر کی محبت بے حد طاقتور ہے۔ آپ سوچیے تو سہی، جس محبت کو وہ لائمی اور جدائی کے دنوں میں خود سے جدا نہیں کر سکتی وہ اب کیا جدا ہوگی اس کے دل سے۔ اور ویسے آپ کو بتاؤں چاہت ہے کہ مندرجہ میں بندھے لوگ ایک دوسرے سے روٹھ سکتے ہیں خفا نہیں ہو سکتے۔ اسے مجھ پر غصہ نہیں آیا ہنگو ہوگا، مجھ سے بے وفائی کا شکوہ اور جب ثابت ہوگا کہ میں نے وفائیں تو ظاہری بات ہے کہ شکوہ بھی تمام ہو جائے گا۔ آپ میرے اس خواب کو مت توڑیے آپا۔ یہ خواب میں کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اچانک اپنے سامنے پا کر اس کے چہرے کی جو کیفیت ہوگی اسے خبر نہیں ہوگی۔ اسے قید کر لیتا میری آنکھوں کا حق ہے۔ باقی آپ بے فکر رہے گا۔ اسے منانا راضی کرنا میرا کام ہوگا میں آپ لوگوں کو مدد کے لیے ہرگز نہیں پکاروں گا۔“ وہ بڑے جذب سے کہتا گیا۔

”ارم۔ شازی۔ ہڈرا۔ سدرہ آپا۔ بھئی آپ سب لوگ کہاں ہو، ہماری سالی آدمی گھر رانی تشریف لائی ہیں۔ اور ابھی معاملہ ان کے ہاتھ میں ہے۔ انہیں ہم سے شکوہ ہوا تو انہیں بھگتنا مشکل ہو جائے گا۔ چلیے آپا میرا خیال ہے وہ سب میرے کمرے میں ہیں۔“

شہیر نے جو ہر کا ہاتھ پکڑ لیا اور اوپر لے آیا۔ اس کے کمرے میں واقعی وہ سب موجود تھیں۔  
 ”ارے۔ آہا اس گھر کے سب افراد کی تو آپ کو خبر ہی نہیں ہوگی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ظہیر آیا ہے نا۔“ لغز سب اس گھیر پٹی چلی گئی۔

”یہ میری بھانجی ہیں۔ لغز۔“  
 جو ہر کو کچھ خبر ہی نہ تھی اس لیے وہ نیران سی کھڑی تھیں۔ شہیر نے فضلہ کو جو ہر کے بارے میں بتایا تو وہ اٹھ کر ان کی طرف چلی آئی اور گھٹنے ٹی۔

”افو! ابھی خواتین آپ سب کمال کی چیز ہیں..... بھائی کچھ تھنوں میں مشرقی آداب سکھا دیے۔“ شہیر نے جتے ہوئے کہا۔  
 ”آداب مشرقی اور مغرب کے نہیں محبت کے مرہون منت ہوتے ہیں شہی۔“

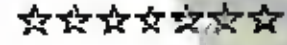
ہڈرا نے زور دے کر کہا۔ سب ہنس دیے۔ ارم جو ہر آ پک ساری بات بتانے لگی۔ ظہیر بھی وہ ہیں آ گیا جو ہر سے محفل جو پہلے ہی جمی ہوئی تھی ان افراد کے آ جانے پر اور بھی رہیں، وہ مٹی۔ شہیر نے جو ہر کی بتائی ہوئی صورت

”شہیر..... میرے شہیر۔“ اس نے زرب لب کہا اس کی آنکھوں میں زمانے بھر کی روئیاں بھر گئیں۔ زمانے بھر کا شوق اور وارفتگی۔ وہ دیکھے گی۔ کتنے مٹی۔ کتنے مٹی بیتیے چلے گئے اس کے چہرے کے ایک ایک گوشہ نگار پر نظریں جاتے۔ پھر اس کی آنکھیں برسے لگیں۔ شہیر کی تصویر و چند لائی گئی اس کی نظروں میں۔  
 اس نے ایک ایک کر کے ساری تصویریں دیکھیں ایک میں جمال احمد اور ان کی بیگم اور دوسری میں سعیدہ بیگم اور شاہنواز اس کے ساتھ تھے۔ یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ لیکن اس کے اعتراف نے گوہر کی کافی مشکلات حل کر دیں۔ ساری کچھائی سمجھا دی۔

کتنا خوب رو ہو گیا تھا ان پتے سالوں میں اس کا شہیر کتنا پیڑم۔ کتنا باوقار۔  
 آنسو پوچھ کر وہ بغورا سے دیکھ رہی تھی۔

یہ بلا کہ کتنا ہی دل خوش کن کیوں نہ ہو۔ جدائی کے ماہ سال کی اذیت کوئی بھول جانے والی اذیت نہیں ہے۔  
 ”تمہیں ہر لمحے کا حساب دینا ہوگا۔ سارے غصے شدت حقوق واپس کرنے ہوں گے۔ اپنی سنگدلی کی سزا ہر حال میں بھگتنا ہوگی تمہیں۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں سوچا۔

”تم تو، کچھ ان سارے لوگوں کا۔ بلکہ اس ستم کے روح رواں تو خود تم ہو۔ جس نے سوچ رکھا ہے بلکہ تمہیں رکھا ہے کہ مجھے خبر نہ ہو۔ اور تمہیں ہے مجھ پر جو اتنا پوچھ لیتے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوں کہ تمہاری شادی فطینہ سے ہوتے ہوتے مجھ سے کیسے ہونے لگی۔ بہر حال وقت اتنا بھی دور نہیں ہے۔ وقت تو وقت تم بھی خدا کے کرم سے میری دسترس میں آنے والے ہو۔ پوچھ لوں تو تم سے سارے ستم کا حساب لے لوں گی۔“  
 نہیں یسپ آف کر کے وہ سونے کی تیاری کرنے لگی۔ آنکھیں بند کیں شہیر بیگم سے آنکھوں میں اترا آیا۔ اپنی پوری خریداری اور وجاہت کے ساتھ۔



”شہیر..... شہیر..... بات تو سنو بھئی۔“  
 ”ارے آپا! آپ اس وقت۔ ابھی تو سب لوگ سوئے ہیں وہاں سب خیر تو ہے۔“ اپنے کمرے میں جاتے شہیر کے قدم چوتھی سیڑھی پر ہی رک گئے۔

”خیر کہاں؟“ جو ہر بھاگ کر اس کے قریب آئیں۔  
 ”جو بھی تھا آپ فون پر بات کر لیتیں۔“  
 ”فون پر بات کرتی اور بھانڈا پھونڈنے کا التزام اپنے سر لے لیتی۔ اس نے تو میری جان خراب میں کر دئی تھی ابھی۔“

”کس نے؟ کیا ہوا؟“  
 ”ابھی ابھی فون کرنے چلی تھی۔ میرا عیلام کو..... وہ تو شکر ہے کہ ان کی رہائش جگہ کا نمبر نہیں تھا اس نے۔“

پاس۔  
 ”کیوں؟ کس سبب؟“

”یہ مجھ سے نہیں اپنے باقی چہوتوں سے پوچھو۔ جو اس سے الٹی سیدھی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ میں تو ان تفتیشی انداز سے گھبراتی تھی۔ عیلام کے گھر والے کہاں ہیں؟ مسز جمال کیوں آئی ہیں؟ بینما ایس کی والدہ! کس نے بتایا بلایا گیا ہے؟ تم سب لوگوں نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ اس کی آنکھوں میں بھول جھونک ہو گئے۔“





ایک بیٹی کیا ایسی اور کئی لٹیں ہرگز بوجھ نہیں لگیں سرکاری خزانہ آ خر عوام کی خدمت کے لیے ہی تو ہوتا ہے۔" غمرا نے پرانا بدلہ چکانے کی سستی کی۔  
شیر نے ہوش میں آنے کی زبردست پرفارمنس دیتے ہوئے جھٹ جوائی حملہ کیا۔  
"تمہیں وضاحت کا حق کس نے دیا ہے وہ میری اکلوتی سالی ہیں حق بننا ہے ان کا لاسے جو ہر آپا مجھے دیتے۔"

"اچھا۔ بڑا حق ہے ان کا۔ اور ہم۔" غمرا نے اپنی باتیں اس کے گھٹے میں ڈال کے اسے چھوڑا۔  
"ہم کون ہیں بچہ ہیں۔ غیر ہیں۔"

"ارم تم چپ کیوں بیٹھی ہو احتجاج کیوں نہیں کرتیں۔ ابھی تو وہ دن کا من نہیں دیکھا ابھی سے بدنا جا رہا ہے۔ ہمارا بھائی اس کے آنے کے بعد کیا ہوگا یہ تو اس کا اور اس کے گھر والوں کا کلمہ پڑھا کرے گا ہم بے چارے تو ماشی کا قصہ بن کر رہ جائیں گے کبھی بھولے سے ملنے چلے گئے تو دورہ زہ کھول کر ہمیں دیکھ کر کہے گا آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا تھا یا نہیں پڑ رہا۔ ویسے کس سے ملنا ہے آپ کو۔"

"تو بے اجی۔ اختیار افسوس تو نہ کچھو۔" سرد رہے ٹوکا۔  
"کہنے دیں بے چاری کو۔ یہ اصل میں بخاری صاحب یعنی اپنے پیغمبر صاحب کا تجربہ۔۔۔ بیان کر رہی ہے۔ آئیے میں جھانکنے سے اپنی ہی صورت نظر آتی ہے یہ دنیا کی بہت بڑی حقیقت ہے اچھا تو پیغمبر صاحب اپنے رشتہ داروں کا استنبال ان ہی الفاظ سے کرتے ہیں اور پیچھے سے تمہاری کڑک دار آواز سنتے ہیں دم و پا کر تمہاری طرف آتے ہیں۔ چہ۔ چہ۔ چہ۔ ویری سیڈ۔ مانی سسز میں ہوں۔ پیغمبر صاحب نہیں تم سب لوگ جاؤ جو ہر آپا کے مقابلے میں اپنی اپنی فرمائشوں کی فہرست تیار کر کے لاؤ۔ بندہ حاضر ہے۔ بلکہ چشم بارش دل ماشاؤ۔ کیا یا۔ کر دے تم سب لوگ تم سب کے دلوں کی جو بھی حسرتیں ہوں بندہ انہیں تمام کرتے کہ تیار ہے۔ چلو ہری آپ سب لوگ تیار ہو جاؤ چلتے ہیں شیر۔ جاؤ۔ جاؤ۔ سب نے بے یقینی کے ساتھ اسے دیکھا۔  
"دیکھو پہلے بھی کانی ہر ہو چکی ہے اب مزید لیٹ ہوئیں تو مار گئیں بندہ ہو جائیں گی اور ہاں پیغمبر تم بھی ساتھ چلے چلو ساری چیزیں ایک ہی گاڑی میں آنے سے تو رہی۔ فتنہ بھائی کبھی چلنا ہوگا۔"

گزکیاں اپنے اپنے اپنے کمرے کی طرف بھاگیں جھٹ پٹ تیار ہوئیں شیر پاپا کے کمرے میں گیا۔  
وہ میز کو ساتھ بٹھائے کچھ نکھوارے تھے۔  
"آؤ آؤ بیٹا! میں کچھ مصروف تھا تمہاری ممانے ہدایات جاری کی تھیں کچھ دینے دلانے کی بات تھی۔ میرے نکھوارے ہوں کہ کہیں کچھ نہ جائے ہاں تمہیں کیا کام ہے۔"

"پاپا! وہ کچھ کیش چاہیے تھا۔ اس وقت میرے پاس نہیں ہیں پیسے کل لا دوں گا بیک سے یا چیک دے دوں۔"

"اتنی رات کو کیا ضرورت آن پڑی۔ کتنے چاہئیں؟"

"بہنوں کو بازار لے جا رہا ہوں۔ جتنے بھی دے سکیں۔"

"کیا مطلب؟"

"تقدار میں اور آپ گن سکتے ہیں ان کی پاپا۔ لیکن ان کی فرمائشوں کا حساب لگانا مشکل ہی ہوگا۔ لیکن وہ خریدنا چاہیں گی۔ میں انہیں ضرور لے سوں گا۔" شاہنواز مسکرا دیے۔

"تب تو لگتا ہے میرے پاس موجود کیش بھی کم پڑ جائے گا۔ نچر لے جاؤ۔ اور ہاں میں چیک بک دے دیتا ہوں چیک سائن کر کے ضرورت پڑے تو خود ہی غل کر کے دے آنا۔ یعنی جہاں کیشی رقم کاغذ سبتے۔"

"مگر پاپا! اس نے سر جھکا لیا۔"

"میں یہ سب کچھ اپنی طرف سے دینا چاہتا ہوں۔"

"باپ کا پیسہ کیا اپنا نہیں ہوتا۔"

"ہوتا ہے مگر وہ خوشی جو۔ خود سے انہیں سب کچھ دے کے ہوگی۔ وہ۔۔۔۔۔"

"تو کوئی بات نہیں لوٹا دینا ہمیں رقم اس وقت تو لے جاؤ۔"

"پاپا۔ یہ شیر بھائی کس لیے دے رہے ہیں انہیں سب کچھ۔" شیر نے جھٹ پوچھا۔

"بٹے ایشاہی کے موقع پر بہنوں کو دیا ہی جاتا ہے پرانا رواج ہے۔"

"اور بھائیوں کو؟ کیا ان بے چاروں کا حق نہیں ہوتا۔"

شاہنواز ہنس پڑے۔

"اصل میں لڑکیاں بڑی مصوم ہوتی ہیں ان کی فرمائشیں بھی بہت چھوٹی موٹی ہوتی ہیں۔"

"وہ سستی چھوٹی موٹی؟"

"یہی ایک دوسوٹ۔ پر لیوم۔ میک اپ رسٹ وایج ٹیشن کے جوڑے حد سے گزرے تو نیولری کا ایک آدھ سیٹ مگر لڑکے۔ خدا کی پناہ۔"

"لڑکے کے ذکر پر آپ ایک مجھے ہیں شیر بھائی۔"

"ہاں بھئی لڑکوں کو ذرا سا آفر کر دو تو کم سے کم سوئز بائیک اور زیادہ سے زیادہ بھیر دی فرمائش تو عام سی بات ہے کسی اور ذکر کی طرف آتے ہی نہیں ہیں۔"

"میں سمجھاؤ غیرہ اور دادی اماں کے پاس بھی یہی ذکر تھا۔ یعنی بہنوں کے ٹیک کا۔ دادی اماں تیار ہی تھیں ان کے زمانے میں انہیں بھائیوں کا پلو باندھتی تھیں اور پلو بندھائی لیتی تھیں پلو بندھائی دو دو پائی جو تپا پائی اٹھائی بھائی وغیرہ وغیرہ جانے کن کن رہیں کے نام پر لونا کرتی ہیں لڑکیاں اور ہم ہیں بے چارے کہ کہیں سے کوئی اسید ہی نہیں ہے پاپا۔ میں شیر بھائی کا پلو باندھ کے ساتھ جاؤں گا۔ پلو بندھائی وصول کروں گا اور ٹیک بھی وصول کریں گا۔"

وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا اور شاہنواز اور شیر دونوں ہنس رہے تھے۔

"تم بھی چلے جاؤ۔ جتنا کچھ ہو لیں تم بھی لے لینا! پنے بھائی سے اخفا کیوں ہوتے ہو یا۔"

"کچھ پاپا۔"

"اور نہیں تو کیا۔"

"ہرا۔ چہ پاپا۔ چلے شیر بھائی۔" شیر نے کاغذ قلم و ہیں چھوڑ دیا۔

شیر چیک بک اور پیسے لے کر باہر آ گیا مگر غم میں پھنس چکی ہوئی تھی۔ لڑکیاں شتم شتم تیار ہو رہی تھیں۔

بھاگ دوڑ کرتے آ کر سب باہر نکل ہی آئے۔

میر پش پش تھا۔

”مٹے اتم کو دھرا آگے۔ جاؤ اپنے کمرے میں یہ خالص لڑکیوں کا معاملہ ہے شہیر بھائی اسانس بلکہ فٹانس ہیں ورنہ وہ بھی نہ ہوتے اور ظہیر بھائی صرف ڈرائیور کی حیثیت سے جا رہے ہیں۔“ شاز نے منیرہ آڑے ہاتھوں لیا۔

”ہمشت خاموش زمانے کے رسم و رواج بدل گئے ہیں ٹیک کی وصولی میں اب لڑکے بھی شامل ہو کر رہ گئے۔ کیوں شہیر بھائی۔“ منیرہ نے شہیر کا سہارا لیا۔

”بالکل ٹھیک کہا میں تائید کرتی ہوں۔“

لڑکیاں گاڑیوں میں بھر گئیں، قافلہ چل پڑا۔ ایک شہیر میاں تھے اور فرمائشوں کا طوفان تھا۔ مگر پھر بھی خوشی انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

رات کا وقت تھا۔ رش کافی حد تک کم تھا۔ گاڑیاں پارک کرنے کے بجائے اندر ہی لے جالی گئیں۔ یہ شہر کی پرمارکیٹ ہر قسم کی خریداری کے لیے موزوں شہیر سب سے آگے آگے تھا اس کے ساتھ ظہیر اور فضلہ تھے اور کندھے سے کندھا جوڑے منیر۔

”شہیر بھائی وہ جو سامنے دکان ہے نا وہاں ہر قسم کی ورائٹی ہے میرا مطلب ہے گارمنٹس کی۔ ڈپارٹمنٹل اسٹور ہے نا ضرورت کی ساری چیزیں مل جاتی ہیں، کم از کم میری ضرورت کی ایمان سے شہیر بھائی بڑی حسرت سے بدل میں اپنی مرضی کی شاپنگ کرنے کی ہمت تو نہیں ایک سے زیادہ چیزیں خریدنے کے لیے پیسہ تو ہی نہیں ہیں۔“

”سدر جاؤ منیر۔ سدر جاؤ۔ شہیر بھائی آپ اس کی وارڈ روم کھول کر دیکھیے گا۔ کیا نہیں ہے اس کے پاس۔“ ارم نے مداخلت کی۔

”یہ ہم دونوں کا آپس کا معاملہ ہے ارم اور دیکھیں ہی اس نے مجھ سے سدر جانے کا وعدہ پہلے ہی کر رکھا ہے۔ منیر تم ان ہی لڑکیوں کے ہمراہ گھسنے کے بجائے ادھر ہی چلے جاؤ۔ بلکہ میں بھی تمہارے ساتھ چلے ہوں یہ لوگ سب گھانپتی مرضی سے خریدیں گی۔ ظہیر ان کے ساتھ ہوگا۔ یہ لڑکیوں۔“ منیر نے کچھ رقم اس کی طرف بوجھادی۔

”میں منیر کو لے کر جا رہا ہوں ابھی آ جاؤں گا۔“ وہ منیر کے ساتھ چلا آیا۔

”صرف منیر کے لیے ہی کیا اس نے سب کے لیے جی کھول کے رقم خرچ کی، ماہر ماہر شہیر، بہنت، امیری، ان کے سارے بچے کاظم چچا کے بچے عدی، انٹار بھائی، یوسف ان کے بچے تیل بنائی جو آپا کا مانا سا گھو سدرہ آپا کے چاروں چھوٹے چھوٹے بچے جن کے دم سے شہیر کی انیشن کٹن کا سیانی سے چلی تھی، ہار دن احمد نیلما واسطی کے شوہر اور احسن کے بچے ظہیر اور ظہیر کا چارہ سا بیٹا۔ یہاں تک کہ ظہور ہا سدرہ اس کے بھائی یہ سارے اس کی قبرست میں موجود تھے اس نے ہر تعلق دار کے لیے بہت کچھ خریدا۔ اس کی ادا سنی کی اور دوسری دکان پر آ گیا۔ یہ لیڈریز بلوسات کی بہت بڑی دکان تھی۔“

”یہاں سے کیا لیتا ہے؟“

”دیکھ لو گے کہ کیا لے رہا ہوں۔“

وہ اس کے ساتھ گاڑی کی طرف بڑھ آیا۔ سیلز مین نے عمدہ نظریں، دیکھ کر سادہ سا جیباں سوٹ شرٹ سے اس کے آگے پھیلا دیے شہیر نے اپنی پسند کے چند رنگوں کا انتخاب کیا۔

”شہیر بھائی..... یہ کس لیے۔ شام کو میں نے دیکھا تھا ماما لوگوں نے ایک اخبار ما اپنے سامنے رکھا ہوا تھا ایسے کپڑوں کا۔ یہ..... ان کی کیا ضرورت ہے۔ دہن کے لیے تو پہلے ہی بہت کچھ ہے۔“

”پانگل لڑکے ایہ بھائی کے لیے ہیں۔“

”بھائی۔ یعنی۔“ وہ حیران تھا۔

”جی ہاں آپ کی بھی اور میری بھی۔“

”آپ کی بھائی۔“ منیر کے انداز پر شہیر کو ہنسی آ گئی۔ وہ اس کی وضاحت پر الجھ رہا تھا۔

”جی ہاں یعنی فضلہ بھائی۔“

”اوہ اچھا۔ اچھا۔“ اب وہ بھی ہنس دیا۔

”وہ بھی اس گھر میں بہو کی حیثیت سے آئی ہے اور اس کا استنبان بھی ضروری ہے، پاپا اور ماما جو مرضی دیں یہ سب میری طرف سے ہوگا۔ میں بڑا بھائی، جینے ہوں اس کا۔“

منیر حیران سا سے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆☆☆☆

بارہ بجے کے قریب سب لوگ گھر واپس آئے، نیند تو نیند یہاں تو ممکن بھی کسی کے انداز سے ظاہر نہیں ہو رہی تھی، سٹنگ روم میں سب نے سامان پھیلا دیا ہوا تھا۔ ایک دوسرے سے مقابلہ موزوں ہو رہا تھا۔ چیزیں سنبھالی جا رہی تھیں۔

فضلہ بھی ایک طرف بیٹھی اس ساری صورت حال کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ ظہیر اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ بار بار نظر بچا کر اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ یہ ساری کارروائی اسے خوش بھی کر رہی تھی۔ لیکن ایک احساس بار بار اسے ستا رہا تھا، فضلہ پورا وقت ان سب کے ساتھ دکان دکان گھومتی رہی تھی، بے شک وہ صرف نئے ملک کے بچر کو دیکھنے میں مگن تھی، لیکن تھی تو ایک انسان اور وہ بھی عورت جو جس کھٹے کی بھی ہو کھڑکھا ڈرم و رواج اور تھیں اور نظر میں اس کا سہلا مسئلہ ہوتی ہیں۔ کسی نے ایک پل کو اس کی طرف توجہ کی تھی نا سے کچھ نہیں کو کہا تھا۔ ظہیر نے اس کے لیے کوئی سر اٹھانہ رکھی تھی۔ اس وقت بھی وہ چاہتا تو اس کے لیے سب کچھ خرید سکتا تھا۔ لیکن اس کا مدعا کچھ اور تھا۔

وہ صرف ظہیر ہی نہیں، ظہیر کی بھی تھی اور گھروالوں نے اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دی اور کوئی نہیں تو ارم اور شاز یہ ہی بچہ لیتیں وہ بڑا دل گرفتہ سا وہاں بیٹھا تھا۔

اپنے اور گھروالوں کے درمیان ایک دیوار کو جاکل محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس سے نظریں چراتے ہوئے تھا کہ فضلہ کی نگاہوں میں چھپا شکوہ اسے نظر نہ آ جائے وہ اس کے سامنے شرمسار نہ ہو جائے۔

فضلہ خوش ہو کر اس سے ہر ایک چیز کے بارے میں سوال کر رہی تھی ارم کے خریدے ہوئے ایک گاڑی اور سوٹ کو اس نے ہاتھوں میں لے کر بڑے استیقا سے دیکھا۔

”کیسا خوبصورت ہے، بہت اچھا لگ رہا ہے۔“ اس کے گلابی گلابی ہاتھ اس سوٹ پر دھرے بے پناہ اچھے لگ رہے تھے۔

”تم پہنو گی؟“ ظہیر نے حجت پوچھا وہ مسکرائی اقرار اس کی آنکھوں میں تھا۔

”کل ہم چلیں گے لے آئیں گے، ہنڈ اس کے ساتھ گولڈن چیئری تھی، میں تمہیں مشرقی لباس میں دیکھ کر.....“ ظہیر کی بات اور حوری رہ گئی۔ سامان کے انبار کے ساتھ منیر اور شہیر دروازے کی راہ اندر آئے۔

”انہ..... آج تو تمہارا دیا اس خریداری نے۔“



”کیا تجھ کو کھانا تھا تم نے نہیں۔ ہماری پسند ہمیشہ سے اسے دن رہی ہے۔“

”کیوں کہ وہاں تمہارے شروع ہونے اور منت مشورے بھی۔“

”شادی میں دو دن باقی ہیں یہ سوٹ سلوانا بھی ہوں گے ساز جیوں کے ساتھ یعنی کوٹ اور بلاؤڈ وغیرہ۔“ ارم نے فکر غاہری۔

”معاف کرنا یہ کام میرا نہیں ان کے شوہر کا ہے میں نے بڑے شوہر دیکھے ہیں ایسے جو ٹیلرز کے سر پر بیٹے کر سلاتے ہیں اپنی از روئے راج کے ملبوسات، قمیڑ اور کرے گا بھی کیا جلا جائے گا کل سارے دن کے لیے کسی ٹیلر کے ہاں۔“

”ہنڈ بگ شیر۔ تم میں جو رو کا غلام بننے کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں۔“ عدنی جانے کہاں سے آئی۔

”مگر تم یہ سبق شوہروں کی ساری قوم کو نہ پڑھاؤ۔“

”مسترم جو سبق آپ سے سیکھا ہے اسے باقیوں تک نہ پہنچانا ہے ایمانی ہوگی۔“

ایک فریڈنگی تھتے نے دروہام ہلا دی۔

ظہیر جتے جتے ایک دم خاموش ہو گیا۔ وہ شہیر کا شاداں و فرحاں چہرہ دیکھنے لگا۔ ماضی پر غور کرنے لگا اپنی اور اپنے اہل خانہ کی زیادتیوں اور شہیر کی محبتوں کا سارا حساب اس کے دل پر تحریر تھا۔ اس کا دل بھرا آیا۔ اس نہ امت کا اظہار ہے وقت تھا۔ شاید غیر ضروری بھی تھا۔

اب تو یہ حساب صرف محبت اور نیکت سے ہی برابر ہو سکتا تھا کہ اس کا نکات میں پائے جانے والے سارے مسائل کا (خواہ وہ ذاتی ہوں یا اجتماعی) حل محبت ہی ہے۔ محرمیوں کا عداوت بھارتی ہے۔

بعض لمبے بھی شہیر کی بھول کی مانند ہوتے ہیں لاکھ بھاگ دوڑ کے بعد بھی ہاتھ نہیں آتے اور بھولتے کر لیں۔ ترس کھانے لگیں۔ تو خود ہی ہار مان کر آ لیتے ہیں سینے سے۔

لہجوں نے شہیر سے بھی بڑی مدت آنکھ پھولی تھی۔ بلکہ لہجوں نے تو بسا اوقات شہیر سے سفاک انسان کا روپ بھی دکھایا۔ لیکن سنی بڑی بات تھی کہ لہجوں کو اس پر ترس آ گیا تھا۔ اس کے صبر حوصلے۔ اعلیٰ ظرفی اور انسانیت کے آگے سفاکی نے گھٹنے ٹیک دیے تھے چاروں اور خوشیاں تھیں خوشیاں تھیں یہ وہ سر تھیں جس جو اس نے اپنی پل کی قربانیوں کے صلے میں حاصل کی تھیں یہ وہ عزتیں تھیں رب کی جو ڈھیر سارے امتحانوں اور آزمائشوں کے بعد اس کا نصیب ہوئی تھیں۔ کتنا عظیم تھا وہ پھر بھی باقی رہا تھا اسے رہا تھا سب کو۔ دینا اور ہانپنا بے شک ایک اہم صفت ہے لیکن خوش نصیب ہوتے ہیں وہ انسان جنہیں رب اپنی اس صفت سے روشناس کراتا ہے۔ اس صفت کا ایک ذرہ ان کے دل میں بھی بھر دیتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

واداد غرہ گوری وا

شاہد بھتی غرہ گوری وا

لڑکے لڑکیوں نے مل کر ایک طوقان اٹھا رکھا تھا۔ صبح سے اس کے کمرے میں گھسے اس کے کانوں کے پروے پھانڈے میں گوشاں تھے ناچ رہے تھے گارے تھے ہنگامہ برپا کر رہے تھے بلکہ اس کمرے میں اور بھی بہت کچھ بھور باتھا۔ کیونکہ پورا گھر مہمانوں سے بھر چکا تھا یوں کہ تل و صر نے کو جگہ۔ حتیٰ لڑکیوں نے اپنے اپنے ملبوسات اور سامان آرائش و زیبائش یہاں تار کھا تھا۔ لڑکے بار بار ہل سیٹ کرنے کی غرض سے اسی ڈریسنگ روم کا رخ

”یہ کیا لائے ہیں آپ شہیر بھائی! ہم نے تو سب لے لیا تھا۔“  
”پھاؤ نہیں تم لوگ۔ یہ لڑکوں کے لیے ہے ہر عمر کے لڑکوں کے لیے۔“ منیر نے سینہ بھلایا۔  
”اے میرے خدا۔“

”اچھا۔ اب خدا یاد آ رہا ہے اور اپنی دفعہ۔“

منیر چلنے لگا۔ شہیر صوفے پر گر سا گیا۔

”منیر! لڑکے بعد میں پہلے باقی سامان تو اٹھلاؤ۔“

”ابھی اور بھی سامان ہے؟“ ارم نے آنکھیں پھاڑیں۔

”دگر نہ کرو وہ تمہاری جنس کا ہے میرا مطلب ہے لیڈیز سے متعلق اور دیکھو فلائنگی میں نہ پڑ جانا وہ تم میں سے کسی کے لیے بھی نہیں ہے ایک خاص ہستی کا ہے۔“ وہ جاتے جاتے کہتا گیا۔

”آپ نے بڑی دیر لگا دی۔ مجھے وہ پھیروں میں ان سب کو لانا پڑا۔“ ظہیر نے کہا۔

”ہاں یار! میں نے سوچا روز روز کون بازاری آتا پھرے جو لینا ہے ایک ہی بار لے لوں اور پھر لیڈیز کے لیے خریداری میرا پہلا تجربہ تھا اسی سبب زیادہ دیر ہو گئی۔“

منیر واپس آ چکا تھا ایک بڑے سامان کے ڈھیر کے ساتھ جو اس نے لاکھ شہیر کے سامنے رکھ دیا۔

ظہیر نے اشتیاق سے ان شاپنگ بیگز کی طرف دیکھا۔ اسے رشک بھی آیا اور اپنی کوتاہی کا احساس بھی ہوا۔ یہ شادی کا موقع تھا اسے فضا کے لیے..... کچھ لینا چاہیے تھا۔

”شہیر بھائی! مجھے بھی فضا کے لیے کچھ لینا تھا۔ آپ ساتھ ہوتے تو میں بھی۔“

فضا مصیبت کے ساتھ مسکرا رہی تھی شہیر کی نگاہوں میں ایک ان دیکھا چہرہ سا گیا۔ اسے لگا اس کے سامنے ظہیر کی بیوی نہیں اس کی اپنی ماں تھی ہے۔

وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھ گیا۔

”اس کے لیے کچھ لینے والے صرف تم ہی نہیں ہو کچھ اور لوگ بھی ہیں اور یہ سب کچھ جو تمہارے سامنے پڑا ہے میں فضا بھائی کے لیے لایا ہوں۔ فضا! چلو اٹھو اور اپنی چیزیں خود ہی لے لوں گے۔“

ظہیر نے اور فضا نے ایک ساتھ شہیر کی طرف دیکھا۔

”میرے لیے؟“

”فضا کے لیے؟“

یہ سوال و ذوں کی زبان پر ایک ساتھ آیا۔

”آف کورس۔ کیا بڑے بھائی کو حق نہیں دینے کا؟ کیا دینا اس کا فرض نہیں ہے۔“ سب اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کر ان کے گرد جمع ہو گئے فضا نے مشکور نظروں سے شہیر کی طرف دیکھا اور اس کی نرم و نازک انگلیاں ایک

شاپنگ بیگ کی گرہ کھولنے لگیں۔

بناری اور کاہدار سوٹ۔ کچھ بہترین پرنٹڈ جوڑے، جیولری کے دو سیٹ، کالج کی ٹیٹس، چوڑیاں۔

دوا سہائی، گلش رنگوں کی بیماری ساڑھیاں اور نہ جانے کیا کچھ۔

”اللہ شہیر بھائی! آپ تو بڑے چھپے دستم ہیں..... آپ نے ہم سب کی لائی ہوئی چیزوں کی انٹرا، بہت کمات کر دیا۔“ شازید نے پیار بھرا احتجاج کیا۔

کر رہے تھے گوہر کی الماری میں بگڑا ہوا طوفان آیا ہوا تھا لڑکوں نے ویسے کے دن سینے کے سبب استری کے بغیر یہاں ٹانگ رکھتے تھے گھنٹوں کی محنت کے بعد انہیں محفوظ جگہ ہی نظر آئی تھی خود گوہر کے بیڈ پر رنگوں کی ایک قطار اتری ہوئی تھی ہر رنگ کے سوٹ اور بھاری دو پٹے پر لیس کیے ہوئے یہیں براجمان تھے کمرے کے ایک کونے میں وہ بیٹی باکسز کی قطار تھی دوسری طرف سینڈل اور کورٹ شوز سجے تھے بیڈ کے نیچے چیلری باکسز محفوظ کیے ہوئے تھے کبھی شیر خوار بچے قالین پر قطار اندر قطار استراحت فرما رہے ہیں۔ اور کبھی ان کی مائیں آرام کی غرض سے لیٹی ہوئی ہیں چائے کے قہرک جب چھپانے کی جگہ بھی بھی ہوئی یہی محفوظ کرنے کی جگہ یہی کمرہ کیا تھا امرت دھارا تھا۔ ہر پریشانی کا علاج ہر درد کی دوا اور توت اور پانچانانے نکاح کے وقت تقسیم کیے جانے والے میوہ جات کی بیک کی ہوئی تھیلیاں بھی اسی کے کمرے میں رکھوائی تھیں۔ کیونکہ ایک ہی رات میں لڑکے لڑکیوں نے پچاس تھیلیاں پانچ لڑکیوں اور توتوہ وہ چچا اماں انہیں بھی اماں ہمیں نظر آئی تھی ان کا پاندان بھی گوہر کے پہلو میں دھرا تھا

”میں تو منگوا منگوا کر عاجز آگئی ہوں بیٹی لڑکیاں بالیاں آنکھ بچاتے ہی اڑا لے جاتی تھیں سب کچھ اور لڑکے بمشکل سامان لانے کے لیے آواز دہرتے ہیں وہ تو کھیل تماشا کرتے ہیں میرے لیے پان کے بغیر وقت کاٹنا محال ہو جاتا ہے۔“ انہوں نے فکری پاندان جو چچا بابا کی نشانی تھا۔ ایک چادر میں چھپا کے رکھ دیا۔

ان دنوں میں جب وہ سارے کمرے کے لیے سب سے زیادہ اہم تھی اور یہ سارے ہنگامے صرف اپنی خاطر برپا کیے گئے تھے اسے ایسا نگ رہا تھا کہ وہ اس سارے ساز و سامان میں رکھا ایک بیٹی سے اور بس۔ گو خوشی نے اس سے بھوک پچاس چھین رکھی تھی لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ اسے کھانا دینا سب کو بھول جاتا۔ کئی بار منیجہ بیگم کو اس کے لیے علیحدہ سے کھانا بنا کر دیا۔

”اے میں صدقے میں قربان اپنی بیٹی کے لیے میں خود لایا کروں گی کھانا۔ بلکہ منیجہ بیگم تم میرا کھانا بھی اسی کے ساتھ دیا کرو۔“ چچی اماں کو بے حد برا آ جاتا اس پر۔  
اب وہی بات عدگنی سے ہر چیز اس کے لیے لاری تھیں۔  
پاپانے سب سے چھپا کر فروٹ اس کے لیے لار کھے تھے۔

”پھر تم تو مہمان بن کر ہی آیا کرو گی بیٹی اس گھر کے فرد کی حیثیت سے یہ اختیاری دن ہیں تمہارے یہاں۔“ اس کی جدائی کی اذیت اس کی زندگی کی خوشیوں کے احساس سے وہ کبھی خاصی تکلیف دہن اور ان کا کوئی ازالہ نہیں تھا۔ ان دنوں لڑکے لڑکیوں کے ہر طرح بڑے مزے تھے اس رات بخت ڈرائی فروٹ کے نیلے لیے اس کے پاس آئے تو سب بڑی دل کی طرح اس پر نوٹ پڑے اور غصہ بعد ان تھیلیوں میں چھلکوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

آج ہندی کی رسم ہونا تھی۔ سولڑکوں نے مقابلے کی رہبر سل کرتے کرتے میسے والوں سے سسرالیوں کا دوپ دھار کر اس کو نشانہ بنا لیا۔ اور اب ”خزہ گوری دہا“ کی گردان نے اس کے کان کھائے تھے وہ کانوں میں انگلیاں دے کر بیٹھی تھی۔ جب شور اٹھا کہ لڑکے والے تشریف لائے جہاں لڑکیوں کی بیٹی میں اس کا کمرہ خالی ہو گیا سارا شور لان میں منتقل ہو چکا تھا۔ جہاں رنگوں اور دہنیوں نے چکا چوند پیدا کر رکھی تھی۔ اس نے در سے بھاگ کے دیکھا۔ سارا عسکری خاندان ایک جگہ جمع تھا بھر پور مسکراہٹ اس کے خوب صورت لیں پر پھیل گئی۔  
جدائیوں کے ذمہ جب بھرتے ہیں تو پھول بن جاتے ہیں شاید خوش رنگ پھول بیو دنیا واقعی بھتوں کے لیے بنی

ہے۔ یہ نیا بھتوں سے ہی حسین نظر آتی ہے۔ اس کمرے میں خوشی کے بے شمار سواچ آئے تھے۔ تینوں بھائیوں کی شاہیاں ان کے بچوں کی پیداؤں۔

خود اس کی شادی کا وہ حادثہ نہ ہر دوں پہلے پیش آیا تھا ہر شخص سہا ہوا اور اس نظر آتا تھا۔ زبردستی مسکراتا تھا۔ خوشی کو اپنے اوپر طاری کرنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کے ساتھ جو بھی تھا اسے تو ہر خوشی نے اس اور نہیجہ ہی کیا تھا ان لمحوں میں جب نسا میں بیٹی کی ٹخنیاں بچ رہی ہوتی تھیں وہ ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی شیر کو سوچا کرتی تھی اپنی تقدیر پر غور کیا کرتی تھی۔

خوشی کوئی بڑی شے تو نہیں تھی کہ وہ اسے اپنی مٹھی میں بند کر لیتی خوشی تو ایک احساس تھا اور احساس کسی کے ماتھے پر نہیں لگا کرتے احساس من کے اندر پھونٹے والے جتنے کی مانند ہوتے ہیں اور سرچشمہ روح ہوتی ہے دل کے احساس موسموں نے اسے کبھی ہنسنے کی مہلت ہی نہ دی تھی۔  
مگر آج۔

صبر و ضبط اور مستقل مزاجی کا جو صلہ رب نے اسے دیا تھا وہ بہت دلفریب تھا۔ بہت حسین تھا۔ بہت دلکش تھا۔ اور مزے کی بات تو ایک اور تھی۔

اتل خاندان مل کر اسے بے وقوف بنا رہے تھے بقول یا بزم خوران کے مگر وہ انہیں بے وقوف بنا رہی تھی۔ سب کی ترس کھاتی نظروں پر خود اسے ترس آتا تھا۔  
”آہ بے چارے نادان لوگ۔“ وہ انہیں دیکھ کر مسکراہٹ چھپاتے ہوئے سوچتی۔  
اور سب اس کی لاطمی پر اسے بے چاری دیکھتے کبھی کبھی جو ہر کسے حد حیرانی ہوتی۔

”یہ وہی لڑکی ہے جس نے اپنی عمر کے خوب صورت ترین سال ایک سو ہوم ہی آس میں چراغ دل کی روشنی میں راستوں کو منور کیے رکھا آج وہ کس جین سے آئنا ہو گئی ہے۔“  
کبھی کبھی انہیں ڈر لگتا۔

محبیبوں کے رہ گ ایک بار لگ جائیں تو عمر بھر کے لیے جدا نہیں ہو سکتے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ عین وقت پر کوئی ہنگامہ کھڑا کر دے۔  
کبھی دو سوچتیں۔

بہت سی باتوں سے لاعلم رہ کر وہ کوئی بھیجا تک فیصلہ نہ کر بیٹھے لیکن وہ بد عہدی نہ کر سکیں سب سے اب تو ایک محزنی رشوت سے ویسے بھی ان کو متہ بند رکھنے کا پابند بنا دیا تھا انہوں نے سب کو خدا پر چھوڑ دیا کہ جو اس کی مرضی ہوگی وہی ہوگا۔

☆☆☆☆☆☆

رات ڈھلی دن میں بدل گئی یہ دن بڑی مشکل سے اس کی زندگی میں آیا تھا۔ یہ دن اس کے لیے خواب بنا تھا کبھی بھرتا کام حسرت میں بدل گیا تھا۔

بہت سارے دن بھاگ دوڑ میں کام کاج میں گزر گئے تھے وہ پاپا سے کہہ کر اپنے گھر چلا آیا تھا۔ ریٹ کرنا چاہتا تھا یا بے صبر اور ہاتھا۔

سکون کے ساتھ گوہر کو سوچنا چاہتا تھا۔  
سب کا منفقہ فیصلہ تھا سب نے بخوشی اس پر آمادگی ظاہر کی تھی کہ وہ کوشیر کے گھر میں لایا جائے۔ شب

زخاف گزارنے کے لیے اس کی اپنی خواہگاہ ہی سچائی جائے دوسرے دن بے شک صبح ہی صبح وہ ادھر آ جائیں۔  
 عروسی کمرے کی تزئین و آرائش عدی اور اس کی بیگم نے اپنے ذمے لے لی شہیرہ وہ پہر تک دوسرے کمرے  
 میں سوتا رہا جاگا تو اس کی خواہگاہ کی شکل عیا بدل چکی تھی پہلوؤں کی آرائشی شکل وہ شہیرہ نے عروسی شب کی تصویر  
 اس کی نظروں میں بسا دی تھی وہ گھبرا کر کمرے سے نکل آیا۔

”تو ن پر فون آ رہے ہیں یار..... ادھر دو لہا صاحب کے گھر والوں کو ان میں چین نہیں آ رہا..... کام مکمل ہو چکا  
 ہے اور تم بھی آرام کر چکے ہو میرا خیال ہے اب چلنے ہیں کھانے پر جناب کا انتظار ہو رہا ہے۔“  
 ”بھائی صاحب! یہ آرام جو آپ نے کیا۔ اپنی داوے بچھائی جن کا اتارنے کے بہانے اٹھی شب بے ناری کا  
 سدباب تو نہیں تھا۔“ وہ اب آگاہ ہو رہا تھا عدی کی بیگم سے خاصی دلکش شخصیت تھی اس کی بھی۔ بس تھوڑی سی  
 مفرور اور بے نیاز تھی۔

وہ صرف سر جھکا کر رہ گیا جواب نہ دے سکا۔

”یہ سچ کہہ رہی ہیں خواتین کو کمال حاصل ہے۔“ عدی نے مستراہٹ لبوں میں دہائی شریرا انداز میں۔  
 ”کس بات کا؟“ شہیرہ نے پوچھا۔

”بے چارے شوہروں کو چگانے رکھنے کا۔ فیملی اڑا دینے کا برق میں اور ان میں فرق ہی کیا ہوتا ہے وہ دونوں  
 ہی ہوش رہا اور خاستر کر دینے والی چیز ہیں۔ آپ نے سچ کہا ہاں مہینہ تو بس وہی تھی جو آج کر لی تھی سنئے  
 اب چکن سے سونا تو خواب ہوا۔“ عدی نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے دل کھول کر قہقہہ لگایا۔

فون کی گھنٹی پھر بج رہی تھی شہیرہ فون کی طرف بڑھا۔ عدی نے جان لیا کہ بلاوا کہاں سے ہے اور تینوں چل  
 پڑے۔

”تو بے شہی۔ آدمی اگر غلطی سے اہم بن ہی جائے تو اسے نخرے نہیں دکھانے چاہئیں اسے۔“

عذرا گیٹ پر ہی مل گئی لان میں چاروں طرف شوخ زنگ بکھرے تھے لڑکیاں چوچھاری تھیں سب نے کھانا  
 برائے نام ہی کھایا اور جانے کی تیاریوں میں لگ گئے ساری بہنوں نے مل کر دو لہا کی ایک ایک چیز مطلوبہ مقام  
 تک پہنچا دی۔ بزرگ خواتین بھی اس کے کمرے میں موجود تھیں۔ وہ شلواری تھیں پین کر فارغ ہواتی تھیں کہ سب  
 نے ایک ساتھ دھاوا بول دیا۔ سب نے مل کر اسے نچھامنا بچھ بنا دیا۔ تھیں کے ہنوں سے لے کر بال سنوارنے  
 تک کلون لگانے سے موڑے پہنانے تک سارا کام باری باری سب بہنوں نے کیا۔ سہرہ آ پا اور شاز یہ عذرا  
 چاروں بار بار اس کی پیشانی پر اپنے ہیکر کی مہر میں غبت کر رہی تھیں ماما اور مگی دونوں وہیں تھیں وہ بیڈ پر بیٹھا تھا۔  
 آپ ہی آپ اس کا سر جھک گیا تھا۔ کبھی بھی نظر اٹھا کر وہ چہروں پہ چھائی بہار کا نگارہ کر لیتا اور اس کا دل جھوم  
 اٹھتا۔ تھوڑی دیر میں مرد حضرات مدعو شری لڑکوں کے کمرے میں داخل ہوئے۔

شاہنواز اور جمال، احمد ایک ساتھ کھڑے تھے۔ جمال احمد نے سب چہروں کو بنظر غور دیکھا۔

”اے رب کا مل! یہ سفر جب شروع ہوا تھا تو شہیرہ ایک بچہ تھا۔ تنہا ابا اس اور بے سہارا۔ میری محبت نے اسے  
 سہارا دیا۔ ایک کمزور پودے سے تناور درخت بننے کا سارا عمل تیرے بعد میری نگرانی میں تھا۔ میں نے کسی لالچ  
 کے بغیر اس کی ذمہ داری کی زمانے کی سروی گری سے بچانے کی سعی کی یہ میری حسرت تھی کہ اسے اس کے پہلوں  
 کے درمیان ہنسا سکرنا دیکھوں۔ تو بڑا دلچسپ ہے اسے رب! تو نے یہ دن مجھے دکھایا یہ دن گو دیر بعد آیا۔ لیکن اس کا  
 دیر سے آنا بھی اس کی خوبصورتی ہے اور آج بے حساب سجدات شکر مجھ پر واجب ہیں۔ ابھی اب اس کی زندگی

کے موسم میں خزاں کبھی نہ آئے۔ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے سبب یہ لڑکا مجھے واقعی بے حد عزیز ہے شہیرہ اپنی  
 اولاد..... جتنا ہی۔“ جمال احمد کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”بھائی صاحب! بیٹے کے سر پر سہرا سہا ہے۔“ شاہنواز عسکری کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔  
 ”نہیں صاحب! خوبصورت فرمیں آپ کا ہے۔“ جمال احمد نے جھٹ کہا۔

”آپ ان انمول گھڑیوں میں غیریت کا احساس پیدا نہ کیجئے جمال احمد۔ آپ ہم سب کے بڑے بھائی  
 ہیں۔“ شاہنواز نے آگے بڑھتے ہوئے سہرا ان کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ سارے ہاتھ ایک ساتھ دعا کے لیے بند  
 ہوئے تھے خود شہیرہ کے ہاتھ بھی لیکن اس نے بڑی مختصری دعا مانگی تھی۔

”اللہ ہی اس ساری کائنات کو محبت کے جذبوں سے حسین و آبا رکھ۔“

عدی ہارون، ظہیر، منیر، یوسف، افتخار، غلام، ساغر، سب شہیرہ کے ساتھ ساتھ تھے گاڑیوں کی قطاریں جانے کو تیار  
 تھیں۔

”یار! اگر تم نے بھائی کا پلو باندھنے کا ارادہ ترک نہ کیا ہوتا اب کرو۔ کیونکہ پلو بندھانی ٹیک جو تاج چھپائی وودھ  
 پلائی وغیرہ کے نام پر تم سب کچھ لے چکے ہو۔“

ظہیر نے میر کے کان میں کہا۔ ”سخت اجتن لگو۔ گھر پھر اس حرکت پر خواہ مخواہ لوگ نہیں گے۔ اور ایسا تو ان کے  
 ساتھ ہونا ہے جو کچھ دینے میں ہیں وچیزیں سے کام لیتے ہیں۔ شہیرہ بھائی نے تو ہم سب کو بہت کچھ دے دیا ہے۔  
 بہت کچھ۔“ اس بہت کچھ سے ظہیر کی مراد۔ جذبے تھے حسین و بے سول جذبے اور اس بات کو ظہیر بھی سمجھ  
 کہا۔

☆☆☆☆☆☆

رات کے دس بجے بارش داپس جانے کے لیے تیار کھڑی تھی لڑکیوں کے منہ چھولے ہوئے تھے لڑکے ایک  
 طرف خاموش کھڑے تھے عدی اور ہارون ان کے پاس تھے۔

”یار عدی ان لڑکیوں کی موٹی عقل میں یہ بات سماعتی نہیں رہی یہاں تک تو ان کی موجودگی بے جواز نہیں تھی  
 وہاں ان سب کو پا کر اسے پنا نہیں چل جائے گا۔ نکاح کے وقت قاضی صاحب اندر گئے تھے جب میں نے  
 رازداری کا اکتھا خیال رکھا۔ یہاں تک کہ قاضی صاحب سے بھی اکتھا کی شہیرہ کا نام نہ لینے کی صرف کاغذات پر  
 دستخط کر لینے کی روز کیا فرق پڑے گا ان کے نہ جانے سے اور ان کو کڑھ مغزوں کو دیکھ یہاں تک منہ بتائے کھڑے  
 ہیں ہم سب کی تہ و خاک میں ملنا چاہتے ہیں۔“

”آپ اظہیر ان رکھے ہارون بھائی ان میں سے کوئی بھی دو لہا وہن کے ساتھ نہیں جائے گا۔“

عدی کی بات پر سب نے گھور کر اسے دیکھا جیسے اس نے کوئی بہت ہی غلط بات کہہ دی ہو۔

اس نے سب کو سچا کر کے رساں کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی اور انہیں اپنے ساتھ لے گیا۔

اور اتو قفسے میں کھینچا رہا تھی۔

”پتا نہیں کیا چارم نظر آتا ہے آپ کے ہارون صاحب کو۔ ان کے ساتھ ایسے کیا جاتا تو انہیں خبر ہوتی ہے  
 چارم اتنی انجمن گور بھائی کے ساتھ دھوکا کیا جا رہا ہے۔ میں انجمن جا کے کہہ آئی ہوں سب کچھ ان سے۔“

”ارے رے۔ رے ایسا غضب نہ کرنا۔ پلیز ماما۔ پلیز۔ گھر چلو۔ صرف چند گفتگوں کی بات ہے۔“

سرجوڑ کے اپنی بھائی کے ساتھ۔“ قسطیہ نے اسے پکڑ لیا۔





نے تو ممکن ہی روپیہ کر کی تھی ان حالات میں جب میرے پیارے میری شادی ایک اور جگہ طے کر دی تو مجھے بڑی توشی ہوئی، لیکن چونکہ میرا دل آپ کا یہ حسین ملاپ آسمان پر تقدیر کی کتاب میں ازل سے رقم تھا۔ کسی بہانے یہ شادی ہوتے سے رہ گئی۔

لوگوں کا خیال ہے کہ میں نے عمر کے چوسات برس اس ہندے کی یاد میں گزارے ہیں یہ مجھ پر ایک انعام ہے اور حقیقت اس زندگی میں مجھے ایک بھی شخص ایسا نظر نہ آیا جو میرے معیار کے مطابق ہوتا۔ آپ کو میں نے اپنے لائق پایا، اور والدین کی تجویز پر باں کہہ دی آپ میرے اپنے ہیں آپ سے دل کی بات چھپا کر میں دوئی کا احساس پیدا نہیں کروں گی۔

وہ مکار شخص جو کچھ بھی تھا جیسا بھی تھا باتیں کرتے کا فن خوب جانتا تھا اسی خوبی کے سبب تو اس نے شہر کے پانچ لاکھ لوگوں کو بے وقوف بنا کر سیٹ جیت لی ہے آپ سوچئے آخر ایک دو سال ہم ایک دوسرے کے منگیتر رہے ہیں تو خیر جو کچھ سمجھتی تھی وہ منگیتر جان کر صرف دل لگنی کے طور پر سبھی ادھر ادھر کی ستایا کرتا تھا۔ ایک بار شاید کسی حسین رات کی اتنی رات کے حسن سے مرعوب ہو کر وہ کہنے لگا۔

"ہم ایک پیارا سا گھر بنا کر اسے پھولوں اور گلیوں سے سجائیں گے یہ جو آسمان پر تارے سجے ہیں ناپہ اور کسی کے لیے نہیں ہمارے آگن کی سجاوٹ کے لیے یہ رہا ہے بنائے ہیں۔ ہم مجھ پر سے سادوں کے دن بڑے ہی دل فریب ہوں گے کہ ہم تم مل کر ان کا استقبال کیا کریں گے اور اپنے ڈرائنگ روم میں کرنا گرم پکڑے کھاتے ہوئے شیشے کی دیوار کے پار سے بومدوں کی رقم، مجھ کا منظر دیکھا کریں گے۔"

اس نے تو خیر گپ..... ہرئی تھی یا شاید کسی فلم کے رنے رنائے مکالمے مجھے سنا دیے تھے لیکن کیا کیا ایسے لمحوں کے خواب ضرور دیکھتی ہیں میں نے آپ کو سچ بتا دیا ہے کہ بخدا آپ کے سوا کسی کی میرے دل میں گنجائش تھی نہ ہے کیا میں اسید کھوں کہ آپ کی محبت کی چھاؤں میں مندرجہ بالا سارے احساسات محض تصور نہیں رہیں گے ہمارا گھر میرے خوابوں کا حقیقی روپ ہوگا اور میں یہ سارا دل فریب جہاں صرف اپنی بصارتوں سے نہیں آپ کی آنکھوں سے بھی دیکھوں گی۔

اگر ایسا ہے تو آپ مجھے آواز دینے پکارنے میں جہاں بھی ہوں دوڑی چلی آؤں گی اور آپ نے مجھے نہ پکارا تو میں سمجھ لوں گی کہ....."

اس سے آگے شہر کچھ پڑھ ہی نہیں سکا۔ کچھ دیر وہیں رکا رہا۔ پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ڈرینگ روم میں بیٹھا نکلا۔

اور اس کی بدحواسی کو گہرے مزے لے لے کے دیکھا شاید اسے اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا، تبھی وہ لیک کے..... سائیکل نہیں کی طرف آیا۔ قون کا چوڑا اٹھایا۔ جندی جلدی بسر لایا ایک تمبر پھر دوسرا تمبر پھر تیسرا تمبر۔

پھر اس کی گھنچلائی ہوئی آواز گہرے کالوں میں آئی۔ "ہارون بھائی ہیں۔"

"یار کہاں تم ہو گئے ہیں وہ جندی سے بلاؤ نہیں۔ ایک دو تیل کی تاخیر کے بعد وہ پھر بولا۔

"انہ کہیں چھپ گئے ہیں۔ اب آئے خود ہی منیجا لیے معاذ۔"

"یہ کیسے کیا نہیں ہوا۔ وہ کمرے میں نہیں ہے جانے کہاں چلی گئی ہے میں نے آپ سے کہا تھا۔ آپ کا یہ راز انکھا بلکہ بھونڈا اتنا میری جان پر بنا دے گا۔ میں ایک عمر کانٹوں پر چل کر اس تک پہنچا تھا ہارون بھائی۔ آپ پڑھ کر حیران ہوں گے۔ اسے مجھے سے نفرت ہے وہ اس میجر کے بچے کے۔ اف میرے خدا۔ میں کہہ رہا ہوں

آپ خود آ جائیے میری شان میں جو قصیدے اس نے لکھے ہیں وہ بڑھ لیجئے۔ ان الفاظ کے بعد کس کا فر کو یقین رہا ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ یا کرتی ہے۔ جس شخص ہارون بھائی ایک یہی بات تو ہے جس کا میں قائل نہیں رہا بڑی دقتی کا۔ میں کسی ذی روع سے اس کی مرضی کے خلاف کچھ لیتے کا یا اسے کچھ دینے کا قائل ہرگز نہیں ہوں میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کہا کہوں اور کیا نہ کہوں۔ میں تو کچھ سوچ لینے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوں۔" وہ شاید رو دینے کو تھا جواب میں ہارون احمد نے جانے کیا کہا۔ "آئی سو بیٹا ہارون بھائی۔ اگر اس کی مرضی نہیں ہے تو میں اسے آزار....."

اس نے مڑ کر دیکھا حنائی ہاتھوں نے اس کے ہونٹوں کا احاطہ کر لیا تھا وہ عین اس کے سامنے کھڑی محبت پاش لگا ہوں سے اسے تک رہی تھی۔

وہ دونوں ایک طویل مدت بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اس بات کا احساس گویا کو تھا شیر کو ہرگز نہیں۔ وہ اس سے بلکہ اس کے لبوں پر بسنے والی دل فریب مسکراہٹ سے یہاں تک کہ اس کی حسین آنکھوں میں اٹھائیاں لیتے نئے نئے لمبے جذبوں سے بھی بے نیاز تھا۔

گوہر نے کریٹل پر اٹکی رکھتے ہوئے رابطہ کاٹ دیا۔ شیر نے اس کا ہاتھ آہستگی سے پرے بنایا اور دستہ پھیر لیا۔

"آپ ببول رہی ہیں گوہر! میں صلام حسن نہیں شیر ہوں۔"

"میں نے اس فارم پر کھلی آنکھوں کے ساتھ سامن کیے تھے جس نے مجھے اور آپ کو ایک ساتھ جیون ڈور میں باہم چاہے شیر۔"

وہ ایک دم پلٹا۔ "تو یہ خط؟"

"یہ میں نے اپنے جیون ساتھی کے نام ہی لکھا ہے۔ آپ اسے ایک بار پھر پڑھیے۔"

"مگر اس کا ایک لفظ یہ ظاہر کرتا ہے کہ تمہیں مجھ سے..... اوہ گوہر۔ تمہیں نہیں۔ میں بے وقوف نہیں ہوں..... سب جانتا ہوں۔"

"بے وقوف تو میں بھی نہیں تھی۔ آپ سب مجھے ایسا خیال کر رہے تھے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب آپ اپنے آپ سے پوچھیے۔"

"یعنی یہ کہ تمہیں سب خبر تھی۔"

"آف کورس!"

"مگر کیسے؟ سب سے؟"

"خبر تو مجھے ہر حال میں ہو جاتی، لیکن ایک مہربان دوست نے بڑے اہم لمحوں میں کئی تو یہیں ایک ساتھ مجھے دے دیں۔"

"کیا مطلب؟ تم سب کچھ جانتی تھیں؟"

"یقیناً۔"

"کون تھا وہ خدا مارا اٹاں۔ بے ایمان۔" شیر نے جھنجھٹا ہٹ سے کہا۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)

## خواتین ڈائجسٹ کے مقبول نام

رفعت سراج

آسیہ سلیم قریشی

عمیرہ احمد

عمیرہ احمد

عمیرہ احمد

ماہ ملک

ماہ ملک

ماہ ملک

رضیہ جمیل

رضیہ جمیل

رضیہ جمیل

نگہت عبداللہ

نگہت عبداللہ

نگہت عبداللہ

زہرہ ممتاز

شوکت رانا الطاف

نسیم سحر قریشی

نسیم سحر قریشی

نگہت سیما

دل ویا دلینز

وہ مجھ ہی سی دیوانی سی

ایمان امید محبت

لا حاصل

امر تیل

اک دیا جلانے رکھنا

جو چلے تو جاں سے گزر گئے

میرے خواب ریزہ ریزہ

ورد کے قاصدے

اک گھر وندہ برف کا

ساگر دریا بادل بوند

مجھے روٹھنے نہ دینا

انتظار فصل گل

دل پھولوں کی ہستی

میرے اس کے بیچ سفر

جنور

تو شریک سفر رہا

میرے دل میرے مسافر

بار وفا

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37- اردو بازار کراچی

Scanned By Waqar Azam